اصولِ دعوت

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان

ترجمہ

گل زادہ شیرپاؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُصولِ دعوت

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان
(سابق صدر شعبہ اسلامیات، بغداد یونی ورسٹی)

ترجمہ

گل زادہ شیرپاؤ

البدر پبلی کیشنز
23- راحت مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور
042-37225030 - 0300-8485030

☆ نام کتاب — اُصولِ دعوت

☆ مؤلف — ڈاکٹر عبدالکریم زیدان
سابق صدر شعبہ اسلامیات، بغداد یونیورسٹی

☆ ترجمہ — گل زادہ شیر پاؤ

☆ ناشر — عبدالحفیظ احمد

☆ طبع اوّل — جنوری 2010ء

☆ مطبع — علی اعجاز پرنٹرز' لاہور

☆ ہدیہ — -/700 روپے

فہرست

عرضِ مترجم

زیر نظر کتاب ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی کتاب أصول الدعوة کا ترجمہ ہے۔ مؤلف موصوف کا نام علمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ یہ کتاب، جیسا کہ مؤلف نے اپنے مقدمے میں بیان کیا ہے، انھوں نے بغداد یونیورسٹی میں سالِ چہارم کے طالب علموں کے لیے بطورِ نصاب تحریر کی تھی، مگر مؤلف کی علمی گہرائی اور محنت سے یہ ایک مبسوط مقالے کی صورت میں سامنے آئی ہے اور اب اسے دعوت کا انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس کتاب کا ترجمہ بھی مولانا محمد احمد واسطی صاحب کی نشاندہی اور مشورے سے کیا گیا ہے۔ ترجمے کے دوران کتاب کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جن امور کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ ذیل میں مختصراً پیش کیے جاتے ہیں۔

۱- اگر کسی بات کی وضاحت ضروری سمجھی گئی تو اس کا اظہار زیادہ تر حواشی میں کیا گیا ہے مگر بعض اوقات متن ہی کے اندر اضافہ ناگزیر تھا جس کی نشان دہی کے لیے کھڑے بریکٹ "[......]" استعمال کیے گئے ہیں۔

۲- آیات واحادیث کے ترجمے کے ساتھ عموماً ان کی اصل عبارتیں بھی دی گئی ہیں البتہ باقی عربی اقوال وغیرہ میں اصل عبارت سے عموماً احتراز کیا گیا ہے۔

۳- اصل کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ آخری باب کا عنوان أساليب الدعوة و وسائلها ہے۔ اس کی ذیل میں دو فصلیں دعوت کے اسالیب اور تیسری فصل دعوت کے وسائل سے متعلق ہے۔ گویا ایک باب میں دو مختلف چیزیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اردو ترجمے میں مناسب سمجھا گیا کہ چوتھے باب کی آخری

فصل کو مستقل باب بنا دیا جائے۔ چنانچہ اب یہ ترجمہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ مگر چوتھے باب کی پہلی فصل میں اسالیب دعوت کے لیے جو مصادر بیان کیے گئے ہیں اُن کا تعلق پانچویں باب یعنی وسائل دعوت کے ساتھ بھی سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ فصل 'اسالیب' اور 'وسائل' دونوں کے لیے تمہید کا درجہ رکھتی ہے۔

۴- آیات کے ترجمے عام طور پر ترجمۂ قرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے لیے گئے ہیں۔ بعض مقامات پر کتاب کے سیاق وسباق کی وجہ سے کسی اور کا ترجمہ لیا گیا ہے یا نیا ترجمہ کیا گیا ہے، مگر یہ بہت کم ہے۔ آیات کے ترجمے میں قوسین "(......)" کے اندر عبارت مولانا مودودیؒ یا جس کا ترجمہ لیا گیا ہو، اس کی طرف سے ہوتی ہے۔

۵- بعض مصنفین کا اسلوبِ تصنیف یہ ہوتا ہے کہ پوری کتاب سلسلہ وار پیراگرافوں کی صورت میں ہوتی ہے۔ مؤلف کا اسلوب بھی یہی ہے چنانچہ پوری کتاب ۷۶۸ چھوٹے بڑے پیراگرافوں پر مشتمل ہے۔ ترجمے میں بھی اسی کی پیروی کی گئی ہے۔ مگر اصل کتاب میں جگہ جگہ سلسلہ وار نمبر کی غلطیاں پائی جاتی تھیں جن کو ترجمے میں رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۶- شروع میں کتاب کی اشاعت دوم کا نسخہ سامنے تھا جس میں مؤلف نے عام طور پر آیات واحادیث کے حوالے نہیں دیے تھے۔ چنانچہ مسلسل یہ کوشش تھی کہ کوئی نیا نسخہ مل جائے جس میں یہ مسائل نہ ہوں۔ بڑی کوشش کے بعد آخر کار اشاعت سوم کا نسخہ مل گیا، جس میں مذکورہ مسائل تو حل نہیں ہوئے تھے مگر اس ایڈیشن میں مؤلف نے پہلے باب کی چوتھی فصل میں دو اہم مباحث یعنی اسلام کا نظام افتاء اور نظام حسبہ کا اضافہ کیا تھا۔ چنانچہ ان مباحث کو بھی شامل کیا گیا۔ ترجمے میں آیات کے ساتھ حوالے کی پابندی کی گئی ہے۔ البتہ احادیث کے حوالے نہیں دیے جا سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے دین کے داعیوں کے لیے رہنمائی اور مؤلف ومترجم کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ آمین

گل زادہ شیر پاؤ
منصورہ، لاہور
۰۳۰۰۸۰۰۶۱۵۰

۲۶؍صفر ۱۴۲۹ھ
۲۱؍فروری ۲۰۰۹ء

مقدمہ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمد وعلی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین، وبعد:

اُصولِ دعوت کے بارے میں یہ کچھ یادداشتیں ہیں۔ یہ ان لیکچروں کا خلاصہ ہے جو میں نے کلیۃ الدراسات الإسلامیۃ میں چوتھے سال کے طلبہ کے سامنے پیش کیے تھے۔ یہ یادداشتیں میں نے جلدی میں تحریر کی ہیں، اس لیے کہ طلبہ اس بات کا تقاضا کررہے تھے کہ ان کے سامنے اس موضوع پر کچھ تحریری لوازمہ موجود ہو۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے طلبہ اور ان سارے لوگوں کو نفع پہنچائے جو اسلامی افکار و تعلیمات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

۱- دعوت سے ہمارا مقصود دعوت الی اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ۱۲:۱۰۸) تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

دعوت الی اللہ سے مراد اس کے دین کی طرف دعوت ہے اور وہ اسلام ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ. (آل عمران ۳:۱۹) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

اس دعوت کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف سے لے کر آئے ہیں۔ چنانچہ اسلام ہی دعوت کا موضوع اور اس کی حقیقت ہے اور یہ دعوت کی پہلی بنیاد ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو احسن انداز میں مکمل طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ آپؐ نبوت و رسالت سے سرفراز ہونے کے دن سے

لے کر اپنے رب کی جوارِ رحمت میں منتقل ہونے تک اس دین کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی رسالت کا اعلان فرمایا: يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا. وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (الاحزاب ۳۳: ۴۵-۴۶) اے نبیؐ! ہم نے تجھے بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے پہلے داعی ہیں، اور اس بنا پر 'داعی' دعوت کی دوسری بنیاد ہے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا اور اللہ کا پیغام جن لوگوں تک پہنچایا، وہ عرب بھی ہیں اور دوسرے لوگ بھی۔ کیوں کہ آپ کی رسالت عربوں تک محدود نہیں تھی بلکہ تمام انسانوں کے لیے تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ. (سبا ۳۴: ۲۸) [اور ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں]۔ چنانچہ 'مدعو' دعوت کی تیسری بنیاد ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے کچھ وسائل، اسالیب اور طریقے اختیار کیے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کیے تھے اور جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔ یہ وسائل و اسالیب اور ان سے متعلقہ امور دعوت کی چوتھی بنیاد ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دعوت کے اصول چار ہیں: موضوعِ دعوت، داعی، مدعو اور وسائل۔

۲- اس بنا پر ہمارا منہج تحقیق بھی چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ہم نے ہر بنیاد کے لیے ایک باب متعین کیا ہے اور آخر میں ایک خاتمہ درج کیا ہے۔ ابواب کی ترتیب یہ بنتی ہے:

باب اول: دعوت کا موضوع

باب دوم: داعی

باب سوم: مدعو (مخاطبین دعوت)

باب چہارم: دعوت کے اسالیب و وسائل[۱]

خاتمہ

۱- جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، ترجمے میں وسائل کو الگ کر کے پانچواں مستقل باب بنا دیا گیا ہے۔ (مترجم)

باب اوّل

دعوت کا موضوع

تمہید

۳- ہم نے کہا ہے کہ دعوت کا موضوع اسلام ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن وسنت کے ذریعے وحی کیا ہے۔ ہم اسلام کے بارے میں اپنی گفتگو میں تفصیل و طوالت سے کام نہیں لیں گے اور زیادہ ایجاز اور اختصار بھی نہیں کریں گے۔ ہم اس میں سے وہی چیزیں بیان کریں گے جس کی مدعو کو ضرورت ہے اور جس کے بغیر داعی کے لیے بھی کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ اس کی تعریف، ارکان، خصائص اور نظامات و مقاصد بیان کر دیے جائیں۔ لہٰذا ہم اس باب کو پانچ فصلوں میں تقسیم کریں گے۔

پہلی فصل: اسلام کی تعریف

دوسری فصل: ارکانِ اسلام

تیسری فصل: خصائص اسلام

چوتھی فصل: نظام ہائے اسلام

پانچویں فصل: مقاصد اسلام

پہلی فصل

اسلام کی تعریف

اسلام کی بہت سی تعریفیں کی جا سکتی ہیں۔ ہم ان میں سے چند ہی تعریفوں پر اکتفا کریں گے۔

پہلی تعریف

۴- حدیث جبریلؑ میں ہے کہ جب آپؑ ایک دیہاتی کی شکل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے اور آپؐ سے سوالات پوچھ رہے تھے تاکہ حاضرین ان کے جوابات سنیں اور اپنے دین کے معاملات سے واقفیت حاصل کریں۔ ان سوالات میں سے ایک سوال یہ تھا کہ مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا. اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ تم نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ دو، اور رمضان کے روزے رکھو، اور اگر راستے (یعنی حج پر جانے) کی طاقت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔

تو اسلام کی ایک تعریف یہ ہوئی جو اس حدیث میں آئی ہے اور اس کی تشریح بعد میں آئے گی۔

دوسری تعریف

۵- اسلام یہ ہے کہ اللہ رب العالمین کے آگے خضوع اختیار کیا جائے، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے اور اس کے آگے جھکا جائے۔ اس میں یہ شرط ہے کہ یہ جھکاؤ اور میلان اختیاری طور پر ہو نہ کہ زبردستی۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے آگے جبری خضوع، یعنی اس کے تکوینی قوانین کو تسلیم کرنا تو ایک عمومی چیز

ہے۔ یہ قوانین تمام مخلوقات پر لاگو ہیں اور ان میں ثواب وعذاب کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ. (آل عمران ۳:۸۳) اب کیا یہ لوگ دین اللہ (یعنی اللہ کی اطاعت کا طریقہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان وزمین کی ساری چیزیں چارونا چار اللہ ہی کی مسلم (یعنی تابع فرمان) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

اپنے وجود اور بقا وفنا میں ہر مخلوق اللہ کے قوانین کو تسلیم کرتی ہے۔ اس جبری خضوع میں انسان بھی باقی مخلوقات کی طرح ہے۔ رہا اللہ کے آگے اختیاری خضوع تو یہ اسلام کا اصل جوہر ہے اور انسان سے اسی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اسی پر ثواب وعذاب کا دارومدار ہے۔ اس کا مظہر اللہ کی شریعت کے آگے مکمل طور پر جھکنا اور پوری رضا ورغبت سے اس کو قبول کرنا اور اس میں کسی قید اور شرط اور کسی دنیوی نتیجے سے بالاتر ہونا ہے۔ یہیں سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلام اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جو اسے پسند ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو وحی کیا ہے اور انھوں نے اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ. (آل عمران ۳:۱۹) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (آل عمران ۳:۸۵) اس اسلام (یعنی فرماں برداری) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام ونامراد رہے گا۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ إِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى وَإِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ (لقمان ۳۱:۲۲) جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کردے اور عملاً وہ نیک ہو، اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا، اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

وَوَصّٰى بِهَآ إِبْرَاهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ اٰبَآئِكَ إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْمَاعِيْلَ وَإِسْحَاقَ إِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ. (البقرۃ ۲:۱۳۲-۱۳۳) اسی طریقے پر چلنے کی وصیت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو

کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوبؑ اپنی اولاد کو کر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ "میرے بچو! اللہ نے تمھارے لیے یہی دین پسند کیا ہے۔ لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔" پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا: "بچو! میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟" ان سب نے جواب دیا: "ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ نے خدا مانا ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔"

۶- پھر 'اسلام' کا لفظ اس دین کے ساتھ خاص ہو گیا جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف سے لے کر آئے ہیں۔ اب 'اسلام' کا لفظ اس دین کے آگے بغیر کسی قید اور شرط کے، کامل انقیاد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس انقیاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنے رب کے آگے اختیاری طور پر کس قدر جھکا ہوا ہے۔ یہ چیز، جیسا کہ ہم نے کہا، اسلام کا اصل جوہر ہے۔ اسلام کے اسی مخصوص معنی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد آتا ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا. (المائدہ ۵:۳) آج میں نے تمھارے لیے دین مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو نظامِ زندگی کے طور پر پسند کیا۔

اس بنا پر اسلام کی تعریف اس کے مخصوص معنی میں، جو کہ مطلق ذکر ہونے کی صورت میں مراد ہوتے ہیں، یہ ہیں: اسلام اللہ رب العالمین کے آگے اختیاری خضوع کا نام ہے اور اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کی اس شریعت کا مکمل طور پر تابع فرماں بن جائے جو اس نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی ہے اور آپؐ کو اسے لوگوں تک پہنچانے پر مامور کیا ہے۔

تیسری تعریف

۷- اسلام انسانی زندگی کے معاملات اور کردار و عمل کے ان طریقوں کے لیے ایک عمومی نظام اور جامع قانون ہے جنھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف سے لے کر آئے ہیں اور آپؐ کے رب نے آپؐ کو اسے لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح یہ نام ہے اس ثواب و عذاب کا جو اس کے اتباع یا مخالفت کی صورت میں اس پر مترتب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ. (آل عمران

۸۵:۳) اس اسلام (یعنی فرماں برداری) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

یہاں دین ان معانی کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جو میں نے ذکر کیے ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے معانی کو بھی مستلزم ہے۔ مجموعی طور پر اس سے مراد وہ اسلام ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم رب العالمین کی طرف سے لے کر آئے ہیں۔

چوتھی تعریف

۸- اسلام ان تمام احکام کا مجموعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے عقیدے، اخلاق، عبادات، معاملات، اور واقعات کے حوالے سے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن و سنت میں نازل کیے ہیں اور آپ کو حکم دیا ہے کہ لوگوں کو اس کی تبلیغ کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ...... (المائدۃ ٥:٦٧) اے پیغمبر! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچادو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر جو چیز نازل کی ہے وہ قرآن و سنت ہے۔ ان میں وہ تمام احکام موجود ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ یہی اللہ کا دین ہے اور یہی اسلام ہے۔

پانچویں تعریف

۹- اسلام تین سوالات کے درست اور حق جوابات کا نام ہے۔ یہ تین سوالات وہ ہیں جنھوں نے قدیم وجدید دور میں انسانی عقل کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ انسان جب اکیلا ہو جاتا ہے اور دنیا کے امور کے بارے میں غور و فکر کرنے لگتا ہے یا کسی جنازے کے ساتھ جاتا ہے یا کبھی قبرستان کی زیارت کرتا ہے تو یہ تین سوالات اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں: ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ہم کس لیے آئے ہیں؟ اور ہمیں کہاں جانا ہے؟

ان سوالات کے صحیح جوابات وہی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیے ہیں اور وہ سب مل کر اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ 'اسلام' ہے۔

۱۰- پہلے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِن كُنتُمْ فِى رَيْبٍ مِّنَ ٱلْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِى ٱلْأَرْحَامِ مَا نَشَآءُ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوٓا۟ أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰٓ أَرْذَلِ ٱلْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا... (الحج ۲۲:۵) لوگو! اگر تمھیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں۔ (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو، اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا ٱلْإِنسَـٰنَ مِن سُلَـٰلَةٍ مِّن طِينٍ. ثُمَّ جَعَلْنَـٰهُ نُطْفَةً فِى قَرَارٍ مَّكِينٍ. ثُمَّ خَلَقْنَا ٱلنُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا ٱلْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا ٱلْمُضْغَةَ عِظَـٰمًا فَكَسَوْنَا ٱلْعِظَـٰمَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَـٰهُ خَلْقًا ءَاخَرَ فَتَبَارَكَ ٱللَّهُ أَحْسَنُ ٱلْخَـٰلِقِينَ (المومنون ۲۳:۱۲-۱۴) ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔

ٱلَّذِىٓ أَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهُۥ وَبَدَأَ خَلْقَ ٱلْإِنسَـٰنِ مِن طِينٍ. ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُۥ مِن سُلَـٰلَةٍ مِّن مَّآءٍ مَّهِينٍ. ثُمَّ سَوَّىٰهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِۦ وَجَعَلَ لَكُمُ ٱلسَّمْعَ وَٱلْأَبْصَـٰرَ وَٱلْأَفْـِٔدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ. (السجدۃ ۳۲:۷-۹) اس نے جو چیز بھی بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی

تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے، پھر اس کو نِک سُک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی، اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار رہتے ہو۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا. إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (الدہر ۷۶:۱-۲) کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ. خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ. يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ (الطارق ۸۶:۵-۷) انسان ذرا یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اُچھلنے والے پانی سے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔

قرآن کریم میں یہ اور اس طرح کی دوسری آیات یہ بات واضح کرتی ہیں کہ انسان پہلے کوئی چیز نہیں تھا۔ یعنی وہ معدوم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر اس کی نسل ایک معمولی بوند سے آگے چلائی، جس طرح کہ ان آیات میں مذکور ہے۔ پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے لحاظ سے دیکھیں تو انسان گارے یا مٹی سے پیدا ہوا ہے اور اس کی نسل کی تخلیق کے لحاظ سے دیکھیں تو انسان کی تخلیق پانی کی ایک ٹپکنے والی بوند[1] سے ہوئی ہے جو ریڑھ کی ہڈی اور سینے کی ہڈی کے درمیان سے نکلتی ہے۔[2]

۱۱- دوسرے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. (الذاریات ۵۱:۵۶) میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

اور عبادت کے ضمن میں اللہ کی معرفت، اس سے محبت، اس کے آگے خضوع اور اس کے ان

۱- نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ (القیامۃ ۷۵:۳۷) نطفہ جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے۔

۲- خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ. يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ. (الطارق ۸۶:۵-۷) [انسان] ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔

طریقوں کا اتباع بھی شامل ہے جو اس نے انسان کے لیے مقرر کیے ہیں تا کہ وہ ان کے ذریعے اپنے نفس کی تکمیل کرے اور اسے اس کے شایانِ شان اور اس کے لیے تیار کی ہوئی سطح پر پہنچائے۔ اس طرح وہ دنیا اور آخرت دونوں میں حقیقی سعادت سے سرفراز ہو جائے گا۔ انسان وسیع معنوں میں اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے جس کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

۱۲۔ تیسرے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ. (الانشقاق ۸۴:۶) اے انسان تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔

اَللّٰهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ. (الروم ۳۰:۱۱) اللہ ہی خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا، پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔

......ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ...... (الزمر ۳۹:۷) آخر کار تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے۔

وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ. (النجم ۵۳:۴۲) اور یہ کہ آخر کار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے۔

إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ. (العلق ۹۶:۸) اور پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔

یہ آیات کریمہ انسان کی موت کے بعد اس کے انجام کی وضاحت کرتی ہیں۔ اس کا انجام یہ ہے کہ اسے اپنے رب کے پاس لوٹنا ہے اور اسے دنیا میں اپنے کیے ہوئے اعمال کا حساب دینا ہے۔ وہاں اسے ایسے مقام پر پہنچا دیا جائے گا جو اس کے اعمال کے مناسب ہوگی۔ اگر اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے اپنے نفس کا تزکیہ کیا ہو اور یہ پاکیزہ لوگوں میں سے ہو کر رہا ہو تو وہاں اس کی مہمان نوازی پاکیزہ لوگوں کے گھر یعنی جنت میں ہوگی۔ اور اگر اس نے اپنے نفس کو گناہ کی گندگیوں سے آلودہ کیا ہو اور اسے خباثت میں رہنے دیا ہو تو اس کی مہمان نوازی برے لوگوں کے گھر یعنی جہنم میں کی جائے گی۔ اس کا بیان بعد میں بھی آ جائے گا۔

چھٹی تعریف

۱۳۔ اسلام انسان کی حقیقی روح، زندگی کے معاملات میں اس کے لیے راہنما روشنی، بشری بیماریوں کے لیے مکمل شفا اور وہ صراط مستقیم ہے جس پر چلنے والا کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِيْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ أَلَآ إِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْأُمُوْرُ (الشوریٰ ۴۲:۵۲-۵۳) اور اسی طرح (اے نبی!) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمھاری طرف وحی کی ہے۔ تمھیں کچھ پتا نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو، اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو، سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ. (بنی اسرائیل ۱۷:۸۲) ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ. (حٰمٓ السجدة ۴۱:۴۴) ان سے کہو: یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ اسلام کی ایک لازمی صفت کے ساتھ اس کی تعریف ہے جو اس سے الگ نہیں ہوتی۔ اس بنا پر اس کی دوسری صفات کے ساتھ بھی اس کی تعریف کی جا سکتی ہے۔ جیسے ہم یہ کہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ. (الروم ۳۰:۳۰) پس تم لوگ یک سُو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اسی طرح ہم اس کی تعریف میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام توحید کا دین ہے، یا وہ علم کا دین ہے، یا وہ عدل کا دین ہے۔ کیوں کہ اس میں یہ معانی پوری طرح موجود ہیں، وہ ان کی طرف دعوت دیتا ہے اور ان کی

تاکید کرتا ہے۔

دوسری تعریفات

۱۴- اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ہم نے اسلام کی جو مختلف تعریفیں کی ہیں یہ صرف بطور مثال چند نمونے پیش کیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام کی بس یہی تعریفیں ہیں اور ان کے علاوہ اس کی کوئی تعریف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف عبارتوں کے ساتھ اس کی کئی تعریفیں ہو سکتی ہیں۔ اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ تعریف کا مضمون صحیح ہو اور اسلام کے معنی پر منطبق ہوتی ہو۔ اور یہ کہ تعریف کے الفاظ واضح اور صحیح ہوں، ان میں کوئی التباس اور غموض یا کوئی اشتباہ نہ ہو۔

نہ تضاد نہ اختلاف

۱۵- دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ تعریفات جو ہم نے ذکر کی ہیں، یہ ساری درست ہیں۔ ان میں نہ کوئی تضاد اور تناقض ہے اور نہ اختلاف۔ ان میں سے ہر تعریف ان معانی اور مفاہیم کو بھی اپنے ضمن میں شامل کرتی یا ان کو لازم قرار دیتی ہے جو دوسری تعریفوں میں موجود ہیں۔ ان تعریفوں میں صرف لفظی اختلاف ہے۔ ان کے درمیان معنوی طور پر ایسا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس معنی کو ایک تعریف واضح کر رہی ہے وہ اس معنی سے الگ ہیں جو دوسری تعریف میں موجود ہیں۔ اس طرح کا اختلاف اس بات پر اثر انداز نہیں ہوتا کہ مختلف تعریفوں کا مضمون اور ان کی اسلام کے معانی پر دلالت ایک ہی ہے، خواہ صراحتاً ہو یا ضمناً یا استلزاماً۔

متعدد تعریفوں کا مقصد

۱۶- اسلام کی متعدد تعریفیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ داعی کے سامنے اسلام کی مختلف تعریفیں ہوں جن سے وہ اس بات پر قادر ہو سکے کہ وہ ان میں سے جس کو اپنے فہم، علم، سلامت فطرت اور درپیش شبہات کے لحاظ سے حالات کے مناسب سمجھے اس کو لے لے۔ اسی طرح داعی جن معانی و مفاہیم کی پہچان کی دوسری چیزوں سے زیادہ ضرورت محسوس کر رہا ہے ان کی پہچان حاصل کر سکے۔

ایک ایسا شخص جوشکی مزاج ہو، اس نے فلسفہ پڑھا ہوا ہو اور اس کے سامنے ہر چیز مشکوک ہو وہ جب اسلام کے بارے میں پوچھتا ہے تو مناسب یہ ہوتا ہے کہ اسے اسلام کی پانچویں تعریف کے کے مطابق جواب دیا جائے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام ان سوالات کا صحیح اور سچا جواب ہے جو انسان کو پیش آتے ہیں، یعنی ہم کہاں سے آئے؟ کیوں آئے؟ اور ہمیں کہاں جانا ہے؟ وہ کیا چیز ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں تک پہنچائی ہے؟

اس طرح وہ شخص جو قانونی امور اور معاشرتی وعمرانی علوم سے واقفیت رکھتا ہو وہ جب اسلام کے بارے میں سوال کرتا ہے تو مناسب یہ ہوتا ہے کہ اسے تیسری تعریف کے مطابق جواب دیا جائے۔ اسی طرح ایک غیر مسلم کو جب اسلام کی دعوت دی جائے اور وہ پوچھے کہ اسلام کیا ہے؟ تو اسے پہلی تعریف کے ساتھ جواب دینا مناسب ہے، اور وہ یہ کہ **الإسلام أن تِشهد أن لا إله إلا الله و أن محمدًا رسول الله**..... اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔

پسندیدہ تعریف

۱۷- ہم جس تعریف کو پسند کرتے ہیں اور اسے ارکان اسلام کے بیان کے لیے بنیاد قرار دیتے ہیں وہ وہی تعریف ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث جبریلؑ میں منقول ہے اور اسے ہم بیان کر چکے ہیں۔ وہ اُن تمام معانی کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے جو دوسری تعریفوں میں موجود ہیں۔

......☆......☆......

دوسری فصل

ارکانِ اسلام

۱۸- ہم نے حدیث جبریل اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسلام کے بارے میں جواب ذکر کیا ہے۔ اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا. اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ تم نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ دو، اور رمضان کے روزے رکھو، اور اگر راستے (یعنی جانے) کی طاقت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔

اس بنا پر مذکوہ حدیث کی روشنی میں اسلام کے ارکان تین ہیں: ایک اللہ کی وحدانیت کی گواہی دینا، دوسرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دینا اور تیسرا عمل صالح کرنا، جن میں نمایاں اعمال نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج ہیں۔ اعمال صالحہ میں ان چار کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ایک تو یہ بہت اہم ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان کو عمل صالح پر متنبہ کرنا ضروری ہے۔ پھر گواہی میں صرف لفظ پر اکتفا نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کے مضمون پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ ضرورت ہے کہ ان تین ارکان پر بحث کی جائے اس لیے ہم اس فصل کو تین حصوں میں تقسیم کریں گے۔

۱

اللہ کی وحدانیت کی شہادت

شہادت کے معنی

۱۹-شہادت سے مراد ہے: جاننا، آگاہ کرنا، خبر دینا اور بیان کرنا۔ اسی بنا پر گواہ کو شاہد کہتے ہیں کیوں کہ وہ اس بات کی خبر دیتا ہے جسے وہ جانتا ہے۔ بیان کرنا اور آگاہ کرنا جیسا کہ زبان سے ہوتا ہے اسی طرح فعل سے بھی ہوتا ہے۔ شہادت بالفعل کی ایک صورت اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ أَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شَاهِدِيْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ. (التوبۃ ۹:۱۷) مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور اور خادم بنیں درآنحالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔

یہ ان کے خلاف ان کے اپنے اعمال کی گواہی ہے۔ یعنی ان کے اعمال نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ کافر ہیں۔

کلمہ شہادت کے ضمن میں اقرار، اعتراف اور اعتقاد بھی موجود ہے۔ کیوں کہ گواہ اس بات پر عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ جس بات کی گواہی اور جس چیز کی خبر دے رہا ہے وہ صحیح ہے۔ اگر وہ ایسی بات کی گواہی دیتا ہے جس پر اسے یقین نہیں ہوتا تو اس کی گواہی جھوٹی گواہی ہوگی۔ کیوں کہ اس کی خبر اس کے عقیدے کے مطابق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِذَا جَآءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ. وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ط وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ. (المنافقون ۶۳:۱) اے نبیؐ! جب یہ منافق تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ ہاں اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس

کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔

یہ جھوٹے اس لیے ہیں کہ انھوں نے جو بات کہی ہے اس کی صحت کا نہ وہ اعتراف کرتے ہیں اور نہ اس کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس صورت میں یہ کہنا کہ 'میں گواہی دیتا ہوں' علم، معرفت، اور بیان کے معنی پر دلالت کرر ہا ہے اور اس کے ضمن میں اقرار، یقین اور اعتقاد کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔

الٰہ کے معنی

۲۰- رہا لفظ الٰہ تو اس سے مراد معبود ہے۔ اس کا استعمال معبود برحق کے لیے بھی ہوتا ہے اور معبود باطل کے لیے بھی۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں آیا ہے: أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰهُ (الجاثیہ ۴۵:۲۳) پھر کیا تم نے اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا۔

اسی طرح یہ معبود برحق کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہ اسی معنی میں آیا ہے کہ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ (محمد ۴۷:۱۹) پس خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے۔

اس حدیث میں بھی یہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے کہ أن تشهد أن لا إله إلا الله..... اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

کلمہ توحید کے معنی

۲۱- اس بنا پر کلمہ توحید أشهد أن لا إله إلا الله...... کے معنی یہ ہوں گے کہ میں جانتا ہوں، اقرار کرتا ہوں، اعتراف کرتا ہوں اور عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ معبود جو حق ہے اور جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہ کہ میں اپنے قول، فعل اور کردار سے اس کا بیان اور اظہار کروں گا۔

ایک بات یہ ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عبادت میں اکیلا سمجھنا، جسے توحید الوہیت کہتے ہیں، اس کے ضمن میں یہ بات بھی موجود ہے کہ ربوبیت میں بھی وہ اکیلا ہے۔ اس کا مطلب ہے یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہی اکیلا رب العالمین بھی ہے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک توحید کی دو قسمیں ہوئیں: ایک توحید

الوہیت اور دوسری توحید ربوبیت۔

۱- توحید الوہیت

۲۲- توحید الوہیت وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیا کو مبعوث فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ. (الانبیاء ۲۱:۲۵) ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ. (النحل ۱۶:۳۶) ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

ایک اور جگہ فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ. (المومنون ۲۳:۲۳) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں ہے۔ کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟

ایک اور مقام پر ارشاد ہے: وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ. (الاعراف ۷:۶۵) اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟

۲۳- اللہ تعالیٰ کی عبادت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ کے لیے خالص محبت ہو اور اس کے آگے مکمل سپردگی ہو۔ اس کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے: اسی پر توکل کر کے، اس پر اعتماد کر کے، اس سے خوف کھا کر، اس کی طرف مائل ہو کر، اسی سے مانگ کر، اس کے ذکر سے اُنس حاصل کر کے، اسی کی طرف بھاگ کر، اپنے اعضا کو اس کی شریعت کے نفاذ اور اس کے دین کی اقامت کے لیے چست رکھ کر، اسی کا رنگ اختیار کر کے، اس کے محبوبات کو پسند کر کے، اس کی اطاعت

کر کے اور اپنے اقوال، افعال، کردار اور تمام چیزوں کو اس رخ پر ڈال کر جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ یہ سب کچھ کر کے ایک مسلمان کلمہ أشهد أن لا إله إلا الله کو اپنے قول اور فعل سے عملی جامہ پہنا دے تو وہ اپنی شہادت میں سچا ہوتا ہے۔

۲۴- پھر آدمی کو اپنی عاجزی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی محتاجی، اور ایک لمحے کے لیے بھی اس سے مستغنی نہ ہونے کا جتنا زیادہ احساس ہوتا ہے اسی قدر عبودیت کے ان میں معانی میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی قدر اس کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ بندے کو اللہ تعالیٰ کے کمال، اس کے عظیم احسانات اور نعمتوں کی جتنی زیادہ معرفت حاصل ہوتی ہے اسی قدر اس کی اللہ سے محبت اور اس کے سامنے عاجزی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ معرفت اسے اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں غور وفکر کرے جو بے حد وبے حساب ہیں: وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (النحل ۱۶:۵۳) [تمھیں جو نعمت بھی میسر ہے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے] اسی طرح جب وہ اس کی صفات اور اسمائے حسنیٰ کے معانی میں غور وفکر کرتا ہے تب بھی اسے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

۲۵- پھر جس قدر انسان کے دل میں عبودیت کا مفہوم راسخ ہوتا ہے اسی قدر وہ غیر اللہ کی عبادت سے آزاد ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کا خالص بندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ وہ بلند ترین درجہ ہے جسے ایک انسان حاصل کرسکتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ ترین مقام پر عبودیت کی صفت کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اِس صفت سے اُس مقام پر موصوف کیا ہے جہاں آپؐ پر وحی نازل ہوتی ہے، جہاں آپؐ اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور جب آپؐ کو معراج کے لیے آسمانوں پر لے جایا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَآ أَوْحَىٰ. (النجم ۵۳:۱۰) اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اس کو پہنچانی تھی۔

وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا (الجن ۷۲:۱۹) اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔

سُبْحَانَ الَّذِيٓ أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى.

(بنی اسرائیل ۱:۱۷) پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ (دور کی مسجد) تک۔

۲-توحید ربوبیت

۲۶- لفظ رب کئی معانی پر دلالت کرتا ہے۔ ان میں ایک معنی آقا، کسی چیز کے مالک، اس کے ایجاد کرنے والے اور اس میں تصرف کرنے والے، انسان کی مصلحتوں کی کفالت کرنے والے اور ایسے صاحب اقتدار و صاحب قیادت کے ہیں جس کا حکم دوسروں کے بارے میں نافذ ہوتا ہے۔ ربوبیت کے یہ معانی، اور اس کے ضمن میں یا اس کے لوازمات میں موجود دوسرے معانی کی حالت یہ ہے کہ ان سے نہ اللہ کے سوا کوئی حقیقتاً موصوف ہوسکتا ہے اور نہ کوئی ان کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوقات ہیں وہ اللہ کی ربوبیت کے آگے تسلیم ہیں۔ ان میں اگر ربوبیت کے معانی میں کوئی معنی پائے جائیں تو وہ حقیقتاً نہیں ہوتے بلکہ مجازی طور پر ہوتے ہیں۔ اللہ کے سوا جو بھی ہے وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ اسی سے وہ اپنا وجود و بقا بھی اخذ کرتا ہے اور وہ باقی صفات کمال بھی جو مخلوق کی صفات کے مناسب ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فی الحقیقت رب العالمین ہے، اس کے علاوہ کوئی رب نہیں ہے۔ وہی خالق ہے، وہی مارنے والا ہے، وہی تمام مخلوقات میں اپنے احکام و اوامر کو نافذ کرتا ہے، اسی کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جیسا چاہتا ہے کائنات میں تصرف کرتا ہے، کوئی اس کے حکم یا اس کے کسی کام کا پیچھا کرنے والا نہیں۔ دوسری طرف وہ اپنی مخلوقات کے حالات کی نگرانی کر رہا ہے اور ان کے مفادات کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ نفع و نقصان پر قادر ہے۔ وہ جب کسی کو نفع پہنچانا چاہے تو کوئی اس کو روکنے والا نہیں اور اگر وہ کسی کے ساتھ اس کے علاوہ سلوک کرنا چاہے تب بھی کوئی اس سے نہیں پوچھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (الانعام ۶:۱۷) اگر اللہ تمھیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمھیں اس نقصان سے بچا سکے، اور اگر وہ تمھیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

صرف اور اکیلا وہی اللہ تعالیٰ ہے جو عطا کرتا اور منع کرتا ہے اور جو نفع اور نقصان دیتا ہے۔ اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ اللہ کے سامنے فقیر اور محتاج ہے: يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ إِلَى اللّٰهِ. (فاطر ۳۵:۱۵) لوگو!

تم ہی اللہ کے محتاج ہو۔

فقر اسی طرح ہر مخلوق کا وصف ذاتی ہے، جیسا کہ 'غنا' اللہ رب العالمین کے لیے وصف ذاتی ہے۔

توحید ربوبیت کے دلائل

۲۷- اللہ کی ربوبیت اور اس کے اکیلے رب ہونے اور کسی کا اِس میں اُس کے ساتھ شریک نہ ہونے کے دلائل بہت زیادہ ہیں۔ کائنات میں ایک چھوٹے سے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے اجرام فلکی تک کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے کہ وہ اس بات کی گواہی نہ دے رہی ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی رب العالمین ہے، اور نتیجتاً وہی تمام جہانوں کا الٰہ ہے...... یہ عجیب وغریب، باہم جڑی ہوئی اور منظم کائنات بزبان حال کہہ رہی ہے کہ اس کا ایک عظیم خالق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ عقل سلیم کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کائنات کے وجود کے بارے میں یہ تصور کرے کہ یہ بغیر کسی موجد کے وجود میں آئی ہے۔ اس تصور کی قبولیت ہر عقل صحیح کے خلاف ہے۔ ہماری عقل اس بات سے انکار کرتی ہے کہ اس شخص کی بات کو قبول کرے جو کہتا ہے کہ یہ گھر ایک حادثے کو طور پر وجود میں آیا ہے۔ مثلاً یہ کہ یہاں مٹی کا ایک ڈھیر تھا۔ بارش ہوئی اور اس سے باقی مٹی بہہ گئی مگر یہ دیواریں اسی طرح قائم رہیں اور کمرے بن گئے۔ اسی طرح ہماری عقل اس بات کو بھی مسترد کرتی ہے کہ کوئی کہے: یہ کتاب اس طرح بنی ہے کہ لوہے کے کچھ ٹکڑے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ پھر حرارت کی وجہ سے وہ پگھل گئے اور ان کے حروف بن گئے۔ پھر یہ حروف آپس میں جمع ہو گئے اور ان پر کوئی سیاہی گر گئی۔ اس کے بعد لکڑی کی ایک خمیر بن گئی اور وہ اس طرح کہ بارشوں کی وجہ سے درخت گر گئے اور اور نرم ہو گئے۔ پھر یہ خمیر کاغذ کے صفحات میں ڈھل کر خشک ہو گئی۔ پھر یہ صفحات ہوا میں اُڑ کر لوہے کے بنے ہوئے حروف پر جا گرے اور وہ حروف صفحات کے اوپر طبع ہو گئے۔ پھر ہوا نے ان صفحات کی ترتیب ٹھیک کر دی اور اس طرح یہ کتاب تیار ہو گئی۔ اس بات کی کوئی صاحب عقل تصدیق نہیں کر سکتا۔ تو پھر کوئی یہ تصور کیسے کر سکتا ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات، یہ حیران کن انسان، اور یہ عجیب وغریب مخلوقات، جو حیوانات اور نباتات کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، یہ بغیر کسی موجد اور بغیر کسی مدبر و منتظم کے خود بخود وجود میں آئی ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کو کبھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک طالب علم نے مجھ سے پوچھا: یہ بات کیوں ممکن نہیں ہے کہ یہ

کائنات مادیاتی ردعمل کے طور پر ایک حادثے کے ساتھ وجود میں آئی ہو؟ میں نے اسے جواب دیا: یہ تختہ سیاہ جو آپ کے سامنے ہے اور اس کے اوپر کچھ لکھائی ہوئی ہے۔ اگر ایک انسان کہے کہ یہ سطریں جو تختہ سیاہ پر لکھی ہوئی ہیں ان کو کسی کاتب نے نہیں لکھا بلکہ یہ حادثاتی طور پر وجود میں آئی ہیں، اور وہ اس طرح کہ ہوا میں مٹی کے کچھ ذرات اُڑ رہے تھے جو کمرے کی کھڑکیوں سے داخل ہو کر تختہ سیاہ کے اوپر گر گئے ہیں اور ان سے یہ سطریں وجود میں آئی ہیں جن کو پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ کیا کسی عقل مند کے لیے ممکن ہے کہ اس بات کو قبول کر لے؟ اس نے کہا: نہیں۔ میں نے کہا: پھر ایک عقل سلیم کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس بات کی تصدیق کرے کہ ایک اندھے بہرے مادے نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے، یا یہ کہ یہ کائنات ایک دھماکے سے اس مادے سے وجود میں آئی ہے؟

اس بنا پر اللہ کی ربوبیت کا اقرار اور اس کو اکیلا سمجھنا انسانوں کے ہاں ایک عام معاملہ ہے اور یہ چیز انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے۔ اس کا اعتراف مشرک بھی کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَأَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (الزخرف ۴۳: ۸۷) اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ تو پھر یہ کہاں پھرائے جا رہے ہیں۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ. (الزخرف ۴۳: ۹) اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ انھیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔

قرآن اور توحید ربوبیت

۲۸- قرآن توحید ربوبیت کو دلوں میں راسخ کرتا ہے۔ وہ اپنی آیات میں لوگوں کو اس چیز کی یاد دلاتا ہے جو ان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے اور اس کو ان کے دلوں میں مضبوط کرتا ہے۔ وہ چیز یہ ہے کہ اللہ ہی رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ. (ابراہیم ۱۴: ۱۰) ان کے رسولوں نے کہا: کیا خدا کے بارے میں (تمھیں) شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے؟

جو شخص زبان سے اپنے خالق کے وجود سے انکار کرتا ہے وہ بھی باطن میں اس کے وجود کا یقین رکھتا ہے۔ اس طرح کے عنادی اور منکر لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا. (النمل ۲۷:۱۴) انھوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالاں کہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔

معلوم ہوا کہ بعض لوگ وجود خالق کے منکر ہوتے ہیں تو اس کی وجہ محض ان کا عناد اور تکبر ہوتا ہے ورنہ انسان کی فطرت اس عمیق احساس سے کبھی خالی نہیں ہوتی کہ خالق موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی فطرت سے جب عناد کے پردے چھٹ جاتے ہیں اور اس کا کبر وغرور ختم ہو جاتا ہے تو وہ بے اختیاری میں اپنے آپ کو اللہ کی طرف متوجہ پاتا ہے اور وہ ببانگ دہل اس کا اعلان کرتا ہے اور اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کو محسوس کرتا ہے۔ میں نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ایک مجلّے میں ایک بات پڑھی۔ ایک صحافی نے کسی ہواباز سے انٹرویو کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ ڈیوٹی کے دوران میں سب سے مشکل لمحات کون سے تھے اور اس مشکل وقت میں اس کے احساسات کیا تھے؟ اس نے جواب دیا: میں ایک ایسے گھرانے میں پلا بڑھا ہوں جہاں مجھے اللہ کی طرف متوجہ کرنے کا کوئی سامان مہیا نہ تھا۔ میرا باپ ملحد تھا اور اس نے مجھے الحاد ہی سکھایا۔ میں ہر اس بات سے انکار کرتا تھا جسے میرے حواس محسوس نہ کرتے۔ اپنی عسکری ذمہ داریوں کو انجام دیتے وقت میں محسوس کرتا تھا کہ قریب ہے میرا جہاز گر جائے اور میری موت حتمی ہو جائے۔ اگر میں جہاز گرنے سے نہ بھی مرا تو زمین پر پہنچتے ہی دشمن کے ہاتھوں مارا جاؤں گا۔ وہ آگے کہتا ہے کہ میں نے اس مشکل وقت میں کبھی اس بات پر توجہ نہ دی کہ زمین پر میرا اہل وعیال ہے، میرے رشتہ دار ہیں، میرے دوست احباب ہیں، میری بیوی ہے۔ مگر اس کے باوجود میں نے بے اختیاری میں اپنے آپ کو اللہ کی طرف متوجہ پایا۔ میں نے زور سے اس کا نام پکارا اور اس سے مدد طلب کی۔ اس طرح میں حیران کن طور پر نجات پا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہے، جس کے بارے میں مَیں نے اپنی زندگی کے تیس سالوں میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

میرے خیال میں یہ واقعہ بالکل صحیح ہے کیوں کہ ایک تو اس کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ اس طرح کے سینکڑوں واقعات روز روز مختلف شکلوں میں پیش آتے ہیں۔ ایک انسان جو خدا سے غافل اور اس کو بھولا ہوا ہو، جس کے ذہن میں کبھی خدا کا خیال بھی نہ آیا ہو، کبھی کبھی جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے یا

اپنے آپ کو مشکل میں محسوس کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اللہ کی طرف توجہ کرنے پر مجبور پاتا ہے۔

ایک مریض جو اپنے بستر پر اونگھ رہا ہوتا ہے، یا وہ کمرۂ جراحت (operation theatre) میں ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو جہاز میں سوار ہوتا ہے اور جہاز کا کپتان اسے خبر دیتا ہے کہ جہاز کو ایک خطرہ درپیش ہے، اس وقت اس کے دل میں اللہ کے سوا کسی کا خیال نہیں گزرتا۔ وہ اسی سے مدد مانگتا ہے اور اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے بارے میں خبر دیتے ہوئے بالکل سچ کہا ہے:

وَإِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَّمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ. (لقمان ۳۱:۳۲) اور جب (سمندر میں) ان لوگوں پر ایک موج سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے۔ پھر جب وہ بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اقتصاد برتتا ہے۔ اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکرا ہوتا ہے۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ. (العنکبوت ۲۹:۶۵) جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں۔ پھر جب وہ انھیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں۔

اللہ کے وجود کا مسئلہ ان بدیہیات میں سے ہے کہ اس کی طرح کا کوئی اور بدیہی امر موجود نہیں ہے جو اس قدر واضح اور ظاہر ہو۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جب تک یہ مسئلہ ذہن میں صحیح نہیں ہوتا اس وقت تک اس کے علاوہ کوئی اور مسئلہ بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر اتنے زیادہ اور متنوع دلائل موجود ہوں جتنے اللہ تعالیٰ کے وجود کے مسئلے میں ہیں۔

توحید ربوبیت اور توحید الوہیت کا لزوم

۲۹- توحید ربوبیت، اور اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے اکیلا سمجھنا قطعی طور پر توحید الوہیت یعنی اس بات کو مستلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عبادت میں اکیلا سمجھا جائے اور اسی کو واحد معبود برحق مانا جائے، جس کے سوا کوئی اور عبادت کا

مستحق نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم مشرکین کو نصیحت کرتا ہے کہ توحید ربوبیت اختیار کریں اور اس کو اللہ کے لیے مخصوص کریں۔ اس لیے کہ یہ توحید الوہیت کو مستلزم ہے۔ یہ ایک درست، واضح اور صحیح مسلک ہے۔ اس سے غفلت برتنا اور دوسری غیر واضح اور غیر معقول مسلکوں کو اس کا بدل سمجھنا درست نہیں ہے۔

اس کے بارے میں جو قرآنی نصوص وارد ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُونَ. (الاعراف ۷:۱۹۱) کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔

أَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ. (النحل ۱۶:۱۷) پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، دونوں یکساں ہیں؟ کیا تم ہوش میں نہیں آتے۔

يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهُ وَإِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ. (الحج ۲۲:۷۳) لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو، جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔

یہ آیات مشرکین کو ایک وضح حقیقت کی طرف متوجہ کر رہی ہیں اور وہ یہ کہ اللہ کے سوا ان کے جو معبود ہیں وہ عاجز ہیں، وہ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ وہ مکھی جیسی چھوٹی چیز کو بھی تخلیق کریں اور تخلیق کرنا تو دور کی بات ہے، اگر مکھی ان سے کوئی چیز اُچک لے جائے تو اسے بھی نہیں چھڑا سکتے۔ پھر ایک عقل سلیم اس بات کی اجازت کیسے دے سکتی ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی جائے اور اسے اللہ کے ساتھ برابر کیا جائے، حالانکہ وہی اکیلا خالق ہے اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ عاجز اور ضعیف مخلوق ہے۔

قرآن کریم مشرکین کے سامنے یہ دلیل پیش کرتا ہے اور انھیں یاد دلاتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا جن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں وہ آسمان اور زمین میں ایک ذرے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ وہ آسمان اور زمین میں اللہ کے ساتھ ایک ذرے کے برابر کسی چیز میں شریک نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے معبودانِ باطلہ کی نہ

کوئی ضرورت ہے اور نہ وہ اس کی کوئی مدد کر سکتے ہیں۔ اور جب معاملہ اس طرح ہے جیسا کہ ان کو علم ہے تو ان پر یہ بات لازم ہے کہ وہ عبادت کو اللہ کے لیے خالص کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهُ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ. (سبا ۳۴:۲۲) کہو کہ پکار کر دیکھو اپنے ان معبودوں کو جنھیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھ بیٹھے ہو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں نہ زمین میں۔ وہ آسمان و زمین کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اللہ کی مددگار بھی نہیں ہے۔

قرآن کریم بعض حقائق کی تائید کرتا ہے جن کے مشرکین معترف ہیں اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، وہی ان میں تصرف کرتا ہے اور وہی مدد چاہنے والوں کو مدد فراہم کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ. قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ. سَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُوْنَ. قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَأَنّٰى تُسْحَرُوْنَ. بَلْ أَتَيْنَاهُمْ بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ. (المومنون ۲۳:۸۴-۹۰) ان سے کہو: بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے۔ یہ ضرور کہیں گے: اللہ کی۔ کہو، پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے؟ ان سے پوچھو: ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے: اللہ۔ کہو: پھر تم ڈرتے کیوں نہیں؟ ان سے کہو: بتاؤ اگر تم جانتے ہو، کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ بات تو اللہ کے لیے ہے۔ کہو: پھر کہاں سے تم کو دھوکہ لگتا ہے؟ جو امرِ حق ہے وہ ہم ان کے سامنے لے آئے ہیں، اور کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

جدید سائنس اور عقیدۂ توحید

۳۰- کائنات، ایٹم، انسان، نباتات، فنون، انکشافات اور ایجادات کے بارے میں جدید سائنس بھی

عقیدہ توحید کی تائید کرتی ہے۔ وہ ایک مومن کے ایمان میں اضافے کا ذریعہ بنتی ہے۔ کیوں کہ وہ نظام کائنات کی باریکیوں، مخلوقات الٰہی کے عجائبات اور اللہ تعالیٰ کی اس کاریگری سے پردہ اُٹھاتی ہے جو اس کی عظمت اور وسیع علم وقدرت کی نشانی ہے۔ کسی چیز کی خوشنمائی اور حسن اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا عظیم ہے اور اس عمدہ تخلیق کے پیچھے کسی عظیم کاریگر کی مہارت کارفرما ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا:

سَنُرِيهِمْ آيٰتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ. (حٰمٓ السجدة ۴۱:۵۳) عن قریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔

وَفِيٓ أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. (الذاریات ۵۱:۲۱) اور خود تمھارے وجود میں، کیا تم کو سوجھتا نہیں ہے؟

اسلام میں توحید کا مقام

۳۱- اسلام میں توحید ہی اصل چیز ہے، گویا کہ سارا کا سارا اسلام توحید ہے۔ قرآن پورا توحید کے گرد گھومتا ہے۔ قرآنی آیات یا تو اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، اس کی تخلیقات، اس کے افعال اور اس کی تدبیروں پر مشتمل ہیں یا امر و نہی پر، اور یہ دونوں بھی اللہ کی ربوبیت اور مخلوق پر اس کی قوامیت کے لوازم میں سے ہیں؛ یا پھر ثواب کی مختلف قسموں کا بیان ہے، اور یہ اس شخص کی جزا کا نام ہے جو اس کی اطاعت کرتا ہے یا اس کے ان رسولوں کی پیروی کرتا ہے، جنھیں اللہ تعالیٰ توحید الوہیت و ربوبیت پر مبنی شریعت دے کر بھیجتا ہے؛ یا پھر ان میں سزا کی مختلف قسموں کا بیان ہوتا ہے، اور یہ ان لوگوں کی جزا ہے جو اس کی شریعت کے خلاف چلتے ہیں؛ یا گذشتہ مکذبین کے احوال کا ذکر ہوتا ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی وحدانیت اور اس کے تقاضوں پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

معلوم ہوا کہ توحید اسلام کا خلاصہ اور اس کی بنیاد ہے۔ اسی سے اسلام کے سارے نظام، اس کے اوامر و نواہی اور اس کے طریق کار کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اس میں جو عبادات اور احکام ہیں وہ توحید کو راسخ اور مضبوط کرتے ہیں اور اسے مومنوں کے دلوں میں اچھی طرح بٹھاتے ہیں۔

۲

رسالتِ محمدیہ کی شہادت

اس شہادت کے معنی

۳۲- یہ گواہی اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ اس کے معنی ہیں: اس بات کا علم، تصدیق اور پختہ عقیدہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور اس بات کا اعلان و اظہار کرنا قول کے ساتھ بھی اور عمل کے ساتھ بھی۔ قول کے ساتھ اظہار یہ ہے کہ اس گواہی کو زبان سے ادا کریں اور عمل کے ساتھ اس کے اظہار کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے کردار سے اور اپنے تمام قولی اور عملی اقدامات سے اس چیز کے قیام کی کوشش کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف سے اس مقصد کے لیے لے کر آئے ہیں کہ لوگ اس کا اتباع کریں اور انھیں اس اعتبار سے قبول کریں کہ یہ اللہ کے رسول کی ہدایات ہیں۔

اللہ کے رسول بہت ہیں

۳۳- اللہ کے رسول جنھیں اللہ نے انسانوں کے پاس بھیجا ہے بہت سے ہیں۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کے واقعات اللہ تعالیٰ نے ہمیں بیان کیے ہیں اور ہم انھیں نام بہ نام پہچانتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے ہمیں نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ. (النحل ۱۶:۳۶) ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کردیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

دنیا میں جتنی قومیں گزری ہیں ان میں سے ہر ایک کے پاس نبی آیا ہے۔ مگر بعض اوقات ہمیں ان کا علم نہیں ہوتا کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے ناموں اور ان کے پیغامات کا علم نہیں دیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا. (النساء۴:۱۶۴) ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ہم نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔

رسول بھیجنے کی ضرورت

۳۴- وہ نظریہ جو رسولوں کی بعثت کے پیچھے کارفرما ہے اور جس کی بنا پر اس بات کی ضرورت پڑتی ہے کہ انھیں لوگوں کے پاس مبعوث کیا جائے، اس کی بنیاد اسی بات پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ الوہیت و ربوبیت میں اکیلا ہے۔ وہ تمام عالمین کا رب اور ان کا الٰہ ہے۔ اللہ کے سوا نہ ان کا کوئی معبود ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی رب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت کے ساتھ یہ بات لازم ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے معاملات کی تدبیر کرے، ان کی مصلحتوں کی حفاظت کرے، ان کی اصلاح کرے، ان کی حالت کو درست کرے اور امر و نہی کے ذریعے ان کی زندگی کی درست منصوبہ بندی کرے۔

یہ بات کسی شک و شبہے سے بالاتر ہے کہ انسان کو صرف غذا یا اس طرح کی ان اشیا کی ضرورت نہیں ہوتی جو اس کی جسمانی زندگی کے بقا کے لیے ضروری ہوتی ہیں، بلکہ اسے ان چیزوں کی بھی ضرورت ہے جو اس کی روحانی ضروریات کو پورا کریں۔ کیوں کہ اس کی روح ہی تو ہے جس کے ذریعے وہ دوسری مخلوقات سے ممتاز ہے۔ اسی طرح اسے ان چیزوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اسے بحیثیت انسان اپنے کمال تک پہنچاتی ہیں۔

اس بنا پر انسان کی اہم ترین مصلحت یہ ہے اس کا خالق اور اس کا معبود سعادت اور کمال کے اس درجے تک پہنچنے کے لیے اس کی رہنمائی کرے جو اس کے لیے مقرر ہے، اسے اس تک پہنچنے کا راستہ دکھائے اور اسے صراط مستقیم پر ڈال دے، جس پر قائم رہتے ہوئے وہ نہ گمراہ ہوتا ہے اور نہ اس کی قسمت ماری جاتی ہے۔

چوں کہ یہ امور انسان اپنے طور پر صحیح طریقے سے نہیں سمجھ سکتا، اس لیے کہ یہ چیزیں اس کی قدرت سے باہر ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ انسانوں کے سامنے ان کی جنس سے رسولوں کو مبعوث کیا جائے، جو ان کے ساتھ ان کی زبان میں بات کریں اور ان تک اللہ کے پیغامات پہنچائیں۔ وہ انھیں ان پیغامات کی پہچان کرائیں اور ان کے سامنے اس مقصد تک پہنچنے کے راستے واضح کریں۔ وہ انھیں وہ راستہ دکھائیں جس سے ان کو دنیا اور آخرت کی زندگی میں سعادت نصیب ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ پر بحیثیت رب اور الٰہ ایمان لانے کے ساتھ یہ بات لازم ہے کہ اس کے رسولوں کا عقیدہ رکھا جائے۔ جو شخص اللہ کے رسولوں کا انکار کرتا ہے تو اس کے ضمن میں گویا وہ اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان کی حقیقت سے جاہل ہوں۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی شان کو کم کرنے کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ اللہ کی قدر نہیں پہچانتا۔

یہی وجہ ہے کہ رسولوں سے انکار بھی کفر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ إِذْ قَالُوْا مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ. (الانعام ۶:۹۱) ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔

نبوت ورسالت کا اختتام

۳۵- اللہ تعالیٰ نے رسالت اسلامی کے ذریعے سلسلۂ رسالت کا اختتام فرمایا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا اور انھیں خاتم الانبیاء والمرسلین بنایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ. (الاحزاب ۳۳:۴۰) محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

سلسلۂ رسالت کا اختتام اسلام کے اس رسالت سے ہوا جو دائمی اور ابدی رسالت ہے۔ کیوں کہ اس میں کمال ہے اور یہ قیامت کے دن تک انسان کی تمام ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ اس وجہ سے اب کسی اور رسالت کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْإِسْلَامَ دِیْنًا.

(المائدة۵:۳) آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

نبوت محمدیہ کے دلائل

۳۶- ہم نے یہ بات کہی ہے کی رسولوں کا بھیجنا اللہ کی ربوبیت اور الوہیت کے لوازمات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس رسول کو بھی کسی قوم کے پاس بھیجا ہے تو ساتھ ہی اس کی ایسے دلائل کے ساتھ تائید بھی کی ہے جو اس کی صداقت اور نبوت پر دلالت کرتے ہیں۔

نبوت محمدیہ کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ کوئی دلیل بھی جو کسی نبی کی نبوت کے اثبات کے لیے قائم کی جا سکتی ہے وہ اس سے بہتر اور احسن واکمل انداز میں نبوت محمدیہ پر دلالت کرتی ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں ان سے زیادہ واضح اور بڑی تعداد میں دلائل موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص حضرت موسیٰ یا عیسیٰ یا کسی اور نبی کی نبوت پر ایمان لاتا ہے اور نبوت محمدیہ سے انکار کرتا ہے تو اس سے خود اس کے اپنے دل میں بھی تضاد ہوگا اور حقائق کے بارے میں بھی تضاد سے دوچار ہوگا۔ اس کا ایمان وانکار جہالت، تعصب اور تقلید بلا دلیل و برہان کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ کیوں کہ وہ بات جس نے اسے کسی بھی نبی یا رسول کی نبوت ماننے پر آمادہ کیا ہے وہ بات اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نبوت محمدیہ میں پائی جاتی ہے۔

ایسے شخص کی مثال یوں ہوگی جیسے ایک شخص یہ سمجھے کہ فلاں آدمی علم طب جانتا ہے کیوں کہ وہ میڈیکل کالج کے سال اول میں پڑھتا ہے، مگر اس طالب علم کا استاذ جو اس طرح کے دسیوں بچوں کو کئی سالوں سے طب کی تعلیم دیتا ہے، وہ علم طب کو نہیں جانتا۔ ان میں سے ایک بات کو ماننا اور دوسری کو نہ ماننا صریح تضاد ہے۔ اس طرح کا عقیدہ اس شخص کے سوا کوئی نہیں رکھ سکتا جو جہالت اور تعصب کا شکار ہو۔

اس عمومی بات کے ساتھ مفید معلوم ہوتا ہے کہ نبوت محمدیہ کے اثبات میں کچھ دلائل پیش کیے جائیں۔ ان میں سے ایک دلیل ولادت سے لے کر وفات تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے۔ یہ پاکیزہ اور معطر سیرت، جس کا صاحب کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کے بارے میں وہ دعویٰ کرے جو اس میں موجود نہ ہو۔ جو لوگ عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے مالک ہوتے ہیں ان کے لیے یہ ایک ہی دلیل کافی ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے

اس دلیل سے اس وقت استدلال کیا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غارِ حرا میں جبریل علیہ السلام کی آمد اور پہلی وحی کا واقعہ بتایا تھا۔ اس وقت حضرت خدیجہؓ نے آپؐ سے جو باتیں کہی تھیں ان میں ایک یہ تھی: ''مبارک ہو۔ اللہ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ آپ معذوروں کو سواری پر بٹھاتے ہیں، کمزور کی مدد کرتے ہیں......'' انھوں نے آپؐ کی سیرت طیبہ اور صفات عالیہ میں سے اس طرح کی چند اور چیزوں کا بھی ذکر کیا۔

نبوتِ محمد یہ کے ثبوت کی ایک دلیل یہ عظیم شریعت اور اس کے مختلف پہلو ہیں جن کا ایک امی محض آدمی سے ظاہر ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اور امی بھی وہ جو عرب کے اس معروف معاشرے میں رہا ہو۔ اگر یہ وحی الٰہی نہ ہوتی تو کسی کے لیے ممکن نہ ہوتا کہ وہ اس طرح کی شریعت لے کر آئے، خواہ اس کی عقلی پختگی کتنی ہی زیادہ ہو اور اس کا فکری افق کتنا ہی وسیع ہو۔ اس دلیل کو سمجھنے والے اور اس کی قدر پہچاننے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو قانون، عمرانیات اور دوسرے علوم کو جانتے ہیں۔

نبوت محمد یہ کی سب سے بڑی دلیل، جو اَب تک قائم ہے اور ہمارے درمیان موجود ہے وہ یہ قرآن ہے، جس کا اعجاز بے شمار دلائل سے ثابت ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دلیل کو الگ سے ذکر کیا جائے۔

۱- اعجاز قرآن

۳۷- جو لوگ اسلام کی تاریخ سے واقف ہیں ان کے سامنے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اہل مکہ اور خاص طور پر قریش نے اسلام کی دعوت کا سخت مقابلہ کیا۔ انھوں نے پہلے پہل نبوت محمد یہ کا اعتراف نہیں کیا۔ انھوں نے اس بات سے انکار کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان جو دلیل بازی ہوئی ان میں آپؐ کی طرف سے ایک دلیل یہ تھی کہ آپؐ نے ان کو قرآن کے ذریعے چیلنج کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وحی کی اور اس کی روشنی میں آپؐ نے ان کو چیلنج کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۸۸) کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب مل کر ایک دوسرے کے لیے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔

اس چیلنج سے مخالفین خاموش ہو گئے۔ وہ اس کے توڑ یا اس کا جواب دینے سے عاجز آ گئے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک اور چیلنج دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک اور چیلنج دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَّادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّنْ دُونِ اللّٰهِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ. (ہود ۱۱:۱۳) کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو: اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ۔ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمھارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انھیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو۔

اس سے بھی وہ خاموش رہ گئے اور اس کا جواب دینے سے بھی عاجز آ گئے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرا چیلنج دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ أَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِينَ. أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّنْ دُونِ اللّٰهِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ. (یونس ۱۰:۳۷-۳۸) اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی اور تعلیم کے بغیر تصنیف کر لی جائے۔ بلکہ یہ تو پہلے جو کچھ آ چکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو: اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلا لو۔

اور وَإِنْ كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ. فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ. (البقرۃ ۲:۲۳-۲۴) اور اگر تمھیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اُتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اس آگ سے، جس کا ایندھن

بنیں گے انسان اور پتھر، جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لیے۔

سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قریش اور باقی مخالفین کو اس بار بار چیلنج کا نتیجہ کیا تھا؟ اس کے جواب میں مَیں کہتا ہوں: اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مخالفین خاموش ہو گئے اور وہ اس کے توڑ یا اس کا جواب دینے سے عاجز آ گئے۔ وہ ایسے خاموش ہو گئے جیسے وہ پتھر یا دیوار ہوں۔ انھوں نے دوسرے راستوں کو اپنانا شروع کیا جن کی بنیاد کذب وافترا پر تھی، یا وہ لوگوں کو زبردستی اللہ کے راستے سے روکتے تھے۔ جو لوگ ان کے زیر اثر ہوتے تھے ان پر یہ لوگ تاکید کرتے تھے کہ وہ قرآن کو نہ سنیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر اس کا کوئی اثر ہو جائے۔ ان کے اس طریق کار کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَاتَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ. (حٰم السجدۃ ۴۱:۲۶)

یہ منکرین حق کہتے ہیں: اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو، شاید کہ اسی طرح تم غالب آ جاؤ۔

قرآن کا اپنے مخالفین کو چیلنج

۳۸- ایک چیلنج جب کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں وہ شخص خاموش رہتا ہے جس کے سامنے یہ چیلنج پیش کیا گیا ہوتا ہے تو یہ اس بات کی واضح دلیل ہوتی ہے کہ چیلنج دینے والا اپنی بات میں سچا ہے اور وہ اپنے بارے میں جو دعویٰ کرتا ہے وہ درست دعویٰ ہے۔ اسی طرح یہ اس بات کی بھی دلیل ہوتی ہے کہ جس کو چیلنج کیا گیا تھا اس کا دعویٰ غلط ہے۔ مگر یہ دلالت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ یہ چیلنج ان ضروری شرائط پر پوری نہ اُترے جو اس دلالت یا اس نتیجے کے لیے درکار ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے قریش کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی جو چیلنج پیش کیا تھا کیا اس میں یہ شرائط پائی جاتی ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ چیلنج کی مطلوبہ شرائط کیا ہیں؟ ذیل میں ہم پہلے یہ شرائط بیان کریں گے۔

چیلنج کی شرائط

۱- پہلی شرط یہ ہے کہ چیلنج کا موضوع ان لوگوں کی قدرت اور دسترس میں ہو جن کو چیلنج کیا گیا ہے، بلکہ وہ

ان کے اختصاص (specialization) میں داخل ہو۔ انھیں اس میں مہارت، فوقیت اور شہرت حاصل ہو۔ مثلاً یہ کہ ایک پہلوان دوسرے پہلوانوں کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ کُشتی میں بہت بڑا تجربہ اور مہارت رکھتا ہے۔ اگر کسی کو اس میں شک ہو تو وہ میرے ساتھ کُشتی کھیل کر دیکھ لے۔ یہاں چیلنج کا موضوع کُشتی ہے اور یہ ان لوگوں کی مہارت و اختصاص میں داخل ہے جن کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔

۲- چیلنج کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کو چیلنج کیا گیا ہے وہ اس میں مکمل طور پر دلچسپی بھی رکھتے ہیں اور انھیں اس بات کا بہت زیادہ شوق بھی ہو کہ وہ چیلنج دینے والے کے دعوے کو باطل کر دیں اور اس کے چیلنج کا منہ توڑ جواب دے دیں۔ چنانچہ چیلنج کی صحت اور اس کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے پہلی شرط ہی کافی نہیں ہے۔ بعض اوقات ہوتا یہ ہے کہ جن لوگوں کو چیلنج کیا گیا ہے وہ چیلنج دینے والے کا جواب دینے کی رغبت اور شوق نہیں رکھتے، اس لیے وہ خاموش رہتے ہیں اور اس کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ اس مقام پر ان کا سکوت ان کی کمزوری کی دلیل نہیں ہوتا، اسی طرح وہ چیلنج کرنے والے کی صداقت کی دلیل بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر پہلوانوں میں کوئی ایسا پہلوان بھی ہو کہ وہ چیلنج کرنے والے کے چیلنج کا توڑ کر سکتا ہو مگر وہ اس میں رغبت نہ رکھتا ہو، مثلاً وہ چیلنج کرنے والے کا بیٹا، یا اس کا بھائی یا کوئی دوست ہو، یا یہ کہ چیلنج کرنے والا ان لوگوں کی نظر میں کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو اور وہ ان کی طرف سے کسی جواب کا بھی مستحق نہ ہو۔

۳- چیلنج کی تیسری شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کو چیلنج کیا گیا ہے ان کے سامنے کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہ ہو جو اِن کو اس چیلنج کا جواب دینے سے روک رہی ہو۔ رکاوٹ سے میری مراد یہ ہے کہ مثلاً چیلنج کرنے والے کی طرف سے خوف ہو کہ وہ بعد میں مجھ پر ہاتھ ڈالے گا اور اس کی طرف سے مجھے کوئی نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ چیلنج کی صحت کے لیے اگر یہ تیسری شرط موجود نہ ہو تو پہلی دو شرطیں بھی کافی نہیں ہیں۔ اگر ایک شخص اپنے مخالفین اور مد مقابل لوگوں کو اس بات کا چیلنج دے کہ میں ہی عوام کا اعتماد رکھتا ہوں اور عوام میرے سوا کسی کو منتخب نہیں کرتے اور میرے مقابلے میں کسی پر راضی نہیں ہوتے کہ وہ صدر مملکت بن جائے۔ وہ ہر اس شخص کو جو اس کی بات کو تسلیم نہیں کرتا، یہ چیلنج دیتا ہے کہ وہ آئندہ صدارتی انتخابات میں امیدوار بن جائے۔ جب سارے لوگ اس کے چیلنج پر خاموش رہیں اور کوئی بھی اس کے مواخذے اور اس کی قوت واقتدار کے خوف سے اپنے آپ کو امیدوار کے طور پر سامنے نہ لائے،

کیوں کہ وہ ملک کے سیاہ وسفید کا مالک ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، تو یہ سکوت اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ چیلنج دینے والے نے جو چیلنج دیا ہے وہ صحیح ہے۔

یہ وہ ضروری شرائط ہیں جو چیلنج کے قیام، اس کی صحت اور اس کی نتیجہ خیزی کے لیے درکار ہوتی ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ شرائط قرآن کے اس علانیہ چیلنج میں موجود ہیں جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مشرکین کو دیا تھا؟

قرآن کے چیلنج میں یہ شرائط

۳۹- ہم نے چیلنج کے لیے جن شرائط کا ذکر کیا ہے وہ سب قرآن کے اپنے مخالفین کو دیے گئے چیلنج میں موجود ہیں۔ ذیل میں ہم اس کی تھوڑی سی تفصیل بیان کریں گے۔

۱- پہلی شرط یہ تھی کہ چیلنج کا موضوع اس شخص کے اختصاص میں داخل ہو جسے چیلنج کیا گیا ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ قریش اور باقی عرب فصاحت و بلاغت میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور وہ عربی زبان میں بڑی مہارت کے مالک تھے۔ وہ اس میں خطابت، شعروشاعری، نظم ونثر اور مزاح نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ حتّٰی کہ ان کے ہاں بعض ادبی تقریبات منعقد ہوتی تھیں جن میں وہ بہترین اشعار کا انتخاب کرتے تھے۔

اسی طرح یہ بات بھی معلوم ہے کہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں نازل کیا ہے، جو ان کی اپنی زبان تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی زبان کے ساتھ چیلنج کیا اور انھیں کہا کہ اگر تم اس قرآن کے بارے میں کسی شک میں مبتلا ہو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے تو اس کی طرح کا قرآن یا اس کی محض دس سورتیں، یا ایک ہی سورت بنالاؤ۔ چنانچہ قرآن اُن کو ایک ایسی چیز کا چیلنج دے رہا ہے جو ان کے موضوعِ اختصاص میں اور اس چیز میں داخل ہے جس میں وہ مہارت رکھتے تھے۔معلوم ہوا کہ قرآن کے اپنے مخالفین کو دیے گئے چیلنج میں پہلی شرط موجود ہے۔

۲- دوسری شرط یہ تھی کہ مخالفین یعنی قریش وغیرہ کے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے کو باطل اور اپنے اس دعوے کو صحیح ثابت کرنے کا شوق اور رغبت موجود ہو کہ وہ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔ یہ شرط بھی

موجود تھی۔اس سے تاریخ اسلام کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی واقف ہے۔ یہ بات واضح تھی کہ قریش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ناپسند کرتے تھے اور انھوں نے اس دعوت کو باطل قرار دینے کے لیے طرح طرح کی کوششیں کیں۔ پہلے انھوں نے ترغیب کا راستہ اختیار کیا اور ابوطالب کے پاس یہ مطالبہ لے کر گئے کہ وہ اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی دعوت جاری رکھنے سے روکے تو اس کے مقابلے میں وہ اسے اتنا مال دے دیں گے کہ وہ سب سے زیادہ مال دار ہو جائے گا، وہ اسے اپنا سردار بنالیں گے اور وہ تمام اختیارات کا مالک بن جائے گا، یا اس کو کسی ایسے آدمی کے پاس لے جائیں گے جو نفسیاتی امراض کا ماہر ہو، تاکہ اگر اسے کوئی نفسیاتی بیماری ہو تو اس کا علاج ہو سکے۔ مگر اس کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے صاف کہہ دیا: چچا جان! خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں اور شرط یہ ہو کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں تو میں اس کام کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ یا تو اس کو غالب کردے یا میں اس کی راہ میں اپنی جان دے دوں...... أو کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.

اس کے بعد انھوں نے ترہیب اور دھمکی کا راستہ اختیار کیا، پھر ایذائیں پہنچائیں، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان لوگوں کا جو آپؐ کے ساتھ تھے، معاشی ومعاشرتی مقاطعہ (boycott) کیا۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کذب وافترا کی بارش کی اور آپؐ پر ایسے ایسے الزامات لگائے جن سے آپ مکمل طور پر بری تھے۔ جیسے انھوں نے کہا کہ آپؐ مجنون ہیں، جادوگر ہیں، جھوٹے ہیں۔ انھوں نے آپ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو بڑی ایذائیں پہنچائیں۔ قریش نے بعض مسلمانوں کے اتنا ستایا کہ وہ تکلیف کی تاب نہ لا کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بعض مسلمانوں نے ان ایذاؤں اور تکالیف سے بچنے کے لیے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ سب کچھ اس بات کی واضح اور تاکیدی دلیل ہے کہ وہ اس دعوت کو باطل ثابت کرنے اور اس چیلنج کا جواب دینے کا شوق رکھتے تھے اور اس کے لیے پوری طرح آمادہ تھے۔

۳- تیسری شرط یہ تھی کہ چیلنج کا توڑ کرنے اور اس کا جواب دینے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ قرآن کے چیلنج میں یہ شرط بھی موجود ہے۔ تاریخ اسلام کے ایک ادنیٰ طالب علم کو بھی یہ بات معلوم ہے کہ مکہ میں اقتدار، قوت اور نفوذ ساری چیزیں مشرکین کے ہاتھ میں تھیں۔ مسلمانوں اور ان کے رسولؐ کے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ وہ کمزور وناتواں تھے، ان کے پاس نہ کوئی قوت تھی اور نہ اقتدار تھا۔ یہاں تک بعض

لوگوں نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے دو مرتبہ حبشہ کی ہجرت کی۔ اور آخر کار سارے مسلمان اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ ہجرت کر گئے۔ یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی ایسی رکاوٹ بھی نہیں تھی جو قریش کو اس قرآن کے اس چیلنج کا جواب دینے یا اس کا توڑ پیش کرنے اور اپنے اس دعوے کا اثبات کرنے سے روکتی کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا رسول نہیں ہے۔

چیلنج کا نتیجہ

۴۰- قرآن کے مشرکین کو چیلنج کرنے کا نتیجہ ان کے عاجز ہونے اور خاموش رہنے کی صورت میں سامنے آیا، جیسا کہ ہم نے اس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ جب ان کا عاجز ہونا بھی ثابت ہوا اور چیلنج کی شرائط بھی پوری ہیں تو اس سے ثابت ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوے میں سچے ہیں اور یہ بھی ثابت ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اور جب یہ بات ثابت ہوگئی تو مخلوق پر لازم ہوگیا کہ وہ آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لائے، اس کی اطاعت کرے اور اس شریعت کے آگے جھکے جو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں اور ان تمام تعلیمات پر ایمان لائے جو قرآن کریم میں اور سنت نبوی میں آئی ہیں۔ اور یہی مطلوب ہے۔

چیلنج کا تسلسل

۴۱- قرآن کا اپنے مخالفین کو دیا گیا چیلنج اب بھی قائم ہے اور وہ ہر اس شخص کی طرف متوجہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں یا قرآن کے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے میں شک کرتا ہے۔ یہ چیلنج اب تک موجود ہے اور جب تک دنیا قائم ہے اور اس میں مخلوقات کا وجود ہے تو یہ چیلنج بھی قائم ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ موجودہ دور میں اس کی دلالت کیا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس کی دلالت بہت واضح ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایسے دلائل سے ثبوت ہے جو بالکل قطعی، انتہائی واضح اور ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ یہ ایسے دلائل ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا کافر اور متکبر بھی نہ ان کا انکار کر سکتا ہے اور نہ ان کے بارے میں کوئی مغالطہ کر سکتا ہے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ دلیل عہد نبوی سے لے کر اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود قائم ہے اور اسلام کو مختلف قسم کو دشمنوں اور معاند کفار کا سامنا ہے جن میں باطل افکار کے علمبردار بھی ہیں، جنھوں نے اسلام پر

الزامات لگانے اور اس کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کی ہے۔ اس کی شکل بگاڑنے اور اس کے افکار وعقائد کو خراب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے مگر انھوں نے اس چیلنج کا توڑ کرنے اور اس کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ ہم کہتے ہیں کہ جب ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی تو ہمیں اس دلیل (یعنی دلیلِ اعجاز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے اثبات کے لیے دلیل بنانے) کی قوت کا بھی علم ہو جائے گا۔ جس دلیل کو ثابت ہوئے چودہ سال کا عرصہ گزر گیا اور کوئی اس کا توڑ پیش نہ کر سکا یہ نبوت محمدیہ کے اثبات کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

۲- نبوت محمدیہ اور عقل انسانی

۴۲- محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار عقل انسانی کی تنقیص ہے۔ ہم نے گذشتہ صفحات میں جو بحث کی ہے اس کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ کی نبوت ورسالت اور آپ کی صداقت کے قطعی دلائل سامنے آنے کے بعد آپ کی نبوت سے انکار عقل انسانی کی تنقیص ہی کہلا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا انکار ہے کہ اس کے بعد تو انکار کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو محض عناد اور بہت بڑا جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی سزا بھی اللہ کے ہاں بہت سخت ہے۔ اس سے انکار کرنے والا اللہ تعالیٰ کے منکرین اور اس سے سرکشی اختیار کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ یہ تو اس کی ایک سزا ہے۔ دوسری سزا یہ ہے کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہیں لاتا تو اس کے لیے کسی اور نبی پر ایمان لانے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ کیوں کہ جو شخص سورج کو دیکھتے ہوئے اس کے وجود سے انکار کرتا ہے اس کے لیے ایسے ستاروں کا وجود تسلیم کرنے کا کوئی جواز نہیں رہتا جنھیں یہ نہ دیکھ رہا ہو۔ اگر وہ اپنی آنکھوں سے غائب کسی ستارے پر ایمان رکھتا ہے تو وہ اس پر ایمان لانے اور سورج کا انکار کرنے میں متضاد طرز عمل کا حامل ہوگا۔

۳- نبوت محمدیہ اور باقی نبوّتوں کا ثبوت

۴۳- جب نبوت محمدیہ کا ثبوت ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ باقی نبوتیں خود بخود ثابت ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ ان نبوتوں کو قرآن نے ذکر کیا ہے۔ بلکہ ان نبوتوں کے علمبرداروں یعنی باقی پیغمبرانِ کرام کا ذکر بھی قرآن کا ایک اہم موضوع ہے۔ چنانچہ دلیل اعجاز سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو قرآن میں جو کچھ ہے وہ سب ثابت ہوگیا اور وہ ساری باتیں

بھی ثابت ہوئیں جن کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔ یہ بات ہم اس لیے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی زندہ دلیلِ قاطع اس بات کی نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کسی نبی کی نبوت کو ثابت کر سکیں۔ اسی بنا پر جو شخص نبوت محمد یہ کا انکار کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ کسی اور نبی کی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دے تو اس کے ہاں تضاد پایا جائے گا اور وہ مطلقِ نبوت سے انکار کی دلیل اپنے مخاطب کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ یہی وجہ اس بات کی بھی ہے کہ کسی بھی رسول کی رسالت سے انکار اسلام کی رسالت سے بھی انکار اور کفر ہے۔ کیوں کہ اس کے ضمن میں وہ بعض ایسی چیزوں کا منکر ہو جاتا ہے جو قرآن میں وارد ہیں۔

نبوت محمد یہ پر ایمان کے تقاضے

۴۴- محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ِ رسالت پر ایمان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان تمام چیزوں کو مطلق طور پر تسلیم کیا جائے جسے آپؐ لے کر آئے یا جن کی آپؐ نے خبر دی، اس کے اوامر اور نواہی میں آپؐ کی اطاعت اور تصدیق کی جائے۔ کوئی شخص اس میں کسی قسم کا حرج اور تنگی محسوس نہ کرے، اس کے ساتھ کوئی مناقشہ اور جھگڑا نہ کرے، اس کا تعاقب نہ کرے اور ایسا بھی نہ کرے کہ ان میں سے کسی حکم کو قبول اور کسی کو رد کرے۔ یہ ساری چیزیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر ایمان کے مقتضا کے خلاف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بہت سی نصوص ان امور اور ان کے علاوہ دیگر ایسے امور کی تاکید اور وضاحت کرتی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان کے مقتضیات میں سے ہیں۔ قرآن کریم کی ان نصوص میں سے چند درج ذیل ہیں:

وَأَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ. (آل عمران ۳:۱۳۲) اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کرو توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (آل عمران ۳:۳۱) اے نبی! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ، فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ. (آل عمران ۳:۳۲) ان

سے کہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت قبول کرو۔ پھر اگر وہ تمھاری یہ دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ. (النساء۴:۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ إِذَا دُعُوْٓا إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ أَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا، وَأُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (النور۲۴:۵۱) ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تا کہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ وَمَنْ یَّتَوَلَّ یُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِیْمًا. (الفتح ۴۸:۱۷) جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، اور جو منہ پھیرے گا اسے وہ دردناک عذاب دے گا۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. (الحشر۵۹:۷) جو کچھ رسول تمھیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا. (الاحزاب۳۳:۳۶) کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِیْلًا...... فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. (النساء۴:

۵۹-۶۵) اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. (النور۲۴:۶۳) رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری نصوص قرآن کریم میں بہت ہیں۔ یہ مومنوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی اور رسول ہونے پر ایمان کے تقاضے اور اس کے لوازم یاد دلاتی رہتی ہیں۔ یہ آیات کبھی ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیتی ہیں کیوں کہ آپ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ وہ انھیں یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ اطاعت کرنے والوں کی جزا جنت اور اطاعت نہ کرنے والوں کی جزا جہنم ہے۔ کبھی یہ آیات مومنوں کے سامنے یہ بات واضح کرتی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے ساتھ یہ بات لازم ہے کہ آپؐ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کو لے لو اور جن سے آپؐ نے منع فرمایا ہے ان سے باز آ جاؤ۔ وہ انھیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ کر دیں وہ واجب اطاعت ہوتا ہے اور اس میں کسی مسلمان کے لیے اختیار کی گنجایش نہیں ہوتی۔

ان آیات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اختلاف واقع ہونے کی صورت میں ضروری ہے کہ رجوع اللہ اور اس کے رسول کی طرف کیا جائے۔ اور ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پر حقیقی ایمان کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ وہ جو حکم اور فیصلہ دیں یا کوئی خبر سنائیں آدمی اس پر راضی ہو جائے۔

کبھی یہ نصوص قرآن یہ بات واضح کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی اور اس کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کے غضب کا ذریعہ ہے۔ جو لوگ آپؐ کی مخالفت کرتے ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ فتنے اور آزمایش اور دردناک عذاب سے ڈریں۔

۴۵- حقیقت یہ ہے کہ یہ نصوص جن امور کی یاددہانی کرتی ہیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپؐ کی رسالت پر راضی ہونے کا منطقی نتیجہ ہے۔ کیوں کہ یہ تضاد ہوگا اور عقل سلیم کے لیے قابل قبول نہ ہوگا کہ

آدمی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بھی لائے اور پھر آپؐ کے ساتھ آپؐ کی لائی ہوئی بعض چیزوں میں جھگڑا بھی کرے یا آپؐ کی لائی ہوئی تعلیمات پر ناراضی کا اظہار کرے یا اس کے خلاف بغاوت کرے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری باتیں جو آپؐ پر ایمان لانے کے تقاضوں کے خلاف پڑتی ہیں۔ انسان جب اس بات پر یقین کرلیتا ہے کہ فلاں آدمی علم طب میں ماہر اور ممتاز ہے تو اس کے ساتھ لازم ہے کہ وہ 'فلاں آدمی' علم طب کے بارے میں جو کچھ کہے گا وہ اس شخص کے لیے قابل قبول ہوگا جو اسے ماہر کہتا ہے۔ وہ اس کی بیماری کی جو تشخیص کرے گا اور اس کے لیے جو علاج تجویز کرے گا اسے بھی تسلیم کرنا اس پر لازم ہوگا۔ وہ کھانے پینے میں اس کی ہدایات پر عمل کرے گا۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اپنے تسلیم کردہ طبیب کے ساتھ مقابلہ اور مناقشہ نہیں کرے گا۔ یہ طریقہ اگر ایک جسمانی ڈاکٹر کے بارے میں درست اور معقول ہے حالانکہ اس کی بات میں غلطی کا احتمال بھی موجود ہے، تو کسی کے لیے اس بات کی گنجایش کیوں کر ہوسکتی ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی اور رسول ہونے پر ایمان بھی لائے اور اس کے ساتھ مقابلہ اور مناقشہ بھی کرے۔

رسول اللہ اور ہماری ذمہ داری

۴۶- ایک مسلمان پر جب اللہ تعالیٰ نے یہ انعام فرمایا کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کی دولت نصیب ہوئی تو آپؐ کے بارے میں اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپؐ جن جن باتوں کی خبر دے رہے ہیں ان کی تصدیق کرے، اور تمام اوامر ونواہی میں آپؐ کی اطاعت کرے۔ ان ساری چیزوں کو وہ پوری تسلیم ورضا کے سات قبول کرے، جیسا کہ ہم نے پچھلے پیراگراف میں بیان کیا ہے۔ ہم نے اس میں وہ نصوص بھی ذکر کی ہیں جو اس مضمون پر دلالت کرتی ہیں۔ آپؐ کے بارے میں ہماری مزید ذمہ داریاں درج ذیل ہیں:

۱- حب رسول

آپؐ سے محبت رکھنا، اپنے نفس، اولاد، بیوی اور مال ودولت ہر چیز سے زیادہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لَايُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ نَّفْسِهٖ وَوَلَدِهٖ وَمَالِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ. تم میں

سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ میں اسے اپنے نفس، اپنی اولاد، مال اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ سچی محبت وہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے آدمی خلوص دل سے اپنے محبوب کی پیروی کرے۔ جس نے ایسا کیا تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ اس سے محبت رکھتا ہے اور اسے راضی کرنا چاہتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی حاصل کرنے کی سعی ایک ایسا عمل ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے بھی ہمیں حکم دیا ہے۔ یہ چیز سچی محبت کے لوازم میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَحْلِفُوْنَ بِاللهِ لِيُرْضُوْكُمْ، وَاللهُ وَرَسُوْلُهٗ أَحَقُّ أَنْ يُّرْضُوْهُ إِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ (التوبۃ ۹:۶۲) یہ لوگ تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمھیں راضی کریں، حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ اور رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں۔

۲-عزت واحترام

آپؐ کی تعظیم وتوقیر اور عزت واحترام، آپؐ کی موجودگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَاتَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا. (النور ۲۴:۶۳) مسلمانو! اپنے درمیان رسولؐ کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عام لوگوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ وہ 'رسول اللہ' ہیں اور لوگوں پر لازم ہے کہ وہ آپؐ کی تعظیم وتکریم اور عزت واحترام کا خیال رکھیں، یہاں تک کہ اگر آپؐ کو پکارنا ہو تو اس میں بھی ان کو چاہیے کہ آپؐ کو نام لے کر نہ پکاریں بلکہ یہ کہیں کہ 'اے اللہ کے رسول!' 'یا اے اللہ کے نبی!' وغیرہ۔ یہ اس آیت کے مفہومات میں سے ایک مفہوم ہے۔

آپؐ کی تعظیم واحترام کا ایک مظہر یہ ہے کہ آپؐ سے گفتگو میں سبقت نہ کی جائے اور آپؐ کی گفتگو کے دوران میں اپنی آواز کو بھی بلند نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ.

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَرْفَعُوْٓا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَاتَشْعُرُوْنَ. إِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ أَصْوَاتَكُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّأَجْرٌ عَظِيْمٌ.

(الحجرات ۴۹:۱-۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو، اور اللہ سے ڈرو، اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی آواز نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبیؐ کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو، جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمھیں خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ رسول اللہ کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم۔

یہ عزت واحترام آپؐ کی وفات کے بعد بھی جاری ہے۔ چنانچہ آپؐ کی مسجد میں اور آپؐ کی قبر کے پاس اپنی آواز بلند کرنا درست نہیں ہے۔ اسی طرح جب آپؐ کی احادیث اور آپؐ کی سنت مطہرہ کا بیان ہو رہا ہو تو اس وقت بھی پوری طرح باادب ہو کر اسے مکمل توجہ اور انہماک کے ساتھ سننا چاہیے، آپؐ کے احکامات پر راضی ہونا چاہیے، ان سے بغاوت اور فاسد خیالات کے ساتھ ان کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ایک مسلمان جب سنے کہ ''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ آپؐ کے قول کے بعد کسی کا قول کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور آپؐ کی بات کا مقابلہ کسی کی بات نہیں کر سکتی۔ اسے سمجھنا چاہیے کہ اب اس ارشاد نبوی کو سننا، اسے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔

۳- اذیت سے اجتناب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینے سے مکمل طور پر اجتناب کرنا، خواہ معاملہ کوئی بھی ہو اور تکلیف جتنی بھی ہو۔ یہ سب ناجائز ہے اور کبھی کبھی ایک مسلمان کو اسلام کے دائرے سے نکال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللهِ (الاحزاب ۳۳:۵۳) تمھارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ (التوبۃ ۹:۶۱) اور جو لوگ

اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

اسی حرام ایذا میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آپؐ کی ازواج مطہراتؓ پر الزامات لگائے جائیں اوران کو گالیوں کا نشانہ بنایا جائے یاان سے دشمنی رکھی جائے۔وہ تو قرآن کے منصوص حکم کی رو سے مومنوں کی مائیں ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ (الاحزاب۳۳:۶)اور نبیؐ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

وہ دنیا میں بھی آپؐ کی ازواج مطہرات ہیں اورآخرت میں بھی ہوں گی۔

اسی طرح اس ایذا میں آپؐ کے اہل بیت اطہار پر لعن طعن،سب وشتم اوران کے ساتھ عداوت بھی شامل ہے۔

۴-درودوسلام

آپؐ پر درودوسلام بھیجنے کے حوالے سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ اللهَ وَمَلٰئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (الاحزاب۳۳:۵۶)اللہ اوراس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں،اے لوگو جو ایمان لائے ہو!تم بھی ان پر درود بھیجو۔

۴-اللہ کے حقوق رسول کو نہ دیں

۴۷- یہاں اس بات کی تنبیہ اورتذکیر بھی ضروری ہے کہ اللہ اور رسول کے حقوق کو آپس میں گڈمڈ کرنے سے اجتناب کیا جائے۔بعض اوقات ایک مسلمان غیرشعوری طور پر اس چیز میں مبتلا ہو جاتا ہے،یاوہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے مگر اس کا گمان یہ ہوتا ہے کہ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے مسلمانوں کی ایک ذمہ داری ہے یا مسلمانوں پر آپؐ کا یہ حق ہے،یا یہ کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مزید محبت ہے۔اس طرح وہ شرک خفی یا جلی میں مبتلا ہو جاتا ہےاور نتیجتاً اللہ کے غضب کا مستحق ٹھیرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی محبت یہی ہے کہ اس کی پیروی کی جائے اوراس کی رضا کا طالب رہا جائے۔اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اپنی پیروی واطاعت کو اس شریعت کے لیے خالص کیا جائے جو

پ ﷺ اپنے رب کی طرف سے لے کر آئے ہیں، یا آپ ﷺ کی اُن قولی اور فعلی سنتوں کے لیے جو آپ کہہ یا
ر گئے۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف سے جو کچھ لے کر آئے
ں وہ یہ ہے کہ ہر قسم اور ہر شکل وصورت کی عبادت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی کی جانی چاہیے اور اس
بادت میں سے ایک ذرہ بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ دیا جائے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ یہی معنی ہیں کلمہ توحید
ے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔

مسلمانوں کے دلوں میں ان معانی کو جا گزیں کرنے کے لیے قرآن کریم نے یہ بات بیان کی ہے کہ
ر صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَّاحِدٌ (الکہف ۱۸:۱۱۰) اے نبی ﷺ! کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔

قرآن کریم نے یہ بات بھی بیان کی ہے کہ آپ ﷺ اپنے لیے نفع ونقصان کا کوئی اختیار نہیں رکھتے کیوں کہ
نع اور نقصان دونوں کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ، وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوٓءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَّبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ. (الاعراف ۷:۱۸۸)

اے نبی! ان سے کہو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں۔

اس بنا پر استعانت کرنا، مدد طلب کرنا اور تکلیف دور کرنے کی دعا کرنا اللہ تعالیٰ ہی سے ہوگا جس نے
ہیں دعوت دی ہے کہ اسی سے سب کچھ طلب کیا جائے اور اسی کی طرف توجہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اُدْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن ۴۰:۶۰) مجھے پکارو میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (البقرۃ ۲:۱۸۶) اور اے نبی! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انھیں بتادو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔

اسی طرح قرآن نے یہ بات بھی واضح کی ہے کہ خشیت اور تقویٰ بھی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، توکل اللہ تعالیٰ پر کیا جائے گا کیوں کہ وہی کافی بھی ہے اور عظمت شان والا بھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ. (النور ۲۴:۵۲) اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور رسول کی فرماں برداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَسَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهُ اِنَّآ إِلَى اللّٰهِ رَاغِبُوْنَ. (التوبۃ ۹:۵۹) کیا ہی اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول نے انھیں جو کچھ بھی دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے، وہ اپنے فضل سے ہمیں اور بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا۔ ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں۔

یہ آیتیں اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کیا ہیں اور رسول کے حقوق کیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ وحدہ کا یہ حق ہے کہ اس سے خشیت اور تقویٰ اختیار کیا جائے، اسی کو آدمی اپنے لیے کافی سمجھے، اسی پر توکل کرے اور اسی کی طرف رجوع کرے۔ رہا اطاعت کا حق تو وہ اللہ اور اس کے رسول دونوں کا حق ہے۔

رسول کی اطاعت بھی درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔ اسی طرح رسول کا یہ بھی حق ہے کہ وہ جو مال غنیمت اور مال فے جس شخص کو دینا چاہے، دے سکتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَاتُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُاللّٰهِ فَقُوْلُوْا عَبْدُاللّٰهِ

وَرَسُوْلُهُ، أَوْكَمَا قَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تم میری محبت میں حد سے نہ بڑھو، جیسے نصاریٰ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں حد سے بڑھ گئے تھے۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ تم میرے بارے میں یہی کہو کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے کہا: مَاشَاءَ اللهُ وَشِئْتَ جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں۔ آپؐ نے فرمایا: أَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰهِ نِدًّا؟ قُلْ مَاشَآءَ اللهُ ثُمَّ شِئْتَ. کیا تم نے مجھے اللہ کے ساتھ شریک بنایا؟ یہ کہو کہ جو اللہ چاہے پھر جو آپؐ چاہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ رب العالمین کے لیے خالص توحید لے کر آئے۔ مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے آپؐ کو جو شدید فکر تھی اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ آپؐ ان کو توحید خالص بیان کرتے تھے اور ان کو شرک کے مختلف معانی سے بھی آگاہ کرتے تھے، تاکہ وہ اس میں گر نہ جائیں۔ یہ آپؐ کی اپنی امت کے ساتھ خیر خواہی، ان پر رحم اور شفقت کا کمال ہے۔ میرے والدین آپؐ پر فدا ہوں۔ فَجَزَاهُ اللّٰهُ عَنَّا خَيْرَ الْجَزَاءِ. اللہ تعالیٰ آپؐ کے بعض اوصاف کریمہ کے بیان میں فرماتا ہے:

لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَاعَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (التوبۃ ۹:۱۲۸) دیکھو، تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔

اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ (الاحزاب ۳۳:۶) بلاشبہ نبیؐ تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے۔

۳

عمل صالح

عمل صالح کی ماہیت

۴۸۔عمل صالح سے مراد وہ عمل ہے جو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہو۔اس میں دو چیزیں شامل ہیں: ایک یہ کہ وہ اسلامی شریعت کے موافق ہو اور دوسری یہ کہ اس کا مقصد اللہ کی رضامندی اور اس کی اطاعت ہو۔اگر عمل میں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں یا ان میں سے ایک کم ہو تو یہ عمل اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ نہیں ہوگا اور نتیجتاً اس میں نہ اجر ہوگا اور نہ ثواب۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا.

(الکہف ۱۸: ۱۱۰) پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو، اُسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔

عمل صالح سے مقصود عمل صحیح ہے۔یعنی یہ کہ وہ اسلامی شریعت کے موافق ہو اور خالص اللہ کی رضا کے لیے ہو۔

اسلام میں عمل صالح کا مقام

۴۹۔ اسلام میں عمل صالح کا بہت بڑا مقام ہے۔کیوں کہ یہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسول کا ثمرہ ہے۔اس سے کلمہ شہادت کا مفہوم عملی اور کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔اسلام میں اس کی اہمیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں بےشمار آیات نازل ہوئی ہیں۔ یہ آیات کبھی اسے ایمان کے ساتھ ملا دیتی ہیں اور کبھی یہ بیان کر دیتی ہیں کہ یہ ایمان کی بہترین جزا ہے۔بعض آیات میں یہ صراحت آئی ہے کہ آخرت میں جو چیز انسان کے لیے مفید ہے وہ عمل صالح ہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کسی عمل کرنے والے کے

عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ کبھی یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ اعمال صالحہ خطاؤں کی معافی اور گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہیں، اور انسان ضرور بالضرور خسارے میں مبتلا ہوگا سوائے اُس کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کرے۔ یہ معانی جن آیات میں بیان ہوئے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

وَعَدَ اللهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّأَجْرٌ عَظِيْمٌ. (المائدۃ ۵:۹) جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور انھیں بڑا اجر ملے گا۔

اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنَ مَآبٍ (الرعد۱۳:۲۹) جن لوگوں نے دعوت حق کو مانا اور نیک عمل کیے وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لیے اچھا انجام ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (النحل۱۶:۹۷) جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيْعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا (الکہف۱۸:۳۰) وہ لوگ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو یقیناً ہم نیکوکار لوگوں کا اجر ضایع نہیں کیا کرتے۔

وَيَزِيْدُ اللهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى وَّالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا. (مریم۱۹:۷۶) جو لوگ راہِ راست اختیار کرتے ہیں اللہ ان کو راست روی میں ترقی عطا فرماتا ہے اور باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک جزا اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (العنکبوت۲۹:۷) اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے ان کی برائیاں ہم ان سے دور کر دیں گے اور انھیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِيْنَ. (العنکبوت ۲۹:۹) اور جو

لوگ ایمان لائے ہوں گے اور نھوں نے نیک اعمال کیے ہوں گے ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔

وَالْعَصْرِ. إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ. إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. (العصر۱۰۳:۱-۳) زمانے کی قسم! انسان درحقیقت خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

قبولیت عمل اور قبول اسلام کی شرط

۵۰- یہ ایک بدیہی امر ہے کہ اللہ کے ہاں پسندیدہ عمل کی ایک ضمنی شرط یہ ہے کہ اسلام کو قبول کیا جائے یعنی اس پر ایمان لایا جائے۔ اور اس کا اصل مقصد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی بنا دیے جانے کے بعد آپ پر ایمان لانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو عمل صالح کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَفِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. (آل عمران ۳:۸۵) اور جس نے اسلام کے سوا کوئی اور دین ڈھونڈ لیا وہ اس کی طرف سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

اس بنا پر ایک شخص جب کوئی نیک عمل کرتا ہے اور ظاہری طور پر اسلامی شریعت کے موافق کرتا ہے۔ یعنی اس میں وہ ظاہری شکل وصورت موجود ہوتی ہے جو اسلامی شریعت میں مطلوب ہوتی ہے اور عمل کرنے والے کا مقصد اللہ کی رضا ہو مگر اس نے اسلام کو بحیثیت دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت نبی اور رسول تسلیم نہ کیا ہو تو اس کا عمل اس کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور اس کا نہ کوئی اجر ہوگا اور نہ ثواب۔

اسلام اور بدعت

۵۱- جب عمل صالح کی حقیقت یہ ہے کہ وہ درست بھی ہو اور اللہ کے لیے خالص بھی — اور صحیح تو وہ ہوتا ہے جو شریعت کے موافق ہو — تو یہ بات خود بخود معلوم ہوئی کہ دین میں کمی بیشی کر کے اس میں بدعت کی بنیاد رکھنا جائز نہیں ہے۔ اس میں عمل کرنے والے کے لیے کوئی ثواب نہیں ہے، خواہ وہ اسے اللہ کی عبادت

ہی کی نیت سے کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ. جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز گھڑ لائی وہ ناقابل قبول ہے۔

بدعت گناہ سے بھی بدتر چیز ہے۔ کیوں کہ بدعت میں تغیر فی الدین کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ اس میں اس تاثر کی بو آتی ہے کہ دین ابھی ناقص ہے، اس کی تکمیل اور نوک پھلک درست کرنے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔ اس کا عقیدہ رکھنا بھی جائز نہیں ہے اور اس کی بنیاد پر کوئی عمل کرنا تو انتہائی معیوب ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعتوں سے محتاط رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا: إِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَّكُلُّ بِدْعَةٍ فِي النَّارِ. (دین میں) نئی نئی چیزوں سے بچو، اس لیے کہ (دین میں پیدا کی جانے والی) ہر نئی چیز بدعت ہوتی ہے اور ہر بدعت آگ میں ہوگی۔

معلوم ہوا کہ بھلائی اور خیر شریعت میں موجود ہے اور اسی پر اکتفا کرنا نیکی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا. (مریم ۱۹:۶۴) اور تمھارا رب بھولنے والا نہیں ہے۔

اعمالِ صالحہ میں تنوع

۵۲- اعمال صالحہ بے شمار ہیں۔ وہ تمام امور جن کا اللہ تعالیٰ نے بطور وجوب یا استحباب حکم دیا ہے، خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، وہ سب اعمال صالحہ کے ضمن میں آتے ہیں۔ جب ایک مومن ان کو بجالاتا ہے اور اس میں اطاعت الٰہی کو ملحوظ رکھتا ہے، اس کی شریعت کے آگے سر جھکاتا ہے اور اس کے ذریعے اللہ کی رضا چاہتا ہے تو وہ عامل باعمال صالحہ شمار ہوتا ہے۔ ان اعمال صالحہ میں سب سے پہلے نمبر پر عبادات کا درجہ ہے، اور عبادات میں وہ عبادات مقدم ہیں جن کا ذکر حدیث جبرئیل میں آیا ہے۔ یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج۔ یہ عبادات ارکان اسلام میں شمار ہوتی ہیں جن میں کسی قسم کی کوئی نرمی نہیں برتی جاسکتی، نہ ان کی اہمیت میں کمی کی جاسکتی ہے۔ اسی وجہ سے اس اہم حدیث میں ان کا ذکر آیا ہے۔

اسلام اور عبادات

۵۳- اسلام میں عبادات فرد کا تعلق اس کے رب کے ساتھ جوڑتی ہیں اور یہ واضح طور پر انسان کی عبودیت کا اظہار ہوتی ہیں۔ یہ بندوں پر اللہ تعالیٰ خالص حق ہوتی ہیں۔ ان میں سے اہم ترین، جیسا کہ ہم

نے کہا، نماز اور اس کے وہ ساتھی ہیں، جن کا ذکر مذکورہ حدیث میں آیا ہے۔ان عبادات کی فکر بھی ضروری ہے اور ان کی طرف دوسروں کو بھی دعوت دی جائے گی۔ان عبادات کی شان کو کم کرنا کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔ یہ بحیثیت مجموع ایمان کو تقویت پہنچاتی اور اسے راسخ کرتی ہیں۔ ایمان کے لیے ان کی مثال ایسے ہے جیسے نباتات کے لیے پانی، اور انسان کے لیے ہوا۔ یہ بہت بعید ہے کہ انسان ان عبادات میں کوتاہی بھی کرے اور پھر بھی اس کا ایمان مضبوط رہے۔

نماز کی اہمیت

۵۴- اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی درجنوں آیات میں نماز کا ذکر کیا ہے۔احادیث میں بڑی تاکید کے ساتھ نماز کی اہمیت اور فرضیت بیان کی گئی ہے۔احادیث میں یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ وہ نماز ہی ہے جو مسلمان اور کافر کے درمیان فرق کرتی ہے۔نماز متقی مومنوں کی نشانی ہے۔اس کے بارے میں کوتاہی جائز نہیں ہے، خواہ کوئی سفر میں ہو یا حضر میں، خواہ امن کی حالت ہو یا جنگ کی، اور آدمی خواہ صحت مند ہو یا بیمار ہو۔ نماز کو ترک کرنا اور ان میں سستی کا مظاہرہ کرنا منافقین کی صفات میں شمار ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو جو آخری وصیتیں فرمائی ہیں نماز کی پابندی ان میں سے ایک ہے۔ قیامت کے دن جب انسان اپنے رب کے سامنے حاضر ہوگا تو سب سے پہلے اسی کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔اس کے علاوہ نماز نفس کا تزکیہ کرتی ہے، یہ انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ جوڑ دیتی ہے اور ہر وقت اسے یاد دلاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے۔اس طرح نماز کلمہ توحید کے معانی کو اس کے دل میں اجاگر کرتی ہے۔ وہ اس کی روح کے لیے صیقل کا کام دیتی ہے اور اس کے میل کچیل کو دھوڈالتی ہے۔ یہ مسلمان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ انسان جب دل گرفتہ ہو جاتا ہے اور اس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں تو نماز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ وہ نماز ہی ہے جو اپنے عامل کو بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ کیوں کہ اس میں قرآن کی تلاوت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور ذکر و تمجید ہوتی ہے۔ یہ ساری چیزیں انسان کو اللہ کی بندگی کی یاد دلاتی ہیں اور اسے اللہ کی نافرمانی اور مخالفت سے بچاتی ہیں۔

نماز اور قرآن

۵۵- ہم یہاں نماز کی اہمیت اور اس کے عظیم اثرات کے بیان میں قرآن و سنت کی چند ہی نصوص پر اکتفا

کریں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَاتَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (الروم۳۰:۳۱) نماز قائم کرو، اور نہ ہو جاؤ مشرکین میں سے۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (البقرۃ۲: ۲۳۸) اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو، خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسن صلوٰۃ کی جامع ہو۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا. (النساء۴:۱۰۳) نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔

الٓمّٓ. ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ. اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. (البقرۃ۲:۱-۳) الف، لام، میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لیے۔ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں خرچ کرتے ہیں۔

اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ. (العنکبوت۲۹:۴۵) بے شک نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. (البقرۃ۲:۱۵۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى. (النساء۴:۱۴۲) یہ منافقین اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے اٹھتے ہیں۔

نماز اور سنت رسولؐ

۵۶- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ. انسان اور کفر کے درمیان نماز (حد فاصل) ہے۔

اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ، فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ. ہمارے اور ان (نومسلموں) کے درمیان نماز کا عہد ہے۔ جس نے اسے چھوڑ دیا، کافر ہوگیا۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلالؓ سے کہا کرتے تھے: أَرِحْنَا بِهَا يَا بِلَالُ! ''اے بلال! ہمیں اس سے (یعنی نماز سے) راحت پہنچاؤ۔'' اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ کو جب کوئی چیز پریشان کرتی تو نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

نماز کے اسرار

۵۷- نماز کے کچھ اور اسرار و حکم بھی ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ایک مسلمان جب پورے خشوع اور فکر و تدبر، فہم و توجہ اور بیدار مغزی کے ساتھ نماز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو وہ ان اسرار کو خود محسوس کرسکتا ہے۔ نماز کے دوران وہ قرآن کریم کی جو آیات تلاوت کرتا ہے اور اس میں جو اذکار پڑھتا ہے ان سے اس کے سامنے ان اسرار کے دروازے کھلتے ہیں۔ مثلاً نماز کا آغاز 'اللہ اکبر' سے ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بڑا ہے۔ وہ ہر صاحب اختیار و اقتدار اور ہر صاحب قوت و جبروت سے زیادہ بڑا ہے۔ اور جب انسان کا تعلق اس رب کے ساتھ جڑا ہوا ہو جو ہر چیز سے بڑا اور ہر چیز سے زیادہ غالب ہے تو پھر انسان اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ یہی معاملہ دوسرے اذکار کا ہے۔ یہ مسلمان کے دل میں اللہ کی عبودیت کے معانی کو اجاگر کرتے ہیں اور اسے غیر اللہ کی عبودیت سے آزاد کر دیتے ہیں۔ وہ اس کے دل سے ہر قسم کی سرکشی اور غیر اللہ کے ساتھ ہر قسم کے تعلق کو اکھاڑ دیتے ہیں۔

دیگر عبادات

۵۸- دوسری عبادات جیسے روزہ، حج اور زکوٰۃ بھی ایمان کو تقویت دیتی ہیں، نفس کا تزکیہ کرتی ہیں اور بندے کو اس کے رب کے ساتھ جوڑتی ہیں۔ وہ اس کے دل کو اللہ کی بندگی سے بھر دیتی ہیں۔ روزے میں جسمانی خواہشات کو اللہ کی پسند کے لیے قربان کیا جاتا ہے اور مسلمان کو اخلاص کے مفہوم سے آشنا کیا جاتا ہے، اسے قوت ارادی اور صبر کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ ساری وہ چیزیں ہیں جن کی ایک مسلمان کو ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔

زکوٰۃ مسلمان کے لیے بخل، حرص اور بندگیِ مال ودولت کی بیماری سے طہارت کا ذریعہ ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو مال کی محبت پر ترجیح دی جاتی ہے اور شریعت میں ضرورت مندوں کے ساتھ تعاون کا جو حکم دیا گیا ہے اس کو عملی جامہ پہنانے میں شرکت کا موقع ملتا ہے۔

حج مسلمان کے لیے عملی تربیت کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مسلمان کے لیے صرف یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ 'تم نیک بنو' بلکہ یہ کہنے کے بعد اس کے لیے ایک عملی پروگرام وضع کرتا ہے جس پر چلتے ہوئے وہ نیک بنتا ہے۔ان عملی پروگراموں میں ایک حج ہے۔اس میں ایک تو اس بات کا عملی اظہار ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے۔ بندگی کا یہ اظہار ایسی متعین اور واضح شکل وصورت کے ساتھ ہوتا ہے کہ مسلمان کے دل سے سرکشی کی تمام جڑیں اور اس کے سارے جراثیم کو کھینچ لیتا ہے۔انسان میں سرکشی کا جذبہ موجود ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ (العلق ۹۶:۶) ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے۔

اس کے علاوہ کچھ اور عبادات بھی ہیں جو حدیث جبرئیل میں مذکور عبادات کے علاوہ ہیں۔ان میں سے بعض کا تعلق باطن سے ہوتا ہے مثلاً اللہ پر توکل، اس کی محبت، اسی سے مانگنا، اسی سے استعانت طلب کرنا، اسی کی طرف رغبت اور اسی سے لو لگانا، اسی پر اعتماد، اسی سے اس کا طلب گار ہونا اور اسی سے خوف کھانا۔ یہ ساری چیزیں ایک مسلمان سے مطلوب ہوتی ہیں۔

افضل عمل

۵۹- اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اعمال صالحہ میں اجر وثواب اور شریعت میں مطلوب ہونے کے لحاظ سے مختلف درجات موجود ہیں۔ جو فرض ہیں وہ مستحب اعمال سے افضل ہیں اور جن اعمال کا فائدہ جماعت کے لیے ہے وہ افضل ہیں ان اعمال سے جن کا فائدہ فرد تک محدود رہے۔فرد کے لیے اعمال صالحہ میں افضل کا تعین کرنے کے حوالے سے قاعدہ یہ ہے کہ اس کے لیے مخصوص وقت اور مخصوص حالات میں عمل صالح کون سا ہے۔مثلاً جب نماز کا وقت ہو جائے تو اس وقت نماز دوسرے اعمال سے افضل ہوتی ہے۔اس سے مسلمان پر لازم ہو جاتا ہے کہ نماز کے لیے اپنی باقی مصروفیات چھوڑ دے۔جس پر جہاد فرض ہو جائے اس کے لیے جہاد اس سے افضل ہے کہ نفل عبادات اور طلب علم میں مشغول ہو جائے۔ رمضان کے مہینے میں جس پر روزہ فرض ہو اس کے لیے روزے اس سے افضل ہوتے ہیں کہ وہ کسی اور عبادت میں مشغول ہو جائے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس

ایک مسلمان کے لیے اپنے حالات کے حوالے سے یہ معلوم کرنا لازمی ہے کہ اس وقت اور ان حالات میں اللہ کے ہاں محبوب ترین عمل کون سا ہے۔ اس کی روشنی میں وہ افضل عمل کی طرف بڑھے اور اسے دوسروں پر ترجیح دے۔ اس طرز عمل سے اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی خالص عبودیت پیدا ہوگی کہ وہ ہمیشہ اپنے پسندیدہ عمل کے مقابلے میں اس عمل کو ترجیح دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوتا ہے، اگرچہ جو عمل اس کا پسندیدہ ہوتا ہے، وہ بھی عمل صالح ہی ہوتا ہے۔

عبادات اور اصلاحِ فرد و معاشرہ

۶۰۔ مختلف عبادات کے فرد کے کردار پر واضح اثرات ہوتے ہیں۔ ان سے، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس کے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے اس کی کھلے چھپے ہر حالت میں اللہ کی طرف توجہ اور اس سے خوف میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح وہ گناہوں سے اور لوگوں کو تکلیف دینے سے باز آتا ہے اور رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب معاشرے میں اس طرح کے لوگوں کی کثرت ہو جاتی ہے جو نیک اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں تو اس سے معاشرے میں خوشی اور سعادت کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اس سے معاشرے میں بھلائی کی کمیت میں اضافہ ہوتا ہے اور برائی اور شر کی اقدار دم توڑ دیتی ہیں۔ اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں اسلامی عبادات فرد اور معاشرے کی اصلاح کرتی ہیں اور اس سے فرد اور معاشرے دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

......☆......☆......

تیسری فصل

خصائصِ اسلام

تمہید

۶۱-اسلام کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہ خصوصیات اسے دوسرے مذاہب سے نمایاں طور پر ممیّز اور ممتاز کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ اپنے مصدر کے لحاظ سے اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ اسلام کی پہلی خاصیت ہے۔

اسلام جن تعلقات کی تنظیم کرتا ہے اور جن افعال کا حکم دیتا ہے ان کی نوعیت اور دائرہ کار کے اعتبار سے بالکل جامع ہے۔ یہ اس کی دوسری خصوصیت ہے۔

یہ جن لوگوں کو مخاطب کرتا ہے ان کے لحاظ سے عام ہے۔ یہ تمام انسانوں کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ باقی رہنے والا ہے۔ اس پر زوال نہیں آئے گا۔ یہ اس کی تیسری خصوصیت ہے۔

اس کے ماننے والوں اور اس کے مخالفین کو جو بدلہ ملے گا اس لحاظ سے یہ دینی اور دنیوی دونوں پہلو رکھتا ہے، ایک طرف اس سے اخروی بدلہ ملے گا تو دوسری طرف یہ دنیوی اعتبار سے بھی مفید ہی ہے۔ یہ اس کی چوتھی خصوصیت ہے۔

اگر اس لحاظ دیکھا جائے کہ اس میں مثالیت پسندی پائی جاتی ہے تو یہ ایسا ہی ہے، مگر دوسری طرف وہ زمینی حقائق سے بھی صرف نظر نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے یہ مثالیت پسند بھی ہے اور حقیقت پسند بھی۔ یہ اس کی پانچویں خصوصیت ہے۔

اس بنا پر ہم اس فصل کو پانچ حصوں میں تقسیم کریں گے۔

ا

من جانب اللہ ہونا

۶۲- قرآن کا مصدر اور اس کے احکام ومناہج کا نقطۂ آغاز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر لفظی ومعنوی وحی (یعنی قرآن کریم) اور لفظ کے بغیر صرف معنوی وحی (یعنی سنت رسول) سے عبارت ہے۔ اس خصوصیت کے لحاظ سے اسلام دوسرے من گھڑت قوانین سے بنیادی اور جوہری اختلاف رکھتا ہے، کیوں کہ ان کا مصدر انسان ہوتا ہے۔ مگر اسلام کا مصدر انسان نہیں بلکہ انسان کا رب ہے۔ اسلام اور دوسرے قوانین میں یہ عظیم فرق کسی طرح سے بھی نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا اور نہ اس کی اہمیت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

من جانب اللہ ہونے کے دلائل

۶۳- پچھلے صفحات میں ہم یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے اور ہم نے اس کو دلیل اعجاز کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں موجود ہر آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اسی طرح اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس کے باوجود مناسب اور مفید معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی بعض صریح آیات پیش کی جائیں جو اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔ اس طرح کی چند آیات درج ذیل ہیں:

۱- إِنَّآ أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ. (القدر ۹۷:۱) ہم نے اس قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔

۲- وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ. (الحجر ۱۵:۸۷) ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں۔

۳- وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ (النمل ۲۷:۶) اور (اے نبیؐ) بلاشبہ تم یہ قرآن

ایک علیم وحکیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو۔

۴- إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ. (الزمر۳۹:۲)[اے نبیؐ] ہم نے یہ کتاب تمھاری طرف برحق نازل کی ہے، لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔

۵- تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (السجدۃ۳۲:۲)اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

۶۴- قرآن کریم جو تعلیمات اسلام کا سرچشمہ ہے وہی واجب الاتباع، نہ کہ دوسرے سابقہ ادیان سماویہ کی کتابیں، اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَهٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ. (الانعام۶:۱۵۵) یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے ایک برکت والی کتاب۔ پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو، بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔

۶۵- سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک اور سرچشمہ ہے جس کی پیروی اور اتباع ضروری ہے۔ اس کی دلالت بھی قرآن کریم سے ملتی ہے۔ اس کے بارے میں آیات ہم نے اس باب میں پیچھے ذکر کی ہیں۔ سنت رسول کے واجب الاتباع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. (النجم۵۳:۳) وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

من جانب اللہ ہونے کے نتائج

۱- کامل اور نقائص سے پاک ہونا

۶۶- جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ جہالت، خواہش پرستی اور ظلم جیسے عیوب ونقائص سے پاک ہے۔ اس کی وجہ بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ کاریگر کی صفات اس کے کام میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کمال کا اکیلا مالک ہے، وہ اپنی ذات میں بھی کامل ہے اور اپنی صفات اور افعال میں بھی، اس لیے اس کے حق میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ

اس کا کام کمال سے عاری ہو۔ اس کے کمال کا اثر اس کے دیے ہوئے احکام وقواعد اور قوانین میں ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ پس یہ بات ضروری ہے کہ اس کا کام بھی کامل ہو۔ البتہ انسانوں کے قوانین اور احکام کا معاملہ الگ ہے۔ انسان خواہش، جہالت اور ظلم کے نقائص سے بالاتر نہیں ہوتا۔ یہ صفات انسانوں کے ساتھ چپکی ہوئی ہیں۔ انسان کا ان عیوب سے خالی ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ نتیجتاً یہ نقائص ان قوانین واحکام میں بھی ظاہر ہوتے ہیں جنھیں انسان وضع کرتے ہیں۔

یہاں ہمارے لیے اپنی بات کو مدلل بنانے کی خاطر یہی کہنا کافی ہے کہ اسلامی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان حقوق میں اور قانون کے سامنے سرنگوں ہونے کے لحاظ سے مساوات پایا جاتا ہے، خواہ ان کی نسل، زبان، رنگ اور پیشہ کچھ بھی ہو اور فقر وغنا کے لحاظ سے خواہ ان کے درمیان کتنا ہی فرق موجود ہو۔ اسلام نے فضیلت کی میزان کو تقویٰ اور عمل صالح کی بنیادوں پر کھڑا کیا ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم قرآن وسنت دونوں میں وارد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَآأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْٓا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳) لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَافَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى أَعْجَمِيٍّ وَّلَا لِأَعْجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَّلَا لِأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى. اے لوگو! تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار رہو! کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے، سوائے تقویٰ کے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا. اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

اس تعلیم پر عمل کرنے میں دقت اور باریک بینی کی حد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عربی مسلمان کا کسی غیر عربی مسلمان کو یہ کہنا سخت ناپسند فرمایا کہ یَا ابْنَ السَّوْدَاءَ [اے کالی عورت کے بیٹے!]۔ آپؐ نے اس قول کو جاہلیت کی نشانی قرار دیا۔

اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ اسلامی قانون افراد کے درمیان عدالت اور مساوات کے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچا ہوا ہے، خواہ ان کی نسل، رنگ اور زبان کچھ بھی ہو۔ اور پھر اسلام نے صرف یہ تعلیم دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اسے عملی زندگی میں رائج کر دکھایا۔

بیسویں صدی میں اور ہمارے موجودہ دور میں باوجودے کہ دنیا میں ہر طرف مساوات مساوات کا شور بپا ہے اور اسے بین الاقوامی دستور میں شامل کیا جا رہا ہے، مگر یہ سب محض زبانی جمع خرچ ہے۔ عالم واقعہ میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اِلا ماشاءاللہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اب تک وہاں کے شہریوں کے درمیان معمولی معمولی حقوق میں بھی رنگ و نسل کی بنیادوں پر فرق روا رکھا جاتا ہے۔ جس کی چمڑی سفید ہے وہ اس شخص سے بہت اعلیٰ مقام و مرتبے پر ہے جس کی چمڑی سیاہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی مساوات نہیں ہے، نہ انسانی حقوق کے لحاظ سے اور نہ قانون کے سامنے جواب دہی کے اعتبار سے۔ اگر تفریق و امتیاز صرف عملی زندگی میں پایا جاتا تو کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ افراد کی سرکشی اور انحراف ہے اور اس کے بارے میں ریاست جواب دہ نہیں ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ خود قانون بھی اس کی تائید کرتا ہے اور صریحی طور پر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ کالے اور گورے کے درمیان یہ ظالمانہ امتیاز قائم رہے۔ یہ قانون اس وقت بھی اس امتیاز و تفریق کی تائید کرتا ہے جب کہ کالا اور گورا دونوں امریکہ کے شہری ہوں۔ امریکہ کی بعض ریاستوں میں ان قانونی دفعات میں سے ایک یہ ہے: "کالے اور گورے کا آپس میں نکاح باطل ہے۔"

یہاں نکاح کے باطل ہونے کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ عاقدین میں سے کسی میں اہلیت کے لحاظ سے کوئی نقص پایا جاتا ہے۔ ان دونوں کی اہلیت کامل اور مکمل ہے۔ مگر اس کی بنیاد ایک اور چیز ہے جو قانون وضع کرنے والے کی نگاہ میں بہت اہم ہے۔ وہ یہ ہے کہ نکاح کرنے والوں میں سے ایک کی چمڑی سفید ہے اور دوسرے کی چمڑی سیاہ ہے۔ اسی طرح بعض ریاستوں میں یہ قانون ہے:

''جوشخص کوئی کتاب شائع کرتا ہے، کوئی رسالہ چھاپتا ہے یا کوئی اعلان نشر کرتا ہے اور اس میں عوام کو معاشرتی مساوات کی دعوت دیتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ کالے اور گورے کے درمیان نکاح کو جائز قرار دیا جائے۔ جو شخص اس سلسلے میں عوام کو دلائل فراہم کرتا ہے یا ان کے سامنے تجاویز رکھتا ہے تو اس کا یہ کام جرم تصور ہوگا۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا جو پانچ سو ڈالر سے زیادہ نہیں ہوگا، یا قید جس کا دورانیہ چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوگا، یہ دونوں سزائیں بھی دی جاسکتی ہیں۔''

مغربی قانون کی یہ دفعہ خواہش کی پیروی، اور ظلم وجور کی آخری انتہا پر ہے۔ اس میں کسی جھجک اور شرمندگی یا ضمیر کے کسی کچوکے سے بالاتر ہوکر اس حد تک ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا گیا ہے کہ جو شخص امریکی شہریت رکھتے ہوئے اس کے مختلف رنگ ونسل کے شہریوں میں مساوات کی دعوت دیتا ہے اسے سزا دینے کی بات کی گئی ہے۔ اب کیا انسان کی جہالت اور اس کے ظلم وجبر کی اس سے زیادہ واضح کوئی مثال مل سکتی ہے؟

رہی یہ بات کہ استعمار اپنے محکوم لوگوں اور مفتوحہ ممالک کے باشندوں میں امتیاز روا رکھتا ہے تو یہ ایک مسلمہ امر ہے اور اس میں کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ استعمار کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مفتوحہ ممالک میں ایسے قوانین جاری کرتے ہیں جن کے ذریعے وہ وہاں کے باشندوں کے ساتھ چوپایوں جیسا سلوک کرتے ہیں، مگر کیا مجال کہ وہ اپنے ضمیر کی ملامت کا کوئی خوف محسوس کریں یا اپنے جیسے انسانوں پر ظلم ڈھاتے ہوئے وہ کسی شرمندگی کا احساس کریں۔ وہ جس چیز کو اپنے ممالک میں اور اپنے شہریوں کے حوالے سے ظلم کہتے ہیں وہی چیز مفتوحہ علاقوں کے بارے میں انھیں حق اور انصاف دکھائی دیتی ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے امور اس بات کے لیے کافی دلیل ہیں کہ انسان ظلم وجور، خواہش پرستی، جانب داری اور جہالت کے کس مقام پر ہے۔

۲- برائی کے خلاف دل پر اثر انداز ہونا

۶۷- جب ثابت کیا جائے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں ان پر بڑی حد تک اس کی ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور ان کے دل میں اس کا احترام پیدا ہوتا ہے، خواہ ان کے معاشرتی مراکز اور دنیوی اقتدار کیسا ہی ہو۔ کیوں کہ یہ مراکز اور یہ

اختیارات انھیں اللہ کے آگے جھکاؤ اور اس کی شریعت کے احترام کے دائرے سے خارج نہیں کرتے۔ اس شریعت کی اطاعت ایک اختیاری چیز ہے جو دل سے نکلتی ہے اور اس کی بنیاد ایمان پر قائم ہوتی ہے۔ اس پر کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ یہ اس بات کی ایک بہت بڑی وجہ ہے کہ اسلامی قانون کو احسن طریقے سے عملی جامہ پہنایا جائے اور اس کے خلاف کوئی بغاوت نہ کی جائے، اگرچہ آدمی کو اس کی قدرت بھی ہو اور سے اس کا موقع بھی مل رہا ہو۔

رہا من گھڑت قوانین اور اقدار کا معاملہ جنھیں انسان ایجاد کرتا ہے تو انھیں اس قدر احترام اور ہیبت نہیں ملتی۔ کیوں کہ اس کو لوگوں کے دلوں پر اختیار و اقتدار نہیں ہوتا اور نہ اس کی بنیاد اسلام کی طرح، عقیدے اور ایمان پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے قانون کی مخالفت کا جب بھی کوئی موقع ملتا ہے اور اس کے اتباع سے بغاوت اختیار کرنے کی جب بھی طاقت پیدا ہوتی ہے، اور لوگ دیکھتے ہیں کہ اس مخالفت میں ہماری خواہشات کی تسکین ہوتی ہے اور ہمارے مقاصد حاصل ہوتے ہیں تو وہ اس کی مخالفت پر جری ہو جاتے ہیں۔

اس معاملے میں صرف قانون کافی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے کچھ اور چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو اچھے انداز میں عملی جامہ پہنانے میں معاون ثابت ہوں۔ ان میں پہلی چیز لوگوں کے دلوں میں وہ جذبہ بیدار کرنا ہے جس سے یہ قانون لوگوں کے دلوں میں گھر کر جائے اور انھیں اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ رضا کارانہ طور پر اس کے آگے جھک جائیں۔ یہ چیز جس طرح کہ اسلام پیدا کرتا ہے کوئی اور چیز پیدا نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ اس نے اپنے تمام قوانین کو ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت کی بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ ان قوانین پر رضا کارانہ عمل اور ان کا احترام ان کے ایمان کا تقاضا ہوتا ہے۔

ہم نے جو بات کہی ہے اس کی دلیل کے طور پر ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک مخصوص مسئلہ تھا جسے اسلام نے اپنے قانون کے ذریعے بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا اور اس میں پوری طرح کامیاب رہا۔ پھر اسی مسئلے کو من گھڑت قوانین نے بھی حل کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ اسلام سے پہلے عرب شراب کے رسیا تھے۔ وہ اس میں کوئی عیب اور ناپسندیدگی کی کوئی بات محسوس نہیں کرتے تھے۔ شراب کے مشکیزے اور اس کے مٹکے گھروں میں ایسے رکھے جاتے تھے جیسے پانی گھر میں ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ مگر جب اسلام نے یہ کہہ کر شراب کو حرام کیا کہ **إِنَّمَا الْخَمْرُ**

وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدۃ ۵:۹۰) [اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی] تو اس وقت لفظ فَاجْتَنِبُوْهُ میں اللہ تعالیٰ نے وہ عظیم قوت رکھ دی جو کسی طاقت ور حکومت کی بڑی فوج اور پولیس میں بھی نہیں ہوتی جسے وہ اپنا کوئی حکم جبراً نافذ کرنے کے لیے استعمال کر سکے۔ مسلمانوں نے اُٹھ کر شراب کے مشکیزوں کو انڈیل دیا اور اس کے مٹکوں کو توڑ ڈالا۔ وہ فوری طور پر شراب سے ایسے باز آئے جیسے بچے کا دودھ چھڑایا جاتا ہے۔ اب ان کی حالت یہ ہوگئی کہ وہ نہ کبھی شراب کے نام تک سے واقف تھے اور نہ کبھی انھوں نے اسے چکھا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کا حکم فَاجْتَنِبُوْهُ آ چکا تھا۔ اور اللہ کے احکام کی شان ہی یہی ہے کہ ان کا احترام کیا جاتا ہے اور ان کی اطاعت کی جاتی ہے۔

پھر بیسویں صدی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے چاہا کہ اپنے شہریوں کو شراب سے نجات دلا دے۔ شراب کا قانون نافذ کرنے سے پہلے انھوں نے اس قانون کو ماننے کے لیے بڑے پیمانے پر ذہن سازی کی۔ اس مقصد کے لیے ہر قسم کے ملکی وسائل کو بروئے کار لایا گیا اور جو لوگ اس حوالے سے مہارت رکھتے تھے ان کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ انھوں نے اس کام کے لیے سینما، تھیٹر، ریڈیو اور اخبارات ورسائل کو استعمال کیا۔ ہینڈ بل تقسیم کیے گئے، لیکچر دلوائے گئے، سیمینار کروائے گئے۔ دانشوروں، ڈاکٹروں اور سوشیالوجی کے ماہرین سے انٹرویو کیے گئے۔ اس مہم پر اُٹھنے والے اخراجات کا تخمینہ ۶۵ ملین ڈالر بتایا جاتا ہے۔ اس دوران شراب کے مفاسد اور اس کے برے نتائج کے بارے میں نو ہزار ملین صفحات لکھے گئے۔ اور قانون نافذ کرنے پر دس ملین ڈالر خرچ ہوئے۔ اس ہمہ گیر مہم اور زرِ کثیر خرچ کرنے کے بعد حکومت نے ۱۹۳۰ء میں حرمت شراب کے قانون کو نافذ کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے شراب کی خرید و فروخت پر بھی پابندی لگا دی اور اس کی پیداوار اور درآمد و برآمد بھی روک دی۔ مگر نتیجہ کیا نکلا؟ نفاذِ قانون سے لے کر اکتوبر ۱۹۳۳ء تک کے واقعات کے سروے سے معلوم ہوا کہ اس قانون کی تنفیذ کے سلسلے میں دو سو افراد کو قتل کیا گیا، پانچ لاکھ لوگوں کو جیل جانا پڑا اور قانون کی مخالفت کرنے والوں سے جو جرمانے وصول کیے گئے اس کی مقدار چار ملین ڈالر تک پہنچتی ہے۔ اس کی مخالفت کے سلسلے میں جو اموال ضبط کیے گئے ان کا تخمینہ ایک ہزار ملین ڈالر ہے۔ اور آخر کار ۱۹۳۳ء میں حرمت شراب کے قانون کو ختم کرنا پڑا۔ اس وسیع و عریض تشہیری

مہم کے باوجود، جو حکومت نے چلائی تھی، یہ بھی نہ ہو سکا کہ شہریوں کے دلوں میں اس قانون کے لیے جگہ بنائی جاتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس قانون کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور اس کی وجہ سے حکومت کو یہ قانون منسوخ کرنا پڑا۔ کیوں کہ اس قانون کو لوگوں کے دلوں پر کوئی اختیار اور اقتدار نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ اس کے احترام اور اطاعت پر آمادہ ہو جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ قانون ناکام ہو کر منسوخ ہوا۔ مگر اس کے مقابلے میں ایک فَاجْتَنِبُوْہ کا لفظ جسے اسلام جزیرۂ عرب میں لے کر آیا تھا وہ عظیم اثر کر گیا کہ یہ قانون بغیر کسی مہم کے بہترین انداز میں عملی طور پر نافذ ہوا۔ شراب پینے والوں نے شراب کو گلی کوچوں میں بہا دیا اور وہ اس سے مکمل طور پر باز آئے۔ مگر کسی پولیس اور فوج کی قوت سے یا کسی نگران کی وجہ سے نہیں، بلکہ ایمان کی قوت سے اور اس بات سے کہ مسلمان اسلامی قوانین کی اطاعت کرتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔

۲

جامعیت

۶۸- ہم نے اسلام کی تعریف کے سلسلے میں کہا ہے کہ اسلام انسانی زندگی اور اس کے کردار کے تمام پہلوؤں کو جامع ہے۔ اسلام کا یہ وصف ایسا ہے کہ یہ حقیقی بھی ہے اور یہ اسلام کے لیے ثابت بھی۔ اسلام کو اس سے خالی قرار دینا درست نہیں ہے سوائے اس کے کہ ایک شخص اس پر جھوٹا الزام عائد کرتے ہوئے اس کا دعویٰ کرے، یا یہ کہ وہ اس کی حقیقت سے جاہل ہو اور اس جہالت سے متاثر ہو کر وہ کوئی بات کہہ ڈالے۔

اسلام کی انسانی زندگی اور کردار کے حوالے سے یہ جامعیت اس قدر وسیع ہے کہ اس میں کسی استثنا اور تخصیص کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ یہ جامعیت کے تمام معانی کے ساتھ ایک مکمل جامعیت ہے۔ یہ انسانی اقدار اور انسانی نظاموں کے برعکس اپنا ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے نظامات میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص دائرہ ہوتا ہے جسے وہ منظّم کرتے ہیں۔ اس مخصوص دائرے کے باہر جو چیزیں ہوتی ہیں ان کے ساتھ ان نظاموں کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس بنا پر ایک مومن کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ کہے: ''یہ میدان میرے لیے ہے، اس کے معاملات کو میں جیسا چاہوں گا منظّم کروں گا، اور اس کے بارے میں اسلام کا کوئی دخل نہیں ہے۔''

ایک مسلمان یہ بات اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اسلام سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک اس پر حکمرانی کر رہا ہے۔ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اس کے لیے اسلام میں ایک مخصوص حکم موجود ہے۔ اسی طرح وہ اپنے دماغ میں جو خیالات رکھتا ہے اور اپنے دل میں جن میلانات کو جگہ دیتا ہے اس پر اسلام کی حکمرانی ہے۔ اسی وجہ سے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام کے سوا کسی اور نظام کو زندگی کے کسی بھی پہلو میں اپنے امور کی تنظیم کی اجازت یا اس کا موقع فراہم کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق بن جائے گا:

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ إِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (البقرۃ۲:۸۵) تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں۔ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔

انسان کے افعال اور اس کے حرکات وسکنات، اختیارات اور دوسروں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے اسلام کے ثابت شدہ احکام میں سے کچھ واجب ہیں، کچھ مستحب، کچھ حرام اور کچھ مکروہ یا مباح، اسی طرح کوئی چیز صحیح ہوتی ہے اور کوئی باطل۔

اسلامی احکام کی قسمیں

۶۹- اسلامی احکام کا تعلق جن چیزوں سے ہوتا ہے ان کے لحاظ سے احکام اسلام کی درج ذیل قسمیں بنتی ہیں:

اولاً: اسلامی عقیدے کے احکام۔ ان کا تعلق عقیدے کے امور جیسے ایمان باللہ، ایمان بالآخرت، وغیرہ کے ساتھ ہوتا ہے۔

ثانیاً: اخلاق کے احکام۔ ان کا تعلق اُن اخلاق وعادات کے ساتھ ہوتا ہے جن سے ایک مسلمان کو مزین یا مبرّا ہونا چاہیے۔ جیسے سچائی کا وجوب اور جھوٹ کی حرمت۔

ثالثاً: عبادات کے احکام۔ یہ وہ احکام ہیں جن کا تعلق انسان اور اس کے رب کے درمیان تعلق کے امور سے ہوتا ہے۔ جیسے نماز، روزہ اور دیگر عبادات۔

رابعاً: معاش کے احکام۔ یہ وہ احکام ہیں جن کے ذریعے انسانوں کے آپس کے تعلقات کو منظّم کیا جاتا ہے۔ اس کی مختلف قسمیں ہیں:

۱- خاندانی کے احکام، جیسے نکاح، طلاق، وراثت، نان ونفقہ وغیرہ۔ جدید اصطلاح میں اس کو عائلی احکام یا ذاتی زندگی کا قانون (personal law) کہا جاتا ہے۔

۲- وہ احکام جن کا تعلق افراد کی باہمی لین دین اور مالی معاملات کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے خرید وفروخت، اجارہ، رہن، کفالہ، وغیرہ۔ یہ وہ امور ہیں جو جدید اصطلاح میں معاشی معاملات یا قانون تمدن کہلاتے ہیں۔

۳- وہ احکام جن کا تعلق عدالتی امور کے ساتھ ہوتا ہے، جن میں مدعی اور مدعیٰ علیہ، شہادت، بیان حلفی اور دلائل کے احکام بیان ہوتے ہیں۔ یہ احکام موجودہ دور کے عدالتی ضابطوں کے قانون سے ملتی جلتی چیز ہے۔

۴- غیر مسلم اقلیتوں کے معاملات اور ان کے حقوق وفرائض کے احکام۔ یہ امور موجودہ دور کے 'خاص بین الاقوامی قانون' کے ضمن میں آتے ہیں۔

۵- وہ احکام جن کا تعلق اسلامی ریاست کے، دوسری ریاستوں کے ساتھ صلح وجنگ کے تعلقات کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ قانون اس چیز میں داخل ہے جسے آج کے دور میں 'عام بین الاقوامی قانون' کہتے ہیں۔

۶- وہ احکام جن کا تعلق نظام حکومت اور اس کے قواعد وضوابط، سربراہ مملکت کے چناؤ، ریاستی ڈھانچے، افراد کے اس کے ساتھ تعلقات اور اس کے بارے میں ان کے حقوق کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ امور آج کے دستوری قانون میں داخل ہوتے ہیں۔

۷- وہ احکام جن کا تعلق اسلامی ریاست کے ذرائع آمد وخرچ، افراد اور حکومت کے مابین اور غریبوں اور مال داروں کے مابین مالی تعلقات کی تنظیم سے ہوتا ہے۔ یہ موجودہ دور کے قانون معیشت میں داخل ہے۔

۸- وہ احکام جن کا تعلق فرد اور حکومت کے مابین تعلقات سے ہوتا ہے مگر ان افعال کے لحاظ سے جو ریاست کے قانون میں ممنوع ہوتے ہیں۔ یعنی جرائم، اور ہر جرم کے بالمقابل سزا۔ یہ آج کل کے قانون جرم وسزا میں داخل ہے۔ ان احکام میں وہ تفتیشی اقدامات بھی شامل ہیں جو جرائم کی تحقیق، مجرموں کو سزائیں سنانے اور ان کو نافذ کرنے کے لیے اٹھائے جاتے ہیں۔ یہ امور موجودہ دور کے قانون تفتیش جرائم، یا مقدمات میں بدلہ لینے کے قانون میں شامل ہیں۔

شریعت اور انسانی قوانین کا تقابل

۷۰- ہماری پچھلی بحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اسلامی شریعت اپنی جامعیت کے

لحاظ سے من گھڑت قوانین سے مختلف ہے۔ کیوں کہ شریعت کی جامعیت صحیح معنوں میں کامل اور مکمل جامعیت ہے۔کوئی واقعہ یا انسان کا کوئی فعل اور اس کا دوسروں سے کوئی تعلق ایسا نہیں ہے کہ اس کے بارے میں اسلامی شریعت میں کوئی حکم نہ ہو۔ مثلاً عقیدہ، اخلاق اور عبادات شریعت کی جامعیت کے دائرے میں آجاتے ہیں مگر انسانی قوانین کی جامعیت ان کا احاطہ نہیں کرتی۔ بلکہ یہ تو دور کی بات ہے انسانی قوانین تو ان انسانی تعلقات کا احاطہ بھی نہیں کرتے جن کی تنظیم کے لیے ان کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔اس سلسلے میں بھی انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور اسلامی شریعت کے درمیان نمایاں فرق موجود ہے۔اس فرق کے دو پہلو ہیں: ایک اخلاقیات کا پہلو اور دوسرا حلال وحرام کا پہلو۔

۱- اخلاقی پہلو

۷۱- اخلاقیات کا لحاظ رکھنے کا پہلو ایسا ہے کہ اسلامی شریعت نے اس کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ شریعت نے اس پہلو کو یہ موقع فراہم کیا ہے کہ وہ قانونی قواعد میں نفوذ کر جائے اور ان میں خلط ملط ہوجائے۔شریعت اپنے تنظیمی احکام کی بنیاد اس کے اوپر رکھتی ہے۔مگر انسان کے بنائے ہوئے قوانین کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔وہ اخلاقی پہلو کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ بلکہ ان کی بنیاد ہی اسی بات پر قائم ہوتی ہے کہ اخلاقی اور قانونی قواعد کے درمیان فرق کیا جائے۔ مثلاً وعدے سے پھرنا، خیانت کرنا اور اپنی بات پر قائم نہ رہنا اخلاق کے ترازو میں قابل مذمت ہیں اس وجہ سے شریعت اسلامیہ کے قائم کردہ تعلقات میں ان میں سے کوئی چیز بھی جائز اور مباح نہیں ہے، خواہ ان تعلقات کا دائرہ افراد تک محدود ہو یا ملکوں کی سطح تک وسیع ہو۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کریں گے تاکہ ہمیں معلوم ہوسکے کہ اسلامی شریعت اخلاقی پہلو کا کس قدر معمولی قسم کے تعلقات میں بھی انتہائی حد تک خیال رکھتی ہے، خواہ اس سے کتنی ہی بڑی قربانی دینا پڑے۔

فقہا نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ایک اجنبی (یعنی غیر مسلم) جب امان حاصل کر کے کچھ مدت کے لیے اسلامی حکومت کے حدود میں داخل ہوتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے کہ اس مدت کے دوران اسے غیر مسلم ریاست (جس کا وہ شہری ہے) کے مطالبے پر اس کے حوالے کیا جائے، خواہ اس کے بدلے میں ہمارے ایک شہری کو (جو وہاں قید ہو) آزاد کرنے کی پیش کش کی جائے۔ پھر اسے اپنے ملک کے حوالے کرنے کی

ممانعت اسی طرح قائم رہتی ہے خواہ اس کی حکومت اسلامی ریاست کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔

اس حکم کی علت فقہائے کرام یہ بتاتے ہیں کہ یہ اسلامی ملک میں امان لے کر داخل ہوا ہے اس لیے اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہے۔ اس طرح وہ امن کے ساتھ رہے گا اور اس کی طرف کسی کو بری نیت سے ہاتھ بڑھانے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اس کی رضامندی کے بغیر اسے اس کی حکومت کے سپرد کرنا اس کے ساتھ وعہدہ خلافی ہے جو اسلامی شریعت میں ناجائز ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی رخصت نہیں ہے۔

یہ ممانعت اس وقت بھی جاری رہے گی جب کہ اس کی حکومت اسلامی ملک پر حملہ کرے اور اس کے شہریوں کی جان و مال لینا شروع کر دے۔ [اس موقع پر اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی حفاظت کے لیے اس کی حکومت کے خلاف جنگ کرے گی] مگر اس ریاست کے سارے شہری اس جنگ میں کام آئیں تب بھی یہ اجازت بہر حال نہیں ہے کہ اس ذمی کو اس کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔ کیوں کہ اس کی حکومت ظلم کر رہی ہے، جس میں اس کی مدد نہیں کی جا سکتی۔

یہ اسلامی شریعت کے ماہرین کا کہنا ہے۔ اب کوئی بتائے کہ اسلامی شریعت اس نازک ترین حالت میں بھی اخلاقی پہلو کا جس انداز سے التزام کرتی ہے اس کی مثال کسی بھی انسانی قانون میں مل سکتی ہے؟ اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے اس لیے کہ اسلامی شریعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے وہ خالص حق اور عدل ہوتی ہے۔

۲- حلال و حرام کا پہلو

۲۷- یعنی فی نفسہٖ اس فعل میں حلال و حرام کا پہلو جس میں مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک کام ظاہری طور پر صحیح ہوتا ہے اور اس میں صحت کی مطلوبہ شرائط موجود ہوتی ہیں مگر حقیقت میں وہ حرام ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی باطنی حقیقت کے خلاف ہوتی ہے، یا اس کا مقصود ایسا ہوتا ہے جس کا اسلام نے حکم نہ دیا۔

کسی چیز کی حلت و حرمت کی یہ صفت اس کے ساتھ ملحق رہتی ہے، خواہ اس کے بارے میں کوئی عدالتی حکم ہی آ جائے جو اس کے خلاف فیصلہ کر دے۔ مثلاً ایک شخص ناحق طور پر دوسرے پر قرض کا دعویٰ دائر

کرے اور اسے عدالت میں ثابت کر دے، تو عدالت کے فیصلے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ آدمی اپنے مطالبے میں حق پر ہے یا اس دوسرے شخص سے قرض وصول کرنے میں حق بجانب ہے۔ بلکہ اللہ کے ہاں معاملہ اپنی حقیقت پر قائم رہے گا اور وہ یہ ہے کہ اس مدعی نے ایک حرام کا ارتکاب کیا اور اس نے جھوٹ کا مال کھایا۔ یہ چیز اللہ کی شریعت میں جائز نہیں ہے اور عدالت کے فیصلے کا اسے کچھ فائدہ نہ ہوا کیوں کہ اس نے اپنے لیے ایک ظلم کا دعویٰ کیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیوی عدالتیں ظاہر کے مطابق فیصلہ دیتی ہیں اور اللہ تعالیٰ راز کی باتوں سے بھی باخبر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آخرت میں جزا وسزا کا فیصلہ افعال کے حقائق، لوگوں کی نیتوں اور ان کے انجام دیے گئے حرام وحلال کے مطابق کیا جائے گا۔ حقوق اور شرعی آثار کے ثابت ہونے کی اصل بنیاد فعل کی حقیقت اور اس کے ظاہری اور باطنی دونوں طرح سے حلال اور جائز ہونے پر ہے۔ مگر چونکہ باطن کا معاملہ مخفی رہتا ہے اور انسان اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا اور اس کے لیے چیزوں کے حقائق معلوم کرنا بعض اوقات ناممکن بن جاتا ہے، جبکہ دوسری طرف معاملات کا فیصلہ کرنا اور احکام جاری کرنا ٹھوس بنیادوں اور متعین اصولوں کی بنیاد پر ہوتا ہے اس وجہ سے اسلامی شریعت نے ظاہر کو معتبر قرار دیا ہے اور اس کی صحت اور اس کے مقاصد شریعت کے مطابق ہونے کو باطن کی صحت اور اس کی حلت کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ نیز اس کے ذریعے حقوق کے متعین ہونے اور اثرات کے واقع ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ مگر چیز اس کے باوجود اپنی باطنی حقیقت کی بنا پر حلت اور حرمت سے موصوف ہوتی ہے۔ اس وصف کی بنیاد پر اس چیز کے حلال یا حرام ہونے کا حکم نکالا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر اس کی جزا یا سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔ کیوں کہ ظاہری فیصلہ کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔

اس بنا پر کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے کسی حرام فعل کا کرنا اور کسی حرام چیز کا کھانا مباح سمجھے، خواہ عدالت نے وہ چیز یا فعل اس کے لیے حلال قرار دی ہو۔ ہم جو بات کہہ رہے ہیں اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی دلالت کر رہا ہے:

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَّإِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ إِلَيَّ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَّكُوْنَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ، فَأَقْضِيَ لَهٗ عَلٰى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ مِنْهُ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِشَيْءٍ مِّنْ حَقِّ أَخِيْهِ فَلَا يَأْخُذْمِنْهُ شَيْئًا فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ. تم لوگ میرے سامنے اپنے مقدمے پیش کرتے ہو اور میں

تمھارے جیسا ایک انسان ہوں۔ ممکن ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنے دلائل کو دوسرے کے مقابلے میں اچھے طریقے سے پیش کرسکتا ہو اور میں مقدمے کی کارروائی کی روشنی میں اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ پس میں جس کے لیے اس کے بھائی کے حق میں سے کسی چیز کا فیصلہ کروں تو اسے چاہیے کہ اس میں سے نہ لے۔ کیوں کہ وہ دراصل اس کا حق نہیں بلکہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب باطن کافی حد تک ظاہر ہو جائے اور اس کی حقیقت منکشف ہو جائے تب اعتبار اسی کا ہوگا، ظاہر کا نہیں ہوگا۔

ہم نے جو بیان کیا ہے اس کی اہمیت اس سے معلوم ہوتی ہے کہ اسلام لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور وہ ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان یہ بات جانتا ہے کہ اگر وہ حرام کی طرف بڑھتا ہے یا کسی پر زیادتی کرتا ہے اور دوسروں کے حقوق ہڑپ کر جاتا ہے تو یہ چیز اسے کوئی فائدہ نہیں دیتی اور یہ اسے ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں کرتی، اگرچہ وہ دنیا میں ذمہ داری سے اپنی گردن چھڑا لے یا قانون سے فرار میں کامیاب ہو جائے، قانون کے ساتھ چالبازی کرے یا اپنی اور اپنے فعل کی حقیقت چھپائے۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ سے کبھی چھپ نہیں سکتیں۔ آدمی جب آخرت میں اللہ تعالیٰ کی پرہیبت عدالت میں پیش ہوگا تو ان چیزوں کے بارے میں اس کا حساب لیا جائے گا۔ اس بنا پر مسلمان کسی چیز کا اقدام نہیں کرتا جب تک کہ اسے یقین سے معلوم نہ ہو کہ یہ چیز حلال ہے، وہ کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا جو اس کی نہ ہو اگرچہ وہ اس کا مطالبہ کرسکتا ہو۔ اسی طرح وہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہیں کرتا جو اس کے لیے حلال نہ ہو اگرچہ وہ اسے عدالت کی نگاہوں سے چھپا سکتا ہو۔

اس انداز سے اسلام لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور اس طرح لوگ ان کے بارے میں مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس طرح لڑائی جھگڑے اور مقدمے کم ہو جاتے ہیں اور عدالت کی طرف رجوع کرنے والوں کی تعداد میں کمی آجاتی ہے۔ اس طریق کار میں لوگوں کے آپس کے تعلقات کو منظم کرنے اور ان کے حقوق کو ضائع کرنے سے بچانے کا بہترین سامان موجود ہے۔ یہ چیز انسان کے وضع کردہ قوانین میں نہیں پائی جاتی کیوں کہ وہاں تو عدالت سے فیصلہ سنائے جانے پر معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ قوانین کچھ نہیں کرسکتے۔ اس لیے کہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین کو اخروی امور کے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا اور اس میں وہ معانی نہیں پائے جاتے جن کا ہم نے اسلامی شریعت میں موجود ہونے کا ذکر کیا ہے۔

۳

عموم

۷۳- یہ بات اسلام کے بدیہیات اور اس کی بنیادی صفات میں سے ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لیے آیا ہے۔ یہ کسی خاص گروہ یا کسی مخصوص نسل کے لیے نازل نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ أَرۡسَلۡنَاكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا. (سبا۳۴:۲۸) اور (اے نبیؐ!) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

قُلۡ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّي رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيۡكُمۡ جَمِيعًا. (الاعراف ۷:۱۵۸) [اے محمدؐ!] کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں۔

اسلام کا یہ عموم زمانے کے کسی مخصوص دور یا قوموں کی کسی مخصوص نسل تک بھی محدود نہیں ہے۔ یہ جیسا کہ زمانے کے لحاظ سے عام ہے اسی طرح یہ مکان کے لحاظ سے بھی عموم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اب بھی باقی ہے اور اس کو کوئی زوال نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ یہ منسوخ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ ناسخ کی قوت منسوخ سے زیادہ یا اس کے برابر ہونی چاہیے، خواہ نسخ کلی ہو یا جزوی۔ جب اسلام سابقہ شریعتوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیا و مرسلین کے خاتم ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ الٰہی شریعتوں کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اور اللہ کی وحی اب کسی انسان پر نازل نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمۡ وَلَٰكِن رَّسُولَ ٱللَّهِ وَخَاتَمَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ. (الاحزاب ۳۳:۴۰) [لوگو!] محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

اس بنا پر یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی چیز اسلام کو منسوخ کرے یا اس میں کوئی تبدیلی کر سکے۔

۷۴- بعض اوقات اس مقام پر سوال کیا جاتا ہے کہ اسلام دوسری شریعتوں کا خاتم کیوں ہے، کیا یہ بہتر

اور مفید نہ ہوتا کہ الٰہی شریعتوں کا نزول جاری رہتا اور رسالت کا دروازہ کھلا رہتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ اس لیے کہ شریعتوں کا نزول کوئی مذاق اور کھیل نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد سابقہ شریعت کے نقص کو دور کرنا یا ایک ایسی شریعت کے ساتھ اس کی تکمیل کرنا ہوتا ہے جو انسانی سطح کے موافق ہو۔ مگر جب اسلامی شریعت کامل اور مکمل ہے اور اس نے ان تمام نقائص کی تکمیل کی ہے جو سابقہ شریعتوں میں موجود تھیں اس لیے کسی نئی شریعت کے آنے کی ضرورت اور داعیہ موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْأَسْلَامَ دِينًا ط

(المائدۃ ۵:۳) آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے۔ اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

اس کمال و اتمام کے بعد کسی اور شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اور جب کوئی اور شریعت نہیں ہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے رسول کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

۷۵- اسلامی شریعت کا عموم، اس کی بقا اور اس کا نسخ، تغییر و تبدیل اور کمی بیشی کو قبول نہ کرنا، ان ساری باتوں کے بارے میں عقل کا فیصلہ بھی یہ ہے اور عدل کا تقاضا بھی کہ اس کے مبادی و احکام اور اس کی لائی ہوئی تمام تعلیمات کچھ اس انداز سے منظم ہوں کہ وہ ہر زمانے اور ہر جگہ لوگوں کے مفادات کو حاصل اور ان کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ ان میں کوئی تنگی نہ آئے اور انسانی معاشرہ خواہ کتنی ہی بلندیوں پر پہنچ جائے اس دین کے قواعد و اصول اس سے پیچھے نہ ہٹیں۔

یہ صفت اللہ کے فضل و کرم سے اسلامی شریعت میں پوری طرح موجود ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے اور اس نے اپنی شریعت کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کر کے عام کیا ہے اور اسے تمام شریعتوں کا خاتم قرار دیا ہے۔ اس نے اس کے قواعد و احکام کو ہر جگہ اور ہر دور کے لیے مناسب بنایا ہے اور وہ بقا و استمرار کے لیے ہر وقت تیار ہے۔

ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ بالکل درست ہے جس کی سب سے بڑی دلیل خود شریعت اسلامیہ، اس کے مبادی و احکام اور اس کے مناہج و افکار کی عملی صورتِ حال ہے۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی اختصار کے ساتھ اس مفہوم کی وضاحت اور اپنی بات کے ثبوت کے لیے چند دلائل پیش کیے جائیں۔

ا-شریعت میں مصلحت کا مقام

۷۶-اس دلیل کی بنیاد یہ ہے کہ اسلامی شریعت لوگوں کے حقیقی مصالح کی حفاظت اور ان سے مفاسد کو دفع کرنے کا کس قدر اہتمام کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی شریعت کا مقصد ہی یہ ہے کہ بندوں کے دنیوی اور اُخروی مفادات کو حاصل کیا جائے اور ان سے دنیوی اور اُخروی نقصانات کو دفع کیا جائے۔ یہاں تک کہ بعض فقہا نے کہا ہے کہ ''شریعت ساری کی ساری مصالح پر مبنی ہے۔ اس میں یا تو انسانوں کے لیے مفادات دلائے جاتے ہیں یا ان سے مفاسد کو دور کیا جاتا ہے''۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قول مبنی بر مبالغہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ ہم نے شریعت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اور اس کے بارے میں فقہا کے جو اقوال نقل کیے ہیں وہ شریعت اسلامی اور اس کے تمام احکام کے ضروری اور ثابت شدہ اوصاف میں سے ہے۔ شریعت کا کوئی حکم اس وصف سے باہر نہیں ہے، نہ ان میں سے کوئی چیز اس عمومی مقصد سے خارج ہے جس کا بندوں کے لیے دنیا اور آخرت میں حصول شریعت اسلامی کے پیش نظر ہے۔ یہاں ہم اس حقیقت کے چند جزوی دلائل بیان کرنا چاہتے ہیں جو پہلی دلیل کا حصہ ہیں۔

۷۷-أ: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی وجہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ. (الانبیاء۲۱:۱۰۷)[اے نبی! ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے] اور رحمت کے ضمن میں قطعی طور پر یہ بات موجود ہے کہ بندوں کے مصالح کا خیال رکھا جائے اور ان سے مفاسد کو دور کیا جائے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ رحمت موجود ہو اور وہ ان مصالح سے غفلت برتے۔

۷۸-ب: احکام کی یہ علت بیان کرنا کہ اس میں مصلحتوں کو حاصل کیا جاتا ہے اور مفاسد کو دور رکھا جاتا ہے انسانوں کو یہ بتانے کے لیے ہوتا ہے کہ مصالح کا حصول ہی اسلام کا مقصود ہے اور اسلام نے جو احکام مقرر کیے ہیں تو ان کا مقصد بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَآ أُولِي الْأَلْبَابِ. (البقرۃ۲:۱۷۹) عقل خرد رکھنے والو! تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قصاص کو بھی اسی مقصد کے لیے قانون کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کی مصلحت 'انسانیت کی زندگی' یعنی امن وامان اور سکون واطمینان قائم کرنا اور جس شخص کے لیے اس کے نفس نے لوگوں پر ظلم کو مزین کیا ہے اس کو سزا دے کر لوگوں کے خون کی حفاظت کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ. (المائدۃ ۹۱:۵) شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟

شراب کی حرمت لوگوں سے اللہ کے ذکر اور نماز سے غافل ہو جانے کے مفسدہ کو روکتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مفسدہ کو دور کرنا بھی مصلحت کے حصول کی ایک شکل ہے۔ کیوں کہ مصلحت کا ایک مثبت پہلو ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جو فائدہ حاصل نہیں ہوا اس کو حاصل کیا جائے، اور دوسرا اس کا منفی پہلو ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ضرر یا فساد کو دور کیا جائے۔ یہی معاملہ بلا استثنا باقی تمام احکام کا بھی ہے۔ اس سے کوئی حکم بھی باہر نہیں ہے، خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات سے یا اس کے علاوہ کسی اور چیز سے۔

ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی حکم کی مصلحتوں اور اس کی تفصیلات سے بے خبر ہو۔ مگر یہ جہالت اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ مصلحت موجود ہی نہیں ہے۔ انسان کبھی کسی دوائی کی مصلحت سے بھی بے خبر ہوتا ہے مگر اس کی جہالت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس میں مصلحت ہے ہی نہیں۔ اگر انسانی قواعد کے بارے میں یہ بات تسلیم ہے تو انسان کے پیدا کرنے والے کے وضع کردہ قواعد میں اسے کیوں تسلیم نہ کیا جائے۔ یہ تو ہوئی ایک بات، دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں جو مصلحت مقصود ہوتی ہے وہ دنیا کی حدود تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اُخروی مصالح تک ممدود ہے۔ یعنی یہ انسان کو دائمی سعادت کے حصول کے لیے تیار کرتی ہے جو اسے اپنے کریم اور رحیم رب کے جوار میں جا کر ملنے والی ہے۔

۹۷۔ ج: اگر قانون پر عمل کرنا انسان کی عادی طاقت سے باہر ہو اور اس کی وجہ سے عمل کرنے میں اس کے لیے مشقت ہو تو اس کے لیے اسلامی شریعت میں رخصت کا قانون موجود ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اگر کسی پر جبر کیا جائے مثلاً اس کو قتل وغیرہ کی دھمکی دی جائے کہ وہ کلمہ کفر زبان سے نکالے تو اس کے لیے ایسا کرنا مباح ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات اضطرار کی وجہ سے (یعنی جب ایک آدمی بھوک سے قریب الموت ہو جائے) حرام مثلاً مردار یا سور کا گوشت کھانا مباح ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً رمضان میں مسافر اور مریض کے لیے افطار کرنا جائز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مشقت کو دفع کرنا بھی مصلحت کی رعایت اور فساد کو دور کرنے ہی کی ایک شکل ہے۔

۸۰-د: تحقیق وتلاش اورغور وفکر سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ بندوں کی مصالح تین قسم کی چیزوں سے متعلق ہوتی ہیں: ضروریات، حاجیات اورتحسینات۔ پہلی قسم کی چیزیں وہ ہوتی ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی کا قیام ممکن نہیں ہوتا۔ اگر یہ فوت ہوجائیں تو فساد نازل ہوتا ہے، افراتفری پیدا ہوتی ہے اور نظام زندگی ملیپٹ ہوکر رہ جاتا ہے۔ وہ 'ضروریات' یہ ہیں: حفظ جان، حفظ مال، حفظ عقل، حفظ نسل اور حفظ مال۔ 'حاجیات' وہ ہیں جن کی لوگوں کو زندگی میں آسانی اور سہولت کے لیے حاجت پڑتی ہے۔ اگر یہ فوت ہوجائیں تو زندگی کا نظام خراب نہیں ہوتا مگر لوگ حرج اور تنگی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ 'تحسینات' وہ ہیں جن کا مرجع محاسنِ عادات اور مکارمِ اخلاق ہوتے ہیں۔ اگر یہ فوت ہوجائیں تو لوگوں کی زندگی سیدھے اور صحیح منہج سے نکل جاتی ہے جس کا تقاضا فطرت سلیمہ اور عادات کریمہ کو ہوتا ہے۔

شرعی احکام سارے کے سارے یہی کام کرتے ہیں کہ ضروریات، حاجیات اور تحسینات سے متعلق، لوگوں کے مصالح کے حصول اور تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔

۸۱-ضروریات کے سلسلے میں تحفظ دین، یعنی دین کی اقامت اور اس کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کی خاطر عبادات کا تقرر کیا گیا ہے اور اس کے تحفظ کی خاطر جہاد، سزائے مرتد اور ان لوگوں کو تعزیر دینے کا حکم دیا گیا ہے جو لوگوں کے عقائد خراب کرتے ہیں۔

نفس (جان) کو وجود میں لانے کے لیے نکاح مشروع کیا گیا ہے[1] اور اس کے تحفظ کے لیے اس شخص کے بارے میں قصاص کا حکم دیا گیا ہے جو انسانی جان کو قتل کردیتا ہے۔ اسی مقصد کے لیے یہ بات بھی حرام کی گئی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ہلاک کرے اور ہر شخص پر یہ بات لازم کی ہے کہ وہ اپنے نفس سے ضرر کو دور کرے۔

عقل کے تحفظ کے لیے شراب کو حرام کیا گیا ہے اور اس کے پینے والے کے لیے سزا مقرر کی گئی ہے۔

نسل کو قائم رکھنے کے لیے نکاح کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے تحفظ کے لیے زنا اور قذف[2] کی سزائیں

۱-مولف کی یہ بات محل نظر معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں نفس کو وجود میں لانا تشریعی نہیں بلکہ تکوینی امر ہے جس کا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے۔ البتہ اس کا تحفظ تشریعی امر ہے اور اس کے بارے میں انسان مکلف ہے۔ نکاح کا مقصد جیسا کہ مولف نے آگے خود بیان کیا ہے، نسل کا تحفظ ہے۔ (مترجم)

۲-مولف کی یہ بات بھی محل نظر ہے، کیوں کہ حدقذف کا مقصد نسل کا نہیں بلکہ عزت کا تحفظ ہے۔ (مترجم)

مقرر کی ہیں۔اسی طرح اس کے لیے حاملہ عورت کے حمل کو تلف کرنے کو بھی حرام کیا گیا ہے۔

مال کے حصول کے لیے معاملات کی مختلف قسمیں جیسے خرید وفروخت وغیرہ کو مشروع کیا گیا ہے اور اس کے تحفظ کے لیے لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانے کو حرام کیا گیا ہے اور اسی لیے مال تلف کرنے کو بھی حرام کیا گیا ہے۔اسی کی خاطر ناسمجھ آدمی کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے اور سودخواری کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اسی لیے چوری کی سزا مقرر کی گئی ہے۔

۸۲- حاجیات کے بارے میں جب آدمی کو مشقت کا سامنا کرنا پڑے تو اس کے لیے رخصتیں مقرر کی گئی ہیں۔ازدواجی زندگی گزارنا اگر بس سے باہر ہو جائے تو اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے طلاق کو مشروع کیا گیا ہے۔اسی طرح قتل خطا کی صورت میں قاتل کے عاقلہ پر دیت لازم کر دی گئی ہے۔

۸۳-تحسینات کے بارے میں جسم اور لباس کی طہارت مشروع کی گئی ہے، اسی کے لیے ستر کے مقامات کو چھپانے اور عبادات کے وقت زیب وزینت کا حکم دیا گیا ہے۔اسی مقصد کے لیے یہ بات منع کی گئی ہے کہ ایک شخص دوسرے کی بیع پر بیع کرے۔اسی طرح اس مقصد کے لیے جنگوں میں بچوں اور عورتوں کے قتل سے بھی روکا گیا ہے۔[1]

۸۴-نصوص شریعت کی تحقیق وتلاش سے اس بات کی دلیل ہاتھ آتی ہے کہ اسلام نے لوگوں کے لیے جو احکام مقرر کیے ہیں ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ان کی ایسی ہی ضروریات، حاجیات، اور تحسینات کا تحفظ ہو۔یہی انسانوں کی دنیا وآخرت کے مصالح ہیں۔اور جب مصالح اور مفاسد میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو پھر اس چیز کو ترجیح دی جائے گی جس کی مصلحت بڑی ہو یا اس کو جس کا فساد کم ہو۔مثلاً قاتل کو قتل کرنا مفسدہ ہے کیوں کہ اس میں ایک جان کا ضیاع ہے۔مگر پھر بھی یہ مفسدہ جائز ہے کیوں کہ اس میں ایک بڑی مصلحت موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے انسانیت کی زندگی کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ستر کھولنا مفسدہ ہے مگر جب آپریشن کے لیے اسے کھولنا ضروری ہو جائے تو یہ جائز ہو جاتا ہے کیوں کہ جان کو ہلاکت سے بچانے کی مصلحت ستر کھولنے کے مفسدہ سے بہت زیادہ ہے۔ذخیرہ اندوزوں کو کھلا چھوڑ دینا، ان سے کوئی تعرض نہ کرنا اور انھیں اپنی اس حرکت سے نہ روکنا ان کے لیے مصلحت ہے مگر اس میں ایک بڑا فساد پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے لوگ تکلیف

۱- بیع پر بیع کی ممانعت کا تعلق تحفظ مال، اور عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت کا تعلق تحفظ جان کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔(مترجم)

میں مبتلا ہوں گے۔اس لیے ذخیرہ اندوزی سے روکنا جائز ہے۔ملک کے دفاع کے لیےلڑنے میں یہ فساد ہے کہ اس سے فوجی کی جان کو ہلاکت کے لیے پیش کیا جاتا ہےلیکن دشمن کواپنے ملک میں گھسنے دیناچند جانوں کے ضیاع سے زیادہ فساد کی بات ہے۔چنانچہ دشمن سےلڑکراسے اپنے ملک سے پرے رکھنا اس سے بڑی مصلحت ہے کہ چند نفوس کوان کے خلاف مقابلے پر بھیج کر ہلاکت کے لیے پیش کیا جائے۔

شریعت کے احکام اس طرح ایک ہی انداز سے جاری ہوتے ہیں اوران کی بنیاد ایک ہی ہے کہ مصالح کو حاصل کیا جائے اور مفاسد کو دور کیا جائے۔

۸۵- اس بنا پر جو بھی جائز اور حقیقی مصلحت سامنے آتی ہے یا کوئی بھی فساد کی بات نازل ہوتی ہے تو اسلامی شریعت اس بات کو مباح کرتی ہے کہ اس سے مصلحت کے حصول اور فساد کو دفع کرنے کے لیے فقہ اسلامی کے مقررہ قواعد کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعے حکم نکالا جائے۔کیوں کہ جیسا کہ مشہور فقیہ علامہ ابن القیم فرماتے ہیں:

شریعت کی بنیاد اور اساس بندوں کی دنیا وآخرت کی حکمتوں اور مصلحتوں پر ہے۔شریعت پوری کی پوری عدل، پوری کی پوری رحمت، پوری کی پوری مصلحت اور پوری کی پوری حکمت ہے۔ ہر مسئلہ جو عدل سے ظلم کی طرف، رحمت سے غضب کی طرف، مصلحت سے فساد کی طرف اور حکمت سے عبث کی طرف نکلتا ہے تو وہ شریعت کا حصہ نہیں رہتا، اگرچہ تاویل کرکے اسے شریعت میں داخل کیا جائے۔
شریعت بندوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے عدل اور اپنی مخلوق کے مابین اس کی رحمت کا نام ہے۔

اس بحث سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اسلامی شریعت،اور اپنی نصوص میں اس نے جو احکام پیش کیے ہیں،اوران کی بنیاد پر صحیح اجتہاد کے ترازو سے جو اجتہادی احکام نکالے گئے ہیں یہ سب مل کر کبھی اس بات سے تنگی محسوس نہیں کرتے کہ لوگوں کی جائز ضروریات کو پورا کریں اور نہ یہ سب اس بات ہی سے عاجز ہو سکتے ہیں کہ کسی بھی زمان ومکان میں لوگوں کی حقیقی مصلحتوں کو حاصل کریں۔

۲- شریعت کے اصول وفروع کی حقیقت

۸۶-شریعت کے احکام دو قسم کے ہیں: ایک وہ جو قواعد وضوابط اور عمومی اصول ومبادی کی صورت میں

نازل ہوئے ہیں اور دوسری وہ جو تفصیلی احکام کی شکل میں نازل ہوئے ہوں۔ یہ دونوں قسمیں اس طریقے سے وارد ہیں کہ یہ ہر زمان ومکان میں شریعت کے عموم اور اس کی بقا کے موافق ہیں۔ اس مقام پر ان قسموں کے بارے میں اختصار کے ساتھ گفتگو ضروری ہے۔

۱۔عمومی قواعد واصول

۸۷۔شریعت میں کچھ عمومی قواعد واصول ہیں جن کے ضمن میں بہت سے عمومی احکام آتے ہیں اور ان کو ہر جگہ اور ہر دور میں آسانی وسہولت کے ساتھ منطبق کیا جاسکتا ہے۔ وہ کچھ اس انداز سے وارد ہیں جس کی وجہ سے انطباق کی یہ سہولت اور آسانی ممکن بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بلند ترین معانی، رفعت وبلندی کے اس مقام پر ہیں کہ انسانی معاشرہ خواہ کتنی بلندیوں پر پہنچے، یہ اصول وقواعد اس سے پیچھے نہیں رہتے۔ اس بنا پر لوگوں کی کوئی جدید سے جدید مصلحت بھی اس کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔ اسی طرح یہ قواعد واصول ان جزوی احکام اور فروعی مسائل کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جو اِن اُصول سے مستنبط ہوتے ہیں۔

۸۸۔**اولاً، شوریٰ کا اصول**:۔ یہ اسلامی نظام حکومت میں شریعت کا بنیادی اصول ہے۔ یہ مسلمانوں کی اوصاف میں سے وہ وصف ہے جس سے وہ اپنی اجتماعیت اور حکومت واقتدار کے براہ راست امور کو انجام دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ أَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۸) وہ اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے فرماتا ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ. (آل عمران ۳:۱۵۹) اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو۔

یہ اصول انسانوں کے درمیان ایک اچھی حکومت کا اعلیٰ ترین، عادلانہ اور پائیدار اصول ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی اصول اس اصول کا نعم البدل بن سکے۔ یہ اصول کافی حد تک عموم اور وسعت کے ساتھ وارد ہے۔ یہ ہر اس صحیح تنظیم پر محیط ہے جو اس اصول کے انطباق کے لیے بنائی جائے۔ اس کی کچھ تفصیل اُس مقام پر آئے گی جہاں ہم اسلامی نظام حکومت کے بارے میں بحث کریں گے۔

۸۹- **ثانیاً، مساوات کا اصول**:- یہ بھی اسلام کے عظیم اصولوں میں سے ہے۔ اسلامی قانون کے تمام پہلوؤں میں اس کے بہت سے مظاہر موجود ہیں۔ مثلاً قانون کے سامنے مساوات، احکام کے انطباق میں مساوات، مراکز قانون میں مساوات (جب کہ افراد ان شرائط میں برابری رکھتے ہوں جو اسلامی شریعت نے ان کے لیے مقرر کی ہیں) اور جواب دہی میں مساوات (جب کہ افراد کے اسبابِ موجبہ میں برابری کے مقام پر ہوں)۔

یہ عظیم اصول تو عملی طور پر زندگی میں منطبق ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عملی جامہ پہنانے پر بڑی توجہ دی۔ سنت نبوی میں یہ بات آئی ہے کہ بنومخزوم کی ایک عورت نے چوری کی [اور اس پر جرم ثابت ہوا]۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ اس کی سفارش لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللهِ؟ کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کر رہے ہو؟

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّمَا أَهْلَکَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ، وَأَيْمُ اللهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا. تم سے پہلے والے لوگ اسی وجہ سے تو ہلاک ہو گئے تھے کہ ان میں جب کوئی شریف آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب ان میں سے کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

اس میں شک نہیں کہ مساوات اور اس کی بنیاد پر مبنی اور اس سے مستنبط ہونے والے احکام شریعت کی وہ بنیاد فراہم کرتے ہیں جس سے عقل سلیم خوشی سے سرشار ہوتی ہے اور جسے فطرت سلیمہ قبول کرتی ہے، جس سے بہت سے معاملات درست ہوتے ہیں اور مختلف امور کی اصلاح ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اصول ہر زمان و مکان کے لیے صالح ہے۔

۹۰- **ثالثاً، عدالت کا اصول**:- عدالت اسلام کا ایک نمایاں اصول ہے۔ اس کی یہ اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام ہر معاملے میں اس کا حکم دیتا ہے اور لوگوں کے درمیان اسی کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے، وہ ہر دُور و نزدیک اور ہر دوست اور دشمن کے بارے میں، عدالت سے لے کر بازار تک اور سرکاری اداروں سے

لے کر گھریلو معاملات تک میں اس کے مقتضا کو لازم پکڑتا ہے۔ یہاں تک کہ باپ اپنی اولاد کو کوئی چیز دیتا ہے تو اس میں بھی عدل کا حکم دیا گیا ہے۔

عدل کی روح اور اس کا اصل جوہر یہ ہے کہ ہر حق دار تک اس کا حق پہنچایا جائے اور ہر چیز کو اپنے مناسب مقام پر استعمال کیا جائے۔ عدل کا یہ وسیع مفہوم انسان کے تمام افعال، دوسروں کے ساتھ اس کے ہر قسم کے معاملات، اس کے رب کے حوالے سے اور اس کے علاوہ دوسرے انسانوں کے بارے میں اس کی ذمہ داریوں پر حاوی ہے۔

عدل کے موضوع پر قرآن کریم میں جو نصوص وارد ہیں ان میں دو نصوص یہ ہیں:

۱- إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا لا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ط (النساء۴:۵۸) مسلمانو! اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

۲- يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى. (المائدۃ۵:۸) اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا یہ عظیم اصول لوگوں کی مصلحتوں کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور یہ ہر صحیح نظم میں رہنمائی کی گنجایش رکھتا ہے جو عدل قائم کرنا چاہتا ہو اور یہی اس کی منزل مقصود ہو۔ چنانچہ اگر کہیں یہ دیکھنے میں آئے کہ عدالت میں عدل قائم کرنے کے لیے لازمی طور پر عدالتوں کو درجات میں تقسیم کرنا ضروری ہے: ایک ابتدائی درجہ اور ایک ثانوی درجہ، یا یہ دیکھا جائے کہ عدالت میں ایک سے زیادہ ججوں کا تقرر ضروری ہے، یا پھر یہ کہ عدالت کے فیصلوں کے لیے زیادہ گہرائی کے ساتھ غور و فکر کرنے کرنے والا شعبہ تشکیل دیا جائے تو اس طرح کے امور جائز ہیں بشرطیکہ اس میں یہ بات یقینی ہو کہ عدالت میں عدل صحیح طریقے سے ہو رہا ہے۔

۹۱- **رابعاً، لاضرر ولاضرار کا قاعدہ**:- یہ ایک حدیث نبوی ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ شریعت کے حکم

سے ضرر مرفوع ہے۔ یعنی کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ضرر کو اپنے اوپر واقع کرے یا کسی اور کے اوپر۔ اسی طرح ضرر کا ضرر کے ساتھ مقابلہ بھی جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فضول کام ہے اور اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر ایک آدمی نے دوسرے کا مال جلا دیا تو دوسرے کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بھی اس کا مال جلا دے۔ اس کو چاہیے کہ اس سے عوض کا مطالبہ کردے۔ اور جب ضرر ممنوع ہے تو جب کوئی ضرر واقع ہو جائے تو اس کو رفع کرنا لازم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قاعدے کی بنیاد پر ایک اور فرعی قاعدہ نکلا اور وہ یہ کہ اَلضَّرَرُ یُزَالُ. ''ضرر کو زائل کیا جائے گا۔'' پھر اس طرح کے اور بہت سے فروع و احکام ہیں جن کی بنیاد اسی قاعدے پر ہے۔ ان میں حق شفعہ کو برقرار رکھنا، اپنے حق کے استعمال میں اسراف کی ممانعت، اور حکومت کے ایسے اقدامات شامل ہیں جو لوگوں کو ضرر سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے اٹھائے جاتے ہیں۔ جیسے معذوروں یا ایسے لوگوں کو سرکاری نگرانی میں لینا جو خاص نگرانی میں ملک کے اندر لائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مخصوص حالات میں نرخ بندی کرنا وغیرہ۔

۲- تفصیلی احکام

۹۲- شریعت کے تفصیلی احکام تو بہت زیادہ ہیں جن کی شرح و بیان اور ان کی تحقیق و تلاش کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ اس وجہ سے ہم ان احکام میں غور و فکر، تحقیق و تلاش اور ان پر نظر مرکوز کرنے کے لیے صرف ان کے ناموں اور مثالوں پر اکتفا کریں گے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ یہ بقا اور عموم کی کس قدر صلاحیت رکھتے ہیں۔

شریعت کے احکام جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، عقیدے کے امور سے متعلق ہوں گے یا اخلاق کے، یا پھر عبادات اور معاملات کے، اس وجہ سے ہم ان قسموں میں سے ہر قسم کی چند مثالیں پیش کریں گے۔

۹۳- **عقیدے کے احکام** میں ضروری ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا مسئلہ بالکل بدیہی مسئلہ ہے جس پر ہر عقل سلیم کا مالک ایمان لاتا ہے اور ہر فطرت سلیمہ اسے قبول کرتی ہے۔ اس کے ثبوت پر وہ دلائل و براہین موجود ہیں جو کسی دوسرے بدیہی مسئلے پر موجود نہیں ہیں۔ ان میں سے چند دلائل ہم نے ارکان اسلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے پیش کیے ہیں۔ اس بنا پر یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایک دور یا لوگوں کی ایک نسل آئے،

جس میں کہا جائے کہ ''ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور اس سے نکلنے والے عقیدے کے دوسرے مسائل اب پرانے ہو گئے ہیں، یہ عصر حاضر کے ساتھ موافق نہیں ہیں اور عقل ان کی تائید نہیں کرتی۔'' حالانکہ عقل تو ثابت شدہ حقائق سے انکار نہیں کرتی، بلکہ ان کی تائید کرتی ہے اور انھیں دل میں مزید گہرا کرتی ہے۔ دوسری طرف ثابت شدہ حقائق کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ثابت رہتی ہیں اور عقل اس ثبوت کی تائید کرتی ہے اور اس کا اعتراف کرتی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایمان باللہ ان ثابت شدہ حقائق میں سے ہے جو ہمیشہ ثابت رہتے ہیں اور ان کا کسی بھی دور میں بدلنا یا ٹوٹنا ممکن نہیں۔ یہ اس نوعیت کا مسئلہ ہے جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔

۹۴۔**عبادات کے احکام** میں سے ایک نماز اور روزے اور اس جیسے دوسرے عبادات کی فرضیت ہے۔ اور عبادات کے مسائل ایمان کے لوازمات اور اس کے تقاضوں میں سے ہیں۔ کیوں یہ بندے کے اپنے رب کے ساتھ تعلق اور اپنے عظیم خالق کے ساتھ وفاداری کو منظم کرتے ہیں۔ انسان سے یہ صفت کسی زمانے اور کسی دور میں الگ نہیں ہو سکتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اور نتیجتاً وہ اس چیز سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی فرض ہے۔ وہ اپنے رب کے ساتھ تعلق سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ عبادات نفس کے تزکیے اور اس کی طہارت، حق کے معانی کو سمیٹنے، اسے ہر کدورت سے پاک کرنے، اسے ایک رب کے ساتھ جوڑنے، بھلائی کی طرف دھکیلنے اور برائی سے روکنے کا ذریعہ ہیں۔ قرآن کریم نے ان میں سے بعض معانی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (العنکبوت ۲۹:۴۵) بے شک نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معاشرہ اس وقت بہت بڑی سعادت سے مالا مال ہو گا جب اس میں ان مثالی نمونوں کی کثرت ہو گی جنھیں اسلامی عبادات نے صیقل بنا دیا ہو۔ اُس وقت اِس معاشرے میں بھلائی یقینی طور پر بڑھ جائے گی اور شر اگر ختم نہ ہو تو بہت زیادہ کم ہو جائے گا۔

یہ سب کچھ ہر دور اور ہر زمانے میں انسانوں کی اجتماعیت کی مصلحت میں ہے۔ اس وجہ سے ہر انسانی معاشرے میں اور خاص طور پر بیسویں صدی میں اور اس کے بعد آنے والی صدیوں میں عبادات کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

۹۵-**اخلاق کے احکام** جیسے سچائی، وفاداری، امانت، عہد کا پاس، بھلائی میں تعاون، جھوٹ، دھوکہ، خیانت اور برائی میں عدم تعاون، کام چوری، ناجائز فائدہ اٹھانے، ظلم اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا حرام ہونا۔ میں کہتا ہوں کہ فرضیت اور حرمت کے لحاظ سے یہ احکام ہر انسان اور ہر اس معاشرے کے لیے ضروری ہیں جو اپنے افراد کے درمیان خیر خواہی اور بھلائی کو پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہو۔ اخلاق کے بغیر علوم وفنون کی ترقی کسی کام کی نہیں ہے۔

آج کی دنیا جس بحران سے گزر رہی ہے، معاشروں میں جو اضطراب پایا جاتا ہے، افراد کے درمیان تعلقات کی جو بری حالت ہے اس کا انجام دلوں میں اخلاقی اقدار کی دگرگونی اور حد سے گزرنے کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ کیوں کہ یہ اپنی اصل اور جوہر کے لحاظ سے ایک اخلاقی بحران ہے۔ شریعت نے اخلاق کے بارے میں یہ تاکید کر کے کسی قسم کے اسراف یا مبالغے سے کام نہیں لیا۔ اس لیے کہ اس نے صرف اسی قدر اخلاق کی تاکید کی ہے جس حد تک اصلاحی قواعد کے، مضبوط بنیادوں پر قیام کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ اس اصلاح کا آغاز نفس سے ہوتا ہے۔ ان امور کے ثابت ہونے کے بعد ایک سیدھا سادھا انسان اخلاق کی سخت ضرورت محسوس کرتا ہے۔

یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی دن ایسا بھی آئے جب کہا جائے کہ ''سچائی، عدل، عہد کا پاس اور ظلم سے اجتناب غلط اور فرسودہ خیالات ہیں جو ہمارے دور اور ہمارے زمانے کے لیے درست نہیں۔'' سوائے اس کے کہ انسان جاہلیت کے ایسے گڑھے میں گر جائے جس میں پرانی جاہلیت کے لوگ بھی مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ اخلاق کے مسئلے کی مزید تفصیل بعد میں آئے گی۔

۹۶-دوسرے **تفصیلی احکام**، جن کا تعلق معاملات یعنی افراد کے باہمی روابط سے ہے، بھی عموم ودوام کے قابل ہیں، کیوں کہ ان کی بنیاد اسی بات پر قائم ہے کہ ان کی ضرورت ہمیشہ قائم ودائم ہے اور کوئی دوسری چیز کبھی ان کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کوئی چیز لوگوں کی مصلحت کو اس طرح پورا نہیں کر سکتی جس طرح یہ احکام پورا کرتے ہیں۔

۹۷-ان احکام میں خاندان کی تنظیم، ازدواجی احکام، کفالت اور ولایت کے احکام، نسب اور میراث کے احکام، طلاق اور نفقہ وغیرہ کے احکام شامل ہیں۔ یہ تمام احکام ایسے انداز سے وارد ہیں کہ وہ درست بھی

ہیں اور لوگوں کے لیے خیر اور بھلائی کے حصول کے لیے کافی بھی۔ ان کی جگہ کوئی چیز ان کا بہتر بدلہ نہیں ہوسکتی۔

مثلاً نکاح کی تنظیم میں انتہائی سادگی برتی گئی ہے اور یہ اشکالات اور تکلفات سے بالکل پاک ہے۔ اس میں اتنا ہی کافی ہے کہ گواہوں کی موجودگی میں مرد ایجاب کرے اور عورت قبول کرے۔ پھر اس پاکیزہ اور شریفانہ عقد کو کسی دھوکے بازی اور نقصان سے بچانے کے لیے عورت کے سرپرست کی رضامندی حاصل ہو تو اور بھی بہتر ہے۔ نکاح کی صحت کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کسی خاص شخص کے ہاتھ پر یا کسی مخصوص مقام پر انجام پائے، یا اس میں کسی خاص کیفیت، مخصوص زبان اور متعین لہجے کا استعمال ضروری ہو۔ نکاح کی یہ سادہ صورت اسے اس قابل بناتی ہے کہ اس کو بقا اور دوام حاصل ہو، اور عقل میں اس سے بہتر کوئی صورت آ نہیں سکتی۔

طلاق کا قانون بھی بالکل فطری اور معقول قانون ہے کیوں کہ یہ درست نہیں ہوگا کہ دو افراد کو ہمیشہ کے لیے ازدواجی رشتہ قائم رکھنے پر مجبور کیا جائے، باوجودے کہ ان کے درمیان ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں جو علیٰحدگی کا تقاضا کرتے ہوں۔ معقول بات یہی ہے کہ اس صورت میں ان کو الگ ہونے کی اجازت دی جائے تا کہ ہر شخص اپنی راہ لے اور کسی دوسرے ازدواجی رشتے میں داخل ہو کر قسمتی آزمائی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک نے اپنے عقیدے کے لحاظ سے عیسائی مذہب میں حرام ہونے کے باوجود میاں بیوی کے درمیان جدائی کو جائز قرار دیا ہے۔ پھر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شوہر کو طلاق کا اختیار کیوں دیا گیا ہے اور عورت کو اس حق سے کیوں محروم رکھا گیا ہے، اس لیے کہ عورت اگر چاہے تو اس کو حق ہے کہ نکاح کے وقت اپنے لیے حق طلاق کی شرط رکھے۔ اس کی یہ شرط معتبر ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر عورت کو شوہر کی طرف کسی ایسے نقصان کا اندیشہ ہو جس کا تدارک طلاق کے علاوہ کسی اور طریقے سے ممکن نہ ہو تو وہ [خلع کے لیے] عدالت سے رجوع کرسکتی ہے۔

میراث کی تنظیم اور وارثوں کے حصوں کا تقرر بھی کچھ اس اعلیٰ انداز سے ہوا ہے کہ اس میں مختلف اعتبارات کا لحاظ رکھا گیا ہے جیسے وارث کا رشتہ، اس کی ضرورت، سرمائے کا خرچ اور تقسیم وغیرہ۔ اعتبارات کے اس لحاظ نے اس نظام کو ایسی بنیادوں پر قائم کیا ہے کہ یہ نظام ہر زمان و مکان کے لیے مناسب اور کارگر

۹۸- سود کی حرمت، جو مالی معاملات کے ساتھ متعلق چیز ہے، اس کا حکم بہت تفصیلی ہے اور وہ نسخ وتبدیل کی کوئی گنجایش نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ سود کے مفاسد اور اس کی خرابیاں ذاتی ہوتی ہیں۔ وہ اس سے کبھی الگ نہیں ہوتیں۔ اس کے مظاہر میں سے ایک مظہر یہ ہے کہ اس سے معاشرہ پگھل جاتا ہے اور اس میں فساد برپا ہوتا ہے۔ اس سے ظلم کی راہ ہموار ہوتی ہے اور افراد کے درمیان معاشرتی تعاون کا فقدان ہو جاتا ہے۔ ایسے فاسد معاشرے کا علاج یہ ہے کہ اس میں جڑوں سے اصلاح کا کام کیا جائے، نہ کہ اس کے فساد اور ٹیڑھ کو اپنی حالت پر رہنے دیا جائے اور ایسی قانون سازی کی جائے جو اس فساد اور ٹیڑھ کے موافق ہو۔

۹۹- شریعت کی سزائیں بھی کچھ اس انداز سے وارد ہیں جن میں چند مخصوص جرائم کی سزا تو بالکل واضح اور تفصیلی طور پر بیان کی گئی ہے جیسے ارتداد، زنا، قذف، چوری، راہزنی، شراب خوری اور قتل۔ اس کے علاوہ جو دوسرے جرائم ہیں ان کا تعین شریعت نے قاضی پر چھوڑ دیا ہے اور انھیں تعزیری جرائم کا نام دیا ہے۔ ان پر جو سزائیں دی جاتی ہیں ان کو تعزیری سزائیں کہتے ہیں۔

شریعت نے جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ سب کی سب خیر وصلاح اور عدل پر مبنی ہیں۔ یہ معاشرے کو شر اور فساد سے بچاتی ہیں۔ کوئی بھی اعلیٰ معاشرہ ان سزاؤں سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ ان کی بنیاد عدل پر قائم ہے۔ ان میں مجرم کے لیے اس کے مناسب زجر وتوبیخ کا سامان ہوتا ہے۔ ان سے فرد اور معاشرے دونوں کی مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔

ارتداد کی سزا کی دو بنیادیں ہیں: ایک، مسلمان کے دل میں یہ فکر پیدا کرنا کہ وہ اسلامی احکام کی پابندی کرے اور دوسری، معاشرے کو فساد سے بچانا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک آدمی جب اسلام کو قبول کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے اسلامی احکام اور ان کی بنیادوں کو قبول کرلیا۔ اب وہ ان سے باہر بھی نہیں نکلے گا اور ان کو منہدم بھی نہیں کرے گا۔ اب جب وہ ارتداد کا اقدام کرتا ہے تو وہ اسلام میں خلل کا ذریعہ بنتا ہے اور اس خلل کی سزا کا مستحق بنتا ہے۔ یہ اس کا ایک پہلو ہے۔ دوسرے پہلو کے لحاظ سے مرتد ہونا اور ایک مرتبہ جان بوجھ کر اسلام کا اقرار کرنے کے بعد علانیہ ارتداد کا اظہار کرنا جماعت میں فساد برپا کرنا اور اس کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس لیے کہ اگر مرتد اعلان نہ کرتا تو ہمیں اس کا علم ہی نہ ہوتا۔ اور وہ اپنے ارتداد کا اعلان بھی اسی لیے کرتا ہے کہ لوگوں کو

اپنے عقیدے اور ایمان میں شک ہو جائے، ان کے درمیان اضطراب پیدا ہو جائے اور اس حکومت کا پورا ڈھانچہ اضطراب کا شکار ہو جائے جس نے اسلام کو اپنے قیام وبقا اور اپنے اہداف کے لیے اساس بنایا ہوا ہے۔

اس لیے ضرورت تھی کہ ایسے آدمی کو سخت سزا دی جائے تاکہ فرد اور معاشرے کو اور خود اس ریاست کو جو اسلامی اصولوں پر قائم ہوئی ہو، اس فساد سے بچایا جائے۔

زنا کی سزا کی بنیاد یہ ہے کہ اخلاقیات کا التزام ہو اور فرد، خاندان اور معاشرے کو بیماریوں کے پھیلنے، نسب کے خلط ملط ہونے، گھروں کے ویران ہونے، شادی سے فرار اور اس جیسے دیگر مفاسد سے دور رکھا جائے۔ شریعت تو اپنے اصول سے لے کر اپنے اہداف تک نام ہی اسی چیز کا ہے کہ اخلاق کی حفاظت ہو اور لوگوں کو فساد سے بچایا جائے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اعلیٰ اقدار کا حامل ہر معاشرہ اس سزا کا خیر مقدم کرتا ہے۔ وہ اس سے کوئی تنگی محسوس نہیں کرتا۔ وہ اس میں خیر اور مصلحت کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔ البتہ اس میں یہی نظر آتا ہے کہ یہ سزا اُن فسادی عناصر کے لیے موت کا پیغام ہے جو دوسروں کی عزتوں کے ساتھ کھیلنے اور ان کے ساتھ مذاق کرنا چاہتے ہیں۔

چوری کی سزا یعنی ہاتھ کاٹنا لوگوں کے مالوں پر ظلم واعتدا کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں اپنے مال کے بارے میں اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ کا کٹ جانا اس بات کی بہت تھوڑی قیمت ہے کہ معاشرے میں لوگوں کو اپنے مال کے حوالے سے اطمینان حاصل ہو جائے۔ ایک خیانت کار اور مجرم ہاتھ کا کٹنا اس کینسر زدہ ہاتھ کے کٹنے کی طرح ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر فیصلہ کریں کہ جسم کی حفاظت کے لیے اس کو کاٹنا ضروری ہے۔

چوروں کے لیے جیل کی سزاؤں نے اس کی راہ میں نہ کوئی رکاوٹ پیدا کی ہے اور نہ اس کے واقعات میں کمی کی ہے۔ اس کے برعکس ماضی میں کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ ہاتھ کاٹنے سے مجرم اپنے جرم سے باز آئے ہیں۔ یہ سزا موجودہ دور میں بھی اس بات کی پوری صلاحیت رکھتی ہے کہ چوری کم ہو جائے اور اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔

اس سزا کا پرانا ہونا اس کی صلاحیت میں کوئی کمی نہیں کرتا۔ کیوں کہ ایسا نہیں ہے کہ ہر پرانی چیز خراب ہو

اور نہ ایسا ہی ہے کہ ہر نئی چیز اچھی ہو۔ کسی چیز کی صلاحیت کا اندازہ اس کے جدید یا قدیم ہونے سے نہیں بلکہ اس کی ذات اور اس کی منفعت سے لگایا جا سکتا ہے۔

اسلامی شریعت میں قتل عمد کی سزا قصاص ہے۔ یعنی مجرم کو قتل کرنا۔ قصاص مقتول کے وارثوں کا حق ہوتا ہے۔ وہ اس کا مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں اور عدالت کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ ان کے دعوے کو مسترد کرے۔ اسی طرح وارثوں کو یہ بھی حق ہوتا ہے کہ وہ قاتل کو معاف کریں یا اس کے ساتھ دیت پر مصالحت کر لیں۔ معافی یا مصالحت کی صورت میں عدالت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ قاتل کو کوئی تعزیری سزا مثلاً قید یا کوڑوں کی سزا بھی دے۔

قتل عمد کے جرم کی یہ تنظیم بھی ایسی کامل ہے کہ اس نے انسانی طبیعت کے کسی پہلو سے بھی غفلت نہیں برتی۔ مثلاً ایک طرف قاتل سے انتقام لینے کا جو جذبہ موجود ہے اس کا خیال رکھا گیا ہے اور اس کے لیے عادلانہ قصاص کا طریقہ مقرر کیا ہے، اور دوسری طرف معاشرے کی منفعت کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔[۱] معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت کی تمام تفصیلی سزائیں ایسے معانی اور اوصاف پر قائم ہیں جو ثابت شدہ اور مسلّم ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ یہ ہر اس معاشرے کے لیے مناسب ہیں جو اعلیٰ اقدار پر قائم ہو اور چاہتا ہو کہ امن و اطمینان کے ساتھ رہے۔

۱۰۰- رہی تعزیری سزائیں جو اُن تمام جرائم پر دی جا سکتی ہیں جن کے بارے میں شریعت نے سزاؤں کا تعین نہ کیا ہو۔ قاضی ان کو بطور سزا نافذ کرنے میں اس بات کا لحاظ کرے گا کہ جرم کا ضرر کتنا ہے اور معاشرے کو اس سے پہنچنے والے نقصان کی صورتِ حال کیا ہے۔ اسی طرح وہ مجرم کے حالات اور جرم کے پس منظر کو بھی ملحوظ خاطر رکھے گا۔ اس طرح کے امور کا لحاظ کرنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا. (الشوریٰ ۴۲:۴۰) کی روشنی میں کسی مناسب سزا کا تعین کرے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت اسلامی میں نظام تعزیرات ایک مجرب نظام ہے جو مختلف حالات میں جرائم کی تدارک کے لیے رہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔ اور اسی لیے وہ ہر دور اور ہر جگہ لیے مناسب اور موزوں ہے۔

۱- تیسری جانب اس میں یہ لحاظ بھی رکھا گیا ہے کہ اگر مقتول کے ورثا انسانی جذبے کے تحت قاتل کو معاف کرنا چاہیں تو اس کے لیے بھی راستہ کھلا ہے۔ کیا شان ہے قانونِ الٰہی کی!! (مترجم)

۳-اسلام کے مصادر

۱۰۱-شرعی احکام کے مصادر دو قسم کے ہیں: پہلی قسم مصادر اصلیہ کی ہے اور وہ قرآن وسنت ہیں۔ دوسری قسم تابع مصادر کی ہے جو مصادر اصلیہ کی بنیاد پر قائم ہیں، جیسے اجماع اور اجتہاد کی مختلف قسمیں جیسے قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ وغیرہ۔

یہ سارے مصادر مل کر اسلامی شریعت کو اہلیت واستعداد کے اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جس میں اس کو عموم اور بقا نصیب ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ جب بھی کوئی نیا واقعہ پیش آتا ہے تو اسلامی شریعت کے پاس اس کا حل موجود ہوتا ہے۔ یا تو کوئی صریح نص ہوتی ہے یا پھر اجتہاد صحیح کے ذریعے اس کا حکم معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں نئے واقعات کے رونما ہونے سے اسلامی شریعت کو کسی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ لوگوں کی ضروریات اور ان کے مصالح کے بارے میں تنگی سے کام نہیں لیتا۔

۱۰۲- ہم نے جو دلائل وبراہین پیش کی ہیں ان سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی شریعت ایک ایسی شریعت ہے کہ اس میں زمانی اور مکانی عموم کی تمام اقدار بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر دور میں تمام لوگوں کے لیے درست ہوتی ہیں۔ یہ نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔

۴
جزا و سزا

۱۰۳- اسلام کے احکام محض نصیحتیں اور ارشادات نہیں ہیں جو ثواب اور عقاب سے خالی ہوں، اس میں شک نہیں کہ یہ بہت اچھی نصیحتیں اور ارشادات بھی ہیں، مگر ان کا بہترین ثواب بھی ہے جسے ان احکام کی پابندی کرنے والا حاصل کرسکتا ہے اور ان کی سزا بھی ہے جو اِن احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مل جاتی ہے۔ اس ثواب اور عقاب کے مختلف درجات ہیں جو ہر شخص کے اُپنے اپنے کردار کے مطابق اُسے ملتے ہیں۔

اسلامی احکام کی جزا و سزا میں اصل الاصول یہ ہے کہ یہ دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں ملتے ہیں، مگر زندگی کی ضروریات، معاشرے کے استحکام کی ضرورت اور افراد کے تعلقات کی اس انداز سے تنظیم — کہ وہ واضح بھی ہو، مؤثر بھی اور لوگوں کے حقوق کی ضامن بھی — اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اُخروی جزا کے ساتھ ان احکام کی دنیوی جزا بھی ہو۔ یعنی اخروی سزا کے علاوہ دنیوی سزا بھی ہو جسے دنیا کی حکومت، اسلامی احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں پر جاری کرے۔

اسلام میں جزا کا دائرہ اتنا ہی وسیع اور جامع ہے جتنا خود اسلام کا دائرہ ہے۔ یہ دائرہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی جزائیں بھی عقیدے، اخلاق، عبادات اور معاملات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ اس لیے جو لوگ ان احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کے لیے آخرت میں جو بدلہ ہے وہ تو ہے ہی، مگر کبھی دنیا میں بھی ان کے لیے جزا ہوتی ہے۔

دنیوی جزا مجرم سے اخروی جزا کو روک نہیں سکتی، اِلّا یہ کہ وہ گناہ کرنے کے بعد توبہ کرے۔ اور سچی وخالص توبہ وہ ہوتی ہے جس کی بنیاد انسان کی اپنے گناہ پر ندامت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ مضبوط عزم بھی شامل ہوتا ہے کہ اس گناہ کی طرف دوبارہ نہیں آئے گا۔ اگر جرم کا تعلق دوسروں کے حقوق سے ہو تو ان حقوق کی تلافی بھی اس توبہ کا حصہ ہوتی ہے۔

اس اُخروی جزا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی سزا سے ڈرتے ہوئے ظاہر و باطن میں اختیاری طور پر احکام شریعت کے آگے جھک جاتا ہے، اگر چہ وہ دنیوی سزا سے اپنے آپ کو بچا سکتا تھا۔ کیوں کہ اگر یہ دنیوی سزا سے اپنے آپ کو بچالے تو اخروی سزا ہر حال میں اس کی منتظر ہے اور اس سے وہ کسی حال میں بچ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان جب غفلت میں کوئی جرم یا گناہ کرتا ہے تو وہ محض اپنے اختیار سے اپنے آپ کے لیے سزا کا مطالبہ کرتا ہے۔ حضرت ماعزؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے جرم زنا کا اعتراف کیا اور آپؐ سے حد یعنی سزا کی اقامت کا مطالبہ کیا۔

اسی طرح اس سے دلوں میں قانون کی مخالفت سے خوف کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ یہ جذبہ یا تو قانون کے احترام کی وجہ سے ہوتا ہے یا اس سزا سے خوف کھانے کی وجہ سے، جو قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے آخرت میں مقرر ہے۔ اور آخرت وہ دن ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا. (آل عمران۳:۳۰) جب ہر نفس اپنے کیے کا پھل حاضر پائے گا خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی۔ اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش! ابھی یہ دن اس سے بہت دور ہوتا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ. وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال۹۹: ۷-۸) جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

ان سارے احکام میں اس بات کی سب سے بڑی ضمانت موجود ہے کہ لوگوں کو قانون کی مخالفت اور گناہ سے روکا جائے۔

۵

مثالیت اور حقیقت پسندی

۱۰۴- اسلام کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ انسان کو ممکن حد تک کمال کے اعلیٰ ترین درجے پر پہنچانا چاہتا ہے۔ یہ اسلام کی مثالیت پسندی ہے۔ مگر وہ انسان کی طبیعت اور اس کی فطرت سے بھی آنکھیں بند نہیں کرتا۔ یہ اسلام کی حقیقت پسندی ہے۔ ضروری ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کے بارے میں الگ الگ عنوانات کے تحت گفتگو کی جائے۔

مثالیت پسندی

مثالیت پسندی کا مفہوم

۱۰۵- جیسا کہ ہم نے کہا، اسلام انسان کو مقدور بھر کمال کے اعلیٰ درجے تک پہنچانا چاہتا ہے۔ یہ اس طرح ممکن ہوتا ہے کہ انسان کی تمام سرگرمیوں، اس کے اقوال، افعال، اس کے ترک وقصد، اس کی سوچ وفکر اور اس کے رجحانات ومیلانات کو اس منہج، طریق کار اور کیفیت کے مطابق بنایا جائے جو اسلام لے کر آیا ہے۔ یہ ساری چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود تھیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم آپؐ کے نقش قدم پر چلیں:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (الاحزاب۳۳:۲۱) درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا۔

اس مثالیت کے لیے ریڑھ کی ہڈی اعتدال اور جامعیت ہے۔

۱-اعتدال

۱۰۶-اعتدال سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ کسی بھی معاملے میں افراط اور تفریط موجود نہ ہو اور ہر صاحب حق کو اس کا حق مل جائے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا. (الفرقان ۲۵:۶۷)[مومنوں کی صفت یہ ہے کہ اگر] خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے اعتدال پر قائم رہتا ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَاطُهَا. سب سے بہترین امر وہ ہے جس میں اعتدال پایا جاتا ہو۔

۱۰۷-اعتدال ہر حال میں مطلوب ہے یہاں تک کہ عبادات میں بھی۔ چنانچہ کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے نفس کو خواہ مخواہ مشقت میں ڈال دے یا اپنے جسم کو اذیتیں دے۔ اس کی دلیل بخاری، مسلم اور نسائی کی روایت کردہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تین آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے حجروں کے پاس آئے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں دریافت کیا۔ جب ان کو بتایا گیا تو گویا ان کو آپ کی عبادت کم معلوم ہوئی۔ وہ کہنے لگے: ہمارا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا۔ آپؐ کے تو اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیے گئے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو ساری ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے دور رہوں گا اور شادی نہیں کروں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے اور فرمایا: أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا ؟ أَمَا وَاللّٰهِ إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ ، لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّيْ وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ. وہ تم لوگ ہو جنھوں نے یہ یہ باتیں کہی ہیں؟ خبردار! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور زیادہ متقی ہوں، مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی

کرتا ہوں، اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ جس نے میرے طریقے سے منہ موڑا وہ میرے ساتھ نہیں۔

۱۰۸- جسم کو اذیتیں دینا اور اسے طاقت سے زیادہ پر مجبور کرنا اسلام کا منہج اور مطلوبہ درجۂ کمال تک پہنچنے کے لیے اس کا طریق کار نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کمال اور اس کے تقاضوں میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ ایسا کیا جائے۔ اسی طرح یہ بات بھی مقاصد اسلام میں شامل نہیں ہے کہ جسم کو اذیتیں دی جائیں۔ یہ چیز اس کے پروگرام میں نہ غایت اور مقصد کا درجہ رکھتی ہے اور نہ وسائل و ذرائع کا۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے وہ وہم میں مبتلا ہے۔ اسلام کی مثالیت تک پہنچنا ایک معتدل طریق کار اور دھیمی چال کے ساتھ بھی ممکن ہے۔ اس طریق کار سے خروج جسم کی کمزوری اور اسے نفل تو درکنار فرائض سے بھی اُکتا دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ جو شخص اس طریق کار سے نکلتا ہے اس کو دوبارہ اس کی طرف لانا ضروری ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ دھوپ میں کھڑا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ پوچھی تو لوگوں نے بتایا: یا رسول اللہ! اس نے نذر مانی ہے کہ یہ دھوپ میں کھڑا ہوگا، نہ بیٹھے گا، نہ سائے میں جائے گا اور نہ کسی سے بات کرے گا، اور یہ کہ وہ روزہ رکھے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مُرُوْهُ فَلْيَتَكَلَّمْ وَلْيَقْعُدْ وَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ. اس کو بتادو کہ باتیں بھی کرے اور بیٹھے بھی، البتہ اپنا روزہ پورا کرے۔

روزہ ایک مطلوب امر ہے مگر دھوپ میں کھڑا ہونا، حالانکہ سائے میں بھی کھڑا ہوا جا سکتا ہے، غیر مطلوب ہے اور اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اسی طرح دن بھر کسی سے بات نہ کرنا، اس کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ کوئی فائدہ۔

اس مسئلے کا اصل راز یہ ہے کہ جسم روح کی سواری ہے اور یہ کوئی سمجھ داری کی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنی سواری کو ہلاک یا اسے کمزور کرے۔ جسم روح کے لیے جائے قرار اور اس کا مسکن ہے اور یہ کوئی مصلحت کی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے گھر کو اُجاڑ دے۔ دوسری طرف جسم کے حق کو ضایع کرنا بھی کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح خود روح کا بھی یہ حق ہے کہ اس کو آرام و راحت ملے۔ اس سلسلے میں بھی کوتاہی جائز نہیں ہے۔ بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ دونوں ستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟

آپؐ سے کہا گیا کہ یہ زینب کی رسی ہے۔ وہ جب (عبادت کرتے ہوئے) تھک جاتی ہے تو اس کے ساتھ اپنے آپ کو لٹکا دیتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: لَا، حُلُّوهُ. لِيُصَلِّ أَحَدُكُمْ نَشَاطَهُ فَإِذَا فَتَرَ فَلْيَقْعُدْ. نہیں، اسے کھول دو۔ تم میں سے کوئی شخص اپنی چستی کی حد تک نماز پڑھے، جب اُکتا جائے تو بیٹھ جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو جو وصیت کی تھی اس میں ہے کہ فَإِنَّ لِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّإِنَّ لِضَيْفِكَ عَلَيْكَ حَقًّا فَصُمْ وَأَفْطِرْ وَصَلِّ وَنَمْ. تیرے گھر والوں کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے مہمان کا بھی تجھ پر حق ہے، کبھی روزہ رکھو اور کبھی نہ رکھو، کبھی نماز پڑھو اور کبھی سویا کرو۔

۱۰۹- انسان کا اپنے نفس اور اپنے جسم کو طیبات سے اور حلال لذتوں سے محروم کرنا حصول کمال کے لیے اسلامی طریق کار نہیں ہے۔ اسلام کا طریق کار اعتدال کا ہے۔ انسان کو جب کوئی پاکیزہ چیز جائز طریقے سے میسر آئے تو اسے لے لے اور اسے تناول کرے۔ یہ اس کے مثالی مسلمان ہونے میں کوئی خرابی پیدا نہیں کرتا۔ اور اگر اسے کوئی چیز نہیں ملتی تو وہ اس پر مایوس بھی نہیں ہوتا۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَآ أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْٓا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. (المائدۃ ۵:۸۷) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرلو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰٓى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (النساء ۴:۵۸) مسلمانو! اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَلَّا تَعْدِلُوْا إِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ. (المائدۃ ۵:۸) اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ

سے ڈر کر کام کرتے رہو۔

وَ كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ. (المائدة۵:۸۸)
جو کچھ حلال وطیب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اُسے کھاؤ پیو اور اس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

معلوم ہوا کہ حصول کمال کے لیے مطلوب چیز اللہ سے ڈرنا ہے نہ کہ حلال اور پاک چیزوں کو اپنے لیے حرام کرنا اور جسم وروح کو ان سے محروم کرنا۔

۱۱۰- اس کے باوجود کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کے لیے یہ بات مباح یا جائز ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو شدت اور سختی کے ساتھ پکڑے یا اسے تنگی پر آمادہ کرے۔ مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کی کوئی جائز ضرورت پیش آجائے یا اس کا کوئی اعلیٰ مقصد اور کوئی قابل قبول سبب ہو۔ مثلاً یہ کہ ایک مسلمان دوسروں کے لیے نمونہ بننے کے مقام پر فائز ہو یا دوسروں کے لیے ایثار کرے یا مثلاً یہ کہ وہ ناجائز کاموں سے بچنے کے لیے وہ اقدامات کرے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس بنا پر ہمیں اپنے سلف صالحین کی سیرتوں کو سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے کس طرح اپنے آپ کو شدت کے ساتھ پکڑا اور اسے زندگی کی بہت سی لذتوں اور نعمتوں سے روکے رکھا۔

۲- جامعیت

۱۱۱- اسلام کی مثالیت کی دوسری صفت جامعیت ہے۔ کیوں کہ اسلام مسلمان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں درجہ بدرجہ اس کمال تک پہنچے جو اس کے لیے مقدر ہے۔ اسلام کو یہ بات قبول نہیں ہے کہ انسان ایک پہلو میں یا چند پہلوؤں میں کمال کے اعلیٰ درجات تک پہنچے مگر دوسری طرف کئی دوسرے پہلوؤں کو ایسا نظر انداز کرے کہ اس میں مطلوبہ مقام سے بھی نیچے رہ جائے۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ایک آدمی اپنے ہاتھوں کو خوب مضبوط کرے مگر دوسرے اعضا کو ڈھیلا، نحیف اور کمزور رہنے دے۔

صحابہ کرامؓ نے اسلام کی مثالیت کو سمجھا تھا اس وجہ سے نہ انھیں کسی عبادت نے اپنا اسیر بنایا اور نہ کسی عادت نے اپنی قید میں بند کیا۔ انھوں نے ہر حال میں اور تمام عبادتوں کے مزے لوٹے اور اس میں کمال کے

اعلیٰ مراتب تک پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو کسی ایک جگہ میں یا ایک قسم کی عبادت میں یا عبادت کے کسی مخصوص طرز میں قید نہیں کیا بلکہ انھوں نے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کیا۔ نماز کے وقت وہ مسجد میں نماز پڑھتے تھے، علم کی مجلس جمتی تھی تو وہ معلم یا متعلم بن جاتے تھے، جہاد کے وقت میں ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرتے تھے اور جب کوئی مشکل یا مصیبت آتی تھی تو وہ ایک دوسرے کی غم خواری اور مدد کرتے تھے۔ ہر قسم کے حالات میں ان کی یہ شان رہی۔

حقیقت پسندی

اعمال کی اعلیٰ وادنیٰ سطح

۱۱۲- اسلام انسان کی فطرت اور لوگوں کے درمیان اس فطری فرق سے آنکھیں بند نہیں کرتا جو اعلیٰ درجات تک پہنچنے کے لیے درکار استعداد وصلاحیت کے حوالے سے ان میں پایا جاتا ہے۔ اس حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کے لحاظ سے اسلام نے ایک ادنیٰ حد یا کمال کی ایک زیریں سطح کا تقرر بھی کیا ہے جس سے نیچے اترنا جائز نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ سطح معقول طور پر ایک مسلمان شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ یہ وہ کم سے کم سطح ہوتی ہے جسے ایک مسلمان سے قبول کیا جاسکتا ہے، تاکہ اس کا شمار مسلمانوں میں ہو۔ یہ سطح اس انداز سے مقرر کی جاتی ہے جس تک پہنچنا کم استعداد رکھنے والے لوگوں کے لیے بھی ممکن ہوتا ہے۔ یہ ادنیٰ ترین سطح معانی ومفاہیم کے ایک مجموعے سے وجود میں آتی ہے جن کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ ان معانی ومفاہیم کو فرائض کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ سطح ان مفاہیم کی جامع ہوتی ہے جن سے بچنا ضروری ہوتا ہے اور ان کو محرّمات کہتے ہیں۔ یہ فرائض اور محرّمات ایسے بنائے گئے ہیں کہ یہ بھلائی کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے کم استعداد والے لوگوں کی طاقت سے بھی باہر نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص ان کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے اور ان سے پیچھے رہنے کے لیے کوئی عذر پیش نہیں کرسکتا۔

لیکن اس الزامی سطح، جس تک پہنچنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، کے ساتھ ساتھ شریعت نے ایک اور سطح بھی رکھی ہے جو اس سے تھوڑی سی اونچی اور وسیع ہے۔ شریعت نے اس سطح تک پہنچنا لوگوں کے لیے صرف پسندیدہ قرار دیا ہے۔ اگر اسے لوگوں پر لازم کردیا جاتا تو یہ ان کے لیے مشقت اور حرج کا ذریعہ بنتا

اور اسلام میں حرج رفع کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ حرج اسلام کے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ. (الحج ۲۲:۷۸) اور اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. (البقرۃ ۲:۲۸۶) اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔

اس، قدرے بلند سطح میں وہ مستحبات شامل ہیں جن کو انجام دینے کی شریعت لوگوں کو ترغیب دیتا ہے یا یہ ان مکروہات کو شامل ہے جن سے باز آنے کی مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے۔

اعلیٰ وادنیٰ سطح کی مثالیں

۱۱۲ (i) یہ دونوں یعنی اعلیٰ اور ادنیٰ سطحیں اسلام کے احکام میں موجود ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱- نماز

نمازوں میں بعض فرض ہیں اور بعض مستحب ہیں۔ پہلی قسم ادنیٰ درجے میں داخل ہے اور دوسری قسم اعلیٰ درجے کی ہے۔ اسی بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث آئی ہے:

مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يُصَلِّيْ لِلّٰهِ تَعَالٰى فِيْ كُلِّ يَوْمٍ اِثْنَتَيْ عَشَرَةَ رَكْعَةً تَطَوُّعًا غَيْرَ الْفَرِيْضَةِ اِلَّا بَنَى اللّٰهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ. کوئی بھی مسلمان روزانہ اللہ کی خاطر فرضوں کے علاوہ بارہ رکعتیں پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں مکان بنا دے گا۔

۲- روزہ

روزوں کے حوالے سے بات یہ ہے کہ رمضان کے روزے فرض ہیں۔ یہ کم از کم مطلوب درجہ ہے۔ اس کے علاوہ شوال کے چھ روزے، ہر مہینے ایام بیض کے روزے اور سوموار (پیر) و جمعرات کا روزہ اعلیٰ درجے کی مثالیں ہیں۔

۳- حج

یہ عمر میں ایک بار فرض ہے اور اس کے بعد نفل ہے جو اس عبادت کا اعلیٰ درجہ ہے۔

۴- انفاق فی سبیل اللہ

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے سلسلے میں فرض یہ ہے کہ آدمی زکوٰۃ ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرۃ ۲:۴۳) نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو۔

اور نفل صدقات کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (البقرۃ ۲:۲۷۲) اور راہِ خیر میں جو مال تم لوگ خرچ کرتے ہو وہ تمھارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال راہِ خیر میں خرچ کرو گے، اس کا پورا پورا اجر تمھیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔

۵- حدود

قتل عمد میں قصاص کو قانون کا درجہ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى. (البقرۃ ۲:۱۷۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے لیے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔

مقتول کے وارث قصاص کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور انھیں اس کا حق حاصل ہے۔ اس معاملے میں ان پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ البتہ اسلام نے یہ بات پسند کی ہے کہ مقتول کے وارث درگزر سے کام لیں۔ یہ اس حکم کے حوالے سے اعلیٰ درجہ ہے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ اسی آیت میں، جو قصاص کے حکم کے بارے میں نازل ہوئی، فرماتا ہے:

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ. (البقرۃ ۲:۱۷۸) اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو، تو معروف طریقے کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے۔

۶- عام زیادتی

اس میں سزا بالمثل بھی جائز ہے مگر معافی اور صبر زیادہ بہتر ہے جو کہ اعلیٰ درجے کی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ. (النحل ۱۶:۱۲۶) اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔

۷- خرید و فروخت

اسلام نے مسلمانوں کے لیے یہ بات پسند کی ہے کہ وہ خرید فروخت اور کسی سے تقاضا کرنے میں نرم خو ہوں۔ یہ بھی اعلیٰ درجے کی مثال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا إِذَا بَاعَ وَإِذَا اشْتَرٰى وَإِذَا اقْتَضٰى. اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو خرید و فروخت میں اور تقاضا کرنے میں نرم رویہ اختیار کرے۔

۸- امر بالمعروف و نہی عن المنکر

یہ فرض کفایہ ہے۔ امت میں اس کا وجود ضروری ہے۔ اس میں یہ گنجایش بھی موجود ہے کہ ہاتھ اور زبان کے استعمال سے اجتناب کیا جائے اور صرف دل سے اس کا انکار کیا جائے۔

خاص طور پر اس حکمران کے بارے میں جو ظالم اور سرکش ہو اور اس کے سینے میں اتنی وسعت بھی نہ ہو کہ وہ نصیحت کی بات سن سکے۔ اگر کوئی اسے امر و نہی کرتا ہے تو یہ اسے قتل کرتا ہے۔

مگر یہ بات مستحب ہے کہ مسلمان پھر بھی اس کو امر و نہی کریں، خواہ وہ انھیں قتل کرنے سے بھی نہ چوکے۔ یہ اعلیٰ درجے کی مثال ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَرَجُلٌ قَالَ كَلِمَةَ حَقٍّ لِسُلْطَانٍ جَائِرٍ فَقَتَلَهُ. شہیدوں کا سردار ایک تو حضرت حمزہ ہیں اور دوسرا وہ شخص جو کسی ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہے اور

وہ اسے قتل کر دے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب: یہاں ہم پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کام تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اور انسان کا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ. (البقرۃ ۲:۱۹۵) اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں شہادت حاصل کرنا کرامت ہے نہ کہ ہلاکت، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر خواہ زبان سے ہو یا ہاتھ سے، یہ تو شرعی جہاد کی قسموں میں سے ایک قسم ہے۔ اس لیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے حق پرستوں کے دل مضبوط ہوتے ہیں، باطل پرستوں کو ذلیل ورسوا ہونا پڑتا ہے اور ظالم اپنی حدود میں رہتے ہیں۔

۹- آدابِ گفتگو

غلط بات کہنا حرام ہے اور اس سے اجتناب فرض ہے۔ مگر اس کا ترک کرنا ادنیٰ درجے کی چیز ہے۔ فضول گپ شپ اور غیر ضروری باتیں جن کا کوئی فائدہ نہ ہو، باطل اور حرام تو نہیں مگر مکروہ ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

إِنَّ اللهَ يَكْرَهُ لَكُمْ قِيلَ وَقَالَ وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ وَإِضَاعَةَ الْمَالِ. اللہ تعالیٰ تمھارے لیے قیل وقال، بہت زیادہ سوالات، اور مال ضایع کرنا پسند نہیں کرتا۔

معلوم ہوا کہ زیادہ باتیں کرنا مکروہ اور ان کا ترک افضل ہے۔ یہ بھی اعلیٰ درجے کا حکم ہے۔

۱۰- جبر واکراہ

کسی کو دھمکی دی جائے کہ وہ کلمہ کفر کہے ورنہ اسے جان سے مار ڈالا جائے گا اس کو شریعت نے اجازت دی ہے کہ کلمہ کفر کہے مگر شرط یہ ہے کہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ یہ اسلام کی رخصتوں میں سے ایک رخصت ہے اور یہ ادنیٰ درجے کی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ. (النحل ۱۶:۱۰۶) مگر یہ کہ کسی کو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (تب خیر ہے)۔

مگر اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ کلمہ کفر نہ کہے خواہ اس میں اس کی جان چلی جائے۔ یہ اعلیٰ درجے کا عمل ہوگا۔

اضطراری احکام

۱۱۳- اسلام کی یہ حقیقت پسندی اسی حد پر رک نہیں جاتی جسے ہم بیان کر چکے ہیں، یعنی یہ کہ اس نے ہر عمل کے لیے اعلیٰ اور ادنیٰ کی دو سطحیں مقرر کی ہیں بلکہ اس کی حقیقت پسندی ایک اور بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے مسلمانوں کے لیے مشکل اور مصیبت کے اوقات میں ایسے جائز راستے کھول رکھے ہیں جن سے وہ مشکلات سے نکل سکتا ہے۔ ان صورتوں میں وہ چیزیں لازم نہیں ہوتیں جو پہلے عام حالات میں اس کے لیے لازم اور ضروری یا حرام اور مکروہ تھیں۔ اسی بنیاد پر اسلامی رخصتیں وارد ہیں اور اسی بنیاد پر فقہ میں یہ مشہور قاعدہ وجود میں آیا ہے کہ اَلضَّرُوْرَاتُ تُبِيْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ ضرورت ممنوع اشیا کو مباح کر دیتی ہے۔

نفس کی حالت یہ ہے کہ بعض اوقات وہ اس بات کی طاقت نہیں رکھتا کہ مشکل اور اضطراری حالات میں اسلام کی اصل مراد پر قائم رہ سکے۔ اس وجہ سے وہ معصیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی صورت حال میں اسلام نے اس کے لیے کچھ رخصتیں مقرر کی ہیں۔ ان میں سے ایک رخصت یہ ہے کہ اگر آدمی کو سخت بھوک لگی ہو جس کی وجہ سے اس کی جان جانے کا خطرہ ہو تو اس کے لیے مردار کھانا مباح ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ایک فرض کا ترک مباح ہو جاتا ہے جیسے رمضان میں مریض اور مسافر کے لیے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوتی ہے۔ ایسے ہی اگر ایک آدمی کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے بیٹھ کر نماز پڑھنا بھی جائز ہوتا ہے۔

۱۱۴- اسلام کی اسی مثالیت اور حقیقت پسندی کے ساتھ ایک مسلمان کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے لیے کمال کا وہ درجہ حاصل کر لے جو اس کے لیے مقدر ہے۔ اس طریقے پر یہ کام اس کے لیے آسان بھی ہو جاتا ہے، اس میں اعتدال بھی ہوتا ہے اور جامعیت بھی۔ یہ انسانی فطرت کے موافق بھی ہے اور اس

میں کوئی تنگی یا حرج بھی نہیں ہے۔اسی طرح اس میں دنیا اور اہل دنیا سے گوشہ نشین ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

......☆......☆......

چوتھی فصل

نظام ہائے اسلام

تمہید

۱۱۵- اسلام کے خصائص کے بیان میں ہم نے کہا کہ یہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا جامع ہے۔ اس کی جامعیت کے مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے احکام میں اخلاق سے متعلق بھی احکام موجود ہیں اور انسانوں کے درمیان تعلقات کے بارے میں بھی۔ ان احکام کا ہر مجموعہ کسی خاص موضوع پر ایک پورا نظام تشکیل دیتا ہے۔ جیسے اخلاق کے احکام کا مجموعہ اسلامی نظام اخلاق کی تشکیل کرتا ہے اور عائلی احکام کے مجموعے سے اسلام کا عائلی نظام وجود میں آتا ہے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس

اس فصل میں ہم اسلام کے چند اہم نظاموں کا تذکرہ کریں گے اور ان کے کھلے نشانات راہ کی طرف اشارہ کریں گے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان نشانات کی اسی قدر وضاحت ہو جائے جس قدر ایک داعی کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ نظام ہائے اسلام کے بارے میں ہمارا یہ بیان ان حدود کے اندر رہے گا جو اسلام نے خود بیان کی ہیں۔ ہم ان حدود سے نہ تجاوز کریں گے، نہ اس میں کوتاہی کریں گے اور نہ اسے اپنی غرض کے تابع بنائیں گے۔ کیوں کہ مسلمان ہمیشہ اسلام کے پیچھے پیچھے چلتا ہے، اس سے آگے نہیں بڑھتا۔

اس بنا پر ہم اس فصل کو چھے (۶) مباحث میں تقسیم کریں گے جن کی تفصیل یہ ہے:

۱- نظام اخلاق، ۲- نظام معاشرت، ۳- نظام حکومت، ۴- نظام معیشت، ۵- نظام جہاد، ۶- نظام جرم وسزا

۱

اسلام کا نظامِ اخلاق

اخلاق کی تعریف

۱۱۶- [اخلاق خُلُق کی جمع ہے] خُلُق کے لغوی معنی طبیعت اور عادت کے ہیں۔ اہل علم کی اصطلاح میں، جیسا کہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں، اخلاق کی تعریف یہ ہے:

یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو نفس میں راسخ ہوتی ہے اور اس سے مختلف افعال کسی غور وفکر کے بغیر آسانی اور سہولت کے ساتھ صادر ہوتے ہیں۔[1]

ہم اخلاق کی تعریف اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ یہ نفسیاتی معانی ومفاہیم اور دائمی صفات کا ایک مجموعہ ہے جس کی روشنی میں اور جس کے ترازو سے انسان کی نگاہ میں کوئی کام اچھا اور کوئی برا دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے وہ یا تو اس کام کو کر ڈالتا ہے یا اس سے اِبا کرتا ہے۔

اخلاق کی اہمیت

۱۱۷- انسان کے کردار وعمل پر اخلاق کا بڑا اثر ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا کردار انھی عادات وصفات کے مطابق ہوتا ہے جو اس کے دل ودماغ میں رچی بسی ہوتی ہیں۔ امام غزالیؒ نے 'اِحیاء علوم الدین' میں کتنی درست بات کہی ہے، وہ کہتے ہیں:

۱- اِحیاء علوم الدین ۳:۴۶

دل میں جو صفت بھی پیدا ہوتی ہے اعضا میں اس کا اثر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اعضا کی کوئی حرکت بھی ان صفات کے اثر سے خالی نہیں ہوتی جو دل میں موجود ہوں۔

معلوم ہوا کہ انسان کے ’فعال ہمیشہ انھی صفات کا صلہ ہوتے ہیں جو اس کے نفس میں موجود ہیں۔ ان کا آپس میں تعلق ایسا ہوتا ہے جیسا کہ درخت کی شاخوں اور اس کی جڑوں کا ہوتا ہے جو مٹی میں چھپی ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے افعال کی اصلاح اسی طرح ہوگی کہ اس کے اخلاق درست ہو جائیں۔ کیوں کہ فرع کا دارومدار اصل پر ہوتا ہے۔ اگر اصل درست ہو تو فرع خود بخود درست ہو جاتی ہے، مگر اصل خراب ہو تو فرع کے درست ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا. (الاعراف ۷: ۵۸) جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی اصلاح، ان کے کردار کی درستی اور ان کے لیے پاکیزہ زندگی کا راستہ آسان بنانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اصلاح کرنے والا لوگوں کی نفسیاتی اصلاح اور اخلاقی تزکیہ سے آغاز کرے اور ان میں اچھے اخلاق کا بیج بوئے۔ یہی وجہ ہے اسلام نے نفس کی اصلاح پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اس نے بتا دیا ہے کہ لوگوں کے حالات، یعنی سعادت وشقاوت، یسر اور عسر، آسانی اور سختی، اطمینان واضطراب، عزت وذلت سب کو بدلنے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے اخلاق وعادات کو بدلا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ. (الرعد ۱۳: ۱۱) حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔

۱۱۸- اخلاق کی اہمیت ایک اور پہلو سے بھی ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ انسان کوئی کام کرنے یا کوئی چیز چھوڑنے سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اس کام کے کرنے یا چھوڑنے کی قدر وقیمت کیا ہے۔ یہ اندازہ وہ اخلاق کے ان معانی کی روشنی میں لگاتا ہے جو اس کے دل میں موجود ہوتے ہیں۔ جب اس کے سامنے اس فعل کے کرنے یا چھوڑ دینے کا حکم واضح ہو جاتا ہے تو وہ اس پر راضی ہو کر اسے قبول کر لیتا ہے۔ دل میں اس کے لیے رغبت اور توجہ پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس کا اقدام کرتا ہے۔ اگر معاملہ اس کے خلاف ہو تو دل اس سے

اچاٹ ہو جاتا ہے، اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس سے مُنہ پھیر لیتا ہے خواہ اس اَمر کا تعلق فعل کے ساتھ ہو یا ترک کے ساتھ۔

اندازہ لگانے کا یہ عمل بعض اوقات بہت تیز ہوتا ہے اور اس قدر غیر محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی انسان ایک کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اور اس کے لیے کوئی غور وفکر نہیں کرتا۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اندازہ لگانے کا یہ عمل طویل غور وفکر اور لمبے عرصے کے بعد تکمیل پذیر ہوتا ہے یہاں تک کہ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ کام تکمیل تک نہیں پہنچ پاتا۔ مگر ان سارے احوال میں اندازے اور قدر و قیمت معلوم کرنے کا عمل بلا استثنا ہر فعل اور ترک کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا اخلاق کی میزان سے اندازہ لگانا، اس اندازے کی صحت اور فساد معلوم کرنا اور انسان کا اس کے مقتضا کی پابندی کرنا اور اسے نافذ کرنا، ان ساری چیزوں کا دارومدار اُن اخلاقی معانی ومفاہیم پر ہوتا ہے جن کا وہ معیاری یا غیر معیاری ہونے کے لحاظ سے حامل ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کا انحصار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ یہ صفات اس کے دل میں کس قدر راسخ ہیں، ان کے رنگ میں وہ کتنا رنگا ہوا ہے، ان پر کس مقدار میں غیرت کر سکتا ہے اور ان کی ضرورت کا اسے کتنا احساس ہے۔

اس وجہ سے انسان کے کسی کام کرنے یا نہ کرنے میں اس کے اخلاق کا اثر ظاہر ہونے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہوتا کہ انسان اچھے اور برے اخلاق کو پہچان لے، اس پہچان کو اپنے دماغ میں بٹھا لے اور کوئی موقع آ جائے تو اس کے بارے میں بہترین لیکچر دے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اپنے تمام حالات کو اس کے رنگ میں رنگ دے اور اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں راسخ کر دے۔ اس حد تک راسخ کہ یہ اس کے لیے اس کے جسم کے رنگ کی طرح لازم ہو جائے، یہ اس کے ذہن میں ہر وقت موجود اور اس کے کردار پر حکمران رہے۔ وہ ایمان کی حد تک اس کے لیے جرأت دکھائے اور اس پر غیرت کرے۔

اگر ایک مسلمان میں اسلام کے اچھے اخلاق کے لحاظ سے کمی پائی جاتی ہو تو اس کی باقی پوری زندگی اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مطلوبہ اخلاقیات کی بڑی تاکید کی ہے اور اس کا شوق دلایا ہے۔ اس نے دلوں کو اس پر اُبھارا ہے، اس کا بار بار تکرار اور اعادہ کیا ہے تاکہ مسلمان ہمیشہ اس کو یاد رکھیں اور اپنے آپ کو اس کے رنگ میں رنگ دے۔ اس کا اثر ان کے کردار میں بالکل واضح ہو گا۔

اسلام میں اخلاق کا مقام

۱۱۹- اسلام میں اخلاق کا بہت بڑا مقام ہے۔ اس کا اظہار کئی پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ ہم یہاں چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

۱- رسالت کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ اخلاق کو سدھارتی اور مکارم اخلاق کو عام کرتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ. میری بعثت کا مقصد یہ ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔

۲- دین کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ حسن اخلاق کا نام ہے۔ ایک حدیث مرسل میں آیا ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! دین کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: حُسْنُ الْخُلُقِ. اچھے اخلاق۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حسن اخلاق دین کا ایک عظیم رکن ہے جس کے بغیر دین قائم نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ حج میں وقوف عرفات کا معاملہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اَلْحَجُّ عَرَفَةٌ. حج وقوف عرفات کا نام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیام عرفات حج کا ایک عظیم رکن ہے جس کے بغیر حج نہیں ہوتا۔

۳- قیامت کے دن جن چیزوں سے اعمال حسنہ کا ترازو جھکے گا ان میں سب سے اہم چیز حسن اخلاق ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ أَثْقَلُ مَا يُوضَعُ فِي الْمِيزَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَقْوَى اللهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ. قیامت کے دن میزان میں سب سے بھاری چیز اللہ تعالیٰ کا خوف اور اخلاق حسنہ ہوں گے۔

۴- مومن دوسرے لوگوں پر ایمان کی وجہ سے فضیلت رکھتے ہیں، اور ان کے آپس میں فضیلت کا معیار حسن اخلاق ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ کسی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! مومنوں میں سب سے افضل ایمان کس کا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا. جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

۵- قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپؐ کے قرب سے سرفرازی کے لحاظ سے مومنوں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ اور آپؐ کی محبت اور قرب سے سرفرازی میں سب سے

کامیاب وہ مومن ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہوں گے اور جن کو حسن اخلاق میں دوسروں پر فوقیت حاصل ہوگی۔ حدیث شریف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے: إِنَّ أَحَبَّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبَكُمْ مِنِّيْ مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحْسَنُكُمْ أَخْلَاقًا. قیامت کے دن تم میں مجھے سب سے زیادہ محبوب اور مجلس میں سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہوں گے۔

۶- حسن اخلاق ایک لازمی امر ہے۔ یہ آگ سے نجات اور جنت میں داخلے کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ اس شرط سے غفلت برتی جائے تو پھر کوئی چیز اس کی قائم مقام نہیں ہو سکتی، یہاں تک کہ نماز اور روزہ بھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: فلاں عورت دن کو روزے رکھتی ہے اور رات کو نماز میں کھڑی رہتی ہے مگر وہ بد اخلاق ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو زبان سے ایذا پہنچاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: لَاخَيْرَ فِيْهَا، هِيَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ. اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔ وہ دوزخی ہے۔

۷- نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے دعا کیا کرتے تھے کہ وہ آپؐ کے اخلاق کو حسن عطا فرمائے — حال یہ ہے کہ آپ اخلاق حسنہ کے مالک تھے — اور یہ کہ اچھے سے اچھے اخلاق کی طرف آپؐ کی ہدایت فرمائے۔ آپؐ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَحَسِّنْ خُلُقِيْ. اے اللہ! تو نے میری صورت حسین بنائی ہے، تو میرے اخلاق کو بھی حسن عطا فرما۔

اور آپؐ کہا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ فَإِنَّهُ لَايَهْدِيْ لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَهَا فَإِنَّهُ لَايَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ. اے اللہ مجھے حسن اخلاق کی ہدایت عطا فرما، حسن اخلاق کی ہدایت تیرے سوا کوئی نہیں دے سکتا اور اے میرے پروردگار! مجھے برے اخلاق سے بچا، برے اخلاق سے بچانے والا بھی تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔

یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ سے وہی دعائیں مانگتے تھے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوتی تھیں اور جن سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا تھا۔

۸- اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اس بنا پر تعریف کی ہے کہ آپؐ حسن اخلاق کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے: وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ. (القلم ۶۸:۴) اور بے شک تم اخلاق کے بڑے

مرتبے پر ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی تعریف کسی ایسی ہی چیز سے کرتا ہے جو عظیم ہو، اور یہ چیز اسلام میں اخلاق کے بلند مقام کی دلیل ہے۔

۹- قرآن کی بہت سی آیات اخلاق کے موضوع سے متعلق ہیں۔ ان میں اچھے اخلاق کو اپنانے کا حکم دیا گیا ہے، جو لوگ اچھے اخلاق کی صفت رکھتے ہیں ان کی تعریف کی گئی ہے اور تعریف کے ساتھ ثواب کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ ان آیات میں برے اخلاق سے منع کیا گیا ہے، جو لوگ برے اخلاق کے مالک ہوتے ہیں ان کی مذمت کی گئی ہے اور ان کی سزا بھی بیان کی گئی ہے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کریم میں اخلاق کے متعلق اتنی زیادہ آیات اسی بات کی دلیل ہیں کہ اسلام میں اخلاق کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔

اس اہمیت میں مزید اضافہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان آیات میں کچھ وہ ہیں جو ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور کچھ وہ ہیں جو ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اخلاق ایک انتہائی اہم چیز ہے اور اس سے کوئی مسلمان مستغنی نہیں ہوسکتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق کی پابندی ایک مسلمان کے لیے ہر حال میں لازمی اور ضروری ہے۔ قرآن نے مکی اور مدنی سورتوں میں اس پر جس قدر یکساں توجہ دی ہے اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اس کی مثال عقیدے کے معاملات کی طرح ہو جاتی ہے۔

اسلامی نظام اخلاق کی خصوصیات

۱۲۰- اسلام کا نظام اخلاق چند خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہے۔ وہ یہ ہیں: تفصیل، جامعیت، ذریعہ اور مقصد دونوں میں لزوم، ایمان و تقویٰ سے ربط اور جزا و سزا کا وقوع۔ ذیل میں ہم ان خصوصیات کو اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

اولاً: عموم اور تفصیل

۱۲۱- اسلام اچھے اخلاق کی عام دعوت دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم

میں فرماتا ہے:وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۵۳) اور اے نبیؐ! میرے بندوں (یعنی مومنوں) سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

یہاں احسن طریقے سے بات کرنا ایک عام دعوت ہے جس میں لوگوں کو ان کے محاورے اور ہر قسم کی گفتگو میں پاکیزہ انداز اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ. (النحل ۱۶:۹۰ - بدی و بے حیائی اور ظلم وزیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تا کہ تم سبق لو) میں بھی اس بات کی ایک عام دعوت ہے کہ برے اخلاق سے دور رہا جائے۔ احادیث نبوی میں اس عمومی دعوت کے حوالے سے بہت سا لوازمہ موجود ہے۔ مثلاً: اِتَّقِ اللهَ حَيْثُ مَا كُنْتَ وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ. تم جہاں ہو بھی اللہ سے ڈرتے رہو اور کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے بعد نیکی کرو تا کہ وہ اس کو مٹا دے، اور لوگوں سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔

خلق حسن کے الفاظ اچھے اخلاق کی تمام قسمیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک انسان اچھے اخلاق کی وجہ سے روزہ دار اور نمازی کے درجے تک پہنچ سکتا ہے۔

۱۲۲- اسلام نے صرف عمومی دعوت پر اکتفا نہیں کیا کہ اچھے اخلاق سے مزین ہونا اور برے اخلاق سے بچنا چاہیے بلکہ اس نے دونوں کے بارے میں تفصیلی ہدایات دیں۔ ہر قسم کی ذیلی قسمیں بیان کیں۔ اس تفصیلی بیان کی حکمت یہ تھی کہ اخلاق کے تمام معانی کی وضاحت اور اس کا تعین ہو جائے تا کہ لوگوں کے درمیان اس حوالے سے کوئی اختلاف نہ رہے اور ان کی مراد متعین کرنے میں خواہشات کو دخل دینے کا موقع نہ ملے۔

انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر یہ بھی ہے کہ اس نے انسانوں کے لیے وہ تمام چیزیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں جن سے بچنا چاہیے یا جنھیں کرنا یا چھوڑنا چاہیے۔ ذیل میں ہم قرآن وسنت میں بیان کردہ اخلاق کی تفصیلات کی چند مثالیں پیش کریں گے۔

۱۲۳-قرآن سے مثالیں

ا- **ایفائے عہد**:- وَأَوْفُوْا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴) عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔

ب- **بلاعلم کوئی بات کہنے کی ممانعت**:- وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۶) کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔

ج- **متکبرین کی طرح اکڑتے اور اتراتے ہوئے چلنے کی ممانعت**:- وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۷) زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

د- **اسراف وتبذیر اور بخل وکنجوسی کی ممانعت**:- وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۶-۲۷) رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔ فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔

ہ- **ہر حال میں اور تمام لوگوں یہاں تک کہ کفار کے ساتھ بھی عدل کا حکم**:- فَاذْكُرُوْنِيْٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ. (الانعام ۶:۱۵۲) اور جب بات کہو انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدۃ ۵:۸) کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ر۔ **بھلائی اور تقویٰ اور ان چیزوں میں جو لوگوں کے لیے مفید ہوں، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور گناہ و بغاوت میں عدم تعاون**:۔وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا علی الْإِثْمِ و الْعُدْوان. (المائدۃ ۵:۲) جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب کے ساتھ تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو۔

ز۔ **ظلم کی ممانعت**:۔ظلم قیامت کے دن کے لیے اندھیرا ہے۔اس کا انجام بہت خطرناک ہے۔اس کی کئی قسمیں ہیں جن میں سب سے بری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا جائے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کیا جائے۔ظالم کا تعلق اللہ تعالیٰ سے کٹا ہوتا ہے۔وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دھتکارا ہوا ہوتا ہے۔وہ اس کی مدد سے محروم رہتا ہے۔اس بنا پر اسلام نے ظلم سے منع کیا ہے: وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ. (الشعراء ۲۶:۲۲۷) اور ظلم کرنے والوں کو عن قریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ إِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (الانعام ۶:۲۱) اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے، یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (البقرۃ ۲:۲۲۹) یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ أَنْصَارٍ. (البقرۃ ۲:۲۷۰) اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

ح۔ **صبر**:۔ایمان میں صبر کی مثال اس طرح ہے جیسے جسم میں سر۔اس وجہ سے ایک مسلمان کے لیے صبر بہت زیادہ ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر، اس کی معصیت سے بچنے پر صبر، اس کی قضا و قدر پر صبر۔اس طرح مومن کا شمار محسنین میں ہونے لگتا ہے۔اور اللہ کی رحمت محسنین کے قریب ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے صبر کا حکم دیا ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (آل عمران

۳:۲۰۰) اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ. (ہود۱۱:۱۱۵) اور صبر کر، اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ. (الروم۳۰:۶۰) پس صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔

ط- **صدق**: سچائی ایمان کی علامت اور اس کا ثمرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس کا حکم دیا ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ. (التوبۃ۹:۱۱۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔

وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّأَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا. (بنی اسرائیل۱۷:۸۰) اور دعا کرو کہ پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو لے جا، سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال، سچائی کے ساتھ نکال، اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

ی- **جھوٹ سے اجتناب**:- جھوٹ ایک بری عادت ہے۔ جو شخص جھوٹ بولتا ہے وہ اللہ کی ہدایت سے محروم رہتا ہے۔ اس سے دل میں نفاق پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس کی ممانعت کی ہے اور اس سے محتاط رہنے کی تاکید کی ہے: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ. (المومن۴۰:۲۸) اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو۔

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ إِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ. (التوبۃ۹:۷۷) نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو انھوں نے اللہ کے ساتھ کی، اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے، اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔

ک- **تکبر اور اس کے متعلقات**:-تکبر، خود پسندی، بخل، فخر وغرور اور ریا برے اخلاق اور ایسے امراض ہیں جو دل کو لگتے ہیں اور اسے کچل کر اس کے نور کو ختم کرتے ہیں۔ یہ آدمی کو اللہ تعالیٰ سے دور کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی بھی ممانعت آئی ہے:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ. (لقمان۳۱:۱۸) اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا. الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا. وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطَانُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا (النساء۴:۳۶-۳۸) یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ ایسے کافر نعمت لوگوں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے، اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور در حقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز آخر پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا سے بہت ہی بری رفاقت میسر آئی۔

ل- **چلنے اور آواز میں اعتدال**:- تیز اور آہستہ دونوں حالتوں کے درمیان اعتدال ایک مسلمان سے مطلوب ہے۔ اسی طرح آواز کو پست رکھنا اور ضرورت سے زیادہ بلند کرنے سے اجتناب کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ. (لقمان۳۱:۱۹) اپنی چال میں اعتدال اختیار کر، اور اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔

م- **استقامت اور استقلال**:- حق پر ثابت قدم رہنا اور اطاعت وعبادت پر دوام اختیار کرنا مطلوب

امور ہیں۔ کیوں کہ چیزوں کا دارومدار ان کے خاتمے پر ہوتا ہے۔ اگر ایک آدمی حق پر دوام اور ثبات اختیار نہیں کرتا تو وہ اس کے ثمرات سے محروم ہو جاتا ہے۔ مسلمان اپنے مقصد تک نہیں پہنچ پاتا اور وہ نیک لوگوں کے قافلے سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اس وجہ سے ایک مسلمان پر یہ بات لازم کی گئی ہے کہ وہ ایمان پر مضبوطی سے ثابت قدم رہے اور اس پر استقامت اختیار کرے تا کہ وہ کامیابی اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَآئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ... (حم السجدة ۴۱: ۳۰) جو لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ”نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے......“

۶- **انفاق، غصے کو پی جانا اور احسان**:- جنت پاکیزہ لوگوں کی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے متقین کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے اچھے اخلاق میں سے ایک صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ انفاق کرنے والے ہوتے ہیں۔ مال داری اور غریبی میں اور ہر حال میں بقدر استطاعت انفاق کرتے ہیں۔ وہ انفاق میں بخل نہیں کرتے، خواہ تھوڑا ہی ہو۔ ان کے اخلاق میں سے ایک صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہیں۔ اس پر فوری عمل نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ عمل کرنے پر قادر ہوتے ہیں، مگر اللہ کی اطاعت، اس کی خشیت اور اس کے پاس سے اجر پانے کی نیت سے وہ اپنے غصے کو پی جاتے ہیں۔ ان کے اخلاق کی ایک صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے پورے پورے حقوق نہیں لیتے بلکہ احسان کرتے ہوئے اس کا کچھ حصہ ان کے لیے چھوڑ دیتے ہیں:

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ. الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ. (آل عمران ۳: ۱۳۳-۱۳۴) دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمان جیسی ہے، اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بد حال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔

ص- **بغض وحسد کی ممانعت**:- **وَالَّذِينَ جَآءُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا**

الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (الحشر ۵۹:۱۰)[اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے] جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں، جو کہتے ہیں کہ ''اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب! تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

س- **جاہلوں سے سلوک**:- جاہل کا علاج یہ ہے کہ اس سے اعراض کیا جائے اور اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ اسلام اس کا بھی حکم دیتا ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ. (الاعراف ۷:۱۹۹) اے نبیؐ! نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ الجھو۔

ع- اخلاق کے باب میں مومن بندوں کے لیے اسلام کی جامع وصیتوں میں سے ایک، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى أَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰى أَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ. يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ. يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ[1] (الحجرات ۴۹:۱۱-۱۳) اے لوگو جو ایمان لائے

۱- سخرية سے مراد ہے لوگوں کی تحقیر اور ان کا مذاق اڑانا، لمز ان کو باتوں سے نشانہ بنانا ہے اور همز فعل سے ہدف بنانا ہے۔ جو شخص همز اور لمز کرتا ہے وہ مذموم اور ملعون ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (الھمزۃ ۱۰۴:۱) ہلاکت ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے۔ تنابز بالألقاب یہ ہے کہ تم کسی کو ایسے لقب سے پکارو جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ ظن جیسا کہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں، یہ ہے کہ اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں یا دوسرے لوگوں پر بے جا تہمت لگائی جائے۔ چوں کہ اس میں بعض تہمتیں گناہ ہوتی ہیں اس لیے احتیاط کے طور پر ان میں سے زیادہ گمانوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: ''تیرے مومن بھائی کی زبان سے جو بات نکل جائے اس کے بارے میں اگر بھلائی کا کوئی معمولی احتمال بھی موجود ہو تو اس پر اچھا گمان ہی کرو۔'' غیبت کسی بھائی کا اس انداز سے ذکر کرنا ہے جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ اور اگر اس میں وہ بات نہ ہو تو یہ بہتان ہوگا۔ (مؤلف)

ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمھارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو، تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

ف۔ بعض آیات ایسی ہیں جن میں مومنوں کے اخلاق کو یکجا کیا گیا ہے اور اسے ان کے ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح کی آیات میں سے ایک آیت یہ ہے: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ. الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ. إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ. فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. أُولٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ. الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ. (المومنون ۲۳: ۱-۱۱) یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے، جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں اور لغویات سے دور رہتے ہیں[1] زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو اُن کی ملک یمین میں ہوں، کہ ان پر محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں[2]، اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس[3] پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَّإِذَا

۱- لغو ہر اس قول اور فعل کو کہتے ہیں جو قابل تعریف نہ ہو۔ (مؤلف)

۲- العادون سے مراد وہ لوگ ہیں جو حلال سے حرام کی طرف تجاوز کر جاتے ہیں۔ (مؤلف)

۳- الفردوس اعلیٰ ترین جنت کا نام ہے۔ (مؤلف)

خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا. وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا. وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا. إِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا. وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا. وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا. يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا. إِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صٰلِحًا فَأُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَّكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَإِنَّهُ يَتُوْبُ إِلَى اللّٰهِ مَتَابًا. وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا. وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا. وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا. أُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلَامًا. خَالِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا[1] (الفرقان ۲۶: ۶۳-۷۶)

رحمان کے اصلی بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل اُن کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ جو دعائیں کرتے ہیں کہ ''اے ہمارے رب! جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے، اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی برا مستقر اور مقام ہے۔'' جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے

---

۱ - ھونا: سکون، وقار اور تواضع کے ساتھ۔ (مؤلف)

قالوا سلاما: یعنی وہ درست بات کہتے ہیں اور جاہلوں کے ساتھ جنگ وجدال میں نہیں پڑتے۔ (مؤلف)

غراما: یعنی لازم اور طویل۔ (مؤلف)

أثاما: یعنی جزا وسزا۔ (مؤلف)

لایشھدون الزور: یعنی برائی اور جھوٹ، کفر وفسق اور باطل کی مجلسوں میں حاضر نہیں ہوتے۔ (مؤلف)

مرّوا کراما: یعنی وہ برائی کی مجلسوں سے کنارہ کش رہ کر اپنی عزت کو ضایع ہونے سے بچا کر رکھتے ہیں۔ (مؤلف)

لم یخروا علیھا صما وعمیانا: یعنی ان کی حالت کافروں جیسی نہیں ہوتی، کہ وہ کلام اللہ کو سنتے ہیں مگر اس سے نہ کوئی تأثر لیتے ہیں اور نہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے وہ اندھے بہرے ہوں۔ مومن جب اللہ کا کلام سنتے ہیں تو ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ (مؤلف)

اماما: یعنی ہمیں ایسا امام بنا کہ بھلائی میں ہماری پیروی کی جائے۔ ہمیں ایسے ہدایت بنا جو خود بھی ہدایت یافتہ ہوں، اور بھلائی کی طرف دعوت دیں۔

حسنت مستقرا مقاما: یعنی ان کا منظر حسین وجمیل ہوگا اور ان کی منزل اور قیام گاہ بھی اچھی ہوگی۔ (مؤلف)

درمیان اعتدال پر قائم ہوتا ہے۔ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں — یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے دن اس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے — (اور رحمان کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ جنھیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔ جو دعائیں مانگا کرتے ہیں — کہ "اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا" — یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے۔ آداب وتسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا۔

سنت سے مثالیں

۱۲۴- (أ) غصے کی ممانعت میں یہ حدیث ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے نصیحت کیجیے تو آپؐ نے فرمایا: لاتغضب. غصہ نہ کرو۔

(ب) حیا کے بارے میں کئی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً: اَلْحَیَاءُ لَایَأْتِي إِلَّا بِخَیْرٍ. حیا بھلائی کے علاوہ کوئی چیز نہیں لاتی۔

اَلْحَیَاءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ. حیا بھلائی ہی بھلائی ہے۔

إِنَّ لِکُلِّ دِیْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَیَاءُ. ہر دین میں ایک مخصوص خصلت ہوتی ہے اور اسلام کی یہ مخصوص خصلت حیا ہے۔

إِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ. اگر تم میں حیا نہ رہے تو جو جی چاہے کرو۔

(ج) تعاون کے بارے میں یہ حدیث ہے کہ وَاللہُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ

أَخِيهِ. جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے۔

(د) مسلمانوں کے حقوق اور بعض عادات کی ممانعت کے بارے میں حدیث ہے:

لَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا يَبِعْ بعْضُكُمْ عَلٰى بيْعِ بعْضٍ. آپس میں حسد نہ کرو، ایک دوسرے پر چیزوں کے دام نہ چڑھاؤ، بغض نہ کرو، ایک دوسرے کی ٹانگیں نہ مارو، ایک دوسرے کی بیع پر بیع نہ دو۔

وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا. اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔

اَلْمُسْلِمُ أَخُوا الْمُسْلِمِ لَايَظْلِمُهٗ وَلَا يَخْذُلُهٗ وَلَا يَكْذِبُهٗ وَلَا يَحْقِرُهٗ، وَالتَّقْوٰى هَاهُنَا- وَيُشِيْرُ إِلٰى صَدْرِهٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ - بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّأَنْ يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ. مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ذلیل کرتا ہے، نہ اس کو جھوٹ بولتا ہے اور نہ اس کی تحقیر کرتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہے (یہ کہتے ہوئے آپؐ نے تین بار اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا)۔ ایک شخص کے لیے اتنی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے حرام (یعنی محترم) ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت۔

(ہ) منافقین کی اخلاقیات کی ممانعت کے لیے فرمایا:

آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ. منافق کی تین نشانیاں ہیں: بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے۔

نیز فرمایا: أَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً، وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا: إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ. (متفق علیہ) چار خصلتیں ایسی ہیں جو اگر کسی میں ساری پائی گئیں تو وہ خالص منافق ہوگا اور کسی میں ان میں سے ایک پائی گئی تو اس میں منافقت کی ایک

خصلت موجود ہوگی، جب تک کہ اسے چھوڑ نہ دے: اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے، بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے، معاہدہ کرے تو دھوکہ دیتا ہے اور لڑے تو گالیاں بکتا ہے۔

(و) حلم و بردباری کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج عبد القیس سے فرمایا:

إِنَّ فِيكَ خَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللهُ وَرَسُولُهُ: اَلْحِلْمُ وَالْأَنَاةُ. تمھارے اندر دو خصلتیں ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو بہت محبوب ہیں: حلم و بردباری۔

(ز) رفق اور نرمی کے بارے میں فرمایا: إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهٖ. اللہ تعالیٰ رفق اور نرمی کرنے والا ہے اور ہر چیز میں رفق و نرمی کو پسند کرتا ہے۔

(ح) ریا، خودنمائی اور اخلاص کے بارے میں یہ حدیث ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص بہادری کے لیے، دوسرا حمیت کے لیے اور تیسرا ریا کے لیے لڑتا ہے ان میں سے کون سا اللہ کی راہ میں ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللهِ. جو شخص کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لیے لڑتا ہے بس وہی اللہ کی راہ میں ہے۔

اسی طرح فرمایا: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهٖ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهٖ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلٰى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَّنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ. اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے بے شک ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس کی ہجرت اللہ کی خاطر ہو اس کی ہجرت اللہ کی طرف شمار ہوگی اور جس کی ہجرت حصول دنیا کے لیے یا کسی عورت سے شادی کرنے کی خاطر ہو تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف شمار ہوگی جس کی خاطر اس نے ہجرت کی۔

(ط) لڑائی جھگڑے کی ممانعت کے بارے میں حدیث ہے:

مَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِيَ لَهٗ بَيْتٌ فِي أَعْلَى الْجَنَّةِ، وَمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ

مُبْطِلٌ بُنِیَ لَهُ بَيْتٌ فِيْ رَبَضِ الْجَنَّةِ. جس نے حق پر ہوتے ہوئے لڑائی جھگڑا ترک کیا اس کے لیے جنت کے اعلیٰ درجے میں مکان بنا دیا جائے گا اور جس نے باطل پر ہوتے ہوئے جھگڑا ترک کیا اس کے لیے جنت کے ادنیٰ درجے میں [یا جنت کے باہر] مکان بنایا جائے گا۔

مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ أَنْ هَدَاهُمُ اللّٰهُ إِلَّا أُوتُوا الْجَدَلَ. ہدایت کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی مگر یہ کہ وہ لڑائی جھگڑے میں پڑ گئی۔

(ی) بدزبانی کے بارے میں یہ حدیث ہے کہ لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيِّ. کوئی مسلمان لعن طعن کرنے والا اور بدزبان نہیں ہوتا۔

(ک) خودرائی اور حرص کے بارے میں فرمایا: ثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ: شُحٌّ مُطَاعٌ وَهَوًى مُتَّبَعٌ وَإِعْجَابُ كُلِّ ذِيْ رَأْيٍ بِرَأْيِهِ. تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں: حرص وہویٰ جن کی پیروی کی جائے اور خودرائی۔

(ل) لایعنی باتوں کو ترک کرنے کے بارے میں ارشاد ہوا: مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ. اسلام کی خوبیوں میں ایک خوبی یہ ہے کہ آدمی لایعنی باتوں کو ترک کرے۔

(م) فضول گفتگو کے بارے میں فرمایا: طُوْبٰى لِمَنْ أَمْسَكَ الْفَضْلَ مِنْ لِسَانِهِ وَأَنْفَقَ الْفَضْلَ مِنْ مَالِهِ. بشارت ہے اس شخص کے لیے جس نے فضول گفتگو سے اجتناب کیا اور اپنے مال کا فاضل حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔

(ن) کلمے کو زبان پر لانے سے پہلے اسے اسلام کے میزان سے تولنے کے بارے میں فرمایا:

إِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ مَا يَظُنُّ أَنْ تَبْلُغَ بِهِ مَا بَلَغَتْ فَيَكْتُبُ اللّٰهُ بِهَا رِضْوَانَهُ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ مَا يَظُنُّ أَنْ تَبْلُغَ بِهِ مَا بَلَغَتْ فَيَكْتُبُ اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا سَخَطَهُ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. ایک شخص اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا کوئی کلمہ زبان پر لاتا ہے اور وہ گمان کرتا ہے کہ یہ اسے وہاں تک پہنچائے جہاں یہ کلمہ پہنچ چکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کے لیے قیامت تک اپنی رضامندی لکھ دیتا ہے۔ اور ایک شخص اللہ تعالیٰ کی

ناراضی کا کوئی کلمہ زبان پر لاتا ہے جس کے بارے میں اس کا گمان ہوتا ہے کہ یہ اسے وہاں تک پہنچادے گا جہاں یہ کلمہ پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اِس کے ذریعے اُس کے لیے قیامت تک اپنی ناراضی لکھ دیتا ہے۔

(س) امانت اور ایفائے عہد کے بارے میں فرمایا: لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ، وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ. اس شخص میں کوئی ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں اور اس شخص کا کوئی دین نہیں جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا۔

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: قیامت کب قائم ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: إِذَا ضُيِّعَتِ الْأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ. جب امانتیں ضائع ہوں تو قیامت کا انتظار کرو۔

اس شخص نے پوچھا: امانتوں کے ضائع ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلٰى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ. جب اختیار نااہل لوگوں کے سپرد ہو تو قیامت کا انتظار کرو۔

(ع) سچ اور جھوٹ کے بارے میں ارشاد ہے:

عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيْقاً، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ وَإِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّاباً. سچائی کو اپناؤ اس لیے کہ سچائی بھلائی کا راستہ دکھاتی ہے اور بھلائی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ایک شخص ہمیشہ سچ بولتا رہتا ہے اور اسی کی کوشش میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں صدّیق لکھ دیا جاتا ہے۔ جھوٹ سے پرہیز کرو اس لیے کہ جھوٹ فسق و فجور کا راستہ دکھاتا ہے اور فسق و فجور جہنم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ایک شخص مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے اور اسی کی تلاش میں رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اس کا نام جھوٹوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔

(ف) قوت و عزیمت کے بارے میں فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَّأَحَبُّ إِلَی اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیفِ، وَفِي کُلٍّ خَیْرٌ، اِحْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُکَ وَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَلَا تَعْجَزْ، وَإِنْ أَصَابَکَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّيْ فَعَلْتُ کَذَا لَکَانَ کَذَا، وَلٰکِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ. طاقت ور مومن کمزور مومن سے بہتر اور اللہ کے ہاں زیادہ پسندیدہ ہے، اگرچہ دونوں میں بھلائی ہے۔ اس چیز کے حریص رہو جو تجھے نفع پہنچائے اور اللہ سے مدد مانگو، عاجز نہ بنو۔ اگر تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو یہ نہ کہو کہ اگر میں فلاں کام کرتا تو یوں ہوتا، بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے تقدیر مقرر کی ہے، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ 'اگر' کا لفظ شیطان کا راستہ کھول دیتا ہے۔

(ص) بھلائی میں کسی کی پیروی جائز ہے مگر برائی میں جائز نہیں، اس حوالے سے فرمایا:

لَا یَکُنْ أَحَدُکُمْ إِمَّعَةً، یَقُوْلُ: أَنَا مَعَ النَّاسِ إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَحْسَنْتُ وَإِنْ أَسَاؤُا أَسَأْتُ، وَلٰکِنْ وَطِّنُوْا أَنْفُسَکُمْ إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَنْ تُحْسِنُوْا، وَإِنْ أَسَاؤُا تَجْتَنِبُوْا إِسَاءَتَهُمْ. تم میں سے کسی کو آنت نہیں بننا چاہیے کہ کہے: میں تو لوگوں کے ساتھ ہوں اگر وہ بھلائی کریں گے تو میں بھی بھلائی کروں گا اور اگر وہ برائی کریں گے تو میں بھی کروں گا۔ بلکہ اپنے آپ کو اس بات کا عادی بناؤ کہ اگر لوگ بھلائی کریں تو تم بھی بھلائی کرو اور اگر لوگ برائی کریں تو ان کے ساتھ برائی کرنے سے اجتناب کرو۔

(ق) احتیاط اور بیداری کے بارے میں فرمایا: لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَیْنِ. مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ ڈسا نہیں جاتا۔

(ض) ذلت کو قبول کرنے کی ممانعت کے حوالے سے فرمایا: لَا یَنْبَغِيْ لِلْمُؤْمِنِ أَنْ یُذِلَّ نَفْسَهٗ. کسی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کر دے۔

(ط) باہمی محبت، رحم اور شفقت: مَثَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ کَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَکٰی مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰی لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰی. باہمی محبت اور شفقت اور مسلمانوں کی مثال ایک جسم کی ہے کہ جب اس کے ایک عضو میں تکلیف ہو تو باقی جسم اس کی وجہ سے بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہوتا ہے۔

ثانیاً: جامعیت

۱۲۵- اسلامی نظام اخلاق کی ایک خصوصیت اس کی جامعیت ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اسلامی اخلاق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ انسان کے اپنے نفس کے ساتھ اور دوسروں سے متعلق تمام قسم کے افعال کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ دوسروں کے متعلق جو افعال ہیں ان میں افراد اور جماعت یا حکومت سے متعلقہ سارے افعال شامل ہیں۔ اخلاق کے دائرے سے کوئی چیز بھی خارج نہیں ہے۔ پھر اخلاقی امور کا خیال رکھنے کی جتنی اہمیت اسلام میں ہے اس کی مثال کسی آسمانی شریعت میں ملتی ہے نہ کسی انسانی قانون میں۔ اس مقام پر ہم بطور مثال صرف یہ بات بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات میں اخلاقیات کا کتنا خیال رکھا گیا ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلام اخلاقیات کا لحاظ رکھنے کے حوالے سے کتنی تاکید کرتا ہے۔

ہم نے مثال پیش کرنے کے لیے ریاستی تعلقات کو اس لیے چن لیا ہے کہ لوگوں میں یہ بات مشہور ہے اور حقیقت حال بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ ریاستوں کے مابین تعلقات کسی قسم کے اخلاقیات کے پابند نہیں ہوتے۔ کسی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ریاستی امور میں اخلاقیات کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست میں دھوکہ دینا، بے وقوف بنانا اور جھوٹ بولنا کمال سمجھا جاتا ہے۔ مگر اسلام اس بیمار سوچ کو مسترد کرتا ہے۔ وہ اسی بات کا اعتبار کرتا ہے کہ جو کچھ انفرادی تعلقات میں برا ہے وہ ریاستی امور میں بھی برا ہے۔ اسی طرح وہ اس بات کا بھی اعتبار کرتا ہے کہ جو کچھ انفرادی معاملات میں اچھا ہے وہ ریاستی معاملات میں بھی اچھا ہی ہے۔ اس لیے اسلامی شریعت میں یہ بات طے ہے کہ اسلامی ریاست کے لیے اخلاقیات کی پابندی لازمی ہے۔ یہ بیان قرآن کریم اور سنت نبویہ اور اقوال فقہا میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

۱- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَآءٍ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (الانفال ۸:۵۸) اور اگر کبھی تمھیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے اگر ان کی خیانت ظاہر ہو جائے اور یہ بات دلائل کے ساتھ ثابت ہو تو انھیں معاہدہ توڑنے سے آگاہ کر دو، تاکہ تم ان کے ساتھ علم میں برابری کے مقام

پر آ جاؤ۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ خائنوں کو پسند نہیں کرتا، اگر چہ یہ خیانت کافر لوگوں کے ساتھ ہی ہو اور معاہدہ توڑنے کے مرتکب بھی وہی ہوئے ہوں۔

۲- نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ کی شرائط میں ایک بات یہ تھی کہ جو قریش میں سے جو شخص مسلمان ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے گا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے، اسے پناہ دینے کا حق نہیں ہے۔ وہ معاہدے کی دستاویز لکھنے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ابو جندلؓ مسلمان ہو کر اور اپنے اسلام کا اعلان کر کے قریش مکہ سے نکل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ہم نے اس قوم سے ایک صلح کا معاہدہ کیا ہے، ہم نے باہمی رضامندی سے یہ شرط رکھی ہے اور ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔[۱]

۳-فقہا کہتے ہیں کہ کسی مسلمان کے لیے دارالحرب کے لوگوں کے ساتھ خیانت جائز نہیں ہے، اگر وہ دارالاسلام میں مسلمانوں کے امان کے ساتھ داخل ہوئے ہوں۔ کیوں کہ ان کے ساتھ خیانت وعدہ خلافی ہے اور یہ اسلام میں جائز نہیں ہے۔[۲]

۴-فقہائے حنابلہ کہتے ہیں: جب کفار کسی مسلمان قیدی کو رہا کر دیں اور اس سے قسم لیں کہ جا کر اپنا فدیہ بھیجو یا ہمارے پاس واپس آ جاؤ تو اس پر لازم ہے کہ قسم کو پورا کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللّٰهِ إِذَا عَاهَدْتُّمْ.** (النحل ۱۶:۹۱) اللہ کے عہد کو پورا کرو، جب کہ تم نے اس کے ساتھ کوئی عہد باندھا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: **إِنَّهُ لَا يُصْلِحُ فِي دِينِنَا الْغَدْرُ.** یقیناً ہمارے دین میں غدر جائز نہیں ہے۔[۳]

۵- اگر دارالحرب کے لوگ اپنی حدود میں داخل ہونے پر مسلمانوں سے ان کے مال پر ٹیکس لیتے ہیں اور وہ اتنا ظالمانہ ٹیکس ہو کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے مال کی جان ہی نکل جاتی ہے یا یہ کہ تھوڑے مال پر ان سے اتنا زیادہ ٹیکس لیتی ہے کہ اس مال اور ٹیکس میں کوئی معقول نسبت نہ ہو تو دارالاسلام ان کے ساتھ اسی طرح کا سلوک نہیں کرے گا۔ فقہائے کرام اپنے اس قول کی علت یہ بیان کرتے ہیں کہ دارالحرب والوں کا

۱- سیرت ابن ہشام، موضوع: صلح حدیبیہ

۲- المغنی، ابن قدامہ ۸:۴۵۸

۳- المغنی، ابن قدامہ ۸:۴۸۳

یہ فعل غدر اور ظلم ہے اور ہمیں اس طرح کی اخلاقیات سے روکا گیا ہے، اگر چہ وہ اسی طرح کی اخلاقیات اختیار کرتے ہیں۔[1]

ثالثاً: ذرائع اور مقاصد دونوں میں لزوم

۱۲۶- اسلام کے نظام اخلاق کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اخلاقیات کا نہ صرف مقاصد میں التزام کیا جاتا ہے بلکہ وسائل و ذرائع میں بھی اس کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ کسی اعلیٰ مقصد تک پہنچنے کے لیے غلط ذریعہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی اخلاقیات میں اس غلط اصول کی گنجایش نہیں ہے کہ اَلْغَایَۃُ تُبَرِّرُ الْوَسِیْلَۃَ یعنی اچھا مقصد غلط ذریعے کو جائز بنا دیتا ہے۔ یہ اصول کافرانہ تہذیب سے ہماری طرف سرایت کر گیا ہے۔

ذریعہ کے جائز ہونے اور اس میں اخلاقیات کا لحاظ رکھنے کی ضرورت پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے کہ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. (الانفال ۸:۷۲) اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمھارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔

یہ آیت کریمہ مسلمانوں پر اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد و اعانت لازم کر رہی ہے تا کہ دینی بھائی چارے کا حق ادا ہو جائے، لیکن اگر ان کی مدد سے ظلم کرنے والے کفار کے ساتھ کیے گئے ہمارے کسی معاہدے کی خلاف ورزی لازم آتی ہے تو پھر ان مسلمانوں کی مدد جائز نہیں ہوگی۔ کیوں کہ یہ اعلیٰ مقصد تب حاصل ہوگا جب اس کے لیے خیانت اور عہد شکنی کا غلط ذریعہ استعمال کریں گے اور اسلام خیانت کو مٹاتا اور خائنوں کو ناپسند کرتا ہے۔

رابعاً: ایمان اور تقویٰ کے ساتھ اخلاق کا تعلق

۱۲۷- اسلام میں اخلاق کا تعلق ایمان اور تقویٰ و پرہیز گاری کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (التوبۃ ۹:۴) تم بھی مدت معاہدہ تک ان

۱- المبسوط ۱۲: ۲۰۰، حاشیہ ابن عابدین ۲: ۵۶

کے ساتھ وفا کرو کیوں کہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ عہد کی وفاداری تقویٰ میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتا ہے۔ اور یہ بات ایمانیات میں سے ہے کہ آدمی ان چیزوں کی طرف سبقت کرے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔

اور حدیث میں آیا ہے: لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ، وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ. اس شخص میں کوئی ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں اور اس شخص کا کوئی دین نہیں جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ یہ بات ضروری ہے کہ وہ اچھے اخلاق کا پھل دیتا ہے جن میں سرفہرست امانت اور عہد کی پاسداری ہے۔ جو امانت میں خیانت کرتا ہے اور عہد کی خلاف ورزی کرتا ہے تو یہ اس بات کا اعلان ہے کہ یہ شخص مطلوبہ ایمانیات سے عاری ہے اور یہ تقویٰ کے بارے میں تفریط کا شکار ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے: وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ. خدا کی قسم! مومن نہیں، خدا کی قسم! مومن نہیں، خدا کی قسم! مومن نہیں، کسی نے پوچھا: کون مومن نہیں؟ آپ نے فرمایا: اَلَّذِيْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ. وہ شخص مومن نہیں جس کے ضرر سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں۔

یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ برے اخلاق ایمان کے منافی ہیں۔ ایمان اور برے اخلاق ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

خامساً: جزا و سزا

۱۲۸- اسلام میں نظام اخلاق کی ایک خصوصیت جزا و سزا کا تصور ہے۔ اسلام نے مثبت اخلاق کا حکم دیا ہے اور منفی اخلاق سے روکا ہے۔ جن چیزوں کا حکم ہے ان کی نافرمانی اور جن چیزوں کی ممانعت کی گئی ہے ان کا ارتکاب سزا کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (الھمزۃ ۱۰۴:۱) تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے۔

اسی طرح شرعی حدود کی پابندی اور ان کی اطاعت ثواب کا ذریعہ ہے۔

جو لوگ اخلاق کے بارے میں شرعی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہیں اس کی سزا کبھی دنیا میں مل جاتی

ہے۔مثلاً جھوٹ کی گواہی دینے والا، بدزبانی کرنے والا، خائن اور اس طرح کے لوگوں کو مسلمان قاضی دنیا میں تعزیری سزا دے گا۔اسی طرح قسم کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں آدمی حانث ہو جاتا ہے۔یعنی اللہ کے نام کے ساتھ جو پختہ عہد کیا ہوتا ہے اس کی خلاف ورزی کرنے پر کفارہ لازم آتا ہے۔کفارہ بھی فقہا کے قول کے مطابق سزا کے حکم میں ہے۔

بعض اوقات دنیا میں سزا کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جس جماعت میں برے اخلاق کی کثرت ہو جاتی ہے وہ جماعت ہی صفحۂ ہستی سے مٹادی جاتی ہے۔اس سزا کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ إِنَّمَا أَهْلَکَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ وَإِذَا سَرَقَ الْوَضِيعُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ... تم سے پہلے والے لوگوں کی ہلاکت کا سبب یہ تھا کہ جب ان میں کوئی شریف آدمی چوری کر لیتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمتر آدمی چوری کر لیتا تو اس پر حد قائم کر دیتے تھے۔

اسی طرح مثلاً کسی قوم میں بزدلی عام ہو جائے اور وہ ظالم کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں کہ لوگوں کے حقوق کے ساتھ کھیلتے رہیں، وہ اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے کیوں کہ وہ بزدلی کی بنا پر ان سے ڈرتے ہیں اور ذلت ورسوائی کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔اس طرح کے کمینہ اخلاق بھی امت کی ہلاکت کا ذریعہ بنتے ہیں یا اسے بہت بڑا نقصان پہنچا دیتے ہیں جس میں گناہ اور بے گناہ دونوں قسم کے لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (الانفال ۸:۲۵) اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔

اخلاق کی تعمیر وتہذیب

۱۲۹- اب جبکہ ہم اسلام میں اخلاق کا مقام بیان کر چکے ہیں اور یہ بھی کہ اخلاق کا اعمال پر کیا اثر ہوتا ہے اور ان کے نتیجے میں انسان کو کیا جزا یا سزا ملتی ہے، ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا اخلاق کو درست کرنا ممکن ہے اور اچھے اخلاق کو اپنانا یا برے اخلاق سے جان چھڑانے کا امکان موجود ہے؟ یا پھر اخلاق کچھ لازمی صفات ہیں جو انسان کے اندر قدرتی طور پر رکھی جاتی ہیں اور وہ ان میں فطری طور پر ڈھل جاتا ہے، چنانچہ ان میں تغییر تبدیل یا ان کی درستی ممکن نہیں ہے، جیسا کہ جسمانی صفات مثلاً قد کے لمبے یا چھوٹے ہونے اور رنگ

کو نہیں بدلا جا سکتا؟

اس سوال کا جواب ہمارے خیال میں مختصراً دو نکات میں یہ ہے:

۱۔ اخلاق مجموعی طور پر قابل اصلاح وتبدیل ہے۔ اسی طرح اچھے اخلاق کو اپنانا اور برے اخلاق سے جان چھڑانا بھی ممکن ہے۔ اس پر ہماری دلیل یہ ہے کہ شریعت نے اچھے اخلاق سے مزین ہونے کا حکم دیا ہے اور برے اخلاق کو اپنانے سے روکا ہے۔ اگر یہ بات ممکن نہ ہوتی اور انسان کے بس میں نہ ہوتی تو شریعت یہ حکم اور یہ ممانعت کبھی نہ کرتا۔ کیوں کہ اسلام کسی محال کا حکم نہیں دیتا۔ فقہ اسلامی کے قواعد میں سے ایک یہ ہے کہ لَاتَكْلِيْفَ إِلَّا بِمَقْدُوْرٍ، یالَا تَكْلِيْفَ بِمُسْتَحِيْلٍ (یعنی کسی کو مکلّف اسی چیز کا کیا جاتا ہے جو قدرت میں ہو اور ممکن ہو)۔ اس بنا پر ہر انسان کے پاس اس بات کی قدرت اور اہلیت موجود ہے کہ اچھے اخلاق سے مزین ہو اور برے اخلاق سے خالی ہو۔ اس مفہوم کے لیے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (الشمس ۹۱: ۷-۱۰) اور نفس انسانی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیز گاری اس پر الہام کر دی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

مگر اخلاق کو بنانے اور اس کو درست کرنے کے لیے لوگوں کی اہلیت، قدرت اور استعداد میں فرق ہوتا ہے جیسا کہ عقل وذہانت میں باہم فرق ہونے کی وجہ سے مختلف علوم وفنون حاصل کرنے اور باریک باتوں کو سمجھنے میں لوگوں کی قدرت اور استعداد میں فرق ہوتا ہے۔

۲۔ بعض لوگوں کو فطری طور پر کچھ اخلاق دیے جاتے ہیں۔ ان میں یہ اخلاق نمایاں اور ان کے کردار میں ظاہر وباہر ہوتے ہیں۔ اس پر ہماری دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج عبدالقیس سے فرمایا: إِنَّ فِيْكَ خَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى وَرَسُوْلُهُ: اَلْحِلْمُ وَالْأَنَاةُ. تمھارے اندر دو خصلتیں ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو بہت محبوب ہیں: حلم وبردباری۔

اس نے کہا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَنَا أَتَخَلَّقُ بِهِمَا أَمِ اللّٰهُ تَعَالٰى جَبَلَنِيْ عَلَيْهِمَا؟ یا رسول اللہ! کیا یہ

خصلتیں میں خود اپناتا ہوں یا اللہ تعالیٰ نے میری فطرت ان پر بنائی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: بَلِ اللّٰهُ جَبَلَكَ عَلَيْهِمَا . یہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری فطرت ان پر بنائی ہے۔ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسی دو خصلتوں کے ساتھ پیدا فرمایا جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں[1]

ظاہر ہے کہ لوگ جن اخلاق کے ساتھ پیدا کیے جاتے ہیں ان میں ان کے درمیان فرق اور تفاوت موجود ہوتا ہے، جیسا کہ ان کے درمیان ذہانت اور قوت ادراک میں فرق ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص کسی خاص قسم کے اخلاق کے ساتھ پیدا ہو جائے اُس کے لیے اِس قسم کے اخلاق کو اپنے اندر راسخ کرنا اور اس پر برقرار رہنا آسان ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں فطرت اس کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔

اخلاق کی تعمیر اور درستی کا طریقہ

۱۴۰- اخلاق کی تعمیر اور درستی حسب ذیل صورتوں میں ممکن ہوتی ہے:

۱- ایک یہ کہ اس کے اثرات کو کم کیا جائے اور اس کے بدعمل کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ یہ طریقہ ان اخلاق کے بارے میں اختیار کیا جا سکتا ہے جنھیں ہر انسان میں ایک فطری چیز سمجھا جاتا ہے۔ اس پر وہ بات دلالت کرتی ہے جو حدیث میں وارد ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے نصیحت کیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: ''غصہ نہ کرو۔'' اس آدمی نے کئی بار اپنا سوال دہرایا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بار اسے یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کرو۔

علمائے کرام اس حدیث کی تشریح میں کہتے ہیں کہ غصے کی ممانعت کا اصل مقصد غصے کے مقتضا پر عمل کی ممانعت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غصے کے اثرات کو دبانا لازم ہے۔ یہ ممانعت خود غصے کی طرف راجع نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ تو انسانی طبیعت کی بات ہے جسے دبانا یا مٹانا ممکن نہیں ہے۔[2] چنانچہ غصے کی خصلت کو بالکلیہ مٹانا مقصود نہیں ہے کیوں کہ یہ ناممکن ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اسے پر قابو پایا جائے، اسے پیا جائے اور اس کے مقتضا پر عمل نہ کیا جائے۔ اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے کہ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ

۱- تیسیر الوصول، ابن الدیبع الشیبانی، ج ۴، ص ۳۰۴

۲- شرح اربعین نووی از امام نوویؒ، ص ۴۹۔ فتح المبین لشرح الاربعین از ابن حجر ہیثمی، ص ۱۴۰

(آل عمران ۳:۱۳۴)اور غصے کو پی جانے والے۔

اس میں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اپنے غصے کو ضبط کرتے ہیں، اسے قابو میں رکھتے ہیں نہ کہ اسے مکمل طور پر ختم کرتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں یہ بھی آیا ہے کہ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ (الشوریٰ ۴۲:۳۷)اور جب انھیں غصہ آتا ہے تو معاف کردیتے ہیں۔

یہاں اس بنا پر تعریف کی گئی ہے کہ وہ اپنے غصے کے مقتضا پر عمل نہیں کرتے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ. پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسروں کو پچھاڑ دے بلکہ اصل پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

۲- دوسری صورت یہ کہ اخلاق کی خراش تراش کرکے اسے مہذب بنایا جائے، اصل اخلاق کو کدورتوں سے پاک کیا جائے اور اس کی اس طرح رہنمائی کی جائے کہ وہ شریعت کے لیے قابل قبول بن جائے۔ جیسے شجاعت ایک اخلاقی صفت ہے مگر اسے ظلم وزیادتی کے لیے اور بے گناہ لوگوں کو قتل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے یا اسے خودنمائی اور جاہ وجلال کے لیے کام میں لایا جائے تو یہ غلط ہوگا۔ اسی طرح سخاوت ایک اچھی صفت ہے مگر اسے ریا اور نام ونمود کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ اخلاق بذات خود قابل تعریف ہیں مگر مذموم اس وجہ سے بن گئے کہ یہ درست مقصد اور شریعت کے قابل قبول پہلو سے انحراف کر گئے۔ اب اس اخلاق کی درستی کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے غلط مقصد کا ازالہ کیا جائے اور اسے درست سمت کی طرف متوجہ کیا جائے۔ مثلاً شجاعت کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے کہ کمزور کا ہاتھ تھام لیا جائے مظلوم کی مدد کی جائے، ظالم کا ہاتھ پکڑا جائے، اللہ کے کلمے کو بلند کیا جائے اور کفر وباطل کو مٹایا جائے۔ یہ سب کچھ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے ہو نہ کہ ریا، خودنمائی، جاہ وجلال اور قابل تعریف بننے کے لیے۔ اسی طرح سخاوت کو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ جہت کی طرف متوجہ کیا جائے اور وہ یہ کہ سخاوت اسی کے راستے میں ہو اور اسی کی رضا کے لیے ہو۔ مثلاً یہ کہ اپنے مال کو بھلائی کے راستوں میں لگائے۔ جیسے مہمان اور پڑوسی کا اکرام کرنا، یتیم کی کفالت کرنا، ضرورت مند کے ساتھ تعاون کرنا، اسے قرض دینا، بیواؤں اور مسکینوں کی ضرورتیں پوری کرنا، وغیرہ۔ ان بیانات پر بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے چند احادیث یہ ہیں:

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص

بہادری کے لیے، دوسرا حمیت کے لیے اور تیسرا ریا کے لیے لڑتا ہے ان میں سے کون سا اللہ کی راہ میں ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے فرمایا: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةَ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ. جو شخص کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لیے لڑتا ہے بس وہی اللہ کی راہ میں ہے۔[1]

قرآن کریم میں بھی ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ (البقرۃ ۲:۲۶۴) اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے۔

اور حدیث میں آیا ہے کہ اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوْا. انسانوں کی مثال معدنیات کی ہے۔ ان میں جو جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہوں گے، بس شرط یہ ہے کہ وہ سمجھ جائیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جب سمجھ جاتے ہیں تو اپنے ان اخلاق کو جو بذات خود اچھے ہیں صحیح طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور انھیں درست سمت کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں اس وجہ سے وہ بہتر ہوتے ہیں۔

۳- تیسرا طریقہ یہ ہے کہ برے اخلاق کو اچھے اخلاق میں بدل دیا جائے۔ مثلاً جھوٹ کو سچ میں وعدہ خلافی کو وفاداری میں اور ظلم و جبر کو عدل و انصاف میں۔ یہ تبدیلی بہت سے اخلاقیات میں ممکن ہوتی ہے، کہ بری خصلت زائل ہو جائے اور اس کی جگہ اچھی صفت آ جائے، جیسا کہ ہم اس شخص میں دیکھتے ہیں جو گناہوں سے سچی توبہ کر لیتا ہے۔

اخلاق کی درستی کے ذرائع

۱۳۱- اخلاق کو درست کرنے، اچھے اخلاق کو حاصل کرنے اور برے اخلاق سے جان چھڑانے کے کئی ذرائع ہیں۔ ان میں سے چند اہم ترین ذرائع درج ذیل ہیں:

۱- **علم**: اس سے ہماری مراد اچھے اخلاق، جن کا اسلام نے حکم دیا ہے اور برے اخلاق، جن سے اسلام نے روکا ہے، کی قسموں کو پہچاننا ہے۔ یہ علم بہت ضروری ہے اس لیے کہ اس کے بغیر ایک مسلمان نہیں جان

۱- تیسیر الوصول، ج ۱، ص ۲۳۱۔ اس میں کہا گیا ہے کہ رواہ الخمسۃ

سکتا کہ کون سے اخلاق کو اپنایا جائے اور کون سے اخلاق سے جان چھڑائی جائے۔ اسلام نے مسلمانوں کو ان اخلاق کی تلاش اور استنباط سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس نے اخلاق کی دونوں قسمیں پوری تفصیل سے بیان کر دی ہیں۔ مسلمان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دونوں قسم کے اخلاق کے سامنے پیش کرے تاکہ وہ اپنا مقام پہچان لے۔ پھر وہ بھرپور کوشش کرے کہ اس کے اخلاق حقیقی طور پر اسلامی اخلاق ہوں۔

۲-شوق اور خوف: یہی کافی نہیں ہے کہ اخلاق کی قسموں کو پہچان لے بلکہ یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ اچھے اخلاق کا شدید محتاج ہے، کیوں کہ اچھے اخلاق ایمان اور تقویٰ کے ساتھ متصل ہیں اور وہ اللہ کی رضا حاصل کرنے اور جنت میں داخل ہونے کے اسباب ہیں۔ اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ برے اخلاق اس کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں، کیوں کہ یہ نفاق کی نشانی، ایمان کی کمزوری کی دلیل اور اللہ کی ناراضی اور جہنم میں جانے کا ذریعہ ہیں۔ یہ معرفت اللہ کی رضا کے شوق میں اسے اچھے اخلاق اپنانے پر آمادہ کرے گی۔ اسی طرح اللہ کی ناراضی کے خوف میں یہ اسے برے اخلاق سے نجات کی تلقین کرے گی۔ اس لیے کہ جو شخص کسی چیز کا شوق رکھتا ہے اس کی طرف آگے بڑھتا ہے، اور جو شخص کسی چیز سے خوف کھاتا ہے وہ اس سے دور بھاگتا ہے۔

۳-استحضار و یاد دہانی: برے اخلاق کی قسموں اور ان کے نتائج کو جاننا بھی کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس معرفت کو اپنے ذہن میں مستحضر رکھے تاکہ وہ اسے بھول نہ جائے۔ اس لیے کہ نسیان علم کے لیے ایک بڑی آفت ہے۔ نسیان اخلاقیات میں سستی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس سے دل میں ان کا اثر کمزور ہو جاتا ہے اور پھر آدمی سے وہ افعال سرزد ہوتے ہیں جو مناسب نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ہمارے سامنے اخلاقیات کو بار بار بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام سے جو کچھ صادر ہوا وہ نسیان ہی کی وجہ سے تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا** (طٰہٰ ۲۰:۱۱۵) ہم نے اس سے پہلے آدمؑ کو حکم دیا تھا، مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔

اور جب حضرت عمرؓ کے سامنے ایک آدمی نے کہا کہ آپ عدل کے ساتھ اور حق کے ساتھ فیصلہ نہیں کرتے تو ان کو غصہ آیا مگر وہاں جو لوگ موجود تھے ان میں سے کسی نے کہا: امیر المومنین! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (الاعراف ۷:۱۹۹-نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو) اور یہ شخص جاہلین میں سے ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا: تو نے سچ کہا۔ اور ان کا غصہ جاتا رہا۔ معلوم ہوا کہ اخلاقیات اور ان کی اساس و بنیاد یعنی ایمان کی دائمی یاددہانی اور اخلاقیات کے مقتضا پر عمل ایمان کا ثمرہ اور اسلام کا پھل ہے۔ یہ ساری چیزیں ایک مسلمان کے کردار کو اسلامی اخلاقیات کی حدود میں رکھتی ہیں۔

۴-تقویت عقیدہ: چوتھی چیز عقیدے کے مختلف پہلوؤں کو دل میں مضبوط کرنا ہے۔ ان میں سرفہرست اللہ پر ایمان، روزِ آخرت پر ایمان اور رسالت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان ہے۔ یہ احساس پیدا کرنا کہ مسلمان اس دنیا میں اجنبی ہے اور عنقریب اسے یہاں سے جانا ہے۔ اسے اس کے اعمال اور اخلاقیات کا بدلہ دیا جائے گا۔ ان لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے ثواب کا سچا وعدہ کر رکھا ہے جو اسلامی اخلاقیات کو اپناتے ہیں۔ اور جو لوگ اسلامی اخلاق کو مسترد کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے سزا کی وعید سنائی ہے۔

دل میں اسلامی عقیدے کی مضبوطی، دل کی کشادگی اور اسلامی اخلاقیات کو قبول کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ اخلاقیات ایمان اور تقویٰ کے ساتھ متصل ہیں۔ جوں جوں دل میں ایمان پختہ اور راسخ ہوتا ہے اس تعلق میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ چیز ایک مسلمان کے پاکیزہ اخلاق کو راسخ اور مضبوط کرتی ہے جس پر نہ زوال آتا ہے اور نہ اس میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلق اُس ذات سے ہے جو قوی اور عزیز ہے۔ اس کا باقی و جاری رہنا، اور اس کا صالح ہونا اس چشمۂ صافی کے دم سے ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ یعنی ایمان باللہ اور اس کے لوازم۔ چنانچہ مثال کے طور مسلمان کبھی ذلیل نہیں رہتا۔ کیوں کہ اس کا تعلق قوی اور عزیز ذات کے ساتھ ہے، جو عزت و عظمت کا واحد مالک ہے: فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا (النساء ۴:۱۳۹) عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔

اور جو مسلمان اپنے رب کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ان کو بھی اس عزت میں حصہ ملتا ہے: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ (المنافقون ۶۳:۸) عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے۔

مومن کسی مخلوق سے خوف و ڈر نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ کسی کی خوشامد کرتا ہے، نہ کسی کے آگے جھکتا ہے اور نہ منافقت اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ سارے امور کا اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ نفع،

نقصان، رزق، زندگی، موت سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں: وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلاَ كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلاَ رَآدَّ لِفَضْلِهٖ (یونس۱۰:۱۰۷) اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے، اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

مومن کا معزز ہونا بھی ایسا ہے کہ اس کے ساتھ کبر وغرور، سرکشی وخودسری اور خودرائی کا نام ونشان تک نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس کی عزت ایمان باللہ کے ساتھ قائم ہوتی ہے اور اللہ ہی کبریا وجبروت کا مالک ہے۔ اس کے سوا جو بھی ہے وہ فقیر وناتواں اور مجبور ہے۔ چنانچہ کسی فقیر اور مجبور کا کیا کام ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے کبروغرور کا اظہار کرے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ عاجز مزاج ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنی قدر پہچان لی ہے۔ اور جس نے اپنی قدر پہچان لی وہ کبھی متکبر نہیں ہوسکتا۔ پھر عزت اور تواضع کے ساتھ اسے صبر جمیل، اعتماد کامل، مایوسی کے ہر شائبے سے بالاتر امید اور پریشانی سے پاک اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ایمان ان تمام فاضلانہ اخلاق کا پھل دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلاَ بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد۱۳:۲۸) آ گاہ رہو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اور اس کے لیے کہ جو کچھ مقدر ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے۔ چنانچہ اضطراب اور پریشانی کا کوئی فائدہ نہیں ہے: قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (التوبۃ۹:۵۱) کہہ دو کہ ہمیں تو بس وہی پہنچنے والا ہے جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے۔

اور اس لیے کہ جو اللہ پر توکل کرتا ہے وہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے: وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطلاق۶۵:۳) جس نے اللہ پر توکل کیا اس کے لیے وہی کافی ہے۔

شجاعت، جرأت، آگے بڑھنا، حق پر ثابت قدم رہنا اور اس طرح کی دیگر اخلاقیات ایک مسلمان میں راسخ ہوتی ہیں، بشرطیکہ اس کا دل ایمانیات سے معمور ہو۔ اس لیے کہ مسلمان کا ایمان اسے سکھاتا ہے کہ زندگی میں یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک مسلمان ذلیل ورسوا ہو جائے یا بزدل بن جائے یا آگے بڑھنے کے موقع پر وہ رک جائے۔ اس لیے کہ اجل لکھنے والا تو فارغ ہو چکا ہے اور موت ہر ذی روح پر آنے والی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران۳:۱۸۵) آخرِکار ہر شخص کو مرنا ہے۔

اور وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوْتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران۳:۱۴۵) کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔

قناعت، عفت، لوگوں، اوران کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے نیازی ایمان کے میٹھے اور پاکیزہ پھلوں میں سے ہیں۔ اس لیے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر یقین رکھتا ہے کہ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ...وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (آل عمران۳:۷۳) کہو کہ فضل وشرف اللہ کے اختیار میں ہے.....وہ وسیع النظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

اور رزق کی کنجیاں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں: اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (الرعد۱۳:۲۶) اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا رزق دیتا ہے۔

اور یہی معاملہ باقی اخلاقیات کا بھی ہے کہ اگر ان کی بنیاد عمیق ایمان پر قائم ہو، جو دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتا ہے اور پوری شخصیت اس سے رنگی ہوئی ہوتی ہے تو ان میں رسوخ آتا ہے اور ان میں دوام واستمرار پیدا ہوتا ہے۔ پس ایمان کی جڑوں کا دل میں گہرا ہونا اور عقیدے کی مضبوطی اچھے اخلاق سے مزین ہونے اور برے اخلاق سے نجات حاصل کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔

۵- پاکیزہ اعمال: وہ پاکیزہ عمل کرنا جو اخلاق کی درستی کا ذریعہ یا اس میں مددگار بنتا ہے یا نفس کے لیے اچھے اخلاق اپنانے کو آسان بنا دیتا ہے اور برے اخلاق کو بھگا دینے میں مدد دیتا ہے۔ عمل کے بغیر صرف علم کافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (الشمس۹۱:۹) فلاح پا گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ بنایا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ فلاح پا گیا وہ شخص جس نے اس کے پاکیزہ بنانے کا طریقہ سیکھا۔ چنانچہ عملی طور پر تزکیہ ضروری ہے۔ اور وہ اس طرح ہوگا کہ نفس کا تزکیہ کرنے والے افعال انجام دیے جائیں اور اس کو خراب کرنے والے اعمال کو چھوڑ دیا جائے۔ وہ مریض جس کے لیے کوئی علاج تجویز کیا جائے یا اس کا عملی طور پر علاج کیا جائے مگر وہ اس علاج کو استعمال نہ کرے وہ اس سے کوئی استفادہ نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ مسلسل اس نسخے کو دیکھتا رہے اور اس کی ترکیب کو دہراتا رہے۔

۶۔فرائض ونوافل: اخلاق کی درستی کے لیے نافع اور پاکیزہ اعمال کی قسموں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کے وہ کام کیے جائیں جو فرض یا مستحب کا درجہ رکھتے ہیں۔اس لیے کہ ان سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے اور اس کے لیے اچھے اخلاق کو اپنانا اور برے اخلاق کو بھگانا آسان ہوجاتا ہے۔یہ چیزیں نفس کی طہارت، تزکیہ، قوت اور بچاؤ کا آلہ ہیں۔قرآن کریم نے ان چیزوں کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے: إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنكَرِ (العنکبوت۲۹:۴۵) یقیناً فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

اور زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا: خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا. (التوبۃ ۹:۱۰۳) ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو۔

یعنی آپؐ ان کو بخل اور حرص سے پاک کرتے ہیں اور ان کے دلوں کو کدورتوں اور گرے ہوئے اخلاق سے صاف فرماتے ہیں۔

روزہ انسان میں صبر کی صفت کو نمو دیتا ہے، قوت ارادی اور عزیمت کی ترقی اور خودنمائی سے نجات کا ذریعہ بنتا ہے۔ حج روح کی عملی تربیت اور دل کی ریاضت کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ بہت سے دوسرے اخلاقیات کے حصول اور بہت سے ناپسندیدہ صفات سے نجات کا فعال وسیلہ ہے۔حج میں صبر کی تربیت ہے، اخلاص کی تربیت ہے، جسمانی خواہشات پر قابو پانے کی تربیت ہے، اپنے مال کو ان مقامات میں خرچ کرنے کی تربیت ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔اس میں غرور، تکبر، خودرائی، اپنی قدر سے تجاوز اور اس قسم کی دیگر مذموم صفات سے بچنے کی تربیت ہے۔

یہی معاملہ باقی عبادات کا ہے، جن کو اگر ہمیشہ کیا جائے تو ان سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔اس سے دل میں ایمانی صفات اور تقویٰ ہمیشہ کے لیے جاگزیں ہوجاتا ہے اور انھی میں سے اچھے اخلاق بھی ہیں۔اس لیے کہ یہ اخلاق صرف ایسے ہی نفس میں پیدا ہوتے ہیں جس کا تزکیہ ہوچکا ہو اور مختلف عبادات کی طرح کوئی چیز نہیں جو نفس کے تزکیہ، اچھے اخلاق کے حصول اور برے اخلاق سے نجات کے لیے کارگر ہوسکے۔اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ان بیانات کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا إِلَّا الْمُصَلِّينَ

الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج ۷۰:۱۹-۲۵) انسان تھڑ دِلا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں، جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔

۷- برے اخلاق کے خلاف اعمال: ایسے اخلاق جن سے نجات درکار ہوتا ہے ان کے خلاف یا ان کے مقتضا کے خلاف اعمال کو اپنانا بھی اچھے اخلاق کو پروان چڑھانے کے ذرائع میں شمار ہوتا ہے۔ اس طریق کار کو ہم 'علاج بالضد' یا 'شیطان کو زچ کر دینے' کا طریق کار کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ شیطان برے اخلاق سے خوش ہوتا ہے اور ان کو دلوں میں باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ لوگوں کے دل میں ان کے غلط وجوہِ جواز پیدا کر کے انھیں مزین کرتا ہے۔ اس لیے جب انسان کوئی ایسا عمل کرتا ہے جو ان اخلاقیات کے خلاف ہو اور شیطان کے مقتضا کے مطابق نہ ہو تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ شیطان کو غصہ دلانے اور اس کو زچ کرنا ہے۔ اس سے وہ مجبور ہوگا کہ یہ بری خصلت لوگوں کے لیے مزین کرنے اور غلط وجوہ جواز پیدا کرنے سے باز آئے۔ جب شیطان پیچھے ہٹ جائے گا تو اس عمل کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ برے اخلاق کی بنیاد کو ہلا دے یا اس کا کام اسی طرح تمام کرے جیسا کہ مؤثر علاج بیماری کا کام تمام کرتا ہے۔ اس طریق کار کے کارگر ہونے اور اخلاق کی درستی میں مؤثر ہونے پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جس میں وارد ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرے دل میں سختی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِمْسَحْ رَأْسَ الْیَتِیْمِ وَأَطْعِمِ الْمِسْکِیْنَ. یتیم کے سر پر ہاتھ رکھو اور مسکین کو کھانا کھلاؤ۔

اس طریق کار کی دیگر مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً حسد کا علاج یہ ہے کہ حسد کرنے والا حسد کیے جانے والے کے لیے استغفار اور دعا کرے۔ اس طرح وہ محسوس کرے گا کہ اس کے دل سے حسد زائل ہو رہا ہے۔ تکبر کا علاج یہ ہے کہ متکبر آدمی فقرا، مساکین اور ناداروں کے ساتھ نشست و برخاست رکھے اور مجلس کے آخر میں بیٹھے۔ تکبر کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ ایسے افعال انجام دیے جائیں جسے لوگ عموماً حقیر اور متکبرین کی شان کے خلاف سمجھتے ہوں، جیسے لکڑیاں اُٹھانا وغیرہ۔

اسی قسم کے اعمال میں سے وہ بات بھی شمار کی جاسکتی ہے جو حدیث میں آئی ہے کہ إِذَا غَضِبَ

أَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ فَإِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَإِلَّا فَلْيَضْطَجِعْ. جب تم میں سے کسی کو غصہ آ جائے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے۔ اگر غصہ فرو ہوا تو ٹھیک، ورنہ ٹیک لگا دے[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے چاہیے کہ پانی سے وضو کرے۔ اس لیے کہ غصہ آگ سے ہے اور آگ پانی سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔

۸- تکلف کا طریقہ: انسان جب اپنے آپ کو ایک اخلاق کا عادی بنانا چاہتا ہے تو اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انسان مصنوعی طور پر اس کی نقل اُتارے۔ مثلاً ایک شخص چاہتا ہے کہ وہ حلم و بردباری کی صفت سے مزین ہو جائے تو وہ بار بار تصنع کے ساتھ حلم اختیار کرے یہاں تک اس کا نفس اس کے ساتھ مانوس اور عادی ہو جائے اور یہ چیز اس کے لیے طبیعت ثانیہ بن جائے۔ اس طریق کار کی تائید بھی حدیث سے ہوتی ہے اگر چہ وہ ضعیف سند کے ساتھ مروی ہے۔ وہ یہ کہ **إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ وَالْحِلْمُ بِالتَّحَلُّمِ.** علم سیکھتے رہنے سے اور حلم اس کی نقل اُتارنے سے آتا ہے۔

اس طریق کار کو زیادہ سے زیادہ تکرار اور دوام کی ضرورت ہے یہاں تک کہ وہ اپنا اثر دکھادے۔ اس دوام کے لیے صبر کی ضرورت ہوگی، اس لیے انسان جن اچھے اخلاق سے تکلف کے طریقے پر مزین ہونا چاہتا ہے اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ صبر کی صفت اپنے اندر پیدا کرے۔ اس کے لیے صبر اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ کڑوی دوا کھانے والے مریض کے لیے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ صبر کرے گا اور اس پر دوام اختیار کرے گا تو نفس اس کے آگے جھک جائے گا اور وہ اس فعل کے ساتھ مانوس ہو جائے گا۔ پھر یہ فعل اس کے لیے لذیذ بن جائے گا۔ جیسے ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کی لکھائی اچھی ہو تو اس کو زیادہ سے زیادہ لکھتے رہنے سے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح لکھنا اس کے لیے آسان ہوتا ہے اور اسے لکھنے میں مزہ آتا ہے۔

۹- خوش اخلاق لوگوں سے میل جول: اچھے اخلاق رکھنے والے لوگوں سے میل جول، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا بھی اخلاق کی درستی کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ اچھے اخلاق رکھنے والے شخص سے اٹھنا بیٹھنا اور اس کی باتیں سننا ہم نشینوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سے وہ نیکو کار آدمی کے بعض

۱- اس کی وجہ یہ ہے کہ کھڑا شخص انتقام لینے کے لیے تیار ہوتا ہے، بیٹھا شخص اس سے کم تر اور لیٹا شخص کم ترین ہوتا ہے۔ (مؤلف)

اخلاق کو اپنے اندر سموئے گا۔ ایک پرانا مقولہ ہے کہ طبیعت طبیعت سے بنتی ہے۔[1]

ایک حدیث میں آیا ہے جسے امام ترمذی نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: لَا تُصَاحِبْ إِلَّا مُؤْمِنًا وَّلَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ. مومن کے سوا کسی کا مصاحب نہ بنو اور تیرا کھانا پرہیز گار کے سوا کوئی نہ کھائے۔

یہ اس لیے ہے کہ ایک شخص جس کے ساتھ معاشرت رکھتا ہے، جس کے ساتھ رہتا ہے، جس کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے اسی کی پیروی کرتا ہے اور اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین اپنے پیروکاروں کو حکم دیتے تھے بلکہ ان کو وصیت کرتے تھے کہ بدعت اور معصیت میں مبتلا لوگوں اور برے اخلاق کے لوگوں کو چھوڑ دیا جائے۔

۱۰- اسوۂ حسنہ: سب سے بہترین اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (الاحزاب ۳۳:۲۱) درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ تھا، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔

اب اگر مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھ کر آپؐ کی شخصیت کو اپنے لیے اسوہ نہیں بنا سکتے تو بصیرت کی آنکھوں سے آپؐ کو دیکھنا اب بھی ممکن ہے۔ وہ اس طرح کہ آپؐ کی معطر سیرت اور عظیم شمائل و اخلاق کا دل میں استحضار کیا جائے۔ اس لیے ہم ہر مسلمان کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بار بار آپؐ کی سیرت کا مطالعہ کرے اور اپنے دل و دماغ میں آپؐ کی شخصیت کا استحضار کرے۔ اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں موجود تصور کرے۔

یہ بھی اسوۂ حسنہ میں سے ہے کہ آپؐ کے صحابہ کرام کی سیرت کا استحضار کرے جو سراپا خیر ہیں اور اچھے اعمال و اخلاق کے لیے مثال ہیں۔ خاص طور پر خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ اور وہ صحابہ جو غزوۂ بدر اور بیعت رضوان میں شریک تھے۔

۱۱- غلط ماحول سے فرار: اچھے اخلاق کو پروان چڑھانے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ آدمی خراب ماحول کو

۱- ہم اردو میں کہہ سکتے ہیں کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ (مترجم)

چھوڑ کر اس سے فرار اختیار کرے جیسا کہ آدمی وبار سیدہ مقام سے فرار اختیار کرتا ہے۔ اس ماحول کو چھوڑ کر آدمی ایک صالح ماحول میں چلا جائے، جہاں پاکیزہ اور نیکوکار مومنوں کی ایک جماعت قیام پذیر ہو۔ یہ صالح ماحول بھی مسلمان کے دل میں اچھے اخلاقیات کو تقویت دیتا ہے اور اسے برے اخلاقیات سے بچاتا ہے۔

ایک مسلمان خواہ کتنا پختہ اور پُرعزم شخصیت کا مالک ہو اور اس کے خراب ماحول سے متأثر ہونے کا امکان کتنا ہی کم ہو بہر حال اس کے لیے خراب ماحول میں رہنا جائز نہیں ہے جہاں غلط قسم کے لوگ آباد ہوں۔ یہ ایک شیطانی دھوکہ اور وہم ہے۔ اگر کوئی خطرہ مول لیتا ہے تو اس کی مثال اس شخص کی ہے جو ایک وبار سیدہ مقام میں چلا جاتا ہے کہ میرا جسم مضبوط ہے۔

اس کی دلیل میں ہم وہ حدیث مبارکہ پیش کر سکتے ہیں جس میں آیا ہے کہ ایک شخص نے سو قتل کیے تھے۔ اس نے لوگوں سے پوچھا کہ روئے زمین پر سب سے بڑا عالم کون ہے؟ لوگوں نے اسے ایک شخص کا پتہ دیا۔ وہ اس کے پاس چلا گیا اور کہا: میں نے سو قتل کیے ہیں، کیا میرے لیے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں، تیرے اور توبہ کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے۔ تم فلاں علاقے میں چلے جاؤ۔ وہاں ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ تم بھی ان کے ساتھ عبادت کرو۔ اپنے علاقے میں واپس نہ جاؤ، وہ بری جگہ ہے...[1]

یہ حدیث خراب معاشرے سے اچھے اور پاکیزہ معاشرے کی طرف چلے جانے کی ضرورت پر دلالت کرتی ہے۔ اس لیے کہ ایسے معاشرے میں رہنا کسی شخص کی استقامت اور برائی سے روکنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

خراب معاشرہ وہ ہوتا ہے جو انسان کو گناہ اور بداخلاقی کے سامنے پیش کرے اور نیک معاشرہ وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور تقویٰ اور حسن اخلاق میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

۱۲- اچھی عادات کی حرص: یہ بھی اخلاق کی درستی کا ایک ذریعہ ہے کہ ہر اچھی صفت کو اپنایا جائے اور اسے ایک ایسے نفیس ہیرے کا مقام دیا جائے جس کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی بری صفت کو

۱- تیسیر الوصول، ج۱، ص۲۱۲

معمولی نہ سمجھا جائے، خواہ اس کا آغاز کتنا ہی معمولی ہو۔ اس لیے کہ مسلمان ایک اچھی صفت کو کبھی کم نہیں سمجھتا اور ایک بری صفت کو کبھی معمولی خیال نہیں کرتا۔ کبھی کبھی ایک چھوٹی سی بھلائی انسان کو اعلیٰ درجات تک پہنچا دیتی ہے اور ایک چھوٹی سی برائی اسے جہنم کا ایندھن بنا دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اس بنا پر تعریف کی ہے کہ آپ وعدے کے سچے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ. (مریم ۱۹:۵۴) اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا تھا۔

اور حدیث میں آیا ہے کہ اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ. آگ سے بچو، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے ہی کے ساتھ ہو۔

اسی طرح بعض اوقات ایک صفت اختیار کرنا، اس کی پوری پابندی کرنا اور اسے ہمیشہ اختیار کیے رکھنا اسے رسوخ عطا کر دیتا ہے۔ اگر وہ صفت اچھی ہو تو یہ اُس شخص کے لیے بہتر ہوگا اور اگر صفت بری ہو تو یہ اس کے لیے برا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ بھلائی بھلائی کا ذریعہ بنتی ہے اور برائی برائی کا۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَلَيْكُم بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيقاً، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّاباً. سچائی کو اپناؤ اس لیے کہ سچائی بھلائی کا راستہ دکھاتی ہے اور بھلائی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ایک شخص ہمیشہ سچ بولتا رہتا ہے اور اسی کی کوشش میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں صدّیق لکھ دیا جاتا ہے۔ جھوٹ سے پرہیز کرو اس لیے کہ جھوٹ فسق و فجور کا راستہ دکھائی ہے اور فسق و فجور جہنم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ایک شخص مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے اور اسی کی تلاش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اس کا نام جھوٹوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔

۱۴۔ دوسروں کی نصیحتیں: ایک مسلمان پر لازم ہے کہ کسی دین دار، ہوشیار، متقی اور سچے شخص کی نصیحتوں

سے مستفید ہو۔ایک مسلمان دوسروں کے عیوب تو آسانی سے دیکھ سکتا ہے جب کہ اپنے عیوب اس طرح نہیں دیکھ سکتا، جس طرح دوسروں کے دیکھتا ہے۔اسی وجہ سے اچھے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اچھا قرار دیا گیا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو مجھے میرے عیوب کی نشان دہی کر دے۔''

تیرا سچا خیر خواہ وہی ہے جو تجھے تیرے عیوب سے آگاہ کر دے اور تیرے بعض برے اخلاق کی نشان دہی کر دے۔وہ تیری طرف شکر اور قدر کا مستحق ہے۔تم اس شخص کا تو شکر ادا کرتے ہو جو تمھیں اس بچھو کے بارے میں خبر دے جو تمھارے جسم پر رینگ رہا ہو یا تمھارے کپڑوں کے نیچے چھپا ہوا ہو۔تم اسے فوراً اپنے سے دور پھینک دیتے ہو۔اسی طرح کا طرز عمل اس وقت بھی ہونا چاہیے جب کوئی شخص خیر خواہی کرتے ہوئے تمھیں تمھارے عیوب سے آگاہ کر دے۔اس لیے کہ برے اخلاق بھی بچھو ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ یہ دل کو نقصان پہنچاتے ہیں اور اس میں اپنا زہر چھوڑ دیتے ہیں۔

یہ ہیں چند وسائل وذرائع جو برے اخلاق کی درستی اور اچھے اخلاق کو اپنانے میں کام آتے ہیں۔اس کے علاوہ بھی بعض اہم وسائل موجود ہیں مگر ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

......☆......☆......

۲

اسلام کا نظامِ معاشرت

تمہید

۱۳۲- یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس کی طرف علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اشارہ کیا ہے کہ انسانی معاشرت ایک ضروری امر ہے۔ بات یہ ہے، جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے معاشرت ضروری ہے۔ زمینی حقائق بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس لیے کہ انسان معاشرے میں پیدا ہوتا ہے، معاشرے میں رہتا ہے اور اسی میں موت سے ہم کنار ہوتا ہے۔

۱۳۳- جب انسان کے لیے معاشرت ضروری ہے اور اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے تو معاشرت کے لیے نظام ضروری ہے، خواہ جیسا بھی ہو۔ کسی نظام کے بغیر معاشرت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ افراد کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ معاشرے کے اندر مکمل آزادی کے ساتھ رہ سکیں۔ ورنہ یہ تو ان کی ہلاکت کا ذریعہ بن جائے گا، یا کم از کم یہ کہ ان کی زندگی میں اضطراب اور پریشانی رہے گی۔ اس سے ان کا معاشرہ حیوانوں کے معاشرے میں بدل جائے گا، جیسا کہ جنگلوں میں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے لیے ایک نظام کا ہونا ضروری تھا، جس کے ضمن میں وہ حدود موجود ہوتی ہیں جن پر پہنچ کر سب کو رُک جانا چاہیے اور وہ عمومی ضوابط ہوتے ہیں جن کے بارے میں سب پر لازم ہوتا ہے کہ اپنے کردار میں ان کا خیال رکھیں۔ اس طرح وہ امن واطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے۔

۱۳۴- جب یہ بات طے ہوگئی کہ معاشرت کے لیے کسی نہ کسی صورت میں ایک نظام کی ضرورت ہے تو اس نظام کے لیے کچھ بنیادوں، کچھ اصولوں اور کچھ افکار کی ضرورت ہے جو معاشرے کے لیے قابل قبول ہوں اور ان کے اوپر وہ نظام قائم ہو جس سے معاشرے کی گاڑی چلتی رہے۔ نظام اپنے اصول، افکار اور

بنیادوں کے لحاظ سے کبھی ٹھیک ہوتا ہے اور کبھی غلط، اس لیے کہ فرع اپنے اصل کے تابع ہوتی ہے، اگر اصل درست ہو تو فرع بھی درست ہوتی ہے اور اگر اصل غلط ہو تو فرع بھی غلط ہوتی ہے۔

۱۳۵- جب یہ معلوم ہوا کہ نظام معاشرت کبھی ٹھیک اور کبھی غلط ہوتا ہے تو اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ٹھیک یا غلط ہونے کا اثر افراد پر ہوتا ہے۔ وہ اس سے متأثر ہوتے ہیں، اس کے نتائج برداشت کرتے ہیں اور پھر کبھی سعادت حاصل کرتے ہیں اور کبھی شقاوت۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اپنے لیے خیر و بھلائی چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اچھی بنیادوں کی تلاش میں رہے جن پر معاشرے کو قائم ہونا چاہیے۔ پھر اس کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس بنیاد کو مضبوط کرنے اور اس پر نظام معاشرت کو قائم کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح افراد کے لیے خیر و فلاح کے راستے آسان ہوتے ہیں اور زندگی کا ممکن حد تک بڑے سے بڑا حصہ اپنے افراد کے لیے پاکیزہ اور سکون و اطمینان والا ہوتا ہے۔

۱۳۶- حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے ہمیں ان بنیادوں کی تلاش و تفتیش اور ان کو معلوم کرنے کے لیے دوڑ دھوپ سے بے نیاز کر دیا ہے جن پر معاشرہ اور ایک صالح نظام قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلام نے ہمیں اس بات سے بھی بے نیاز کیا ہے کہ ہم اس اچھے نظام کی طبیعت اور خصوصیات معلوم کرنے کے لیے کوشش اور تلاش کریں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی بنا پر ہمارے لیے ایک صالح معاشرے کا، جس سے سارے لوگوں کو سعادت نصیب ہوتی ہے، قیام آسان ہو گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں ایک اچھے نظام کی بنیاد کیا ہے اور اس نظام کی خصوصیات کیا ہیں؟ ذیل میں ہم دو بڑے بڑے عنوانات کی صورت میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

اسلامی نظام معاشرت کی اساس

۱۳۷- اسلام میں نظام معاشرت کی اساس عقیدہ ہے۔ اس لیے کہ ہر انسان سے مطلوب ہے کہ وہ اس عقیدے کا حامل ہو، تاکہ وہ زندگی میں اپنا مقام، اس کائنات کے ساتھ اپنا تعلق اور وہ مقصد پہچان سکے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

یہ عقیدہ انسان کی فکر، اس کے کردار اور اس کے سارے اقدامات میں اسے رہنمائی دیتا ہے۔ انسان کسی حال میں بھی اس عقیدے سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اور چونکہ انسان، جیسا کہ ہم نے کہا، مدنی الطبع ہے، اس لیے یہ بات بدیہی ہے کہ عقیدہ ہی اس کے پسند کردہ معاشرے اور نظام کی تعمیر میں راہنما بنے۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی عقیدہ ہی اس کے معاشرے اور نظام کے لیے اساس ہونا چاہیے۔ تاکہ افراد اپنے عقیدے کی روشنی میں معاشرے کے ارکان اور اس کے افراد ہونے کی حیثیت سے عمل کرسکیں۔ اس طرح معاشرہ بحیثیت معاشرہ منظم ہوکر اسی عقیدے کی روشنی میں عمل کرے گا جو اس معاشرے کے افراد کا نظریہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے، اس کے آگے جھکتا ہے اور اس کے مقتضا پر عمل کرتا ہے وہ اس بات کا اہل ہوگا کہ اس معاشرے کا حصہ بن جائے اور اس کا رُکن ہو جائے، اس کے بقا میں حصہ لے اور اس کے مقاصد کی تکمیل میں مددگار بنے، اس کے فوائد سے مستفید ہو اور اس کے نتائج بھگتے، خواہ اس کا رنگ، نسل، زبان، علاقہ اور پیشہ کچھ بھی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے انسانی معاشرے کے قیام کے لیے یہ اصول پیش کیا تو یہ انسانی تاریخ کا ایک بے مثال واقعہ تھا۔ اس سے پہلے انسان نہ اس بات کو جانتا تھا اور نہ کبھی اس کے خیال میں یہ بات آئی تھی۔ یونان، روم، فارس اور عربوں کے جو معاشرے اسلام سے پہلے قائم تھے ان کی بنیاد نسل، قبیلہ، قومیت اور علاقہ ہوتا تھا۔ پھر اس بنیاد پر انھوں نے اور بہت سے خرافات کی بنیاد رکھی تھی، جو ظلم و جبر اور انسانی شرافت کا مذاق اڑانے کے لیے منبع کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جب اسلام نے معاشرے کی تعمیر کی یہ نئی اساس پیش کی تو یہ انسانی زندگی میں ایک عظیم انقلاب تھا۔ اس سے انسان کو کرامت اور شرافت نصیب ہوئی اور اس کی زندگی کو ایک مقصد اور ایک رخ مل گیا۔ یہ بات انسان کے لائق نہیں ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی تعمیر نسل، قبیلے یا علاقے کی بنیاد پر کرے، جیسا کہ اسلام سے پہلے کے جاہل لوگ کیا کرتے تھے۔

یہ تقسیم اس لیے غلط ہے کہ انسانوں کی بنیاد ایک ہی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ خواہ انسانوں میں کتنا ہی اختلاف پیدا ہو جائے، یہ حقیقت چھپائی نہیں جاسکتی۔ ان کی مختلف نسلیں اور قومیں ایک درخت کی مختلف شاخوں کی مانند ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء۴:۱) لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔

اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: كُلُّكُمْ لِآدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ.

تم سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہو اور حضرت آدم مٹی سے بنے تھے۔

اسی طرح کسی علاقے کو انسانی معاشرے کی بنیاد بنانا بھی ایک لایعنی بات ہے۔ اس لیے کہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے چنانچہ یہ ان کا علاقہ بھی ہے اور مشترکہ ملک بھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (الرحمٰن ۵۵:۱۰) زمین کو اس نے سب مخلوقات کے لیے بنایا۔

اسی طرح رنگ، نسل اور قبیلے میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو کسی معاشرے کی تعمیر کے لیے بنیاد کا کام دے سکے۔ اس لیے کہ یہ چیز اپنی طبیعت کے لحاظ سے تنگی رکھتی ہیں۔ سارے انسانوں کا ان چیزوں میں یکجا ہونا ممکن نہیں۔ کسی کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہ پیدا تو ایک قبیلے میں ہو مگر وہ اپنے آپ کو شامل کرے دوسرے قبیلے میں۔ البتہ ہر انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اسلامی عقیدے کو اپنائے۔ اس طرح وہ اسلامی معاشرے کے ارکان میں شامل ہو جائے گا۔ اور جو شخص اس عقیدے کو مسترد کرتا ہے اسے بھی اسلامی معاشرہ بالکل مسترد نہیں کرتا۔ بلکہ اگر وہ اس معاشرے میں شامل رہنا چاہتا ہے تو وہ اسے بھی اپنے اندر قبول کرتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرے اور 'عقد ذمہ' کے ذریعے اس کے نظام کے آگے جھکنے کا اقرار کرے۔ اس صورت میں ایک غیر مسلم بھی اس فکری معاشرے میں اپنے آپ کو محفوظ پائے گا اور اسے عمومی و خصوصی ہر قسم کے حقوق حاصل ہوں گے، کہ اس کی جان، مال اور عزت محفوظ رہے گی۔

اس لیے بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ اسلامی عقیدے کی اساس پر معاشرے کی تعمیر کا مطلب یہ ہے کہ آپ غیر مسلموں کو اسلامی عقیدہ اپنانے پر مجبور کر رہے ہیں، بالکل غلط ہے۔ یہ ذہن میں تشویش پیدا کرنے، لوگوں کو گمراہ کرنے اور جہالت کا ثبوت دینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اسلام نے قرآن کریم میں اس بات کا تعین کیا ہے کہ لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرۃ ۲:۲۵۶) دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔

فقہا کے درمیان یہ قاعدہ مسلم ہے کہ لَهُمْ مَا لَنَا، وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْنَا. یعنی ہمارے حقوق اُن کے حقوق اور ہمارے فرائض اُن کے فرائض ہیں۔

تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ غیر مسلم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر آج تک اسلامی معاشرے میں رہتے رہے ہیں مگر انھیں ان کے مذہب کی وجہ سے کبھی کوئی تکلیف نہیں دی گئی۔ بلکہ حقائق اس کی تائید کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے حفاظت اور نگرانی سے سرفراز ہوتے رہے۔ مسلمان اپنے

ہاں کی غیر مسلم اقلیت سے جس طرح کا سلوک کرتے ہیں اس کی مثال کسی معاشرے میں غیر مذہب رکھنے والی اقلیت کے ساتھ نہیں ملتی۔ یہاں ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اندلس کی مثال پیش کریں جہاں مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کا ظلم و جبر روا رکھا گیا اور وہاں سے مسلمانوں کی [آٹھ سو سالہ] حکومت و اقتدار کا خاتمہ کر دیا گیا۔

عقیدے کو معاشرے کی بنیاد بنانے کے نتائج

۱- ایمانی رشتہ

۱۳۸- اسلام اپنے عقیدے کے ذریعے مسلمانوں کو دینی بھائی قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹:۱۰) یقیناً مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اور حدیث میں ہے: اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ. یعنی مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔

مسلمانوں کے درمیان ایمانی اخوت سب سے بڑا رشتہ ہے۔ ان کے درمیان دوستی کی بنیاد یہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے دیگر رشتوں میں بھی منسلک ہوتا ہے، جیسے نسبی رشتہ، علاقے کا رشتہ وغیرہ۔ یہ سارے رشتے ناپسندیدہ نہیں ہیں نہ اسلام ان سے روکتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ان میں کسی ناجائز چیز کی آمیزش نہ ہو اور یہ ایمانی رشتے اور اس کے لوازم پر غالب نہ آئیں۔

ایمانی رشتہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ غیر مسلموں کو اپنے عقیدے پر مجبور کیا جائے یا انھیں اذیت دی جائے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام غیر مسلموں کے لیے اسلامی معاشرے کی رکنیت کو قبول کرتا ہے اور اس کی حفاظت کا حکم دیتا ہے۔ ایک غیر مسلم ایمان کا رشتہ اور دینی بھائی چارے کا رشتہ کھو دیتا ہے مگر وہ مسلمانوں کی طرف سے حفاظت، اسلام کے عدل و انصاف اور اسلامی معاشرے کی طرف سے بھلائی کا فائدہ نہیں کھو دیتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدۃ ۵:۸) کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ

يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (الممتحنہ ۶۰:۸)

اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَنْ آذىٰ ذِمِّيًّا فَقَدْ آذَانِي. جس نے ذمی کو اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی۔

۲۔ تعصب کا خاتمہ

۱۳۹۔ تعصب سے مراد یہ ہے کہ حق و باطل کی تمیز کیے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا جائے اس لیے کہ ان تعاون کرنے والوں کے درمیان میں نسبی تعلق موجود ہوتا ہے۔ یعنی قبیلے کا رشتہ، ذات کا رشتہ یا برادری کا رشتہ۔ اس مفہوم میں تعصب اسلام سے پہلے عربوں میں بہت عام تھا۔ ایک قبیلے کے افراد اپنے قبیلے کی مدد اور حمایت کرتے تھے، خواہ قبیلہ حق پر ہو یا باطل پر۔ اس کی بنیاد قبیلے کے ساتھ تعلق ہی ہوتا تھا۔ اسلام نے اس تعصب کی مخالفت کی اور اس سے اجتناب کرنے کا حکم دیا۔

حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ سلم سے منقول ہے کہ لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلٰى عَصَبِيَّةٍ وَّلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَّاتَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ. اس شخص کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں جو عصبیت کی طرف دعوت دیتا ہے اور وہ شخص بھی ہم میں سے نہیں جو عصبیت پر جان دیتا ہے۔

عصبیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دَعُوْهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ. اسے چھوڑ دو، یہ گندی چیز ہے۔

جاہلیت کا نعرہ یہ تھا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ مگر جاہلیت میں اس کا مفہوم یہ تھا کہ دونوں صورتوں میں اس کی طرف داری کرو۔ اسلام نے یہی نعرہ بلند کیا مگر یہاں اس کا مفہوم بدل گیا۔ یعنی اپنے ظالم بھائی کی مدد کرو اس معنی میں کہ اسے ظلم سے روک دو اور اپنے مظلوم بھائی کی مدد کرو اس معنی میں کہ مظلوم کی حمایت میں ظالم کے خلاف کھڑے ہو جاؤ۔

اسلام نے عصبیت کی مذمت کی ہے تو وہ صرف نسل، قبیلے اور خاندان کی عصبیت پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ مذمت ہر عصبیت کی طرف متوجہ ہوتی ہے، خواہ اس کا سبب کچھ بھی ہو۔ چنانچہ عصبیت جب اور جہاں بھی موجود ہو، جس اس کا اصل جوہر یہ ہے کہ باطل طریقے سے کسی کی حمایت کی جائے، تو اسلام اس کی مذمت کرتا ہے۔ چنانچہ ایک ضلعے، ایک پیشے، ایک مسلک اور ایک پارٹی کے لوگوں کے درمیان باطل طور پر آپس میں جو طرف داری ہوتی ہے یہ اسی عصبیت میں شامل ہے جو مذموم اور تباہ کن ہے۔ اگر اسلامی معاشرہ ان تمام تعصبات سے پاک ہو تو اس سے ظلم، زیادتی اور فساد کے مواقع کم ہوں گے۔ نیز یہ افراد کو حق و عدل کے ساتھ جوڑنے میں مددگار ثابت ہوگا اور یہ سارے اُمور معاشرے اور اس کے افراد کے لیے یقینی طور پر بھلائی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔

۳- فضیلت کا معیار تقویٰ ہے

۱۴۰- تعصب کے ختم ہونے سے اس کے نتائج بھی ختم ہوں گے۔ اس کے نتائج میں سے ایک نتیجہ حسب نسب اور بوسیدہ ہڈیوں پر فخر کرنا ہے۔ کسی فرد کا صرف کسی خاص قبیلے کی طرف منسوب ہونا اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ آدمی اس قبیلے پر فخر کرے یا اس کی وجہ سے اپنا مقام و مرتبہ بلند سمجھے۔ اس لیے کہ کسی شخص کی ذاتی فضیلت کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ وہ مخصوص قبیلے یا قوم کی طرف منسوب ہے۔

سمجھ میں آنے والی بات یہ ہے کہ انسان کی فضیلت کا اندازہ انھی فضائل، اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کے حساب سے کیا جائے جن کا وہ خود حامل ہے۔ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کی پیدا کردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں فضیلت کا معیار اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اور خوف ہے۔ رہا مختلف قبائل کی طرف منسوب ہونا تو وہ صرف تعارف کے لیے ہے۔ جیسا کہ ایک شخص کسی، شہر یا کسی پیشے یا کسی گھر کی طرف منسوب ہوتا ہے، یا کسی مخصوص نام کے ساتھ موسوم ہوتا ہے۔ نسبت اور نام کی یہ مختلف شکلیں صرف تعارف کے لیے ہوتی ہیں یا پھر اس کا مقصد باہمی تعاون اور حقوق و فرائض ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳) لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنادیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے

نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

جب لوگوں کی قدر و منزلت کو جانچنے کے لیے یہ دقیق اور منصفانہ میزان مقرر کیا گیا تو اس سے بھلائی اور انسانیت کے منتظر، اعلیٰ درجات تک پہنچنے کے لیے مسابقہ و مقابلے کا میدان وسیع ہو گیا ہے۔ اب انسان کو کوئی چیز اس مقام تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی، خواہ کوئی غریب ہو یا مال دار، کالا ہو یا گورا، مرد ہو یا عورت، اعلیٰ نسب کا ہو یا کم تر نسل کا، اس کی شکل خوب صورت ہو یا بد صورت اور وہ کمزور ہو یا طاقت ور۔

اسی طرح انسان میں تقویٰ نہ ہو تو اسے کوئی چیز رفعت نہیں دے سکتی، نہ خاندانی شرافت، نہ مال کی کثرت، نہ وسیع اختیار و اقتدار، نہ افرادی قوت، نہ زبان کی فصاحت، نہ پیرو کاروں کی کثرت اور شکل کی خوب صورتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور کی طرف اپنے ایک مختصر مگر بلیغ ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے: مَنْ أَبْطَأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ. جو شخص عمل میں پیچھے رہ گیا وہ نسب کے ذریعے آگے نہیں نکل سکتا۔

اس ارشاد میں لفظِ 'نسب' سے دوسری اشیا کی طرف بھی اشارہ ہے جن کا کسی شخص کی قدر و قیمت اور اس کی فضیلت جاننے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اسلامی نظامِ معاشرت کی خصوصیات

١٤١- اب جب کہ ہم اسلام کے معاشرتی نظام کی اساس بیان کر چکے ہیں اور اس کے نتائج بھی واضح کر چکے ہیں، ہم اس نظام کی خصوصیات یا اس کی نمایاں خوبیاں بیان کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی خصوصیات بھی اس کی اساس سے نکلے ہوئے یا اس پر قائم ہیں۔ یہ خصوصیات بہت زیادہ ہیں مگر ہمارے خیال میں ان میں سے اہم ترین خصوصیات یہ ہیں: اخلاق کا لحاظ کرنا، عدل کے اصولوں کا التزام، خاندان کا خیال رکھنا، عورت کے دائرہ کار کا تعین اور فرد پر معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری ڈالنا۔ ہم ان خصوصیات یا خوبیوں کے بارے میں مختصراً بیان کریں گے۔

١- اخلاقیات کا لحاظ رکھنا

١٤٢- پیچھے ہم کہہ چکے ہیں کہ اسلام میں اخلاقیات کا بہت اعلیٰ مقام ہے۔ اسلام کے مختلف نظاموں

میں اس کے نمایاں آثار نظر آتے ہیں۔ انھی میں سے ایک نظام معاشرت بھی ہے۔ یہ نظام معاشرے کو بری عادات وخصائل سے پاک کرنے کی فکر میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ چنانچہ اس میں زنا حرام ہے اور اس کی سزا کوڑے لگانا اور جلا وطن کرنا یا رجم کرنا ہے، اور قذف جس کا مطلب ہے: دوسرے پر زنا کا الزام لگانا، یہ بھی حرام ہے اور اس کی سزا کوڑے لگانا ہے تا کہ زبان اس گھٹیا بات کے کہنے سے بھی آلودہ نہ ہو کہ یہ لوگوں کے لیے مانوس بن جائے۔ اگر یہ سلسلہ چل پڑا تو اس سے معاشرہ گندگی سے آلودہ ہوگا اور گناہ میں پڑنا آسان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی سزا بڑی سخت رکھی گئی ہے۔ مگر اس میں عدل بھی ہے اور اچھے اخلاق کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔ مگر بدزبانی، مثلاً گالم گلوچ اسلام میں ممنوع ہے اور اس کی سزا تعزیر ہے۔ اسی طرح جوا کی تمام قسمیں اسلامی شریعت میں حرام ہیں اور اسلامی معاشرہ اس کو ناپسند کرتا ہے۔

جھوٹی گواہی دینا اسلام میں کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح تجسس، غیبت، چغلی اور ہر وہ چیز جو معاشرے کے افراد کے درمیان دشمنی ڈالنے والی ہو، منکرات میں شامل ہے جنھیں اسلام کا نظام معاشرت قبول نہیں کرتا۔ معاملات پاکیزگی، اچھی نیت اور امانت کے ساتھ انجام پانے چاہییں۔ یہی وجہ ہے کہ دھوکہ دہی، بے وقوف بنانا، ملاوٹ کرنا اور جھوٹ بولنا کسی معاملے میں بھی جائز نہیں ہے۔ اسی طرح معاشرے میں منکرات کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ جرائم کی طرح ہیں۔ اگر یہ باقی رہیں گے تو پھیلتے رہیں گے اور ایک وبا کی صورت اختیار کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ایسے لوگوں پر سختی سے گرفت کرتا ہے جو علی الاعلان یہ منکرات کرتے ہیں یا زبان سے اس کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ اسلام ان منکرات کے اعلان اور ان کے بارے میں بات کرنے کو ایک اور جرم قرار دیتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے: أَيُّهَا النَّاسُ، مَنِ ارْتَكَبَ شَيْئاً مِّنْ هٰذِهِ الْقَاذُوْرَاتِ فَاسْتَتَرَ فَهُوَ فِي سِتْرِ اللهِ، وَمَنْ أَبْدٰى صَفْحَتَهُ أَقَمْنَا عَلَيْهِ الْحَدَّ. لوگو! جس نے ان گندے کاموں میں سے کوئی کام کیا اور چھپ رہا تو اس پر اللہ کی طرف سے پردہ ہوگا اور جس نے اسے ظاہر کردیا، ہم اس پر حد قائم کریں گے۔

اسلامی نظام معاشرت میں کچھ دفاعی وسائل ہیں جو معاشرے کو برائیوں اور منکرات سے بچاتے ہیں اور شیطان کے لیے نفوذ کے دراڑوں اور چور دروازوں کو بند کرتے ہیں۔ یہ وسائل انتہائی اہم ہوتے ہیں۔ ان سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہوتا۔ چنانچہ کسی عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر اور اپنے مَحرم رشتہ داروں کے علاوہ کسی کے ساتھ خلوت میں رہے۔ وہ جب گھر سے نکلے تو اس پر لازم ہے کہ اس کا لباس شرعی

لباس ہو، جس کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

اسلام کے نظامِ معاشرت میں اخلاقیات کا خیال رکھنے کا ایک مظہر یہ ہے کہ اس میں افراد کے درمیان الفت ومحبت اور باہمی رحمت وشفقت ہوتی ہے۔ اسلام اس کی دعوت دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باہمی رحم میں مسلمانوں کی حالت کو ایک عظیم مثال میں بیان فرمایا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ إِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى. باہمی محبت، شفقت اور رحم میں مومنوں کی مثال ایک جسم کی مانند ہے کہ جب ان میں سے ایک عضو میں تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی وجہ سے بے خوابی اور بخار سے پکار اُٹھتا ہے۔

اور دوسری حدیث میں ہے: اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَّنْ فِي السَّمَاءِ. جو لوگ دوسروں پر رحم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی ان پر رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے: لَايَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَّا يَرْحَمُ النَّاسَ. اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا۔

اگر انسان کا دل رحم سے خالی ہو جائے تو یہ اس کی شقاوت کی نشانی ہے۔ حدیث میں ہے: لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ إِلَّا مِنْ شَقِيٍّ. رحم صرف اسی شخص کے دل سے نکالا جاتا ہے جو شقی القلب ہو۔

چھوٹوں پر شفقت کرنا اس بات کی نشانی ہوتی ہے کہ آدمی کا دل رحم سے معمور ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے بیٹے حضرت حسنؓ کا بوسہ لیا۔ وہاں حضرت اقرع بن حابسؓ موجود تھے۔ انھوں نے کہا: میرے تو دس بچے ہیں مگر میں نے کبھی ایک کا بھی بوسہ نہیں لیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ لَّايَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ. جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

قرآن کریم میں صحابہ کرامؓ کی صفات میں بتایا گیا ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح ۴۸:۲۹) محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔

معلوم ہوا کہ باہمی رحم مومنوں کی بنیادی صفات میں سے ہے۔ یہ اسلامی معاشرے کو ایک جسم کی مانند بنادیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس معاشرے میں باہمی رحم اور شفقت اس حد تک پہنچے وہ ایک باسعادت معاشرہ ہوتا ہے۔

باہمی رحم کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہے اور وہ بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ پاکیزہ تعاون ہے۔ اس سے ایک ایسی اخلاقی صفت کی بنیاد پڑتی ہے جس کا فائدہ ہر حاجت مند تک پہنچتا ہے۔ کیوں کہ اسلام باہمی تعاون کا حکم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلاَ تَعَاوَنُوا عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ ۵:۲) جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔

یہ تعاون، جس کا مطالبہ کیا گیا ہے، خاندان، پڑوسیوں، دوست احباب، رفقائے سفر، قطع تعلق کرنے والے، یتیم، مسکین اور معاشرے کے ہر محتاج کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلاَ تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (النساء ۴:۳۶) اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک براؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ دار، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے، اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمھارے قبضے میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو۔

سنت نبوی میں بہت سی احادیث ہیں جو باہمی تعاون پر دلالت کرتی ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں:

مَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللّٰهُ فِي حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُّسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ. جو شخص اپنے بھائی کی حاجت میں لگا ہوا ہو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری کرتا ہے اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی سے کوئی مصیبت کو ہٹا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے آخرت کی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت کو ہٹا دیتا ہے۔

پڑوسی کے ساتھ تعاون اور اس کی مدد کے بارے میں ارشاد ہے: مَازَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِي بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ. جبریلؑ مجھے مسلسل پڑوسی کے حقوق کی تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے گمان

ہونے لگا کہ پڑوسی آدمی کا وارث بن جائے گا۔

یہ مطلوبہ تعاون صرف محتاجوں اور مفلسوں کے ساتھ تعاون پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ اس دائرے سے نکل کر وسیع آفاق اور کھلے میدانوں تک پھیل جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کا دائرہ اچھے کام ہیں اور ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر، مدرسے کے قیام، ہسپتال کھولنے، پل تعمیر کرنے، خدمت اسلام کے لیے کوئی اچھی کتاب چھاپنے، کسی برائی، فساد اور ظلم کے خاتمے اور اس طرح کی چیزوں میں تعاون اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے جو اسلام میں مطلوب ہے۔ کیوں کہ یہ نیکی میں تعاون ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرے کے افراد میں تعاون کا عام ہونا خود پسندی، جفا کاری، بغض وحسد اور قطع تعلق جیسے امراض کا قلع قمع کردے گا اور دلوں کو پیار، محبت اور شفقت سے معمور کرے گا۔ اس طرح اس پاکیزہ معاشرے میں زندگی خوش گوار ہوگی کیوں کہ اس زندگی کی بنیاد مودت ورحمت پر ہوگی نہ کہ بغض وحسد پر۔

۲- عدل وانصاف کا التزام

۱۴۳- عدل وانصاف کے اصولوں کا خیال رکھنا بھی اخلاق فاضلہ میں سے ہیں، بلکہ زیادہ درست الفاظ میں اس کی چوٹی کا عمل ہے۔ ہم نے اسے الگ اسی لیے ذکر کیا ہے کہ اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ نیز اس کے شعبے بھی زیادہ ہیں اور اس کے مظاہر بھی متعدد ہیں اور یہ اسلام کے نظام اجتماعی میں ایک نمایاں ترین وصف ہے۔ اس کی اہمیت کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا حکم دینے کے لیے عمومی یا خصوصی شکل میں کئی آیات وارد ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (النحل ۱۶:۹۰) اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی اور بے حیائی اور ظلم وزیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ (النساء۴:۱۳۵) اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! انصاف کے علم بردار بنو۔

قُلْ أَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ (الاعراف ۷:۲۹) کہو: میرے رب نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے۔

ان آیات میں عمومی طور پر عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ ایسی آیات بھی ہیں جن میں بعض مخصوص مسائل کے بارے عدل کا حکم دیا گیا ہے۔

قول میں عدل: وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (الانعام۶:۱۵۲) اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتے دار ہی کا کیوں نہ ہو۔

کتابت میں عدل: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (البقرۃ۲:۲۸۲) اور تمھارے درمیان ایک شخص دستاویز لکھے۔

فیصلہ کرنے میں عدل: وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء۴:۵۸) اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

اصلاح میں عدل: فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ (الحجرات۴۹:۹) پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو۔

ناپ تول میں عدل: وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (الانعام۶:۱۵۲) اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا دو۔

وَأَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (الرحمٰن۵۵:۹) انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔

قیامت کے دن حساب بھی عدل کے ساتھ ہوگا۔ چنانچہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (یونس۱۰:۴۷) ان کے درمیان فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے۔ اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ (الانبیاء۲۱:۴۷) قیامت کے روز ہم ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے۔

اگر ہم ان کے ساتھ وہ آیات بھی ضم کر دیں جو ظلم کی ممانعت کرتی ہیں تو ہمیں اسلام میں عدل کی اہمیت اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلام ہر معاملے میں عدالت

کا دین ہے۔

اسلام نے عدل وانصاف کی ضرورت پر زور دیا ہے، اس کی پابندی کرنے کی ضرورت بیان کی ہے، ظلم کی ممانعت کی ہے اور اس سے اجتناب کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے۔ عدل و جور کے بارے میں اسلام کے ان تاکیدی احکام کے بہت بڑے نتائج نکلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں عدل عام ہوتا ہے اس کے افراد اپنے حقوق کے بارے میں اطمینان اور سکون محسوس کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہاں قانون حق دار کا ساتھ دیتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی کمزور ہو، اور وہ ظالم کا ساتھ نہیں دیتا، خواہ وہ کتنا ہی طاقت ور ہو۔

اس کے برعکس جب ظلم عام اور عدل ناپید ہو وہاں افراد اپنے حقوق کے بارے میں ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اطمینان وسکون نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل وانصاف کے بارے میں کوتاہی کرنے اور قوم کے لیے اس کی ہلاکت خیزی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ **إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ، وَأَيْمُ اللهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا.** تم سے پہلے کے لوگوں کو اسی بات نے ہلاکت سے دوچار کیا کہ جب ان میں سے کوئی شریف آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد جاری کر دیتے۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر فاطمہ بنت محمد چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

قوموں کی ہلاکت کا ذریعہ ظلم کو اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ ظلم آگ کی مانند ہے جس کی گرمی مظلوموں تک پہنچتی ہے۔ جب ظلم عام ہوتا ہے اور عدل ناپید ہو جاتا ہے تو مظلوموں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ ان لوگوں کو اس معاشرے میں اپنی حمایت یا اپنے حقوق کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں ملتی۔ بلکہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس معاشرے میں ان کے حقوق ہضم کیے جا رہے ہیں۔ یہ احساس ان کو اس بات کی جرأت دے دیتا ہے کہ وہ اس معاشرے کی کوئی پرواہ نہ کرے بلکہ اس کو صفحہ سے مٹانا ممکن ہو تو مٹا دے۔

مگر یہ صورت حال عدل وانصاف سے معمور معاشرے میں الٹ ہوتی ہے۔ اس میں افراد دل سے چاہتے ہیں کہ یہ معاشرہ قائم ودائم رہے اور دشمن اس کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکیں۔ اس لیے کہ یہ

معاشرہ ان کے لیے اپنے گھر کی مانند ہوتا ہے جو انھیں پناہ دیتا ہے۔ جب سارے افراد معاشرے کے دوام بقا کے لیے فکر مند ہوتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں تو معاشرہ قائم رہتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ یک عادل مملکت قائم رہتی ہے خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو اور ایک ظالم مملکت ختم ہو کر رہتی ہے خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

انھی وجوہات کی بنا پر اسلام کے دورِ اول میں جو معاشرہ قائم ہوا عدل وانصاف پر قائم ہوا اور اسی پر قائم رہا۔ وہاں نہ ظلم تھا، نہ طرف داری تھی اور نہ کسی کو نقصان پہنچایا جاتا تھا۔ وہاں قطعی عدل ہوتا تھا جس کے سامنے کمزور اور طاقت ور برابر تھے۔ اسلامی قانون ہی وہ چیز تھی جس کے آگے سب جھکتے تھے، خواہ حکمران ہو یا کوئی اور۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کمزور اگر حق پر ہوتا تو اس کی پشت پر سارا معاشرہ اور اس کی پوری قوت ہوتی تھی۔ اس کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کمزور ہے کیوں کہ معاشرے اور قانون کی قوت اسی کے پاس ہوتی تھی۔ اسی طرح طاقت ور کے لیے یہ بات کسی طرح سودمند نہیں تھی کہ وہ طاقت ور ہے، کیوں کہ معاشرے اور قانون کی قوت اس کے خلاف ہوتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے تھے: اَلْقَوِيُّ مِنْكُمُ الضَّعِيفُ حَتّٰى اٰخُذَ الْحَقَّ مِنْهُ، وَالضَّعِيفُ مِنْكُمُ الْقَوِيُّ حَتّٰى اٰخُذَ الْحَقَّ لَهُ. تم میں سے جو طاقت ور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق لے لوں اور تم میں سے جو کمزور وہ میرے نزدیک طاقت ور ہے یہاں تک کہ میں اس کے لیے حق لے لوں۔

بلکہ اس پہلے اسلامی معاشرے میں عدل اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ عدالت میں بھی فریقین کے درمیان مساوات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمان قاضی کسی فریق کی طرف دیکھنے میں آنکھوں یا آبروؤں کے اشارے اور بولنے میں آواز کے اُتار چڑھاؤ میں بھی مساوات کو ملحوظ رکھتا تھا۔ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے اپنے قاضی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے کہا تھا: فریقین کو عدالت میں بٹھانے، ان کی طرف اشارہ کرنے اور ان کے دیکھنے میں مساوات کا خیال رکھو۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ عدل وانصاف کی پابندی اسلامی نظامِ معاشرت کے بنیادی اصولوں میں شامل ہے تو عدل وانصاف کے اجرا میں رکاوٹ بننے والی یا اس کو اپنی راہ سے ہٹانے والی کوئی سفارش اسلامی

شریعت میں ناجائز قرار دی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بنومخزوم کی ایک عورت نے چوری کی اور اس کے بارے میں شرعی حکم کے اجرا نے لوگوں کو پریشان کیا تو انھوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ سے کہا کہ وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کی سفارش کریں۔ انھوں نے سفارش کی تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جلال میں آئے اور فرمایا کہ کیا تم اللہ کی ایک حد کے بارے میں مجھ سے سفارش کر رہے ہو!!۔ پھر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَّشْفَعُوْنَ فِيْ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللهِ. اور پھر وہ حدیث ارشاد فرمائی جو اوپر گزر چکی ہے۔

۳- خاندان پر توجہ

۱۴۴- خاندان معاشرے کی عمارت کی پہلی اینٹ ہے۔ اس لیے کہ خاندانوں ہی کے مجموعے سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ خاندان معاشرے کے لیے ایسا ہے جیسا انسان کے جسم میں خلیہ۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر خاندان صالح ہو تو معاشرہ بھی اچھا ہوگا اور اگر خاندان فاسد ہو تو معاشرہ بھی فاسد ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ معاشرت میں خاندان پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس کا اظہار اسلام کے بہت سے احکام میں اپنی شان کے ساتھ نمایاں ہے۔ ان میں سے اکثر احکام قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں جنھیں مسلمان نماز میں بھی اور نماز کے باہر بھی عبادت کے طور پر تلاوت کرتے ہیں۔ اور خاندان کے موضوع پر احادیث میں جو احکام آئے ہیں وہ تو ہیں ہی۔ یہاں ہمارے لیے اس بات کی گنجایش نہیں ہے کہ خاندان کے بارے میں احکام کی پوری تفصیل بیان کریں۔ اس لیے کہ یہ بہت طویل بحث ہے جس کی ہماری یہ کتاب متحمل نہیں ہے اور نہ وہ یہاں ہمیں مطلوب ہے۔ اس مقام پر ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ خاندان کی اسلامی تشکیل کے چند مظاہر کی طرف اشارہ کریں۔

نکاح

۱۴۵- نکاح خاندان کی تشکیل اور انسانی نسل کی بقا کا فطری طریقہ ہے۔ اسلام نے اس کی ترغیب دی ہے اور اسے مسنون قرار دیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے: يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ ، وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ. اے نوجوانانِ اسلام! تم میں سے جو شادی کر سکتا ہے اُسے چاہیے کہ شادی کرے۔ یہ اس کے لیے غضِ بصر

اور جنسی حصار میں بند ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جو لوگ شادی نہیں کر سکتے تو انھیں چاہیے کہ روزے رکھیں۔ اس سے جنسی خواہش قابو میں رہے گی۔

نکاح کا مقصد نئی نسل کی پیدائش اور نیک خاندان کی تشکیل ہے۔ حدیث میں ہے: اِمْرَأَةٌ وَلُوْدٌ أَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنِ امْرَأَةٍ حَسْنَاءَ لَا تَلِدُ، إِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. بچے پیدا کرنے والی عورت [اگر حسین نہ بھی ہو] اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عورت سے زیادہ پسندیدہ ہے جو خوب صورت ہو مگر بچے پیدا نہ کرتی ہو۔

نکاح کے عملی اقدامات

۱۴۶- اسلام نے نکاح کے تعلق کی تعظیم و تکریم کی خاطر کچھ متعین اقدامات کا حکم دیا ہے۔ ان میں سب سے پہلا حکم خِطبہ ہے یعنی اچھے طریقے سے عورت کو نکاح کا پیغام دینا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مرد و عورت میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں جان سکے کہ کس بنا پر کوئی شخص دوسرے سے نکاح کا فیصلہ کرتا ہے اور کس چیز کے پیش نظر وہ اس کے ساتھ نکاح سے انکار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے خِطبہ کرنے والے کے لیے اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھے۔ البتہ اس کے ساتھ خلوت جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ابھی اس کے لیے اجنبی ہے۔ اس لیے کہ خِطبہ صرف نکاح کا وعدہ ہوتا ہے عقد نکاح نہیں۔

شریعت میں اس حوالے سے پسندیدہ یہ ہے کہ نیک بیوی کو تلاش کیا جائے۔ اسی طرح عورت کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے لیے نیک شوہر کو منتخب کرے۔ ایک شخص کی صالحیت، تقویٰ اور اخلاق شریعت کی ترازو میں زیادہ قابل ترجیح ہیں، بجائے اس کے کہ آدمی دوسری چیزوں، مثلاً مال، منصب اور جاہ و جلال کی طرف نظر کرے۔

حدیث میں ہے: تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ، لِمَالِهَا، وَلِحَسَبِهَا، وَ لِجَمَالِهَا، وَلِدِيْنِهَا، فَاظْفُرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ. (بخاری و مسلم) کسی عورت کے ساتھ چار وجوہات کی بنا پر شادی کی جاتی ہے: مال کی وجہ سے، حسب نسب کی وجہ سے، حسن کی وجہ سے اور دین داری کی وجہ سے۔ ارے کم بخت! دین والی سے شادی کرو کہ کامیاب ٹھہرو۔

دین دار عورت کا اپنے خاندان کی اصلاح، بچوں کی اسلامی تربیت اور ان کے اخلاق کی پاکیزگی میں بڑا کردار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دشمن قوتوں کی یلغار کا بڑا ہدف مسلمان عورت ہے تاکہ وہ اس کے دل میں موجود بھلائی اور دین داری کی بیخ کنی کر کے اس کے پورے خاندان کو گمراہی کے راستے پر لگا دیں۔

جب میاں بیوی کے درمیان نکاح پر اتفاق ہو جائے تو پھر شرعی عقد نکاح ہو جاتا ہے جو دو قابل اعتماد گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کا مقصد عقد نکاح کی تعظیم اور اسے زنا سے ممیّز کرنا ہے۔ پسندیدہ بات یہ ہے کہ مہر زیادہ نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ عورت کی قیمت نہیں بلکہ یہ عقد نکاح کے وقت عورت کے لیے ایک اعزازیہ ہے۔ سنت نبوی میں وارد ہے کہ مہروں میں غلو سے کام نہ لینا پسندیدہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: خَيْرُ الصِّدَاقِ - أَيِ الْمَهْرِ - أَيْسَرُهُ. بہترین صداق، یعنی مہر وہ ہے جس کی ادائیگی آسان ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: أَخَفُّ النِّسَاءِ صِدَاقًا أَعْظَمُهُنَّ بَرَكَةً. جس عورت کا مہر کم ہو اس کی برکت زیادہ ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مہروں میں حد سے بڑھ جانے کی عادت نکاح کی رغبت رکھنے والوں کی تعداد میں کمی کر دیتی ہے۔ اکثر لوگ اس سے منہ موڑتے ہیں کیوں کہ وہ اس پر قادر نہیں ہوتے۔ نکاح سے منہ موڑنے کے جو نقصانات ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے نکاح کے اقدامات کو کم سے کم رکھا ہے اور اسے آسان بنایا ہے۔ عقد نکاح کی تکمیل جیسا کہ ہم نے کہا، صرف ایجاب اور قبول کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے کسی متعین شکل وصورت کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ اس کے لیے مخصوص مذہبی پابندیوں کی ضرورت ہے، نہ کسی خاص زبان کا خیال رکھنا اور نہ مخصوص مقام۔

اس کے لیے ایجاب وقبول کے علاوہ صرف یہ بات شرط ہے کہ عورت کے سرپرست اس سے راضی

ہیں۔اس لیے عدل کی بات یہ ہے کہ عورت کے عقد نکاح میں اس کے ولی کی بات بھی سنی جائے۔

اسی طرح عقد نکاح کے وقت گواہوں کی موجودگی بھی ضروری ہے تاکہ اس کے بارے میں لوگوں کو معلوم ہو اور اس کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہو، عورت کے حقوق کی حفاظت ہو، بطور بیوی اس کے لیے ایک قانونی مرکز فراہم ہو اور اس کے ساتھ جو حقوق وفرائض لازم ہوتے ان کو قانونی تحفظ حاصل ہو جائے۔

نکاح کی صحت کے لیے ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص جس عورت سے عقد نکاح کرتا ہے وہ اس کے لیے محرم نہ ہو جیسے بہن، خالہ اور دوسری محرمات۔

بیوی کے حقوق

۱۴۷-عقد نکاح کے نتیجے میں عورت کو کچھ متعین حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ان میں سے ایک مہر ہے۔یہ خالص عورت کا حق ہے اس میں کوئی دوسرا اُس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔

اسے اس بات کا پابند نہیں بنایا جا سکتا کہ وہ اس کے گھر کا ساز وسامان خریدے۔ہاں، اگر وہ خود چاہے تو وہ الگ بات ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ شادی والے گھر کے لیے چارپائی، بستر اور دیگر ساز وسامان فراہم کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے، عورت کی نہیں۔

اسی طرح عقد نکاح کے ساتھ شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہو جاتا ہے۔کیوں کہ عورت اپنے آپ کو گھر کے معاملات سنبھالنے اور بچوں کی تربیت کے لیے یکسو کر دیتی ہے اس لیے انصاف کی بات یہی ہے کہ شوہر اس کے لیے نفقہ کا انتظام کرے۔کیوں کہ ہر فرض کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی حق ہوتا ہے۔حدیث میں آیا ہے:... وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ. عورتوں کا تمھارے اوپر دستور کے مطابق کھانے اور لباس کا حق بنتا ہے۔

عورت کا نفقہ کا حق اس وقت تک باقی رہے گا جب تک وہ شوہر کے حقوق ادا کرتی رہے۔اگر اس نے یہ حقوق ادا کرنا چھوڑ دیے اور اپنے شوہر کے گھر سے نکل گئی تو یہ نشوز کرنے والی شمار ہوگی اور اس کا حق نفقہ اس وقت تک ساقط ہوگا جب تک وہ نشوز پر قائم رہے گی۔اگر وہ نشوز چھوڑ دے گی تو اس کا حق بھی دوبارہ ثابت ہو جائے گا۔

عورت کا ایک اور حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ۲: ۲۲۸) عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔

اور حدیث میں ہے: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ. تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔

اسلام مرد کو عورت کے ساتھ صبر کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص اپنی بیوی میں کوئی ناپسندیدہ صفت دیکھے تو مناسب نہیں ہوتا کہ وہ جلد بازی سے کام لے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء۴: ۱۹) ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔

شوہر کے حقوق

۱۴۸- جس طرح شوہر پر بیوی کے حقوق ہیں اسی طرح بیوی پر شوہر کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کے حقوق ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔

● مرد کی قوامیت

شوہر کے حقوق میں سے ایک اس کی اطاعت ہے۔ اس لیے کہ قوّام وہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ أَنْفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ (النساء۴: ۳۴) مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

بیوی پر شوہر کی قوامیت بڑی حد تک ایک فطری چیز ہے۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے جس سے کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔ اس لیے کہ ازدواجی زندگی ایک اہم ترین اشتراک ہے اور ہر مشترک کام میں ایک امیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ازدواجی زندگی جو اہم ترین اشتراک ہے اس کے بارے میں کیسے ہوسکتا ہے کہ

اس میں کوئی امیر نہ ہو۔ اس مبارک تعلق اور اس اہم ترین اشتراک کے لیے ایک امیر کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے، جس کی اختلاف کے موقع پر اطاعت کی جائے، اور یہ شراکت تسلسل کے ساتھ جاری وساری رہے۔ اس قوامیت کے لیے مرد عورت کے مقابلے میں زیادہ اہل ہے۔ یہ وہ بات ہے جس کا اسلام نے حکم دیا ہے اور زمینی حقائق اس کی تائید کرتے ہیں۔ انسان بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں، اگرچہ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اس میں جھگڑا کرتے ہیں۔

پھر مرد کی اس قوامیت میں عورت کے لیے کوئی ذلت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں وہ کسی قسم کی بالا دستی اور تسلط سے آزاد ہے۔ اس کے خلاف کسی خواہش پرستی یا ظلم اور غلط ارادے رکھنے کی گنجایش نہیں ہے۔ کیوں کہ مرد کا کام ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی بیوی کے لیے بھلائی ہی سوچے۔ اپنی قوامیت کے ذریعے وہ اس پر بالا دستی، تکبر یا تسلط کا ارادہ نہ کرے۔ نہ اپنی قوامیت کو استعمال کرتے ہوئے اس پر ظلم و زیادتی کا مرتکب ہو۔

ان ساری باتوں کے علاوہ شوہر کا اپنی بیوی سے تعلق مودت اور رحمت کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم ۳۰:۲۱) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔

چنانچہ عورت پر مرد کی قوامیت مودت و رحمت کی بنیاد پر ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ اس میں یہ بات متصور نہیں ہے کہ عورت کے لیے تنگی پیدا کی جائے یا اس کی کرامت کو مجروح کیا جائے۔

ایک انسان اپنے مخلص اور محبت کرنے والے دوست کی اطاعت کرتا ہے تو اپنے آزادانہ اختیار کے ساتھ اور بخوشی کرتا ہے۔ بلکہ وہ اسی بات سے خوشی محسوس کرتا ہے کہ یہ دوست حکومت کے کسی دائرے میں اس کا سربراہ بن گیا ہے۔ اگر ایک عام محبوب دوست کے بارے میں یہ صورت حال ہے تو پھر بیوی پر اپنے شوہر کی قیادت و سربراہی کا تصور کیجیے جن کے درمیان اللہ تعالیٰ نے مودّت و رحمت رکھی ہے۔ اور ان کے درمیان اخلاص کی حالت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے بھلائی کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا۔ اس کی عام مخلص دوستوں کے درمیان تعلق کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔

بعض لوگ جلد بازی سے کام لیتے ہوئے شوہر کے اپنی بیوی کے اوپر قوامیت کے حق سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ عورت کے دل میں اس قوامیت کے خلافت زہر گھول دیتے ہیں اور اسے عورت کی غلامی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کی شریعت میں جائز نہیں ہے۔ بلکہ اگر انسان اسی پر اصرار کرے تو کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ طرزِ عمل شریعت کے صریح احکام کے ساتھ ٹکراتا ہے۔ اسی طرح یہ طرزِ عمل آدمی کی جہالت، اس کی خواہش پرستی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص عورت کو نقصان پہنچانے، خاندان کے ادارے کو توڑنے اور معاشرے میں افراتفری پھیلانے کے ارادے رکھتا ہے۔ یہ سارے امور لازمی تقاضے ہیں اس بات کے کہ عورت مرد کی قوامیت کے خلاف بغاوت کرے۔ چنانچہ عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان خیالات سے اسی طرح بچائے جیسا کہ وہ ہر نقصان دہ چیز سے بچنا چاہتی ہے۔ عورت کو چاہیے کہ اس خیال میں جو گمراہی اور نقصان چھپا ہوا ہے اس پر نظر رکھے۔

دوسری طرف جو لوگ یہ خیالات رکھتے ہیں ان کے لیے ہم یہ کہنا مفید سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کی ایک ملکہ نے جب شادی کی تو مذہبی شعائر کی ادائیگی سے پہلے پادری نے اس سے پوچھا: ''کیا تم اپنے شوہر کی بات مانو گی؟'' وہ کہنے لگی: ''جی ہاں۔''

اس سے ہر منصف مزاج شخص پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت پر مرد کی قوامیت تمام شریعتوں میں مسلم ہے، عقلِ سلیم اس کی تائید کرتی ہے اور انسانی ذہن اس کے ساتھ موافقت کرتا ہے۔ چانچہ ایک مسلمان اور اپنی مصلحت کو پہچاننے والی خاتون کا یہ فرض ہے کہ وہ معروف میں اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ لیکن اگر وہ کسی غیر معروف کا حکم دے تب عورت کا فرض ہوگا کہ اس کی بات نہ مانے۔ اس لیے کہ لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ. خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

● **حفظ و امانت**

عورت پر مرد کے حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ کسی معاملے میں اس کے ساتھ خیانت نہ کرے اور اس کے ساتھ تعاون کرے، اس لیے کہ وہ اس کا شریکِ حیات ہے۔ اسی طرح وہ اس کی اولاد کی تربیت بھی کرے کیوں کہ یہ اہم ترین کام وہی سب سے بہتر کر سکتی ہے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس تربیت میں کوئی اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی نہیں جس کے دل میں بچے کے لیے اس قدر شفقت

ومحبت ہوجتنی کہ ماں کے دل میں ہوتی ہے۔ چنانچہ جب وہ اپنی یہ ذمہ داری پوری کرے گی تو وہ ایک صالح نسل کی تخلیق میں اپنا کردار ادا کرے گی اور اس کا یہ کام ہر اس کام سے افضل ہوگا جو وہ اپنے گھر سے باہر انجام دیتی ہے۔

● تعدّدِ ازواج

۱۴۹-شوہر کے حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک سے چار تک شادیاں کرسکتا ہے۔ اس کی تصریح قرآن میں بھی موجود ہے اور سنت سے بھی ثابت ہے۔ فقہا نے بھی بالاتفاق اس کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے کسی نے اس کے خلاف قول نہیں کیا۔

قرآن کریم میں ہے: وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (النساء۴:۳) اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو۔ لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔

یہاں عدل سے مراد بیویوں کے درمیان نان ونفقہ اور اس طرح کے دوسرے امور میں عدل ہے جن میں عدل ممکن ہو۔

ایک سے زائد شادیاں کرنا کوئی واجب یا مستحب امر نہیں بلکہ صرف جواز کی حد تک ہے۔ یعنی اس پر عمل بھی جائز ہے اور ترک بھی۔ یہ حکم ہر شخص کے اپنے اندازے پر موقوف ہے۔ اگر وہ مصلحت اسی میں دیکھتا ہے کہ یہ کام کرے، تو کرسکتا ہے ورنہ چھوڑ سکتا ہے، اور دونوں صورتوں میں اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ یہاں اس بات کا کوئی داعیہ موجود نہیں ہے کہ قاضی یا کوئی اور شخص تعدد ازواج کی ضرورت و مصلحت کے تعین میں مداخلت کرے کیوں کہ یہ ہر انسان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اور ایک عقل مند انسان کے بارے میں بنیادی امر یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات میں مصلحت کا سب سے زیادہ متلاشی ہوتا ہے۔ خصوصاً شادی کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ اس کی بنیاد پر بڑی بڑی معاشی و معاشرتی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ چنانچہ کوئی شخص اس وقت تک زائد شادیوں کا فیصلہ نہیں کرسکتا جب تک اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ نہ ہو۔

یہاں ہم اس بات کا احاطہ نہیں کرسکتے کہ کون سی چیزیں ہیں جو آدمی کو واقعی تعدد ازواج پر مجبور کرتی

ہیں۔ہم ان میں سے چند مثالیں ہی بیان کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان دواعی میں سے ایک یہ ہے کہ بیوی بانجھ ہو اور شوہر کی خواہش ہو کہ اس کے ہاں اولاد ہو۔عورت بیمار ہو اور وہ ازدواجی ذمہ داریاں ادا نہ کرسکتی ہو۔مرد نیک اور شریف النفس آدمی ہو، وہ کسی یتیم لڑکی ، بیوہ یا ایسی رشتہ دار خاتون سے شادی کرے جس کو شادی کے مواقع حاصل نہ ہوں۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے اچھے مقاصد تعدد ازواج کے دواعی میں سے ہیں۔

اس کے علاوہ تعدد ازواج ایک بہت ہی اہم معاشرتی مسئلے کے حل کا بہترین علاج بھی ہے جو معاشرے کو جنگوں کے بعد بلکہ عام حالات میں بھی درپیش ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ معاشرے میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جائے اور مرد کم تعداد میں ہوں۔اس مسئلے کے حل کے لیے تعددِ ازواج کو قانونی حیثیت دینے کے علاوہ کوئی کامیاب اور شریفانہ حل ممکن نہیں ہے۔ورنہ عورت کا نفس زنا اور غیر قانونی تعلقات کے لیے کھلا رہ جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک عقل مند عورت اسی بات کو ترجیح دے گی کہ وہ کسی شخص کی دوسری بیوی بنے ، بجائے اس کے کہ وہ مرد کی آزادانہ معشوق بن جائے۔اس بنا پر بعض لوگ جو تعدد ازواج کی اسلامی قدر پر اعتراض کرتے ہیں تو ان کی یہ بات بالکل بے بنیاد، دلیل و حجت کے لحاظ سے کمزور اور اسلامی شریعت کے خلاف ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا مفید ہوگا کہ بعض فقہا کے نزدیک عورت کو عقد نکاح کے وقت یہ شرط رکھنے کا اختیار ہے کہ وہ اس کے اوپر دوسری شادی نہیں کرے گا۔اس شرط کے بعد اگر شوہر نے دوسری شادی کر لی تو عورت کا حق ہوگا کہ اس سے طلاق کا مطالبہ کرے۔اس فقہی رائے پر عمل جائز ہے کیوں کہ مسلمان اپنی شرط کا پابند ہوتا ہے۔

● طلاق

۱۵۰-شوہر کے حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔طلاق بنیادی طور پر شریعت میں مرغوب نہیں ہے۔حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللهِ الطَّلَاقِ. حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔

اس بنا پر یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک مسلمان بغیر کسی معقول اور مقبول وجہ کے طلاق کا اقدام کرے۔

بعض جاہل لوگ طلاق پر بھی اعتراض کرتے ہیں اور مرد کے اس اختیار کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس طرح کی لغو باتیں اکثر سننے میں آتی ہیں اور کتب و رسائل میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات کوئی اسلامی شریعت سے جاہل یا عنادی شخص ہی کرسکتا ہے۔ اسلام میں طلاق شریعت کے محاسن میں سے ہے اور یہ اس کی حقیقت پسندی کی علامت ہے۔ اس کو شریعت ایک ایسی خرابی کے علاج کے طور پر پیش کرتا ہے جہاں کوئی اور تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی عیب نہیں ہے کہ بیماری اور ہنگامی حالات کے لیے کوئی قانون تیار موجود ہو اور موقع پر کام آئے۔

طلاق کے مسئلے کا خلاصہ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ اسلام ازدواجی بندھن کو مودت اور موافقت پر قائم ودائم رکھنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ وہ مقاصد حاصل ہوسکیں جن کے لیے نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ ان مقاصد کے راستے میں نکاح کے مختلف اعمال کو اسلام نے ان کو آسان بنایا ہے، اسی لیے خِطبہ یعنی پیغام نکاح کا حکم دیا ہے، اسی لیے مخطوبہ کو دیکھنا مباح قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ رشتہ قائم ودائم رہے۔ اسی طرح اگر عورت میں کوئی عیب نظر آئے تو اسلام نے شوہر کے لیے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ اس کے ساتھ صبر سے کام لے۔ اسلام نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ رہے۔ اس سب کے باوجود اسلام حقائق سے آنکھیں بند نہیں کرتا۔ کبھی کبھی زوجین کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے جو بعض اوقات طلاق کا سبب بنتا ہے۔ اس صورت حال کے علاج کے لیے اسلام نے درج ذیل چیزوں کا حکم دیا ہے۔

۱- جب ایک شوہر کے دل میں اپنی بیوی کے بارے میں ناپسندیدگی کا احساس پیدا ہوتا تو اسلام اس کے اس ارادے میں شک پیدا کردیتا ہے۔ وہ اس کو تلقین کرتا ہے کہ ممکن ہے وہ غلطی پر ہو اور جلد بازی سے کام لے رہا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (النساء۴:۱۹) ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہوں مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔

۲- اگر عورت اپنے لڑائی جھگڑے اور مخالفت کو جاری رکھے تو مرد کا کام ہے کہ اسے وعظ ونصیحت کے ذریعے راہ راست پر لائے، اس سے اپنا بستر الگ کرلے اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ہلکے انداز

میں مار سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (النساء۴:۳۴) اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے علیٰحدہ رہو اور مارو، پھر اگر وہ تمھاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو۔ یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔

۳- جب اختلاف سنگین صورت اختیار کر جائے تو تحکیم ضروری ہو جاتی ہے۔ تحکیم یہ ہے کہ شوہر اپنے رشتہ داروں میں سے ایک ثالث مقرر کرے اور بیوی اپنے رشتے داروں میں سے ایک ثالث مقرر کرے۔ وہ دونوں مل بیٹھ کر میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والے اس اختلاف پر غور کریں گے، اس کے اسباب معلوم کریں گے اور ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح کی ثالثی اکثر اوقات کامیاب رہتی ہے۔ اس لیے کہ ہر ثالث کی کوشش ہوتی ہے کہ اختلاف ختم ہو جائے، کیوں کہ اس کے ختم ہونے میں ان دونوں کا بھی فائدہ ہوتا ہے، اور خاندانی تعلق کی بنا پر ان کے لیے اختلاف کے اسباب سے آگاہ ہونا بھی ممکن ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اختلاف کے حقیقی اسباب معلوم ہو جائیں تو پھر اس کا ختم ہونا آسان ہو جاتا ہے۔

میاں بیوی کے درمیان ثالثی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُّرِيْدَا إِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا (النساء۴:۳۵) اور اگر تم لوگوں کو میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا۔

۴- اگر ثالثی سے کوئی فائدہ نہ ہو اور اختلاف جاری رہے اور شوہر تفریق ہی چاہتا ہو تو پھر اسے چاہیے کہ تفریق کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرے جس میں عُجلت، جلد بازی اور غصے کے نقصان سے بچے۔ اس مقصد کے لیے اسلام شوہر کو حکم دیتا ہے کہ حسب ذیل کیفیت کے ساتھ طلاق دے:

أ- طلاق طہر کی حالت میں دے، یعنی یہ کہ بیوی کے مخصوص ایام نہ ہوں۔ یہ طہر بھی ایسا ہو جس میں

بیوی کے ساتھ ہم بستری نہ کی ہو۔اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر شوہر بیوی کو اس حالت میں طلاق دے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا دل اس بیوی سے بیزار ہے اور کچھ ایسے قوی اسباب موجود ہیں جو اسے بیوی کی تفریق پر مجبور کر رہے ہیں۔ وہ اسباب اس حد تک پہنچے ہوئے ہیں کہ وہ طلاق دینے سے پہلے بیوی کو ہاتھ لگانا تک گوارا نہیں کر رہا۔

ب- اس کے علاوہ شریعت نے اس معاملے میں ایک اور احتیاط بھی ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ بعض اوقات ہوتا یہ ہے کہ شوہر کو مسئلے کا ٹھیک اندازہ نہیں ہوتا اور وہ طلاق کا ارادہ کرنے میں جلدی کر لیتا ہے۔اس لیے شریعت نے اس پر لازم کیا ہے کہ ایک طلاق دے۔ شریعت کی اصطلاح میں اس طلاق کو 'طلاق رجعی' کہتے ہیں۔ اس طلاق میں شوہر کو حق ہوتا ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے اپنی بیوی کی طرف دوبارہ رجوع کرے۔ عدت کا عرصہ تقریباً تین مہینے ہوتا ہے۔ جب وہ ٹھنڈے دل سے غور کرے گا تو اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس نے طلاق دینے میں جلدی کی ہے۔ یہ سوچ بعض اوقات اسے اس بات پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ ازدواجی رشتے کو جاری رکھنے کی طرف لوٹ آئے۔ کبھی رشتہ توڑنے کے جائز اسباب موجود ہوتے ہیں مگر وہ اپنے چھوٹے بچوں کے فائدے اور ان کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے اسے جاری رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لیے شریعت نے اس کو حق دیا ہے کہ عدت کے دوران میں بیوی کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ بعض اوقات یہ طلاق بیوی کے لیے تنبیہ ثابت ہوتی ہے اور وہ آئندہ وہ کام نہیں کرتی جو اس طلاق کا سبب بن گیا تھا۔

ج- جب شوہر عدت کا عرصہ گزارنے تک رجوع نہیں کرتا، مگر پھر اسے اپنے کیے پر افسوس ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ بیوی کی طرف رجوع کرے اور بیوی بھی اس پر راضی ہے تو وہ نئے نکاح اور نئے مہر کے ساتھ اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

د- اگر شوہر نے مذکورہ بالا طریقے پر بیوی کو دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد تیسری بھی دے دی تو اس صورت میں اس کے لیے رجوع کا امکان کچھ بھاری شرطوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ پہلے اس عدت سے فارغ ہو جائے، پھر کسی اور شوہر کے ساتھ اپنی مرضی سے حقیقتاً (نہ کہ صورتاً) نکاح کرے، پھر اس دوسرے شوہر سے وفات یا طلاق کے ذریعے الگ ہو جائے، اور پھر اس دوسری تفریق کی عدت بھی گزر جائے۔ اس کے بعد ہی پہلا شوہر عورت کی آزاد مرضی سے نئے نکاح اور نئے مہر کے

ساتھ اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

۱۵۱- اسلامی شریعت نے طلاق کے واقع ہونے یا بغیر کسی غور و تامل کے اس کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے یہ اقدامات کیے ہیں۔ اگر طلاق کے اسباب کو ختم کرنے کے سلسلے میں یہ تمام اقدامات ناکام ہو جائیں تب طلاق کا وقوع ہی اس جھگڑے کا فیصلہ ہونے کا واحد حل رہ جاتا ہے۔ یہ رشتہ جو کہ راحت اور سکون کا ذریعہ نہیں رہا بلکہ شر و فساد اور لڑائی جھگڑے کا ذریعہ بن گیا ہے اس کو ختم کرنا ہی آخری چارہ کار ہوتا ہے۔ اس سے میاں بیوی دونوں کے لیے میدان کھل جاتا ہے کہ دوسری شادی میں اپنی قسمت آزمائیں۔

یہاں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ طلاق کا حق مرد کو دیا گیا ہے، عورت کو نہیں دیا گیا، اس میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مرد عمومی طور پر عورت کے مقابلے میں اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ طلاق مرد پر بہت بڑی مالی ذمہ داریاں لاد دیتی ہے۔ یہ بھی اسے غور و فکر پر آمادہ اور جلد بازی سے روکنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ یہ ذمہ داریاں مہر موجل، بیوی کے اخراجات اور بچوں کے خرچ کی صورت میں اس کے اوپر آ پڑتی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی جائز ہے کہ عورت عقد نکاح کے موقع پر اپنے لیے طلاق کی شرط لگائے۔ اس شرط کی بنا پر وہ اپنے آپ پر خود بھی طلاق واقع کر سکتی ہے۔ اسی طرح اگر عورت کو شوہر کی طرف سے کوئی ایسا نقصان پہنچا ہو جو رشتے کو ختم کرنے کے لیے جائز وجہ ثابت ہو سکتا ہو تو اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ عدالت کے ذریعے شوہر سے تفریق کرا دے۔

اسلام میں طلاق کے نظام کے بارے میں اس مختصر بیان سے ایک منصف مزاج کے سامنے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایک کامل نظام ہے اور یہ اسلامی شریعت کے محاسن میں سے ہے۔ اس لیے کہ جب رشتہ ازدواج کے باقی رہنے میں کوئی فائدہ نظر نہ آ رہا ہو یا اس میں نقصان دکھائی دے رہا ہو تو یہ کوئی منطق اور مصلحت نہیں ہے کہ اس رشتے کو خواہ مخواہ باقی رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک اب معاشرتی تفریق کو بھی جائز قرار دے رہے ہیں حالانکہ کلیسا اسے ناجائز کہتا ہے۔ یہاں تک کہ اٹلی میں بھی اب معاشرتی تفریق جائز ہے جہاں کچھ عرصہ پہلے تک (کلیسا کے تقدس میں معاشرتی تفریق جائز نہیں تھی مگر) یہ جائز تھا کہ جب واقعی اسباب موجود ہوں تو میاں بیوی کے درمیان جسمانی تفریق

ہوسکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے الگ رہ سکتے ہیں مگر قانوناً وہ ایک دوسرے کے رشتے میں بندھے رہیں گے۔ اس صورت میں ان دونوں کے لیے شادی کی گنجایش نہیں تھی کیوں کہ قانونی طور پر ازدواجی رشتہ قائم ہوتا تھا۔ مگرآخر کار انھوں نے ایسے قوانین بنائے جن کی بنا پر طلاق جائز ہوگئی۔

یہاں یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ طلاق کی صحت کے لیے عدالت کی اجازت کو کیوں شرط نہیں کیا گیا، تاکہ کوئی شخص عدالت کی اجازت کے بغیر طلاق نہ دے سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس اجازت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ ازدواجی زندگی کے رازوں سے عدالت آگاہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ بیوی کی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ یہ راز چھپے ہی رہیں اور کسی کے سامنے نہ کھلیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی فقیہ نے بھی طلاق کی صحت کے لیے عدالت کی اجازت کو شرط نہیں قرار دیا۔ فقہا نے جو رائے قائم کی ہے وہی درست ہے۔ اس کے سوا کوئی راستہ جائز نہیں ہے۔

گھر میں چھوٹوں کے حقوق

۱۵۲- نکاح کے درخت سے بچوں کا پھل ملتا ہے اور نسل آگے بڑھتی ہے۔ بچوں کے اپنے والدین پر کچھ مقررہ حقوق ہیں۔ ان میں سے ایک نسب کا ثبوت اور اس سے متعلقہ حقوق ہیں۔ ان کا خرچہ باپ کی ذمہ داری ہے، اس سلسلے میں ماں کی ذمہ داری نہیں بنتی، البتہ ماں پر دودھ پلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (البقرۃ۲: ۲۳۳) جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیے، تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔

جب میاں بیوی کے درمیان تفریق واقع ہوجائے تو چھوٹے بچوں کی کفالت اور تربیت ماں کے ذمے ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس عمر کو پہنچیں کہ وہ ماں کی کفالت کے محتاج نہ رہیں، تب ان کو باپ لے گا تاکہ ان کی تربیت اور حفاظت تکمیل کو پہنچے۔ لڑکوں کے بارے میں مدت کفالت کا اندازہ سات سال ہے

اور لڑکیوں کے بارے میں نو سال ہے۔

بچوں پر والدین کے حقوق

۱۵۳- والدین ماں باپ کا ذریعہ وجود ہیں اور انھوں نے بچے کی تربیت کے سلسلے میں بڑی مشقت برداشت کی ہوتی ہے، چنانچہ ان کے ساتھ وفاداری میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ان کے حقوق کو پورا کیا جائے اور اس میں کوتاہی نہ کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں بڑی سخت تاکید آئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلَاھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۲۳-۲۴) تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمھارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ پروردگار، ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

افرادِ اُسرہ کے مابین تعاون

۱۵۴- خاندان کے افراد کے مابین محبت، شفقت اور رحمت کا تعلق فطری اور جبلی طور پر موجود ہوتا ہے۔ اسلام نے اپنے بہت سے قوانین کے ذریعے اس کی تائید کی ہے۔ ان قوانین سے افرادِ اُسرہ کے مابین باہمی تعاون و تکافل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان میں بعض ایسے لازم ہیں کہ ان میں عدالت بھی گرفت کر سکتی ہے اور بعض وہ ہیں میں عدالت گرفت نہیں کر سکتی مگر پھر بھی وہ اپنی جگہ لازم ہیں۔

پہلی قسم میں سے یہ بات ہے کہ جو شخص استطاعت رکھتا ہو اس پر اپنے مستحق اہل خانہ کا نفقہ واجب ہے۔ چنانچہ بیوی کا نفقہ شوہر پر اور چھوٹے بچوں کا نفقہ ان کے باپ پر واجب ہے۔ اسی طرح اگر باپ

غریب ہے تو اس کا نفقہ اس کی صاحب مال اولاد پر واجب ہے۔ یہی معاملہ باقی افرادِ اُسرہ کے نفقہ کا ہے۔ اس کے بارے میں عدالت کے فیصلے کے آگے جھکا جاتا ہے۔ اگر مطلوبہ شرائط پوری ہوں تو اس کے بارے میں عدالت فیصلہ دے سکتی ہے اور اس کا ماننا لازم ہوگا۔

دوسری قسم کے حقوق، جو لازم ہیں مگر ان کے بارے میں عدالت کا فیصلہ معتبر نہیں ہے، کی مثال خاندان کے افراد کے درمیان حسن سلوک ہے۔ یہ اپنی جگہ واجب ہے مگر اس میں عدالت کی گرفت درست نہیں ہوتی۔ یہ چیزیں افرادِ اسرہ کی دیانت اور پرہیز گاری پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔

افرادِ اُسرہ کے مابین نفقہ کے بالمقابل میراث کا حق ہے۔ کیوں شریعت کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ اُلْغُرْمُ بِالْغُنْمِ (یعنی نقصان فائدے کے بدلے میں ہے)۔ میراث کے اسباب زوجیت اور قرابت ہیں۔ اسلام نے وارثوں کے حصے متعین کیے ہیں اور یہ تعین عدل کی دقیق بنیادوں پر ہے جنھیں بعض لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ اس میں لڑکے کا حصہ لڑکی کے حصے سے دوگنا رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (النساء ۴:۱۱) تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت مشقت سے محفوظ ہے۔ اگر وہ مال دار نہ ہو تو جب تک اس کی شادی نہ ہو، اس کا نفقہ باپ کے ذمے ہوتا ہے، اور اسے کمانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ پھر جب اس کی شادی ہو جائے تو اس کا نفقہ شوہر کے ذمے ہوتا ہے۔ وہ نہ نکاح کے موقع پر مہر دیتی ہے اور نہ اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری اس پر ڈالی جاتی ہے۔ رہا مرد تو وہ جب بالغ ہوتا ہے اور کمانے کے قابل ہوتا ہے تو اس کا نفقہ اپنے ذمے ہو جاتا ہے۔ پھر جب شادی کرتا ہے تو وہ اپنی بیوی کو مہر دیتا ہے اور بیوی بچوں کا نفقہ برداشت کرتا ہے۔ چنانچہ مرد کی مالی مشقتیں عورت کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے عدل یہی ہے کہ میراث میں اس کو زیادہ حصہ ملے۔

میراث کے احکام انسانی فطرت اور میلان کی بنیاد پر قائم ہیں۔ جو شخص مال کماتا ہے تو صرف اپنی حاجت کو پورا کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی کفالت کے لیے بھی کماتا ہے۔ چنانچہ اگر اس کی موت کے بعد اس کی کمائی کا پھل انھی لوگوں کو ملنے کا یقین ہو تو اس سے وہ مزید کوشش پر بھی

آمادہ ہوتا ہے، کیوں کہ یہ بات اس کے میلان اور ارادے کے مطابق ہے۔

میراث میں بڑے فوائد اور حکمتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وارثوں کو کچھ مال ہاتھ آتا ہے جس سے وہ زندگی میں مستفید ہوتے ہیں اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے مستغنی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ میراث کے ذریعے مال کئی افراد کے درمیان پھیلتا اور تقسیم ہوتا ہے۔ اس طرح مال کی گردش رہتی ہے اور وہ چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہیں رہ جاتا۔

گھر کے اندر کفالت کی ایک صورت جانی اور مالی ولایت ہے۔ جانی ولایت میں بچے کا ایک متعین مدت تک ماں کے پاس زیر کفالت رہنا اور پھر دوسرے ولی جیسے باپ یا دادا کے سپرد ہونا ہے۔ اس طرح اس کی تعلیم وتربیت اور حفاظت مکمل ہوتی ہے۔ دیوانہ اور بے وقوف بھی جانی ولایت کے بارے میں بچے کی طرح ہیں۔ جب بچہ بالغ ہو اور وہ عاقل ہو، یا دیوانے کو اِفاقہ ہو جائے یا بے وقوف کی بے وقوفی ختم ہو جائے تو اس کے اوپر سے دوسروں کی جانی ولایت ختم ہو جاتی ہے اور اس کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ جہاں جانا چاہے چلا جائے۔ مگر لڑکی جب بالغ ہو جاتی ہے تب بھی اس پر ولایت باقی رہتی ہے اور ولی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کی حفاظت اور نگرانی کرے، یہاں تک کہ اس کی شادی ہو جائے۔

چوں کہ جانی ولایت کے ضمن حفاظت، نگرانی، تربیت اور رہنمائی سب شامل ہیں اور یہ سب کچھ بچے یا بچی کے فائدے کے لیے ہوتا ہے اس لیے فقہا نے ان شرطوں کا ذکر بھی کیا ہے جو سرپرست میں موجود ہونی چاہییں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں بلوغ، عقل اور امانت کے علاوہ ولایت کی اہلیت مذہب میں اتحاد بھی شرط ہے۔

رہا ولایت مالی کا مسئلہ تو وہ بچے کے مال میں اور ہر اس شخص کے مال میں ثابت ہوتی ہے جو بچے کے حکم میں ہو جیسے دیوانہ اور بے وقوف وغیرہ۔ یہ ولایت باپ، دادا یا ان لوگوں کے لیے ثابت ہوتی ہے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ یہ ولایت بھی بچے یا دیوانے اور بے وقوف کے فائدے کے لیے جائز کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ولایت میں بھی ولی کے اندر امانت اور بچے کے مال کی حفاظت اور اس میں اضافہ کرنے پر قادر ہونے کی شرط لگائی گئی ہے۔ یہ ولایت اس وقت تک قائم رہے گی جب تک کہ اس کے اسباب موجود ہیں۔ جب یہ اسباب زائل ہو جائیں، مثلاً بچے کو عقل اور سمجھ بوجھ حاصل ہو جائے اور وہ اس

بات پر قادر ہو کہ اپنے مال کو اچھے طریقے سے استعمال کر سکے اور اسے ترقی دے سکے تو اس کے اوپر سے سرپرست کی ولایت ختم ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ (النساء۴:۶) اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔

اسی طرح اگر دیوانے کو افاقہ ہو جائے تو اس کے اوپر سے بھی ولایت زائل ہو جاتی ہے۔

سرپرست کی ذمہ داری ہے کہ وہ جن کا سرپرست ہے ان کے مال میں تصرف کرے اور اس میں ان کی بھلائی چاہے۔ اس لیے ان کا مال کسی کو تحفے میں دینا یا اسے فضول اُڑا دینا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔

۴-معاشرے میں عورت کے دائرہ کار کا تعین

۱۵۵- اسلام کے معاشرتی نظام کے خصائص میں سے ایک یہ ہے کہ وہ معاشرے میں عورت کے دائرہ کار کا تعین کرتا ہے اور یہ تعین وہ بڑی باریک بینی، وضاحت، صراحت اور تفصیل کے ساتھ کرتا ہے تاکہ اس اہم ترین مسئلے میں ہوس و ہوا کا دخل نہ ہو اور معاشرے کو طہارت، نظافت، عفت اور استقامت نصیب ہو۔ نیز اس میں ایک قوی اور امین نسل تیار ہو سکے۔ اس طرح معاشرہ صالح اور درست رہے گا اور اس کے افراد کو سعادت حاصل ہو گی۔

قرآن کریم نے بہت سی آیات میں عورت کے احوال، اس کے معاشرتی مقام اور اس کے حقوق و فرائض کو بیان کیا ہے۔ یہی معاملہ سنت نبوی کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں سے بہت سی احادیث میں زیر بحث آنا اس بات پر قطعی دلالت کر رہا ہے کہ یہ موضوع بڑا اہم ہے اور اسلام نے اس کی طرف بھرپور توجہ دی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں عورت کی حالت، اس کے حقوق و فرائض اور اس کے دائرہ کار کو متعین کرنے والے ضوابط پہلے بھی معاشرے کی زندگی اور اس کے اچھا برا ہونے میں سب سے زیادہ موثر ہوتے تھے اور آج بھی ہیں۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر اسلام نے عورت کے مسئلے کی طرف بھرپور توجہ دی ہے اور اس

کی اچھی طرح وضاحت کردی ہے تا کہ اس کے تمام پہلو واضح ہو جائیں اور لوگ اس مسئلے کے حل کے لیے صحیح طریقے سے کوئی درست راستہ معلوم کر کے اس پر عمل پیرا ہو سکیں۔

ہم اس بحث میں اس موضوع کے تمام جزئیات کو سمیٹنا نہیں چاہتے۔ اس میں ہم صرف نمایاں نکات بیان کرنا چاہتے ہیں تا کہ اسلام کی نظر میں عورت کے دائرہ کار کا درست تصور سامنے آ سکے۔

اسلام سے قبل معاشرے میں عورت کا دائرہ کار

۱۵۶- مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسلام سے پہلے عرب کے جاہلی معاشرے میں عورت کے بارے میں کچھ بیان کیا جائے، تا کہ ہم دیکھ سکیں کہ اس موضوع پر اسلام نے کتنی عظیم اصلاحات کی ہیں۔ اس کے ساتھ ہم وہ عیوب، غلطیاں اور خرابیاں بھی دیکھ سکیں گے جو اسلام سے پہلے لوگوں میں رائج تھیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ اسلامی معاشرے ان میں ملوث نہ ہوں۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: **إِنَّمَا تَنْقُضُ عُرَى الْإِسْلَامِ عُرْوَةً عُرْوَةً إِذَا نَشَأَ فِي الْإِسْلَامِ مَنْ لَّمْ يَعْرِفِ الْجَاهِلِيَّةَ**. جب اسلام میں ایک ایسی نسل جوان ہوگی جنھوں نے جاہلیت کو نہیں دیکھا ہوگا تو اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے گرنا شروع ہو جائیں گی۔

یہ بات انھوں نے اس لیے فرمائی تھی کہ جب ہم جاہلیت کی خرابیوں کو نہیں پہچانیں گے تو ان سے بچ نہیں سکیں گے بلکہ غالب یہ ہے کہ ہم ان کو خلط ملط کر دیں گے یا ان میں گر پڑیں گے۔

اسلام سے پہلے جو غیر عرب معاشرے تھے اور جو اسلام کا آفتاب چمکنے کے بعد بھی اس کی ہدایت سے بہرہ ور نہیں ہوئے تھے ان کا حال عرب کے جاہلی معاشرے سے بہتر نہیں تھا۔ ذیل میں ہم عرب اور غیر عرب معاشروں میں عورت کی حالت کا ایک مختصر جائزہ پیش کریں گے۔

۱- اسلام سے پہلے عربوں میں جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی تھی تو وہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اس سے غم زدہ ہو جاتے تھے۔ قرآن کریم نے ان کی اس نفسیاتی حالت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوٓءِ مَا بُشِّرَ بِهِۦٓ أَيُمْسِكُهُۥ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُۥ فِي التُّرَابِ أَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ. (النحل

۵۸:۱۶-۵۹) جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے۔ دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ لگا رہے ہیں۔

بعض لوگوں کا معاملہ تو یہاں تک پہنچا ہوا تھا کہ انھوں نے اپنی بچیوں کو زندہ دفن کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَإِذَا الْمَوْؤُدَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (التکویر ۸۱:۸-۹) اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔

۲- عورت کا میراث میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ جاہلیت کے عربوں میں میراث کا حق صرف مردوں کو پہنچتا تھا۔

۳- وہ اکثر اوقات ظلم و جانبداری کا شکار رہتی تھی۔ اگر ایک شخص بیوی بچے چھوڑ کر مر جاتا تو اس کے دوسری بیوی کے بچوں کو حق حاصل ہوتا تھا کہ سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح کر لیں، خواہ ماں کو یہ منظور ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح سوتیلی اولاد کو یہ بھی حق تھا کہ وہ اسے نکاح کرنے سے روکے۔

شوہر کو اختیار تھا کہ بیوی کو جتنی چاہے طلاقیں دے اور عدت گزرنے سے پہلے پہلے اس کی طرف رجوع کرے۔ اس طرح اسے معلق بنا کر چھوڑتے، نہ تو وہ مطلقہ ہوتی کہ اپنی راہ لیتی اور نہ بیوی ہوتی کہ زوجیت کے فوائد حاصل کرتی۔

۴- دوسری جاہلی اقوام کی حالت بھی جاہلی عربوں سے بہتر نہیں تھی۔ یورپ میں عورت کے بارے میں یہ اختلاف رہا ہے کہ کیا وہ دین کے حصول، عبادات کی ادائیگی اور آخرت میں جنت کے حصول کے حوالے سے مرد کے برابر یا نہیں۔ حتیٰ کہ رومی کلیسا کی بعض مجالس نے طے کیا کہ عورت ایک ناپاک حیوان ہے، نہ اس میں روحانیت ہے اور نہ اس کے لیے دوام ہے۔[1]

۵- رومی قانون میں شوہر کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی بیوی کو بیچ دے اور اس کے پاس جو مال ہے اس پر قبضہ کر لے۔ یہ قانون اس صورت میں ہے جب کہ بیوی آزاد ہو۔

۱- الوحی المحمدی، محمد رشید رضا، ص ۵۸۱

۶- عمومی اخلاقی آداب میں کوئی پابندی نہیں تھی جن کا عورت کو خیال رکھنا ضروری ہو۔ بلکہ عرب اور غیرعرب جاہلی معاشروں میں ان پابندیوں سے آزادی بہت عام تھی۔قرآن کریم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى (الاحزاب۳۳:۳۳) سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔

جاہلی سج دھج کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ عورت سر اور سینہ اور گلا کھلا کر کے مردوں کے ساتھ گھل مل جائے، ان کے درمیان مٹک مٹک کر چلے۔ اہل تفسیر نے اس آیت کی تفسیر میں اسی طرح کے اقوال ذکر کیے ہیں۔

اسلامی معاشرے میں عورت کا دائرہ کار

۱۵۷- اسلامی نظام معاشرت میں عورت کا دائرہ کار جاننا منحصر ہے یہ جاننے پر کہ اس کے لیے ثابت ہونے والے حقوق اور اس پر عائد ہونے والی ذمہ داریاں کیا ہیں، وہ مخصوص کام کیا ہے جس کے لیے اس کی تخلیق کی گئی ہے اور وہ کون سے آداب ہیں جن کی وہ پابندی کرتی ہے۔ چنانچہ یہ چار اشیا جو اسلامی معاشرے میں عورت کے دائرہ کار کے عناصر ترکیبی ہیں ان کے بارے میں گفتگو ضروری ہے۔

i- عورت کے حقوق

۱۵۸- عورت کے حقوق کے بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ حقوق میں یہ مرد کے برابر ہے۔ البتہ کچھ حقوق ایسے ہیں جن کے لیے کسی مخصوص استعداد، صلاحیت اور قدرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی صلاحیتوں کے لحاظ سے اگر مرد اور عورت کے درمیان فرق ہو تو اس کی بنیاد پر ان کے حقوق میں بھی فرق واقع ہوتا ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ یہ حقوق عورت پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے ٹکراتے نہ ہوں۔ اس قاعدے کی بنیاد پر عورت درج ذیل حقوق سے استفادہ کرتی ہے:

أ- وہ زندگی کے حق سے مستفید ہوتی ہے اس لیے کہ وہ مرد کی طرح ایک معصوم جان رکھتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کو حرام قرار دیا۔ اگر کوئی شخص کسی عورت کو عمداً قتل کرے تو اس کے اوپر اسی طرح قصاص کو لازم کر دیا ہے جیسا کہ مرد کے قتل ہونے کی صورت میں ہے۔

ب- وہ عزت وتکریم کی مستحق ہے کیوں کہ وہ انسان ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی۔

ج- اس کو حق ہے کہ جائز طریقے سے مال کمائے۔ کیوں کہ اسے ضمانت حاصل ہے کہ وہ مالی اور غیر مالی حقوق حاصل کرسکتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ مرد کے برابر ہے۔ مال کے حصول کے اسباب میں سے ایک سبب میراث ہے اور یہ شریعت میں اس کے لیے ثابت ہے، اگرچہ اہل جاہلیت نے عورت کو اس سے محروم کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا (النساء ۴:۷) مرد کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

اسے یہ بھی حق ہے کہ اپنے مال کو جیسا چاہے استعمال کرے۔ اگر وہ عقل منداور سمجھ دار ہے تو اپنے مال کے استعمال میں اس کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

د- عقد نکاح میں اسے مہر کا حق حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء ۴:۴) اور عورتوں کے مہر خوش دِلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو۔

اور اس کا اپنے شوہر پر نفقہ کا حق بھی بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ ۲:۲۳۳) اور بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔

اسی طرح ماں ہونے کی حیثیت سے اس کا اپنے بچوں پر بھی نفقہ کا حق ہے۔

ہ- اگر میاں بیوی کے درمیان تفریق ہوجائے تو عورت کو حق ہے کہ وہ چھوٹے بچوں کی پرورش کرے۔

و- عورت کو حق ہے کہ جو علوم اس کے لیے مفید ہیں انھیں وہ حسب حال حاصل کرسکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں وہ ضروری اسلامی احکام کی مکمل پابندی کرے۔

عورت کے لیے سب سے مفید چیز تو یہ ہے کہ وہ اسلامی شریعت اور اس کے حلال و حرام کو سیکھے۔ رہے دنیوی علوم تو وہ مباح ہیں۔ اگر عورت ان میں سے کوئی علم سیکھنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر مذکورہ بالا شرط کی پابندی ضروری ہے۔ یعنی اسلامی آداب اور حسب حال کیفیت کی پابندی اور اپنی عفت کی حفاظت۔

اسی طرح اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ ایسے علوم سیکھے جو اس کی طبیعت کے مناسب، اور بچوں کی تربیت اور گھر کے انتظام کے حوالے سے اس کے اختصاص کو تقویت پہنچانے والے ہوں۔ مثلاً یہ کہ وہ سینے پرونے، کھانا پکانے، بچوں کی نگہداشت کرنے اور اس قسم کے دیگر امور کے طریقے سیکھے۔

اگر وہ اس سے بھی زیادہ معرفت حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ چیز ایک بیوی اور ایک ماں کی حیثیت سے مطلوبہ ذمہ داریوں کی ادائیگی پر اثر انداز نہ ہوں۔ یہ بھی شرط ہے کہ تعلیم و تعلم کا طریقہ درست ہو۔ چنانچہ یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ تعلیم کے نام پر لڑکوں سے گھل مل جائے، مردوں کے سامنے بے پردہ ہو جائے یا ناجائز لباس میں اپنی نمائش کرے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے امور، خواہ تعلیم ہی کے لیے ہوں، حرام ہیں، ان میں نہ اباحت ہے اور نہ جواز۔

ز۔ رہے اس کے سیاسی حقوق، جن میں فلاح عامہ کے امور اور انتخابات بھی شامل ہیں تو یہ مسئلہ تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے۔

مسلمانوں کی فلاح عامہ کے امور پر توجہ دینا اس کا حق ہی نہیں بلکہ ذمہ داری بھی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مَنْ لَّمْ يَهْتَمَّ بِأُمُوْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَلَيْسَ مِنْهُمْ. جو شخص مسلمانوں کے امور کا اہتمام نہیں کرتا وہ ان میں سے نہیں ہے۔

مسلمانوں کے امور میں اُن کے عام معاملات بھی شامل ہیں جن سے اُن کی اصلاح ہوتی ہے یا جو اُن کی بدبختی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اہتمام کے مظاہر میں سے ایک مظہر یہ ہے کہ ان سے معاملات کے بارے میں غور و فکر کی جائے اور اُن لوگوں میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کا اہتمام کی جائے جو عورت سے متعلق ہوں جیسے شوہر، بچے، رشتے دار اور پڑوسی وغیرہ۔

عورت کو عوامی امور میں رائے دینے کا حق بھی حاصل ہے اور اس کو 'نصیحت' کے اظہار کا حق بھی حاصل ہے۔ اس کے لیے جو طریقہ ممکن ہو اور اس کی طبیعت کے مناسب ہو وہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کر سکتی ہے، کوئی کتاب تالیف کر کے یا عورتوں کے اجتماعات منعقد کر کے امت کی اصلاح میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس طرح کے اجتماعات کا مقصد عورتوں کی تعلیم و تربیت، ان کے درمیان اچھے اخلاق کی اشاعت اور ان کو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر ابھارنا اور منکرات سے روکنا ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَّأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (التوبۃ ۹:۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

رہا موجودہ دور میں مروجہ کیفیت کے ساتھ انتخابات میں شرکت کا معاملہ، جس کا مقصد سربراہ مملکت یا وزیر اعظم کا انتخاب ہوتا ہے تو اس کے بارے میں ہمارے سامنے جو بات ظاہر ہو چکی ہے وہ یہ کہ یہ کام عورت کے لیے ناجائز ہے۔ اس لیے کہ اس حوالے سے اسلامی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ خلفائے راشدین بھی منتخب تھے اور مسلمانوں نے ان کے ساتھ بیعت کی تھی مگر اس میں عورت کی شرکت منقول نہیں ہے۔

ii۔عورت کی ذمہ داریاں

۱۵۹۔عورت کی ذمہ داریوں کے بارے میں بھی وہی قاعدہ ہے جو اس کے حقوق کے بارے میں ہے۔ ذمہ داریوں میں بھی یہ مرد کی طرح ہے۔ مگر جن ذمہ داریوں کے لیے درکار صلاحیتیں مرد اور عورت میں مختلف ہوں اُن میں ان کے درمیان اختلاف ہوتا ہے۔

اس قاعدے کی بنیاد یہ ہے کہ عورت بھی انسان ہے اور وہ اپنے حقوق کے حصول اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے درکار ہر قسم کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنے کی اہل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ (النساء ۴:۱) لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔

چنانچہ عورت سے بھی مرد کی طرح شریعت کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کو مان کر اور اس کے نواہی سے اجتناب کر کے اس سے تقویٰ اختیار کرے۔ اس قاعدے پر درج ذیل امور مترتب ہوتے ہیں:

أ- یہ مرد کی طرح عقیدے، عبادات، اور معاملات میں شرعی احکام کی مخاطب ہے، علاوہ ان امور کے جو اس کی طبیعت کے مناسب نہ ہوں، جیسا کہ معروف ہے۔ یا یہ کہ وہ کسی عبادت پر قادر نہ ہو۔ جیسے جہاد، جس کا حکم مرد کو دیا جاتا ہے عورت کو نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود ہی مجاہدین کے ساتھ جانا چاہے تو اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اس میں وہ وہی کام انجام دے گی جسے وہ انجام دے سکتی ہے، مثلاً زخمیوں کا علاج کرنا، کھانا تیار کرنا وغیرہ۔

قرآن کریم میں وارد ہے کہ مسلمان خواتین نے مردوں کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیعت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى أَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ أَيْدِيْهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الممتحنہ۶۰:۱۲) اے نبیؐ، جب تمھارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امرِ معروف میں تمھاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورتیں بھی دین کے ان احکام کی پابند ہوتی ہیں جن کی پابندی مردوں پر عائد کی گئی ہے۔

ب- جب یہ بات طے ہوگئی کہ عورت احکامِ شرعیہ کی مخاطب ہے تو اس سے خود بخود یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسے اپنے اعمال اور لازم شدہ احکام کی پابندی کا بدلہ دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (النساء۴:۱۲۴) اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا

عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّيْ لَآ أُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (آل عمران۳:۱۹۵) جواب میں ان کے رب نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے: مَنْ عَمِلَ صٰلِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيَاةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل ۱۶:۹۷) جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو اُن کے اَجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

ج۔ قرآن کریم میں جو خطاب ایسا ہوتا ہے جس میں مومنوں کو شرعی احکام کا مکلّف کیا جاتا ہے تو اس میں عورتیں بھی داخل ہوتی ہے، سوائے اس کے کہ اس کے خلاف کوئی دلیل آجائے۔ مثلاً اللہ کا ارشاد ہے:

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءً يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (النساء۴:۱۲۳) انجامِ کار تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی کوئی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی ومددگار نہ پاسکے گا۔

اس میں مرد اور عورتیں سب داخل ہیں۔

بعض اوقات قرآن کریم مردوں کو احکام کا مکلّف بنانے کے لیے خطاب کرتا ہے یا ان کی تعریف کرتا ہے تو اس میں عورتوں کا ذکر الگ سے کر دیتا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصَّآئِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيْمًا. (الاحزاب۳۳:۳۵)

بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزے رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اَجر مہیا کر رکھا ہے۔

۵- عورت کی ایک ذمہ داری شوہر کی معروف میں اطاعت اور اس کے حقوق کی ادائیگی ہے۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَّسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الزَّوْجَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا. اگر میں کسی کو کسی کے آگے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیتا تو میں عورت سے کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

جب وہ معروف میں اس کی اطاعت کرے گی اور اس کے حقوق کو ادا کرے گی تو اس کا شمار صاحبِ فضیلت خواتین میں ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! کون سی عورت سب سے بہتر ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اَلَّتِي تَسُرُّهُ إِذَا نَظَرَ، وَتُطِيعُهُ إِذَا أَمَرَ وَلَا تُخَالِفُهُ فِي نَفْسِهَا وَمَالِهَا بِمَا يَكْرَهُ. وہ عورت جسے اگر شوہر دیکھے تو اسے خوشی نصیب ہو، جب کوئی حکم دے تو اسے مانے اور اپنے نفس اور شوہر کے مال میں اس کی مرضی کے خلاف نہ کرے۔

۶- اس کے علاوہ عورت گھر اور اس کے سارے معاملات کی ذمہ دار اور اس کی امین ہے۔ اس کا فرض بنتا ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرے اور اس ذمہ داری سے اچھے طریقے سے عہدہ برآ ہو۔

حدیث شریف میں آیا ہے: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَّسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ... وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُوْلَةٌ عَنْ رَّعِيَّتِهَا. تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی نگرانی کے بارے میں سوال کیا جائے گا..... عورت اپنے شوہر کے گھر میں نگران ہے اور اس سے اس نگرانی کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

iii- عورت کی خصوصی ذمہ داری

۱۶۰- اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو اسی انداز سے پیدا کیا ہے کہ اس کے لیے وہ مقصد پورا کرنا ممکن رہے

جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔عورت کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس انداز سے پیدا کیا ہے جس کے ذریعے اس کے لیے بیوی اور ماں بننا ممکن ہے۔عورت کے اندر اس کی تڑپ اور اُمنگ ودیعت کی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسے اولاد کی پرورش کی قابلیت اور صلاحیت عطا کی ہے۔اور مامتا کی فطری شفقت کی فضا میں اس کے راستے میں پیش آنے والی مشقتوں پر صبر کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔چنانچہ عورت کی خصوصی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ بیوی اور ماں بن کر اولاد کی اچھی پرورش کرے۔

اولاد کی تربیت راستے میں نہیں بلکہ گھر میں ہوتی ہے۔اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس ذمہ داری کی طرف متوجہ ہو اور اس کے لیے کماحقہ وقت نکالے۔اسلام نے اس کے لیے بے شمار وافر مواقع پیدا کر دیے ہیں۔چنانچہ اس کے کندھوں سے معاش اور کمانے کا بوجھ اُتار دیا ہے۔اس نے یہ ذمہ داری مرد کی لگائی ہے کہ بیوی اور اس کی اولاد کے لیے نفقہ کا انتظام کرے۔اس لیے عورت کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ گھر کے باہر کام کاج کرے۔کیوں کہ کام کاج کا مقصد کمانا اور رزق حاصل کرنا ہوتا ہے اور اس سے عورت کو اس وقت مستغنی کر دیا گیا ہے جب اس نے ایک عظیم کام کی طرف رخ کیا۔یعنی گھر میں بچوں کی پرورش کرنا۔

اسلام نے اس سے بعض ایسی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی ہلکا کیا ہے جو مرد کے اوپر کچھ متعین مقاصد کے حصول کے لیے ڈال دی گئی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عورت کو اس کے کام کی انجام دہی کے لیے پورا پورا موقع فراہم کرے۔چنانچہ عورت پر اللہ کی راہ میں لڑنا اس طرح واجب نہیں ہے جیسا کہ مرد پر ہے۔مسجد میں نماز باجماعت مردوں کے لیے واجب یا سنت موکدہ ہے مگر عورت پر نماز باجماعت لازم نہیں ہے۔نماز جمعہ مردوں پر واجب ہے مگر عورتوں پر نہیں۔

یہ اور اس طرح کی دوسری چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اسلام اسی بات پر زور دیتا ہے کہ عورت گھر میں ہی رہے اور اس سے باہر صرف کسی ضرورت یا معقول حاجت کے لیے ہی نکلے۔تاکہ وہ اپنے اہم ترین کام یعنی اولاد کی تربیت پر پوری توجہ دے سکے، اور اپنے شوہر کے لیے باہر کی مشقت اور تھکاوٹ سے پناہ لینے کے لیے ایک پرسکون اور آرام دہ گھر تیار کر سکے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى (الاحزاب ۳۳:۳۳) اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔

گھروں میں ٹک کر بیٹھنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل گھروں سے نہ نکلیں، دیکھتے نہیں کہ عورت حج کے لیے جا سکتی ہے اور اگر چاہے تو مسجد میں نماز پڑھنے جا سکتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنے رشتہ داروں کی زیارت کے لیے اور علاج معالجے اور اس قسم کے دیگر امور کے لیے گھر سے نکلتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ٹک کر بیٹھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی جائز ضرورت اور معقول سبب کے بغیر گھر سے نہیں نکلے گی۔ رہا ضرورت کی بنا پر نکلنا تو وہ شریعت کی نظر میں مرغوب ہے۔

iv- عورت کے لیے لازمی آداب

۱۶۱- بعض آداب اور صفات ایسی ہیں جن کی عورت کو پابندی کرنی چاہیے تاکہ وہ معاشرے کی طہارت کو باقی رکھنے اور اسے عیوب سے پاک وصاف رکھنے میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ ان کے ذریعے وہ اپنے آپ کو بھی تہمت کی جگہوں سے اور شیطان کے بہکاوے سے بچا سکے گی۔ اس قسم کے آداب میں سے بعض درج ذیل ہیں:

۱- ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی ایسے مرد کے ساتھ خلوت اختیار کرے جس کے ساتھ اس کا نکاح حلال ہوتا ہے، خواہ وہ اس کا کتنا ہی قریبی رشتہ دار ہو، جیسے چچازاد یا ماموں زاد بھائی۔ یہ ممانعت، جیسا کہ واضح ہے، عورت کی طرح مرد پر بھی لاگو ہے۔ چنانچہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے خلوت اختیار کرے جس کے ساتھ اس کا نکاح حلال ہوتا ہے۔

اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ شیطان کے لیے چور دروازوں کو پہلے ہی سے بند کر دیا جائے۔ اس لیے کہ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے، شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ وہ انسان کے لیے برائی کو مزین کرتا ہے اور اس کے اندر شہوت کی آگ بڑھکاتا ہے۔

ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ **إِيَّاكُمْ وَالْخَلْوَةَ بِالنِّسَاءِ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا خَلَا رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا وَدَخَلَ الشَّيْطَانُ بَيْنَهُمَا.** [اجنبی] عورتوں کے ساتھ خلوت سے بچ کر رہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، جب بھی کوئی مرد اور عورت خلوت اختیار کرتے ہیں تو ان کے درمیان شیطان ضرور آ موجود ہوتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے: لَا يَخْلُوَنَّ أَحَدُكُمْ بِامْرَأَةٍ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ. کوئی مرد کسی عورت سے خلوت نہ کرے سوائے اس کے کہ عورت کے ساتھ اپنا محرم موجود ہو۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ تعلیمی سطح بلند ہونے سے غلطی میں پڑنے سے محفوظ رہا جا سکتا ہے چنانچہ پھر اجنبی عورت سے خلوت میں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ یہ بات اس لیے درست نہیں ہے کہ مسئلہ نفس کی کمزوری اور اس کے اندر موجود شہوتوں کا ہے۔ اس کے اندر شیطان کے بہکاوے سے متاثر ہونے کی صفت پائی جاتی ہے اور ان مسائل میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سب برابر ہیں۔ واقعات ہماری اس بات کی تائید کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی ہے کہ تعلیم وتربیت شہوت کو ختم نہیں کرتی۔ البتہ اللہ تعالیٰ سے تقویٰ، خشیت اور دل میں ایمان کی حلاوت اسے کمزور ضرور کر سکتی ہے اگرچہ پوری طرح ختم وہ بھی نہیں کر سکتی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ حدیث مبارکہ ان مومنوں یعنی اصحاب رسول کو مخاطب کر رہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہترین انسان تھے۔ چنانچہ دوسروں کی کیا حیثیت ہے جن کے دلوں میں شیطان نے گھونسلا بنا کر انڈے بچے دیے ہیں اور اس کے ساتھ انھوں نے اپنے دماغ کو ایک چیز سے بھر دیا ہے جسے 'علم' اور 'تعلیم' کہتے ہیں۔

پھر جس طرح کہ خلوت کی ممانعت ہے اسی طرح عورت کا اپنے شوہر یا محرم کے بغیر اکیلے سفر بھی ممنوع ہے۔ اس لیے کہ اجنبی علاقے میں اس کا اکیلا ہونا شیطان کے لیے بہکاوے اور برائی میں مبتلا کرنے کے چور دروازے کھول دیتا ہے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ اس کے لیے مردوں کے ساتھ اختلاط سے دور رہنا لازم ہے۔ کیوں کہ اس میں بھی فتنے کا خوف ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے بچانے ہی کے لیے اسلام نے عورتوں پر نماز جمعہ واجب نہیں کی، بلکہ اس کے لیے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ہی ضروری نہیں ہے۔ جنازے کے ساتھ جانا بھی اس کے لیے پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر وہ مسجد میں نماز باجماعت کے لیے حاضر ہوتی ہے تو اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ آخری صف میں مردوں کے پیچھے عورتوں کے ساتھ کھڑی ہو۔ اگر اللہ کے گھر میں یہ معاملہ ہے تو جہاں عبادت نہیں کی جاتی وہاں مردوں

کے ساتھ اختلاط کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

اس کے باوجود اگر کوئی ضرورت یا حاجت ایسی پیش آتی ہے جہاں اس قسم کا اختلاط ضروری ہو تو ادب واحترام کے حدود میں یہ اختلاط جائز ہوتا ہے۔ جیسے کسی خاتون کا مجاہدین کے ساتھ کھانا پکانے یا زخمیوں کا علاج کرنے کے لیے جانا۔ ایسے واقعات ثابت ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد پر گئے ہیں اور بعض مسلمان خواتین آپ ؐ کے ساتھ تھیں۔ وہ زخمیوں کا علاج کرتیں اور مسلمان مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں۔ بلکہ بعض اوقات عورت عملی جنگ میں حصہ لینے پر مجبور ہوتی ہے، جیسا کہ غزوہ اُحد میں بعض خواتین اسلام کو اس کی ضرورت پیش آئی۔ اس طرح کی صورتوں میں اختلاط ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اسی طرح بعض اوقات کوئی خاتون اپنی ضرورتوں کے لیے بھی گھر سے نکلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ عام گاڑی یا ریل گاڑی پر سوار ہوتی ہے اور اس کا مردوں کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے۔ اس طرح کی صورتیں ضرورت کے وقت جائز ہوتی ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس میں چال چلن، لباس اور کلام کے حوالے سے اسلامی آداب کا خیال رکھا جائے۔

۳- تیسری بات یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کو چھپا کر رکھے گی، سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہو۔ عورتوں کے آداب کے حوالے سے قرآن کریم میں آیا ہے: وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (النور۲۴:۳۱) اور اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے۔

چنانچہ ارادے سے کسی زینت کا اظہار جائز نہیں ہوگا، سوائے اس کے جو بلا ارادہ خود بخود ظاہر ہو، یا یہ کہ کوئی چیز ایسی ہو جس کو چھپانا ممکن ہی نہ ہو۔ جیسے چادر اور لباس۔ یہ وہ زینت ہے جس کا ظاہر کرنا حضرت ابن مسعودؓ کی رائے میں جائز ہے۔ جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی رائے میں اس سے مراد سرمہ اور انگوٹھی ہیں۔ بعض علما کے نزدیک اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔[1] چنانچہ چہرہ اور ہاتھ کھولنا جائز ہوگا۔ مگر اس کے علاوہ کوئی چیز کھولنا جائز نہیں ہوگی۔ بعض علما نے ان دونوں کا ظاہر کرنا بھی اسی صورت میں جائز قرار دیا ہے جب ان میں زینت نہ ہو۔

[1] - أحکام القرآن، لابن العربی المالکی، ج ۳ ص ۱۳۶-۱۳۷

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ عورت کا لباس شرعی ہونا چاہیے،یعنی وہ ان ہدایات کے مطابق ہو جن کا شریعت نے حکم دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِن (النور۲۴:۳۱) اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔

خمار وہ ہوتا ہے جو سر پر رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ حکم دے رہی ہے کہ خمار یعنی دوپٹے کو گردن اور سینے پر لٹکایا جائے تاکہ وہ چھپ جائیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِکَ وَبَنَاتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِکَ أَدْنٰى أَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (الاحزاب۳۳:۵۹) اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکالیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

جلباب سے مراد وہ بڑی چادر ہے جو عورت کے پورے جسم کو چھپاتی ہے۔ اسے عورتیں اپنے کپڑوں کے اوپر اوڑھتی ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی چیز ظاہر نہیں ہوتی۔ یہ اس عباء کی مانند ایک چیز ہے جسے ہمارے دور میں 'بعض' خواتین پہنتی ہیں مگر پہلے یہ عباء بہت عام تھی۔

اسلام کی رو سے عورتوں کے لباس میں مزید شرطوں میں ایک بات یہ ہے کہ یہ نہ شفاف ہو اور نہ بہت تنگ ہو، تاکہ اس کے اعضا ظاہر بھی نہ ہوں اور ان کی کیفیت بھی نمایاں نہ ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ سَيَكُوْنُ فِيْ آخِرِ أُمَّتِيْ نِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ عَلٰى رُؤُوْسِهِنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ، اَلْعِنُوْهُنَّ فَإِنَّهُنَّ مَلْعُوْنَاتٌ. میری امت کے آخری دور میں ایسی عورتیں ہوں گی جو کپڑے پہن کر ننگی ہوں گی۔ ان کے سروں کی چوٹیاں ایسی ہوں گی جیسے بختی اونٹ۔ ان پر لعنت بھیجو، یہ ملعون عورتیں ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ انھوں نے برائے نام کپڑے پہنے ہوں گے مگر حقیقت میں ننگی یا ننگوں کی طرح ہوں گی۔ یہ حدیث بھی نبوت کی علامات میں سے ہے۔ اس لیے کہ اس میں جو بات رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمائی ہے وہ ہو کر رہی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو ایسا لباس پہننے سے منع فرمایا ہے جو اس کی ہڈیوں کی موٹائی ظاہر کر دے۔

عورت کے شرعی لباس کی شرطوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب وہ گھر سے نکلے تو وہ معطر نہ ہو اور وہ مردوں کے لباس کے مشابہ یا اس کے 'سٹائل' میں نہ ہو۔

حدیث میں آیا ہے: لَیْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِالرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ، وَلَا مَنْ تَشَبَّهَ بِالنِّسَاءِ مِنَ الرِّجَالِ. وہ عورت ہم میں سے نہیں جو مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرے اور وہ مرد بھی ہم میں سے نہیں جو عورتوں کی مشابہت ختیار کرے۔

عورت کے شرعی لباس کے بارے میں بات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں عورتوں کے لیے مقررہ لباس کے تمام آداب کا خیال رکھا گیا ہو، وہ یہ کہ لباس چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ سارے جسم کو چھپانے والا ہو، وہ بذاتِ خود زینت نہ ہو، وہ شفاف یا اتنا تنگ نہ ہو جس سے عورت کا جسم نمایاں ہو، نہ وہ خوشبو والا ہو اور نہ مردوں یا کفار کے لباس کے مشابہ ہو اور نہ وہ شہرت کا لباس ہو۔[1]

۵- پانچویں بات یہ ہے کہ عورت کی چال چلن اور اس کے کلام میں اسلامی آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس کی طرف قرآن کریم کے اس ارشاد میں اشارہ کیا گیا ہے کہ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (النور۲۴:۳۱) وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔

یعنی وہ اپنے پاؤں ایسے مار کر نہ چلیں تاکہ اس کے جوتوں کی آواز سنی جا سکے۔ اگر وہ سج دھج کرتے ہوئے یا مردوں کے سامنے نمائش کی غرض سے ایسا کرتی ہے تو یہ حرام ہے۔[2]

درحقیقت یہ چیز سد الذریعہ[3] کی قبیل سے ہے۔

۱- حجاب المرأة المسلمة فی الکتاب والسنة، استاذ ناصر الدین الالبانی، ص۸۹

۲- أحکام القرآن، لابن العربی المالکی، ج۳، ص۱۳۶

۳- سد الذریعہ کا مطلب ہے کسی برائی کا سبب بننے والی مباح چیز پر پابندی لگانا، تاکہ برائی کا راستہ روکا جا سکے (مترجم)

چنانچہ یہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ آدمی کا مقصد کیا ہے بلکہ نظر فعل کے انجام پر ہوتی ہے۔ اس بنا پر عورت کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ یہ کام نہ کرے، تاکہ مردوں کے درمیان میں وہ کوئی ایسی چیز نہ پھیلائے جس کی طرف وہ متوجہ ہوں، یا اس کی چال کو دیکھ کر بدنگاہی یا بدگمانی کے گناہ میں مبتلا ہوں۔

اس ممانعت پر فتنہ برپا کرنے والی کسی بھی قسم کی چال کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے عورت کو چاہیے کہ ایسی چال چلے جس سے فاسق اور بداخلاق لوگ اس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا (الاحزاب ۳۳:۳۲) نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن العربیؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو حکم دیا ہے کہ ان کی گفتگو باوقار اور بات واضح ہو۔ اس کا انداز ایسا نہ ہو کہ دل میں کوئی تعلق پیدا ہو جائے۔ یعنی یہ کہ کلام میں ایسی نرمی پیدا کی جائے جس سے سننے والے کے دل میں کوئی امید پیدا ہو اس میں ان پر یہ بھی لازم کر دیا کہ ان کی بات معروف ہو... بعض کہتے ہیں کہ معروف سے مراد آہستہ بولنا ہے، چنانچہ عورت کو آواز ہلکی رکھنے کا بھی حکم ہے۔[۱]

چنانچہ ایک مسلمان عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنی گفتگو میں ان حدود کی پابندی کرے۔

۵- معاشرے کی اصلاح میں فرد کی ذمہ داری

۱۶۲- اسلام کے نظام معاشرت کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ فرد کو معاشرے کی اصلاح کا ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے۔ ذمہ دار اس معنی میں کہ اس معاشرے کے ہر فرد سے یہ تقاضا ہوتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح اور اپنی وسعت و طاقت کی حد تک فساد کو ختم کرنے کے لیے کام کرے۔ نیز اس مقصد کے حصول میں دوسروں کے ساتھ تعاون کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ ۵:۲) جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو

۱- اُحکام القرآن، لابن العربی المالکی، ج ۳، ص ۱۲۳

گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔

سب سے بڑا تعاون یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ معاشرے کی اصلاح میں تعاون کیا جائے۔ جب فرد سے معاشرے کی اصلاح کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو خود فرد کے بارے میں یہ بات ظاہر ہے کہ وہ معاشرے میں فساد نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلاَ تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلاَحِهَا (الاعراف ۷:۵۶) زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔

اور فقہی قواعد میں ایک قاعدہ ہے کہ مَا حُرِّمَ أَخْذُهٗ حُرِّمَ إِعْطَاءُهٗ. جس چیز کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی حرام ہوتا ہے۔ کیوں کہ حرام چیز کا کسی کو دینا فساد بھی ہے اور اِفساد بھی۔

ایک مسلمان اگر اصلاح کرنے سے عاجز ہو تو اس کی کم سے کم ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ فساد کا آغاز کرنے اور اس میں اضافہ کرنے سے باز آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رشوت دینا بھی ناجائز ہے اور اس کا لینا بھی۔ اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے اور اس کا لینا بھی۔ حدیث میں آیا ہے: لَعَنَ اللهُ آكِلَ الرِّبَا وَمُوْكِلَهٗ وَكَاتِبَهٗ وَشَاهِدَهٗ. اللہ تعالیٰ نے سود کھانے والے، اس کے کھلانے والے، اس کی دستاویز لکھنے والے، اور اس کے گواہوں پر لعنت کی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے: لَعَنَ اللهُ الرَّاشِيْ وَالْمُرْتَشِيْ وَالرَّائِشَ. اللہ تعالیٰ نے رشوت دینے والے، رشوت لینے والے اور رشوت کی دلّالی کرنے والے پر لعنت کی ہے۔

اصلاحِ معاشرہ میں مسئولیتِ فرد کے دلائل

۱- آیاتِ قرآنیہ

۱۶۳- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَّأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (التوبۃ ۹:۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

معروف ایک جامع نام ہے ہر اس چیز کا، جس کا شریعت اسلامی نے مطالبہ کیا ہو اور منکر ایک جامع نام

ہے ہر اس چیز کا، جس سے شریعت نے ممانعت کی ہو۔ اس میں بدیہی طور پر وہ ساری چیزیں داخل ہیں جن سے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے اور وہ فساد سے پاک ہوتا ہے۔

اللہ کے ایک نیک بندے لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے بھی بیان کی ہے اس میں ہے: یَا بُنَیَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ أَصَابَکَ إِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ (لقمان ۳۱:۱۷) بیٹا! نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

قرآن کریم میں سابقہ اقوام کے واقعات کے ذریعے بھی اصلاح معاشرہ میں فرد کی ذمہ داری کو مؤکد کیا گیا ہے۔ ان قوموں کے افراد نے اصلاح کا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی کی تھی تو ان کی مذمت کی گئی اور انھیں ہلاکت سے دوچار ہونا پڑا۔ ان واقعات سے مقصود یہ ہے کہ ہر مسلمان اُن پر نازل ہونے والے عذاب سے عبرت حاصل کرے اور ان کی طرح اپنی ذمہ داری میں کوتاہی نہ کرے ورنہ ان پر بھی وہ عذاب آ سکتا ہے جو پچھلی قوموں پر آیا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُوْلُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ (ہود ۱۱:۱۱۶) پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہل خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم، جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا۔

مطلب یہ کہ تم سے پہلے گزرنے والی قوموں میں ایسے لوگ کیوں نہ رہے جو اطاعت کرنے والے، دین دار اور عقل مند ہوتے اور اپنی قوم کو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔[1]

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ أَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَأَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (الاعراف ۷:۱۶۵) جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انھیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے، اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔

---

[1] تفسیر القرطبی، ج ۹ ص ۱۱۳

یہ آیت کریمہ دلالت کر رہی ہے کہ جن لوگوں کو عذاب سے نجات مل گئی وہ اسی وجہ سے کہ وہ برائی اور فساد سے روکتے تھے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ برائی اور فساد سے روکنا واجب اور ضروری ہے۔

۲-احادیث نبویہ

۱۶۴- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں بہت سی احادیث ہیں جو فرد کو معاشرے کی اصلاح کا ذمہ دار قرار دیے جانے کی تاکید کرتی ہیں۔ ان میں ایک یہ حدیث ہے کہ مَنْ لَّمْ یَھْتَمَّ بِأُمُوْرِ الْمُسْلِمِیْنَ فَلَیْسَ مِنْھُمْ. جو شخص مسلمانوں کے معاملات کا اہتمام نہیں کرتا وہ ان میں سے نہیں ہے۔

معاشرے کی اصلاح، اس سے فساد کو ختم کرنا اور اس کے لیے فکر مند ہونا ہی مسلمانوں کے معاملات کا اہتمام کرنا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے: مَنْ رَّاٰی مِنْکُمْ مُّنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ، فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ. (مسلم) تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے، اور اگر اس کی طاقت بھی نہ ہو تو دل سے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

یہ حدیث اس مفہوم میں صریح ہے کہ مسلمان معاشرے سے فساد کے ازالے کا مسلمانوں سے جو مطالبہ کیا گیا ہے اس کی ذمہ داری ہر ہر فرد پر ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح یہ حدیث یہ حکم بھی دے رہی ہے کہ ایک مسلمان کو ہر وقت معاشرے کی اصلاح اور اس سے فساد کو ختم کرنے کے لیے تیاری اور استعداد کی حالت میں ہونا چاہیے۔ یہ مفہوم فإن لم یستطع فبقلبه کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ دل سے تبدیل کرنے سے مراد برائی کو ناپسند کرنا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: فبقلبه کے معنی ہیں: فلیکرھه بقلبه. یعنی اسے دل سے ناپسند کرے۔ اس کی طرف سے یہ منکر کا ازالہ یا اس کی تبدیلی نہیں ہے، مگر اس کی وسعت اور طاقت ہی اتنی ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ دل سے تبدیل کرنے کا مطلب ہے منکر کو ناپسند کرنا، اور وہ اگرچہ منکر کا ازالہ اور اس کی

۱-شرح صحیح مسلم للنووی، ج ۲، ص ۲۵

تبدیلی نہیں ہے، جیسا کہ امام نوویؒ نے فرمایا، مگر یہ اس کو عملی طور پر تبدیل کرنے کے لیے مقدمہ، تیاری اور اپنے نفس کو آمادہ کرنا ہے۔ کیوں کہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اس چیز کو کبھی ختم نہیں کرتا جو اسے پسند ہو۔ وہ اسی چیز کو زائل اور تبدیل کرتا ہے جو اسے ناپسند ہو۔ چنانچہ کسی چیز کو ناپسند کرنا اس کے ازالے اور تبدیلی کے لیے مقدمہ اور اس کا آغاز ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دل کی ناپسندیدگی پر بھی تبدیلی کے لفظ کا اطلاق درست ہو گیا۔

منکر کو ناپسند کرنا دل کو زندہ اور ایمان سے معمور رکھتا ہے۔ اس میں منکر اور فساد کے خلاف کافی حساسیت موجود ہوتی ہے۔ مسلمان کے لیے اس بات کی گنجایش نہیں ہے کہ وہ اس ناپسندیدگی کو بھی چھوڑ دے۔ اگر یہ احساس مفقود ہو گیا تو یہ دل کی بیماری کی نشانی ہے۔ چنانچہ اس کو موقع ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے پہلے ایمان کی دوا سے اس کا علاج کرنا چاہیے۔

امام ابن تیمیہؒ نے انکارِ قلبی کے نہ ہونے کو اسلام سے ارتداد قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: مرتد وہ ہے جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھتا ہو، یا ان تعلیمات سے جو آپؐ لے کر آئے ہیں، یا یہ کہ منکر کو اپنے دل سے ناپسند کرنا بھی چھوڑ دے۔[1]

احادیث میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَاللّٰهِ لَتَامُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ و لَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لَتَأْخُذُنَّ عَلٰى يَدِ الظَّالِمِ وَ لَتَأْطُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أَطْراً، وَلَتَقْصُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا، أَوْلَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ يَلْعَنُكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ. (ابوداؤد، ترمذی) یقیناً تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور ظالم کا ہاتھ پکڑو۔ اس کو حق کے راستے پر لاؤ اور حق سے تجاوز نہ کرنے دو ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں کو ایک دوسرے سے دے مارے گا اور پھر تم پر اس طرح لعنت کرے گا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر کی تھی۔

یہ حدیث بھی اس بات پر صراحتاً دلالت کر رہی ہے کہ مسلمان معاشرے کی اصلاح اور اس سے فساد کے ازالے کا مسلمانوں سے جو مطالبہ کیا گیا ہے اس کی ذمہ داری ہر ہر فرد پر ڈالی گئی ہے۔ اس میں یہ تاکید بھی

۱۔ مجموعہ فتاویٰ، ج ۵، ۱۸۲

کی گئی ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکنا چاہیے۔ اس لیے کہ ظلم روئے زمین میں سب سے بڑا فساد ہے۔

فرد پر اصلاح معاشرہ کی ذمہ داری ڈالنے کی وجہ

۱۶۵- سوال یہ ہے کہ اگر فرد اصلاح معاشرہ کا ذمہ دار ہے تو اس کی وجہ کیا ہے، ایک فرد سے اپنے نفس کی اصلاح کی ذمہ داری کے ساتھ اس دوہری ذمہ داری کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے؟ فرد کی اس ذمہ داری یا اس سے ہونے والے اس مطالبے کی وجوہات درج ذیل ہیں:

۱۶۶- **پہلی وجہ** یہ ہے کہ فرد اجتماعیت سے متأثر ہوتا ہے۔ انسان ایک معاشرتی مخلوق ہے اور یہ اپنے گردوپیش کے معاشرے کا اثر قبول کرتا ہے۔ معاشرے کی اصلاح یا فساد کے ساتھ اس کی روح بیمار و لاغر یا صحت مند اور مضبوط ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک حدیث میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:

مَامِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّایُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ أَوْیُنَصِّرَانِهٖ... جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے وہ فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی بنا دیتے ہیں...

بچے کے لیے اس کے والدین ایک چھوٹا معاشرہ ہوتے ہیں جو اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ اسے فساد یا صلاح کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر والدین گمراہ ہوں تو وہ اسے گمراہی کی طرف دھکیل دیتے ہیں اور اسے فطرت سلیمہ کے مقتضا سے نکال دیتے ہیں، جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اگر والدین صالح ہوں تو وہ اسے اسی فطرت پر باقی رکھتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے اور اس کے اندر خیر کے پہلو کو نشو و نما دیتے ہیں۔ یہی معاملہ بڑے معاشرے کا بھی فرد پر اثر انداز ہونے کے حوالے سے ہے۔

۱۶۷- **دوسری وجہ** ایک صالح معاشرے کے قیام کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ایک مسلمان سے اصل میں تو یہی چیز مطلوب ہے کہ وہ جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اسے پورا کرے اور صرف اور صرف اللہ کی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ (الذاریات ۵۱:۵۶) میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

عبادت ایک جامع نام ہے ان تمام افعال، اقوال اور احوال کا جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، خواہ ان کا تعلق

ظاہر سے ہو یا باطن سے۔[1]

عبادت کا یہ جامع مفہوم تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان اپنے تمام اقوال، افعال، اختیارات اور لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو ان ہدایات کے تابع بنائے جو شریعت اسلامی نے دی ہیں۔ ایک مسلمان اپنی زندگی کو اسلامی زندگی نہیں بنا سکتا جب تک گرد وپیش کا معاشرہ اس کے لیے مددگار نہ بنے۔ اور معاشرہ اس کے لیے مددگار اسی طرح ہوگا کہ وہ ایک اسلامی معاشرہ بن جائے۔

اگر ایسا نہ ہو اور مثال کے طور پر اردگرد کا معاشرہ خالص جاہلی معاشرہ ہو یا ایسا معاشرہ ہو جس میں جاہلیت کا ملاپ ہو تو اس میں ایک مسلمان، صحیح معنوں میں مسلمان ہو کر زندگی نہیں گزار سکتا اور یہ اس کے لیے ممکن بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک مسلمان جاہلیت کے ازالے پر قادر نہ ہو تو اسلام اسے جاہلی معاشرے سے اسلامی معاشرے کی طرف منتقل ہونے کا حکم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلآئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰٓئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيرًا (النساء۴:۹۷) جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ یہ ہر اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مشرکین کے درمیان میں رہتا ہو۔ وہ ہجرت کر سکتا ہو اور اقامت دین پر قادر نہ ہو۔ ایسا شخص اپنے آپ پر ظلم کرنے والا اور ایک اجماعی حرام کا مرتکب ہے۔[2]

اس لیے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ جس معاشرے میں رہتا ہے اس کا خیال رکھے اور اگر اس میں کوئی منکر ظاہر ہو یا واقع ہو تو اس کا ازالہ کرے۔ منکر کو معمولی نہ سمجھے۔ اس لیے کہ منکر کی مثال جراثیم کی ہے جو جسم

۱۔ مختصر فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ص ۱۷۲-۱۷۳

۲۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۵۴۲

پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر بعض لوگ ان سے بیمار نہیں بھی ہوتے، تو اتنا ضرور ہوتا ہے کہ اُن کی قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے اور بعد میں ان جراثیم کو ان پر غلبہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اسلامی مملکت کا سب سے اہم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھا اسلامی معاشرہ قائم کرے اور اس سے منکرات کا ازالہ کرے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج ۲۲:۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

۱۶۸- **تیسری وجہ** اجتماعی سزا سے نجات حاصل کرنا ہے۔ جب افراد معاشرے کی اصلاح کریں گے تو اس سے افراد بھی اور معاشرے بھی اجتماعی ہلاکت یا سزا سے نجات پائیں گے۔ وہ تنگی ترشی، گھٹن، قلق واضطراب اور معاشرے کو پہنچنے والے شر سے بھی محفوظ ہوں گے۔

اس جملے کی وضاحت کے لیے تھوڑی سی تفصیل درکار ہے اس لیے کہ یہ ایک اہم موضوع ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ جس معاشرے میں منکرات کی کثرت ہو جاتی ہے اور اس میں اللہ کی حرمتوں کو پامال کیا جاتا ہے، جس میں فساد پھیل جاتا ہے اور افراد اس سے انکار کرنے یا اس کو بدل دینے کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں عمومی طور پر بڑی بڑی مصیبتوں اور عظیم مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس میں سارے لوگ گِھر جاتے ہیں اور یہ عذاب نیک اور بد سب کو ملتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک خوف زدہ کرنے والی اور ڈرانے والی سنت ہے جو ہر فرد کو اور خاص طور پر اُن افراد کو جن کے پاس علم وفقاہت یا اختیار واقتدار ہوتا ہے، اس بات پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ جلد از جلد اس منکر کو ختم کرے تاکہ ہر فرد سے بھی اور بحیثیت مجموعی پورے معاشرے سے عذاب ٹل جائے۔ اس پر قرآن وسنت کے بے شمار دلائل موجود ہیں۔

۱۶۹- **قرآن کریم** میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الانفال ۸:۲۵) اور ڈرو اس فتنے سے جو تم میں صرف ان لوگوں کو

لاحق نہیں ہوتا جنھوں نے ظلم کیا ہو، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے درمیان منکر کو نہ رہنے دیں ورنہ سب پر عذاب آ جائے گا۔[1]

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اس فتنے سے ڈرو جو ظالم سے متعدی ہو کر نیک اور بد سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔[2]

اس آیت کی تفسیر کے بارے میں علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو اس فتنے یعنی آزمائش اور مصیبت سے ڈراتا ہے جس میں عمومی طور پر گناہ گار اور بے گناہ سب مبتلا ہوں گے۔ یہ آزمائش صرف گناہ گاروں یا ان لوگوں تک محدود نہیں ہوگی جنھوں نے براہ راست گناہ کا ارتکاب کیا ہو بلکہ یہ عام آزمائش ہوگی۔[3]

۱۷۰- **سنت رسول** میں اس حوالے سے صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے:

مَثَلُ الْقَائِمِ فِيْ حُدُوْدِ اللهِ وَالْوَاقِعِ فِيْهَا كَمَثَلِ قَوْمٍ اسْتَهَمُوْا عَلٰى سَفِيْنَةٍ فَصَارَ بَعْضُهُمْ أَعْلَاهَا وَبَعْضُهُمْ أَسْفَلَهَا، وَكَانَ الَّذِيْنَ فِيْ أَسْفَلِهَا إِذَا اسْتَقَوْا مِنَ الْمَاءِ مَرُّوْا عَلٰى مَنْ فَوْقَهُمْ، فَقَالُوْا: لَوْ أَنَّا خَرَقْنَا فِيْ نَصِيْبِنَا خَرْقاً وَّلَمْ نُؤْذِ مَنْ فَوْقَنَا، فَإِنْ تَرَكُوْهُمْ وَمَا أَرَادُوْا هَلَكُوْا جَمِيْعًا، وَإِنْ أَخَذُوْا عَلٰى أَيْدِيْهِمْ نَجَوْا وَنَجَوْا. اللہ کی مقرر کردہ حدود کے پاس رکنے والے اور اس میں واقع ہونے والے کی مثال ایسی ہے کہ کچھ لوگ ایک کشتی میں قرعہ ڈالیں۔ بعض اوپر والی منزل میں اور بعض نچلی منزل میں ٹھیر جائیں۔ جو لوگ نچلی منزل میں ہوں وہ اوپر والوں کے پاس گزر کر پانی حاصل کرتے ہوں۔ وہ آپس میں کہیں کہ اگر ہم اپنے حصے میں سوراخ کریں تو اوپر والوں کو تکلیف نہیں ہوگی۔ اگر اوپر والے ان کو اپنے ارادے میں کھلا چھوڑ دیں تو سب ہلاک ہوں گے اور اگر وہ ان کا ہاتھ پکڑیں تو ان کو بھی بچالیں گے اور خود بھی بچ جائیں گے۔

۱- تفسیر قرطبی، ج ۷، ص ۳۹۱

۲- تفسیر قرطبی، ج ۷، ص ۳۹۳

۳- تفسیر ابن کثیر

اس حدیث میں بھی اس بات کی دلیل ہے، جیسا کہ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں، کہ اگر بعض لوگ گناہوں میں مبتلا ہوں تو اس کی وجہ سے عام لوگ عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب گناہوں کا ظہور ہو، منکر پھیل جائے اور اسے تبدیل نہ کیا جائے تو اس کی سزا پوری جماعت کو ملتی ہے۔ اور جب منکر کو نہیں بدلا جاتا اور معاملات شریعت کے احکام کی طرف نہ لوٹائے جاتے ہوں تو جو مسلمان اس صورت حال کو ناپسند کرتے ہوں ان پر لازم ہوگا کہ یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور ہجرت کر جائیں۔[۱]

اس حدیث کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک اور دلیل بھی ہے اور وہ یہ کہ درست طریق کار اور صحیح راستے سے ہٹ جانا ہلاکت اور نقصان کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس نقصان اور ہلاکت کو جماعت سے دفع کرنے میں یہ بات کوئی مفید نہیں ہے کہ جو لوگ صحیح طریق کار سے ہٹ گئے ہیں ان کی نیت اور ارادہ اچھا ہے۔ اس لیے کہ جو لوگ کشتی میں سوراخ کرتے ہیں ان کا مقصود تو یہ ہوتا ہے کہ اوپر والوں کو تکلیف نہ ہو مگر ان کی اچھی نیت انھیں ہلاکت سے نہیں بچا سکتی ہے۔ اس لیے کہ جماعت کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ان کا طریق کار درست نہیں ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: اے لوگو! تم تو یہ آیت تلاوت کرتے ہو کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (المائدۃ۵:۱۰۵) [اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمھارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہِ راست پر ہو] مگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلٰى يَدَيْهِ أَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ مِّنْهُ. اگر لوگ ظالم کو [ظلم کرتے ہوئے] دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو عن قریب اللہ تعالیٰ ان سب کو عام عذاب میں مبتلا کر دے گا۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معاشرے میں فساد برپا ہونا اور اس پر خاموش رہنا اور اس کو نہ بدلنا اجتماعی عذاب کا ذریعہ ہے۔

معاشرے کے صالح یا فاسد ہونے کا معیار

۱۷۱- جب فرد معاشرے کی اصلاح اور اس سے فساد مٹانے کا ذمہ دار ہے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ

۲- تفسیر قرطبی، ج ۷، ص ۳۹۲

معاشرے کے صالح یا فاسد ہونے کا معیار کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ ہی صالح معاشرہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ معاشرہ جو اسلامی عقیدے کی اساس پر قائم ہو، جو اسلامی نظام معاشرت کا اصل منبع ہے۔ یہ عقیدہ اس نظام کے مختلف پہلوؤں کو منظم کرتا ہے اور اس کی کچھ خصوصیات ہم بیان کر چکے ہیں۔

فاسد معاشرہ وہ ہوتا ہے جو اسلامی عقیدے کی اساس کے علاوہ کسی اور بنیاد پر قائم ہو، جس پر اسلام کا نظام معاشرت حکمران نہ ہو اور جس میں منکرات پھیل رہے ہوں۔ یہ وہی معاشرہ ہوتا ہے جسے اسلام جاہلی معاشرہ کہتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں صالح معاشرہ وہ ہوتا ہے جو اسلام کی تعلیمات، اس کے افکار اور اس کے طریق کار پر قائم ہو اور جس میں اسلامی احکام کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہو۔ اور فاسد معاشرہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

۳

اسلام کا نظامِ افتاء

تمہید

۱۷۲- ایک مسلمان سے مطلوب یہ ہے کہ اس کے افعال ابتدا ہی سے اسلامی طریق کار کے مطابق ہوں اور وہ اپنے افعال کے نتائج میں شریعت کے حکم کو قبول کرے۔ اس کو چاہیے کہ دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات کو ایسے طریقے سے استوار کرے، جس کی شریعت اجازت دیتی ہے۔ اگر کسی شخص کو ان ساری یا ان میں سے بعض امور کا علم نہ ہو تو اس پر لازم ہوتا ہے کہ ان کو جاننے کی کوشش کرے تاکہ اس کا کردار شرعی حدود کے مطابق بن سکے۔ یہ امور جاننے کے جو طریقے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ علمائے کرام لوگوں کو دینی امور کی تعلیم دینے کی اپنی ذمہ داری ادا کریں اور ان تک دین کے احکام پہنچائیں۔ اسی طرح لاعلم لوگوں کو چاہیے کہ وہ علما سے اسلامی احکام کے بارے میں پوچھیں۔

۱۷۳- تعلیم اور تبلیغ کی ذمہ داری شریعت نے اہل علم پر ڈال دی ہے اس لیے ان پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کو دین کے ان احکام کی تعلیم دیں جو اُن کے لیے ضروری ہیں، اور اس قدر تعلیم دیں جتنا اسلام نے اس کا حکم دیا ہے یا جس قدر لوگ اس کے محتاج ہیں۔ علما کی اس ذمہ داری میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے، جب کہ لوگوں میں جہالت عام ہو جائے اور شریعت کے نشانات ماند پڑ جائیں اور نئی نئی بدعتوں کا ظہور ہو۔ اگر علما تعلیم اور تبلیغ کی ذمہ داری میں کوتاہی کریں گے تو وہ گناہ گار ہوں گے اور ان سے ان کی کوتاہی کے بارے میں سخت حساب لیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس ذمہ داری میں ان کی کوتاہی کتمانِ علم سمجھا جائے گا، جس کا ان کو امین بنایا گیا ہے اور انھیں اس کی تبلیغ و اشاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

اگر علما اپنے تبلیغ کے فریضے کو ادا کریں گے تو لوگوں پر لازم ہو جائے گا کہ ان کا رُخ کریں، ان کی باتیں سنیں، علما جو کچھ کہتے ہیں اس کو سیکھیں اور جو کچھ سیکھیں اس پر عمل کریں۔ اگر عام لوگ یہ کام نہیں کریں گے تو وہ گناہ گار ہوں گے اور ان سے حساب لیا جائے گا۔ اس لیے کہ ان پر حجت قائم کی گئی ہے، کہ علما نے ان کو

ین پہنچانے کی اپنی ذمہ داری ادا کردی ہے۔

۱۷۴- اس کے باوجود کہ علما دینی احکام لوگوں تک پہنچاتے رہیں، بعض لوگ اسلام کے احکام سے جاہل رہ جاتے ہیں۔ بعض اوقات علما سے اپنے فریضۂ تبلیغ میں کوتاہی ہوتی ہے۔ چنانچہ جہالت عام ہوجاتی ہے اور جاہلوں کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے۔ جاہل کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ دین کے جن کا احکام کا تعلق اس کے ساتھ ہے ان کو سیکھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسْئَلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ. (النحل ۱۶:۴۳) اہل ذکر سے پوچھو، اگر تم خود نہیں جانتے۔

جاہل سے یہ ذمہ داری رفع نہیں ہوتی کہ وہ اپنے لیے لازمی دینی امور کی تعلیم حاصل کرے، خواہ علما پنے فریضۂ تعلیم و تبلیغ میں کوتاہی کیوں نہ کریں۔ اس لیے کہ جاہل پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دینی معاملات میں سے جس چیز کا علم نہیں رکھتا اس کے بارے میں سوال کرے، جیسا کہ آیت کریمہ وضاحت کررہی ہے۔

۱۷۵- جاہل کا اہل علم سے سوال کرنا، ان کا اس کو جواب دینا، دو مختلف حیثیتیں ہیں جن میں ایک حیثیت سوال کرنے والے جاہل کی اور دوسری جواب دینے والے عالم کی ہے۔ چنانچہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ایک کی ذمہ داری سوال کرنا اور دوسرے کی ذمہ داری جواب دینا ہوا۔ ان دونوں کی ذمہ داریاں کبھی واجب کا درجہ رکھتی ہیں، کبھی مستحب کا اور کبھی مباح کا۔ اس طرح کی ساری باتیں مل جاتی ہیں تو وہ نظام وجود میں آتا ہے جس کو اسلامی شریعت میں نظامِ افتاء کہا جاتا ہے۔

اِفتاء کے لغوی معنی

۱۷۶- لسان العرب میں ابن منظورؒ لکھتے ہیں: أفتاه في الأمر، أي أبانه له. یعنی أفتاه في الأمر کے معنی ہوتے ہیں معاملے کو اس کے سامنے واضح کردیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: أفتاه في المسألة، يفتيه: إذا أجابه. یعنی یہ جملہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی نے کسی کو جواب دیا ہو۔ اس کا اسم فتویٰ آتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اِستفتيته فأفتاني إفتاءً. میں نے اس سے فتویٰ پوچھا تو اس نے مجھے فتویٰ کا جواب دیا۔ فتویٰ کا لفظ بھی اِفتاء کی جگہ رکھا جاتا ہے۔ پھر فتيا اور فتویٰ اس جواب کو کہتے ہیں جو مفتی اور فقیہ لوگوں کو دیتا ہے۔

اس سے ہمارے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ استفتاء کے لغوی معنی کسی مسئلے کا حکم معلوم کرنے کے لیے سوال کرنے کے ہیں۔ جو شخص یہ سوال کرتا ہے وہ مستفتی کہلاتا ہے، جس سے سوال کیا جاتا ہے اور جو بعد میں جواب دیتا ہے وہ مفتی ہوتا ہے اور اس کا مستفتی کو جواب دینے کا عمل اِفتاء ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ اِفتاء کا عمل مستفتی، مفتی اور خود اِفتاء یا فتویٰ پر مشتمل ہے۔

اِفتاء کے اصطلاحی معنی

۱۷۷- افتاء کے اصطلاحی معنی بھی تقریباً وہی ہیں جو اس کے لغوی ہیں۔ اس کے ضمن میں بھی مستفتی، مفتی اور فتویٰ کے ارکان موجود ہیں، مگر اس کے ساتھ ایک قید کا اضافہ ہے اور وہ یہ کہ جس مسئلے کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ شرعی مسائل میں شمار ہوتا ہو، اور اس کا حکم، جس کے معلوم کرنے کے لیے استفتاء کیا گیا ہے، ایک شرعی حکم ہو۔

چنانچہ نظامِ اِفتاء میں مستفتی، جس سے ہم بحث کر رہے ہیں، وہ شخص ہوتا ہے جو کسی مسئلے میں شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لیے سوال کرتا ہے، مفتی وہ ہوتا ہے جو اس سوال کا جواب دیتا ہے، جواب دینے کا عمل افتاء کہلاتا ہے اور خود اس جواب کو فتویٰ کہتے ہیں۔

منہجِ بحث

۱۷۸- مذکورہ معروضات کی روشنی میں ہم اپنی اس بحث کو چار عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱- مستفتی

۲- مفتی

۳- اِفتاء

۴- فتویٰ

۱۔ مستفتی

مستفتی کون ہے!

۱۷۹۔ مستفتی وہ شخص ہے جو کسی مسئلے میں شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لیے سوال کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس حکم کو نہیں جانتا۔ وہ سوال کر رہا ہے تو اسی لیے کہ اس حکم کو معلوم کرے اور مفتی جو جواب دے اس پر عمل کرتے ہوئے اس فتویٰ میں اس کا مقلد بن جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر شخص پر، جو کسی شرعی حکم سے جاہل ہو، لازم ہے کہ اس حکم کے بارے میں پوچھے، یا نہیں؟ پھر جب وہ حکم کو جان لے یا اس کے جاننے پر خود قادر ہو جائے تو کیا اس کے بارے میں بھی پوچھنے کا وجوب یا اس کی اجازت باقی رہتی ہے یا نہیں؟ ان سوالوں کا جواب مختلف لوگوں اور ان کے احوال کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کے لیے سوال کرنا حرام ہوتا ہے، کبھی اس کا حکم وجوب کا ہوتا ہے اور کبھی صرف جائز۔ چنانچہ لوگوں کی ان قسموں کا بیان ضروری ہے۔

۱۔ جن پر استفتاء حرام ہے

۱۸۰۔ وہ لوگ جو اجتہاد کی اہلیت رکھتے ہوں اور جن میں وہ تمام شرطیں بدرجۂ اتم موجود ہوں جو اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں تو وہ مجتہد بن جاتا ہے اور مجتہد کے لیے کسی کی تقلید حرام ہوتی ہے۔ جب وہ مجتہد بن گیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ مسئلے میں اجتہاد کرے تاکہ وہ اس کے حکم کو یقین کے ساتھ یا گمانِ غالب کے ساتھ جان لے۔ نتیجتاً اس کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ اس مسئلے کے حکم کے بیان کے لیے کسی دوسرے سے استفتاء کرے۔ یہاں تحریم کا تعلق اس استفتاء سے ہے جس کا مقصد مفتی کے فتوے میں اس کی تقلید ہے۔ رہی یہ بات کہ ایک مجتہد کسی اور سے کسی مسئلے کا حکم پوچھے مگر صرف مذاکرہ اور معلومات کی جانچ پڑتال کے لیے، تو یہ ممنوع نہیں ہے۔ اس مذاکرہ کے بعد اگر مجتہد کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے کہ اس کی

رائے غلط اور دوسرے کی رائے درست ہے تو اس کا اتباع واجب ہو جائے گا۔اس لیے کہ یہ چیز ان اشیا میں شامل ہوگئی جو اس نے اپنے اجتہاد کے ذریعے معلوم کر لیے ہیں۔

۱۸۱- جب ہم کہتے ہیں کہ اجتہاد قابل تقسیم چیز نہیں ہے۔[اگر چہ اس میں اختلاف ہے کہ اجتہاد قابل تقسیم ہے یا نا قابل تقسیم، مگر] ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔اس لیے کہ ایک مسلمان بعض امور میں مجتہد ہوتا ہے اور بعض میں نہیں ہوتا۔ چنانچہ جن امور میں وہ اجتہاد پر قادر ہوتا ہے وہاں مجتہد مطلق کے مقام پر بھی فائز ہوسکتا ہے۔اس بنا پر اس کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ ان امور میں وہ کسی اور سے سوال کرے اور کسی کے دیے ہوئے فتوے پر عمل کرتے ہوئے اس کی تقلید کرے۔اور یہی شخص جن امور میں اجتہاد سے عاجز ہوگا اس کے لیے کسی سے استفتاء کرنا واجب یا کم از کم جائز ہوگا، جس کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

۲- جن پر استفتاء واجب ہے

۱۸۲- استفتاء کرنا ہر اس شخص پر واجب ہے جو اجتہاد کے مرتبے پر فائز نہ ہو اور اس پر شرعی حکم کی معرفت واجب ہو۔ چنانچہ کسی پر استفتاء کے واجب ہونے کی دو شرطیں ہیں:

ا- پہلی شرط یہ ہے کہ ایک شخص مجتہد نہ ہو، خواہ اس کا سبب یہ ہو کہ وہ اجتہاد سے عاجز ہے یعنی وہ اجتہاد کی صلاحیت اور قدرت نہیں رکھتا، یا اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں مطلوبہ فقہی ملکہ موجود نہیں ہے، یا پھر یہ کہ وہ حصول علم کے لیے وقت نہیں نکال سکتا، جس کے نتیجے میں وہ اجتہاد کے مرتبے تک پہنچ سکے۔ یا پھر ان کے علاوہ کوئی سبب ہو۔

۲- دوسری شرط یہ ہے کہ اس پر متعلقہ شرعی حکم کا معلوم کرنا واجب ہو، اور اس شرط میں افراد و اشخاص کے اختلاف کے ساتھ اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص عقل کی حالت میں بلوغ کو پہنچا اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ نماز کے احکام اور اس کی ادائیگی کا طریقہ اور اس کی شرائط سیکھے۔ جب رمضان آ جائے تو اس پر واجب ہوگا کہ روزے کے احکام سیکھے۔ پھر جب اس کے ہاتھ میں مال آ جائے اور وہ مال نصاب تک پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ کے احکام سیکھنا واجب ہوگا اور جب حج کی استطاعت پیدا ہو جائے تو اس پر واجب ہوگا کہ حج کے احکام سیکھے۔ جس کو کوئی حادثہ پیش آ جائے اس پر لازم ہوگا کہ اس حادثے کے بارے میں اسلام کے احکام سے آگاہی حاصل کرے۔ جو شخص تجارت اور خرید و فروخت کرتا ہے اس پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اس کے

احکام معلوم کرے اور یہی معاملہ دیگر بہت سے احکام کا ہے۔ اس شرط سے متعلق ان تمام امور کے لیے ایک جامع اصول یہ ہے کہ جس شخص پر کسی متعین شرعی حکم کا علم لازم ہو اس پر واجب ہوگا کہ اس کے بارے میں اہل علم سے سوال کرے۔ لیکن اس سے زائد شریعت کی تفصیلات کا علم ہر فرد کے لیے واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، خواہ وہ بحیثیت امت فرضِ کفایہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ پوری امت مسلمہ میں کوئی نہ کوئی تو ہوگا جس کو شریعت کی تفصیلات کا علم ہو، جو مرتبہ اجتہاد تک پہنچا ہوا ہو اور جو لوگوں کو ان کی ضرورت کے دینی معاملات کے بارے میں فتویٰ دے سکے۔

۱۸۳- خلاصہ یہ ہے کہ عام آدمی پر واجب ہے کہ وہ ان معاملات میں علما سے استفتاء کرے جو اس کے ساتھ متعلق ہوں، تا کہ اس کو معلوم ہو سکے کہ وہ اپنی شرعی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے کس طرح ادا کر سکتا ہے۔

۳- جن کے لیے استفتاء جائز ہے

۱۸۴- غیر مجتہد کے لیے ان شرعی احکام کے بارے میں استفتاء جائز ہے جن کے ساتھ اس کا تعلق نہ ہو۔ جیسے وہ عام آدمی جس پر حج واجب نہیں ہے تو اس پر یہ بھی لازم نہیں ہے کہ وہ حج کے احکام کا علم حاصل کرے، اور نتیجتاً اس پر یہ بھی لازم نہیں ہے کہ وہ ان احکام کے بارے میں کسی مفتی سے پوچھے، اگر چہ اس کے لیے یہ جائز ہے۔ اس لیے کہ شرعی احکام کا جاننا اور ان کے بارے میں اپنے علم میں اضافہ کرنا ایک مسلمان کے حق میں پسندیدہ ہے۔ اور جہاں استحباب پایا جاتا ہو وہاں جواز نہ ہونے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

۱۸۵- لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک غیر مجتہد کے لیے ان امور میں استفتاء کرنا جائز ہے جن کا جاننا اس پر لازم نہیں ہوتا اور اسے کوئی حادثہ یا واقعہ بھی درپیش نہ ہو؟ اس کے بارے میں علمائے کرام کے دو اقوال ہیں:

ایک قول اس کی کراہت کے بارے میں ہے۔ یہ قول امام مالکؒ سے منقول ہے۔ آپؒ ایسے امور کا حکم معلوم کرنے کے بارے میں سوال کو ناپسند کرتے تھے جو درپیش نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ کے بعض شاگرد جب کسی ایسے مسئلے کا حکم معلوم کرنا چاہتے جو ابھی واقع نہ ہوا ہوتا تو وہ امامؒ کے پاس کسی ایسے شخص کو سوال کرنے کے لیے بھیج دیتے، جیسے اس کو یہ واقعہ پیش آیا ہو۔ اس کراہت کی وجہ بعض علما نے یہ بتائی ہے کہ

دینی معاملات میں فتویٰ دینا ایک عظیم کام ہے اور اس کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ اس لیے کہ دینی احکام کے بارے میں فتویٰ دینا درحقیقت اللہ کی شریعت اور اس کے احکام کے بارے میں خبر دینا ہے، اور یہ کام اپنی حد تک بھرپور کوشش صرف کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اگر مجتہد اس میں کوتاہی کرے گا تو اس کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے گا۔ اور جب واقعہ پیش ہی نہیں آیا تو فتویٰ دینے اور ذمہ داری اپنے سر لینے کی کوئی ضرورت اور حاجت نہیں ہے۔ بلکہ دین میں غلطی سے بچنا اور احتیاط برتنا، دونوں اس بات کو واجب کرتے ہیں کہ اس طرح کا فتویٰ دینے سے اجتناب کیا جائے۔ اسی طرح مجتہد کا اجتہاد کبھی بدل بھی جاتا ہے اس لیے فتویٰ دینے میں جلدی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ واقعہ پیش بھی نہیں آیا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجتہد کا اجتہاد بدل جاتا ہے اور اس کے بعد حادثہ پیش آتا ہے۔ اس صورت میں بعض اوقات مجتہد کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ مستفتی تک اپنے نئے اجتہاد کی اطلاع دے سکے۔

اس ساری بحث کی روشنی میں مفتی کے لیے مستحسن یہی ہے کہ جو واقعہ پیش نہیں آیا اس کے بارے میں فتویٰ دینے سے گریز کرے۔ اسی طرح مستفتی کے لیے بھی مفید یہ ہے کہ انھی امور کے بارے میں سوال کرے جن کی ضرورت ہو اور جو عملاً واقع ہو چکے ہوں۔ اس کے علاوہ جو مسائل ابھی درپیش نہیں ہیں تو ان کو چھوڑ دے۔

۱۸۶- دوسرا قول یہ ہے کہ اس مسئلے کے بارے میں سوال کرنا مکروہ نہیں ہے جو ابھی واقع نہ ہوا ہو، مگر شرط یہ ہے کہ سائل کا مقصد وقت سے پہلے حکم معلوم کرنا ہو اور اس کے واقع ہونے کا احتمال ہو۔ ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں کوئی ضرر نہیں ہے، البتہ اس میں یہ احتیاط ہے کہ جو واقعہ پیش آنے والا ہے اس کا حل پہلے سے معلوم ہونا چاہیے۔ کیوں کہ بعض اوقات ایک مسئلہ پیش آتا ہے اور یہ موقع ایسا نہیں ہوتا کہ کسی سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے۔ اگر کوئی آدمی واقعہ رونما ہونے سے پہلے اس کا حکم معلوم کرنے کے لیے پریشان ہو تو اس کی یہ پریشانی برمحل ہوگی۔ اس صورت میں مفتی کے لیے ضروری ہوگا کہ اس کا جواب دے۔ ان میں سے ہر ایک کا کام اچھا ہے، برا کوئی نہیں ہے۔ سائل کا کام اس وجہ سے اچھا ہے کہ اس نے وقت سے پہلے اپنے مسئلے کا حکم معلوم کر لیا اور مفتی کا کام اس لیے اچھا ہے کہ اس نے ایک پیاسے کی علمی پیاس بجھائی۔ اس قول کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض علما مسائل کا تصور کرتے ہیں، واقعات کا مفروضہ قائم کر لیتے ہیں اور ان کا جواب دیتے ہیں۔ پھر ان احکام کو مدون کرتے ہیں۔ تاکہ جن لوگوں کو یہ واقعات

پیش آئیں گے وہ احکام کو جان سکیں۔

'اہل' مفتی سے استفتاء

۱۸۷- چونکہ ایک مسلمان کے لیے استفتاء کرنا واجب یا کم از کم جائز ہے لہٰذا اس کو چاہیے کہ ایسے آدمی سے اپنے مسئلے کے بارے میں سوال کرے جس میں اِفتاء کی صلاحیت ہو۔ اس لیے کہ اس کے استفتاء کا تعلق دین کے ساتھ ہے، چنانچہ اس کو چاہیے کہ اپنے دین کے بارے میں احتیاط سے کام لے اور اسی شخص سے سوال کرے جو اِفتاء کا اہل ہو۔ یہ ایک اہم سوال ہے کہ ایک عام آدمی کیسے معلوم کرے کہ کون ہے، جس سے یہ سوال کرتا ہے۔ اس کے بارے میں علما فرماتے ہیں کہ اس کا علم اسے دوسروں سے پوچھنے کی صورت میں ہوگا، یا کسی با اعتماد شخص نے اس کو بتایا ہوگا، یا پھر یہ کہ اس مفتی کی لوگوں کے درمیان شہرت ہوگی۔ چنانچہ ایک عام آدمی انھی میں سے کسی ذریعے کو استعمال کرتے ہوئے مفتی کی اہلیت معلوم کرے۔

۱۸۸- اگر کوئی شخص اپنے شہر میں کوئی مفتی نہیں پاتا تو اسے چاہیے کہ جہاں مفتی موجود ہے وہاں کے لیے سفر کرے۔ سلف صالحین کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب ان کو کسی مسئلے میں سوال کرنے کی ضرورت پڑتی اور کوئی ایسا آدمی نہ ملتا جو ان کے سوال کا جواب دے سکے تو وہ اس کے لیے سفر اختیار کرتے تھے اور ان کو جہاں بھی اس مسئلے کا عالم ملتا اس کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔

'اہل تر' سے استفتاء

۱۸۹- جب مستفتی پر یہ بات واجب ہے کہ وہ استفتاء کے لیے اہل مفتی کو تلاش کرے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شہر میں کئی مفتی حضرات موجود ہیں تو کیا وہ ان میں سے اہل تر کو تلاش کرے گا؟ اس مسئلے میں علما کے دو اقوال ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اس پر اہل تر مفتی کی تلاش واجب نہیں ہے۔ جب ان میں سے ہر ایک اِفتاء کا اہل ہے تو ان میں سے جس سے چاہے سوال کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام آدمی کو یہ جاننے کی قدرت نہیں ہوتی کہ ان میں اِفتاء کے لیے اہل تر کون ہے، نہ وہ یہی کر سکتا ہے کہ مختلف مفتیوں کے درمیان موازنہ کرے اور ان کے علمی مقام و مرتبہ کا صحیح اندازہ لگائے۔ اس لیے عام آدمی کو اس بات کا مکلف کرنا اس کے لیے ایک

ناقابل برداشت بوجھ ثابت ہوگا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مستفتی پر اہل تر مفتی کی تلاش واجب ہے اور اسے چاہیے کہ اہل تر مفتی ہی سے جا کر سوال کرے۔ یہ کوئی ناقابل برداشت بوجھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ کسی سے پوچھ کر آسانی کے ساتھ معلوم کرسکتا ہے کہ اہل تر مفتی کون ہے۔ کسی بااعتماد شخص کے بتانے سے وہ یہ معلوم کرسکتا ہے یا لوگوں میں کسی مفتی کی شہرت اور اس کے نمایاں مقام کے ذریعے وہ یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ اس حد تک معلوم کرنا کسی کے بس سے باہر نہیں ہے۔ یہ چیز اس کی قدرت میں بھی ہے اور اس سے مطلوب بھی۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ اہل تر مفتی تک نہ پہنچ سکے تو اس پر کوئی ملامت اور گرفت نہیں ہے۔

۱۹۰- میرے نزدیک ان میں سے پہلا قول زیادہ وزنی ہے۔ اس لیے کہ سلف صالحین مثلاً صحابہ وتابعین کسی مستفتی پر یہ بات لازم نہیں کرتے تھے کہ وہ اہل تر مفتی کو تلاش کریں اور اسی سے فتویٰ مانگیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کبھی افضل کو چھوڑ کر فاضل سے بھی استفتاء کیا جاسکتا ہے۔[1]

'اہل تر' کون ہے!

۱۹۱- جب ہم نے کہا کہ 'اہل تر' کی تلاش واجب ہے، جیسا کہ علما کے پہلے قول سے معلوم ہوا[2]، یا یہ کہ 'اہل تر' کی تلاش مستحب ہے، جیسا کہ ہم نے اپنی ترجیح میں کہا، تو سوال یہ ہے کہ اِفتاء کے لیے اہل تر شخص کون ہے؟ اس سلسلے میں علما کے اقوال سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو زیادہ عالم اور زیادہ پرہیزگار ہو وہی اِفتاء کا زیادہ اہل ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ایک مستفتی کو دو مفتی ملیں، جن میں ایک زیادہ عالم اور دوسرا زیادہ پرہیزگار ہو تو پھر کیا کرے؟ اس میں علماء کے دو اقوال ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ جو زیادہ عالم ہے اس سے سوال کرے۔ اس لیے کہ وہ اِفتاء کا زیادہ اہل ہے۔ چنانچہ

۱- مؤلف نے استفتاء کے لیے 'اہل تر' کی تلاش کے واجب نہ ہونے کو ترجیح دی ہے، مگر 'اہل تر' کی تلاش کے مستحب ہونے کے وہ بھی قائل ہیں، جیسا کہ آگے کی عبارت میں وہ صراحت کرتے ہیں۔ (مترجم)

۲- علما کا پہلا قول 'اہل تر' کی تلاش کے واجب نہ ہونے پر مبنی ہے۔ اس کے وجوب پر دوسرا قول مشتمل ہے۔ یہاں کاتب، یا مؤلف کا تسامح معلوم ہوتا ہے۔ (مترجم)

اس کو چاہیے کہ اسی سے استفتاء کرے، اس لیے کہ اِفتاء کی بنیاد علم پر ہے، اور جب وہ علم میں بڑھ کر ہے تو وہی فتویٰ دینے کا زیادہ مستحق اور زیادہ اہل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جو زیادہ پرہیز گار ہے وہی زیادہ اہل ہے۔ چنانچہ اس کو چاہیے کہ اسی سے جا کر استفتاء کرے۔ اس قول کے قائلین نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ. (البقرة ۲:۲۸۲) اللہ سے ڈرو، وہ تمھیں تعلیم دیتا ہے۔

ان کا استدلال سلف کے اس قول سے بھی ہے کہ إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَهُ. یہ علم دراصل دین ہے، لہٰذا تم دیکھو کہ اسے کس سے حاصل کر رہے ہو۔

۱۹۲- میرے نزدیک زیادہ وزنی قول دوسرا ہے، یعنی یہ کہ جو شخص زیادہ پرہیز گار ہو اس سے استفتاء اولیٰ ہے۔ اس لیے کہ اس کے پاس جو علم ہے وہ اِفتاء کے لیے کافی ہے۔ دوسری طرف اس کا تقویٰ اسے فتویٰ دینے میں جلد بازی اور اس میں تساہل کرنے سے روکے گا اور اسے چھپی ہوئی معمولی خواہشات میں پھسل جانے سے بچائے گا۔ اسی طرح اس کا تقویٰ اسے اس بات پر بھی آمادہ کرے گا کہ وہ درست حکم معلوم کرنے کے لیے زیادہ تحقیق کرے۔ اس گہری تحقیق اور اخلاص نیت کی بنا پر اس کے فتویٰ میں درست ہونے کا احتمال زیادہ ہوگا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے دور میں اِفتاء کا زیادہ اہل وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو۔ چنانچہ اس صورت میں، جس حد تک ممکن ہو، اسی سے استفتاء کرنا ضروری قرار پائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام لوگوں میں پرہیز گاری کا فقدان ہے، بلکہ اکثر علما بھی اس سرمایے سے عاری ہیں۔ معلوم ہوا کہ احتیاط کی بات، جو دین میں مطلوب بھی ہے، یہی ہے کہ مستفتی اسی مفتی سے استفتاء کرے جو زیادہ متقی ہو، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں اِفتاء کے لیے مطلوبہ علم موجود ہو۔ اسے چاہیے کہ اس بڑے عالم کو چھوڑ دے جس میں پرہیز گاری نہیں ہے، یا اس قدر تقویٰ ہے جو منصب اِفتاء کے لیے مناسب نہیں ہے۔

ایک سے زائد مفتیوں سے استفتاء

۱۹۳- اگر مستفتی کا دل ایک مفتی کے جواب سے مطمئن نہیں ہوتا تو پھر وہ کیا کرے؟ علما کہتے ہیں کہ اس کے لیے دوسرے مفتی سے استفتاء کرنا جائز ہے۔ مگر اگلا سوال یہ ہے کہ جب اس کے لیے مختلف مقامات سے مختلف فتویٰ موصول ہو تو پھر کیا کرے گا؟ اس مسئلے میں کئی اقوال ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ مستفتی کو چاہیے کہ اس مفتی کے قول پر عمل کرے جو اس کو ممانعت کا فتویٰ دے رہا ہے۔اس لیے کہ اس میں احتیاط زیادہ ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لیے جو قول آسان ہو اسی کو اپنائے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَايُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ. (البقرة ۲:۱۸۵) اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے، اور وہ تم پر سختی نہیں چاہتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْخَذَ رُخَصُهُ، كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْخَذَ عَزَائِمُهُ. اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی رخصتوں کو اسی طرح لیا جائے جیسا کہ وہ یہ بات پسند کرتا ہے کہ اس کے پرعزیمت احکام کو لیا جائے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مستفتی کو چاہیے کہ ایسے مفتی کو تلاش کرے جو زیادہ علم اور زیادہ پرہیزگاری والا ہو، اسی سے استفتاء کرے اور اسی کے فتوے پر عمل کرے۔اگر اِس کو ایسا مفتی نہ ملے اور اس کو دو مفتی ملیں مگر ان میں سے ایک صرف علم میں بڑھ کر ہے اور اس میں پرہیزگاری نہیں، یا کم ہے جبکہ دوسرے میں پرہیزگاری زیادہ ہے مگر اس کے پاس علم کم ہے، تو چاہیے کہ اسی پرہیزگار سے استفتاء کرے اور اسی کے فتوے پر عمل کرے۔اور بعض کہتے ہیں کہ اس صورت میں زیادہ علم والے سے استفتاء کر کے اسی کی بات پر عمل کرے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ اس مفتی کے فتوے پر عمل کرے جس کا فتویٰ دوسروں کے موافق ہو، اور دوسروں کے اقوال سے مؤید۔یہ گویا کہ دلائل کی کثرت ہے، اور غالب گمان ہوتا ہے کہ انھی اکثریت والوں کا قول راجح ہوگا۔

پانچواں قول یہ ہے کہ وہ ان میں انتخاب کرے، اور جس کا قول چاہے قبول کر لے۔اس لیے کہ سارے اِفتاء کے اہل ہیں۔

۱۹۴-میرے نزدیک اس مسئلے میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ پہلے کچھ تفصیل معلوم کی جائے۔اگر مستفتی نے زیادہ عالم اور زیادہ تقویٰ دار شخص سے استفتاء کیا ہے تو اس پر لازم ہوگا کہ اس کی بات کو قبول کرے اور اس

بات کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا کہ وہ اس سے مطمئن ہے یا نہیں۔ نیز اب اس کو یہ بھی حق نہیں ہوگا کہ وہ کسی اور سے سوال کرے۔ ہاں اگر اس نے زیادہ بڑے عالم اور زیادہ متقی سے سوال نہیں کیا تو پھر اس کو چاہیے کہ ایسے ہی مفتی کو تلاش کرے، اسی سے جا کر سوال کرے اور پھر اس کی رائے پر عمل کرے۔ اگر اس کو زیادہ علم اور زیادہ تقویٰ والا مفتی نہ ملے، بلکہ صرف پرہیزگار ملے تو اس کی بات کو قبول کرے۔ اگر مستفتی کی نظر میں سارے مفتی علم و تقویٰ کے لحاظ سے برابر ہوں اور اس نے جس سے سوال کیا اس کے جواب سے اطمینان نہیں ہوا، تب اسے دوسروں سے استفتاء کرنے کی اجازت ہوگی۔ پھر اگر وہ سب ایک ہی فتویٰ دیں تو ان کی بات پر عمل کرے، اور اگر ان میں اختلاف ہو تو جس کی بات پر اس کا زیادہ اطمینان ہو اسی کی بات کو قبول کرے، خواہ اتفاق کرنے والے زیادہ ہوں یا کم۔ اس لیے کہ فتویٰ کے باب میں محض کثرت سے کسی بات میں وزن پیدا نہیں ہوتا۔ فتویٰ کے میدان میں وزن دلیل کا ہوتا ہے۔ اگر کوئی دلیل صریح نہ ہو جو ترجیح کے لیے بنیاد بن سکے تو پھر پہلی ترجیح اس مفتی کی بات کی ہوگی جو زیادہ عالم اور زیادہ متقی ہو پھر اس کی جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر مستفتی کے اطمینان کو ترجیح دی جائے گی جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

اِسْتَفْتِ نَفْسَكَ وَإِنْ أَفْتَوْكَ وَأَفْتَوْكَ وَأَفْتَوْكَ. اپنے نفس کے مفتی سے پوچھو، خواہ دوسرے مفتی تمھیں ہزار فتویٰ دیں۔

اور: دَعْ مَايَرِيْبُكَ إِلَى مَا لَايَرِيْبُكَ. شک و تردد والی چیزوں کو چھوڑ دو غیر مشکوک اشیا کے لیے۔

دوبارہ استفتاء

۱۹۵- جب ایک عام آدمی کسی واقعے کے بارے میں مفتی سے پوچھے اور پھر اسے وہی واقعہ دوبارہ پیش آئے تو کیا اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں دوبارہ استفتاء کرے، یا وہ پہلے والے فتوے پر عمل کر سکتا ہے؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ دوبارہ استفتاء کرنا واجب ہے، اس لیے کہ ممکن ہے مفتی کا اجتہاد بدل گیا ہو، اور بعض کے نزدیک واجب نہیں ہے، اس لیے کہ مستفتی کو پہلی مرتبہ سوال کرنے پر حکم معلوم ہو چکا ہے، لہٰذا دوبارہ استفتاء کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۹۶- میرا اپنا رجحان اس طرف ہے کہ یہاں بھی کچھ تفصیل پیش نظر رکھنی چاہیے۔ اگر مفتی، جس سے اس

نے پوچھا ہے، زیادہ علم وتقویٰ والا ہو تو اس صورت میں دوبارہ استفتاء کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر ایسا نہ ہو، بلکہ جب دوسری مرتبہ مسئلہ پیش آیا تو اس نے پہلے والے مفتی سے زیادہ عالم مفتی کو پایا تو اسے چاہیے کہ اسی سے استفتاء کرے۔ اس لیے کہ اس کے اجتہاد میں درست ہونے کا احتمال زیادہ ہے۔ جب ایسا مفتی مل ہی گیا ہے تو ضروری ہے کہ اس سے استفتاء کرے۔ لیکن اگر زیادہ علم وتقویٰ والے مفتی کو نہیں پایا، تو پھر بھی بہتر یہ ہے کہ دوبارہ استفتاء کرے، بشرطیکہ کہ مستفتی کے لیے یہ ممکن ہو۔ اس لیے کہ مجتہد کا اجتہاد کبھی بدل جاتا ہے، جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے سامنے ایسے دلائل آ جاتے ہیں جو پہلے اس کے علم میں نہیں ہوتے۔ اگر دوسرا فتویٰ بھی پہلے والے کی طرح نکلے تو اسی پر عمل کرے اور اگر جواب مختلف ہو تو ایک بار پھر کسی اور مفتی سے انھی اصولوں کے مطابق سوال کرے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں اور وہی فتویٰ قبول کرے جس سے اس کا دل مطمئن ہو۔

استفتاء کے الفاظ

۱۹۷- مستفتی جب کسی مسئلے یا کسی واقعے کے حکم کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ اس کا شرعی حکم معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اس بنا پر وہ ان الفاظ کے ساتھ استفتاء کرے: ''اس مسئلے میں اسلامی شریعت کا حکم کیا ہے؟'' یا یہ کہے: ''اس مسئلے میں اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہے؟'' یا اس مفہوم کے دوسرے الفاظ۔

کسی خاص مذہب کی بنیاد پر استفتاء

۱۹۸- بہت سے علما نے یہ سوال بھی اُٹھایا ہے کہ کیا مستفتی پر واجب ہے کہ اس کا استفتاء کسی خاص مذہب کی بنیاد پر ہو، یا اس کے لیے کسی بھی مذہب کی بنیاد پر استفتاء کرنا جائز ہے؟ اس سوال کے جواب میں علما کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ ایک اور مسئلے پر مبنی ہے۔ وہ یہ کہ کیا عام آدمی کے **لیے ضروری** ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاص مذہب میں مقید کرے، اور صورت خواہ عزیمت کی ہو یا رخصت **کی، اسی** مذہب پر عمل کرے، اور اسی کی بنیاد پر فتویٰ مانگے، یا یہ ساری باتیں اس پر واجب نہیں ہیں۔ جب ایک شخص کسی خاص مذہب کی طرف منسوب ہو، اسی کا التزام کرے اور اسی کی بنیاد پر فتویٰ مانگے **تو اس کے استفتاء** کی کیفیت میں ان چیزوں کی کیا قدر و قیمت ہوگی؟

۱۹۹- اس کے بارے میں امام احمد بن حمدان حرانی حنبلی نے بحث کی ہے۔ انھوں نے اس کے حوالے

سے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام آدمی یا تو کسی مذہب کے ساتھ منسوب ہوگا یا نہیں ہوگا، اور ہر حالت کا اپنا حکم ہے۔

۱- پہلی حالت

پہلی حالت یہ ہے کہ وہ کسی مذہب کی طرف منسوب ہے۔ اس حالت میں علما کے دو اقوال ہیں:

ایک یہ کہ اس کا کسی مذہب کی طرف منسوب ہونا اس کو استفتاء کے لیے اسی مذہب کا پابند نہیں بناتا۔ اس لیے کہ مذاہب تو ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جو دلائل کی معرفت رکھتے ہیں، اور عام آدمی کو دلائل کی معرفت نہیں ہوتی۔ اس بنا پر اس کے لیے جائز ہے کہ جس مفتی سے چاہے فتویٰ حاصل کرے، اور مفتی چاہے جس مذہب پر بھی اس کو فتویٰ دے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ عام آدمی کا کسی مذہب کی طرف منسوب ہونا اس کے حق میں ایک معتبر نسبت ہے، اور اسے اس کی پابندی کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اس کا عقیدہ ہے کہ وہ جس مذہب کے ساتھ نسبت رکھتا ہے وہ حق ہے۔ چنانچہ اس کو چاہیے کہ وہ جس مذہب کا عقیدہ رکھتا ہے اس کی وفاداری کرے اور اس کی پابندی کو ضروری سمجھے۔ اس پر فقہاء نے یہ نتیجہ مرتب کیا ہے کہ وہ ایسے ہی مفتی سے استفتاء کرے گا جو اس کو اس کے مذہب کے مطابق فتویٰ دے۔

۲- دوسری حالت

دوسری حالت یہ ہے کہ آدمی کسی خاص مذہب کے ساتھ تعلق رکھتا ہو۔ اس حالت میں بھی علما کے دو اقوال ہیں:

ایک یہ کہ اس پر کسی مذہب اک پیروکار بننا لازم نہیں ہے اور نتیجتاً اس پر یہ بھی لازم نہیں ہے کہ وہ کسی خاص مذہب کے مطابق فتویٰ طلب کرے۔ چنانچہ اس کے لیے جائز ہوگا کہ کسی بھی عالم سے استفتاء کرے، اور مفتی کے فتویٰ پر عمل کرے، خواہ اس نے کسی بھی مذہب کے مطابق فتویٰ دیا ہو۔ اس قول کی دلیل یہ ہے سلف صالحین نے عام آدمی پر یہ بات لازم نہیں کی ہے کہ وہ کسی خاص عالم کی تقلید کرے اور دوسروں کو چھوڑ کر اسی سے استفتاء کرے۔ بلکہ سلف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ عام آدمی کے لیے کسی بھی عالم سے فتویٰ لینے کو

مباح سمجھتے تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر کسی خاص مذہب کا پیروکار بننا لازم ہے، چنانچہ وہ اس مذہب کے آسان اور مشکل سارے احکام کو قبول کرے گا اور اسی کے مطابق فتویٰ حاصل کرے گا۔ اس قول کے قائلین نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ اگر عام آدمی کے لیے جائز ہوتا کہ وہ جس مذہب کی چاہے پیروی کرے تو یہ اس بات کا ذریعہ بنتا کہ آدمی اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہوئے تمام مذاہب کے آسان احکام کو قبول کرے اور مشکل احکام سے منہ موڑے۔ یہ تو ایک ایسا مسلک ہوگا جو شرعی احکام کے مٹ جانے اور ان کے ساتھ کھیلنے کا ذریعہ بنے گا۔ اس بے لگامی سے نکلنے کا طریقہ یہی ہے کہ عام آدمی پر کسی خاص مذہب کی طرف نسبت اور اسی سے فتویٰ حاصل کرنا لازم کر دیا جائے۔

پہلے قول کے قائلین نے جو دلیل پیش کی ہے اس کے بارے میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ سلف صالحین کے دور میں چونکہ یہ مذاہب رائج نہیں ہوئے تھے، نہ ان کے مسائل کو تحریر میں لایا گیا تھا اور نہ وہ معروف ہی ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کسی خاص مذہب کے ساتھ عدم تعلق کو مباح قرار دیا۔ پھر اس قول کے قائلین نے کسی مذہب کے ساتھ تعلق کی ضرورت بیان کی ہے، جس کو وہ اپنے لیے غور وفکر کے ذریعے یا کسی سے پوچھ کر چن لیتا ہے۔ یہ بات معلوم کرنا یا تو کسی سے پوچھ کر ممکن ہوگا، یا کسی مذہب کی شہرت اور اس کی اشاعت کی بنا پر۔ بہرحال جب ایک شخص کسی خاص مذہب کی طرف منسوب ہے تو اسے چاہیے کہ اسی کے مطابق فتویٰ مانگے، نہ کہ کسی اور مذہب کے مطابق۔

راجح قول

۲۰۰- اس مسئلے میں بھی میں جس قول کو ترجیح دیتا ہوں اس میں کچھ تفصیل ہے، مگر اسے چند مقدمات کے بعد بیان کیا جائے گا۔ وہ مقدمات یہ ہیں:

أ- ہر مسلمان پر یہ بات واجب ہے کہ وہ اپنے متعلقہ امور میں اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم کرے، جیسا کہ کتاب وسنت میں مذکور ہے یا ان دونوں سے درست اجتہاد اور استنباط کے ذریعے معلوم کیا جا چکا ہے، یا پھر وہ ان مصادر سے معلوم ہوا ہے جن کی طرف کتاب وسنت کی نصوص نے اشارے کیے ہیں۔

ب- یہ اصول ہے کہ ایک مسلمان جب تک اجتہاد پر قادر ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم کرے، قرآن وسنت کے معانی میں اور استنباط واجتہاد کے ان اصولوں میں غور وفکر کے ذریعے، جن پر کتاب وسنت کی نصوص دلالت کرتی ہیں۔ اس طرح اس کی معرفتِ احکام دلیل وبرہان پر مبنی ہوگی اور یہ وہی معرفت ہے جس کا شرع متین حکم دیتا ہے۔

ج- جو شخص تحقیق واجتہاد پر قادر ہو اس کے لیے اجازت ہے کہ وہ اپنے استنباط واجتہاد میں پچھلے مجتہدین کے طریق اجتہاد کو اپنائے، بشرطیکہ وہ طریق اجتہاد جائز ہو اور دلیل وبرہان کی رو سے اس کی پیروی کرنا مشروع ہو۔ اگر چہ ان طرق اور مناہج استنباط میں قوت کے لحاظ سے، حق کے قریب تر ہونے کے لحاظ سے اور قابل اتباع ہونے کے لحاظ سے باہمی فرق ضرور ہوتا ہے۔

د- اگر ایک مسلمان اجتہاد سے عاجز ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اہل علم کی مدد حاصل کرے تاکہ وہ اسے شریعت کے احکام کے بارے میں راہنمائی فراہم کریں۔ یہ آدمی ان باتوں کی پیروی کرے گا جو علما اسے بتاتے ہیں۔ گویا کہ وہ اسے جو حکم دے رہے ہیں وہ شریعت کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم نہ رکھنے والے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اہل علم سے سوال کریں۔ سوال کا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اہل علم کے جواب کو قبول کریں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو سوال کا کوئی فائدہ اور اس کے کوئی معنی نہ رہے۔ شارع حکیم نے اپنے آپ کو اس چیز سے بالاتر کیا ہے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔

ہ- جو شخص اجتہاد سے عاجز ہوتا ہے اس کے لیے یہ بھی اجازت ہے کہ وہ بااعتماد اور ایسے علماٰ کی کتابوں سے استفادہ کرے، جن کی دینی امامت مسلّم ہوتی ہے۔ جیسے مشہور مذاہب کے اہم علماء۔ چنانچہ یہ شخص ان کتابوں سے اپنا مسئلہ مستنبط کرے گا اس کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کرے گا اور ان پر یہ سمجھ کر عمل کرے گا کہ یہ شریعت کے احکام ہیں، جن تک ان مذاہب کے اصحاب کی رسائی ہوئی ہے، جو فقہا، علما اور احکامِ شریعت کی معرفت کے اہل تھے۔

و- جب ایک مسلمان ان مذاہب کے احکام کی فقاہت حاصل کر لیتا ہے اور ان میں سے کسی کی طرف اس کی نسبت ہو جاتی ہے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شافعی یا حنفی ہے۔ اس نسبت کا مطلب ہوتا ہے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کی فقہ کا سمجھ بوجھ رکھنا اور اس کو اپنے لیے شرعی احکام کی معرفت میں دلیل

اور راہنما بنانا۔ چنانچہ اس کا مذہب اس کے حق میں شرعی احکام سے پردہ اٹھانے والا ہے، نہ کہ شریعت کے ساتھ متصادم۔ اسی بنیاد پر وہ اس مذہب کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

ز- یہی وجہ ہے کہ جب اس منتسب کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے کہ اس کا مذہب کسی خاص مسئلے میں دلیل کے لحاظ سے حق کے موافق نہیں ہے اور اس مسئلے میں حق دوسرے مذہب میں ہے، اور پھر اس کے نتیجے میں وہ اس مسئلے میں اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اس عمل میں گناہ گار نہیں بلکہ نیکوکار شمار ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام اصحابِ مذاہب کے بارے میں منقول ہے کہ إِذَا صَحَّ الْحَدِيْثُ فَهُوَ مَذْهَبِيْ وَاضْرِبُوْا بِقَوْلِيْ عَرْضَ الْحَائِطِ. جب حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے اور میری بات کو دیوار پر دے مارو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث ایک سچی بات ہوتی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا حکم بیان ہوتا ہے، اس لیے اس کی پیروی ضروری ہوگی۔ پھر ان کے اس قول پر ہر وہ بات قیاس کی جاسکتی ہے جس کی صحت دلیل و برہان سے ثابت ہو چکی ہو۔ چنانچہ اسی بات کی پیروی لازم ہوگی اور جو اس کے خلاف ہوگا اس کو چھوڑنا پڑے گا۔

ح- گذشتہ بحث کی بنیاد پر مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی خاص مذہب کے ساتھ تعلق رکھے، اسی کو وہ پڑھے، اسی میں فقاہت حاصل کرے، اس اعتبار سے کہ وہ اسی کے بارے میں حق وصواب کا گمان کرتا ہے، اور اسی کے مطابق فتویٰ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح عام آدمی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی خاص مذہب کے ساتھ منسوب نہ ہو۔ اس کے ذمے جو کام ہے وہ تو بس یہی ہے کہ اپنے متعلق لازمی شرعی احکام اہل علم سے پوچھ کر سیکھے، خواہ پہلے ہی سے ہو یا اس وقت، جب کہ اس کو کوئی حادثہ پیش آئے۔ اسی طرح عام آدمی جو کسی مذہب سے منسوب نہ ہو، اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ کسی مذہب کی قید لگائے بغیر استفتاء کرے۔ اگر اس نے کسی خاص مذہب کے مطابق استفتاء کر لیا تو اس کے استفتاء کو اس معنی میں درست سمجھا جاسکتا ہے کہ اس عام آدمی کے خیال میں یہ مذہب دوسرے مذاہب سے بہتر ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی مذہب کی طرف منسوب نہیں ہے اس کے لیے جائز ہے کہ کسی قید کے بغیر استفتاء کرے۔ اس کے علاوہ منتسب بھی کسی مذہب کی قید لگائے بغیر استفتاء کر سکتا ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ وہ شریعت کا حکم معلوم کرنا چاہتا ہے، مگر اس طرح جیسا کہ اُسے یہ مفتی بتائے گا، جو علم میں اس سے بڑھ کر ہے، اور اسی بنا پر وہ اس سے فتویٰ لینے کے لیے حاضر ہوا ہے۔

ط - خلاصہ یہ ہے کہ ان تمام صورتوں میں ایک عام آدمی کے لیے، جو مرتبۂ اجتہاد کو نہ پہنچا ہو، گنجایش موجود ہے کہ کسی خاص مذہب کی قید کے بغیر استفتاء کرے۔ اس کا کام یہ ہوگا کہ وہ شریعت کے حکم کے بارے میں سوال کرے گا، خواہ یہ شخص کسی خاص مذہب کے ساتھ نسبت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح خواہ اس نے کسی خاص مذہب میں فقاہت حاصل کی ہو یا نہ کی ہو۔ چنانچہ یہ شخص مفتی سے کہے گا: اس مسئلے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟ یہ الفاظ درست بھی ہیں اور غلطی سے پاک بھی۔ رہا اس شخص کے لیے کسی خاص مذہب کے مطابق سوال کرنا تو اس کا آخری مرجع بھی یہی ہے کہ اگر اس کی وہی توجیہ کی جائے جو ہم نے کی ہے تو یہ جائز اور قابل قبول ہوگا۔

مفتی سے دلیل کا مطالبہ

۲۰۱ - کیا مستفتی کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مفتی سے اس کے فتوے کی دلیل مانگے؟ اس سلسلے میں بعض علما کہتے ہیں کہ اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ ہاں وہ یہ کر سکتا ہے کہ اس کی دلیل کسی اور مجلس میں معلوم کرلے۔ ہمارے خیال میں دلیل کے بارے میں سوال کو دوسری مجلس کے ساتھ مشروط کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہماری رائے میں زیادہ درست یہ ہے کہ عام آدمی کو مفتی سے دلیل کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔ اس لیے کہ مفتی اس کو جو بات کہتا ہے وہ دین کا حصہ ہے جس کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے آگے جھکتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ اس بنا پر اس کو حق ہونا چاہیے کہ اس کا یقین حاصل کرلے، اور یقین حاصل کرنے کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ مفتی سے دلیل کا مطالبہ کرے۔ جب مفتی اس کو کہتا ہے کہ میرے فتوے کی دلیل حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں اور مفہوم یہ ہے، تو مستفتی اس پر مطمئن ہو جائے۔ اس لیے کہ یہ بات مفتی کے حق میں فرض ہے کہ حدیث کی صحت معلوم کرے اور اس کے مطابق فتویٰ دے۔ لیکن اگر مفتی اس کو کہتا ہے کہ اس فتوے کی دلیل میری اپنی رائے اور میرا اپنا اجتہاد ہے تو اس حالت میں اگر مستفتی کو مفتی کے جواب سے اطمینان نہیں ہوا تو اسے حق ہے کہ کسی اور سے فتویٰ مانگے۔ اسی طرح مستفتی کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ اسی مفتی کے جواب کو قبول کرے اور کسی دوسرے مفتی سے نہ پوچھے، یہ سمجھ کر کہ جس مفتی نے فتویٰ دیا ہے وہ صاحب علم بھی ہے اور فتویٰ بھی دیتا رہتا ہے، اور اس کے اجتہاد کے بارے میں درست اور قابل قبول ہونے کا گمان غالب ہے۔ ان ساری باتوں کے ساتھ ساتھ مستفتی کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ اپنے مفتی سے دلیل کا مطالبہ نہ کرے۔ اس میں وہ مفتی کی ظاہری حالت پر اکتفا کرے اور یہ سوچے کہ وہ جو بھی فتویٰ دیتا ہے، علم اور دلیل کے ساتھ دیتا ہے۔

مستفتی کے لیے آداب

۲۰۲-علما کہتے ہیں: مستفتی کو چاہیے کہ وہ فتویٰ مانگتے ہوئے اس کے آداب کو ملحوظ رکھے۔ علما نے مستفتی کے بعض آداب بھی بیان کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں گفتگو کے جو آداب ہیں، شاگرد اپنے استاذ سے جس طرح گفتگو کرتا ہے اور ہر مسلمان کو اہل علم کے ساتھ جس طرح کی گفتگو کرنی چاہیے، مستفتی کو ان سب کی پابندی کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ وہ مسلمان ہے اور اس پر لازم ہے کہ گفتگو کے اسلامی آداب کو ملحوظ رکھے۔ اسی طرح وہ طالب علم کی طرح ہے، چنانچہ اسے چاہیے کہ اسلام میں طالب علم کے لیے جو آداب مقرر ہیں ان کی پابندی کرے، اسی طرح وہ اہل علم سے سوال کرتا ہے، اس لیے اس کو چاہیے کہ اسلام میں علما کے ساتھ گفتگو کے جو آداب ہیں ان کا خیال رکھے۔ اس بنا پر مستفتی پر واجب ہے کہ وہ مفتی کے سامنے تواضع اور احترام کو ملحوظ رکھے۔ چنانچہ وہ اس کے سامنے اپنی آواز اونچی نہ کرے، اس کے منہ پر ہاتھ سے اشارے نہ کرے، اس کے سامنے سخت لہجے میں بات نہ کرے۔ پہلے اس سے سوال کی اجازت مانگے، اس کے ساتھ بیٹھے اور سوال کے لیے مناسب وقت اور جگہ تلاش کرے۔ ایسے موقع پر اس سے سوال نہ پوچھے جب کہ وہ کسی اور کے ساتھ مصروف ہو۔ اس کے دروازے پر اس کے آرام کے وقت حاضر نہ ہو۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے مظاہر ادب ہیں جو مفتی کے احترام، اس کی توقیر اور سوال کے آداب میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ مظاہر اور آداب میں عرف وعادت کا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ عرف وعادت اگر شریعت کی تعلیمات سے متصادم نہ ہو تو اس کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔

۲۔ مفتی

مفتی میں درکار شرطیں

۲۰۳۔ مفتی وہ شخص ہوتا ہے جو فتویٰ دیتا ہے، اور فتویٰ دینا دراصل اللہ تعالیٰ کے حکم کے بارے میں بتانا ہے۔ اس لیے مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کا اہل ہو اور اہلیت کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ ان شرائط میں سے چند یہ ہیں کہ وہ مسلمان، بالغ، عاقل، فقیہ و مجتہد اور عادل [یعنی قابل اعتماد کردار کا مالک] ہو۔ اس سلسلے میں جو شرطیں مطلوب ہیں ان میں مرد ہونا، آزاد ہونا یا بولنا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ عورت بھی فتویٰ دے سکتی ہے، غلام بھی اور گونگا بھی۔ شرطوں کے اس اجمالی ذکر کے بعد بعض امور میں تھوڑی بہت تفصیل کی ضرورت ہے۔

۱۔ اسلام

۲۰۴۔ یہ شرط تو آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے۔ اس لیے کہ مفتی اللہ کے حکم کے بارے میں خبر دیتا ہے، اس کی شریعت لوگوں تک پہنچاتا ہے، اس کے احکام کو پیش آنے والے واقعات پر منطبق کرتا ہے اس لیے اس کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کی اس شریعت پر ایمان رکھنے والا ہو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم تک پہنچائی ہے۔

اسلام ہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر ایک شخص مسلم بنتا ہے یا کوئی مسلمان اپنی اس صفت کو گم کر دیتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی اسلام سے انکار کرے تو وہ مرتد بن جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں عقائد کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ یہ ہمارا موضوع بحث نہیں ہے۔ یہاں ہمارے لیے اس قدر کہنا کافی ہے کہ ایک مسلمان کی ظاہری نشانی یہ ہے کہ وہ عقیدتاً کلمۂ شہادت کا اقرار کرے۔ یعنی وہ زبان سے یہ کہے کہ **اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ**

أَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللهِ. اور اپنے قول وفعل سے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا مظاہرہ کرے۔ چنانچہ وہ ظاہری عبادات، جیسے نماز، روزہ کا اہتمام کرے، اگر صاحب نصاب ہو جائے تو زکوٰۃ ادا کرے اور حج کی استطاعت ہو تو حج ادا کرے۔ اس پر لازم ہوگا کہ اپنے دل کو اللہ کے سامنے مکمل انقیاد اور تسلیم کے ساتھ متوجہ کرے۔ چنانچہ اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات کے بارے میں نہ تو کوئی اعتراض ہو، نہ ناپسندیدگی اور نہ مزاحمت، خواہ کسی خبر کے معاملے میں ہو یا امر ونہی کے معاملے میں۔ اسی طرح ایک مسلمان کو چاہیے کہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو اسلام کی حقیقت اور کلمۂ شہادت سے متصادم ہو، خواہ عقائد میں ہو، یا اقوال میں یا افعال میں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو گناہ اور بدعت میں مبتلا ہو جائے گا، بلکہ بعض اوقات تو یہ چیز اس کو ارتداد کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ اور جب وہ مرتد بن جائے گا تو اس میں فتویٰ دینے کی صلاحیت نہ رہے گی۔ رہا بدعت اور گناہ کا معاملہ اس صورت میں جب کہ وہ ارتداد تک نہ پہنچائیں تو یہ دونوں چیزیں فتویٰ کے لیے اس کی اہلیت میں خرابی پیدا کر دیتی ہیں، بلکہ بعض اوقات اس سے اِفتاء کی اہلیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔

۲- بلوغ وعقل

۲۰۵- ضروری ہے کہ مفتی عقل مند ہو، تاکہ وہ احکام شریعت کو سمجھ سکے اور ان میں فقاہت حاصل کر سکے۔ عقل کا کم از کم معتبر درجہ یہ ہے کہ مفتی بالغ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مکلّف ہونے کی شرط بھی یہ ہے کہ مسلمان عاقل اور بالغ ہو۔ لہٰذا صرف بلوغ بھی کافی نہیں ہے، اگر اس کے ساتھ عقل نہ ہو اور صرف عقل بھی کافی نہیں ہے، اگر اس کے ساتھ بلوغ نہ ہو۔ اس لیے کہ بلوغ کے ساتھ یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ اس میں عقل کے اندر پختگی آتی ہے، اس وجہ سے مکلّف ہونے کو اسی کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ مکلّف ہونا اسی لیے تو ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر شریعت کا حکم سمجھنے کی صلاحیت ہو اور اِفتاء بھی لازمی طور پر احکام شریعت کی اچھی خاصی سمجھ کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے جس نے بلوغ سے پہلے کوئی فتویٰ دیا ہو یا اس مقام پر فائز ہوا ہو۔ ہمارا یہ قول اس بات سے ٹوٹ نہیں جاتا کہ نابالغ بچہ اپنے بلوغ سے پہلے بھی علم حدیث کا حصول کر سکتا ہے اور بعض علما کے نزدیک اسی دور میں اس سے روایت کرنا بھی جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم حدیث کا حصول اس بات پر مبنی ہے کہ آدمی سنی ہوئی حدیث کو حفظ اور ضبط کرنے پر قادر ہو اور روایت کرنا اس بات پر مبنی ہوتا ہے کہ وہ اپنی سنی ہوئی بات کو درست طریقے سے منتقل کرنے پر

قادر ہو۔ یہ قدرت اس بچے کے اندر بھی پیدا ہونا ممکن ہے جو ابھی بلوغ کی عمر سے کم ہو۔ رہا اِفتاء کا معاملہ، تو اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آدمی شریعت کے معانی سمجھنے اور ان کا فہم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔ یہ چیز عموماً اس بچے میں پیدا نہیں ہوسکتی جو ابھی بلوغ کی عمر تک بھی نہ پہنچا ہو۔

۳۔ عدالت

۲۰۶۔ مفتی کے لیے یہ بھی ایک شرط ہے کہ وہ عادل ہو۔ عدالت مسلمان میں پائی جانے والی ایک صفت کا نام ہے، جس کا تقاضا اور لازمہ یہ ہے کہ آدمی شریعت کے مطلوبہ امور انجام دے اور جن امور سے شریعت نے منع کیا ہے ان سے دور رہے، بلکہ وہ ان چیزوں کو بھی چھوڑ دے جو مردانگی میں خلل پیدا کرتی ہیں اور اس کو شکوک وشبہات کا نشانہ بنا دیتی ہیں۔ صاحب عدالت آدمی کا اخلاق وکردار علمائے حق کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ ہم نے عدل کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صاحبِ عدل آدمی گناہوں سے معصوم ہوگا، تب ہی اس میں عدالت آئے گی اور وہ عادل بنے گا۔ ہماری بات کا مطلب یہ ہے کہ ایک صاحب عدل مسلمان کی حالت میں حسن اور شریعت کی پابندی نمایاں ہو۔ چنانچہ وہ اگر گناہ کبیرہ بھی کرتا ہے تو نہ ہونے کے برابر، غلطی وخطا کے ساتھ، یا اپنی طبیعت انسانی سے مغلوب ہوکر۔ اسی طرح وہ گناہ صغیرہ پر بھی اصرار نہیں کرتا۔ یعنی اس کی مسلسل یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کا کردار سارا کا سارا عدالت کے تقاضوں کے مطابق ہو، اگر چہ بعض اوقات اور حالات میں ان تقاضوں سے انحراف بھی ہوجاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عادل شخص وہ ہے جس کی حالت یہ ہو کہ اس کے کردار میں حسن غالب ہو اور اس سے ایسی حرکات صادر نہ ہوں جو اس کی عدالت میں خرابی پیدا کرنے والی ہوں۔ اور اگر صادر بھی ہوں تو نہ ہونے کے برابر اور غفلت کی بنا پر، نہ کہ گناہ پر اصرار کرنے کے طرزِ عمل کے ساتھ۔

پھر جو چیزیں عدالت کی منافی ہیں وہ بھی برائی میں اور عدالت کے منافی ہونے کے اعتبار سے ایک درجے کی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض ایسی ہیں جو عدالت کو ساقط کر دیتی ہیں جب کہ بعض ایسی نہیں ہیں۔ ان میں سے جو چیزیں ساقط کردینے والی ہیں ان کی مثال اللہ اور اس کے رسول پر بغیر علم کے جھوٹ باندھنا ہے۔ اس کی صورت یا تو یہ ہوگی کہ وہ دین میں کوئی بدعت ایجاد کر دیتا ہے یا دینی احکام کی ایسی تاویلات کرتا ہے جن کا فساد اور بطلان ظاہر ہوتا ہے۔ یا اس کی مثال ظالموں کے ساتھ سودا بازی اور ان کے

لیے ان کی خواہشات کے مطابق فتوے جاری کرنا اور رشوت لینا وغیرہ ہے۔ جو امور عدالت کو ساقط نہیں کرتے ان کی مثال گناہ صغیرہ ہیں جن پر اصرار نہ کیا جائے۔

۴-اجتہاد

۲۰۷-علما کہتے ہیں کہ مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ فقیہ اور مجتہد ہو۔ مجتہد وہ ہے جس میں یہ اہلیت موجود ہو کہ وہ تفصیلی شرعی احکام کو ان کے معتبر دلائل سے تحقیق واستنباط کے ذریعے سمجھ سکے اور اس کے ساتھ وہ ان امور کا بھی احاطہ کرے جو اجتہاد کے لیے ضروری ہیں۔ اس اہلیت کے ثبوت کے لیے کثرت اجتہاد اور استخراج احکام کی شرط نہیں ہے۔ بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ اس میں یہ صلاحیت ہی موجود ہو۔ چنانچہ اس کو کثرت سے عمل میں لانا اور اس کو فعال رکھنا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے کہ مفتی میں جو بات دیکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت اپنی ان تمام صفات کے ساتھ موجود ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں یا نہیں۔ تحقیق اور استخراج احکام کی قدرت اور معتبر مصادر سے استدلال کے ذریعے ان کی معرفت ان صفات میں سے ہیں۔ اس اہلیت کے مالک کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شاعر، جس میں شعر کو نظم کرنے کی اہلیت موجود ہو تو وہ شاعر کہلاتا ہے، خواہ اس نے زیادہ اشعار نظم کیے ہوں یا کم۔

مجتہدین کی قسمیں

۲۰۸-علما نے مفتی کے لیے اجتہاد کی شرط کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے مجتہدین کو کئی اقسام میں تقسیم کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ ان میں سے کون اِفتاء کی صلاحیت رکھتا ہے اور کون نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجتہد کبھی مجتہد مطلق ہوتا ہے، کبھی کسی خاص مذہب میں اجتہاد کے درجے تک پہنچا ہوا، کبھی علم کے کسی خاص شعبے میں مجتہد اور کبھی کسی خاص مسئلے میں اجتہاد کا مقام پانے والا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی تعریف کی جائے اور بتایا جائے کہ ان میں سے کون فتویٰ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

i-مجتہد مطلق

۲۰۹-مجتہد مطلق کی تعریف کرتے ہوئے علما کہتے ہیں کہ یہ وہ شخص ہے ''جس نے فقہ، اصول فقہ اور مختلف مسائل میں ان کے دلائل کو حفظ کر کے سمجھا ہو۔ جب اس میں مکمل اہلیت موجود ہو جس کی بنا پر اس کے

لیے ممکن ہو کہ شریعت کے احکام کو دلیل کے ساتھ جان سکے اور انھیں جب چاہے، درپیش واقعات پر منطبق کر سکے۔ اگر اس میں یہ صلاحیت زیادہ ہو اور باقی شروط بھی موجود ہوں تو وہ اس صلاحیت کا مالک قرار پائے گا کہ وہ فتویٰ دے سکے اور دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کر سکے، ورنہ نہیں"۔

علما کہتے ہیں کہ اجتہادِ مطلق کا درجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو کتاب وسنت کی اور ان میں احکام سے متعلق واردنصوص کی اچھی معرفت حاصل ہو۔ اسی طرح اس کو چاہیے کہ امر و نہی کو جانتا ہو، اجمال اور تفصیل کا علم رکھتا ہو، محکم ومتشابہ، ناسخ ومنسوخ، عام وخاص، مطلق ومقید اور مستثنیٰ و مستثنیٰ منہ سے آگاہی رکھتا ہو۔ اسی طرح ضروری ہے کہ اس میں سنت کی بھی اچھی معرفت موجود ہو۔ تاکہ وہ اِن میں سے صحیح اور ضعیف کے درمیان فرق کر سکے، روایت کے درجات اور ان سے استدلال کے طریقے جان سکے۔ اس طرح کے اور دیگر امور جو قرآن وسنت میں مذکور شرعی احکام کی معرفت کے لیے لازمی اور ضروری ہیں۔

علما یہ بھی کہتے ہیں کہ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل کو جانتا ہو جن پر فقہا نے اجماع کیا ہے اور ان کو بھی جن میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس کو چاہیے کہ وہ قیاس کی شرطوں کو جانتا ہو، نیز وہ عربی زبان، اس کے اسالیب اور صرف ونحو کے بارے میں کافی علم رکھتا ہو۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مجتہد مطلق اِفتاء کا اہل ہے اور وہ مفتی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ii- کسی خاص مذہب میں مجتہد

۲۱۰- اس قسم کے مجتہد کی چار حالتیں ہیں اور علما کے اقوال کی رو سے ہر حالت کا اپنا اپنا حکم ہے۔

۱- پہلی حالت یہ ہے کہ وہ تحقیق، استنباط اور استدلال کے طریق کار میں اپنے مذہب کے امام کی پیروی کرتا ہے، مگر تحقیق کے نتائج اور تفصیلی احکام میں اس امام کا مقلد نہیں ہے۔ اس طرح کے مجتہد کو مفتی بننے کا حق ہے۔ امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد، امام احمد بن حنبل کے شاگردوں میں ابویعلیٰ اور امام شافعی کے شاگردوں میں امام مزنی اور ابن سریج اسی قسم سے ہیں۔ رحمہم اللہ جمیعاً

۲- دوسری حالت یہ ہے کہ آدمی اپنے امام کے مذہب میں اجتہاد کا درجہ رکھتا ہو اور اس کو مستقل دلیل کے ساتھ مؤید کرتا ہو لیکن وہ اپنے امام کے اصول اور اس کے قواعد سے باہر نہ نکلتا ہو، باوجودیکہ اس کو تخریج

اور استنباط کی قدرت حاصل ہو اور وہ فروع کو ان اصولوں کے ساتھ ملا سکتا ہو جو اس کے امام نے طے کیے ہوتے ہیں۔ اس حالت میں بھی مجتہد فتویٰ کا اہل ہوتا ہے، اور جو شخص اس سے فتویٰ پوچھتا ہے وہ اس کے امام کا مقلد ہوگا نہ کہ خود اس مجتہد کا۔ اس لیے کہ یہ مجتہد اپنے امام سے مستقل حیثیت کا حامل نہیں ہے اور اس کی بات کو شرع متین کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے۔ اس کی بات اس کے امام کے واسطے سے شرعی حکم قرار پاتی ہے۔ لیکن یہ مجتہد بھی بعض اوقات ایک لحاظ سے مستقل حیثیت کا حامل بن جاتا ہے، مثال کے طور پر ایسے مسئلے میں، جس کے بارے میں یہ اپنے امام سے منقول کوئی حکم نہیں پاتا۔ چنانچہ یہ اپنے امام کے مذہب اور اس کے اصولوں کے مطابق تحقیق کر کے فتویٰ دے دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب وہ اس طرح کا فتویٰ دیتا ہے تو کیا وہ فتویٰ اس کے امام کی طرف منسوب کیا جائے گا اور اس فتوے کو اس کے امام کا مذہب سمجھا جائے گا، یا یہ فتویٰ اس مجتہد کی طرف منسوب ہوگا اور اسی کے اقوال و اجتہادات میں سے شمار کیا جائے گا؟ اس میں اختلاف ہے۔ مگر ظاہر بات ہے کہ اس فتوے کی نسبت دونوں کی طرف درست ہے، مگر ہر نسبت کا الگ الگ اعتبار ہوگا۔ اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ یہ فتویٰ امامِ مذہب کے اصولوں پر تخریج کیا ہوا ہے تو اس کی طرف منسوب کیا جائے گا اور اس بنا پر مستفتی امامِ مذہب کا مقلد شمار ہوگا، اور اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ فتویٰ اس مجتہد نے دیا ہے تو اگرچہ اس نے تخریج اپنے امام کے اصولوں کے مطابق تحقیق کی ہے بہرحال اس فتوے کی نسبت اسی مجتہد کی طرف کی جائے گی، اور اس بنا پر زیرِ بحث مسئلے کی حد تک مستفتی اسی مجتہد کا مقلد بن جائے گا، نہ کہ اس کے امام کا مقلد۔

۳- تیسری حالت یہ ہے کہ مجتہد دوسری حالت کے لوگوں کے مرتبے تک نہ پہنچ سکے، بلکہ ایک مذہب کے اندر مسائل کے وجوہ معلوم کرنے اور اسی کے اندر تخریج کرنے کے مرتبے پر رُک جائے۔ اس کے ساتھ وہ اپنے مذہب کے امام کی فقہ کو حفظ کرے، اسی کے دلائل کو سمجھے اور اسی کے اقوال کی تائید کا ملکہ حاصل کر لے، اسی کی نصرت کا فریضہ انجام دے اور اسی کے لیے استدلال کرے۔ اسی طرح وہ اس بات پر بھی قادر ہو کہ مذہب کے اندر مذکور، امام کے مختلف اقوال کے درمیان ترجیح کر سکے۔

اس حالت کے حامل مجتہد کو بھی اِفتاء کا حق حاصل ہے اور اس کے لیے مفتی بننا جائز ہے۔ اس کا فتویٰ بھی مقبول ہوگا، اگرچہ اس فتوے کا مرتبہ دوسری حالت والے لوگوں کے مرتبے تک نہیں پہنچتا۔

۴- چوتھی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کی فقہ کو سمجھنے پر قادر ہو اور ساتھ اُس نے اِس فقہ کو یا اس کے

اکثر حصے کو حفظ کر لیا ہو۔ وہ اس فقہ کے ضوابط کو سمجھتا ہو اور اس مذہب کے لوگوں کی تخریجات کو بھی جانتا ہو، نیز وہ اس مذہب کے مصادر کی طرف رجوع کر سکتا ہو۔

اس حالت والے کو بھی فتویٰ دینے کا حق ہے اور اس کا مفتی بننا جائز ہے۔ لیکن یہ انھی مسائل میں فتویٰ دے سکتا ہے جن کے احکام کو اس مذہب کے فقہا و مجتہدین نے بیان کیا ہو۔ اسی طرح اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ ان مسائل کے بارے میں فتویٰ دے جو اس مذہب کے واضح اور سمجھ میں آنے والے ضوابط کے ضمن میں آتے ہوں۔

iii- علم کے ایک شعبے میں مجتہد

۲۱۱- اس قسم کے مجتہد کی مثال پیش کرتے ہوئے علما کہتے ہیں: جس نے قیاس اور اس کی شرطوں کو پہچانا تو اس کو حق ہے کہ قیاس کے مسائل میں فتویٰ دے۔ اسی طرح جس نے علم میراث اور اس کے اصول وضوابط کو سمجھ لیا اس کے لیے ان امور میں فتویٰ دینا جائز ہے۔

میرے خیال میں اس طرح کا مجتہد مفتی مقرر کیے جانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ مفتی صرف اس مسئلے میں فتویٰ نہیں دیتا جس کو اس نے سمجھا ہو۔ اس کو مفتی بنائے جانے کے بغیر اپنے متعلقہ شعبے کے حوالے سے فتویٰ دینے کا حق ہوگا۔

iv- کسی خاص مسئلے میں مجتہد

۲۱۲- یہ وہ مجتہد ہے جس کو فقہ کے کسی خاص مسئلہ یا چند مسائل میں اجتہاد کا درجہ حاصل ہوا ہو۔ اس کو اختیار ہوگا کہ اسی مسئلے کے بارے میں فتویٰ دے، مگر دوسرے مسائل میں اس کو فتویٰ دینے کا حق نہیں ہوگا۔ میرے خیال میں یہ بھی مفتی بنائے جانے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اگر چہ اس کے لیے ان مسائل میں فتویٰ دینا جائز ہوگا جن کو اس نے سمجھا ہے اور اس میں اجتہاد کا درجہ حاصل کیا ہے۔

شرطِ اجتہاد کی بحث کا خلاصہ

۲۱۳- اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اِفتاء کی اہلیت کا دارومدار دیے جانے والے فتوے کے بارے میں

مقبول علم ہے اور یہ اس بات پر مبنی ہے کہ مفتی دلیل کی معرفت رکھتا ہو اور اس کے بارے میں اجتہاد کر سکتا ہو۔ پس جو شخص بھی کسی مسئلے میں اس طرح کا علم حاصل کرے، اس کو حق ہوگا کہ اس مسئلے کے بارے میں فتویٰ دے سکے۔ اس بات کا رُخ اجتہاد کے قابل تقسیم ہونے کی رائے کی طرف ہے اور ہم اسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص کسی مسئلے کے حکم سے جاہل ہوگا اس کو حق نہیں ہوگا کہ اس مسئلے کے بارے میں فتویٰ دے سکے، اگر چہ کسی اور پہلو کے لحاظ سے اس میں فتویٰ دینے کی صلاحیت موجود ہو۔ یہ معاملہ تو اس صورت میں ہے جب کسی خاص مسئلے میں افتاء کی صلاحیت کا سوال درپیش ہو۔ اگر سوال منصب اِفتاء پر فائز کیے جانے کا ہو کہ کس کو مفتی مقرر کیا جائے، تو یہ منصب اسی طریقے پر اجتہاد کی صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے، جس طرح کہ علما نے اس کو ذکر کیا ہے۔ کسی خاص مسئلے میں اِفتاء کا اہل ہونے اور منصب اِفتاء کا اہل ہونے کی دونوں اہلیتوں میں باہم لزوم نہیں ہے۔ کبھی ایک شخص اس طرح کا مجتہد ہوگا جس کی بنا پر وہ مفتی کے منصب کا بھی اہل قرار پائے گا اور اسے عملی طور پر اس منصب پر فائز بھی کیا جائے گا، مگر وہ کسی خاص مسئلے میں اِفتاء کا بھی اہل نہیں ہوگا، کیوں کہ وہ اس مسئلے کے حکم سے جاہل ہوگا، یا اس کے حکم تک اس کی رسائی نہ ہوئی ہوگی۔ کبھی ایک آدمی کسی خاص مسئلے یا چند مسائل میں اِفتاء کا اہل ہوگا مگر وہ لوگوں کے لیے مفتی بنائے جانے کے لیے اہل نہیں ہوگا۔

مفتی کی چند دیگر شرائط

۲۱۴- علما نے مفتی میں کچھ اور شرطیں بھی رکھی ہیں، تاکہ وہ اپنے فرض کی بہتر اور خطرے سے پاک ادائیگی پر قادر ہو۔ اس سلسلے میں علما کہتے ہیں: مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کافی حد تک بیدار مغز، اچھے ذہن والا، لوگوں کی نفسیات اور ان کی چالوں کو جاننے والا ہو، تاکہ وہ ان کی چالوں اور دھوکوں میں نہ آئے۔ اسی طرح اس کو چاہیے کہ اپنے دین کے معاملے میں سخت ہو، حق کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اس کو اپنی بات سے نہ ہٹا سکے اور کسی وعدے یا وعید سے متأثر نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تقویٰ، پرہیز گاری اور خوف الٰہی کا کافی سرمایہ رکھتا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ یہ شرطیں بھی مفتی کے لیے ضروری ہیں۔ اگر یہ شرطیں نہ پائی جائیں تو صرف اس کا علم اور اس کی ظاہری 'عدالت' ان کی قائم مقام نہیں ہوسکتی۔ مگر یہ صفات ایسی ہیں کہ ان کی معرفت اچھے طریقے سے حاصل نہیں ہوسکتی، جب تک کہ اس کو عملی طور پر اِفتاء کا موقع نہ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان

شرطوں کی معرفت ابتدا میں، جب کسی شخص کو اِفتاء کے منصب کے لیے چنا جاتا ہے، بہت مشکل ہوگی۔ اس بنا پر حکمران پر واجب ہے کہ وہ جب کسی کو مفتی مقرر کرنے کے لیے چناؤ کرتا ہے تو اس کے کردار اور اس کے احوال کے بارے میں معلوم کرلے اور اس سلسلے میں ان لوگوں سے پوچھے جو اس کو جانتے ہیں۔ اس طرح کسی کو مفتی مقرر کرنے سے پہلے اس کے حالات کے بارے میں اطمینان حاصل کرے۔

وجودِ مفتی کی ضرورت

۲۱۵- ایک ایسے مفتی کا موجود ہونا، جو مفتی بننے کا اہل اور اِفتاء کی شرطوں کو پورا کرنے والا ہو، فرض کفایہ ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہر بستی اور ہر شہر میں ایک ایسا مفتی موجود ہو جو لوگوں کو ان کے دینی مسائل میں فتویٰ دے اور ان کے پوچھنے سے پہلے بھی ان کو دینی مسائل کی تعلیم دے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ مفتی ایک نہیں کئی ہونے چاہییں۔ کم از کم اتنے علاقے میں ایک مفتی ہونا چاہیے جس سے نکلنے پر نماز میں قصر کیا جاتا ہے۔ ہر شہر میں مفتی کی موجودگی کی اہمیت کے بارے میں علما کہتے ہیں کہ اگر کسی جگہ میں ایک بھی مفتی موجود نہ ہو وہاں رہایش اختیار کرنا حرام اور اس جگہ سے کوچ کرنا واجب ہوگا۔ چاہیے کہ آدمی ایسی جگہ چلا جائے جہاں کوئی نہ کوئی مفتی موجود ہو اور وہ اسے دینی احکام اور اس پر نازل ہونے والے واقعات میں فتویٰ اور رہنمائی دے۔

مفتیوں کی تیاری کا کام

۲۱۶- جب یہ بات معلوم ہوئی کہ مفتی کی موجودگی فرض کفایہ ہے تو مفتیوں کی تیاری کا کام بھی ضروری قرار پاتا ہے اور اس کے لیے ضروری وسائل اختیار کرنا ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں:

> ہر بستی، شہر اور قلعے میں سوسائٹی پر فرض ہے کہ اس میں سے کچھ لوگ نکل جائیں، وہ شروع سے لے کر آخر تک دین کے سارے احکام، پورا قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں سے وہ صحیح احادیث سیکھیں جو احکام سے متعلق ہیں، اور اس طرح کے دیگر امور۔ پھر یہ لوگ اپنی قوم کی تعلیم کی ذمہ داری سنبھالیں۔ اگر لوگوں کو اپنے محلے میں ایسا عالم نہ ملے جو اُن کو دین کی یہ ساری باتیں سکھائے تو ان پر لازم ہوگا کہ اس مقصد کے لیے وہاں تک جا پہنچیں جہاں علم کے مختلف فنون کے علما

اور مجتہدین ملتے ہیں، خواہ ایسی جگہ کتنی ہی دور ہو، یہاں تک کہ خواہ وہ چین میں ہی کیوں نہ ہو۔

معلوم ہوا کہ سوسائٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے لوگ تیار کرے جو دینی احکام سیکھیں، اس میں فقاہت حاصل کریں، پھر پہلے ہی لوگوں کو تعلیم دینے کا آغاز کریں، یا جب وہ کوئی سوال کریں تو ان کا جواب دیں۔

۲۱۷- چونکہ حکمران مسلمان سوسائٹی کے نمایندے ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی مصلحتوں کی ذمہ داری انھی پر ہوتی ہے اس لیے ان کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ مفتیوں کی تیاری کا کام انجام دیں اور اس کے لیے ضروری وسائل فراہم کریں۔ مثلاً فقہ کی تعلیم کے لیے مدارس قائم کرنا، اس کے لیے طلبہ کو منتخب کرنا، ان کے لیے ضروری بجٹ مقرر کرنا، تاکہ وہ اپنا حصولِ علم کا کام مکمل کرسکیں۔ پھر ان کو اِفتاء کے منصب پر مقرر کرنا اور ان کے لیے مناسب تنخواہیں مقرر کرنا، تاکہ وہ کام کاج سے بے نیاز ہوکر اِفتاء میں اپنی ذمہ داری کے لیے ہمہ وقت فارغ رہیں۔

بے شرم اور جاہل مفتی پر پابندی

۲۱۸- حکمران کو یہ حق ہے کہ بے شرم اور جاہل مفتی کو اِفتاء کے کام سے روک دے، خواہ اس مفتی کو خود حکمران نے مقرر کیا ہو یا اس نے تقرر کے بغیر اِفتاء کا کام شروع کیا ہو۔ اگر حکمران نے اس کو مقرر کیا ہے تو اس کو معزول کرکے اس کی جگہ کسی اہل مفتی کو مقرر کردے، اور اگر وہ بغیر تقرر کے لوگوں کو فتوے دیتا ہے تو اس کو اِفتاء سے روکے اور اگر وہ پھر بھی ایسا کرے تو اس کو دھمکائے۔ بے شرم مفتی وہ ہے جو لوگوں کو ان کی خواہشات کے مطابق فتوے دیتا ہے۔ اس طرح وہ ان کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کردیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ باطل شبہات اور فاسد تاویلات کا سہارا لیتا ہے۔ کیوں کہ اس کا مقصد تو لوگوں کو راضی کرنا اور ان کی خواہشات کی پیروی کرنا ہوتا ہے۔ جاہل مفتی وہ ہے جو اسلام کے احکام سے ناواقف ہو، چنانچہ وہ لوگوں کو علم کے بغیر فتوے دیتا ہے۔ یہ دونوں یعنی بے شرم اور جاہل مفتی فتویٰ کے منصب کے لیے اہل نہیں ہیں، اور جو شخص کسی کام کا اہل نہیں ہوتا اسے اس کام سے روکا جاتا ہے۔ علامہ ابن نجیم حنفیؒ کہتے ہیں:

حکمران کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دور کے مشہور اہل علم سے پوچھے کہ کون سا شخص فتویٰ کے منصب کے لیے اہل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ نااہل لوگوں کو فتویٰ دینے سے روکے اور اگر وہ

دوبارہ فتویٰ دے تو اس کو سزا کی دھمکی دے۔

حنابلہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ حکمران کے لیے مناسب ہے کہ وہ مفتیوں کے حالات معلوم کرتا رہے، جو فتویٰ کا اہل ہو اس کو مقرر کرے اور جو اہل نہ ہو اس کو آیندہ کے لیے روکے اور اگر وہ دوبارہ بھی یہ کام کرے تو اس کو دھمکائے۔ یہ بات ان مفتیوں پر بھی منطبق ہوتی ہے جو حکمران کی طرف سے تقرر کے بغیر فتویٰ کا کام کرتے ہیں۔ جب اس کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو فتویٰ دینے سے روک سکتا ہے تو اس کو یہ اختیار بطریق اولیٰ ثابت ہے کہ وہ اپنے مقرر کردہ مفتی کو معزول کردے، جب کہ اس کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ اپنی بے شرمی اور جہالت کی وجہ سے اس منصب کے لیے اہل نہیں ہے۔

بیت المال سے مفتی کی کفایت

۲۱۹- مفتی کے لیے جائز ہے کہ بیت المال سے اپنی ضرورت کے مطابق وظیفہ وصول کرے۔ اس لیے کہ وہ اِفتاء کا کام کرتا ہے اور یہ اذان کی طرح ایک عمومی مصلحت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکمران کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ مفتی کے لیے بیت المال سے ماہانہ تنخواہ مقرر کرے۔ اس کی مقدار اتنی ہونی چاہیے کہ اس کے لیے کافی ہو اور وہ کام کاج سے بے نیاز ہو سکے۔

مفتی کا جرمانہ

۲۲۰- اگر مفتی اپنے مستفتی کو کوئی خاص فتویٰ دے اور وہ اس پر عمل کرے، جس میں کسی کا جانی یا مالی نقصان ہو جائے اور مستفتی پر کوئی جرمانہ عائد کیا جائے تو کیا وہ اپنے جرمانے کے سلسلے میں اپنے مفتی کی طرف رجوع کرے گا یا نہیں؟ اس سلسلے میں دیکھا جائے گا، اگر مفتی کا فتویٰ باطل اور کسی شرعی نص یا کھلے ہوئے اجماع کے خلاف ہو تو اس صورت میں مستفتی اپنے مفتی کی طرف جرمانے کے لیے رجوع کرسکتا ہے۔ اس لیے کہ اس جرم کا سبب وہی بن گیا ہے۔ لیکن اگر مفتی کا فتویٰ ایسا ہو کہ شریعت رو سے اس کی گنجایش موجود ہو تو مفتی کسی چیز کا ضامن نہیں ہوگا۔ یعنی مستفتی کو حق نہیں ہوگا کہ جرمانے کے سلسلے میں مفتی کی طرف رجوع کرے۔ ہاں اگر مفتی اِفتاء کا اہل نہ ہو تو اس صورت میں خواہ فتویٰ باطل ہو یا درست، دونوں صورتوں میں ضامن ہوگا۔ اس لیے کہ اس نے اس شخص کو دھوکہ دیا ہے جس نے اس سے فتویٰ مانگا تھا۔ اس کا مطلب

یہ ہے کہ مستفتی اپنے جرمانے کے سلسلے میں اس کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی وہ ضامن نہیں ہوگا اور نہ مستفتی کو اس کی طرف رجوع کرنے کا حق ہے۔ اس لیے کہ یہاں کوتاہی مستفتی کی ہے، کہ اس نے ایسے شخص سے فتویٰ مانگا ہے جس کے اندر اس کی اہلیت موجود نہیں تھی۔

مفتی کے فرائض و آداب

۲۲۱- مفتی کو جان لینا چاہیے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اور جو فتویٰ دیتا ہے وہ دین کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور اس کے بارے میں اللہ کے حضور اس سے سوال کیا جائے گا۔ لہٰذا اس پر واجب ہے کہ لمبی غور وفکر کرے اور جواب دینے میں جلدی نہ کرے۔ اگر اس کو جواب معلوم نہ ہو تو کہے کہ میں نہیں جانتا۔ یقیناً 'لا ادری' نصف علم ہے۔ حضرت امام مالکؒ سے جب کسی مسئلے کے بارے میں سوال کیا جاتا تو وہ اکثر یا بعض مسائل کے جواب میں فرماتے: میں نہیں جانتا۔ ہیثم بن جمیل کی روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے سامنے حضرت امام مالکؒ سے ۴۸ مسائل کے بارے میں پوچھا گیا۔ انھوں نے ۳۲ مسائل کے جواب میں کہا: میں نہیں جانتا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس نے ہر اس مسئلے کے بارے میں جواب دیا جو اس سے پوچھا جائے وہ مجنون ہے۔

۲۲۲- مفتی کو چاہیے کہ علاقے کے عرف و عادت کو سمجھے، تاکہ مستفتی کے مقصد کو سمجھ سکے۔ اگر سوال کو نہ سمجھ سکے تو سائل سے پوچھے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اگر یہ اس کی زبان نہیں جانتا تو ایک ایسے ترجمان کی ضرورت ہوگی جس پر اعتماد کیا جاسکے۔ اسی طرح مفتی کے لیے مناسب ہے کہ اگر ضرورت محسوس کرے تو استفتاء کے موضوع کے بارے میں موجود فقہا سے مشورہ کرے۔ فتویٰ دیتے ہوئے مفتی کو چاہیے کہ وہ مستفتی یا اس کے فریق مخالف کی طرف میلان اختیار کرنے سے بچے۔ نیز اس بات سے بھی احتراز کرے کہ ایک شخص کو اس کا حق تو بیان کردے مگر اس کی ذمہ داری کی نشان دہی نہ کرے۔

۲۲۳- جیسا کہ علما فرماتے ہیں، مفتی پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ فتویٰ کا جواب ایک ترتیب اور تسلسل کے ساتھ دے، جس طرح کہ وہ پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ پہلے سوال پوچھنے والے کا جواب پہلے دے گا اور بعد والے کا جواب بعد میں۔ البتہ اگر کوئی مسافر یا کوئی عورت فتویٰ مانگے اور تاخیر میں ان کے لیے نقصان ہو تو ان کے فتاویٰ میں تقدیم بھی کی جاسکتی ہے۔

۲۲۴۔مفتی پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ تہمت اور شک کے مقامات سے بچے، تاکہ اس کی بات مستفتی اور غیر مستفتی سب کے لیے قابل قبول ہو۔ مفتی کو چاہیے کہ جو لوگ اس سے فتویٰ پوچھتے ہیں ان سے ہدیہ قبول نہ کرے، تاکہ یہ چیز اسے غیر محسوس انداز میں مستفتی کے ساتھ فتویٰ میں تساہل پر مجبور نہ کرے۔

۲۲۵۔مفتی کو چاہیے کہ وہ نرم خو اور متواضع ہو نہ کہ ترش رو اور سخت مزاج۔ اس کو چاہیے کہ مستفتی کے ساتھ نرمی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے۔ اگر مفتی سمجھ جائے کہ اس کا مستفتی جلدی سمجھنے والا نہیں ہے تو اس کے ساتھ شفقت کرے، یہاں تک کہ اس کو جواب کی سمجھ آئے۔ مختصراً یہ کہ مفتی صاحب علم ہے تو چاہیے کہ اس کے اندر حلم بھی ہو، وقار و سکون بھی اور علما کی طرح شان و شوکت بھی۔

۳-اِفتاء

اِفتاء کی تعریف

۲۲۶-اِفتاء کا مطلب ہے مستفتی کے سوال کا جواب دینا۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے بات پہنچانا اوران احکام کی خبر دینا ہے جواللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے مشروع کیے ہیں۔

کارِ اِفتاء کے بانی

۲۲۷-پہلا شخص جس نے فتویٰ کی ذمہ داری ادا کی، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔آپ ؐ کا فتویٰ جوامع الکلم کی صورت میں ہوتا تھااور وہ کھلےاور واضح خطاب پر مشتمل ہوتا تھا۔

نبیؐ کے بعد کارِ اِفتاء

۲۲۸-نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کارِ اِفتاء کی ذمہ داری آپ ؐ کے صحابہ کرامؓ نے اٹھائی۔ان میں بعض ایسے ہیں جو زیادہ فتوے دیتے تھے بعض اوسط درجے کے مفتی تھے اور بعض کے فتوے کم ہیں۔ان میں جن لوگوں سے کچھ نہ کچھ فتاویٰ منقول ہوئے ان کی تعداد ۱۳۰ سے کچھ اوپر ہے، جن میں مرد بھی ہیں اور خواتین بھی۔ زیادہ فتویٰ دینے والے سات افراد ہیں۔یعنی: حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر، رضی اللہ عنہم۔

افتاء کا مستحق کون!

۲۲۹-اولاً: جو شخص مفتی بننے کا اہل ہے وہ اِفتاء کا اہل ہے، خواہ اسے مفتی مقرر کیا گیا ہو یا نہیں۔اور مفتی کی شرائط ہم نے پہلے بیان کر دی ہیں۔

ثانیاً: جو شخص علم کے کسی شعبے میں مجتہد ہو یا فقہ کے کسی مسئلے میں، اس کو حق ہے کہ وہ اس مسئلے میں یا علم کے اس شعبے کے بارے میں فتویٰ دے۔

ثالثاً: جو شخص کسی مذہب کا مقلد ہو، اس کے مسائل کو حفظ کیا ہو اور اس مذہب کے اصحاب نے جو کچھ کہا ہو اس کو سیکھ لیا ہو تو اسے حق ہے کہ ان کے اقوال کے مطابق فتویٰ دے۔ مگر وہ اپنے جواب میں کوئی ایسی بات کہے گا جس سے معلوم ہو سکے، کہ یہ فلاں کا مذہب ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ امام ابوحنیفہ کا اس مسئلے میں یہ مذہب ہے۔ اگر یہ ترقی کر کے کسی مذہب کے اصول اور اس کے قواعد کی معرفت حاصل کرے اور پھر اس سے کسی ایسے مسئلے کے بارے میں سوال کیا جائے جو اس مذہب کے قواعد میں سے کسی قاعدے کے ضمن میں آتا ہو تو اس کو چاہیے کہ مثلاً یوں کہے: اس مسئلے میں امام ابوحنیفہ کے مذہب کا تقاضا یہ ہے۔

عام آدمی جب مسئلے کا حکم سمجھے

۲۳۰- جب عام آدمی کسی مسئلے کا حکم سمجھ جائے اور اس کو دلیل بھی معلوم ہو جائے اور کوئی اس سے سوال کرے تو کیا اس کو حق ہے کہ مسئلے کا حکم بیان کرے؟ اس سلسلے میں بعض علما کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اگر مسئلے کی دلیل کتاب اللہ یا سنت رسول میں سے کوئی نص ہے تو اس کے لیے جواب دینا جائز ہوگا، جب کہ بعض کہتے ہیں کہ عام آدمی کے لیے فتویٰ دینے کا حق کسی صورت میں نہیں ہے، خواہ مسئلہ ایسا ہی کیوں نہ ہو جس، کا حکم اور دلیل اس نے معلوم کر لیا ہو۔ اس لیے کہ بعض اوقات اس دلیل کے مقابلے میں دوسری دلیل ہوتی ہے جسے وہ نہیں جانتا۔

البتہ اگر اس کو ایک عالم نے کسی مسئلے کے حکم کے بارے میں فتویٰ دیا اور کوئی اس سے پوچھے کہ مفتی صاحب نے تیرے مسئلے کا کیا جواب دیا، تو اس کے لیے جائز ہوگا کہ جو فتویٰ مفتی نے اس کو دیا ہے اس کے بارے میں اس کو خبر دے۔ اس لیے کہ اِفتاء اپنی طرف سے اجتہاد کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ کسی اور کی طرف سے بطورِ حکایت کے۔ یہ سب کچھ تو علما نے فرمایا ہے۔ میری نظر میں جب ایک عام آدمی کسی مسئلے کا حکم شریعت میں علم کے معتبر ذرائع میں سے کسی ذریعے سے معلوم کرے تو اس عام آدمی کے لیے جائز ہوتا ہے کہ دوسرے کو اس پر فتویٰ دے۔ اگرچہ اس میں محتاط طریقہ یہی ہوگا کہ پوچھنے والے کو اپنے مفتی کے فتوے کی عبارت دکھا دے۔

عام آدمی کا حدیث کی بنیاد پر فتویٰ

۲۳۱- جو شخص مجتہد نہ ہو مگر اس کے پاس احادیث کی کتابیں، ان کی شروح اور اقوالِ صحابہ موجود ہوں تو کیا اس کے لیے جائز ہے کہ ان کتابوں میں موجود تعلیمات کے مطابق فتویٰ دے یا نہیں؟

اس سلسلے میں امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا جس کے پاس تصنیف شدہ کتابیں ہوں اور ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور صحابہ و تابعین کے اقوال موجود ہوں اور یہ آدمی خود ایسا ہو کہ اس کو حدیث ضعیف اور حدیث متروک کا علم نہ ہو، نہ وہ یہ جانتا ہو کہ قوی سند کون سی ہوتی ہے اور ضعیف سند کون سی تو کیا اس کے لیے جائز ہے کہ ان میں سے جس قول پر چاہے عمل کرے اور جو قول چاہے اس کو ترجیح دے۔ چنانچہ وہ اس کے مطابق فتویٰ بھی دے اور عمل بھی کرے؟ اس کے جواب میں امام احمد بن حنبل نے فرمایا: وہ اس وقت تک ان میں سے کسی چیز پر عمل نہیں کرسکتا، جب تک وہ اپنی رائے کے بارے میں علما سے سوال نہ کرے، اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کا عمل صحیح طریقے پر انجام پائے۔

کارِ اِفتاء اور حکمران کی اجازت

۲۳۲- جو شخص اِفتاء کا اہل ہو اور اس کو اِفتاء کے کام کے لیے مقرر کیا جائے تو اس کے اِفتاء کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ یہ کام اس پر واجب ہے، اس لیے کہ اسے مقرر ہی اس کام کے لیے کیا گیا ہے۔ مگر ایک شخص اِفتاء کا اہل ہے اور وہ مفتی مقرر نہیں کیا گیا، اس کو بھی اجازت ہے کہ حکمران کی پیشگی اجازت کے بغیر فتویٰ دے۔ اس لیے کہ اِفتاء دراصل شریعت ربانی کی خبر دینا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ ہے۔ اس بنا پر یہ دینی واجبات میں سے ہے اور جو شخص اس پر قادر ہو اس پر لازم ہوگا کہ اس فرض کو انجام دے۔ دینی فرض کی ادائیگی کے لیے حکمران سے اجازت لینے کی شرط نہیں ہے، اگرچہ حکمران کو یہ حق حاصل ہے کہ جو لوگ فتویٰ کا کام انجام دے رہے ہیں ان کی نگرانی کرے۔ مگر اس کا یہ حق اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ مفتی اپنی دینی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے حکمران سے پیشگی اجازت لے۔ سلف میں سے ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے فتویٰ دینے کے لیے امام یا حکمران کی اجازت کو ضروری سمجھا ہو۔ اسی طرح ہم کسی ایسے عالم کے بارے میں بھی نہیں جانتے جس نے کہا ہو کہ اِفتاء کا کام انھی لوگوں تک محدود رہے گا جن کو حکمران نے

فتویٰ کے لیے مقرر کیا ہو۔

اپنے کو اِفتاء کے لیے پیش کرنا

۲۳۳- یہ بات تو معلوم ہوئی کہ ایک مسلمان کے حق افتاء کے ثبوت کے لیے امام اور حکمران کی اجازت ضروری نہیں ہے، مگر جو شخص اپنے آپ کو افتاء کے لیے پیش کرتا ہے اسے اپنے اندر اس کی اہلیت کا یقین کر لینا چاہیے اور اپنی اہلیت وصلاحیت کے معاملے میں جلد بازی سے کام نہ لے۔ یقین کر لینے کے طریقوں میں اپنے اوپر اعتماد کے علاوہ ایک یہ ہے کہ اہل علم اس کی اہلیت کی گواہی دیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کسی عالم کے لیے اِفتاء کرنا مناسب نہیں ہے، یہاں تک کہ لوگ اس کو فتویٰ کا اہل سمجھ لیں اور وہ خود بھی اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھے۔ امام مالکؒ کے قول 'یہاں تک کہ لوگ اس کو فتویٰ کا اہل سمجھ لیں' کا مطلب یہ ہے کہ علما اس کے بارے میں اہلیت کی گواہی دیں اور ان کی گواہی لوگوں میں مشہور ہو جائے۔

اِفتاء کے وقت خلوص نیت واِرادہ

۲۳۴- جب مسلمان کو اِفتاء میں اپنی اہلیت کا اعتماد پیدا ہو اور اہل علم اس کی گواہی دیں تو اس پر لازم ہوگا کہ اپنی نیت کو اچھی طرح ٹٹولے، تاکہ اس کی نیت خالص اللہ کی رضا کے لیے ہو اور افتاء کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنے سے اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے شریعت الٰہی کی تبلیغ اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تعلیمات کی تعلیم ہو۔ چنانچہ اِفتاء سے اس کا مقصد نہ تو علما پر فخر جتانا ہو اور نہ لوگوں کے ہاں مقام ومرتبہ حاصل کرنا۔ اس اچھے مقصد اور خالص نیت سے اللہ تعالیٰ اس کی کوشش میں برکت عطا فرمائے گا، اس کو ان چیزوں کی تعلیم دے گا جن کو وہ نہیں جانتا اور اِفتاء کے کام میں اس کو ثواب عطا فرمائے گا۔

اِفتاء کا وجوب

۲۳۵- بعض اوقات جو شخص اِفتاء کا اہل ہو اس پر یہ کام واجب ہو جاتا ہے اور یہ دو حالتوں میں ہوتا ہے۔

۱- پہلی حالت: اس شخص پر اِفتاء کا کام واجب ہوتا ہے جس کو حکمران نے مفتی مقرر کیا ہو اور اس نے تقرر کو قبول کیا ہو۔ لیکن یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ اس وجوب کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ہر

پوچھے جانے والے استفتاء کا جواب دے۔ اس وجوب کا مطلب دراصل یہ ہے کہ وہ استفتاء کے موضوع پر غور کرے اور افتاء کا ارادہ رکھے۔ اگر وہ پوچھے گئے مسئلے کا حکم سمجھتا ہے تو اس کے بارے میں فتویٰ دے۔ اگر وہ جواب نہیں جانتا تو وہ کہے کہ میں نہیں جانتا۔ جس مسئلے کو وہ نہیں جانتا اس میں فتویٰ دینا اس کو اپنے اوپر لازم نہیں سمجھنا چاہیے۔

۲- دوسری حالت: اگر ایک شخص افتاء کا اہل ہو اور اس کو حکمران نے مفتی مقرر نہ کیا ہو اور کوئی دوسرا شخص بھی نہ ہو جو لوگوں کو فتویٰ دے سکتا ہو تو افتاء کا کام اس پر خود بخود متعین ہو جاتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ کوئی اس سے کسی شرعی مسئلے کے بارے میں پوچھے اور یہ جواب دینے پر قادر ہو۔

اِفتاء کی حرمت

۲۳۶- جاہل کے لیے فتویٰ دینا حرام ہے اس لیے کہ فتویٰ دینا اللہ کی شریعت کے بارے میں خبر دینا ہے اور یہ کام علم کے بغیر جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَّأَنْ تَقُوْلُوا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. (الاعراف ۷:۳۳) اے نبیؐ! ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام — خواہ کھلے ہوں یا چھپے — اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرو، جس کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمھیں علم نہ ہو (کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے)۔

چنانچہ علم کے بغیر فتویٰ دینا خود بھی گمراہ ہونا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنا ہے، اور یہ سب کچھ حرام ہے۔ پھر جس طرح کہ جاہل کے لیے فتویٰ دینا حرام ہے اسی طرح اس بے شرم آدمی کے لیے فتویٰ دینا بھی حرام ہے جو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ کیا فتویٰ دے رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔

اِفتاء کی کراہت

۲۳۷- فقہاء کے درمیان اس بات پر اختلاف ہے کہ قاضی کے لیے فتویٰ کا کیا حکم ہے۔ چنانچہ بعض

کہتے ہیں کہ قاضی کے لیے ان عدالتی مسائل میں فتویٰ دینا مکروہ ہے جن کے بارے میں اس کو فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ فتویٰ کے طور پر ایک بات کہے اور فیصلہ کرتے وقت اس کی رائے اس کے برعکس ہو تو وہ اپنا فیصلہ بدلنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہوگا۔ قاضی شریح کہتے ہیں: میں تمھارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں، فتویٰ نہیں دیتا۔

البتہ عبادات کے مسائل میں قاضی بھی فتویٰ دے سکتا ہے، جیسے نماز، روزہ وغیرہ کے سلسلے میں۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر قاضی کے سامنے ایک مقدمہ نہیں آیا اور اس سے استفتاء کیا گیا تو وہ اس کے بارے میں فتویٰ دے سکتا ہے۔ البتہ جب مقدمہ اس کے سامنے آجائے تو پھر کسی فریق کو اس کے بارے میں فتویٰ دینے کی اس کو اجازت نہیں ہوگی۔

بعض فقہا کہتے ہیں: اگر قاضی فتویٰ دینے کا اہل ہے تو اس کو فتویٰ دینے کی اجازت ہے۔ انھوں نے اس جواز کو کسی چیز کے ساتھ مشروط اور مقید نہیں کیا۔

۲۳۸- میرے نزدیک پہلا قول ہی راجح ہے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ اسے افتاء کے لیے مقرر کیا جائے۔ اگر اس کو افتاء کے لیے مقرر کر دیا گیا تو پھر اس پر فتویٰ دینا لازم ہوگا، خواہ وہ قاضی ہی کیوں نہ ہو اور فتویٰ ایسے مسئلے میں ہی کیوں نہ مانگا جائے جس میں اس کو فیصلہ کرنا ہو، نیز سوال کرنے والا فریقین میں سے ایک فرد ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ جب مستفتی کو معلوم ہو جائے گا کہ حق اس کے مخالف کے پاس ہے تو شاید وہ خود ہی مقدمے سے دستبردار ہو جائے اور حق اس کے سپرد کر دے۔ اس افتاء سے کوئی خوف نہیں ہے اس لیے کہ مفتی جو فتویٰ بیان کرتا ہے وہ یہ فرض کر کے بیان کرتا ہے کہ مستفتی جو ثبوت بیان کر رہا ہے وہ درست ہے۔ رہا قاضی کا معاملہ تو وہ اگرچہ اسی حکم کو نافذ کرتا ہے جس کا وہ فتویٰ دیتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ دلائل اور واقعات اس کے سامنے شرعی طریقے سے ثابت کیے جائیں۔ قاضی کے سامنے جب وہ شخص اپنی بات کو ثابت کرنے سے عاجز آتا ہے جو اصل میں حق پر ہے تو قاضی اس کے حق میں فیصلہ نہیں دے گا، اگرچہ فتویٰ کے طور پر اسی کے حق میں بات کرے گا۔

اِفتاء سے خوف زدہ ہونا

۲۳۹- افتاء اگرچہ شریعت الٰہی کی تبلیغ اور ایک دینی فرض کی ادائیگی ہے مگر آدمی سے غلطی ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین اپنی صلاحیتوں کے باوجود اِفتاء سے خوف زدہ ہوتے تھے اور ان میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ یہ کام کوئی اور انجام دے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ افتاء کو دوسرے کی طرف پھیر دے۔ اس طرح وہ افتاء کی مشقت سے بچ جاتا اور اس کے خطرے سے محفوظ ہو جاتا۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ میں نے ایک سو بیس انصار صحابہؓ کو دیکھا ہے، جن سے اگر کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ اس کو دوسرے کے پاس بھیج دیتا اور دوسرا تیسرے کے پاس، یہاں تک کہ مسئلہ پہلے کے پاس لوٹ آتا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ان میں سے کوئی نہ ہوتا جو ایک حدیث بھی بیان کرتا۔ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا کہ اس کا بھائی اس کی طرف سے کافی ہو جائے، اور ان سے جب بھی کوئی فتویٰ پوچھا جاتا تو ہر ایک چاہتا کہ اس کا بھائی فتویٰ دے کر اس کا بوجھ ہلکا کر دے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ سے اس بات کا خوف نہ ہوتا کہ علم ضائع ہو جائے گا تو میں کبھی فتویٰ نہ دیتا۔ لوگوں کی تو چاہت پوری ہو جاتی ہے مگر بوجھ ہمارے اوپر آ پڑتا ہے۔

افتاء پر جرأت

۲۴۰- اگر ایک طرف افتاء سے خوف زدہ ہونا ایک پسندیدہ عمل ہے اور بعض سلف صالحین اسی کے ساتھ معروف ہوئے تو دوسری طرف افتاء پر جرأت بھی بعض سلف میں پائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض ایسے تھے جنھوں نے بہت سے فتوے دیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک آدمی فتویٰ سے خوف زدگی کا رویہ رکھتا ہو تو اس سے کثرت کے ساتھ فتاویٰ منقول ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ [چنانچہ جو لوگ کثیر الفتویٰ ہیں ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ افتاء سے خوف زدہ نہیں تھے]۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم ان دونوں مسلکوں کے درمیان تطبیق کیسے کریں گے حالانکہ دونوں قسم کا طرزِ عمل سلف صالحین سے منقول ہے۔ اور ان میں سے کسی نے کسی پر نکیر نہیں کی۔

اس مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ افتاء سے خوف زدگی کی وجہ بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ مفتیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور افتاء کا کام کسی ایک کے ذمے نہیں ہوتا۔ سلف صالحین میں یہی وجہ زیادہ پائی جاتی رہی ہے۔ دوسری طرف افتا پر جرأت کا طرزِ عمل یا تو کم علمی کی وجہ سے ہوتا ہے یا اس کی وجہ زیادہ علم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے یہ عالم سائلین کی کثرت میں مبتلا ہوتا ہے۔

افتاء پر جرأت اختیار کرنے کا پہلا سبب علم کی کمی ہے۔ آدمی اپنی کم علمی کی وجہ سے ہر مسئلے کا جواب دیتا

ہے، تا کہ کوئی اس کو جاہل نہ کہہ سکے۔ یہ سبب الحمدللہ سلف صالحین میں واقع نہیں ہوا۔

دوسرا سبب علم کی وسعت اور اہل علم کا سوال کرنے والوں کی کثرت کا سامنا کرنا ہے۔ یہ سبب یقیناً سلف صالحین میں واقع ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے کثرت کے ساتھ فتوے منقول ہیں اور اسی کثرت کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ افتاء پر جری تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ جرأت ایک قابل تعریف جرأت ہے۔ اس کی مذمت نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ افتاء کے لحاظ سے صحابہ میں سب سے آگے ہیں۔ ان کے فتاویٰ بیس جلدوں میں جمع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح تابعین میں حضرت سعید بن المسیبؒ کثرت سے فتاویٰ دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کو سعید بن المسیب الجریئ کہا کرتے تھے۔

افتاء سے انکار

۲۴۱۔ بعض اوقات ایک شخص افتاء کا اہل ہوتا ہے اور اس سے خوف زدہ بھی نہیں ہوتا۔ مگر بعض اوقات وہ محسوس کرتا ہے یا ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ افتاء سے انکار کر دے۔ اس صورت میں اسے کے لیے انکار جائز ہوگا۔ اس طرح کی حالتوں میں چند درج ذیل ہیں:

أ۔ بعض اوقات ایک مستفتی کسی شرعی معاملے میں سوال کرتا ہے لیکن ایک بیدار مغز مفتی کے سامنے کچھ قرائن اس بات کی دلالت کر رہے ہوتے ہیں کہ مستفتی اس فتویٰ سے کسی غلط مقصد تک پہنچنا چاہتا ہے۔

ب۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک عام آدمی کسی مشکل مسئلے کے بارے میں سوال کرتا ہے جس کا ادراک وہ نہیں کر سکتا، اور وہ ایسا مسئلہ بھی نہیں ہوتا جس کا سمجھنا اس شخص کے لیے ضروری ہو۔ اس صورت میں مفتی اس کو جواب دینے سے انکار کر دیتا ہے، تا کہ عام آدمی پریشانی اور غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔

ج۔ جب استفتاء کا موضوع کوئی ایسا مسئلہ ہو جو ابھی موجود نہیں ہوا تو مفتی بعض سلف کے طریقے پر چلتے ہوئے اس کا جواب دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ چونکہ واقعہ ابھی موجود نہیں ہوا تو اسے خوف ہو کہ جب واقعہ موجود ہوگا تو اس وقت اس کی رائے اور اجتہاد بدل گیا ہو۔

د۔ اگر مفتی کی حالت ایسی ہو جس میں وہ اس بات کا خوف رکھتا ہو کہ اسے فتوے کے بارے میں پوری طرح سوچ بچار کا موقع دستیاب نہیں ہے، مثلاً یہ کہ وہ غصے کی حالت میں ہو، اسے سخت بھوک یا پیاس لگی ہوئی

ہو، کوئی غم اور پریشانی لاحق ہو، بیماری میں مبتلا ہو، شدید گرمی ہو، ذہن کسی مصروفیت میں ہو، اور اس قسم کے بے شمار حالات ہو سکتے ہیں، چنانچہ مفتی ان حالات میں فتویٰ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔

اِفتاء پر اُجرت

۲۴۲- جو شخص افتاء کا کام کرتا ہے اس کے لیے جائز ہے کہ اس پر بیت المال سے اجرت حاصل کرے۔ اس لیے کہ افتاء ایک عوامی مصلحت کا کام ہے اور اس کی بنیاد پر حکمران کے لیے جائز ہوگا کہ جو شخص فتویٰ کی ذمہ داری انجام دیتا ہے اس کے لیے بیت المال سے کچھ مقرر کر دے، خواہ یہ مفتی ایسا ہو جس کو حکمران نے فتویٰ کے لیے مقرر کیا ہو، یا ایسا مفتی، جس کو حکمران نے مقرر تو نہ کیا ہو مگر وہ افتاء کا کام کرتا ہے۔ عطا کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ منظم طور پر ہر مہینے دی جائے اور یہ بھی کہ یکمشت کچھ دے دیا جائے۔ اگر مفتی کے لیے بیت المال سے کچھ مقرر نہ ہو تو اس صورت میں اس کے لیے بہتر تو یہی ہے کہ وہ اپنے فتوے پر کوئی اجرت قبول نہ کرے، لیکن اگر فتویٰ کی مصروفیات اس کو کام کاج نہیں کر دیتیں، تب اس کے لیے فتویٰ پر اجرت لینا جائز ہوگا۔ مگر جب اس کو مستقل طور پر فتویٰ کے کام کے لیے مقرر کیا جائے تو اس کے لیے مستفتی سے اُجرت لینا جائز نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہ ایک واجب کام کا عوض ہوگا اور یہ جائز نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ اس کے پاس ضروریات کے لیے کافی وسائل موجود نہ ہوں۔ یہاں یہ کہنا بھی مفید ہے کہ اگر کسی شہر یا کسی جماعت کے لوگ اپنے مفتی کے لیے — جو حکومت کی طرف سے مقرر نہیں ہوتا — اپنے اموال میں سے کسی چیز کا تقرر کر لیں تو یہ بہتر ہوگا اور مفتی کے لیے اسے قبول کرنا جائز ہوگا۔

رشتہ دار کو فتویٰ

۲۴۳- اس شخص کو فتویٰ دینا بھی جائز ہے جس کی گواہی مفتی کے حق میں قبول نہیں ہوتی۔ جیسے ایک شخص اپنے باپ، ماں، بیوی، اور شریک کاروبار کو فتویٰ دے، اس لیے کہ فتویٰ کا مقصد صرف شرعی حکم بیان کرنا ہے اور قضا کے برعکس اس میں کسی پر کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔

۴۔فتویٰ

فتویٰ کی تعریف

۲۴۴۔مفتی کے جواب کی عبارت کو فتویٰ کہتے ہیں، یا شریعت کا وہ حکم جس کے بارے میں مفتی خبر دیتا ہے۔

فتویٰ کی بنیاد

۲۴۵۔چونکہ فتویٰ کسی شرعی حکم پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے اس کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول پر، یا ان علوم پر ہونی چاہیے جن کے دلیل ہونے کا ثبوت قرآن وسنت سے ملتا ہے، جیسے اجماع۔

۲۴۶۔قیاس ورائے اگر مقبول ہو تو وہ فتویٰ کی بنیاد بن سکے گا اور اگر فاسد قیاس ہو تو وہ فتویٰ کی بنیاد نہیں سکے گا۔قیاس فاسد وہ ہے جو کتاب وسنت کے خلاف نکلے۔قیاس ورائے مقبول کی کئی قسمیں ہیں۔

ایک صحابہ کرام کی رائے: جس میں درست غور وفکر، گہری سمجھ بوجھ اور دقیق استنباط پر اعتماد ہوتا ہے۔اس لیے کہ انھوں نے نزول قرآن کا دور بھی دیکھا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے بھی سرفراز ہوئے اور اس بنا پر ان کو ذہن کی پختگی بھی نصیب ہوئی اور شریعت کے مقاصد ومعانی کا احاطہ کرنے کا موقع بھی میسر آیا۔

دوسری وہ رائے جو نصوص کی تفسیر اور ان کی دلالتوں کے بیان پر مشتمل ہو اور جو نصوص سے استنباط کا طریقہ آسان بناتی ہو۔جیسے میراث میں عول[1] کے حوالے سے صحابہ کرام کی رائے۔

۱۔علم میراث کی اصطلاح میں عول اس کو کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے لیے قرآن وسنت میں حصے مقرر ہیں ان کی تعداد بڑھ جائے اور ورثہ ان کے لیے کم پڑ جائے تو مقررہ حصوں میں کمی کر کے ہر مستحق کو کچھ نہ کچھ دیا جاتا ہے۔برائے ملاحظہ: المواریث، محمد علی الصابونی، دار القلم دمشق، ص ۱۱۵۔(مترجم)

تیسری وہ رائے جس کو امت نے قبول کیا ہو۔ اس میں وہ سارے قیاس شامل ہوں گے جن میں قیاس کی شرطیں پائی جاتی ہیں اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول کے خلاف نہ ہوں۔

۲۴۷- چونکہ فتویٰ شریعت کے حکم پر مشتمل ہوتا ہے اور نتیجتاً اس کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد کتاب وسنت اور دوسرے مصادرِ شریعت پر ہو، چنانچہ یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ فتویٰ ایسے حیلوں پر مشتمل نہ ہو جو شریعت میں حرام ہیں، اور نہ ایسے باطل شبہات پر مشتمل ہو جس میں اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور اس کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَعَنَ اللّٰہُ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی، حُرِمَتْ عَلَیْهِمُ الشُّحُوْمُ فَجَمَّلُوْهَا (أَيْ أَذَابُوْهَا) وَبَاعُوْهَا وَأَكَلُوْا ثَمَنَهَا. اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت کرے، ان کے لیے چربی کو حرام کیا گیا تھا تو وہ اسے پگھلاتے، اسے بیچ دیتے اور اس کی قیمت کھا جاتے۔

ہاں البتہ یہ جائز ہے کہ جتنی رخصت کی اجازت ہے اس قدر آسانی دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مفتی کے لیے جائز ہے کہ اس کے مطابق فتویٰ دے اور مستفتی کے لیے جائز ہوگا کہ اس پر عمل کرے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَخُذْ بِیَدِکَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ (ص ۳۸:۴۴) تنکوں کا ایک مٹھا لے اور اس سے مار دے، اپنی قسم نہ توڑ۔

اور حدیث میں آیا ہے:

إِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ أَنْ تُؤْخَذَ رُخَصُهٗ، کَمَا یُحِبُّ أَنْ تُؤْخَذَ عَزَائِمُهٗ. اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی رخصتوں کو اسی طرح لیا جائے جیسا کہ وہ یہ بات پسند کرتا ہے کہ اس کے پرعزیمت احکام کو لیا جائے۔

فتویٰ کا استفتاء کے موضوع سے تعلق

۲۴۸- اصل فتویٰ وہ ہوتا ہے جو استفتاء کے موضوع سے متعلق بھی ہو اور اس کے مطابق بھی، تاکہ مستفتی اپنے استفتاء کے مقصد کو پاسکے اور جواب اس کے موضوع سے خارج نہ ہو۔

۲۴۹- البتہ یہ جائز ہے کہ فتویٰ استفتاء کے موضوع سے وسیع تر ہو۔اس انداز سے کہ فتویٰ کا تعلق مستفتی کے ساتھ بھی رہے اور دوسرے بھی اس سے رہنمائی لے سکیں، خصوصاً اس صورت میں جب مفتی سمجھتا ہو کہ اس وسعت میں مستفتی کا فائدہ ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک صحابیؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سمندر کے پانی کے بارے میں سوال کیا کہ کیا اس سے وضو جائز ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

هُوَ الطُّهُوْرُ مَاؤُهٗ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهٗ. اس کا پانی پاک اور اس کا [ذبح کیے بغیر] مرا ہوا جانور حلال ہے۔

چنانچہ آپؐ نے سمندر کے مرے ہوئے جانور کے بارے میں بھی بتایا، حالانکہ اس کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ جانتے تھے کہ اس اضافی بیان میں لوگوں کا فائدہ ہے۔

۲۵۰- اسی طرح بعض اوقات یہ بھی جائز ہوگا کہ فتویٰ استفتاء کے موضوع کے علاوہ دوسرے موضوعات سے بھی متعلق ہو۔ یہ اس وقت ہوگا جب مفتی کا خیال ہو کہ استفتاء کے موضوع پر جواب دینا مستفتی کے لیے مفید نہیں ہے، یا یہ کہ وہ اسے سمجھ نہیں سکے گا۔ چنانچہ وہ سوال کا جواب دینے سے پہلو بچاتے ہوئے کوئی ایسی بات بیان کردے جس کی مستفتی کو ضرورت ہوتی ہے۔اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے:

يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ (البقرۃ۲:۱۸۹)

اے نبیؐ! لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو: یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعیین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔ نیز ان سے کہو: یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔

فتویٰ کی وضاحت

۲۵۱- چونکہ فتویٰ شریعت کے حکم کے بیان اور اس کی تبلیغ پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ

واضح بھی ہو اور سمجھ میں آنے والا بھی۔ اس لیے کہ تبلیغ میں یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ وہ واضح اسلوب میں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسالت کی تبلیغ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کام کی انجام دہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (النور۲۴:۵۴) رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔

فتویٰ میں وضوح اس طرح آئے گا کہ زبان آسان ہو اور اسلوب مستفتی کی سمجھ میں آنے والا ہو، اور فتویٰ میں ان اصطلاحات سے بچا جائے جن کو مستفتی نہ سمجھتا ہو۔ اسی طرح فتویٰ کی ایک صفت یہ بھی ہونی چاہیے کہ وہ تردد اور جواب میں شک و ابہام سے خالی ہو۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ اس مسئلے میں دو قول ہیں تو یہ درست نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ مستفتی قطعی جواب کا طالب ہوتا ہے، جس میں وہ مفتی کی تقلید کر سکے اور اس کے قول پر عمل کر سکے۔

فتویٰ کے وضوح اور مستفتی کے سامنے اس کے ایضاح کے ساتھ ایک لازمی امر یہ بھی ہے کہ اگر جواب میں کوئی نیا مفہوم سامنے آ رہا ہے تو اس کے لیے مفتی کچھ تمہید باندھے، تاکہ اس تمہید کے ذریعے مستفتی کے ذہن سے وہ اجنبیت ختم ہو جائے۔

فتویٰ میں اختصار و طوالت

۲۵۲- فتویٰ کی وضاحت کے ساتھ یہ لازم اور ضروری نہیں ہے کہ وہ لمبا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فتویٰ میں اصل چیز ایجاز اور اختصار ہے۔ یہاں تک کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایک قانونی دفعہ ہو۔ اس لیے کہ فتویٰ کا مقصد مستفتی کے لیے کسی مسئلے میں حکم شرعی کا بیان ہوتا ہے۔ اس کا مقصد مختلف آرا کے درمیان تقابل اور ان کے دلائل پیش کرنا نہیں ہوتا۔ اس لیے مفتی کے لیے جائز ہوگا کہ وہ مستفتی کو یہ کہہ کر جواب دے کہ جائز ہے، یا ناجائز ہے۔ یا صرف ہاں یا نہیں میں جواب دے۔

۲۵۳- مگر یہ بھی جان لینا چاہیے کہ فتویٰ میں ایسا اختصار جائز نہیں ہے جس کی وجہ سے مطلوبہ وضاحت اور بیان میں خلل پیدا ہو جائے۔ اس بنا پر مفتی پر لازم ہوگا کہ اپنے فتویٰ میں اتنی طوالت رکھے جتنی ضرورت

ہے، یعنی جتنی طوالت سے فتویٰ کے اندر موجود ابہام دور ہو سکتا ہو۔ مثلاً اگر کسی نے اس شخص کا حکم پوچھا جس نے کوئی کلمہ کفر کہہ دیا ہو تو مفتی فوری طور پر یہ نہ کہے کہ اس کو قتل کرنا جائز ہے، بلکہ یہاں جواب میں کسی حد تک تفصیل اور طوالت درکار ہوگی۔ مثلاً وہ جواب میں یہ کہے گا: اگر یہ بات کھلے شرعی دلائل کے ساتھ ثابت ہو جائے یا وہ اس کا اقرار کرے تو حکمران اس کے سامنے توبہ کی پیش کش کرے گا۔ اگر وہ توبہ کرے گا تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور اگر وہ اپنی بات پر اصرار کرتا ہے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

اسی طرح جب مفتی سے ایسی بات پوچھی جائے جس کے دو مفہوم ہوتے ہیں تو وہ اپنے فتویٰ میں کہے: اگر مستفتی کی بات کا مطلب یہ ہو تو حکم یہ ہوگا، اور اگر اس کا مطلب یہ ہو تو حکم یہ ہوگا۔

۲۵۴- اگر مسئلے میں تفصیل ہو تو مفتی اس کا مطلق جواب نہیں دے گا بلکہ اس کی تفصیل بیان کرے گا۔ اسی طرح اگر سوال کئی مسائل کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے تو مفتی ان کی تفصیل بیان کر دے اور ہر مسئلے سے متعلق فتویٰ بیان کر دے۔

فتویٰ کی دلیل کا بیان

۲۵۵- مفتی کے لیے جائز بلکہ مستحب ہے کہ وہ اپنے فتویٰ میں وہ دلیل بیان کر دے جس پر اس نے اپنے فتوے کی بنیاد رکھی ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ کتاب اللہ کی کوئی آیت یا احادیث رسول میں سے کوئی حدیث پیش کرے، فقہا کا کوئی اجماع بیان کرے یا کوئی نمایاں قیاس۔

اگر مسئلہ ایسا ہو کہ اس میں فقہا و مجتہدین کا نقطہ نظر باہم مختلف ہو تو پھر مفتی کے لیے مستحب ہوگا کہ اپنے فتویٰ میں وہ دلائل بیان کرے جن کی بنا پر وہ کسی رائے کو راجح قرار دیتا ہے اور اسی سے اپنا فتویٰ اخذ کرتا ہے۔ اسی طرح مفتی کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ ان دلائل کا بھی مختصر جائزہ لے جن کو اس نے چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح اگر پہلے سے کوئی غلط فتویٰ موجود ہو اور وہ اس کے فتویٰ کے موضوع سے متعلق ہو تو مناسب ہوگا کہ اپنے فتوے کی دلیل پیش کرے۔ تاکہ مستفتی اور دوسرے لوگ اس کے فتوے کی دلیل اور دوسرے فتوے کی غلطی سمجھ سکیں۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ مستفتی نے ان چیزوں کے بارے میں پوچھا نہ

ہو۔ اگر مستفتی دلیل کا مطالبہ کرے تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس صورت میں مفتی پر لازم ہوگا کہ جواب کے ساتھ دلیل بھی پیش کرے۔

زمان و مکان کی تبدیلی سے فتویٰ میں تبدیلی

۲۵۶- بعض اوقات زمان و مکان کی تبدیلی سے فتویٰ میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب شریعت کا حکم کسی علاقے کے عرف پر مبنی ہو، یہ عرف تبدیل ہو جائے اور نیا عرف کسی شرعی دلیل کے خلاف نہ ہو۔ یا یہ کہ شریعت کا حکم کسی خاص معنی پر مبنی ہو اور وہ معنی بدل جائے۔ جیسا کہ صدقہ فطر کے معاملے میں ہوا۔ چنانچہ ایک حدیث میں کھجور، جو، کشمش اور پنیر سے ایک صاع صدقے کا حکم ہوا۔ علما کہتے ہیں کہ اگر کسی علاقے میں مکئی اور چاولوں کی کثرت ہو تو ان میں سے بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس کی علت علما نے یہ بیان کی ہے کہ حدیث میں مذکور قسمیں اس لیے بیان ہوئیں کہ آپؐ کے دور میں یہ مدینہ منورہ کا غالب غلہ تھا۔ ان قسموں کا بیان حصر اور تخصیص کے لیے نہیں ہے۔

اسی طرح اگر حکم شرعی کسی خاص مقام یا خاص زمانے میں وارد ہوا ہو تو اس کے ساتھ فتویٰ دینا اسی زمان و مکان میں جائز ہوگا، نہ یہ کہ اس کو عمومی حکم سمجھا جائے۔ جیسے چوری کی حد ہاتھ کاٹنا ہے اور یہ اس کا عمومی حکم ہے۔ لیکن جنگ کے دوران دشمن کی سرزمین میں چوری کا حکم ہاتھ کاٹنا نہیں ہے اور اس وقت لازم یہ ہے کہ اقامت حد کو مؤخر کیا جائے۔ اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ لَا تُقْطَعُ الْأَيْدِي فِي الْغَزْوِ. جنگ کے دوران ہاتھ نہیں کاٹے جاتے۔

اسی طرح اگر حکم میں کسی خاص مقصد کا پورا کرنا پیش نظر ہو اور مفتی وفقیہ کا خیال ہو کہ استفتاء کے موضوع میں وہ مقصد پورا نہیں ہوتا، تو اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ اس حکم کے مطابق فتویٰ دے۔ مثلاً کوئی شخص اس سے یہ سوال پوچھے کہ فلاں برائی کو ہاتھ سے روکنے کا کیا حکم ہے؟ تو مفتی کو چاہیے کہ اس کو برائی کے روکنے کا عمومی حکم نہ بتائے۔ یعنی یہ کہ برائی کو ہاتھ سے روکنا چاہیے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ مفتی سمجھتا ہے کہ جس برائی کو روکا جا رہا ہے، اس سے ایک اور بڑی برائی لازم آئے گی۔ یہ ایک وسیع میدان ہے۔ اس میں مفتی کی ذہانت و فطانت اور وسعت نظر اس کے کام آئے گی۔ یعنی یہ کہ وہ دنیا کے حالات، جگہ، زمانہ اور مستفتی کی حالت کو پیش نظر رکھے۔

فتویٰ کی عبارت میں سختی اور قسم

۲۵۷-کسی ضرورت اور مصلحت کی بنا پر فتویٰ کی عبارت میں سختی جائز ہے۔ مثال کے طور پر مفتی اپنے فتویٰ میں یہ کہے: ''یہ وہ بات ہے جس پر مسلمانوں کا اجماع ہے'' یا ''مجھے اس میں کسی اختلاف کا علم نہیں'' یا ''جس نے اس فتویٰ کے حکم کی مخالفت کی تو وہ گناہ گار اور اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہوگا'' اور اس طرح کی دوسری باتیں۔

اسی طرح بعض اوقات ضروری امور کے حوالے سے فتویٰ میں وارد شرعی حکم کے ثبوت پر قسم بھی کھائی جاسکتی ہے۔ یہ اس وقت جائز ہوگا جب حکم کسی قطعی دلیل سے ثابت ہو۔ اس کے جائز ہونے پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے:

وَيَسْتَنْبِئُوْنَكَ أَحَقٌّ هُوَ قُلْ إِيْ وَرَبِّيْ إِنَّهُ لَحَقٌّ وَّمَآ أَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ. (یونس ۱۰:۵۳) پھر پوچھتے ہیں: کیا واقعی یہ سچ ہے۔ جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو: میرے رب کی قسم، یہ بالکل سچ ہے، اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو۔

فتویٰ لکھنے یا بولنے کا انداز

۲۵۸-فتویٰ زبانی بھی جائز ہے اور لکھ کر بھی۔ دونوں حالتوں میں مفتی کو چاہیے کہ اپنے فتویٰ کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور درود پڑھے۔ اسی طرح اپنے فتویٰ کو 'وباللہ التوفیق'، 'واللہ الموفق' یا 'واللہ اعلم' کے الفاظ پر ختم کرے۔

۲۵۹-اگر فتویٰ لکھ کر دیا جاتا ہے کہ تو مفتی کو چاہیے کہ اس کی سطروں اور کلمات کو قریب رکھے اور ان کے درمیان میں خالی جگہ نہ چھوڑے، تاکہ کوئی شخص اس میں اپنی طرف سے جھوٹ کا اضافہ نہ کرسکے۔ فتویٰ کی عبارت سوال کے آخری سطر کے فوراً بعد شروع ہونی چاہیے۔ اگر استفتاء والا صفحہ فتویٰ کے طول کی وجہ سے کم پڑ جائے، تو مناسب یہ ہے کہ باقی جواب اسی صفحے کی پشت پر لکھے، یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اسے مستقل صفحے پر لکھے۔ اس لیے کہ یہ بھی کسی چال باز کے لیے کوئی چال چلنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

۲۶۰-اگر استفتاء کے ورق میں کسی ایسے شخص کا فتویٰ ہو جو فتویٰ کا اہل نہیں ہے تو مفتی کو حق ہوگا کہ اس

کے نام کو قلم زد کر دے، خواہ وہ فتویٰ درست ہی کیوں نہ ہو۔ اگر فتویٰ غلط ہو تو پھر مفتی کے نام کے ساتھ وہ فتویٰ بھی کینسل کر دے۔ البتہ اس میں مستفتی سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔ اگر مستفتی اس سے انکار کرتا ہے تو مفتی کو چاہیے کہ اس کو لکھ کر فتویٰ نہ دے بلکہ زبانی بتا دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس مفتی کا نام نااہل مفتی کے ساتھ ایک کاغذ پر موجود ہوگا تو اس سے لوگ اس غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں کہ پہلے والا مفتی بھی فتویٰ کا اہل ہے، حالانکہ وہ فتویٰ کا اہل نہیں ہے۔ رہی وہ صورت جب کہ پہلے والا مفتی افتاء کا اہل ہو، مگر اس کا فتویٰ غلط ہو تو اس کو اختیار ہوگا کہ مستفتی کی اجازت سے فتویٰ کو قلم زد کر دے، یا اسے دوبارہ مفتی کے پاس بھیج دے اور اس کو اس کی غلطی پر متنبہ کرے تاکہ وہ اس میں تصحیح کرے۔ لیکن اگر فتویٰ قابل قبول ہو تو اس مفتی کو اختیار نہیں ہوگا کہ اس کو مٹائے یا اس میں کوئی اور تبدیلی کر دے، خواہ فتویٰ اس کے اجتہاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

فتویٰ پر عمل

۲۶۱- اگر فتویٰ ایسے شخص نے دیا ہو جو افتاء کا اہل ہے تو مستفتی کو چاہیے کہ اس پر عمل کرے۔ وہ اپنے اس عمل میں مفتی کا مقلد ہوگا۔ البتہ جب مفتی اپنے اس فتوے سے رجوع کر لے، قبل اس کے کہ مستفتی اس پر عمل کرے، اور اس کو معلوم ہو جائے کہ اس نے اپنے فتوے سے رجوع کر لیا ہے تو اس کے لیے حرام ہوگا کہ پھر بھی اس فتوے پر عمل کرے۔ بلکہ اس پر لازم ہوگا کہ دوبارہ استفتاء کرے اور جو فتویٰ ملے اس کے مطابق عمل کرے۔ لیکن اگر اس نے فتویٰ پر عمل کیا، اس کے بعد مفتی نے اپنے فتوے سے رجوع کر لیا اور مستفتی کو معلوم ہوا کہ اس نے رجوع کر لیا ہے تو اس صورت میں بھی مستفتی پر لازم ہوگا کہ دوبارہ استفتاء کر لے اور نئے فتوے پر عمل کرے، خواہ اس کے لیے اسے اپنا پہلا عمل توڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔ یہ بات اس وقت ہوگی جب کہ اس کا عمل ابھی جاری ہو۔ مثلاً یہ کہ اس نے سابقہ فتویٰ کے ذریعے ایک ایسی عورت سے نکاح کیا جس کے ساتھ نکاح اس کے لیے جائز نہیں تھا۔ مگر اس فتویٰ سے مفتی نے رجوع کر لیا۔ مستفتی نے پھر استفتاء کر لیا اور مفتی نے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا تو اس کو چاہیے کہ اپنی اس بیوی سے علاحدگی اختیار کرے۔ یہ تو ہوئی فقہا کی بات، میرے خیال میں عمل کا توڑنا اس وقت ہوگا جب کہ اس کا سابقہ فتویٰ، جس سے مفتی نے رجوع کر لیا ہے، بالکل غلط ہو اور کسی قطعی دلیل کے خلاف ہو۔ رہی وہ صورت جب کہ اس کی کچھ نہ کچھ گنجایش موجود ہو، مفتی نے اس سے رجوع کر لیا ہو اور مستفتی اس پر عمل کر چکا ہو تو اس صورت میں میرا خیال ہے کہ مستفتی کا اپنے عمل کو توڑ دینا ضروری نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس نے ایسے فتویٰ پر عمل کیا ہے جس کی اجازت

موجود تھی اور اس نے دین سمجھ کر اس پر عمل کیا ہے۔

'فتویٰ' اور 'قضا' میں فرق

۲۶۲-مفتی کے فتوے اور قاضی کے فیصلے میں کئی لحاظ سے فرق پایا جاتا ہے۔ان میں سے چند فرق درج ذیل ہیں:

أ-فتویٰ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے آگاہ کرنا ہوتا ہے کہ آدمی سے شرعی طور پر کیا مطلوب ہے اور کیا اس کے لیے مباح ہے۔رہا قاضی کا فیصلہ تو وہ بھی اگر شریعت کے حکم سے آگاہ کرنا ہی ہے لیکن اس میں جو حکم بیان کیا جاتا ہے وہ محکوم علیہ پر لازم ہوتا ہے۔

ب-جن امور میں قاضی کا حکم جاری ہوتا ہے انھی امور میں مفتی کا فتویٰ بھی جاری ہوتا ہے۔البتہ اس کے برعکس نہیں ہوسکتا۔مثلاً عبادات میں فتویٰ تو جاری ہوتا ہے مگر ان میں قاضی کا حکم جاری نہیں ہوتا۔چنانچہ کسی قاضی کو یہ کہنے کا اختیار نہیں کہ یہ نماز درست اور یہ فاسد ہے، یا یہ کہ فلاں پانی ناپاک، اور اس سے وضو جائز نہیں، مگر مفتی ان مسائل میں فتویٰ دے سکتا ہے۔اسی طرح عباوات کے ساتھ ان کے اسباب کو بھی ملایا جاتا ہے۔مثلاً یہ کہ ایک یا دو گواہوں نے رمضان کا چاند دیکھا اور حکمران نے اس کے ثابت ہونے کا حکم دیا، یا اس کا اعلان کر دیا تو اس کی طرف سے یہ فتویٰ شمار ہوگا نہ کہ حکم۔مالکیہ کا اس مسئلے میں یہی مسلک ہے۔

ج-مفتی کا فتویٰ قاضی کے فیصلے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔اس لیے کہ مفتی کا فتویٰ شریعت کا ایک عام حکم تصور کیا جاتا ہے اور اس کا تعلق مستفتی اور غیر مستفتی دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔رہا قاضی کا فیصلہ تو وہ محکوم علیہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، غیر کی طرف تجاوز نہیں کرتا۔

۴

اسلام کا نظامِ حسبہ

تمہید

۲۶۳- گذشتہ بحث میں ہم کہہ چکے ہیں کہ ایک مسلمان سے شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے تمام افعال اور اقوال اسلامی نظام کے مطابق ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل علم کو حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کے احکام سے آگاہ کریں اور انھیں اللہ کی نازل کی ہوئی حدود کی تعلیم دیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو نہیں جانتے، حکم دیا ہے کہ سیکھیں۔

سیکھنے کے طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ اہل علم سے پوچھا جائے۔ اسی مقصد کے لیے اسلام میں نظامِ افتاء بنایا گیا ہے، جس کے بارے میں ہم نے گفتگو کی ہے۔ مگر اس کے باوجود بعض اوقات ایک مسلمان اسلامی شریعت سے جاہل ہوتا ہے، یا تو اس وجہ سے کہ اس کے پاس علما کی تبلیغ پہنچی نہیں ہوتی، یا پھر اس وجہ سے کہ جس چیز کا سیکھنا اس پر لازم تھا، اُس کے سیکھنے میں اس نے خود کوتاہی کی۔ مثلاً یہ کہ جو کام اس سے متعلق تھے ان کے بارے میں اس استفتاء نہیں کیا۔ اس طرح آدمی اپنی جہالت کی وجہ سے گناہ اور شریعت کی نافرمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ حدود کو جانتا ہے مگر اس کے باوجود اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہوئے گناہ میں پڑ جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں گناہ، یا تو اس طرح ہوتا ہے کہ منکر کا ارتکاب کیا جائے یا معروف کو چھوڑ دیا جائے۔ منکر کیا جائے تو اس کا ازالہ لازم ہوتا ہے اور معروف کو چھوڑ دیا جائے تو اس کا حکم دینا لازم ہو جاتا ہے۔ منکر کے ظاہر ہونے پر اس کا ازالہ اور معروف کو چھوڑ دینے پر اس کا حکم دینا، یہی بنیاد اور مغز ہے اس چیز کا جو اسلامی شریعت میں 'نظامِ حسبہ' کے نام سے معروف ہے اور اس مبحث میں ہم اسی کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

منہج بحث

۲۶۴۔ گفتگو کو آسان بنانے اور موضوع کا احاطہ کرنے کے لیے ہم اس مبحث کو پانچ بڑے عنوانات میں تقسیم کریں گے۔

۱۔حسبہ کی تعریف، جواز اور اسلام میں مقام ومرتبہ،

۲۔محتسب،

۳۔محتسب علیہ،

۴۔محتسب فیہ،اور

۵۔احتساب

۱-حسبہ کی تعریف، جواز اور مقام ومرتبہ

لغوی معنی

۲۶۵-لغت میں حسبہ گنتی اور اکتفا کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ **احتسب بکذا** .یعنی اس پر اکتفا کیا۔**احتسب علی فلان الأمر** .یعنی فلاں کے کام کو نا پسند کیا۔**احتسب الأجر علی اللہ**. یعنی اپنا اجر اس کے ہاں ذخیرہ کر لیا۔حسبہ احتساب سے اسم ہے اور یہ اس فعل میں استعمال ہوتا ہے جس میں اللہ کے ہاں اجر طلب کیا جاتا ہے۔

اصطلاحی معنی

۲۶۶-فقہا کی اصطلاح میں حسبہ کی تعریف یہ ہے:

أمرٌ بالمعروفِ إذا ظهَرَ تركُهُ ونهيٌ عنِ المنكَرِ إذا ظهرَ فِعلُهُ. معروف کا چھوڑنا ظاہر ہو جائے تو اس کا حکم دینا اور منکر کا فعل ظاہر ہو جائے تو اس سے روکنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسبہ کا تعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب سے ہے۔ بلکہ فقہا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بھی احتساب اور حسبہ کا نام دیتے ہیں، بشرطیکہ اس کا کام کرنے والا اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے ہاں ثواب کمانے کی نیت سے یہ سب کچھ کرے۔

جواز کی دلیل

۲۶۷-قرآن کریم اور سنت مطہرہ دونوں اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ شریعت میں حسبہ مطلوب ہے۔ چنانچہ ہر وہ آیت جو امر بالمعروف اور نہیں عن المنکر پر دلالت کرتی ہو وہ حسبہ کی مشروعیت کی دلیل بھی

ہے اور اس بات کی بھی کہ شریعت حسبہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم حسبہ کے مطلوب ہونے پر مختلف اسالیب کے ساتھ دلالت کرتا ہے۔ وہ کبھی اس کا حکم دیتا ہے، کبھی اس کو مومنوں کی ایک لازمی صفت اور اس امت کے امتِ خیر ہونے کا سبب بتاتا ہے۔ وہ واضح کرتا ہے کہ زمین میں اقتدار حاصل کرنے کا اصل مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اس کا ترک لعنت کا مستحق بنا دیتا ہے۔ ان آیات میں سے چند آیات حسب ذیل ہیں۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (آل عمران ۳:۱۰۴) تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَّأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ ۷۱:۹) مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (آلِ عمران ۳:۱۱۰) اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔

الَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ. (الحج ۲۲:۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ. كَانُوْا لَايَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ. (المائدۃ ۵:۷۸-۷۹) بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤدؑ اور عیسیٰ

بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیوں کہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ برا طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا۔

۲۶۸- سنت نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بھی حسبہ کی مشروعیت پر اور اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حسبہ شریعت میں مطلوب ہے۔ اس طرح کی احادیث میں ایک تو وہ مشہور حدیث ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

مَنْ رَاٰی مِنکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَإِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ. تم میں سے جو شخص کوئی برائی ہوتی دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے روکے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

اس کے علاوہ چند دیگر احادیث بھی پیش کی جاتی ہیں:

لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْھَوُنَّ عَنِ الْمُنْکَرِ، أَوْ لَیُسَلِّطَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ شِرَارَکُمْ، ثُمَّ یَدْعُوْ خِیَارُکُمْ، فَلَا یُسْتَجَابُ لَھُمْ. تم ضرور بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر تمھارے شر پسند لوگوں کو مسلط کرے گا، پھر تمھارے اچھے لوگ بھی دعائیں کریں گے، مگر وہ قبول نہیں ہوں گی۔

أَفْضَلُ شُھَدَاءِ أُمَّتِیْ رَجُلٌ قَامَ إِلٰی إِمَامٍ جَائِرٍ، فَأَمَرَہُ بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَاہُ عَنِ الْمُنْکَرِ، فَقَتَلَہُ عَلٰی ذٰلِکَ. میری امت میں افضل ترین شہید وہ ہے جو ایک ظالم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو، اس کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے، اور وہ اس پر اسے قتل کر دے۔

جواز کی حدود

۲۶۹- حسبہ کو، جو دراصل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، کبھی اس پہلو سے دیکھا جاتا ہے کہ بذاتِ خود مطلوب ہے اور کبھی اس پہلو سے کہ یہ امر اور نہی ہے۔ چنانچہ اگر اس کا مقدم الذکر پہلو لے لیا جائے تو یہ فرض کفایہ قرار پاتا ہے۔ اس لیے اگر کچھ لوگ اس کو کریں گے تو باقی لوگوں سے اس کی فرضیت ساقط ہو جائے

گی، اور کوئی بھی اس کو نہیں کرے گا تو جو جو لوگ اس پر قادر ہوں گے وہ سب گناہ گار ٹھیریں گے۔ اسی پہلو کے لحاظ سے یہ بعض اوقات فرضِ عین بھی بن جاتا ہے جب کہ کسی کو اسی کام کے لیے مقرر کیا جائے۔ عام مسلمان کے لحاظ سے یہ کام واجب نہیں بلکہ مستحب ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ کچھ مخصوص حالات میں حرام بھی بن جاتا ہے، جس کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

مؤخر الذکر پہلو کے لحاظ سے بعض فقہا کے نزدیک یہ واجب یا مستحب ہوگا۔ اس کا فیصلہ اس کے موضوع یعنی جس چیز کے ساتھ اس کا تعلق ہے، کو دیکھ کر کیا جائے گا۔ اگر یہ کسی واجب کام کا امر ہو یا کسی حرام سے ممانعت ہو تو حسبہ واجب ہوگا، خواہ اس لحاظ سے ہو کہ یہ فرضِ عین ہے، یا اس لحاظ سے کہ یہ فرضِ کفایہ ہے۔ اگر اس کا موضوع، یعنی جس چیز کے ساتھ اس کا تعلق ہے، کوئی مستحب امر ہوگا تو حسبہ بھی مستحب شمار کیا جائے گا۔

بعض فقہا کہتے ہیں کہ حسبہ ذاتی طور پر ہمیشہ واجب ہوتا ہے۔ اس میں موضوع یا متعلّقات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اسلام میں حسبہ کا مقام ومرتبہ

۲۷۰- اسلام میں حسبہ کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے، اس لیے کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین خصوصیات میں سے ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ (الاعراف ۷:۱۵۷) وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے روکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو بھی اسی صفت کے ساتھ متصف کیا ہے جس کے ساتھ اپنے رسول کو، تاکہ بعد میں امت وہی کام سنبھالے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنبھالا تھا۔ فرمایا:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (التوبۃ ۷۱:۹) مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کے بہت بڑے اصولوں میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا کے ہاں حسبہ کا اصول بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے اور انھوں نے اس کی شان کو بہت بلند کیا ہے۔ ابن الاخوۃ کے نام سے شہرت پانے والے عظیم فقیہ کا قول ہے:

حسبہ دینی معاملات کی بنیاد ہے۔ صدرِ اول کے ائمہ یہ کام بذاتِ خود انجام دیتے تھے۔ اس لیے کہ اس سے لوگوں کی اچھی طرح اصلاح ہوتی ہے اور اس کا ثواب بھی عظیم ہے۔ حسبہ اس کو کہتے ہیں کہ جب معروف کا ترک ظاہر ہو جائے تو اس کا حکم دیا جائے اور جب منکر کا فعل ظاہر ہو جائے تو اس سے روکا جائے، اور لوگوں کے درمیان اصلاح کی جائے۔

علامہ ابن خلدونؒ اپنے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

حسبہ ایک دینی فریضہ ہے۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعلق رکھتا ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان لوگوں پر فرض ہے جو مسلمانوں کے معاملات کے نگران ہوتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ جس کو اہل سمجھیں، اسے اس کام پر مقرر کر دیں۔

جواز کی حکمت

۲۷۱- اس کے جواز کی حکمت ظاہر ہے۔ اس لیے کہ اسلام کی دعوت اور اس کی تبلیغ، اپنے تمام معانی کے ساتھ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں آتی ہے۔ اسی طرح حسبہ کے مشروع ہونے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا جائے اور اس کی رحمت کا نزول طلب کیا جائے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان کے گناہ اس کے لیے مصائب اور تادیبی و انتقامی عذاب کے نزول اور بعض اوقات کسی قوم کی ہلاکت کا سبب ہوتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ أَصَابَكُم مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُواْ عَنْ كَثِيرٍ. (الشوریٰ ۴۲:۳۰) تم لوگوں پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے، اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے۔

اگر ایک طرف کفر، فسوق اور نافرمانی مصائب اور ہلاکت کا سبب ہے تو دوسری طرف بعض اوقات

ایک شخص یا کچھ لوگ گناہ کرتے ہیں اور دوسرے اس پر خاموش رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ نہ امر بالمعروف کرتے ہیں اور نہ نہی عن المنکر، تو یہ بھی ان کے گناہوں میں شامل ہو جاتا ہے، اور ان کو بھی وہی مصائب پہنچتے ہیں جو دوسروں کو اپنی نافرمانیوں کے سبب پہنچتے ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الْمُنْكَرَ فَلَمْ يُغَيِّرُوهُ أَوْشَكَ اللهُ أَنْ يَعُمَّهُمْ بِعَذَابٍ مِنْهُ. لوگ جب منکر کو دیکھتے ہیں اور اس کو روکتے نہیں ہیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔

پھر جس طرح کہ گناہ مصیبت اور عذاب کا سبب ہے، اسی طرح اطاعت نعمت، آسانی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اسی طرح جاری وساری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ. (ابراہیم ۱۴:۷) اگر تم شکر گزار بنو گے تو میں اور زیادہ نوازوں گا۔

فَآتَاهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ. (آل عمران ۳:۱۴۸) آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّلَأَجْرُ الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ. (النحل ۱۶:۴۱-۴۲) جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! جان لیں وہ مظلوم جنھوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے)۔

حسبہ کے ارکان

۲۷۲- حسبہ میں سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ کوئی ہو جو یہ کام انجام دے، اس شخص کو محتسب کہتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر حسبہ کسی کے اوپر جاری ہوگا، یہ محتسب علیہ کہلاتا ہے۔ جس کام کے کرنے یا نہ کرنے پر حسبہ جاری ہوتا ہے وہ محتسب فیہ ہوتا ہے۔ محتسب کے فعل حسبہ کو احتساب کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ حسبہ کے چار ارکان ہیں: محتسب، محتسب علیہ، محتسب فیہ اور احتساب۔ ذیل کے مطالب میں انھی چار ارکان کے بارے میں بات کی جائے گی۔

۲۔محتسب

محتسب کون!

۲۷۳۔محتسب وہ شخص ہوتا ہے جو احتساب یعنی امر بالمعروف اور نہی المنکر کا کام کرتا ہے۔مگر فقہا کے ہاں مشہور یہ ہے کہ اس لفظ کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جس کو حکمران نے حسبہ کے کام کے لیے مقرر کیا ہو۔ فقہا اس کو 'والی الحسبہ' [وزیر احتساب] کا نام بھی دیتے ہیں۔اگر کوئی شخص حکمران کے تقرر کے بغیر یہ کام انجام دیتا ہے اس کو 'متطوع' (رضا کار) کہا جاتا ہے۔چنانچہ وہ 'محتسب' اور 'متطوع' کے درمیان فرق کرتے ہیں۔

'محتسب' اور 'متطوع' میں فرق

۲۷۴۔فقہائے کرام محتسب اور متطوع کے درمیان کئی لحاظ سے فرق کرتے ہیں۔

أ۔محتسب پر احتساب فرض عین ہے، اس لیے کہ وہ اس کی ولایت رکھتا ہے اور اسے اسی کام کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔محتسب کے علاوہ دوسرے لوگوں پر یہ فرض کفایہ کا درجہ رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ محتسب کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ وہ جس کام کے لیے مقرر کیا گیا ہے، اسے چھوڑ کر کسی اور کام میں مشغول ہو جائے۔ متطوع پر یہ بات لازم نہیں ہوتی۔

ب۔فقہا کہتے ہیں کہ محتسب اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ لوگ ضرورت کے وقت دوسروں کے خلاف اس سے **مدد مانگیں**۔یہی وجہ ہے کہ جب لوگ اس سے مدد طلب کرتے ہیں تو اس پر لازم ہوتا ہے کہ مظلوم کی بات سنے **اور** اس سے ظلم کو دفع کرے۔متطوع پر نہ کسی کی شکایت سننا لازم ہوتا ہے اور نہ اس کو دور کرنا۔

ج۔فقہا یہ بھی کہتے ہیں کہ محتسب تلاش کرے گا کہ کہیں کھل کر منکر تو نہیں ہو رہا، تاکہ اس کا ازالہ کیا جا سکے۔**اسی طرح وہ** معلوم کرے گا کہ کہیں کھلم کھلا کسی معروف کو ترک تو نہیں کیا جاتا، تاکہ اس کی اقامت کا

حکم دیا جا سکے۔ متطوع پر ان میں کوئی کام بھی لازم نہیں ہے۔

ہ۔فقہا کا یہ بھی کہنا کہ محتسب کو اپنے کام میں تعاون کے لیے کارکنان کا تقرر کرنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ وہ جس کام پر مقرر ہے، اس کے لیے وہ اپنے ساتھ اتنے معاونین مقرر کر سکتا ہے جتنی اس کو ضرورت ہے۔ مگر متطوع کے لیے اس کی اجازت نہیں ہے۔

و۔فقہا کہتے ہیں کہ محتسب کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ ظاہری منکرات پر مجرموں کو تعزیر دے البتہ وہ اس سے تجاوز کر کے حدود قائم نہیں کر سکتا، مگر متطوع کو تعزیر کا اختیار بھی نہیں ہے۔

ز۔محتسب کے لیے اپنے کام پر بیت المال سے اجرت لینا جائز ہے مگر متطوع کو اس کا حق نہیں ہے۔

ز۔محتسب کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ عرف پر مبنی مسائل کے بارے میں اجتہاد کرے اور ان میں سے جن کو جاری رہنے کے قابل سمجھے ان کو جاری رہنے دے اور جن کو روکنے کے قابل سمجھے ان کو روک دے، مگر متطوع کو یہ اختیار نہیں ہوتا۔

ہماری رائے

۲۷۵۔محتسب اور متطوع کے درمیان ان تفریقات کی بنیاد یہ ہے کہ ایک کو حسبہ کے کام کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور دوسرے کو نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حسبہ اسلام کے فرائض میں سے ہے، چنانچہ اس کو انجام دینا اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ کسی کو حکومت کی طرف سے اس کے لیے مقرر کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کو اس کام کے لیے مقرر نہ کیا گیا ہو اس کو متطوع [رضا کار] کا نام دیا جاتا ہے جس کا مطلب واضح ہے۔ یہ لفظ اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ جو شخص حسبہ کے لیے مقرر نہ کیا گیا ہو اور پھر بھی وہ یہ کام کرتا ہے تو یہ کام اس کے لیے مستحب ہے، نہ کہ واجب۔

اس کے باوجود حکمران کی طرف سے حسبہ کا نظام بنانا، اس کے لیے 'اہل' ذمہ داروں کا تعین میرے خیال میں مستحسن امور میں ہے، تاکہ حسبہ کے نام پر معاشرے میں افراتفری نہ پھیلے۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ یہ انتظام دوسروں کے لیے ان کی حسبہ کی ذمہ داری شرعی طریقے سے ادا کرنے میں مانع نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری رائے وہ نہیں ہے، جس کے بارے میں فقہا نے کہا ہے کہ محتسب کو اپنے لیے معاونین مقرر

کرنے کا حق ہے اور متطوع کو نہیں۔ ہماری بات کی دلیل یہ ہے کہ حسبہ کے لیے معاونین کا تقرر تعاون علی البر والتقویٰ میں سے ہے۔ اس لیے جو شخص حسبہ کا کام کرتا ہے اسے اس تعاون سے نہیں روکا جانا چاہیے، صرف اس وجہ سے کہ وہ حسبہ کے لیے مقرر نہیں کیا گیا۔ ہاں، یہ ضرور ہونا چاہیے کہ وہ شخص حسبہ کا اہل ہو اور اس میں حسبہ کی شرائط پائی جاتی ہوں۔ اسی طرح یہ بھی ہماری رائے نہیں ہے کہ متطوع کو ظاہری منکرات پر تعزیر کی اجازت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک کم از کم اس کو اتنا اختیار ہونا چاہیے کہ سارے منکرات نہ سہی بعض پر اس کو تعزیر کی اجازت ہو۔ اس لیے کہ تعزیر کے کئی درجات ہیں، چنانچہ مناسب یہ ہے کہ اس کو ہر قسم کی تعزیر سے نہ روکا جائے بلکہ اسے بعض سخت قسم کی تعزیرات سے روکا جائے جیسے مار پیٹ اور کوڑے لگانا وغیرہ۔

محتسب کے اختیارات

۲۷۶۔ محتسب اپنے اختیارات شرع متین سے اخذ کرتا ہے۔ اس لیے کہ مسلمان حسبہ کا مکلّف ہے اور جہاں مکلّف ہونے کی صفت پائی جاتی ہے اس کے ساتھ اسے یہ کام انجام دینے کے لیے اختیارات بھی موجود ہوتے ہیں۔ مگر جس وقت حکمران حسبہ کے امور کو منظّم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے اہل لوگوں کو مقرر کرتا ہے تو اس صورت میں جو شخص اس کام کے لیے مقرر ہے اس کے پاس ایسے شخص کے مقابلے میں زیادہ اختیارات ہوں گے جو مقرر نہیں کیا گیا۔ اس کے باجود، جس شخص کو حکمران محتسب مقرر کرتا ہے وہ بھی اپنے اختیارات شرع متین ہی سے حاصل کرتا ہے، اگر چہ اس صورت میں وہ اختیارات حکمران کی طرف سے آئے ہوتے ہیں، اس اعتبار سے کہ حکمران کا حسبہ کو منظّم کرنا بھی جائز ہوتا ہے، گویا کہ یہ اختیار شریعت نے حکمران کو دیا ہوتا ہے کہ وہ کسی کو محتسب مقرر کرے۔

اختیارات کا مقصود

۲۷۷۔ محتسب خواہ حکمران کی طرف سے مقرر ہو یا نہ ہو، اس کے اختیارات کا مقصود زمین میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کرنا اور اس کو فساد سے پاک کرنا ہوتا ہے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور کافروں کا کلمہ پست ہو۔ اور یہ مقصود دراصل اسلام کی ہر ولایت کا ہے۔ چنانچہ دو ولایتوں کے درمیان جو بھی فرق ہوگا وہ اس لحاظ سے ہوگا کہ اس کا دائرہ کیا ہے اور اس کے متعلقات کیا ہیں۔ اس طرح تمام قسم کی ولایتیں باہم مل کر ایک ہی مقصود کے لیے کام کرتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کیا جائے اور اس کو فساد اور

مفسدین سے پاک کیا جائے۔

محتسب اور قاضی کے اختیارات

۲۷۸-فقہا نے محتسب اور قاضی کی ولایت کے درمیان فرق کے پہلوؤں پر بحث کی ہے۔انھوں نے اس بحث میں دونوں کے درمیان فرق کے جو پہلو تخریج کیے ہیں ان کا بیان حسب ذیل ہے۔

أ-اتفاقی پہلو

یہ دونوں ولایتیں اس بات میں باہم متفق ہیں کہ محتسب کے ہاں بھی مدد کی درخواست کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح وہ دعوے بھی ان کے سامنے پیش ہو سکتے ہیں جو لوگوں کے حقوق کے حوالے سے مخصوص نوعیت کے حامل ہوں، جن کا تعلق ناپ تول میں کمی بیشی کرنے سے ہو، یا خرید وفروخت کے معاملات میں ملاوٹ اور دھوکے بازی کے ساتھ ہو، یا اس کے ساتھ کہ ایک آدمی قرض کی ادائیگی کر سکتا ہے مگر وہ قرض خواہ کو اس کا قرض نہیں لوٹاتا۔ محتسب کو ان دعوؤں کی سماعت کرنے اور ان پر غور کرنے کا حق ہے، البتہ اس کے علاوہ جو دعوے ہیں ان کی سماعت کا حق اسے حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق، جیسا کہ فقہا کہتے ہیں: ''اس منکر کے ساتھ ہے جو ظاہر ہو اور جس کے ازالے کے لیے اس کو مقرر کیا گیا ہے اور اس کی خصوصیت اس معروف کے ساتھ ہے جو واضح ہو اور جس کی اقامت کے لیے اس کو مقرر کیا گیا ہے۔''

محتسب اور قاضی کو حق ہے کہ مدعا علیہ پر لازم کر دے کہ وہ مستحق کو اس کا حق ادا کر دے۔ یہ ان معاملات میں ہوگا جن کا فیصلہ کرنے کا اس کو اختیار ہوتا ہے۔ اور یہ حقوق اس وقت لازم ہوں گے جب یہ مدعا علیہ کے اقرار سے ثابت ہوں اور ان حقوق کو ادا کرنے پر اس کی قدرت بھی ثابت ہو جائے۔ محتسب کو ان حقوق کے مدعا علیہ پر لازم کرنے اور اسے ان کی ادائیگی پر مکلّف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ادائیگی میں تاخیر 'مطل' یعنی ٹال مٹول ہوتا ہے اور مطل ایک منکر ہے جس کی شارع نے ممانعت کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَطْلُ الغَنِيِّ ظُلْمٌ، يَحِلُّ مَالُهُ وَعِرْضُهُ. مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ [قرض خواہ کے لیے] اس کا مال اسباب لینا حلال ہے۔

جب کہ محتسب کو تو مقرر ہی اسی لیے کیا جاتا ہے کہ وہ منکر کا ازالہ کرے گا۔

ب- اختلافی پہلو

اولاً- دو جہتوں سے محتسب کے اختیارات قاضی کے اختیارات سے کم ہیں:

۱- جو دعوے کھلم کھلا منکرات کے دائرے سے باہر ہوں ان کی سماعت کا اختیار محتسب کو نہیں ہے، یعنی ان تین دعوؤں کے بارے میں جن کی طرف ہم نے وجوہ اتفاق کے ضمن میں اشارہ کیا ہے۔

۲- اس کو ان حقوق کی سماعت کا اختیار ہے جن کا مدعا علیہ خود اعتراف کرے، لیکن جن حقوق سے انکار کیا جائے تو ان کی سماعت کا اختیار اس کو نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں حق، مدعی کی طرف سے پیش کیے جانے والے گواہوں یا انکار کرنے والے کی طرف سے قسم کے بغیر ثابت نہیں ہوگا اور ان چیزوں کا اختیار قاضی کو ہے، محتسب کو نہیں۔

ثانیاً- دو جہتوں سے محتسب کے اختیارات قاضی کے اختیارات سے زیادہ ہیں:

۱- محتسب کو حق ہے، کہ جو کچھ معروف ہو اس کا حکم دے اور جو کچھ منکر ہے اس سے روکے، خواہ اس کا مقدمہ کسی نے اس کے سامنے نہ اُٹھایا ہو اور کوئی مدعی اس کی پیروی کے لیے موجود نہ ہو۔ قاضی کو یہ اختیار نہیں ہے، سوائے اس کے کہ کوئی اس کے سامنے مقدمہ پیش کرے اور کوئی مدعی اس کا دعویٰ کرنے کے لیے حاضر ہو۔

۲- محتسب کو ظاہری منکرات سے ممانعت کے لیے قوت استعمال کرنے کا اختیار حاصل ہے، جب کہ یہ اختیار قاضی کو نہیں ہے۔ اس لیے کہ حسبہ کی بنیاد، جیسا کہ فقہا فرماتے ہیں، رعب پر قائم ہے اور اس کے ساتھ سختی کا رویہ بالکل مناسب ہے، اس مقصد کے لیے محتسب اپنے لیے معاونین کا تقرر بھی کرسکتا ہے اور اس کے لیے قوت بھی استعمال کرسکتا ہے۔ رہا قضا کا معاملہ تو اس کا کام لوگوں کو انصاف فراہم کرنا اور گواہوں کو سننا ہوتا ہے تاکہ مستحق اور غیر مستحق کو معلوم کیا جاسکے اور اس کام کے لیے بردباری اور وقار مناسب ہے۔ اس لیے قاضی کو سختی، ترشی اور رعب ڈالنے سے دور رہنا چاہیے۔

۲۷۹- فقہا نے جو کچھ کہا ہے اس کے ساتھ ہم ایک اور فرق کا اضافہ کرسکتے ہیں، جس کی بنا پر محتسب کے اختیارات قاضی کے اختیارات سے زیادہ ہیں۔ وہ یہ ہے کہ محتسب کو اُن امور میں امر و نہی کا اختیار حاصل

ہے جن میں قاضی کو قدرت حاصل نہیں ہوتی اور نہ ان میں اس کا فیصلہ جاری ہوسکتا ہے۔ مثلاً محتسب کو اختیار ہے کہ وہ نماز کے اوقات میں لوگوں کو نماز کا حکم دے اور ان کو جمعہ اور دیگر جماعتوں کے قیام پر ابھارے۔ اسی طرح محتسب کو اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو مسجد میں ناپسندیدہ کاموں سے روکے، نماز میں تاخیر پر تنبیہ کرے اور اس طرح کے دیگر امور، جن میں قضا کا فیصلہ جاری ہوتا ہے، نہ ان کی سماعت ہوسکتی ہے۔

محتسب کی شرائط

۲۸۰- فقہا نے محتسب میں کچھ شرائط کو ملحوظ رکھا ہے جن کی بنا پر وہ احتساب کا اہل ہوتا ہے۔ یہ شرائط حسب ذیل ہیں:

۱- مکلّف ہونا

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مکلّف ہو۔ اس لیے کہ جو مکلّف نہیں ہوتا اس پر کوئی امر لازم نہیں ہوتا، اسی طرح شریعت کا کوئی حکم اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ فقہا کی اصطلاح میں مکلّف وہ ہوتا ہے جو عاقل اور بالغ ہو۔ یہ دراصل مسلمان پر احتساب کے واجب ہونے کی شرط ہے۔ رہا حسبہ کا امکان اور اس کا جواز، تو اس کے لیے صرف عقل کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ ایک سمجھ دار بچہ اگرچہ مکلّف نہیں ہوتا، مگر اس کے لیے جائز ہے کہ کسی منکر کو روکے، اور کسی کو اسے اس کام سے روکنے کا اختیار نہیں۔ اس لیے کہ اس کا کارِ احتساب ایک ثواب کا کام ہے اور وہ اس کا اہل ہے، جیسے نماز۔ اس کے احتساب کا حکم دوسرے اختیارات اور ولایتوں کی طرح نہیں ہے کہ اس کے لیے مکلّف ہونے کی ضرورت ہو۔

۲- مسلمان ہونا

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو اور یہ شرط بالکل واضح ہے، اس لیے کہ حسبہ دین کی نصرت ہے اور وہ شخص دین کی نصرت کا اہل وہ شخص نہیں ہوسکتا جو خود دین کا منکر ہو۔

۳- حکمران کی اجازت

۲۸۱- تیسری شرط حکمران یا افسر مجاز کی اجازت ہے۔ یہ شرط محل نظر ہے۔ اس لیے کہ محتسب جب

حکمران کی طرف سے مقرر ہوتا ہے تو اس کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لیے کہ اس کو مقرر ہی احتساب کے لیے کیا جاتا ہے۔ رہی وہ صورت جب کہ اس کو حکمران نے مقرر نہ کیا ہو، جو متطوع کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کے لیے اگر ہر قسم کے حسبہ میں اجازت کو شرط کیا جائے تو اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ بعض نصوص اس شرط کو رد کرتی ہیں۔ اس لیے کہ ہر مسلمان جب کسی منکر کو دیکھے اور وہ اس کے ازالے پر قادر ہو تو اس پر لازم ہے کہ اس کو بدل ڈالے۔ اس میں حکمران کی اجازت کی شرط نہیں لگائی گئی۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ سلف صالحین کسی حکمران کی اجازت کے بغیر ہمیشہ حسبہ کا کام کرتے رہے۔ بلکہ اس سے ایک قدم آگے، بات یہ ہے کہ خود حکمران پر بھی حسبہ کا اجرا ہوتا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ حکمران پر نکیر کرنے کے لیے اس سے اجازت لے گا۔

ہاں، اگر حکمران کی اجازت کی شرط حسبہ کی بعض قسموں کے لیے لگائی جائے اور یہ قسمیں وہ ہیں جن میں تعزیر جاری ہوتی ہے، ان میں معاونین رکھے جاسکتے ہیں اور قوت کا استعمال کیا جاسکتا ہے، تو اس شرط کے کچھ پہلو قابل قبول بھی ہیں کیوں کہ وہ مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔ بعض پہلوؤں کی عام آدمی کے لیے اجازت نہ ہونے کہ وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا احتساب بعض اوقات فتنہ اور افراتفری کا ذریعہ بنتا ہے اور اس سے حسبہ کے نام پر لوگوں کے درمیان لڑائی جھگڑے شروع ہوجاتے ہیں۔ جب حکمران سے اجازت کی شرط رکھی جائے تو اس سے یہ نقصانات دفع ہوجاتے ہیں۔ اس صورت میں اجازت ضروری ہوگی اس لیے کہ ضرر کو دفع کرنا ضروری ہے اور اس کے دفع کے لیے جو چیز لازم ہو وہ بھی جائز ہوتا ہے۔ حسبہ کی بعض صورتوں کے لیے حکمران سے اجازت کی شرط کے اس جائز پہلو کے ساتھ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جب رضا کار محتسب کو یقین ہو کہ اس کے کارِ احتساب سے کوئی فتنہ برپا نہیں ہوگا تو اس کے لیے منکر کا ازالہ جائز ہے، خواہ اس کے لیے معاونین رکھنا، قوت کا استعمال کرنا اور براہِ راست تعزیر جاری کرنا پڑے۔ رضا کار محتسب کے لیے یہ سب کچھ اس وقت جائز ہوگا جب کہ یہ اقدامات کرنا ضروری ہوں اور حکمران سے اجازت لینے کی مہلت نہ ہو۔

۴- عادل ہونا

۲۸۲- محتسب کی چوتھی شرط عدالت ہے۔ اس کو بعض فقہا نے شرط قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک محتسب کے لیے عادل ہونا چاہیے، یعنی یہ کہ وہ فاسق نہ ہو۔ عادل ہونے کے مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے علم

پر عمل کرتا ہو اور اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ اس قول کے حق میں درج ذیل دلائل سے استدلال کیا جا سکتا ہے:

أ- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ. (البقرة ۲:۴۴) تم دوسروں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟

ب- مسلمان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو جس چیز کی طرف بلاتا ہے، خود بھی اس پر عمل کرے اور اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ تاکہ اس کے قول میں وہ اثر پیدا ہو جو منکر کو رفع کرنے اور لوگوں کے لیے اس کی بات ماننے کا ذریعہ بنے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا:

وَّمَآ أُرِيْدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلٰى مَآ أَنْهَاكُمْ عَنْهُ إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ. (ھود ۱۱:۸۸) اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔ میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک بھی میرا بس چلے۔

حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رَأَيْتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِيْ رِجَالاً تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ بِالْمَقَارِيْضِ، فَقُلْتُ لَهُ: مَنْ هٰؤُلَاءِ يَاجِبْرِيْلُ؟ قَالَ: هٰؤُلَاءِ خُطَبَاءُ أُمَّتِكَ الَّذِيْنَ يَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَيَنْسَوْنَ أَنْفُسَهُمْ. جس رات مجھے معراج کے لیے لے جایا گیا اس رات میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹوں کو قینچیوں سے کاٹا جا رہا ہے، میں نے جبریلؑ سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا: یہ آپ کی امت کے وہ خطیب ہیں جو دوسروں کو بھلائی کا حکم دیتے تھے اور خود کو بھول جاتے تھے۔

۲۸۳- بعض کہتے ہیں کہ محتسب کے لیے عادل ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ شرط یہ ہے کہ آدمی منکر کا ازالہ کر سکے۔ اس لیے کہ کوئی نہیں ہوگا جس سے کوئی نہ کوئی گناہ سرزد نہ ہو، اور گناہ سے عدالت میں فرق آتا ہے۔ چنانچہ ایسی شرط کیوں کر لگائی جا سکتی ہے جس کا کسی مسلمان میں موجود ہونا ممکن ہی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا:

اگر معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کے لیے ضروری قرار دیا جائے کہ وہ خود اس کے گناہ میں مبتلا نہ ہو تو کسی کو بھی معروف کا حکم دینے [اور کسی منکر سے روکنے] کا اختیار نہیں ہوگا۔

۲۸۴- میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ بنیادی طور پر، اور تفصیل میں جائے بغیر اجمالی طور پر محتسب کے لیے عادل ہونا شرط نہیں ہے۔ اس لیے کہ احتساب بھی دوسرے اسلامی فرائض کی طرح ایک فرض ہے اور اس کا انحصار اتنی ہی بات پر ہوتا ہے جتنی بات کا وہ فرض تقاضا کرتا ہو۔ اس کے تقاضے میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ محتسب اس معنی میں عادل ہو، جو فقہا کی اصطلاح میں معروف ہے۔ اس لیے کہ محتسب اگر کسی کام کا حکم دیتا ہے یا کسی کام سے روکتا ہے تو یہ شریعت میں اچھا اور مطلوب امر ہے۔ حق کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کی پیروی کی جائے جو شخص حق کہتا ہے اس کی بات کو قبول کیا جائے، اس بات سے آنکھیں بند کر کے کہ کہنے والا اس پر خود عمل کرتا ہے یا نہیں کرتا۔

عدل کے شرط کے قائلین نے جس دلیل سے استدلال کیا ہے اس میں ان کے لیے کوئی استدلال موجود نہیں ہے۔ شریعت میں اگر کسی کی اس بنا پر مذمت کی گئی ہے کہ وہ دوسروں کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور خود کو بھول جاتا ہے، تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو بھلائی کا حکم کیوں دیتا ہے اور انھیں برائی سے کیوں روکتا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود ایک ایسا کام کرتا ہے جس سے شریعت نے روکا ہے۔

یہ درست ہے کہ جو شخص خود برائی کرتا ہے اور دوسروں کو اس سے روکتا ہے تو یہ لوگوں کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح معروف کا حکم دینا ایک شخص کے علم کی پختگی کی دلیل ہے، مگر یہی عالم جب خود برائی کرتا ہے تو اس کی مذمت بھی زیادہ شدید الفاظ میں کی جاتی ہے اور اس کی سزا بھی جاہل آدمی کی برائی کے مقابلے میں سخت ہوگی۔ معلوم ہوا کہ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ میں جن لوگوں کی مذمت کی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے تھے، نہ کہ اس وجہ سے کہ انھوں نے دوسروں کو معروف کا حکم دیا تھا۔

۲۸۵- ہم نے اس بات کو ترجیح دے دی کہ بنیادی طور پر عادل ہونا محتسب کی شرط نہیں ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حسبہ کی بعض قسموں میں صفت عدالت کا بڑا اثر ہوتا ہے، خصوصاً ان اقسام کے حسبہ کے وجوب اور عدم وجوب میں۔ یہی وجہ ہے کہ عدل کو شرط قرار دینے کا ایک مقبول پہلو بھی موجود ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اگر حسبہ کا طریقہ وعظ و ارشاد ہو تو اس کا مطلوبہ نفع تب ظاہر

ہوتا ہے جب کہ محتسب متقی، پرہیز گار اور عدل کی صفت سے متصف ہو۔ اس لیے کہ عام طور پر اس کی بات اور اس کے وعظ میں لوگوں کے لیے اثر ہوتا ہے اور وہ اس کی بات کو قبول کر کے برائی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ جس مقام پر حسبہ کے مطلوبہ اہداف وعظ کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں اور اس میں محتسب کے لیے کوئی نقصان کی بات نہ ہو تو اس پر حسبہ کا کام واجب ہوگا۔ اس صورت میں کسی پر حسبہ کے واجب ہونے کے لیے عدالت کی شرط لگانا ایک قابل قبول بات ہوگی۔ اس کے مقابلے میں اگر محتسب فاسق اور بدکردار ہو تو اکثر یہی ہوگا کہ اس کے وعظ کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور لوگ اس کی بات کو قبول نہیں کریں گے۔ لہٰذا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور جب وعظ کا فائدہ نہیں ہوگا تو اس پر حسبہ واجب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اس کے اندر حسبہ کی ایک شرط معدوم ہے، یعنی صفت عدالت۔

رہی وہ صورت جب کہ حسبہ قوت اور زبردستی کے ساتھ انجام دیا جائے تو اس پر حسبہ کے واجب ہونے کے لیے عادل ہونے کی شرط نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ ایسے محتسب پر حسبہ کے واجب ہونے کی شرط قوت ہے، نہ کہ عادل ہونا، اور اللہ تعالیٰ اقتدار کے ذریعے وہ کام روکتا ہے، جو قرآن کے ذریعے نہیں روکتا۔

۲۸۶- باوجود اس تفصیل کے، جو ہم نے بیان کی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر قسم کے محتسب کے لیے پسندیدہ بات یہی ہے کہ وہ ممکن حد تک عدالت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو اور ہر اس کام سے اجتناب کرے جس سے اس کے کام پر حرف آئے۔ جب محتسب دوسروں کے مقابلے زیادہ عادل ہوگا تو اس سے اس کی توقیر میں اضافہ ہوگا، اس کی دین داری پر کوئی اعتراض نہیں آئے گا اور اس کے حسبہ کو قبول کیا جائے گا، خواہ قوت اور قہر ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو۔

۵- عالم ہونا

۲۸۷- محتسب کے لیے پانچویں شرط علم ہے۔ اس کے پاس اتنا علم ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعے وہ منکر کو پہچان سکے اور اس سے لوگوں کو روک سکے، اسی طرح جس کے ذریعے وہ معروف کو پہچان سکے اور شرعی پیمانوں کے مطابق لوگوں کو اس کا حکم دے سکے۔ اس طرح اس کا احتساب علم و معرفت کے ساتھ ہوگا، نہ کہ جہل اور اٹکل سے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام وہی کرے جس کے پاس علم و فقہ ہو، اس چیز کے بارے میں جس کا وہ حکم دیتا ہے اور اس کے بارے میں جس سے وہ روکتا ہے۔

محتسب کے لیے مطلوب علم میں یہ بات بھی شامل ہے، کہ اسے حسبہ کے موقع ومحل، اس کی حدود، اس کے اجرا اور اس کے موانع کے بارے میں آگاہی ہو، تاکہ وہ اُن شرعی حدود پر رُک جائے، جن کو ہم آگے بیان کریں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا محتسب کو مجتہد ہونا چاہیے؟ اس کا جواب دو پہلوؤں سے دیا جاسکتا ہے۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے کہ محتسب لوگوں کو اختلافی مسائل میں اپنی بات ماننے پر مجبور کرسکتا ہے، تو اس صورت میں محتسب کو مجتہد ہونا چاہیے۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے کہ محتسب کسی کو اپنی رائے پر مجبور نہیں کرسکتا تو اس صورت میں اجتہاد بھی اس کے لیے شرط نہیں ہے۔ تب اس کے لیے متفق علیہ برائیوں اور متفق علیہ بھلائیوں کا عالم ہونا ہی کافی ہوگا۔ ہمارے نزدیک محتسب کے لیے اجتہاد کی شرط نہ ہونا ہی وزنی بات ہے۔

۲۸۸- ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا محتسب کو ان پیشوں اور صناعتوں کو بھی جاننا چاہیے جسے لوگ دنیا میں اختیار کرتے ہیں؟ [یہ سوال بظاہر غیر متعلق معلوم ہوتا ہے مگر] حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے، اس لیے کہ محتسب کا کام ان تمام پیشوں اور حرفتوں کی نگرانی کرنے پر حاوی ہوتا ہے، تاکہ اسے معلوم ہوسکے کہ کسی پیشے کے لوگ دوسروں کو کوئی دھوکہ تو نہیں دیتے، کوئی چال تو نہیں چلتے اور لوگوں کو ضرر تو نہیں پہنچاتے۔ چنانچہ فقہا کہتے ہیں کہ محتسب کو چاہیے کہ وہ مختلف پیشوں اور صنعتوں کے لوگوں کی نگرانی کرے اور ان کو اپنے پیشے میں دھوکہ دہی سے باز رکھے۔ اسی طرح فقہا ان لوگوں کو حسبہ کے کام سے روکتے ہیں جو ان چیزوں سے جاہل ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ محتسب یہ کام تب کرسکے گا جب کہ اس کو ان چیزوں سے آگاہی ہوگی۔ بلکہ بعض فقہا کی رائے تو یہ ہے کہ محتسب بعض پیشوں کے لوگوں کو آزمائے گا، جیسے سرمہ ساز (آنکھوں کا ڈاکٹر)، تاکہ یہ بات یقینی ہوجائے کہ اسے اس پیشے میں مہارت حاصل یا نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ محتسب کو اس پیشے کا علم ہو۔ فقیہ عبدالرحمٰن بن نصر الشیرازی کہتے ہیں:

> محتسب آنکھوں کے ڈاکٹروں کو آزمائے گا ...... چنانچہ وہ جسے اس بات کا اہل پائے گا کہ آنکھ کے سات پردوں کی تشریح کرسکے ...... اور اس کو علم ہو کہ سرمے کو کیسے مرکب کیا جاتا ہے اور جڑی بوٹیوں کو کیسے ملایا جاتا ہے تو محتسب اس کو اجازت دے گا کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کی آنکھوں کا علاج کرنے کے لیے پیش کرسکتا ہے۔

اسی طرح فقہا نے اس بات کی بھی تشریح کی ہے کہ محتسب کے لیے اوزان وغیرہ سے آ گاہی بھی ضروری ہے۔فقہا کے اقوال میں سے ایک یہ ہے:

چوں کہ یہ چیزیں — یعنی قنطار، رطل، مثقال، درہم وغیرہ — خرید وفروخت کے معاملات کی بنیاد ہیں اور انھی پر لین دین کا انحصار ہوتا ہے اس لیے محتسب کو چاہیے کہ وہ ان چیزوں کو پہچانے اور ان کی مقدار کی تحقیق کرے تاکہ ان کے ذریعے جو لین دین ہوتی ہے وہ غبن سے پاک ہو۔

۲۸۹- اس بنا پر محتسب کا فرض ہے کہ وہ جن پیشوں اور صناعتوں میں احتساب کرتا ہے ان کو جان لے۔ اگر چہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ محتسب پر ان تمام یا ان میں سے بعض پیشوں کا جاننا لازم کرنا اس کے لیے مشقت اور تکلیف میں ڈالنا ہے، مگر اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ محتسب کے لیے ان چیزوں کے جاننے کی شرط کو پورا کرنا اس طرح بھی ممکن ہے کہ وہ ان پیشوں کے ماہرین سے مدد لے، خواہ یہ ماہرین اس کے مستقل مشیر ہوں، یا ان کے علاوہ ہوں۔ چنانچہ وہ ان معاملات کے بارے میں ان سے مشورہ حاصل کرے گا اور اگر وہ بااعتماد ہوں تو ان کی بات کو قبول کرے گا۔

۶- قدرت

۲۹۰- محتسب کے لیے چھٹی شرط یہ ہے کہ وہ ہاتھ اور زبان سے احتساب پر قادر ہو۔ اگر کسی کو یہ قدرت حاصل نہ ہو تو وہ دل میں ناپسندیدگی کی حد پر رُکے گا۔ یہ شرط اس شخص کے بارے میں سمجھ میں آنے والی ہے جو حکمران کے تقرر کے بغیر اپنے طور پر احتساب کا کام کرتا ہے۔ رہا وہ شخص جس کو حکمران نے اس کام کے لیے مقرر کیا ہو تو اس کو ویسے بھی قدرت حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ ریاست اس کی پشت پر ہوتی ہے۔ حسبہ کے وجوب کا ساقط ہونا صرف اس عجز پر موقوف نہیں ہے جس کو محسوس کیا جا سکے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ مستقبل میں محتسب کو کوئی ضرر پہنچایا جائے گا اور وہ اس کے برداشت کرنے سے عاجز ہوگا۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ ہم بعد میں بیان کریں گے۔

محتسب کے آداب

۲۹۱- فقہا نے چند آداب ذکر کیے ہیں جن سے محتسب کو مزین ہونا چاہیے، تاکہ وہ اپنے کام میں

کامیاب ہو اور وہ حسبہ کے فرض کو ایسے طریقے پر انجام دے جس سے سب راضی ہوں اور ہر ایک اس کو قبول کرے۔ان میں سے چند یہ ہیں:

ا۔محتسب پر لازم ہے کہ وہ اپنے احتساب سے مقصود اللہ کی رضا سمجھے۔وہ اپنے حسبہ سے ریا، شہرت اور لوگوں کے ہاں جاہ و منصب کا ارادہ نہ کرے۔حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے تمام اعمال میں اخلاص نیت انتہائی ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو اس کی رضا کی خاطر کیا جائے، مگر جس وقت ایک مسلمان کا عمل فطری طور پر ظاہر ہو اور اس کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہو تو اس میں اخلاص کی ضرورت زیادہ اور شدید ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض پرہیز گار لوگوں کے دلوں میں یہ احساس سرایت کر جاتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے حسبہ کے کام کو چھوڑ دیتے ہیں۔ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ حسبہ میں خلوص نیت نہیں رہ سکتی۔ہم ان پاکباز اور پرہیز گار لوگوں سے کہتے ہیں کہ وہ حسبہ کے کام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، ریا کے خیالات کو جھٹک دیں، اس حوالے سے زیادہ گہرائی میں نہ جائیں اور ریا کے خوف کو کھلا نہ چھوڑیں، اس لیے کہ شیطان بعض اوقات ان پر وسوسوں کے دروازے کھول دیتا ہے، جن کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔

۲۹۲۔محتسب کے آداب کے بارے میں فقہا یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے لیے دوسری اخلاقی صفات کے ساتھ ساتھ صبر اور بردباری بھی لازم ہے۔حقیقت یہ ہے کہ فقہا نے اگر صبر اور بردباری کی تاکید کی ہے تو اس کی معقول وجہ ہے۔اس لیے کہ محتسب کے بارے میں یہ بات غالب گمان کے درجے میں ہے کہ لوگ اس کو اذیتیں دیں گے اور اس کے گرد دائرہ تنگ کریں گے۔اگر وہ صابر اور بردبار نہیں ہوگا تو اس کے فائدے سے اس کا نقصان زیادہ ہوگا اور وہ اصلاح سے زیادہ فساد کرے گا۔وہ اپنے احتساب کا مقصد حاصل نہیں کر پائے گا۔

۲۹۳۔فقہا یہ بھی کہتے ہیں کہ محتسب کو چاہیے کہ وہ امر و نہی کے کام میں نرم خو، شفقت کرنے والا اور ترش روئی سے دور ہو مگر دین پر مضبوطی سے قائم رہے۔جب فقہا یہ بات کہتے ہیں کہ نرمی بھی کرے اور دین پر سخت بھی ہو تو پہلی نظر میں ان کی یہ بات متضاد نظر آتی ہے۔اس لیے کہ سختی اور نرمی ایک ساتھ کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔نرمی اختیار کرنے اور ترش روئی سے بچنے کا تو شریعت نے حکم دیا ہے۔حدیث شریف میں آیا ہے:

إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهٖ. اللہ تعالیٰ ہر چیز میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔

اور قرآن کریم میں ہے:

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران ۳: ۱۵۹) اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

محتسب اپنے امر و نہی کو ایسے نرم اسلوب کے ساتھ لوگوں تک پہنچا سکتا ہے جس سے دلوں کے بند دروازے کھل جائیں۔ اس مسئلے کی مزید تفصیل ان شاء اللہ بعد میں آئے گی۔ رہا دین پر سختی کا معاملہ تو اس سے مراد یہ ہے کہ دین کے احکام بیان کرتے ہوئے وہ سستی نہ دکھائے۔ وہ محتسب علیہ کے ساتھ مداہنت کا مرتکب نہ ہو اور دین کی قیمت پر اس کے ساتھ سودے بازی نہ کرے۔ یہ باتیں نرمی کے خلاف نہیں ہیں۔

۲۹۴-فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ محتسب کو چاہیے کہ لوگوں کے ساتھ تعلقات کو محدود رکھے تاکہ اس کو ان تعلقات کے منقطع ہونے کا خوف نہ ہو۔ اس کو چاہیے کہ مخلوقات سے اپنی امیدیں منقطع کر دے تاکہ اس کے بارے میں کسی کو نرمی اور مداہنت کا گمان بھی نہ ہو۔ اسے چاہیے کہ لوگوں کے تحائف بھی قبول نہ کرے چہ جائیکہ کہ لوگوں سے رشوت وصول کرے جو کہ حرام اور ناپاک ذریعۂ رزق ہے۔ محتسب کو چاہیے کہ اپنے معاونین کو بھی اسی طرح اچھے اخلاق کا پابند بنائے جس طرح کہ اس کے لیے اچھے اخلاق کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے اس کردار سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور وہ بار بار کی تنبیہات سے بھی راہِ راست پر نہیں آتا تو اس کو چاہیے کہ اسے معزول کر کے اپنے سے دور کرے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ محتسب پر لوگ غلط گمان نہ کریں اور لوگوں کے شبہات دور ہو سکیں۔ اس لیے کہ لوگ معاونین کا گناہ بھی محتسب کے کھاتے میں شمار کرتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس بات فرق کرتے ہوں کہ محتسب اور اس کے معاونین کے اعمال کون کون سے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کی غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ برے معاونین کو ہٹایا جائے۔

۳۔محتسب علیہ

تعریف اور شرطیں

۲۹۵۔محتسب علیہ وہ شخص ہے جو کسی ایسے عمل کا ارتکاب کرے جس کے بارے میں احتساب جائز یا واجب ہو۔اس کو محتسب علیہ اور محتسب معہٗ کہا جاتا ہے۔

اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی صفت پائی جائے جس کہ بنا پر کوئی ممنوع فعل اس کے حق میں منکر بن جائے ،اگر چہ وہ کوئی معصیت نہ ہو کہ دینی طور پر اس کا احتساب کیا جائے۔اس وجہ سے محتسب علیہ کے عاقل و بالغ ہونے کی شرط بھی نہیں ہے۔چنانچہ اگر دیوانہ بھی زنا کرے تو اس کے ساتھ احتساب کیا جائے گا۔اسی طرح بچہ،خواہ باتمیز ہو یا نہ ہو،جب وہ شراب پیے گا اور اس کے پینے کا ارادہ کرے گا تو محتسب اس پر نکیر کرے گا اور اس کو شراب نہیں پینے دے گا،اگر چہ بچے کا یہ فعل گناہ شمار نہیں ہوتا،کہ دینی طور پر اس کا مواخذہ کیا جائے۔

محتسب علیہ کی قسمیں

۲۹۶۔ہم نے کہا کہ محتسب علیہ ہر وہ شخص ہوتا ہے جو کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرے جس پر حسبہ جاری ہو سکے۔اس بنا پر معاشرے کا کوئی بھی فرد محتسب علیہ ہو سکتا ہے،اگر وہ کوئی ایسا کام کرے جس پر حسبہ جاری ہو۔اس میں کوئی استثنا نہیں ہے،خواہ اس فعل کا ارتکاب کرنے والا امام المسلمین ہو یا عوام میں سے ایک فرد۔اس وجہ سے حسبہ درج ذیل قسم کے لوگوں پر جاری ہو سکتا ہے،جن کے بارے میں بعض کا خیال ہے کہ ان پر حسبہ جاری نہیں ہوتا،یا یہ کہ ان کے ساتھ حسبہ میں نرمی کی جائے گی،یا پھر یہ کہ ان کے ساتھ حسبہ کسی مخصوص شکل میں ہوگا۔

۱- رشتہ دار

۲۹۷- حسبہ رشتہ داروں اور غیر رشتہ داروں پر یکساں طور پر جاری ہوگا۔ اس لیے کہ حسبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اس فرض کی نظر میں سب برابر ہیں۔ مگر فقہائے کرامؒ کہتے ہیں: بیٹے کا اپنے والدین کے بارے میں حسبہ حکم شرعی کی وضاحت، موعظۂ حسنہ اور اللہ سے ڈرانے تک محدود رہے گا، یہ حسبہ کے دوسرے ذرائع، مثلاً غصے اور مار پیٹ کی طرف تجاوز نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ والدین کے مقام و مرتبے کا لحاظ کرنا ہے، البتہ ان کے حوالے سے بھی حسبہ کے فرض میں کوتاہی نہیں کی جائے گی۔

۲- غیر مسلم

۲۹۸- حسبہ ان غیر مسلموں پر بھی جاری ہوتا ہے جو دارالاسلام میں 'ذمی' یا 'مستأمن'[1] کے طور پر رہتے ہیں۔ اس لیے کہ اگرچہ اسلام نے یہ حکم تو دیا ہے کہ انھیں اپنے مذہب پر رہنے دیا جائے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو اسلامی نظام کا مذاق اڑانے کی بھی اجازت دی جائے اور وہ کھلم کھلا ایسے ایسے کام کرتے رہیں جو اسلام کے منافی ہیں۔ ان کو اپنے مذہب پر رہنے دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے گھروں اور عبادت خانوں میں جو عبادات کرتے ہیں تو انھیں اس کی اجازت ہے۔ لیکن اگر وہ کھلم کھلا اعلان کے ساتھ اسلام کے منافی افعال کریں، مثلاً یہ کہ سرِ راہ شراب پینا شروع کریں، لوگوں کے درمیان کھڑے ہوکر اسلام کو گالیاں دیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کریں تو انھیں اس سے روکا جائے گا اور ان پر ان کے افعال کی روشنی میں حسبہ جاری کیا جائے گا۔

۳- اُمراء

۲۹۹- حکمران اور اس کے نمائندوں اور سارے عہدے داروں پر اسی طرح حسبہ کا اجرا ہوگا جس طرح کہ ایک عام آدمی پر ہوتا ہے۔ البتہ محتسب کو چاہیے کہ حکمران کے ساتھ احتساب میں اس کے مقام و مرتبے کا لحاظ کرے اور اس کے ساتھ حسبہ کے طریقے کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اسی بنا پر فقہا کہتے ہیں کہ حکمران کا احتساب اس طرح ہوگا کہ اس کو شرعی حکم سمجھایا جائے گا اور وعظ و نصیحت کی جائے گی۔ اس کے ساتھ غصے اور

۱- ذمی اسلامی ریاست میں مستقل طور پر رہنے والا یعنی غیر مسلم اقلیت کا فرد ہے، جب کہ مستأمن وہ غیر مسلم ہے، جو کسی غیر مسلم ریاست کا باشندہ ہو اور کچھ عرصے کے لیے اسلامی ریاست سے اجازت (ویزہ) لے کر قیام پذیر ہو۔ (مترجم)

سختی کا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ اسلامی تاریخ خلفا اور اُمرا کے ساتھ حسبہ کے واقعات سے بھری پڑی ہے، اور اُمرا محتسب کو کوئی اذیت نہیں دیتے تھے بلکہ ان کی بات کو دل سے قبول کرتے تھے اور اس کی قدر کرتے تھے۔ نیک حکمرانوں کی یہی شان ہوتی ہے۔

۴- قاضی حضرات

۳۰۰- حسبہ قاضیوں پر بھی جاری ہوگا۔ فقہا کہتے ہیں:

> محتسب کو چاہیے کہ وہ قاضیوں اور حکام کی مجلسوں کا چکر لگایا کرتے اور ان کو اس بات سے روکے کہ وہ مسجد میں یا عام اجتماع میں لوگوں کے درمیان بیٹھ کر فیصلے کرے۔ اگر محتسب دیکھے کہ قاضی پر غصہ ہو رہا ہے یا اس کو گالیاں دے رہا ہے یا اس کے ساتھ تیز باتیں کر رہا ہے تو محتسب کو چاہیے کہ اس کو روکے، وعظ و نصیحت کرے اور اس کو اللہ کا خوف دلائے۔ اس لیے کہ قاضی کے لیے غصے کی حالت میں فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ وہ کسی کو گالیاں بھی نہیں دے گا اور سخت گوئی و ترش روئی کا مظاہرہ بھی نہیں کرے گا۔

۵- پیشہ ور حضرات

۳۰۱- مختلف پیشوں اور صناعتوں کے لوگوں پر بھی حسبہ کا حکم جاری ہوتا ہے، اس لیے کہ اسلام کا حکم ان کے اور ان کے پیشوں کے بارے میں بھی ہے۔ مثلاً وہ پیشے جن کی لوگوں کو ضرورت ہو، ان کے بارے میں اسلام کا حکم یہ ہے کہ یہ فرض کفایہ ہیں۔ اگر کسی پیشے والے اپنے پیشے سے انکار کریں تو محتسب ان کو اس پر مجبور کرے گا۔ لوگوں کے پیشوں کے بارے میں اسلام کا حکم یہ ہے کہ وہ انھیں درست اور اچھے طریقے سے ادا کریں۔ ایسا طریقہ جس میں نہ کوئی دھوکہ دہی ہو، نہ ڈنڈی ماری اور نہ کسی کو نقصان پہنچانا۔ اسی بنا پر محتسب کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ ان لوگوں کی نگرانی کرے، اور انھیں اپنے کام کاج میں لگائے رکھے۔ بشرطیکہ ان کا پیشہ شریعت کے مطابق ہو۔ اگر کوئی پیشہ خلاف شریعت ہو تو محتسب کو چاہیے کہ وہ اسے اس کام سے روکے۔ یہی وجہ ہے کہ علما نے ان حدود اور ضوابط کو بیان کیا ہے جن کو مختلف پیشوں کی انجام دہی میں ملحوظ رکھنا چاہیے اور محتسب پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اہل پیشہ حضرات کی طرف سے ان ضوابط پر عمل درآمد کو یقینی بنائے۔

۴- حسبہ کا موضوع

حسبہ کا موضوع: منکر

۳۰۲- حسبہ کی تعریف میں ہم نے بیان کیا کہ یہ نام ہے اس بات کا کہ جب معروف کا ترک ظاہر ہو تو اس کا حکم دیا جائے اور منکر کا ارتکاب ظاہر ہو جائے تو اس سے روکا جائے۔ یہ تعریف حسبہ اور احتساب کے موضوع کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ چنانچہ حسبہ کا موضوع معروف اور منکر ہے۔ ان میں سے پہلے کا حکم دیا جاتا ہے اور دوسرے سے روکا جاتا ہے۔ منکر کا معاملہ یہ ہے کہ یہ کبھی شریعت کے منع کردہ کام کے کرنے سے ہوتا ہے اور کبھی کسی ایسے فعل کو ترک کرنے سے، جس کا شریعت نے حکم دیا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے منکر کے دو پہلو نکلتے ہیں۔ ایک ایجابی پہلو، جس کی مثال ممنوع کام کرنا ہے۔ اور دوسرا سلبی پہلو، یعنی کسی ایسے کام کو ترک کرنا جو شریعت کو مطلوب ہے۔ دونوں پہلوؤں میں احتساب اس طرح ہوتا ہے کہ ان دونوں سے لوگوں کو روکا جائے۔ یعنی ممنوع کام کے کرنے سے روکا جائے، تاکہ یہ یا تو موجود ہی نہ ہو، اور اگر موجود ہو گیا ہو تو اس کا راستہ روکا جائے۔ اسی طرح مطلوب کام کو ترک کرنے سے روکا جائے، تاکہ وہ موجود ہو جائے۔ اس بنا پر ہم نے اس بات کو ترجیح دی کہ دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے حسبہ کا موضوع منکر ہی کو قرار دیا جائے، اور اس منکر پر حسبہ کا اجرا اِن دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے ہوگا۔

منکر کا مطلب

۳۰۳- جب یہ بات معلوم ہوئی کہ حسبہ کا موضوع منکر ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منکر کا مطلب کیا ہے؟ اس سلسلے میں غالب تو یہی ہے کہ یہ لفظ معصیت کے لیے بولا جاتا ہے اور معصیت یہ ہے کہ آدمی شریعت کے ممنوعات کا ارتکاب کرے، یا اس کے مامورات کو چھوڑ کر شریعت کی مخالفت کرے، معصیت، خواہ کبائر میں سے ہو یا صغائر میں سے، اور خواہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے، اسی طرح خواہ اس کے بارے میں کوئی خاص نص شرعی وارد ہوئی ہو یا اس کا حکم شریعت کے قواعد اور اس کے عمومی

اصولوں سے معلوم ہوا ہو یا دیگر مصادر شریعت نے ان کی طرف رہنمائی کی ہو، نیز خواہ معصیت باطنی افعال میں سے یا ظاہری افعال میں سے۔

یہ تو ہوا منکر کا عمومی مطلب، مگر حسبہ کے باب میں منکر کا لفظ اس سے وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا اطلاق ہر اس فعل پر ہوتا ہے جس میں کوئی خرابی پائی جاتی ہو، یا شریعت نے اس سے منع کیا ہو، اگر چہ وہ کام کرنے والے کے حق میں یہ گناہ شمار نہ ہو، یا تو اس وجہ سے کہ اس کی عمر کم ہے یا پھر اس وجہ سے کہ اس کے اندر عقل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مجنون زنا کرے یا اس کا ارادہ رکھتا ہو اور بچہ شراب پیے یا پینے کا ارادہ کرے تو حسبہ کے باب میں ان کا یہ فعل منکر ہوگا اور اس پر احتساب ضروری ہوگا، اگر چہ ان دونوں کے حق میں یہ معصیت شمار نہیں ہوتا، اس لیے کہ ان میں مکلّف ہونے کی ایک ایک شرط نہیں ہے، یعنی عقل اور بلوغ۔

منکر قرار دینے کا مجاز ادارہ

۳۰۴- کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر منکر کا اطلاق کرنا خود اسلامی شریعت کا کام ہے۔ اس لیے کہ یہ وصف کسی چیز پر لاگو کرنا ایک حکم شرعی ہے اور حاکم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ إن الحکم إلا للّٰہ. حکم کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔ فقہا کا کام تو بس یہی ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ وہ اپنی طرف سے کوئی شرعی حکم بنا نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کی غلطی واضح ہو جاتی ہے تو پھر اس حکم میں ان کی پیروی نہیں کی جاتی۔ اس لیے کہ دلیل وہی ہوتی ہے جو شریعت نے بیان کی ہو جو ہمارے سامنے ظاہر ہو چکی ہوتی ہے۔ چنانچہ فقہا کا کام کشف ہے، انشا نہیں۔ یعنی وہ احکام بیان کرتے ہیں، ایجاد نہیں کرتے۔

۳۰۵- جب ہم یہ کہتے ہیں تو بعض لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فقہا نے کہا ہے: جس چیز کو مسلمان حسن یا قبیح سمجھیں تو وہ حسبہ کے موضوع میں داخل ہوگی۔ چنانچہ جو حَسن ہو اس کا حکم دیا جائے گا اور جو قبیح ہو اس سے روکا جائے گا۔ اعتراض کرنے والا کہتا ہے کہ تم فقہا کے اس قول اور اپنی بات میں تطبیق کیسے کرو گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی شریعت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اجماع ایک معتبر حجت ہے۔ اگر ہم ایسا کریں گے کہ جس کام کو مسلمان حَسن سمجھیں اسی کو قبول کریں اور اس کا حکم دیں اور جس بات کو قبیح سمجھیں اس سے ہم خود بھی رکیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکیں تو گویا ہم نے اجماع کی دلیل اپنائی اور یہ ایک شرعی حجت ہے جس کی طرف شریعت نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ اسی طرح ہم نے عرفِ صحیح کو اپنایا

جس کی شریعت نے رہنمائی کی ہے اور صحیح عرف کا خیال رکھنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کی شرائط

۳۰۶- جب منکر اپنے دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے حسبہ کا موضوع ہے تو اس میں چند مخصوص شرطوں کا ہونا ضروری ہے، تاکہ اس میں احتساب ممکن ہوسکے۔ سوال یہ ہے کہ یہ شرطیں کیا ہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے علما نے فرمایا ہے کہ منکر ظاہر ہو، فی الحال موجود ہو اور اس کے حکم پر اتفاق ہو۔ ان شرطوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ گفتگو ضروری ہے۔

۱- ظاہر ہونا

۳۰۷- منکر کے ظاہر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ محتسب کے سامنے منکشف ہو جائے اور اسے اس کا علم ہو جائے، بغیر اس کے کہ وہ اس کے لیے کوئی تجسس کرے۔ یہ انکشاف خواہ اس کے سامنے حواس خمسہ میں سے کسی بھی حس کے ذریعے ہوا ہو۔ اس لیے کہ یہ حواس کسی چیز کے علم کے درست ذرائع ہیں اور ان کے ذریعے جو بات معلوم ہو جائے وہ ظاہر ہی ہوتی ہے، بس شرط یہ ہے کہ اس میں تجسس نہ ہو۔ اس بنا پر جو شخص اپنے گھر میں ہو، اس نے اپنا دروازہ بند کیا ہوا اور وہاں وہ کسی منکر کا ارتکاب کر رہا ہو تو محتسب کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کی دیوار پھلانگے، یا اس کا دروازہ توڑ دے، تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ گھر والے کیا کر رہے ہیں۔ ہاں اگر یہ منکر اس طرح ظاہر ہو جائے کہ اندر سے چیخنے کی آواز آئے یا مدد کے لیے پکارا جائے تو پھر محتسب کے لیے جائز ہوگا کہ اس گھر پر حملہ کرے۔ اس لیے کہ یہاں منکر کا اظہار چیخنے والے کی آواز سے ہو گیا ہے۔

منکر کے ظاہر ہونے کے مفہوم میں ہر وہ جگہ بھی داخل ہے جس کے بارے میں محتسب کو غالب گمان ہو کہ یہاں منکر واقع ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس پر لازم ہوگا کہ اس جگہ میں جائے اور وہاں حسبہ کا اپنا فرض انجام دے۔ محتسب کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ یہ کہہ کر گھر میں بیٹھ جائے کہ منکر اس کے سامنے ظاہر نہیں ہوا ہے۔

۲- موجود ہونا

۳۰۸- دوسری شرط یہ ہے کہ منکر فی الحال موجود ہو۔ اس لیے کہ منکر جب واقع ہو جائے اور ختم

ہو جائے تو اس میں فاعل پر کوئی حسبہ نہیں ہے۔ ہاں اگر یہ منکر اس کے بارے میں ثابت ہو جائے تو حکمران کو چاہیے کہ اس پر اسے سزا دے۔ اس صورت میں محتسب کا کام اتنا ہی ہے کہ وہ اسے دوبارہ یہ کام نہ کرنے کی نصیحت کرے۔

سوال یہ ہے کہ احتساب کے لیے منکر کا عملاً وجود شرط ہے یا اس کے مقدمات کا موجود ہونا بھی حسبہ کے لیے کافی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب منکر کے علامات ظاہر ہوں، اس کے مقدمات سامنے آئیں اور اس کے واقع ہونے کے قرائن ظاہر ہو جائیں تو یہ حسبہ کے موضوع میں داخل ہوگا، اور اس میں وعظ و نصیحت کے ذریعے حسبہ جائز ہوگا، مگر مارنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ مارنے سے بعض اوقات محتسب علیہ ضد میں آتا ہے اور وہ کام کر ڈالتا ہے۔ البتہ اگر وعظ کا کوئی فائدہ نہ ہو اور محتسب سمجھتا ہے کہ منکر وقوع پذیر ہونے ہی والا ہے، اور جب وہ واقع ہوگا تو اس کی تلافی ممکن نہیں ہوگی تو محتسب پر واجب، یا کم از کم جائز ہے کہ ایسے طریقے سے اس کا احتساب کرے جس سے منکر کو روکا جا سکے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ اس کے روکنے پر قادر ہو۔

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ منکر کے مقدمات کا موجود ہونا احتساب کے جاری ہونے کے لیے کافی ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا منکر کا ارادہ بھی احتساب کے اجرا کے لیے کافی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ منکر کا ارادہ جب تک دل میں ہے اور خارج میں اس کی کوئی ایسی شکل ظاہر نہیں ہوئی جس کو منکر کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ سمجھا جائے تو احتساب جائز نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اِرادہ کرنے والے نے کھل کر اپنے ارادے کا اظہار کر دیا تو پھر محتسب کے لیے جائز ہوگا کہ اس قدر وعظ و ارشاد اور خوفِ خدا کے ذریعے اس کا احتساب کرے جس قدر کہ اس کے عزم کے لیے ضروری ہو۔

۳- اختلاف نہ ہونا

۳۰۹- منکر کی تیسری شرط یہ ہے کہ اس کے منکر ہونے پر فقہا کا اتفاق ہو، تاکہ محتسب علیہ یہ دلیل پیش نہ کر سکے کہ وہ جو کام کرتا ہے وہ بعض فقہا کے نزدیک جائز ہے، اگرچہ وہ محتسب کی رائے میں جائز نہیں ہے۔

لیکن جب منکر ایسا ہو کہ اس میں فقہا کا اختلاف ہو تو کیا یہ اختلاف محتسب کو مطلقاً اس بات سے روکتا ہے کہ وہ اس کا احتساب کرے؟ یا اس کے لیے کوئی قید یا شرط موجود ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف یا تو جائز ہوگا یا ناجائز، اور ان دونوں کا الگ الگ حکم ہے۔

أ- جائز اختلاف بعض فقہا کے نزدیک احتساب میں مانع ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اگر محتسب اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو تو وہ اختلافی منکر کا ارتکاب کرنے والے کا احتساب بھی کر سکتا ہے۔

ب- ناجائز اختلاف، اور یہ وہ اختلاف ہے، جو شاذ اور باطل ہو اور اس کی کوئی حیثیت نہ ہو، کیوں کہ اس کی پشت پر کوئی قابل قبول دلیل موجود نہ ہو۔ مثلاً یہ کہ وہ قرآن کریم کی صریح آیات، سنت رسول کے صحیح متواتر و مشہور احکام، اجماع امت یا ان امور کے خلاف ہو جو دین میں معلوم و مشہور ہیں۔ اس اختلاف کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی اور یہ محتسب کو کسی فعل کے احتساب سے نہیں روک سکتا۔

حسبہ کے موضوع میں وسعت

۳۱۰- حسبہ کے موضوع میں ایک جوہری شرط یہ ہے کہ جس منکر کا ارتکاب کیا گیا ہے وہ شریعت اسلامیہ میں منکر ہو، اور چونکہ شریعت اسلامیہ کی صفات میں سے ایک صفت اس کی جامعیت ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں بلا استثنا ہر فعل کا حکم موجود ہے، اس وجہ سے حسبہ کا موضوع بہت وسعت اختیار کر جاتا ہے اور یہ انسان کے تمام افعال اور اعمال پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس سے کوئی چیز بھی خارج نہیں ہوگی، سوائے اس چیز کے، جس میں احتساب کی شرائط نہ پائی جائیں اور جو محتسب کی ولایت میں داخل نہ ہوں۔ اس وسعت کی طرف فقہا نے اشارے کیے ہیں۔ فقیہ ابن الاخوۃ فرماتے ہیں:

محتسب وہ ہے جس کو حکمران یا اس کے نمایندے نے اس کام پر مقرر کیا ہو کہ وہ رعایا کے احوال پر نظر رکھے، ان کے معاملات، ان کے مفادات اور ان کے خرید و فروخت کے بارے میں معلوم کرتا رہے، ان کے کھانے پینے، لباس، رہایش اور گزرگاہوں کے بارے میں معلومات رکھے اور ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جائزہ لیتا رہے۔

علامہ ابن خلدون محتسب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ منکرات کی تفتیش کرے گا، ان پر لوگوں کی تعزیر کرے گا اور منکر کے بقدر تادیب کرے گا۔ وہ لوگوں کو شہر کی عمومی مصلحتوں پر آمادہ کرے گا۔ مثلاً راستے میں تجاوزات کھڑے کر کے اسے لوگوں کے لیے تنگ کرنے سے منع کرنا، بار برداری کی گاڑیوں اور کشتیوں میں حد سے زیادہ بوجھ لادنے سے منع کرنا،

جن لوگوں کے مکانات گرنے کے قریب ہوں ان کو اپنے مکانات منہدم کرنے پر آمادہ کرنا تا کہ راہ گیروں کو متوقع نقصان سے بچایا جا سکے، اور اس طرح کی دیگر بہت سی باتیں۔

وسعت کی مثالیں

۱-عقائد میں

۳۱۱-عقیدہ کے مسائل میں حسبہ جاری ہوتا ہے۔ جس نے کسی باطل عقیدے کا اظہار کیا، یا ایک ایسی بات کا اعلان کیا جو درست اسلامی عقیدے کی ضد ہو، یا لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی، یا نصوص میں تحریف کی، یا دین میں کسی ایسی بدعت کی بنیاد رکھی جس کی کوئی بنیاد نہ ہو، تو اُس کو اِس کام سے روکا جائے گا اور اس پر حسبہ کا اجرا ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ اور اس کے دین کے بارے میں باطل کے ساتھ باتیں بنانا جائز نہیں ہے، اور یہ اسلامی عقیدے کے منافی ہے۔ اسلامی عقیدے کے اصول میں یہ بات شامل ہے کہ آدمی اللہ رب العالمین کے آگے جھکے اور اس کے آگے انقیاد اختیار کرے۔ اسی میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ایسی احادیث روایت نہ کی جائیں جن کا باطل اور جھوٹ ہونا قطعیت کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے۔ اسی طرح کتاب اللہ کی باطل تفسیر بیان کرنا، جیسے باطنیہ کی تفسیریں، جن کی نصوص، لغت، شرع اور سلف سے منقول ورثے میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔[1]

۲-عبادات میں

۳۱۲-مثلاً کسی بستی یا شہر کے لوگوں کا باوجود اس کے نماز ترک کرنا کہ ان میں اقامت نماز کی شرطیں موجود ہوں، اذان کو چھوڑ دینا یا اس میں ایسا اضافہ کرنا جو شریعت میں موجود نہ ہو، عبادات کی ہیئت کے خلاف عمل کرنا، مثلاً سری نمازوں میں جہر کرنا اور جہری نمازوں میں سری قراءت کرنا، نماز میں اضافہ کرنا، اس میں سکون و وقار نہ ہونا، اور مثلاً رمضان میں روزہ نہ رکھنا یا زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دینا۔

۳-معاملات میں

۳۱۳-جیسے حرام لین دین کرنا، لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانا، سودخواری، رشوت اور صنعتوں

اور خرید وفروخت کے معاملات میں خیانت کرنا۔ اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلّے کے ایک ڈھیر کے پاس گزرے اور اس میں ہاتھ ڈالا۔ اس سے آپؐ کی انگلیوں میں تری محسوس ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا: غلّے والے! یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! اس پر بارش ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: پھر تم نے اس [تری] کو غلّے کے اوپر کیوں نہ کیا، تاکہ لوگ اس کو دیکھیں۔ جس نے ہمارے ساتھ خیانت کی وہ ہم میں سے نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خیانت بہت سی چیزوں میں ہوتی ہے۔ مثلاً خرید وفروخت کے معاملات میں ایک خیانت یہ ہے کہ مبیع کے عیوب کو چھپا دیا جائے اور اس میں تدلیس کی جائے۔ یعنی اس کا ظاہری حصہ اندرونی والے سے اچھا ہو۔ صنعتوں میں بھی خیانت ہوتی ہے مثلاً یہ کہ کھانے کی اشیا اور ملبوسات کی ایسی صفات بیان کی جائیں جو ان میں نہ ہوں تو ان کو اس خیانت کے ارتکاب سے روکا جائے گا۔

۴- سڑکوں اور گلیوں کے بارے میں

۳۱۴- مثلاً راستے میں چبوترے بنانا، کھمبے کھڑے کرنا، درخت اُگانا، لکڑیاں، فروخت کی چیزیں اور کھانے پینے کی اشیا رکھنا، ان میں جانوروں کو ذبح کرنا، ان کے خون سے زمین کو آلودہ کرنا، گلی کوچوں میں کوڑا کرکٹ ڈالنا، پھلوں کے چھلکے پھینکنا، پانی سے ایسا چڑکاؤ کرنا جس سے کسی کے پھسلنے اور گرنے کا خطرہ ہو، اور اس قسم کے دوسرے اعمال جن میں لوگوں کے لیے اذیت ہو۔ محتسب ان ساری چیزوں کی ممانعت کرے گا اور ان میں احتساب کرے گا۔ اس لیے کہ یہ ساری چیزیں ضرر میں شامل ہیں اور وہ شریعت میں ممنوع ہے، یہاں تک کہ اگر وہ واقع ہو جائے تو اس کا ازالہ ضروری ہوتا ہے۔

۵- صنعت وحرفت کے بارے میں

۳۱۵- فقہا نے ہر قسم کی صنعت وحرفت کو ذکر کیا ہے اور ان میں احتساب کی کیفیت کو بھی بیان کیا ہے۔ ان میں احتساب کے چند جامع اصول حسب ذیل ہیں:

أ- مکان کے لحاظ سے: پہلی بات یہ ہے کہ صنعت وحرفت کی جگہ ایسی ہو جس میں دوسروں کے لیے ضرر نہ ہو۔ مثال کے طور پر نان بائی کی دکان کپڑوں کی مارکیٹ میں نہیں ہوگی۔ اسی طرح جگہ ایسی ہو جو اس

کام کے لیے کافی بھی ہو اور مناسب بھی۔ چنانچہ اس میں صفائی کا انتظام ہو اور جگہ کھلی اور ہوادار ہو۔

ب۔صنعت وحرفت کے آلات کے لحاظ سے: ضروری ہے کہ یہ آلات استعمال کے لائق ہوں۔ فقہا نے ہر قسم کے آلات کے قابل استعمال ہونے کے لیے بھی معیارات مقرر کیے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ان پیشوں کے کاریگر تھے۔ امام شیزری جلیبیوں کی کڑاہی کے بارے میں کہتے ہیں:

''مناسب ہے کہ جلیبیوں کی کڑائی سرخ اور بہترین تانبے کی ہو''۔

پھر امام شیزری اس کو استعمال کے لیے تیار کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

اس میں چھوکر ڈال کر جلا دیا جائے گا اور پھر اس کو ٹھنڈا کر کے 'سلق' نامی پودے کے پتوں سے مل لیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک بار پھر آگ پر رکھ کر تھوڑا سا شہد ڈال دیا جائے گا یہاں تک کہ شہد جل جائے۔ اس کے بعد پسی ہوئی ٹھیکری کے ساتھ چمکایا جائے گا اور پھر دھو کر استعمال کیا جائے گا۔ اس سے میل اور زنگ جاتی رہے گی۔

ہم نے یہ بات پوری تفصیل سے اس لیے ذکر کی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے فقہا اُس چیز کو کس قدر اہم سمجھتے ہیں جس کا تعلق لوگوں کی مصالح کے ساتھ ہو اور جن کے ذریعے لوگوں سے ضرر کو دفع کیا جاتا ہے۔

ج۔اگر پیشے کے آلات وزن، پیمانے یا کاشت کے لیے معیار کا درجہ رکھتے ہوں تو ان آلات کی درستی اور صحت کو یقینی بنانا ضروری ہوگا۔

د۔مصنوع اور مبیع کے حوالے سے: ضروری ہے کہ وہ ملاوٹ سے پاک ہو اور اس کے عیب کو چھپایا نہ گیا ہو۔ چنانچہ گندم کو مٹی کے ساتھ اور آٹے کو دوسری بے کار چیزوں کے ساتھ ملا کر نہ بیچا جائے گا۔ اگر ایک جنس کی چیز میں مختلف قسموں اور معیارات کی چیز پائی جاتی ہو تو ضروری ہوگا کہ ہر ایک کے لیے کوئی امتیازی نشان موجود ہو۔ مثلاً بکرے کے گوشت پر، جیسا کہ فقہا نے بتایا ہے، زعفران کے داغ لگائے جائیں گے، تاکہ اس کو دوسرے گوشت سے الگ پہچانا جا سکے، یا یہ کہ بکرے کی دم آخر تک گوشت کے ساتھ ہی رہے۔

ہ۔صنعت وحرفت کا کام کرنے والے کے لحاظ سے ضروری ہوگا کہ محتسب ان کی اہلیت کو جانچے۔

سرمہ ساز (یا آنکھوں کے ڈاکٹر) کے حوالے سے ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ محتسب اس کی اہلیت جانچے گا۔ یہی بات دوسرے پیشوں کے لوگوں کے حوالے سے بھی کہی گئی ہے۔ جیسے مرہم پٹی کرنے والا، پچھنا لگانے والا، حجام اور جراح وغیرہ۔ اسی طرح ان کی امانت داری اور عفت کو بھی جانچا جائے گا۔

۶- اخلاق وآداب سے متعلق

۳۱۶- محتسب جن چیزوں کا جائزہ لیتا ہے اور احتساب کرتا ہے ان میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ لوگوں میں اخلاق وآداب اور فضائل کا لحاظ رکھے۔ چنانچہ جو امور اخلاقی فضائل اور اسلامی آداب کے خلاف ہوں وہ ان کو روکے گا۔ جیسے اجنبی عورت کے ساتھ اکیلے بیٹھنا، چھت اور کھڑکیوں سے پڑوسیوں کے گھروں میں جھانکنا، مردوں کا عورتوں کے راستے اور ان کی ضروریات کی جگہوں میں بیٹھنا، ان کو اذیت دینا، راستے میں ستر اور ایسے اعضا کھولنا جن کو چھپانا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کو بھی روکا جائے گا جو خواتین کے ساتھ لین دین میں برائی کے ساتھ مشہور ہو۔ علامہ ابو یعلیٰ حنبلیؒ کہتے ہیں:

> اگر ایک شخص دکان دار ہے اور اس کی زیادہ تر لین دین خواتین کے ساتھ ہوتی ہے تو محتسب کو چاہیے کہ وہ اس کی سیرت وکردار کا جائزہ لے۔ اگر سیرت وکردار درست ہے تو اسے اس کام کی اجازت دے اور اگر اس میں کوئی شبہہ پایا جاتا ہے اور برائی کا طرزِ عمل ظاہر ہے تو محتسب اس کو خواتین کے ساتھ لین دین کرنے سے روکے گا اور ان کے ساتھ تعرض کرنے پر اس کی تادیب کرے گا۔

۵- احتساب

احتساب کے معنی

۳۱۷- احتساب سے ہماری مراد عملی طور پر فعل حسبہ کو انجام دینا ہے۔ مثلاً یہ کہ محتسب کسی خاص فعل کا کسی خاص کیفیت کے ساتھ حکم دے، یا منکر کو اپنے ہاتھ سے روکے۔ جیسے کسی چیز کو توڑنا، اسے پھاڑنا یا اسے ضایع کر دینا۔ اسی طرح مثلاً منکر کرنے والے کو ہاتھ سے قوت کے ساتھ اس کام سے روکے، جس میں وہ لگا ہوا ہو۔

احتساب کی تکمیل

۳۱۸- احتساب اس وقت مکمل ہوتا ہے جب منکر کا پوری طرح ازالہ ہو جائے اور وہ عملاً مٹ جائے، خواہ ضرورت کے وقت اس کے لیے قوت ہی کیوں نہ استعمال کرنی پڑی۔ یہ کام خواہ محتسب کرے، یا اس کے معاونین، یا پھر خود وہی شخص جو اس منکر کا ارتکاب کر رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ محتسب اس کو حکم دے کہ منکر کے آلات توڑ دو اور وہ اس کا حکم بجالاتے ہوئے ایسا ہی کرلے۔ اگر محتسب ہاتھ سے روکنے پر قادر نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ احتساب بالقول کے درجے پر آجائے۔ یعنی وعظ وارشاد سے کام لے اور صاحب منکر کو اللہ کا خوف دلائے۔ اس طریقے سے کبھی منکر کا ازالہ ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا، بلکہ منکر کا ارتکاب کرنے والا اپنے کام پر مُصر رہتا ہے۔ چنانچہ اگر محتسب زبانی احتساب سے بھی عاجز آگیا، تو انکار بالقلب کے درجے پر اُتر آئے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ دل میں اس کام کو ناپسند کرے گا، اور چاہے گا کہ اگر اس کو طاقت حاصل ہوئی تو اس برائی کو روکے گا۔ اس کی دلیل حدیث مبارکہ ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا:

مَنْ رَای مِنکُمْ مُنکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِہٖ، فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَإِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ. تم میں سے جو شخص کوئی برائی ہوتی دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے روکے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

احتساب کے مراتب

۳۱۹-گذشتہ بحث کی روشنی میں احتساب کے تین مراتب ہیں:

۱-ہاتھ سے روکنا

یعنی عملی طور پر قوت استعمال کر کے یا اگر ضرورت ہو، تو اسلحہ اٹھا کر اپنے معاونین کی مدد سے برائی کا قلع قمع کر دے۔ مثلاً کسی پر حملہ کرنے والے کو روکنا، تاکہ بے گناہ جان نہ چلی جائے، یا کسی کی عزت خاک میں نہ مل جائے۔ ہاتھ سے تغیر کے ضمن میں یہ بھی آتا ہے کہ محتسب علیہ کی پٹائی کی جائے، اسے قید کیا جائے تاکہ وہ منکر سے باز آئے۔

۲-قولی احتساب

دوسرا مرتبہ احتساب بالقول ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں:

أ-سمجھانا: یعنی یہ کہ محتسب علیہ کو شرعی حکم سمجھایا جائے اس لیے کہ بعض اوقات وہ حکم سے بے خبر ہوتا ہے اس لیے اس کا ارتکاب ہے۔

ب-وعظ و نصیحت اور اللہ کا خوف دلانا: بعض اوقات گناہ گار شخص اس وقت اپنے گناہ سے باز آتا ہے جب وہ نصیحت کرنے والے کی نصیحت اور واعظ کے وعظ کو سنتا ہے۔ چنانچہ احتساب کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

ج-سخت لہجے میں بات کرتے ہوئے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا: جیسے محتسب اس سے کہے: اے فاسق، اے احمق، اے جاہل وغیرہ۔ البتہ محتسب ایسے الفاظ استعمال نہیں کرسکتا جو شرعی طور پر ممنوع ہیں۔ مثلاً اس کے باپ کو گالیاں دینا۔

د-محتسب کی طرف سے تکلیف پہنچانے کی دھمکی اور ڈراوا: مناسب یہ ہوگا کہ یہ دھمکی ایسی ہو جسے محتسب عملی کر سکے، اور یہ دھمکی ایسی ہو جو شریعت میں ممنوع نہ ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ اس کو ایسی دھمکی دے گا جس پر محتسب قادر نہ ہو تو اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوگا، اور اگر ناجائز بات کی دھمکی دے گا تو یہ ناجائز ہے۔

اس لیے کہ محتسب کو چاہیے کہ اپنے احتساب میں شریعت کی مخالفت نہ کرے۔

۳۔قلبی احتساب

اس کا مرحلہ تب آتا ہے جب محتسب سابقہ مراتب سے عاجز ہو۔اس مرتبے سے کسی مسلمان کو بھی خالی نہیں ہونا چاہیے، جب وہ کسی منکر کو سنتا یا دیکھتا ہے۔اس لیے کہ اس میں کوئی ضرر نہیں ہوتا۔ہاں اور اس کے بعد،قولی اور فعلی احتساب کی بھی کوشش کرے۔

احتساب کی سمجھ

۳۲۰۔احتساب کا مقصد زمین سے منکر کو مٹانا اور معروف کو عملاً رائج کرنا ہے،اور جب احتساب کا مقصد یہ ہے تو اس مقصد تک پہنچنا جس قدر مختصر اور آسان طریقے سے ممکن ہو،اسے اختیار کرنا چاہیے۔مگر شرط یہ ہے کہ وہ طریقہ جائز ہو۔نیز احتساب کا انجام بھی دیکھنا چاہیے۔مثلاً یہ دیکھا جائے کہ اس سے منکر کا ازالہ ہو جائے گا اور اس کی جگہ معروف لے لے گا۔اسی جائزے کی روشنی میں احتساب کی طرف اقدام کرنے یا اس سے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔حسب ذیل قواعد احتساب کی سمجھ حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں:

۱۔احتساب بقدرِ استطاعت

۳۲۱۔منکر کے ساتھ دلی نفرت مکمل اور دائمی ہونا چاہیے اور یہ طرزِ عمل ہر قسم کے منکر کے بارے میں ہو۔اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دل میں منکر کے خلاف حساسیت باقی رہے گی اور یہ عزم برقرار رہے گا کہ جب ممکن ہوگا تو اس کو بدل کے رکھ دوں گا۔اس کے برعکس قولی اور فعلی انکار استطاعت سے مشروط ہے۔اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ. (التغابن ۶۴:۱۶) اپنی استطاعت کے مطابق اللہ سے ڈرو۔

اور حدیث میں آیا ہے:

مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ،

وَ ذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ. تم میں سے جو شخص کوئی برائی ہوتی دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے روکے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اگر محتسب منکر کے ساتھ دل سے نفرت کرتا ہے اور مکمل طور پر اس کو ناپسند کرتا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کا ازالہ کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا پورا بدلہ عنایت فرمائے گا۔ ان شاء اللہ

۲۔حصولِ مصلحت اور دفعِ فساد

۳۲۲۔احتساب کا مطالبہ اس وقت کیا جاتا ہے جب اس میں کسی مصلحت کا حصول اور کسی مفسدہ کو دفع کرنا پیش نظر ہو۔ اگر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ ایک معروف کے حصول سے کسی بڑے معروف کا فوت ہونا لازم آئے، یا منکر کے دفع کرنے سے کوئی بڑا منکر واقع ہو جائے تو یہ احتساب شرعی طور پر مطلوب نہیں ہوگا، اگر چہ محتسب علیہ نے کسی واجب کو چھوڑ دیا ہو یا کسی حرام کا ارتکاب کیا ہو۔ اس لیے کہ محتسب کو انسانوں کے بارے میں اللہ کا خوف کرنا چاہیے، اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ ان کو سیدھے راستے پر لا کر رہے گا۔ یہ تقویٰ نہیں ہوگا کہ اپنے احتساب سے اس بات کا ذریعہ بن جائے کہ کوئی بڑا معروف فوت ہو جائے یا کوئی بڑا منکر واقع ہو جائے۔ اس لیے کہ شریعت نے حسبہ کو واجب کیا ہے تو اس لیے کہ فساد کا قلع قمع ہو جائے اور مصلحت حاصل کی جائے۔

اگر احتساب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو فساد موجود ہے اس سے بھی بڑا فساد رونما ہوتا ہے، یا جس مصلحت کو حاصل کرنا ہے، اس سے بڑی کوئی مصلحت ہاتھ سے نکلتی ہے، تو یہ احتساب وہ نہیں ہوگا جس کا شریعت مطالبہ کرتا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس میں افراد اور احوال و ظروف کے ساتھ فرق واختلاف آتا رہتا ہے۔ چنانچہ محتسب کو ان میں خوب غور وفکر کرنا چاہیے۔ وہ پہلے اس معروف اور منکر کی مقدار کا اندازہ لگائے جو اس کے احتساب کے نتیجے میں سامنے آئے گا اور پھر احتساب کی طرف آگے بڑھنے یا اس سے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کرے۔ یہ سب کچھ کسی خاص واقعے یا خاص شخص کے بارے میں پیش نظر رکھا جائے گا۔ مگر عام طور پر اس کا کام یہی ہوگا کہ معروف کا مطلقاً حکم دے گا اور منکر سے مطلقاً روکے گا۔

۳۲۳- اس قاعدے کی بنا پر وہ بات ہماری سمجھ میں اچھی طرح آ جاتی ہے جو علما نے فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

حکمران کے خلاف طاقت کا استعمال کرتے ہوئے بغاوت کرنا اور اس کے خلاف اسلحہ اٹھانا جائز نہیں ہے، خواہ حکمران سے کسی قسم کے فسق و فجور کا ظہور ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ اس بغاوت سے جتنا زیادہ فساد برپا ہوگا وہ اس فساد سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو حکمران کے فسق کی صورت میں پیدا ہوتا ہے، اور جہاں حسبہ کا فساد موجود فساد سے زیادہ ہو تو حسبہ جائز نہیں ہوتا۔ اسی طرح حکمران اپنے فسق کی وجہ سے دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا رعایا پر حق ہوگا کہ اس کی اطاعت کریں، جب تک کہ وہ ان کو کسی معصیت کا حکم نہ دے۔ معلوم ہوا کہ حکمران کے خلاف قوت کے ساتھ احتساب، مسلح جدوجہد اور مسلمانوں کے درمیان فتنہ اور لڑائی پیدا کرنے کے لیے احتساب درست نہیں ہوگا۔

۳- ممکن حد تک نرم رویہ

۳۲۴- جس حد تک ممکن ہو، محتسب کو نرمی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

أ- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهِ. اللہ تعالیٰ خود بھی نرم ہے اور دوسروں میں بھی نرمی کو پسند کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نرمی کے ساتھ جو کچھ دیتا ہے وہ سختی اور تشدد کے ساتھ نہیں دیتا۔

ب- انسان کی طبیعت اور فطرت یہ ہے کہ اگر اس کو نرمی، شفقت اور پیار کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جائے تو وہ اسے زیادہ اچھی طرح قبول کرتا ہے، بمقابلہ اس کے کہ اس کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آیا جائے۔ بلکہ اکثر اوقات سختی اس کو اس بات پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ ضد میں آ کر اور محتسب کو شرمندہ کرنے کے لیے گناہ پر اصرار کرے۔ ہماری اس بات پر اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے جس میں وہ اپنے نبی سے فرماتا ہے:

وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران ۳:۱۵۹) اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معروف کے سوا کوئی حکم نہیں دیتے تھے اور حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتے تھے۔

ج۔ باثمر احتساب وہ ہوتا ہے جو محتسب علیہ کو احتساب پر آمادہ کرے، وہ اس پر قانع ہو جائے اور اس کی ضرورت کو محسوس کرے۔ یہاں تک کہ خود اس کے دل میں ایک روکنے والا موجود ہو جو اسے منکر کے پاس دوبارہ جانے سے روک دے۔ یہ ساری باتیں بڑی حد تک حاصل کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ احتساب نرمی کے ساتھ کیا جائے، اس میں غصہ اور تشدد نہ ہو، بلکہ دلیل کے ساتھ وقار و سکون سے آدمی کو آمادہ کیا جائے۔

ایک حدیث ہے، جسے امام احمد بن حنبل نے حضرت ابوامامہؓ سے روایت کیا ہے، اس میں آیا ہے کہ ایک نوجوان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: یارسول اللہ! کیا آپ مجھے زنا کی اجازت دیں گے؟ لوگوں نے اس پر آوازے کسے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے میرے قریب کردو، اور اس سے بھی فرمایا کہ میرے قریب ہو جاؤ۔ وہ قریب آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گیا۔ آپؐ نے بڑی نرمی کے ساتھ اسے فرمایا: کیا تم اپنی ماں کے لیے زنا پسند کرو گے؟ اس نے کہا: نہیں، میں آپ پر قربان جاؤں، یہ تو مجھے پسند نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسی طرح دوسرے لوگ بھی اس کو اپنی ماؤں کے لیے پسند نہیں کرتے۔ پھر فرمایا: کیا تم اس کو اپنی بیٹی کے لیے پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں، میں آپ پر قربان جاؤں، یہ بھی مجھے پسند نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسی طرح دوسرے لوگ بھی اس کو اپنی بیٹیوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔ پھر فرمایا: کیا تم اس کو اپنی بہن کے لیے پسند کرتے ہو؟ اسی طرح ایک ایک کرکے پھوپھی اور خالہ کا ذکر بھی کیا۔ لڑکا ہر بار یہی کہتا تھا کہ نہیں، میں آپ پر قربان جاؤں، یہ مجھے پسند نہیں ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فرماتے رہے کہ اسی طرح دوسرے لوگ بھی اس کو پسند نہیں کرتے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس کے سینے پر رکھا اور فرمایا:

اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبَهُ وَاغْفِرْ ذَنْبَهُ وَحَصِّنْ فَرْجَهُ. اے اللہ اس کے دل کو پاک کردے، اس کے گناہ بخش دے اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت فرما۔ اس کے بعد کوئی چیز اسے زنا سے زیادہ ناپسند نہیں تھی۔

د- احتساب کا اجرا، جیسا کہ ہم نے کہا ہے، حکمران پر بھی ہوتا ہے اور حکمران نرمی کا زیادہ مستحق ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو مقتدر سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ رعایا پر اس کے رعب کی ضرورت ہوتی ہے، اور بعض اوقات کچھ مطلب پرست لوگ احتساب کے نام پر حکمران کے خلاف حد سے گزر جاتے ہیں۔ اس صورت حال کو روکنے اور حکمران کے مقتدر ہونے کے احساس کی بنا پر وہ احتساب میں نرمی کا زیادہ مستحق ہے اور یہی چیز مطلوب بھی ہے، جیسا کہ اس کی طرف فقہا نے اشارہ کیا ہے۔ اسی پر دوسرے حکومتی نمایندوں اور عہدیداروں کو بھی قیاس کیا جائے گا۔ ہماری اس بات کی دلیل یا اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ملتی ہے جس میں وہ اپنے دو نبیوں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے فرماتا ہے کہ اس کو نرم بات کہو، شاید کہ وہ نصیحت حاصل کرے یا اللہ سے ڈر جائے۔

۳۲۵- ہماری بات کا یہ مطلب نہیں کہ نرمی احتساب کا اکلوتا اسلوب ہے، یا یہ کہ نرمی کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔ ہماری بات کا مطلب دراصل یہ ہے کہ جب اس کے ذریعے اصلاح ممکن ہو تو اس طریقے کو ضرور آزمانا چاہیے۔ اس کی جگہ کسی اور اسلوب کو صرف اس وقت استعمال کرنا چاہیے جب اس کی واقعی ضرورت ہو۔ چنانچہ محتسب کے لیے نرمی کے لازمی میدانوں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر اس کا غالب گمان ہو کہ محتسب علیہ نے جو گناہ کیا ہے وہ جہالت کی بنا پر کیا ہے، یا اپنی عارضی خواہش سے مجبور ہو کر اس سے گناہ ہو گیا ہے، یا ارادے کی کمزوری کی وجہ سے۔ اسی طرح اگر حکم سمجھانے، وعظ و نصیحت اور خدا خوفی کے ذریعے احتساب کیا جاتا ہے تو اس صورت میں بھی نرمی لازمی ہوگی۔ مگر جب نرمی کارگر نہیں ہوتی تو پھر محتسب سختی اختیار کرے گا۔ اسی طرح اگر منکر بہت بڑا ہے اور اس کے لیے مزید انتظار ممکن نہیں ہے تو محتسب اس کے لیے اتنی شدت اختیار کرے گا جتنی اس منکر کو روکنے کے لیے کافی ہو۔ یہ طریق کار نرمی کے قاعدے سے خروج شمار نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہ بھی نرمی کے مفہوم میں داخل ہے کہ محتسب علیہ کی مصلحت کے لیے فکرمندی اختیار کی جائے، اور وہ اس طرح کہ اس کو منکر سے دور کیا جائے اور گناہ اور اس کے نتیجے میں ملنے والی سزا سے اس کو نجات دلائی جائے۔

احتساب کے واجب ہونے کا وقت

۳۲۶- قلبی احتساب ہر مسلمان پر ہر وقت واجب ہے، جب بھی کسی منکر کو دیکھے یا سنے۔ رہا احتساب بالید یا احتساب بالقول کا معاملہ تو یہ تب واجب ہوتا ہے جب آدمی کو اس پر قدرت حاصل ہو۔ مگر اس کے

لیے شرط یہ ہے کہ اس میں محتسب اپنے بارے میں اذیت اور ضرر سے مطمئن ہو، جس طرح کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو پہنچنے والے ضرر اور اذیت سے مطمئن ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اذیت اور ضرر نازل ہونے کا خوف ایسے ہے، جیسے عملی طور پر عاجز ہو، اور عمل سے عاجز ہونے سے قدرت کی شرط ساقط ہو جاتی ہے۔ چنانچہ احتساب واجب نہیں ہوگا۔ البتہ منکرات کے خوگر لوگوں سے دور رہنا چاہیے اور ان سے گھل مل جانا درست نہیں۔

احتساب کا وجوب اور اس کا نافع ہونا

۳۲۷- جب محتسب کو قدرت حاصل ہو اور وہ ضرر و اذیٰ سے امن میں ہو تو کیا احتساب کے وجوب کے لیے اس کا نافع ہونا شرط ہے؟ اس بارے میں علما کے دو اقوال ہیں۔

ایک یہ کہ اگر نفع کی امید نہ ہو تو احتساب واجب نہیں بلکہ مستحب کے درجے میں ہے۔ ہاں، جب نفع کی امید ہو تو احتساب واجب ہوگا۔ اس کی دلیل وہ ہے جو علما نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھی ہے کہ فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (الاعلیٰ ۸۷:۹) تم نصیحت کرو، اگر نصیحت نافع ہو۔

اس آیت کے بارے میں تفسیر ابن کثیر میں آیا ہے کہ اسے بعض نے ظاہر پر محمول کیا ہے، جس کے معنی یہ ہوں گے کہ جہاں نصیحت نفع پہنچائے وہاں نصیحت کرو۔

دوسرا قول یہ ہے کہ احتساب واجب ہے، خواہ نفع پہنچائے یا نہ پہنچائے۔ اس لیے کہ احتساب ایک شرعی فریضے کی ادائیگی ہے۔ چنانچہ یہ اس بات پر موقوف نہیں ہوگا کہ دوسرے کو نفع پہنچاتا ہے یا نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرے، اس کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے کی جو ذمہ داری وہ بھی اُسے ادا کرے، یعنی صاحب منکر بھی منکر کو چھوڑ دے۔ اس قول کے قائلین نے پہلے قول کا جواب یہ دیا ہے کہ آیت کریمہ فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (الاعلیٰ ۸۷:۹) احتساب کے وجوب کو نفع کے حصول سے مشروط نہیں کرتی۔ اس کے دلائل یہ ہیں:

أ- جو بات إن کے ذریعے کسی چیز کے ساتھ مشروط کی جاتی ہے اس کے ساتھ یہ لازم نہیں ہوتا کہ اگر یہ چیز موجود نہ ہو تو وہ بات بھی موجود نہیں ہوگی۔ اس پر کئی آیات دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ أَنۡ تَقۡصُرُوۡا مِنَ الصَّلَاةِ إِنۡ خِفۡتُمۡ (النساء۴:۱۰۱)''تو تم پر کوئی مضایقہ نہیں، اگر نماز میں اختصار کر دو'۔ چنانچہ اگر خوف موجود نہ ہو تب بھی قصر جائز ہوگا۔

وَلَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ (البقرۃ۲:۲۸۳)''اور اگر دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب نہ ملے تو رہن بالقبض پر معاملہ کرلو'۔ یہاں اگر کاتب موجود ہو تب بھی رہن (گروی رکھنا) جائز ہوگا۔

ب- آیت کریمہ فَذَكِّرۡ إِنۡ نَّفَعَتِ الذِّكۡرٰى (الاعلیٰ۸۷:۹) میں شرط کا ذکر چند فوائد کے لیے ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تذکیر کے لیے دونوں حالتوں میں سے اشرف حالت کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ جب نصیحت نفع پہنچائے۔ دوسری حالت، یعنی جب نفع نہ پہنچائے، سے خاموشی اختیار کی گئی ہے، جس کا مقصد تنبیہ کرنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے کہ سَرَابِيۡلَ تَقِيۡكُمُ الۡحَرَّ ...... (النحل۱۶:۸۱) اور تمھیں ایسی پوشاکیں بخشیں جو تمھیں گرمی سے بچاتی ہیں۔

آیت کی تقدیر اس طرح بنتی ہے کہ وَتَقِيۡكُمُ الۡبَرۡدَ. [اور تمھیں سردی سے بھی بچاتی ہیں] اس بنا پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَذَكِّرۡ إِنۡ نَّفَعَتِ الذِّكۡرٰى کی تقدیر یہ ہوگی کہ خواہ نصیحت نفع پہنچائے یا نہ پہنچائے۔

اس کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ ترغیب اس بات کی دلائی جارہی ہے کہ نصیحت نفع بھی پہنچائے۔ جیسے ایک شخص دوسرے کے سامنے حق کو بیان کر دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میں نے تو پورا معاملہ واضح کر دیا ہے اگر تم عقل رکھتے ہو۔ اس کا مقصد اس شخص کو بات ماننے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔

۳۲۸- میرے نزدیک ان میں راجح قول یہ ہے کہ جب نفع کی امید ہو یا فضا نفع کے حصول کے لیے ہموار ہو، یا احتساب میں شعائر اسلام کا اظہار ہو یا اس سے کوئی ایسا جائز مقصد حاصل ہو رہا ہو جو محتسب کے پیش نظر نہ ہو تو وجوب کا حکم ہوگا۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی موجود نہ ہو تو پھر احتساب واجب نہیں بلکہ مستحب ہوگا۔

حسبہ کا استحباب

۳۲۹- قولی احتساب اس وقت بھی مستحب ہے جب محتسب کو علم ہو کہ اس کی بات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، مگر ساتھ یہ بھی جانتا ہو کو اسے کوئی اذیت نہیں دی جائے گی۔ یہ بعض فقہا کی رائے ہے۔ ہم نے استحباب

کو اس بات کے ساتھ مقید کیا ہے، جو ہم نے پچھلے نکتے میں عرض کی ہے۔

اسی طرح اس وقت بھی احتساب کو مستحب کا درجہ حاصل ہوگا جب محتسب جانتا ہو کہ اس کی بات فائدہ دے گی مگر اس کے ساتھ محتسب کو اذیت بھی ہوگی۔ اس میں مستحب ہونے کا پہلو یہ ہے کہ منکر کا ازالہ کرنے میں اذیت اٹھانا بھی جائز بلکہ پسندیدہ ہے۔ یہاں تک کہ اگر محتسب یہ سمجھتا ہے کہ اس کے احتساب کا محتسب علیہ کو فائدہ نہیں اور الٹا اس کی طرف سے اذیت بھی ملے گی، مگر احتساب کسی اور پہلو سے مفید ہو، مثلاً یہ کہ اس سے مومنوں کے دلوں کو تقویت ملتی ہے اور فاسقوں کی شوکت ٹوٹ جاتی ہے یا کمزور پڑتی ہے، یا یہ کہ منکر کے ازالے کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے، تو ان صورتوں میں بھی احتساب پسندیدہ ہوگا، باوجود اس کے کہ اس میں اذیت بھی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس اذیت کا دائرہ محتسب تک محدود ہو، اور دوسرے اس میں مبتلا نہ ہوں۔

احتساب کی حرمت

۳۳۰- احتساب اس وقت حرام ہوگا جب احتساب کی بنا پر محتسب کے علاوہ اس کے ساتھیوں، اس کے رشتہ داروں، رفقا اور عام مسلمانوں کو اذیت سے دوچار ہونا پڑے، خواہ محتسب اس بات پر قادر ہی ہو کہ وہ برائی کو مٹا سکے گا۔ اس حرمت کی وجہ یہ ہے کہ یہ احتساب ایک اور منکر کا ذریعہ بن رہا ہے اور وہ یہ کہ اس سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ ایک مسلمان کو اس بات کا حق تو ہے کہ وہ اپنے بارے میں تسامح سے کام لے اور اذیت برداشت کرے، مگر اس کو یہ حق نہیں کہ اپنے احتساب کی نتیجے میں دوسرے لوگوں کو پہنچنے والی اذیتوں میں بھی تسامح سے کام لے۔ اسی طرح احتساب اس وقت بھی حرام ہوتا ہے جب وہ موجودہ منکر سے زیادہ بڑے منکر کا ذریعہ بنے، اور اس کے ساتھ دوسروں کو اذیت بھی ہو۔ اس وقت بھی احتساب حرام ہوگا جب اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہو کہ محتسب کو سخت اذیت مثلاً قتل یا آبروریزی کا سامنا کرنا پڑے۔ چنانچہ یہ درست نہیں ہوگا کہ وہ یہ سب کچھ تو برداشت کرے مگر فائدہ کوئی نہ ہو، برائی نہ مٹ جائے اور نہ اس میں کمی آئے۔

۳۳۱- احتساب کی صورت میں جس اذیت کا خوف ہوتا ہے، اور جس کی بنا پر احتساب کا درجہ وجوب سے اتر کر استحباب یا حرمت پر آ جاتا ہے، اس سے مراد وہ اذیت ہے جس کے نتیجے میں محتسب کو حاصل صحت وعافیت، جسمانی سلامتی، عزت وحرمت، مال ودولت اور آزادی جیسی نعمتوں سے محروم ہونا پڑے۔ اس سے

مراد وہ اذیت نہیں ہے کہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا حصول متوقع ہو اور احتساب کی صورت میں اس کے حصول میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقی ضرر وہ ہوتا ہے جس میں کسی موجود چیز کا فوت ہونا لازم آئے۔ ان چیزوں کی غیر موجودگی میں کسی چیز کے حصول میں رکاوٹ پیدا ہونا حقیقی ضرر نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت پٹائی، جس سے درد بھی ہو اور چوٹیں بھی آئیں آبروریزی، کسی عضو کا ضایع ہو جانا، جان سے ہی مارا جانا، سخت اذیتیں پہنچنا اور سختی کے ساتھ جیل میں رکھا جانا، یہ اور اس طرح کی ساری چیزیں اس اذیت میں داخل ہیں جن کی وجہ سے احتساب کا درجہ وجوب سے استحباب اور کبھی حرمت پر آجاتا ہے۔

ازخود احتساب کی شرط

۳۳۲- یہ بات تو معلوم ہے کہ قاضی ازخود لوگوں کے حقوق اور ان کے دعووں کی نگرانی نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ لوگ ان کے بارے میں دعویٰ کریں۔ چنانچہ قاضی کے لیے ان کی سماعت کی شرط یہ ہے کہ لوگ اس کے سامنے مقدمہ لے جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا محتسب کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ جب تک کوئی شکایت نہ کرے اس وقت تک وہ احتساب نہیں کرے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر احتساب کا تعلق کسی مخصوص حق کے ساتھ ہے تو محتسب کے لیے اس کے بارے میں غور وفکر اس بات پر موقوف ہوگی کہ صاحب حق اس کا مطالبہ کرے، یا محتسب کو بتادے کہ مجھ پر فلاں ظلم ہوا ہے۔ محتسب کے لیے اس میں ازخود مداخلت کا حق نہیں ہے۔ اس لیے کہ محتسب ازخود مداخلت اس منکر کے بارے میں کر سکتا ہے جو ظاہر ہو، اور مظلوم کے بتائے بغیر محتسب کے لیے یہ ظلم ان منکرات میں شمار نہیں ہوتا، جو ظاہر ہیں۔ ہاں جب مظلوم اس کی شکایت لے کر آتا ہے تو پھر محتسب کے سامنے وہ منکر ظاہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب کسی مخصوص حق کے حوالے سے منکر کا معاملہ اس کے سامنے اٹھایا جائے تو محتسب پر لازم ہو جائے گا کہ اس کا یقین حاصل کرے، خواہ اس طریقے سے ہو کہ اس ظلم کو اپنی آنکھ سے دیکھے یا ظالم خود اس کا اقرار کرے۔ لیکن اگر معاملہ مخفی ہو اور ملزم اس سے انکاری ہو تو اس صورت میں محتسب اس میں مداخلت نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ محتسب گواہوں کی سماعت نہیں کر سکتا، نہ وہ قسم دے سکتا ہے اور نہ اسے تجسس کا اختیار حاصل ہے۔

لیکن اگر احتساب حقوق اللہ میں سے کسی حق کے حوالے سے ہو یا کوئی ایسا معاملہ ہو جس میں اللہ کا حق زیادہ ہوتا ہے، یا اس کے ساتھ عام لوگوں کے مفادات وابستہ ہوں، جیسے کسی عوامی چیز کو نقصان پہنچانا، تو اس

میں احتساب ضروری ہوگا۔ اس کی بنیاد ذاتی مشاہدہ اور وہ شخصی علم ہوگا جو منکر کے وجود کی دلیل بن سکے۔

احتساب اور دورِ حاضر

۳۳۳-موجودہ دور میں مسلمان حکمران کے لیے ممکن ہے کہ وہ حسبہ کے نظام کو اسی طرح منظم کرے جس طرح کہ احتساب کے مقصد کا حصول اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے لیے ضروری اقدامات کرے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کرے جس سے احتساب کے اہل لوگ تیار ہوسکیں۔ اسی طرح حکمران کو چاہیے کہ وہ محتسب حضرات کے درمیان کے معاملات کو بھی منظم کرے۔ چنانچہ مساجد کے معاملات کے لیے الگ، بازاروں کے لیے الگ، راستے کی برائیوں کے لیے الگ اور اس طرح ہر شعبے کے معاملات کے لیے الگ الگ محتسب مقرر کرے۔ اسی طرح حکومت کو چاہیے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کو بستیوں اور دیہات میں بھیجے تاکہ وہ لوگوں کو دینی معاملات کی تعلیم دیں۔ اس لیے کہ دیہات میں جہالت عام ہوتی ہے۔

اگر حکمران یہ سارے کام نہیں کریں گے تو عام مسلمانوں کے لیے جائز، بلکہ بعض اوقات ضروری ہوگا کہ احتساب کے کام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، نئے محتسب تیار کرنے کا منصوبہ تشکیل دیں اور ان پر خرچ کریں۔ ان کو چاہیے کہ وہ وعظ وارشاد اور تذکیر کی حدود میں رہتے ہوئے احتساب کا فریضہ ادا کریں اور تشدد کا راستہ نہ اپنائیں، تاکہ یہ تشدد افراتفری اور فتنے کا ذریعہ نہ بنے۔ اس سے مطلب پرست لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے اور وہ حسبہ اور احتساب کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، اور حکمرانوں کو محتسب کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

۵

اسلام کا نظامِ حکومت

تمہید

۳۳۴- پیچھے ہم کہہ آئے ہیں کہ انسان کے لیے معاشرت ضروری ہے اور معاشرت کے لیے کوئی نہ کوئی نظام ضروری ہے خواہ وہ جیسا بھی ہو۔ یہاں ہم اس میں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ معاشرے کے لیے ایک سربراہ کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ معاشرت بھی قائم رہے اور اس کا نظام بھی برقرار ہو۔ کیوں کہ وہی یہ کام کرسکتا ہے کہ لوگوں کو نظام کی پیروی پر آمادہ کرے اور اس سے بغاوت نہ کرنے دے۔ اس طرح وہ سب کو افراتفری کی زندگی سے بچا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی معاشرے کا وجود کسی سربراہ کے بغیر نہیں ہوتا، خواہ اس سربراہ کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ لوگ اس کی اطاعت کرتے ہیں، خواہ اپنی مرضی اور پسند کے ساتھ ہو یا زبردستی اور مجبوری کے ساتھ۔ ''اس لیے کہ عقل مند آدمی کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسے سربراہ کو تسلیم کرتا ہے جو لوگوں کو مظالم سے محفوظ رکھے اور لڑائی جھگڑوں میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اگر حکمران نہ ہوتے تو لوگ ایک بے ہنگم ریوڑ اور افراتفری میں ضائع ہونے والے جانوروں کی طرح ہوتے'' ۔[1] اور اس لیے کہ ''انسانوں کی مصلحت اجتماعیت کے بغیر پوری نہیں ہوتی، اس لیے کہ انھیں ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اجتماعیت کے وقت ان کے لیے ایک سربراہ ضروری ہوتا ہے۔''[2]

جب معاشرے کا سربراہ موجود ہوگا تو امکان پیدا ہوجائے گا کہ معاشرہ کسی نہ کسی صورت میں مملکت کا روپ دھار لے۔ کیوں کہ اس میں مملکت کے سارے عناصر موجود ہوں گے۔ اس کے پاس زمین ہوگی، اس کے باشندے ہوں گے، اس کا ایک نظام ہوگا، اس نظام کو چلانے والا ہوگا جس نے معاشرے کا اقتدار سنبھالا ہو اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اس کے اوامر و احکام سے تجاوز نہ کریں۔

۱- الاحکام السلطانیۃ، ... دی، ص ۳

۲- السیاسۃ الشرعیۃ، ابن تیمیہ ۱۳۸

نظام حکومت سے مراد

۳۳۵- اس کتاب میں نظام حکومت سے ہماری مراد ہے قواعد واحکام کا وہ مجموعہ جس کا تعلق حکمران یعنی سربراہ مملکت سے ہو۔ یہ قواعد واحکام حکمراں کے اختیارات، اس کی قانونی حیثیت اور عوام سے اس کے تعلق کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ ان اغراض ومقاصد کی بھی وضاحت کرتے ہیں جو حکومت کے مقاصد میں شامل ہیں۔

اسلام اور نظام حکومت!!

۳۳۶- بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا اسلام کا کوئی نظام حکومت ہے؟ اس کا جواب ہے: ''ہاں!'' اس لیے کہ اسلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت اس کی جامعیت ہے۔ چنانچہ یہ بات کسی غور وفکر کی محتاج نہیں ہے کہ اس میں وہ قواعد واحکام موجود ہوں جو اسلام کی رو سے حکومت کے لیے ایک خاص نظام تشکیل دیں۔

ہم قرآن کریم میں شوریٰ کا حکم دیکھتے ہیں، حکام کی اطاعت لازم ہونے، ماانزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے اور اس طرح کے دوسرے امور کے بارے میں ہدایات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ سنت نبوی میں تو 'امیر'، 'امام'، 'بیعت' اور امیر کی 'اطاعت فی المعروف' کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ فقہائے کرام نے قرآن وسنت سے جو احکام مستنبط کیے ہیں حکومت کے متعلق بہت اہم قواعد واحکام دیے گئے ہیں۔ یہ ساری باتیں اور جو کچھ ہم بعد میں بیان کریں گے، اس بات کی دلیل ہیں کہ اسلام کا اپنا ایک مخصوص نظام حکومت موجود ہے۔

اسلام میں نظام حکومت کی بنیادیں

۳۳۷- جب اسلام کا اپنا نظام حکومت موجود ہے تو ضروری ہے کہ اس کی کچھ بنیادیں ہوں۔ ہماری نظر میں اس کی بنیادیں: خلیفہ کا وجود، شوریٰ کا قاعدہ اور اسلام کے اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ ضروری ہے کہ بنیادوں کے بارے میں الگ عنوانات کے تحت مفصل بحث کی جائے۔

۱-خلیفہ

خلیفہ کی تعریف

۳۳۸-خلیفہ ایک اسم ہے۔ یہ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جسے کسی نے اپنا حکمران بنا لیا ہو۔ اس شخص کو بھی خلیفہ ہی کہتے ہیں جو کسی معاملے میں کسی کا نائب بن گیا ہو۔[۱]

شریعت کی اصطلاح میں اگر لفظ خلیفہ مطلق ذکر ہو جائے تو اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو مسلمانوں کی حکومت کا نگران ہو۔ یعنی اسلامی مملکت کا سربراہ ہو۔ اسے امام بھی کہتے ہیں۔ یہ اس حکومت کا سربراہ ہوتا ہے جو اسلام کی صفت سے متصف ہو۔ یعنی اسلام کے اصولوں پر قائم اور اس کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔ وہ اسلامی احکام کا نفاذ کرتی ہو۔ خلیفہ حکومت کو اس صفت پر برقرار رکھنے کا چوکیدار ہوتا ہے، جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے۔

خلیفہ کے تقرر کی ضرورت

۳۳۹-امام ابن تیمیہ کہتے ہیں: یہ بات جاننا ضروری ہے کہ لوگوں کے لیے ایک حکمران کا ہونا دین کے اہم ترین واجبات میں سے ہے۔ دین کا قیام اس کے بغیر نہیں ہوتا۔[۲]

یہ بات بالکل درست ہے۔ خلیفہ جو حکومت اور لوگوں کی زندگی کے امور چلانے کا ذمہ دار ہوتا ہے اس کا تقرر اسلام کے ان فرائض میں سے ہے جس پر قرآن بھی دلالت کرتا ہے، سنت بھی، اجماع بھی اور اسلامی شریعت کے احکام کی طبیعت بھی۔

پہلے نمبر پر کتاب اللہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَأُوْلِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (النساء۴:۵۹) اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔[۳]

۱-منہاج السنۃ النبویۃ، ابن تیمیہ، ج۱، ص۱۳۷

۲-السیاسۃ الشرعیۃ فی الراعی والرعیۃ، ص۱۳۸

۳-احکام القرآن للجصاص، ج۲، ص۲۱۰ تفسیر القرطبی، ج۵، ۲۵۹

اولوالامر اُمراہی ہیں۔ بعض نے اولوالامر کے مفہوم میں علما کو بھی شامل کیا ہے۔

دوسرے نمبر پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قولیہ ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: ...مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَّاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً... جس کو اس حالت میں موت آئی کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہ ہوتو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

یہاں بیعت سے مراد حکمران کی بیعت ہے۔ یہ حدیث اس بات پر صراحت کے ساتھ دلالت کر رہی ہے کہ خلیفہ کا تقرر ضروری ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے: لَتَنْقُضَنَّ عُرَى الْإِسْلَامِ عُرْوَةً عُرْوَةً وَأَوَّلُهَا نَقْضًا الْحُكْمُ وَآخِرُهَا الصَّلَاةُ. اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ گریں گی۔ ان میں سب سے پہلے گرنے والی کڑی حکومت کی ہوگی اور آخری کڑی نماز کی ہوگی۔

حکومت سے مراد اسلامی طریق پر حکومت ہے۔ اس میں لازمی طور پر خلیفہ کا وجود بھی داخل ہے جو اس حکومت کا انتظام چلائے۔ ٹوٹنے سے مراد یہ ہے کہ اس سے بیزاری اختیار کی جائے اور اس کی پابندی نہ کی جائے۔ پھر اس کو نماز کے ساتھ ملایا گیا ہے اور وہ ایک متفقہ واجب ہے۔ یہ بھی حکومت اور خلیفہ کی ضرورت کی دلیل ہے۔

تیسرے نمبر پر سنت عملیہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں پہلی اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی۔ جب کہ اس کے لیے تیاری مکہ میں رہ کر کی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود اس مملکت کے پہلے سربراہ بن گئے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے یہودِ مدینہ اور دوسرے قبائل کے ساتھ معاہدے بھی اسی اقتدار کے مظاہر میں سے ہیں جو آپ نے بحیثیت سربراہ مملکت حاصل کر لیا تھا۔

فقہائے کرام نے اس بات کو پالیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں امام یعنی سربراہِ مملکت کی صفت، نبوت کی صفت کے ساتھ جمع ہوگئی تھی۔ فقہا نے اس بات کو تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کون سی ہدایات آپؐ نے بحیثیت سربراہ مملکت ارشاد فرمائی تھیں اور کون سی ہدایات بطور نبی و رسول۔[1]

چوتھے نمبر پر اجماع ہے۔ فقہا کہتے ہیں کہ خلیفہ کا تقرر بالا جماع واجب ہے۔ ان کے اقوال میں سے ایک قول علامہ ماوردی شافعیؒ اور ابویعلیٰ حنبلیؒ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں: عَقْدُ الْإِمَامَةِ لِمَنْ يَقُوْمُ بِهَا فِي الْأُمَّةِ

۱- الفروق للقرافی، ج۱، ص ۲۰۷-۲۰۸

وَاجِبٌ بِالْإِجْمَاعِ.[1] جو شخص امت میں امامت کی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے اس کے لیے امامت کا انعقاد بالا جماع واجب ہے۔

علامہ ابن خلدون تفصیل بیان کرتے ہوئے اپنے مقدمۂ تاریخ میں لکھتے ہیں:

امام کا تقرر واجب ہے۔ شریعت میں اس کا وجوب اجماع صحابہ وتابعینؒ سے معروف ومعلوم ہے۔ کیوں کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؐ کی وفات کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کی اور اپنے معاملات کی نگرانی ان کے سپرد کردی۔ یہی معاملہ ہر دور میں رہا ہے۔ یہ اس بات پر اجماع قرار پایا کہ امام کا تقرر واجب ہے۔[2]

علامہ ابن حزمؒ نے بھی امامت کے وجوب پر اجماع نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

خوارج کے ایک فرقے 'نجدات' کے سوا کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ ''وہ [نجدات] کہتے ہیں کہ امام کا تقرر لوگوں پر لازم نہیں ہے بلکہ ان پر یہ بات لازم ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں''۔[3]

اس کے بعد ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس فرقے میں کوئی ایک فرد بھی نہیں دیکھا جو باقی رہا ہو۔ اس کے بعد ابن حزمؒ نے امامت کے وجوب پر دلائل پیش کیے ہیں اور اس فرقے کی تردید کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ 'نجدات' کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ کیوں کہ دلائل اس کے خلاف پڑتے ہیں۔ اسلام چھوٹی جماعت میں بھی امیر کے تقرر کو لازمی قرار دیتا ہے تو بڑی جماعت میں اس کا تقرر کیسے ضروری نہیں ہوگا۔ حدیث میں آیا ہے: لَا يَحِلُّ لِثَلَاثَةٍ يَّكُوْنُوْنَ بِفَلَاةٍ مِّنَ الْاَرْضِ إِلَّا أَمَّرُوْا عَلَيْهِمْ أَحَدَهُمْ. اگر تین آدمی ایک صحرا میں سفر کر رہے ہوں تو ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ آپس میں کسی کو امیر مقرر نہ کریں۔

اور سنن ابی داؤد کی ایک روایت میں ہے: إِذَا خَرَجَ ثَلَاثَةٌ فِي سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوْا أَحَدَهُمْ. جب تین

۱- الأحكام السلطانية، للماوردی، ص۳، الأحكام السلطانية لأبی يعلیٰ الحنبلی، ص۳

۲- مقدمہ ابن خلدون، ص۱۹۱

۳- الملل والنحل، ابن حزم، ج۴، ص۸۷

آدمی سفر پر نکلیں تو آپس میں ایک کو امیر بنادیں۔

امام ابن تیمیہ ان احادیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قلیل اور مختصر جماعت میں امیر بنانا لازم کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بڑی جماعتوں میں امیر بنانا زیادہ ضروری ہے۔[1]

پانچویں نمبر پر احکام شریعت کی طبیعت کا مسئلہ ہے۔ ان میں سے اکثر احکام ایسے ہیں جن کا نفاذ اقتدار کی قوت کا محتاج ہے۔ مثال کے طور پر جہاد، اقامت حدود، سزاؤں کا نفاذ، لوگوں کے درمیان عدل وانصاف کا قیام وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام کا تقرر ضروری ہے تاکہ ان احکام کو نافذ کیا جا سکے۔ اس اس بات کی طرف امام ابن تیمیہؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ **وَلأَنَّ اللهَ تَعَالٰی أَوْجَبَ الْأَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ وَإِقَامَةَ الْحَجِّ وَالْجُمَعِ وَالْأَعْيَادِ وَنَصْرَ الْمَظْلُوْمِ. وَإِقَامَةُ الْحُدُوْدِ لَا تَتِمُّ إِلَّا بِالْقُوَّةِ وَالْإِمَارَةِ.**[2] اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت حج اور اقامت جمعہ وعیدین کو واجب کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ مظلوم کی مدد کرنا اور حدود اللہ کو قائم کرنا بھی قوت اور امارت کے بغیر ممکن نہیں۔

خلیفہ کے انتخاب کا مستحق کون؟

۳۴۰- خلیفہ کے تقرر کا مستحق امت مسلمہ ہی ہے۔ یہ امت کی طرف سے اس فرض کی ادائیگی ہے جو ان کی طرف متوجہ ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو المغنی میں وارد ہے۔ وہ یہ کہ **مَنِ اتَّفَقَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰی إِمَامَتِهِ وَبَيْعَتِهِ ثَبَتَتْ إِمَامَتُهُ وَوَجَبَتْ مَعُوْنَتُهُ.**[3] جس کی امامت اور بیعت پر مسلمان متفق ہو جائیں اس کی امامت ثابت ہو جاتی ہے اور اس کی مدد واجب۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کو حق ہے کہ وہ اپنے میں سے جس کو بھی منصب امامت کے لیے مناسب

۱- فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۲۸ ص ۶۵ یہی رائے ان کی کتاب السیاسۃ الشرعیۃ، ص ۱۳۹ میں بھی ہے۔

۲- السیاسة الشرعية فى الراعى والرعية، ص ۱۳۹

۳- المغنى لابن قدامة الحنبلى، ج ۸، ص ۱۷

سمجھے اس کو منتخب کرے۔

خلیفہ کے انتخاب میں امت کے حق کی بنیاد

۳۴۱- خلیفہ کے انتخاب میں امت کے حق کی بنیاد ہمارے خیال میں یہ ہے کہ قرآن کریم میں احکام کے نفاذ، زمین میں کلمۃ اللہ کی سربلندی اور فاضلانہ اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے امت ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔اس قسم کے قرآنی نصوص میں سے چند یہ ہیں:

۱- وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَّأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ ۹:۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

۲- يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ (النساء ۴:۱۳۵) اے لوگوں جو ایمان لائے ہو! انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو، اگر چہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔

۳- اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِىْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور ۲۴:۲) زانی عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

یہ اور اس طرح کی دوسری بہت سی نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مسلمان جماعت اسلام کے احکام کی ذمہ دار ہے۔

جب مسلمان امت اسلامی احکام کے نفاذ کی ذمہ دار ہے اور اس سے یہی تقاضا ہے تو یہ بات خود بخود معلوم ہوئی کہ وہ اس نفاذ کے لیے درکار قوت و اقتدار کی مالک ہے۔اور یہ ملکیت اسے شارع کی طرف سے ملی ہے۔

پھر چونکہ پوری اسلامی جماعت بحیثیت مجموعی براہ راست اس اقتدار کو استعمال نہیں کر سکتی، کیوں کہ حقائق کی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے، اس لیے حکومت و اقتدار میں نیابت ضروری ہوگئی، اور نیابت یہ ہے کہ

امت اپنے میں سے ایک شخص کو خلیفہ منتخب کرے، تاکہ وہ براہِ راست اقتدار میں امت کی نیابت کا فریضہ ادا کرے اور امت پر عائد کردہ ذمہ داری کو ادا کرے۔ مالک کا اپنی ملکیت میں کسی کو نائب بنانا ایک جائز امر ہے۔ یہ چیز فقہ اسلامی میں نیابت کے نظریے میں معروف و مشہور ہے۔

خلیفہ کی قانونی حیثیت

۳۴۲- جب سربراہ مملکت یعنی خلیفہ کا انتخاب امت ہی کرتی ہے تو وہ امت کا وکیل اور اس کا نائب ہوتا ہے۔ اس کا قانونی مقام امت کے نائب اور وکیل ہی کا مقام ہے۔ فقہائے کرام اس بات کو سمجھ گئے تھے۔ انھوں نے اس کی صراحت کی ہے۔ ان کے اقوال کو امام ماوردیؒ نے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے خلیفہ اور اس کے وزیر کی موت سے شہر یا علاقے کے امیر پر اس کے اثرات کے بارے میں کلام کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں:

اگر امیر کا تقرر خلیفہ کی طرف سے ہوا ہو تو خلیفہ کی موت سے وہ معزول نہیں ہوگا لیکن اگر امیر کا تقرر وزیر کی طرف سے ہوا ہو تو وزیر کی موت سے وہ معزول ہو جائے گا۔ اس لیے کہ خلیفہ جو تقرر کرتا ہے وہ مسلمانوں کی جماعت کا نائب ہونے کی حیثیت سے کرتا ہے اور وزیر جو تقرر کرتا ہے وہ خلیفہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے کرتا ہے۔[1]

خلیفہ کا تقرر کیسے؟

۳۴۳- جب یہ بات طے ہوگئی کہ خلیفہ کا انتخاب اُمت کرے گی تو اب سوال ہے کہ امت اپنے اس اختیار کی مشق کیسے کرے گی؟ کیا اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ امت براہِ راست اپنا یہ اختیار استعمال کرے گی کہ ہر شخص اس منصب لیے جس کو موزوں سمجھے اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرے یا یہ کہ کچھ لوگ امت کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کی طرف سے یہ کام انجام دے گی؟

حقیقت یہ ہے کہ سربراہ مملکت کے تقرر کے لیے ہمارے ہاں کوئی ایک متعین طریقہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ امت کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ امت ہی یہ بات بھی طے کرے گی کہ

۱- الأحكام السلطانية للماوردی، ص ۲۹

اپنے لیے خلیفہ کا انتخاب کس طریقے پر کرے۔ اس بنا پر امت کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ براہ راست طریقے سے خلیفہ کا انتخاب کرے۔

اس صورت میں امت کے تمام افراد خلیفہ کے انتخاب میں شریک ہوں گے، سوائے ان کے جو کسی دلیل شرعی کی بنا پر اس اختیار سے مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں جیسے چھوٹے بچے، دیوانے اور غیر مسلم۔ اس طریقے کی سند ہمیں اس آیت کریمہ میں ملتی ہے کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۸) اور وہ اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔

اس آیت کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ مسلمان اپنے اہم معاملات میں باہم مشورہ کرتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ خلیفہ کا انتخاب ان کا اہم ترین معاملہ ہے۔

ہم نے یہاں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی تائید امام رازی کی تفسیر سے بھی ہوتی ہے۔ وہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو یہ جمع ہو کر باہم مشورہ کرتے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ہے۔ یعنی ان کی آرا الگ الگ نہیں ہوتیں۔ بلکہ جب تک کہ وہ کسی معاملے میں جمع ہو کر مشورہ نہ کریں اس کا عزم نہیں کرتے۔[1]

امت کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ اپنے اس حق کو بالواسطہ طور پر نمایندگی کے طریقے سے انجام دے۔ اس طریقے کی سند ہمیں خلفائے راشدین کے دور کے واقعات میں ملتی ہے۔ اسلام کے فہم اور اس پر عمل کرنے کے لحاظ سے وہ خیر القرون تھے۔ ان خلفائے کرام کا انتخاب مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے عمل میں آیا تھا جنھیں فقہا اہل الحل والعقد[2] کے نام سے پکارتے ہیں۔ پھر مدینہ میں موجود مسلمانوں نے ان کی پیروی کی تھی اور انھوں نے اس نمایندہ گروہ کے منتخب کردہ خلیفہ کی بیعت کی تھی۔ ان کا انتخاب براہ راست سارے مسلمانوں نے نہیں کیا تھا۔ اسی طرح انتخاب کے بعد سارے مسلمان علاقوں کے سارے مسلمانوں نے بھی ان کی بیعت نہیں کی تھی۔ مگر اس طریقے پر کوئی اعتراض بھی منقول نہیں ہے۔ نہ خلفائے راشدین کی طرف سے اور نہ دوسرے لوگوں کی طرف سے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس انتخاب کے اس طریقے کی صحت پر مسلمانوں کا اجماع ہوا ہے۔ اس طریقے کی تائید اس بات پر غور کرنے سے بھی ہوتی ہے کہ امت

۱۔ تفسیر الرازی، ج ۲۷، ص ۱۷۷

۲۔ اہل الحل والعقد کے لفظی معنی ہیں گرہ کھولنے اور لگانے والے، مراد ہے اہم امور کا فیصلہ کرنے والے۔ (مترجم)

اپنے لیے خلیفہ کے انتخاب کا حق رکھتی ہے، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ اور جو جس بات کا حق رکھتا ہو اس کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے حق کو براہ راست استعمال کرے یا اس کے لیے کسی کو اپنا نائب اور نمایندہ بنا کر اسے استعمال میں لائے۔

فقہائے کرام نے انتخاب کے اس طریق کار کی بھی تائید اور صراحت کی ہے۔ ان کے اقوال میں سے ایک یہ ہے: جب یہ بات طے ہوگئی کہ یہ منصب یعنی منصب خلافت بالا جماع واجب ہے تو اب یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے۔ اس کا مرجع اہل الحل والعقد کی طرف ہے۔ یہ لوگ خلیفہ کا تقرر کریں گے اور امت پر اس کی اطاعت واجب ہوگی۔[1]

اہل الحل والعقد

۳۴۴- جب یہ بات معلوم ہوئی کہ خلیفہ کا انتخاب امت کا حق ہے اور وہ اس حق کو اہل الحل والعقد کے ذریعے استعمال کرسکتی ہے تو سوال یہ ہے کہ اہل الحل والعقد کون ہوتے ہیں؟ ان کا امت کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اور وہ یہ مقام کیسے حاصل کرسکتے ہیں؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ فقہائے کرام ان کے لیے کچھ عمومی اوصاف بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ان کے لیے معتبر شرائط ہیں۔ ان اوصاف میں سے ایک 'عدالت'[2] ہے جو اپنی شرائط کے لیے جامع ہو۔ دوسرا وصف وہ علم ہے جس کے ذریعے وہ امامت کے مستحق شخص کو، جس کے اندر امامت کی تمام شرائط موجود ہوں، پہچان سکے۔ تیسری چیز صاحب رائے ہونا اور حکمت ہے جو امامت کے لیے ایک ایسے شخص کے انتخاب کا ذریعہ بنتے ہیں جو امامت کا سب سے زیادہ اہل اور مصلحتوں کی تدبیر پر اچھی طرح قادر ہو۔[3]

بعض فقہائے محدثین اہل الحل والعقد کے لیے زیادہ واضح اوصاف کا تعین کرتے ہیں۔ تفسیر المنار کے مؤلف علامہ رشید رضا رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اولوالامر اہل الحل والعقد کی جماعت کا نام ہے۔ یہ امرا، حکما، علما، فوجوں کے سربراہ اور باقی رہنما و قائدین ہیں، جن کی طرف لوگ اپنی ضروریات اور عمومی مصالح میں

۱- مقدمہ ابن خلدون، ص۱۹۳، نیز دیکھیے: الماوردی، ص۴

۲- عدالت کی شرطوں میں سے ایک شرط اسلام ہے۔ چنانچہ عادل قرار دیے جانے کے لیے ایک شخص کو مسلمان ہونا چاہیے۔ (مولف)

۳- الاحکام السلطانیۃ للماوردی، ص۴، الاحکام السلطانیۃ، لابی یعلیٰ الحنبلی، ص۳-۴

رجوع کرتے ہیں۔[1]

اس قول سے اور فقہا کے مذکورہ بالا اقوال سے یہ بات فہم ہوتی ہے کہ امت میں اہل الحل والعقد کی پیروی کی جاتی ہے۔ وہ امت کا اعتماد اور اس کی رضا حاصل کرنے والے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ امت کو ان کے تقویٰ، عدالت، اخلاص، استقامت، رائے کی پختگی، معاملات کی سمجھ بوجھ اور امت کے مفادات کے بارے میں فکرمند ہونے کا علم ہوتا ہے۔

رہا دوسرا سوال کہ اہل الحل والعقد کا امت کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا امت کے ساتھ 'نمایندہ' اور 'وکیل' کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ امت کی نمایندگی میں براہِ راست سربراہِ مملکت یعنی خلیفہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا انتخاب امت کے ہاں بھی لازم و معتبر سمجھا جاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ وہ یہ مقام کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں فوری طور پر ذہن میں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کو اُمت ہی اپنے انتخاب سے اس مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ مگر سابقہ تاریخ میں ہم اس بات کی کوئی مثال نہیں پاتے کہ امت نے مل کر کسی گروہ کو منتخب کیا ہو اور اسے اہل الحل والعقد کی صفت عطا کی ہو۔ لیکن اس کے باوجود کہ سابقہ تاریخ اس طرح کے کسی انتخاب سے خالی ہے یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ پہلے جن لوگوں کو اہل الحل والعقد کہتے تھے وہ امت کے نمایندے نہیں تھے یا وہ ان کے وکیل شمار نہیں ہوتے تھے، اس لیے کہ وکالت کا انعقاد جیسا کہ معروف ہے، کبھی صراحتاً ہوتا ہے اور کبھی ضمناً، اور اسلام کے ابتدائی دور یعنی خلفائے راشدین کے دور میں اہل الحل والعقد کی وکالت ضمنی وکالت تھی۔ اس لیے کہ وہ لوگ اپنے تقویٰ، اسلام میں سبقت، معاملات کا درک رکھنے اور اخلاص فی العمل کی بنا پر معروف تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت کا شرف اس کے علاوہ تھا جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی تعریف کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی کبھی عمومی اور کبھی خصوصی تعریف فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو امت کی رضا اور اس کا اعتماد حاصل تھا۔ اس لیے وہاں اس بات کی ضرورت نہیں تھی کہ اُمت ان کو منتخب کرے اور ان کو صراحتاً اپنا وکیل بنائے۔

اگر اس طرح کا کوئی انتخاب عمل میں لایا بھی جاتا تو یقیناً یہی بہترین لوگ اس میں کامیاب ہوتے جو

۱۔ تفسیر المنار، ج ۵، ۱۸۱

انتخاب کے بغیر بھی اہل الحل والعقد کے طور پر معروف تھے۔اور یقینی بات ہے کہ اس مقام کے بارے میں کوئی بھی ان سے جھگڑا نہ کرتا۔یہی وجہ کہ ان کی طرف سے انتخابِ خلیفہ اُمت ہی کی طرف سے معتبر سمجھا گیا۔کیوں کہ یہ اہل الحل والعقل کی امت کی طرف سے ضمنی وکالت کے طور پر منتخب شدہ ہوتا تھا۔

عصر حاضر میں اہل الحل والعقد کی پہچان

۳۴۵- موجودہ دور میں جب ہم سربراہ مملکت کے انتخاب کے لیے شرعی احکام کی روشنی میں بالواسطہ طریقہ اپناتے ہیں تو یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے کہ امت اپنے لیے کچھ ایسے نمایندوں کا انتخاب کرے جو براہ راست سربراہ مملکت کا تقرر کرتے ہیں۔

امت جن لوگوں کو اس کام کے لیے منتخب کرتی ہے ان کو اہل الحل والعقد بھی کہہ سکتے ہیں۔اس لیے کہ امت انھی کی پیروی کرتی ہے اور امت کی طرف سے ان کی نمایندگی پر راضی ہوتی ہے۔مملکت کا فرض ہے کہ اس انتخابات کے لیے ضروری نظام وضع کرے اور اس کو جعل سازی اور فراڈ سے محفوظ رکھنے کی ضمانت فراہم کرے۔نیز اس میں یہ بات ضروری قرار دی جائے کہ جن لوگوں کو امت اہل الحل والعقد ہونے کے لیے منتخب کرتی ہے ان میں وہ شرائط موجود ہونی چاہئیں جو فقہائے کرام نے ان کے لیے مقرر کی ہیں۔اہل الحل والعقد کی تشکیل، ان کی پہچان اور امت کی طرف سے ان کی صریح نمایندگی کے ثبوت کے لیے مذکورہ طریقے سے انتخاب ہمارے خیال میں ضروری ہے۔اس لیے کہ موجودہ دور میں افرادِ امت کی کثرت کی وجہ سے ضمنی نمایندگی کا حصول ممکن نہیں ہے۔اس طرح کی ضمنی نمایندگی کی اجازت امت کے لیے ایک خطرناک دروازہ کھول دے گی اور اس سے امت میں مستقل افراتفری اور انارکی پیدا ہو جائے گی۔کیوں کہ اس طرح ہر شخص اپنے لیے اس مقام کا دعویٰ کرے گا خواہ اس کے اندر مذکورہ شرائط پائی جاتی ہوں یا نہیں۔وہ امت کی طرف سے نمایندہ اور نائب کے مقام پر کھڑا ہوگا اور کہے گا کہ امت میری نیابت پر راضی ہے۔

ولی عہد کا تقرر

۳۴۶- ہم نے کہا کہ امت ہی اہل الحل والعقد کے ذریعے خلیفہ کا انتخاب کرے گی۔اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ پھر ولی عہد کے تقرر کا کیا مطلب ہے جسے فقہا نے کسی کو منصب خلافت پر مقرر کرنے

کے لیے تسلیم کیا ہے؟ امام ماوردیؒ اور ابویعلیٰ حنبلیؒ کہتے ہیں:

امامت کا انعقاد دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ایک اہل الحل والعقد کے انتخاب سے اور دوسرا اس طرح کہ خلیفہ کسی کو اپنا ولی عہد بنالے۔[1]

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ولی عہدی کی طریقے پر خلیفہ کا تقرر عملی طور پر خلفائے راشدین کے زمانے میں ہو چکا ہے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے چھ آدمیوں کو ولی عہد مقرر کر کے آپس میں کسی ایک کو خلیفہ مقرر کرنے کا اختیار دیا تھا۔ان دو ابتدائی واقعات کی بنیاد پر فقہا نے ولی عہد کا تقرر جائز قرار دیا ہے۔انھوں نے اس طریق کار کے جواز کو اجماع سے ثابت قرار دیا ہے۔

لیکن یہ سوال پھر بھی باقی ہے کہ ولی عہد بنانے کی شرعی اور قانونی حیثیت کیا ہے، کیا ایک شخص ولی عہدی ہی سے خلیفہ بن جاتا ہے، اور کیا ولی عہدی کے لیے کوئی شرط درکار ہے؟ ان سوالوں کا جواب دینا ضروری ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ولی عہدی امت کے حق انتخاب خلیفہ کے ساتھ کس حد تک موافق یا مخالف ہے۔

یہ جواب درج ذیل نکات سے سامنے آتا ہے۔

۱-فقیہ ابویعلیٰ حنبلی کی کتاب الأحكام السلطانية میں چند اشارے موجود ہیں:

أ- امام کے لیے جائز ہے کہ اپنے بعد والے امام کو ولی عہد بنائے...مگر اس کا کسی کو ولی عہد بنانا امامت کا عقد نہیں ہے۔

ب- ولی عہد کی امامت صرف ولی عہد کے ساتھ منعقد نہیں ہوتی، بلکہ یہ مسلمانوں کی بیعت سے منعقد ہوتی ہے...ولی عہد کی امامت اصل امام کی وفات کے بعد موجودہ لوگوں کے انتخاب سے منعقد ہوتی ہے۔[2]

یہ اقوال اس بات پر صراحت کے ساتھ دلالت کر رہے ہیں کہ امامت صرف ولی عہدی سے نہ منعقد

۱-الاحكام السلطانية، الماوردی، ص۴، ابویعلیٰ، ص۷

۲-ابویعلیٰ، ص۹

ہوتی ہے اور نہ ثابت ہوتی ہے۔اس کا ثبوت اہل الحل والعقد کے انتخاب ہی سے ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ولی عہدی کی قانونی حیثیت خلاف کے لیے 'نامزدگی' کی ہے۔ یہ ولی عہد کا خلافت پر حتمی تقرر نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ فقہا نے کہا ہے کہ امامت ولی عہدی سے منعقد ہو جاتی ہے اور 'انعقاد' اور 'نامزدگی' دو الگ الگ چیزیں ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ 'انعقاد' یہاں 'نامزدگی' پر محمول ہے، تاکہ یہ قول ان اقوال سے موافق ہو جو ہم نے بیان کیے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ 'انعقاد' کا لفظ علی عہدی کے نتیجے پر محمول ہے۔ولی عہدی کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر اہل الحل والعقد اس پر راضی ہوں اور وہ آپس میں مشورہ کرکے اسی 'نامزد' شخص کو خلیفہ مقرر کریں تو اس کی امامت وخلافت منعقد ہو جائے گی، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔

۲- حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حضرت عمرؓ کو ولی عہد بنانے کے واقعے میں حضرت صدیقؓ نے اہل الحل والعقد سے مشورہ کیا تھا کہ میں عمرؓ کو ولی عہد بنانا چاہتا ہوں۔انھوں نے اس پر اپنی رضامندی اور موافقت کا اظہار کیا۔یہ بات تاریخ میں ثابت ہے۔اس بنا پر حضرت صدیقؓ کا حضرت عمرؓ کو ولی عہد مقرر کرنا گویا کہ اہل الحل والعقد کی طرف سے ولی عہد مقرر کرنا تھا، کہ جب خلیفہ کی وفات ہوگی تو حضرت عمرؓ کی امامت منعقد ہو جائے گی۔اس توجیہ کی بنیاد پر حضرت ابوبکرؓ کی حضرت عمرؓ کو ولی عہد مقرر کرنے کو اہل الحل والعقد کے ارادے کا اظہار قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہی معاملہ حضرت عمرؓ کا چھ افراد کو ولی عہد مقرر کرنے کا تھا کہ وہ آپس میں ایک کو خلیفہ مقرر کرلیں۔حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد ان افراد میں سے ایک کے انتخاب کی ذمہ داری حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو سونپی گئی۔چنانچہ وہ تین دن رات تک کبار صحابہ اور اہل الحل والعقد سے مشورہ کرتے رہے۔انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمانؓ پر سب راضی ہو رہے ہیں اس لیے ان کے انتخاب کا اعلان کیا اور لوگوں سے ان کی بیعت کی اپیل کی۔چنانچہ لوگوں نے ان کی بیعت کرلی۔

اس کے باوجود ہم حضرت ابوبکرؓ کے حضرت عمرؓ کو ولی عہد بنانے اور حضرت عمرؓ کے چھ افراد کے ولی عہد بنانے کو خلافت کے لیے 'نامزدگی' ہی قرار دیتے ہیں، اگرچہ اس سے پہلے اہل الحل والعقد سے مشاورت ہوئی تھی اور انھوں نے اس نامزدگی کے ساتھ اتفاق کیا تھا۔اس لیے کہ اہل الحل والعقد کی اس موافقت پر ان

کی طرف سے خلافت کے لیے عملاً تقرر لازم نہیں آتا، بلکہ جب ولی عہد بنانے والا خلیفہ وفات پائے گا اور وہ اہل الحل والعقد اس کے ساتھ بیعت کر کے اس کی صریحی موافقت کا اعلان کریں گے تب ولی عہد خلیفہ متصور ہوگا۔ چنانچہ جب تک اہل الحل والعقد کے انتخاب اور اس کی بیعت کا صریحی اعلان نہ کریں گے اس وقت تک نامزد ولی عہد خلیفہ نہیں بن سکتا۔

اسی بات کی طرف مشہور فقیہ امام ابن تیمیہؒ نے توجہ دلائی ہے۔ وہ امامت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اُن لوگوں کے اقوال کی تردید کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ امامت کا انعقاد چار، تین یا دو افراد کی بیعت سے بھی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں:

یہ اہل السنۃ والجماعۃ کے ائمہ کے اقوال نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک امامت کا انعقاد اہل اقتدار کی موافقت سے ہوتا ہے۔ ایک شخص امام (خلیفہ) نہیں بن سکتا جب تک کہ اہل اقتدار اس کے ساتھ موافقت نہ کریں۔ اہل اقتدار وہ لوگ ہیں کہ اگر وہ امام کی اطاعت پر آمادہ ہوں تو امامت کا اصل مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ امامت کا مقصود تو قدرت اور اقتدار ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جب اس کی ایسی بیعت ہوتی ہے جس کی بنا پر اسے قدرت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے تو وہ امام ہو جاتا ہے... یہی معاملہ حضرت عمرؓ کا تھا کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو اپنا ولی عہد بنالیا تو وہ اسی طرح امام بن گئے کہ اہل الحل والعقد نے ان کی بیعت اور اطاعت کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ اہل الحل والعقد حضرت ابوبکرؓ کی ولی عہدی کو نافذ نہ کرتے اور حضرت عمرؓ کی بیعت نہ کرتے تو وہ امام نہ بنتے، خواہ یہ جائز ہو یا نہ ہو... جو لوگ کہتے ہیں کہ ولی عہد ایک، دو یا چار افراد کی موافقت سے امام بن سکتا ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ وہ اصحاب قدرت وشوکت نہ ہوتو یہ سخت غلطی پر ہیں۔ اسی طرح جس نے یہ گمان کیا کہ ایک، دو یا دس آدمیوں کا بیعت نہ کرنا امامت کو نقصان پہنچاتا ہے تو یہ بھی غلطی پر ہے۔ حضرت عثمانؓ بعض لوگوں — یعنی انھی چھ افراد، جنھیں حضرت عمرؓ نے نامزد کیا تھا — کے انتخاب سے امام نہیں بنے تھے۔ بلکہ اس طرح خلیفہ بنے تھے کہ لوگوں نے ان کی بیعت کی تھی۔ حضرت عثمانؓ کی بیعت سارے مسلمانوں نے کی تھی، ان میں سے کسی نے بھی ان کی بیعت میں پس و پیش نہیں کی۔[1]

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ ولی عہد بنانے کی اصل حیثیت نامزد کرنے کی ہے، اور یہ اہل الحل والعقد

۱- منہاج السنۃ لابن تیمیہؒ، ج ۱، ص ۱۴۰-۱۴۳

کی مشاورت اوران کے اظہارِ رضامندی سے پہلے ہوتی ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ خلیفہ کے انتخاب کے لیے ایک درست اور قابل تعریف مسلک ہے۔ یہ امت کے انتخاب خلیفہ کے حق کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ طریقہ کسی کی ولی عہدی کے بغیر اہل الحل والعقد کے براہ راست انتخاب سے زیادہ پسندیدہ طریقہ ہے۔ اس لیے کہ ولی عہدی میں اختلاف ونزاع کے اسباب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن حزمؒ نے بھی اسی طریقے کو راجح قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یہ (یعنی ولی عہدی) ہی وہ طریقہ ہے جسے ہم مختار سمجھتے ہیں اور دوسرے طریقوں کو ناپسند کرتے ہیں، اس لیے کہ اس طریقے میں امامت کا اتصال اور اسلام واہل اسلام کے معاملات کا انتظام ہوتا ہے۔ اس سے اختلاف اور انارکی کا خوف رفع ہو جاتا ہے جبکہ دوسرے طریقوں میں امت کے اندر افراتفری، اضطراب اور لالچوں کے پیدا ہونے کی توقع ہوتی ہے۔[1]

خلیفہ کی شرائط

۳۴۷-خلیفہ میں کچھ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ ساری شرائط ایسی ہیں جو اُس کے لیے اِس عظیم ذمہ داری کی تکالیف اٹھانے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ان کی موجودگی میں وہ اس ذمہ داری کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور امت کی مصلحتوں کے حصول کے لیے اچھے طریقے سے ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ فقہائے کرام نے ان شرطوں کو حسب ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا ہے۔

۱-مسلمان ہونا

پہلی بات یہ ہے کہ خلیفہ کو مسلمان ہونا چاہیے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (النساء۴:۵۹) اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اصحاب امر ہوں۔

مراد ہے: مِنكُمْ أَيُّهَا الْمُسْلِمُونَ یعنی تم میں سے اے اہل اسلام! چنانچہ خلیفہ کو مسلمان ہونا چاہیے۔

۱-الملل والنحل لابن حزم، ج۴، ص۱۶۹

دوسری دلیل یہ ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (النساء۴:۱۴۱) اللہ نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی۔

خلافت سب سے بڑی سبیل ہے، چنانچہ یہ غیر مسلم کو حاصل نہیں ہوگی۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ خلافت، جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے، دین کی حفاظت میں صاحب شریعت کی نیابت ہے، اور یہ بات کسی غور و فکر کی محتاج نہیں کہ یہ امانت کسی ایسے ہی شخص کے سپرد ہونی چاہیے جو اس دین پر ایمان رکھتا ہو۔ اسے کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کیا جا سکتا جو اس پر ایمان نہ رکھتا ہو۔

۲- مرد ہونا

اس کی ایک دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء۴:۳۴) مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

دوسری دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے: لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا أَمْرَهُمْ امْرَأَةً. وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنا معاملہ عورت کے سپرد کیا۔

یہ ایک صحیح حدیث ہے۔ اسے بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔[1]

زمینی صورت حال اس بات کی بہترین شہادت دے رہی ہے کہ عورت سربراہِ مملکت کی مشکلات برداشت کرنے سے عاجز ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ مشکلات زیادہ بھی ہوتی ہیں اور بہت بڑی بڑی بھی۔ اس کے بارے میں ہم زیادہ دلائل پیش نہیں کرنا چاہتے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا جو ایک ایک ارشاد ہم نے نقل کیا ہے وہ ہمارے ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے کافی ہے جو اللہ، یوم آخر، اور دین اسلام پر ایمان رکھتا ہو۔

جس شخص کے دل میں اس حوالے سے کوئی شک ہو اسے ہم کہتے ہیں کہ زمانہ ماضی اور زمانہ حاضر میں دنیا کی سلطنتیں آپ کے سامنے ہیں۔ آپ کاغذ قلم سنبھال کر ان عورتوں کی گنتی کریں جو سربراہ مملکت کے عہدے پر فائز ہوئی ہیں۔ اور دوسری طرف مرد سربراہانِ مملکت کی گنتی کریں۔ پھر ان کے درمیان تقابل

۱- تیسیر الوصول ج ۲، ص ۳۶۔

کریں، آپ دیکھیں گے کہ ان کا تناسب بہت کم ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ اپنے تجربے کی بنا پر بھی اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ سربراہ مملکت کے عہدے کے لیے مرد ہی موزوں ہیں۔ تاریخ میں جو عورتیں سربراہ مملکت کے عہدے پر فائز ہوئی ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے اور یہ ایک استثنائی صورت حال ہے۔

۳- عالم ہونا

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ احکام شریعت کا علم بھی رکھتا ہو، اس لیے کہ وہ احکام شرعیہ کے نفاذ پر مامور ہے۔ اور جب وہ ان احکام سے جاہل ہوگا تو ان کے نفاذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ عمل تو علم سے پہلے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ (محمد ۴۷:۱۹) پس خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور معافی مانگو اپنے گناہوں کی۔

بعض فقہا نے اس کے لیے اجتہاد کی شرط لگائی ہے۔ وہ امامت کے لیے تقلید پر مبنی سادہ علم کافی نہیں سمجھتے۔ نیز یہ کہ وہ امورِ سیاست اور حکومتی معاملات جانتا ہو۔ وہ امت کے مفادات اور ان کے حصول کے طریقے جانتا ہو اور اس کے بارے میں ہمیشہ فکر مند رہتا ہو، نیز یہ مفادات حاصل کرنے کے بعد امت تک بھی پہنچا دے۔

۴- عادل ہونا

خلیفہ کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ دینی حوالے سے ایک عادل اور قابل اعتماد شخص ہو۔ اس کے بارے میں کوئی فاسقانہ بات معروف نہ ہو۔ اس میں تقویٰ و پرہیز گاری ہو۔ اس میں اتنی جرأت و شجاعت پائی جاتی ہو کہ وہ حدود اللہ کو قائم کر سکے اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا شکار نہ ہو۔[۱]

۵- قُرشیّت

خلیفہ کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ وہ قریش میں سے ہو۔ اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

۱- الماوردی، ص ۴، ابویعلیٰ، ص ۴، مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۹۳

حدیث ہے، جس میں فرمایا ہے کہ اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ. ائمہ قریش میں سے ہوں گے۔

یہ بھی ایک صحیح حدیث ہے اور ایک زائد طریقوں سے مروی ہے۔ فقہا نے اس سے استدلال کیا ہے۔[1]

اس شرط کی حکمت یہ ہے، جیسا کہ علامہ ابن خلدونؒ فرماتے ہیں:

خلافت کا اصل مقصد تب حاصل ہوتا ہے جب مسلمان مجتمع ہوں، وہ یک زباں ہوں، وہ باہمی نزاعات کو ترک کر دیں اور ساری امت ایک سربراہ کی مطیع بن جائے۔ یہ چیزیں تب حاصل ہوتی ہیں جب کہ خلیفہ ایسا ہو جس کی وجہ سے دلوں کو سکون و اطمینان نصیب ہو اور اس کی فضیلت و پیش روی کے سب معترف ہوں۔ یہ اعتراف اور یہ اطمینان قریش کے خلیفہ میں پوری طرح موجود تھا۔ کیوں کہ قریش قوت وشوکت کے مالک تھے اور سارے عرب ان کے بلند مرتبہ ہونے کے معترف تھے۔ وہ ان کی فضیلت اور قیادت بھی تسلیم کرتے تھے۔ اس میں کسی نے ان کے ساتھ نزاع نہیں کیا۔ یہ وہ چیز ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کے مجتمع رہنے کا انحصار تھا۔ سب کے لیے ان کی اطاعت کرنے کا زیادہ احتمال تھا اور دوسروں کی نسبت ان کی اطاعت کا حصول آسان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ائمہ قریش میں سے ہوں گے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کے ذریعے مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور ان کی اطاعت لوگوں کے لیے آسان ہو۔ اس طرح خلافت کا اصل مقصد حاصل ہو جائے گا۔[2]

اس کے بعد علامہ ابن خلدونؒ نتیجہ نکالتے ہوئے کہتے ہیں:

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرشیت کی شرط نزاع کو ختم کرنے کے لیے ہے، کیوں کہ لوگوں میں عصبیت[3] پائی جاتی تھی۔ پھر یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ شارع اپنے احکام کو کسی نسل، کسی زمانے، یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں کرتا تو اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ حکم امت کی کفایت وحفاظت کے لیے تھا،

۱-الملل والنحل لابن حزم، الماوردی، ص۴، ابویعلیٰ، ص۴

۲-مقدمہ ابن خلدون، ص۱۹۵

۳-یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ علامہ ابن خلدون جس عصبیت کی بات کرتے ہیں وہ جاہلی عصبیت نہیں ہے۔ عصبیت سے ان کی مراد یہ ہے کہ آدمی کا ایک قوم سے نسبی یا کسی اور قسم کا تعلق ہو، جو اس کی مضبوط معاون وحمایتی بنے اور دوسرے لوگ اس کے ساتھ حکومت میں جھگڑا نہ کرسکیں۔ (مؤلف)

چنانچہ ہم نے قرشیت کی شرط کو عصبیت کی طرف منسوب کیا اور اس علت کو ختم کیا جو قرشیت کی شرط کے اصل مقصود پر مشتمل تھا۔ یہ علت عصبیت کا وجود ہے۔ چنانچہ جو شخص مسلمانوں کے امور کا نگران ہوتا ہے اس کے لیے ہم نے چند شرائط رکھیں۔ ایک یہ کہ اس کا تعلق مضبوط عصبیت والی قوم سے ہو اور اس کی قوم اپنے ہم عصروں پر غالب ہو، تاکہ وہ دوسروں کو اپنے پیچھے چلا سکے اور لوگ اچھے طریقے سے اس کی حمایت پر متفق ہوں۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک قرشیت کا اصل مقصد و مرجع بھی یہ ہے کہ آدمی ایک ایسی جماعت کے ساتھ نسبت رکھتا ہو جو طاقت وقوت کی مالک ہو، لوگوں کو اس جماعت کی قوت وسطوت کا اعتراف ہو اور اسی کو امام ہونے کا فضل وشرف حاصل ہو، تاکہ اس کے ذریعے وہ اس شخص کی اطاعت پر آمادہ ہوں جو خلافت کا ذمہ دار بنتا ہے۔ اس سے لوگوں کے جذبات پرسکون ہوں گے، ان پر حکومت کرنا آسان ہوگا اور وہ اپنی پسندیدہ اور مطلوب حکومت کے آگے سر تسلیم خم کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ حدیث **الأئمة من قریش** ایک صحیح حدیث ہے۔ اس کی سند یا متن میں کلام کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ قابل غور بات صرف یہ ہے کہ اس کا معنیٰ ومقصود متعین کیا جائے۔ فقہا نے تو اس حدیث کا یہی مفہوم لیا ہے کہ خلیفہ کو نسب کے لحاظ سے قریشی ہونا چاہیے۔ فقہا بالعموم یہی معنی بیان کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ کوئی اور معنی بیان نہیں کرتے، سوائے ابن خلدون کے۔ وہ مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فقیہ بھی ہیں۔ انھوں نے حدیث کی وہ توجیہ کی ہے جسے ہم نقل کر چکے ہیں۔

ابن خلدونؒ نے حدیث کا جو مفہوم ذکر کیا ہے، اگرچہ حدیث کے الفاظ میں اس کی گنجایش موجود ہے مگر ہماری نگاہ میں یہ ایک کمزور احتمال ہے۔ اسی طرح کے ایک کمزور احتمال کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث اِخبار کے طور پر وارد ہوئی ہے کہ ایسا ہوگا، نہ کہ امر کے طور پر، کہ ایسا ہونا چاہیے۔

اس ساری بحث کی روشنی میں اب میری نظر میں راجح یہ ہے کہ جب دو افراد خلافت کی شرائط میں برابر ہوں اور ان میں ایک قریشی ہو تو قریشی کو منتخب کرنا واجب ہوگا۔ لیکن اگر قریشی میں خلافت کی شرائط موجود نہ ہوں اور دوسرے میں باقی ساری شرائط موجود ہوں سوائے اس کے کہ وہ قریشی نہیں ہے تو پھر غیر قریشی کو

۱- مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۹۸

قریشی پر مقدم کیا جائے گا۔ کیوں کہ یہاں قریشی کے ذریعے خلافت کے مقاصد حاصل نہیں ہوسکتے، اس لیے کہ وہ خلافت کی شرائط سے عاری ہے۔ یہاں خلافت کے مقاصد اسی غیر قریشی کے ذریعے پورے ہو رہے ہیں جس میں کافی شرائط موجود ہیں اور وہ خلافت کا بار اٹھانے کی قدرت رکھتا ہے۔

ولایت کے معاملے میں یہ ایک عمومی اصول ہے کہ ولی میں قدرت اور کفاءت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ یہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ اگر قریشی سرے سے موجود ہی نہ ہو تو پھر خلافت اسی شخص کو ملے گی جس میں قرشیت کے علاوہ باقی شرائط پوری ہوں۔

خلیفہ کی معزولی

۳۴۸- خلیفہ کا انتخاب امت کرتی ہے تو اسے معزول کرنے کا حق بھی امت کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ جو تقرر کا حق رکھتا ہے وہ معزول کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ مگر اس حق کے استعمال کے لیے کوئی شرعی جواز ہونا چاہیے، ورنہ یہ اس حق کے استعمال میں زیادتی اور اپنی خواہش کی پیروی ہوگی اور یہ چیز اسلام میں جائز نہیں ہے۔

خلیفہ کی معزولی کا شرعی جواز یہ ہے کہ وہ امت کے وکیل ہونے کی صفت سے ایسا نکل جائے جس کی بنا پر اسے معزول کرنا جائز ہو جائے۔ یا یہ کہ وہ خلافت کا بار اٹھانے سے عاجز ہو۔ اس چیز کی فقہا نے صراحت کی ہے۔

علامہ ابن حزمؒ امامؑ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

...... امام کی اطاعت اس وقت تک واجب ہے جب تک وہ کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق ہماری قیادت کرتا ہے۔ اگر وہ ان دونوں میں سے کسی ایک چیز سے مڑ جائے تو اس کو خلافت کی ذمہ داریوں سے روکا جائے گا۔ اس کے اوپر حد اور حق کو جاری کیا جائے گا۔ لیکن اگر اس کے ضرر سے نہیں بچا جاتا، سوائے اس کے کہ اسے معزول کیا جائے، تو اس کو معزول کر کے کسی اور کو خلیفہ بنایا جائے گا۔[1]

دوسرے فقہا کے اقوال میں سے ایک یہ ہے:

۱- الملل والنحل، ج ۴، ص ۱۰۲

امت کو جیسا کہ اپنے امور کے انتظام اور اپنی سربلندی کے لیے امام کے تقرر کا حق ہے اسی طرح اسے یہ بھی حق ہے کہ وہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر امام کو اپنی ذمہ داریوں سے روکے اور اسے معزول کردے۔ ناگزیر وجوہات میں مثلاً ایک یہ ہے کہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوجائے جس سے مسلمانوں کے حالات بگڑ جائیں یا دینی امور تلپٹ ہوکر رہ جائیں۔[1]

جو امور بارِ خلافت اٹھانے سے عاجز کرنے والے ہیں اور جن کی بنا پر خلیفہ کو معزول کرکے اس کی جگہ کسی اور کو منصب خلافت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے ان کی چند مثالیں یہ ہیں:

شدید جنون، اندھاپن، دشمن کے ہاتھ ایسا قید ہونا کہ رہا ہونے کی امید ہی ختم ہوجائے۔ ان امور کی بنا پر وہ مسلمانوں کے معاملات میں غور وفکر سے عاجز ہوتا ہے اس لیے امت کو چاہیے کہ اس کی جگہ کسی اور کو منتخب کرے تاکہ وہ مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کرسکے۔[2]

معزولی کا اقدام

۳۴۹- یہ بات تو طے ہوگئی کہ امت کو کسی جائز سبب کی بنا پر خلیفہ کو معزول کرنے کا حق حاصل ہے، مگر یہاں اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ محض کسی جائز سبب کی موجودگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لازماً معزولی کا اقدام کیا جائے۔ اس لیے کہ معزولی کے اقدام سے پہلے اس کے امکانات اور نتائج پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اگر معزولی ممکن ہو اور یہ بات یقینی ہو کہ خلیفہ کو معزول کرنے سے امت کو کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچے گا جو اس کی عدم معزولی کی صورت میں پہنچنے والے نقصان سے زیادہ ہو تو اس صورت میں معزولی ضروری ہوگی۔ لیکن اگر یہ نظر آرہا ہو کہ معزولی ممکن نہیں ہے، یا یہ کہ فی نفسہٖ معزولی تو ممکن ہے مگر اس پر ایسے مضر نتائج مترتب ہوتے ہیں جو خلیفہ کے برقرار رہنے کی صورت میں پہنچنے والے نقصان سے زیادہ ہیں تو اس صورت میں معزول نہ کرنا واجب یا کم از کم بہتر ہوگا۔ اس لیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قواعد میں سے ایک یہ ہے کہ منکر کے ازالے سے کوئی بڑا منکر لازم نہ آئے۔[3]

---

۱ – المواقف للإیجی، وشرحہ، بحوالہ کتاب: النظریات السیاسیۃ الإسلامیۃ، استاذ ضیاء الدین الریس، ص ۲۷۰

۲- ابویعلیٰ، ص ۶۰۵

۳- فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ج ۲۸، ص ۱۲۹

۲-شوریٰ

شوریٰ کا وجوب

۳۵۰-شوریٰ اسلامی نظامِ حکومت کی اقدار میں سے اہم ترین قدر ہے۔اس کی صراحت قرآن میں بھی آئی ہے اور سنت میں بھی، اور اس پر فقہا کا اجماع بھی ہے۔

یہ امت کا حق اور خلیفہ کا فریضہ ہے۔اس میں کوتاہی کرنا بھی خلیفہ کی معزولی کا ایک سبب ہے، جیسا کہ ہم عن قریب بیان کریں گے۔شوریٰ کے واجب ہونے کے دلائل قرآن کریم، سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہا کے اقوال سے ماخوذ ہیں۔

۱-اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران ۳:۱۵۹-اور ان کے معاملات میں ان کو شریک مشورہ کرو) اس حکم ربانی کا ظاہر دلیلِ وجوب ہے۔اس آیت کی تفسیر میں فقہا و مفسرین کے جو اقوال منقول ہیں ان میں سے ایک علامہ ابن تیمیہؒ کا یہ قول ہے: حکمران کے لیے مشاورت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا ہے۔[۱]

تفسیر طبری میں اس آیت کے حوالے سے آیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مشاورت کا حکم دیا ہے۔ اس کے ذریعے امت کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ وہ اس معاملے میں اپنے نبی کی پیروی کریں اور جب ان پر کوئی مشکل پڑتی ہے تو وہ آپس میں مشاورت کیا کریں۔[۲]

تفسیر رازی میں ہے: حسنؒ اور سفیان بن عیینہؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مشورے کا حکم اس لیے دیا ہے تاکہ دوسرے لوگ باہمی مشاورت میں آپ کی پیروی کریں اور یہ امت میں ایک مستقل سنت کی شکل اختیار کر جائے۔[۳]

۱-السیاسة الشرعیة لابن تیمیہؒ، ص ۱۶۹
۲-تفسیر الطبری، ج ۴، ص ۹۴
۳-تفسیر الرازی، ج ۹، ص ٦٦

۲- سربراہ مملکت کے لیے مشاورت واجب ہونے کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جلالت شان اور بلند مقام کے باوجود اکثر اوقات اپنے صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

آپؐ نے بدر کے دن مشرکین کے خلاف جنگ کے لیے ان سے مشورہ کیا۔ جنگ اُحد سے پہلے بھی آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ مدینے میں رہا جائے یا مدینے کے باہر دشمن کا سامنا کیا جائے۔ غزوۂ خندق میں آپؐ نے سعدین یعنی سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ سے مشورہ کیا کہ مدینے کی پیداوار کے ایک حصے پر دشمن قبیلے بنوغطفان سے مصالحت کر کے اسے واپس لوٹنے پر آمادہ کیا جائے۔ انھوں نے آپ کو مصالحت نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ آپؐ نے ان کا مشورہ قبول کیا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح اپنے صحابہ سے اکثر مواقع پر مشاورت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض علما نے کہا ہے کہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔[2]

ترکِ مشاورت موجبِ عزل ہے

۳۵۱- جب بات یہ ہے کہ مشاورت امت کا حق اور سربراہ مملکت کا فریضہ ہے تو اس میں اتنی کوتاہی کرنا کہ اسے چھوڑ دیا جائے موجب عزل بن جاتا ہے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ ابن عطیہؒ کہتے ہیں: شوریٰ شریعت کا ایک بنیادی اصول اور پرعزیمت حکم ہے۔ جو حکمران اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہیں کرتا اس کو معزول کرنا واجب ہے۔[3]

چنانچہ اسلامی مملکت میں مطلق العنان حکمران کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

مشاورت کی اہمیت کی وجہ

۳۵۲- اب تک کی بحث سے ہمارے سامنے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نظام حکومت

۱- امتاع الأسماع للمقریزی، ص ۲۱۹، تفسیر الرازی، ج ۹، ص ۶۷

۲- السیاسة الشرعیة لابن تیمیةؒ، ص ۱۶۹

۳- تفسیر القرطبی، ج ۴، ص ۲۴۹

میں مشاورت انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔اس کی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ مشاورت درست رائے کو معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔اس لیے کہ ہر مشیر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے، اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہے اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالتا ہے۔اس طرح سے آرا پیش کرنے اور ان کے درمیان تقابل کرتے ہوئے ان پر گفتگو کے ذریعے اکثر اوقات درست رائے سامنے آتی ہے۔مشاورت کے ذریعے بغیر کسی مشقت کے دوسروں کے معلومات اور تجربات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جس کے حصول میں انھوں نے کئی کئی سال لگائے ہوتے ہیں، بڑی مشقتیں اٹھائی ہوتی ہیں اور بڑی قربانیاں دی ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ مشاورت کے ذریعے حکمران کوئی ایسا اقدام کرنے سے محفوظ رہتا ہے جو امت کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے مگر اکیلے حکمران کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔نقصان جب ایک بار ہو جاتا ہے تب اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔حکمران کی نیت خواہ کتنی ہی اچھی ہو نقصان کو دفع نہیں کیا جاسکتا۔نیز مشاورت میں امت کو اس بات کی تذکیر ہے کہ وہ ایک صاحب اقتدار امت ہے۔اس میں حکمران کے لیے یہ یاددہانی ہے کہ وہ اس اقتدار کے حوالے سے امت کا نمائندہ ہے۔ان دونوں یاددہانیوں میں امت اس سرکشی سے محفوظ رہتی ہے جو انسان کی صفات میں سے ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ (العلق ۹۶:۶) ہرگز نہیں انسان سرکشی کرتا ہے۔

امورِ مشاورت

۳۵۳- امت سے مشاورت ریاست کے مختلف امور اور ان شرعی اجتہادی امور میں ہوتی ہے جن کے بارے میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو۔یعنی سربراہ مملکت دینی اور دنیوی امور میں مشورہ لے گا جیسا کہ فقہا نے اس کی تصریح کر دی ہے۔علامہ جصاصؒ فرماتے ہیں: مشورہ دین اور دنیا کے ان امور میں ہوتا ہے جن میں وحی کے ذریعے کوئی حکم وارد نہ ہوا ہو۔[1]

دنیا کے اہم امور میں یعنی ریاست کے اہم معاملات میں مشاورت کی چند مثالیں یہ ہیں: لشکر ترتیب دینا، اعلان جنگ کرنا، معاہدے کرنا، حکومت کے اہم عہدوں پر اہل لوگوں کا تقرر، وغیرہ۔ریاست کے تمام معاملات میں مشاورت، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے اور جزوی معاملات میں بھی، یہ ضروری نہیں۔ یہ نہ

۱- احکام القرآن، للجصاص، ج۲، ص۴۰

ممکن ہے اور نہ مطلوب، نہ اس کی کوئی ضرورت ہے اور نہ فائدہ، نیز اس کی کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔

اصحابِ شوریٰ

۳۵۴- اب سوال یہ ہے کہ مشاورت ہوگی کیسے؟ کیا سربراہ مملکت پر لازم ہے کہ وہ پوری امت سے مشاورت کرے، یا اس کے ایک گروہ یا چند افراد سے مشاورت کرے گا؟ اس سلسلے میں سیرت رسول جو کچھ مستفاد ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے امور میں جمہور مسلمانوں سے مشورہ لیتے تھے جو براہ راست ان کے ساتھ متعلق ہوتے تھے۔ جیسا کہ غزوۂ اُحد میں کفار کے خلاف جنگ کے لیے نکلنے کے حوالے سے مشورہ تھا۔ اس کے بارے میں آپؐ نے مدینہ میں موجود جمہور مسلمانوں سے مشورہ لیا تھا۔ آپؐ فرماتے: أَشِيْرُوْا عَلَيَّ. مجھے مشورہ دو۔[1]

یہی معاملہ بنوہوازن کی غنیمت کے بارے میں تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شدت کے ساتھ چاہتے تھے کہ لڑائی میں شریک تمام مسلمانوں کی رائے معلوم کی جا سکے۔ روایات میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تو وہاں موجود لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ ہم راضی ہیں، ہمیں سب منظور ہے۔

آپؐ نے فرمایا: فَمُرُوْا عُرَفَاءَ كُمْ أَنْ يَّرْفَعُوْا ذٰلِكَ إِلَيْنَا حَتّٰى نَعْلَمَ... اپنے نقیبوں سے کہو کہ یہ میرے پاس لائیں تاکہ ہمیں اس کی صحیح مقدار معلوم ہو سکے۔

حضرت زید بن ثابتؓ انصار کے نقیب تھے، انھوں نے انصار سے پوچھا کہ: کیا تم لوگ مان چکے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں وہ مان چکے ہیں اور وہ راضی ہیں۔ ان میں کوئی بھی پیچھے نہیں رہا...[2]

یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سارے مسلمان اہل شوریٰ تھے جو مشاورت کے موضوع سے متعلق تھے۔ کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سارے صحابہ سے نہیں بلکہ ان میں سے بعض کے ساتھ مشورہ کرتے تھے، جیسا کہ بدر کے قیدیوں کے معاملے میں ہوا۔ ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ سے مشورہ کیا۔ یہ مشورہ اس بات پر تھا کہ کیا ان لوگوں کو فدیہ لے کر آزاد کیا جائے یا نہیں۔

۱- أمتاع الأسماع للمقریزی، ص۱۱۶

۲- أمتاع الأسماع للمقریزی، ص۴۲۹

غزوۂ خندق کے موقع پر بنو غطفان کو مسلمانوں کے خلاف جنگ سے پیچھے ہٹنے پر آمادہ کرنے کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مدینہ کی ایک تہائی پیداوار پر صلح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس معاملے میں آپؐ نے سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ سے مشورہ کیا۔ ان دونوں نے کہا: یارسول اللہ! اگر یہ آسمانی حکم ہو تو اس پر عمل کر ڈالیے، اور اگر اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو اور آپؐ کی یہی خواہش ہو تب بھی ہم سمع وطاعت کریں گے۔ لیکن اگر یہ آپؐ کی صرف ایک رائے ہو تو ہمارے پاس ان کے لیے صرف تلوار ہی ہے۔ آپؐ نے ان کے مشورے کو قبول کیا اور بنو غطفان کے ساتھ مصالحت کا معاملہ ترک کر دیا۔[1]

ان ابتدائی واقعات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حکمران جن لوگوں سے مشورہ لیتا ہے ان کی نوعیت موضوع مشاورت کی نوعیت بدلنے سے بدل جاتی ہے۔ وہ مسائل جن میں کسی خاص قسم کی مہارت، اچھی رائے اور لطیف ادراک کی ضرورت ہو، اس کے بارے میں سربراہِ مملکت اسی موضوع میں خصوصی مہارت اور تجربہ رکھنے والوں سے مشورہ لے گا۔ اس کی طرف امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: حکمرانوں پر لازم ہے کہ وہ دین کے جن امور کا علم نہیں رکھتے اور جن کا سمجھنا ان کے لیے مشکل ہو ان کے بارے میں اہل علم سے مشاورت کریں۔ جنگی معاملات میں جنگی ماہرین سے مشاورت کرے گا اور رفاہِ عامہ کے معاملات میں معاشرے کے سرکردہ رہنماؤں سے مشورہ لے گا۔ اسی طرح جن امور کا تعلق ریاست وسیاست سے ہے ان کے بارے میں انتظامی امور کے ماہرین، سیاسی مشیروں اور وزراوعمال سے مشاورت کرے گا... علما فرماتے ہیں کہ احکام کے بارے میں اہل شوریٰ کی صفت یہ ہے کہ وہ عالم اور دین دار ہو اور دنیوی امور کے بارے میں اہل مشاورت کی صفت یہ ہے کہ وہ عقل مند اور تجربہ کار ہو۔[2]

سربراہِ مملکت اور اہل شوریٰ میں اختلاف

۳۵۵۔ کبھی کبھی سربراہ مملکت کی رائے اہل شوریٰ سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں مسئلے کا حل کیا ہوگا؟ اس کا حل وہی ہے جس کا حکم آیت کریمہ میں دیا گیا ہے۔ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ وَأُو۟لِى ٱلْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَـٰزَعْتُمْ فِى شَىْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ إِن

۱۔ امتاع الاسماع للمقریزی، ص ۲۳۶

۲۔ تفسیر القرطبی، ج ۴، ص ۲۴۹۔۲۵۰

كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا (النساء۴: ۵۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

چنانچہ جس مسئلے میں اختلاف ہو جائے اسے کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف لوٹانا ضروری ہوگا۔ یہی اس آیت کا تقاضا ہے اور اس پر مفسرین کا اجماع ہے۔[1]

اگر کتاب اللہ اور سنت رسول میں صریح حکم پایا جائے تو اسی کا اتباع واجب ہوگا اور اس کے خلاف کسی کی بات نہیں مانی جائے گی۔ اگر صریح حکم موجود نہ ہو تو پھر جو رائے کتاب اللہ اور سنت رسول کے زیادہ قریب ہوگی اسی پر عمل کیا جائے گا۔[2]

سربراہ کی رائے قبول کرنا

۳۵۶- اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کون سی بات کتاب اللہ اور سنت رسول کے زیادہ قریب ہے اور سربراہ مملکت اور شوریٰ کے درمیان اختلاف برقرار رہے تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟ ہماری رائے، جسے ہم ترجیح دیتے ہیں، یہ ہے کہ اس صورت میں معاملہ حکمران پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر وہ چاہے تو اکثریت کی رائے قبول کرے، چاہے اقلیت کی رائے، یا خود اپنی رائے پر عمل کرے، اگرچہ وہ اکثریت اور اقلیت دونوں کی رائے کے خلاف ہو۔ ہماری یہ بات بظاہر تو عجیب لگتی ہے، اس لیے کہ لوگوں کے ذہن ہر حال میں اکثریت کی رائے قبول کرنے کے ساتھ مانوس ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کا عقیدہ بن چکا ہے کہ اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ اکثریت کی رائے کے خلاف عمل کرنے کو استبداد اور زیادتی خیال کیا جاتا ہے، اور معلوم نہیں اس کو اور کیا کیا نام دیا جاتا ہے۔ مگر حق کی پیروی زیادہ ضروری ہے۔

سربراہ کی رائے قبول کرنے کے دلائل

۳۵۷- اب ہماری رائے کے دلائل کیا ہیں؟ ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱- تفسیر الطبری، ج ۵، ص ۸۷، تفسیر القرطبی، ج ۵، ص ۲۶۱، تفسیر الجصاص، ج ۲، ص ۲۱۲

۲- السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہؒ، ص ۱۷۰

۱- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ. (آل عمران۳:۱۵۹) اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو، پھر (مشورے کے بعد) جب تم عزم کرلو تو اللہ کے بھروسے پر عمل کرو۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو حکم دیا ہے کہ آپؐ جب کسی کام کا عزم کرلیں تو اسے کر ڈالیں اور اللہ پر توکل کریں نہ کہ مشاورت پر۔[۱]

۲- دورِ اوّل کی مثالیں بھی اس کی دلیل ہیں۔ ان میں سے ایک خلیفہ راشد اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا طرزِ عمل ہے جو انھوں نے مرتدین کے خلاف جیش اسامہؓ کے بارے میں اختیار کیا۔ جیش اسامہ بن زیدؓ کے بارے میں جو واقعہ پیش آیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسلمانوں کے ایک لشکر کا قائد بنا کر روانہ کیا تھا۔ اس لشکر میں بڑے بڑے صحابہؓ اور سورما شریک تھے۔ اس لشکر کو آپؐ نے فلسطین کا رُخ کرنے کا حکم دیا۔ یہ لشکر ابھی مدینہ سے نہیں نکلا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا جانکاہ واقعہ پیش آیا۔ اس صورت حال میں حضرت اسامہ ٹھہر گئے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ بنا کر ان کی بیعت کی گئی۔ حضرت عمرؓ بھی اس لشکر کے سپاہی تھے انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس پیغام بھیجا اور اجازت طلب کی کہ ہم لشکر سمیت واپس مدینے لوٹتے ہیں، تاکہ لشکر یہاں رہے اور اس نئی صورت حال میں مدینہ پر حملہ آور ہونے والے مرتدین سے اس کی حفاظت میں اپنا کردار ادا کرے۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے بہت سے مسلمانوں کی یہی رائے تھی مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس رائے کو مسترد کیا اور کہا: واللہ، اگر مجھے معلوم ہو کہ اگر میں درندوں کو نہ روکوں تو وہ میری ٹانگ پکڑ کر کھینچیں گے تب بھی میں ان کو نہ روکوں گا۔ میں اس پرچم کو نہیں کھول سکتا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے لہرایا ہے۔[۲]

مرتدین کا قصہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک بڑے گروہ نے تو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا۔ اگرچہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے تھے۔ انھوں نے مدینے میں ایک وفد بھیجا تاکہ خلیفہ کو اپنے ساتھ اتفاق کرنے پر آمادہ کرے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ بات مسترد کی اور ان سے کہا: خدا کی قسم، اگر

۱- تفسیر القرطبی، ج۴، ص۲۵۷

۲- ابوبکر الصدیق، استاذ علی الطنطاوی، ص۱۶۲-۱۶۳

وہ مجھ سے اونٹ کا مہار بھی روکیں تو میں ان کے خلاف جہاد کروں گا۔ حضرت صدیقؓ اس رائے پر ڈٹے رہے، اگر چہ اکثر صحابہ کی رائے یہ تھی کہ ان حالات میں نرمی بہتر ہے۔ اس لیے کہ مسلمان کمزور ہیں، ارتداد عام ہے اور مرتدین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی رائے پر قائم رہے اور وہی کچھ کر ڈالا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا سینہ کھول رکھا تھا اور جو اُن کو حق نظر آ رہا تھا۔ اس میں انھوں نے نہ کمزوری دکھائی نہ اکتاہٹ کا شکار ہوئے۔[1]

اس مثال میں ہماری لیے دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی رائے پر عمل کیا اور دوسروں کی رائے چھوڑ دی، اگر چہ ان کی تعداد زیادہ تھی۔

۳- خلیفہ اپنے اعمال کے بارے میں پوری طرح ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس پر یہ بات لازم کرنا جائز نہیں کہ وہ دوسروں کی ایسی رائے نافذ کرے جس پر خود اسے اطمینان نہیں ہے۔ اس لیے کہ کسی کا ایک کام کا ذمہ دار ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے اختیار اور اپنی رائے کے مطابق انجام دیا جائے۔ یہ درست نہیں ہوگا کہ اسے لازمی طور پر دوسروں کی رائے کے مطابق انجام دے، خواہ ذمہ دار کو نہ اس پر اطمینان ہو اور نہ وہ اس سے راضی ہو۔ پھر وہی اس رائے اور اس کے نتائج کے بارے میں جوابدہ ہو۔

۴- کسی رائے کے درست یا غلط ہونے کا انحصار خود اس رائے کی ذات اور اس کی طبیعت پر ہوتا ہے نہ کہ اصحاب رائے کی کثرت وقلت پر۔

۵- بذاتِ خود 'کثرت' کسی رائے کے درست ہونے کے لیے نہ قطعی دلیل ہے اور نہ قوی دلیل۔ اسی طرح 'قلت' کسی رائے کے غلط ہونے کی نہ قطعی دلیل ہے اور نہ قوی دلیل۔ اس لیے کہ یہ عین ممکن ہے کہ کثرت والے لوگ غلطی پر ہوں۔ اس حقیقت کی طرف قرآن کریم نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے: وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ (الانعام ۶:۱۱۶) اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمھیں بھٹکا دیں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ (المائدۃ ۵:۱۰۰) اے پیغمبر، ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہر حال یکساں نہیں ہیں خواہ ناپاک کی

۱- ابوبکر الصدیق، استاذ علی الطنطاوی، ص ۱۶۲-۱۶۳

بہتات تمھیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو۔

۶- جنگی حالات میں، جو کسی قوم پر گزرنے والے حالات میں سب سے خطرناک حالات ہوتے ہیں، سارے جنگی معاملات سپہ سالار کے سپرد ہوتے ہیں۔ وہ اپنے معاونین کے مشورے سے حملے اور دفاع کے لیے جو بھی منصوبہ مناسب سمجھتا ہے، نافذ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے معاونین سے مشاورت کا پابند ضرور ہوتا ہے مگر اس پر عمل کا پابند بالکل نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی فطرت سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ سربراہ اور مشیروں کے مابین اختلاف کا بہترین حل یہ ہے کہ معاملہ سربراہ کے سپرد کیا جائے۔ وہ جیسا مناسب سمجھے فیصلہ کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگوں کی صورت میں اسی حل کو اپنایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس حالت میں قائد کی غلطی لشکر کی تباہی اور امت کی ہلاکت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس کے باوجود یہی حل اپنایا جاتا ہے، کیوں کہ یہی سربراہ اور اس کے مشیروں کے درمیان اختلاف کا سب سے بہتر اور درست حل ہے۔

اعتراضات اور ان کا جواب

۳۵۸- ہم نے جو رائے پیش کی ہے اور وہی ہمارے نزدیک راجح بلکہ صحیح ہے، اس پر بعض لوگ درج ذیل اعتراضات کرتے ہیں:

۱- پہلا اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ اُحد کے لیے مدینے سے نکلنے کے بارے میں اکثریت کی رائے قبول کی حالانکہ آپؐ کا اپنا میلان اس کے برعکس تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو اس وجہ سے قبول کیا کہ آپ کی یہی رائے بنی، نہ اس وجہ سے کہ اکثریت کی رائے پر عمل لازمی ہے۔ اور ہماری گفتگو اس میں ہے کہ کیا سربراہ مملکت پر اکثریت کی رائے قبول کرنا لازم ہے یا نہیں۔

۲- دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر سربراہ پر اپنے مشیروں یا ان کی اکثریت کی رائے قبول کرنا لازم نہیں ہے تو پھر مشاورت کا کیا فائدہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مشاورت کا فائدہ درست رائے سامنے آنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

سربراہ کے بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ وہ درست رائے کو اپنائے گا۔ مگر جب وہ ان کی بات قبول نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مشیروں کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا، نہ کہ وہ ضد اور اختلاف چاہتا ہے۔

۳- تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشاورت کا حکم دیا ہے اور اس کے ضمن میں خود بخود یہ بات موجود ہے کہ مشیروں کی بات کو قبول کیا جائے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ مشاورت الگ چیز ہے اور اس کا نفاذ الگ چیز۔ اللہ تعالیٰ نے مشاورت کا حکم دیا ہے اور اس حکم کا تقاضا فعل مشاورت کے انجام پانے سے پورا ہو جاتا ہے۔ رہا نفاذ تو وہ ایک الگ چیز ہے۔ چنانچہ اجتہادی امور میں نفاذ کا معاملہ سربراہ مملکت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اظہارِ رائے میں افراد کا حق

۳۵۹- خلیفہ کا تقرر اہل شوریٰ کی مشاورت سے عمل میں آنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے علاوہ امت کے افراد کو ریاست کے معاملات اور خلیفہ کے اقدامات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ اسے جس بات میں مصلحت نظر آ رہی ہو یا جس سے کسی خرابی کا ازالہ ہوتا ہو تو وہ اس کا اظہار کرے۔

اس حق کی بنیاد یہ ہے کہ شارع نے ہر مسلمان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مکلّف کیا ہے۔ بلکہ اس فریضے کی ادائیگی کو مومنوں کی اصلی صفت قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَّاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ ۹:۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک مشہور اور صحیح حدیث میں فرماتے ہیں: مَنْ رَّاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ. (مسلم) تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فریضے کی ادائیگی کے ساتھ یہ بات لازم ہے کہ ہر فرد معروف و منکر ...

بارے میں اظہارِ رائے کا اپنا حق استعمال کرے۔ وہی معروف جس کا وہ لوگوں کو حکم دیتا ہے اور وہی منکر جسے وہ تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ افراد کا یہ حق شوریٰ کی تکمیل کرنے والا، اس کا معاون اور اہداف میں اس کا شریک ہے۔ اس حق کے ذریعے حق کی پہچان اور غلطی سے بچنے میں خلیفہ کی مدد کی جاتی ہے۔

بعض اوقات اہل شوریٰ کی نظر سے وہ چیز اوجھل ہوتی ہے جو دوسرے افرادِ امت کو معلوم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ یا دوسرے حکام کے لیے جائز نہیں کہ وہ افراد کے اس حق کو ختم کریں۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ افراد خود اس حق سے دست بردار ہوں یا اس حق کو استعمال نہ کریں۔

یہ ایک ایسا حق ہے جو انھیں شریعت کی طرف سے حاصل ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے اپنی ذمہ داری کو ادا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے صالح حکمران آزادیِ رائے کے بارے میں افرادِ امت کی تربیت کرتے تھے اور وہ انھیں اس بات پر اُبھارتے تھے کہ وہ اپنے اندر آزادی رائے کی صفت پیدا کریں۔ جو لوگ اپنے اس حق کو استعمال نہیں کرتے تھے انھیں وہ معیوب سمجھتے تھے۔

ایک شخص نے امام عمر بن الخطابؓ سے کہا: اتَّقِ اللّٰہَ یَا عُمَرُ. اے عمر! اللہ کا خوف کرو[1]۔ حضرت عمرؓ نے اس شخص سے فرمایا: یقیناً تم لوگوں کو یہ بات کہنی چاہیے اور اگر ہم نہ سنیں تو ہمارے اندر کوئی خیر نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بحیثیت خلیفہ اپنے پہلے خطبے میں فرمایا: اگر میں درست کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں غلطی کر جاؤں تو مجھے سیدھا کرو۔[2]

آزادیِ رائے کی حدود

۳۶۰- خلیفہ کے اقدامات کے بارے میں اظہار رائے کے حوالے سے افرادِ اُمت کا جو حق بنتا ہے اس کے لیے کچھ حدود اور کچھ ضابطے مقرر ہیں۔

۱- عام حالات میں کسی حکمران کو ان الفاظ کے ساتھ مخاطب کرنا ایک بڑی گستاخی سمجھی جاتی ہے اور بات کرنے کے انداز سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے بھی ایک انسان ہونے کے ناتے یہ بات محسوس کی، لیکن بحیثیت خلیفہ انھوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ ہر دور کے حکمرانوں کے لیے ایک روشن مثال ہے۔ (مترجم)

۲- الطبقات الکبریٰ ابن سعد، ج ۳، ص ۱۸۳

۱- ان میں پہلی بات یہ ہے کہ جو شخص یہ حق استعمال کرتا ہے اس کا اصل مقصود خلیفہ کی خالص خیر خواہی ہو۔ ایک حدیث میں آیا ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ. دین سراسر خیر خواہی ہے۔

ہم نے عرض کیا: کس کے لیے؟ آپؐ نے فرمایا: لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لأَئمَّة الْمُسْلِمِيْنَ وَ عَامَّتِهِمْ. اللہ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، مسلمان حکمرانوں اور مسلم عوام کے لیے۔

چنانچہ کسی فرد کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ حکمرانوں کے اقدامات کے بارے میں اظہارِ رائے اس نیت سے کرے کہ حکمران کی غلطیوں کی تشہیر ہو، ان کی برائیوں کو بڑا بنا کر پیش کیا جائے، ان کی تنقیص کی جائے یا لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکایا جائے یا اس طرح کے دوسرے غلط مقاصد، جن میں نہ اللہ کی رضا پیشِ نظر ہوتی ہے، نہ حکمران کی بھلائی اور نہ امت کی مصلحت۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ ایک شخص جب حکمران کے کردار کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے تو وہ علم و فقہ (یعنی یقینی معلومات اور درست فہم) کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ چنانچہ جائز نہیں ہوگا کہ اجتہادی امور میں ان پر اعتراض کرے یا ان کی تنقیص کرے۔ اس لیے کہ اجتہادی امور میں ایک فرد کی رائے حکمران کی رائے سے اچھی نہیں ہوتی۔

۳- افراد کے لیے جائز نہیں کہ وہ فتنہ برپا کریں یا ان لوگوں کے خلاف لڑیں جو رائے میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ معاملہ ایسا ہو جس میں اس کی رائے کا احتمال بھی موجود ہو اور اس کے مخالف کی رائے کا بھی۔

عصرِ حاضر میں شوریٰ کی تنظیم

۳۶۱- ہم نے پچھلے صفحات میں شوریٰ سے متعلق سنت نبوی کے بعض واقعات نقل کیے ہیں، جو بحیثیت مجموعی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ شریعت اسلامی نے شوریٰ کی قدر کو عمل میں لانے کے لیے کسی خاص کیفیت کی صراحت نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے شوریٰ کی تنظیم کا کام اُمت پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنے احوال وظروف کے مطابق امت کی رائے معلوم کر کے شوریٰ کے مقصود کو حاصل کرے گی۔ یہ چیز دراصل شریعت اسلامی کے محاسن میں سے ہے اور اس سے مستقبل کے بارے میں احتیاط کا طرزِ عمل پروان چڑھتا ہے۔ اس بنا پر ہمارے سامنے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہمارے دور کے لیے مناسب یہ ہے کہ امت مسلمہ اپنے لیے اہل شوریٰ کا انتخاب کرے۔

اہل شوریٰ وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے سربراہ مملکت مختلف امور میں مشورہ کرتا ہے اور یہی لوگ اہل الحل والعقد کہلاتے ہیں۔ سربراہ مملکت کو یہ بھی حق ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے علاوہ ہر موضوع کے خصوصی ماہرین سے اپنے موضوع کے مطابق مشاورت کرے۔ اسی طرح اسے یہ بھی حق ہے کہ زیادہ اہم مسائل میں پوری امت سے استصواب رائے کرے۔

سربراہ ان تمام مسائل اور شوریٰ کے موضوع سے متعلق دیگر مسائل کے بارے میں شریعت کے قواعد وضوابط اور اس کے نظام حکومت کی روشنی میں ایک مفصل نظام وضع کرے گا۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ شہریوں کو حکومتی معاملات کے بارے میں اظہارِ رائے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ مگر وہ یہ کام شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے انجام دیں گے۔ چنانچہ اظہار رائے کے نام پر پروپیگنڈا، اعتراض برائے اعتراض، گالم گلوچ، فحش کلامی، الزام تراشی اور دھوکہ دہی جائز نہیں ہوگی۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اظہارِ رائے کے نام پر فساد برپا کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ درست انتخاب اور ہر قسم کے دجل وفریب اور کھوٹ سے پاک جائز ومباح رائے کی حدود متعین کرنے کے لیے صرف نظام وضع کرنا کافی نہیں ہے۔ اس بارے میں نظام وضع کرنے کے ساتھ ساتھ جو چیز بہت زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور اخلاق کو عام کیا جائے اور عقیدے، خدا خوفی اور کھلے چھپے ہر حالت میں اللہ سے تقویٰ کی بنیاد پر افراد کی تربیت کی جائے۔ اس کی بنا پر انسان حدودِ شریعت کے پاس پہنچ کر رک جاتا ہے اور وہ برضا ورغبت اپنی ذمہ داری ادا کرتا ہے، خواہ یہ ذمہ داری ارکان مجلس شوریٰ کے انتخاب میں ہو، یا ارکان شوریٰ کی اپنی رائے کے اظہار میں، یا عام لوگوں کی طرف سے مصلحت پر مبنی اپنی رائے کے اظہار میں ہو۔

۳- اسلام کے اقتدار کے آگے جھکنا

۳۶۲- گذشتہ بحث میں ہم نے کہا ہے کہ امت احکامِ شریعت کی مخاطب اور ان کے نفاذ کی مکلّف ہے۔ جیسے سزائیں، جہاد اور لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا وغیرہ۔ یہ وہ احکام ہیں جو اسلام میں فرض کا درجہ رکھتے ہیں۔ امت مسلمہ شریعت اسلامی کی طرف سے احکام کے نفاذ اور لوگوں کو اُن کے لیے آمادہ کرنے کا اختیار و اقتدار رکھتی ہے۔ اس اختیار کو اجتماعی طور پر ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے نمایندگی کا قاعدہ سامنے آیا۔ یعنی اُمت اپنے میں سے ایک شخص کو اپنا نمایندہ بنالیتی ہے جو اُمت کا نائب بن کر اس کی ذمہ داری کو ادا کرتا ہے۔ یہ نائب خلیفہ ہوتا ہے۔

امت کا محدود اقتدار

۳۶۳- امت کا اقتدار مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔ اس کی قید وہ غرض ہے جس کے لیے شریعت کی طرف سے اُمت کو یہ اقتدار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کا اقتدار، اللہ تعالیٰ کے مطلق اقتدار کے ساتھ مقید ہے، جو حقیقی اور مطلق حاکمیت کا مالک ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط (یوسف ۱۲: ۴۰) فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔

اسی طرح اُمت کا اقتدار اللہ تعالیٰ کے شرعی ارادے کے ساتھ مقید ہے جو اس کی شریعت کی صورت میں موجود ہے۔ اس کی شریعت میں سے ایک چیز اسلامی نظامِ حکومت ہے۔ اس بنا پر اُمت کا اقتدار دراصل اللہ کی شریعت کو نافذ کرنا ہے، جس کا ایک حصہ نظامِ حکومت ہے۔ امت کا اقتدار یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی نظام وضع کرے۔

خلیفہ کا محدود اقتدار

۳۶۴- جب امت کا اقتدار اسلام کے اقتدار یعنی اس کے قوانین و احکام اور اس کے نظام سے مقید ہے تو خلیفہ، جو امت کا نائب ہے، کا سیاسی اقتدار بھی اسلام کے اقتدار کے ساتھ مقید ہے۔ کیوں کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ وکیل اپنے موکل سے زیادہ اختیارات اور حقوق کا مالک ہو۔ خلیفہ کا اقتدار شریعت کے نفاذ کا

اقتدار ہے۔ اس کا یہ اختیار نہیں ہے کہ نیا قانون وضع کرے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو اپنے پہلے خطاب میں انھوں نے کہا: میں متبع ہوں مبتدع نہیں۔

امت وخلیفہ کے محدود اقتدار کے نتائج

۳۶۵- امت اور خلیفہ کے اقتدار کو اسلام کے اقتدار سے مقید کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اور کبھی بھی اسلام کے اقتدار سے سرتابی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ان میں سے کسی ایک کے لیے یا ان دونوں کے لیے، خواہ ان کی باہمی رضامندی ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو، یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ کی شریعت کو تبدیل کریں یا اس کی جگہ کسی اور قانون کی پیروی کریں۔ کیوں کہ باطل پر متفق ہونا، نہ تو باطل کو حق بنا سکتا ہے اور نہ اتفاق کرنے والوں کو اپنے باطل عمل کے لیے شرعی جواز فراہم کرسکتا ہے۔ البتہ خلیفہ کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ اللہ کی شریعت کے نفاذ کے لیے ضروری حکمت عملی وضع کرے، یا شریعت اسلامی کے عمومی قواعد کی روشنی میں ریاست کے امور کو چلانے کے لیے مختلف نظاموں کی شکل وصورت طے کرے۔

یہ اس صورت میں ہوگا جب ان امور کے بارے میں کوئی نص یا نصوص موجود نہ ہوں۔ یہ وہ دائرہ ہے جس کے اندر خلیفہ کے لیے جائز ہوتا ہے کہ اس قسم کے نظام وضع کرے، تاکہ اللہ کی شریعت کا نفاذ اور ریاستی امور کو چلانا آسان ہوسکے۔ یہ چیز انھی امور میں داخل ہے جنھیں فقہا اجتہادی امور کہتے ہیں اور ان میں بحث ونظر کی گنجایش ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے اجتہاد اور اس کے قواعد وضوابط کی روشنی میں جزوی احکام کا استنباط کیا جاتا ہے۔

ان اجتہادی احکام کا نفاذ بھی ضروری ہوتا ہے اور جب خلیفہ نے یہ احکام طے کرکے انھیں نافذ کیا تو اُمت کے لیے ان کی پیروی بھی۔ اہل الحل والعقد سمیت کسی کے لیے جائز نہیں ہوتا کہ ان احکام کی نافرمانی یا خلاف ورزی کریں۔ ان کی طرف سے نافرمانی کے جواز میں یہ بات قابل قبول نہیں ہوگی کہ یہ احکام ان کی اجتہادی رائے کے خلاف ہیں۔ اس لیے کہ، جیسا کہ فقہا کہتے ہیں، اجتہاد اس جیسے دوسرے اجتہاد سے ٹوٹ نہیں جاتا۔ البتہ خلیفہ کو اس بات کی بہت زیادہ ترغیب دی گئی ہے، بلکہ کبھی کبھی تو اس پر واجب کیا جاتا ہے کہ وہ اجتہادی امور کے بارے میں قانون سازی کرتے ہوئے اہل شوریٰ سے مشاورت کرے، جیسا کہ امام عمر ابن الخطابؓ کیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں اس امام راشد | حضرت عمرؓ | نے جو کچھ کیا اس کی ایک مثال عراق کے ارض سواد کے بارے میں مشاورت ہے، کہ کیا اسے فاتحین میں تقسیم کیا جائے یا اسے اپنے مالکوں کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے اور ان پر ٹیکس لگا دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ خلیفہ ان مسائل میں اہل شوریٰ سے مشورہ کرتا ہے تو وہ کبھی متفقہ رائے دیں گے اور کبھی اس میں اختلاف ہوگا۔ جب اختلاف ہو جائے تو معاملہ خلیفہ پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنی صوابدید پر ان میں سے کوئی رائے اپنا لے۔ مگر امید کی جاسکتی ہے کہ اس طرح کی پرسکون اور بامقصد بحث وتمحیص میں درست رائے سامنے آ جائے گی اور اس تک رسائی آسان ہو جائے گی۔

جب درست رائے سامنے آتی ہے تو اس بات کا قوی ترین امکان ہوتا ہے کہ خلیفہ اس کو قبول کرے گا۔ کیوں کہ درست رائے کی مخالفت کرنے میں اس کا کوئی مفاد نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا تقرر شریعت کے احکام نافذ کرنے اور امت کے مفادات حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اگر فرض کرلیں کہ وہ دوسروں کی درست آرا سے مطمئن نہیں ہوا اور غلط رائے اپنائی تو یہ صورت نادر ہے۔ غالب وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا اور اعتبار غالب کا ہوتا ہے نہ کہ نادر کا۔

نفاذِ شریعت میں اصولیت پسندی اور مساوات

۳۶۶- جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ خلیفہ اور امت، اسلام کے اقتدار کے آگے 'تسلیم' ہیں: جو شریعت الٰہی کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، تو اَب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس تسلیم ورضا سے وہ شریعت الٰہی کے نفاذ میں اصولیت پسندی، اس کے بارے میں فکر مندی اور سرعت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر عملی طور پر انسان مخالفت کر رہا ہو تو تسلیم کے زبانی دعوے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اقتدار کے نفاذ میں اس اصولیت پسندی اور حرص کے ساتھ ساتھ شہریوں پر اسلامی قانون کے نفاذ میں مساوات بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ خلیفہ ان میں سے کسی کے حوالے سے قانون کو معطل نہیں کرسکتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ دینی طور پر قیامت کے دن اللہ کے سامنے اور دنیا میں اس قوم کے سامنے جواب دہ ہوگا جس نے اسے خلیفہ مقرر کیا ہے۔

اسی طرح پوری امت بھی کسی فرد کے حق میں قانون کو معطل نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس ناجائز کام کے بارے میں غلط سفارش کے ذریعے خلیفہ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے۔ ان تعلیمات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مخزوم کی ایک عورت کے مسئلے میں قطعی اور صریح طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس عورت نے چوری کی تھی اور لوگ اس کے معاملے میں پریشان ہو رہے تھے۔ انھوں نے حضرت اسامہؓ سے کہا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے حق میں سفارش کریں۔ اس طرح شاید کہ حد سرقہ سے بچ جائے یا اس کے لیے کوئی راستہ نکل آئے۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور اس کے بارے میں ایک خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

إنّما أهلك الّذين منْ قَبلِكُمْ أنّهُمْ كَانُوا إذا سَرق فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ وإذا سَرقَ فيْهِمُ الضّعِيْفُ أقامُوا عليْهِ الْحدَّ، وَأيْمُ اللهِ لَوْ أنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحمَّدٍ سَرقَتْ لَقَطَعْتُ يدها. تم سے پہلے جو لوگ ہلاکت سے دوچار ہوئے اس کی وجہ یہی تھی کہ جب ان میں کوئی شریف آدمی چوری کر لیتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب ان میں سے کوئی کمزور شخص چوری کر لیتا تو اس پر حد جاری کر دیتے تھے۔ خدا کی قسم، اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کر لیتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

اسلامی ریاست ایک دستوری ریاست

۳۶۷- جب ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ خلیفہ اور اُمت دونوں اسلام کے اقتدار کے تابع ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلامی ریاست کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک 'دستوری ریاست' یا 'دستور والی ریاست' ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے سارے معاملات اور ہر قسم کے کردار میں بالکل اسی طرح قانون کے تابع ہوتی ہے جیسا کہ اس کے افراد اپنی تمام کارگزاریوں اور تعلقات میں قانون کے تابع ہوتے ہیں۔

اس مقام پر اسلامی ریاست کے قانون سے ہماری مراد اسلامی قانون ہے جو قرآن وسنت کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے یا ان دونوں مصادر کی روشنی میں درست استنباط واجتہاد کے نتیجے میں سامنے آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف ۷:۳) جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (النساء۴:۵۹) اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اصحاب امر ہوں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی نظام حکومت کسی غلط بنیاد پر قائم نہیں ہوتی جس کی وجہ سے حکومت انسانیت کی خدمت کے علاوہ دوسری آلائشوں سے پاک نہ رہ سکے۔ جیسے خواہشات نفس، خودسری، استکبار فی الارض، فتنہ جوئی، دوسروں پر تسلط، ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا اور انھیں اپنی خواہش کے تابع بنانا۔ یہ اور اس طرح کے دیگر غلط امور جو انسان کے وضع کردہ نظام ہائے حکومت کا لازمی خاصہ ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت اسلامی قانون کے تابع ہے اور وہ ان عیوب سے بالکل پاک ہے۔ اسلامی قانون کے تابع ہونے کا ایک مظہر یہ ہے کہ امت مسلمہ اپنے لیے خلیفہ اور اہل شوریٰ کا انتخاب ان شرعی اور قانونی معیارات کے مطابق کرتی ہے جن سے انسانی خواہشات کوسوں دور ہیں۔

پھر جو لوگ مجلس شوریٰ کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں وہ اپنا براہِ راست حق رائے دہی اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے خوف اور اس کی نگرانی کا احساس جاگزیں ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ وہی بات کہتے ہیں جس کے حق اور سچ ہونے کے بارے میں ان کو پورا یقین ہو۔ وہ امت کی خیر خواہی اور خلیفہ کی نصیحت کا کوئی لمحہ ضایع نہیں کرتے۔ اور اس کے پیچھے ان کا مقصود رضائے الٰہی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

اُمت کے افراد جب خلیفہ کے کردار پر کوئی تنقید کرتے ہیں یا اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو انھیں احساس ہوتا ہے کہ ہم پر اللہ کی شریعت کی پیروی لازم ہے۔ اور اللہ کی شریعت انھیں حکم دیتی ہے کہ بات کہنے میں عدل وصدق سے کام لیں اور تنقید واعتراض میں ان کے پیش نظر خیر خواہی کے سوا کچھ نہ ہو۔

خلیفہ بھی اپنی ریاستی ذمہ داریوں اور حکومت واقتدار کے استعمال میں اللہ کی شریعت سے رہنمائی

حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا لینا دینا اور کوئی اقدام کرنا یا اس سے پیچھے ہٹنا کسی نہ کسی شرعی دلیل کی بنا پر ہوتا ہے۔ وہ اسلامی قانون کو پورے عدل، مساوات اور اصولیت پسندی کے ساتھ نافذ کرتا ہے۔ کوئی دوستی یا رشتہ داری یا کوئی بھی ایسی چیز اُسے قانون کے نفاذ سے نہیں روک سکتی جو قانون کی رو سے تسلیم شدہ نہ ہو۔ اس لیے کہ جیسا ہم نے پہلے کہا ہے کہ اسلامی قانون کو تسلیم کرنے کا لازمی تقاضا ہے کہ اسے نافذ کیا جائے۔ اس کے نفاذ کو کسی موہوم شفقت و رحمت کی بنا پر معطل نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقی رحمت و شفقت تو اسلامی قانون کے نفاذ میں ہے نہ کہ اسے معطل کرنے میں۔ انسانی نفسیات کے اس کمزور پہلو کی طرف اللہ تعالیٰ نے ہماری توجہ دلائی ہے، جس کے ذریعے شیطان حکمرانوں کو حدود اللہ کے نفاذ سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِىْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ (النور۲۴:۲) زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو۔

جب اسلامی ریاست ایک قانونی ریاست ہے اور اس کا قانون اللہ کی شریعت یعنی اسلام ہے تو اس ریاست میں جو بھی اختلاف پیدا ہوگا اس کے لیے رجوع اسی شریعت کی طرف کیا جائے گا، نہ کہ کسی اور قانون کی طرف۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (النساء۴:۵۹) پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اس ریاست میں حق پر وہی ہوگا جس کے پاس شریعت کی کوئی دلیل موجود ہو۔ پھر ریاست بھی اسی کی پشت پر ہوگی خواہ وہ بذاتِ خود کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ اور باطل پر وہ ہوگا جس کے پاس شریعت کی کوئی دلیل نہ ہو، اور ریاست بھی اس کے خلاف ہوگی خواہ وہ بذاتِ خود طاقت ور ہی ہو۔

۳۶۸- جب یہ بات معلوم ہوئی کہ اسلامی ریاست ایک قانونی ریاست ہوتی ہے اور وہ اسلام کے اقتدار کے تابع ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس میں حقیقی حکومت اور حقیقی اقتدار شارع اسلام کو حاصل ہے اور وہ اللہ جل جلالہٗ ہے۔ اس نے بالکل سچ فرمایا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف۱۲:۴۰) فرماں

روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔

۴- اسلام میں حکومت کے مقاصد

حکومت مقصد نہیں، ذریعہ

۳۶۹- اسلام میں حکومت مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ کچھ متعین مقاصد تک رسائی کے لیے ایک فعال ذریعہ۔ حکومت کے ذریعے حکمران کو وہ اقتدار حاصل ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ ایسے احکام نافذ کرتا ہے جس کے نفاذ سے عام لوگ عاجز ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعے راستہ مختصر ہو جاتا ہے، اہداف تک پہنچنا ممکن ہو جاتا ہے اور مقاصد کا حصول ممکن بنتا ہے۔ اس مقام پر مقاصد سے ہماری مراد 'اسلام' کے بعض مقاصد ہیں۔

حکومت کے مقاصد

۳۷۰- اب سوال یہ ہے کہ حکومت کے مقاصد کیا ہیں؟ تو فقہائے کرام جب امامت یعنی خلافت کی تعریف کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: امامت کا مقصد دین کی پہرہ داری اور دنیا کی سیاست کے بارے میں نبی کی نیابت کا فریضہ انجام دینا ہے۔[1]

اس تعریف میں خلافت کے کاموں یعنی حکومت کے مقاصد کی تاکید کی گئی ہے۔ اس کو اجمالاً دو نکتوں کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک دین کی پہرہ داری اور دوسرا دنیا کی قیادت۔

ان دونوں مقاصد کے بارے میں الگ الگ گفتگو ضروری ہے، اور ان کے ذیل میں جو فروعی مقاصد ہیں ان کا بیان بھی۔

پہلا مقصد: دین کی پہرہ داری

۳۷۱- یہاں دین سے مراد ظاہر ہے کہ اسلام ہی ہے۔ کیوں کہ یہی وہ دین ہے جس کی پہرہ داری

۱- الاحکام السلطانیة للماوردیؒ ص ۳۔ علامہ ابن خلدونؒ نے بھی اپنے مقدمہ میں یہی تعریف بیان کی ہے۔

حکومت سے مطلوب ہے۔ اس کی پہرہ داری کے دو مطلب ہیں۔ ایک اس کی 'حفاظت' اور دوسرا 'تنفیذ'۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مقام پر حفاظت اور تنفیذ سے کیا مراد ہے۔

۱- دین کی حفاظت

۳۷۲- اسلام کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ اس کے حقائق اور تعلیمات کو باقی رکھا جائے اور لوگوں میں اس کی نشر و اشاعت کی جائے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تبلیغ کی، آپ کے صحابہؓ اس کے مطابق چلتے رہے اور پھر اسے دوسرے لوگوں تک منتقل کیا۔ اس وجہ سے ان حقائق اور تعلیمات میں کسی قسم کی تغییر و تبدیل جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان میں تغییر و تبدیل اس بدعت میں داخل ہیں جو اللہ کے دین میں ممنوع ہے۔

اس تغییر و تبدیل کی ممانعت میں اس عذر کے سات ہچکچاہٹ کبھی بھی جائز نہیں ہوسکتی کہ رائے کا اظہار اور فکر و اجتہاد کی آزادی افراد کا حق ہے۔ اس لیے کہ فرد اگر مسلمان ہے تو اس کا یہ حق نہیں کہ وہ اللہ کے دین میں تبدیلی کرے۔ اگر اس نے اپنے لیے گمراہی چن لی ہے اور اس کے عقیدے میں فساد آ گیا ہے تو اس کا یہ حق ہرگز نہیں کہ وہ دوسروں کو بھی گمراہ کرے اور ان کے عقائد میں فساد پیدا کرے۔ اگر وہ غیر مسلم ہے تو اس کا بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ دارالاسلام کے نظام کے خلاف بغاوت کرے اور اسلامی حقائق کو گڈمڈ کر ڈالے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ دارالاسلام کے ساتھ اپنے معاہدے کو توڑنے والا ہوگا۔

اس کے علاوہ کبھی ایک مسلمان کسی غلط فہمی یا کسی کے گمراہ کرنے سے کج نظری، شکوک و شبہات اور غلطیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس صورت میں حکمران، یعنی خلیفہ یا اس کے معاونین پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اس کے شبہات دور کرنے کا انتظام کریں، اس کے سامنے دلیل و برہان کے ذریعے درست نقطہ نظر کی وضاحت کریں تا کہ حق ظاہر ہو جائے اور اس پر حجت تمام ہو جائے۔

اگر وہ اپنے باطل نقطہ نظر پر اصرار کرتا ہے اور لوگوں میں اس کی اشاعت کی کوشش کرتا ہے تو اسے اس کام سے روکا جائے گا اور اس کے خلاف وہ اقدام کیا جائے گا جو شریعت میں اس کے خلاف کرنا چاہیے۔

فقہائے کرام نے اس نقطہ نظر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام کی ذمہ داریوں میں یہ بات

شامل ہے کہ ''ان اصولوں کے مطابق دین کی حفاظت کرے جس پر امت کے سلف کا اجماع ہے۔ اگر ایک شبہات کا شکار شخص ان سے ہٹ جاتا ہے تو حکمران اس کے سامنے دلیل بیان کرے گا اور درست بات کی وضاحت کرے گا اور ان حدود میں اس کا مواخذہ کرے گا جن کا وہ مستحق ہو گیا ہے، تاکہ دین کو خلل سے اور امت کو گمراہی سے بچایا جا سکے''۔[1]

۳۷۳- حفاظت دین کے لوازم میں سے ایک یہ ہے کہ دراڑوں کو بند کرنے کے لیے اس کی مناسب تیاری اور قوت دافعہ کے ساتھ بندوبست کرے۔ تاکہ دشمنوں کا ظہور نہ ہو جو محرمات کی حرمت کو پامال کرتے ہیں اور مسلمانوں یا اہل ذمہ کا خون بہاتے ہیں۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ دارالاسلام سے دشمنوں کو دور رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ دین محفوظ اور باقی رہے۔ کفار کا دارالاسلام پر قبضہ اسلام کے ضیاع اور اس کے حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے ایک عظیم فتنہ اور ان کے عقائد کی بنیاد متزلزل کرنا ہے۔ اس لیے کہ کافروں کی حکومت آ جائے گی اور وہ مسلمانوں کو اپنے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے ہر حربہ آزمائیں گے، خواہ سبز باغ دکھانے کی صورت میں ہو، حقائق کو گڈمڈ کرنے کی صورت میں، یا دھوکہ دہی اور گمراہ کن چالوں کی صورت میں۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دین کی حفاظت کے لوازم اور اس کے متممات میں یہ بات شامل ہے کہ اسے کفر کے تمام نظاموں پر غالب وظاہر کیا جائے، یہاں تک کہ باطل کی کوئی حکومت قائم نہ رہے اور اس کا کوئی پرچم سربلند نہ ہو۔

یہی وہ بات ہے جس کی طرف علامہ ماوردیؒ نے امام کے فرائض بیان کرتے ہوئے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ ''چھٹی بات یہ ہے کہ جو لوگ اسلام سے دشمنی کرتے ہیں خلیفہ ان کے خلاف جہاد کرے گا، مگر دعوت کے بعد، یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرے یا ذمی بن جائے، یہی طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ اللہ کے دین کے سارے ادیان پر غلبہ واظہار کے بارے میں اللہ کا حق ادا کر سکتا ہے۔''[3]

۲- دین کا نفاذ

۳۷۴- دین اسلام کا نفاذ، جو اس کی پہرہ داری کا دوسرا مظہر ہے، کئی امور کی صورت میں موجود و متحقق

۱- أبویعلیٰ الحنبلی ص۱۱

۲- الأحکام السلطانیة للماوردی ص۱۴

۳- الماوردی ص۱۴۔ ہم نظام جہاد پر بات کرتے ہوئے اس نکتے کی مزید وضاحت کریں گے۔ (مولف)

ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک امر یہ ہے کہ دین کے احکام کو عملی جامہ پہنایا جائے، لوگوں کے باہمی معاملات میں، عوام کے اپنی ریاست کے ساتھ تعلقات میں اور اسلامی ریاست کے دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات میں بھی۔ دوسرا امر یہ ہے کہ لوگوں کو حدود اللہ کے پاس پہنچ کر رک جانے اور اس کے احکام کی اطاعت کرنے پر آمادہ کیا جائے، انھیں اس کی ترغیب دی جائے اور اگر کوئی ان احکام کے ماننے سے انکار کرے تو انھیں شرعی سزا دے۔ تیسرا امر یہ ہے کہ معاشرے سے خرابیوں اور منکرات کا ازالہ کیا جائے، جیسا کہ اسلام انھیں ختم کرنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ خرابیوں کا ازالہ کیے بغیر اور قدرت کے باوجود ان کا انکار کیے بغیر دین کی حفاظت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی حکومت کے مقاصد میں سے اُس مقصد کی طرف قرآن کریم نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج ۲۲:۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

دوسرا مقصد: دین کے ذریعے دنیا کی سیاست

دنیوی امور دین کے محکوم ہیں

۳۷۵- اس دوسرے مقصد سے مراد یہ ہے کہ دنیوی امور بھی دین کے دائرے میں داخل اور اسی کے محکوم ہیں، نہ کہ اس سے خارج۔ اس سلسلے میں بات کا خلاصہ یہ ہے کہ ریاست اور رعایا کے معاملات کو دین کی روشنی میں اس طرح چلایا جائے جو امت کی مصلحت اور مفاد میں ہو اور اس کے ذریعے خرابیوں کو دور کیا جاسکے۔ یہ تب ممکن ہوتا ہے جب زندگی کے مختلف شعبوں کو شریعت کے ان قواعد واصول کے مطابق چلایا جائے جن کی قرآن وسنت میں صراحت کی گئی ہے یا جو درست اجتہاد کے ذریعے فقہا نے مستنبط کیے ہیں۔ یہی وہ شرعی سیاست ہے جو دین کی روشنی میں دنیا کا نظام چلاتی ہے۔ اس سیاست کے مختلف پہلو، جن کے ذریعے اسلامی حکومت اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر قادر ہوتی ہے، اور مسلم حکمران جن کی پابندی کرتا ہے، جن کی طرف فقہا نے بھی اپنی کتابوں میں اشارے کیے ہیں، درج ذیل ہیں۔

۱- عدل کا قیام

۳۷۶- دین کے ذریعے دنیا کی سیاست کا پہلا مظہر یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات چلانے میں عدل کی مکمل پابندی کی جائے اور اس سے سرِ موانحراف نہ کیا جائے۔ کیوں کہ یہی وہ اساس ہے جس کے بغیر کوئی ریاست قائم نہیں رہ سکتی اور اگر یہ مفقود ہو تو کوئی قوم باقی نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حکمران کی بیعت کی جاتی تھی تو اس میں یہ الفاظ بھی شامل ہوتے تھے: ہم آپ سے اس بات پر رضامندی کی بیعت کرتے ہیں کہ آپ عدل وانصاف قائم کریں گے اور امامت کے فرائض انجام دیں گے۔[1]

عدل کے ضمن میں یہ بات موجود بھی ہے کہ ہر انسان کو اس کا پورا پورا حق دیا جائے اور اس پر کسی معاملے میں ظلم نہ کیا جائے۔ ظلم یہ بھی ہے کہ کسی کو ایسے امور کا پابند بنایا جائے جو شرعاً اس پر لازم نہیں ہیں، یا اس کا مال ناحق طور پر لیا جائے، یا اسے اس کے حق سے محروم کیا جائے۔

اس بات کی طرف بھی فقہا نے اشارہ کیا ہے۔ علامہ ماوردیؒ امام کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس کا ایک کام یہ ہے کہ شریعت کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق مالِ فے اور صدقات وصول کرے، خواہ نصوص میں متعین کردہ ہوں یا جن کا تعین اجتہاد کے ذریعے کیا گیا ہو۔ وہ اس میں کوئی جانب داری اختیار نہ کرے۔ اسی طرح وہ بیت المال سے استحقاق کے مطابق عطا کرنے کا درست اندازہ لگائے اور اس میں نہ اسراف وتبذیر کرے اور نہ کوتاہی کرے۔ پھر عطا ایسے وقت میں کرے کہ نہ اس میں تقدیم ہو اور نہ تاخیر۔[2]

علامہ ابن خلدون ممانعت ظلم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ مال یا کسی اور چیز کا بلاعوض وبلاسبب مالک کے ہاتھ سے لینا ہی ظلم ہے، جیسا کہ مشہور ہے۔ بلکہ ظلم اس سے عام ہے۔ جو شخص بھی کسی کی چیز لے، اس کے کسی کام پر غاصبانہ قبضہ کرے یا ناحق طور پر اس کا دعویٰ کرے یا اس پر کوئی ایسا حق لازم کرے جو قانون نے اس پر لازم نہ کیا ہو تو اس نے اس پر ظلم کیا۔ اس طرح جو لوگ ناحق طور پر دوسروں کے مال چھینتے ہیں وہ بھی ظالم ہیں،

۱- ابو یعلیٰ، ص ۹

۲- الماوردی، ص ۱۲

اس کو لوٹنے والے بھی ظالم ہیں، لوگوں پر زیادتی کرنے والے بھی ظالم ہیں اور دوسروں کے حقوق ان کو نہ دینے والے بھی ظالم ہیں۔ ان سب کا وبال حکومت کی طرف لوٹتا ہے۔ کیوں کہ اس سے آبادی کو نقصان پہنچتا ہے جو کہ حکومت کا اصل مادہ ہوتا ہے۔[1]

اس بنا پر خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ عدل قائم کرنے اور ظلم کا سد باب کرنے کے لیے کام کرے۔ اس سلسلے میں اس کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ اہل اور با اعتماد ملازمین کا انتخاب کرے اور دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ ان کی نگرانی کرے۔

۳۷۷- اہل ملازمین کا چناؤ ایک بہت ضروری امر ہے۔ خلیفہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ لوگوں کے سارے معاملات براہِ راست خود چلائے۔ یہ اس کی طاقت سے باہر ہے، اگر وہ چاہے بھی تو یہ اس کے لیے محال ہے۔ لہٰذا وہ مجبور ہے کہ لوگوں کے معاملات اپنے ان نمایندوں یعنی ملازمین کے ذریعے انجام دے گا جنھیں اس نے چن لیا ہے۔ چنانچہ اسے چاہیے کہ اہل اور با اعتماد افراد کا چناؤ کرے۔

اہلیت سے مراد یہ ہے کہ آدمی جس کام کا ذمہ دار بنایا جائے اسے وہ انجام دے سکے۔ اور با اعتماد ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے۔ قرآن کریم نے لوگوں کو کسی کام کا ذمہ دار بنانے کے قانون کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا خیال رکھنا ہر حکمران اور ذمہ دار پر لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ (القصص ۲۸:۲۶) بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں، وہی ہوسکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔

اگر خلیفہ کو اہل اور با اعتماد ملازمین کے چناؤ کی توفیق مل گئی جو عدل کے ساتھ فیصلہ کرتے ہوں، لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوں اور انھیں ظلم سے بچاتے ہوں، جن کی وجہ سے لوگ امن وامان اور اطمینان محسوس کرتے ہوں، جن کے ڈر سے لالچی اور باغی لوگ سکڑ جائیں اور کوئی طاقت ور کسی کمزور پر زیادتی نہ کرسکے، اس لیے کہ ریاست اس سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے، کوئی برسرِ حق کمزور شخص اس بات کا خوف محسوس نہ کرے کہ طاقتور اس پر ظلم کر سکے گا کیوں کہ ریاست برسرِ حق شخص کا ساتھ دیتی ہے، خواہ وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔

۱- مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۲۳

یہ سارے امور لوگوں کے دل جیتنے، انھیں ریاست کے ساتھ جوڑنے اور حکمران کے ساتھ ان کے تعلق خاطر کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لیے وہ یہی چاہیں گے کہ یہ حکومت قائم و دائم رہے اور وہ ہر وقت حکومت کی حفاظت پر کمربستہ رہیں گے۔ اس لیے کہ یہ ریاست ان کے لیے اپنے گھر اور اپنے حقوق کے نگہبان کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن اگر خلیفہ بے کار، فسادی اور خیانت کار ملازمین کا چناؤ کرے گا تو لوگ ان کے فساد اور کی خیانت کی آگ میں جلتے رہیں گے اور ان کے ظلم و زیادتی میں زندگی گزاریں گے۔ اس بنا پر لوگوں کا اپنی ریاست کے ساتھ تعلق کمزور ہو جائے گا اور انھیں اس کا دفاع کرنے کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔ چنانچہ جیسا کہ ابن خلدون نے کہا ہے: ان سب کا وبال حکومت کی طرف لوٹتا ہے۔

خلیفہ کی طرف سے لوگوں کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسے ظالم و فاسد عہدیداروں کے 'کارناموں' سے معذور سمجھا جائے۔ اس لیے کہ لوگ عہدیداروں کے اقدامات کا ذمہ دار حکمران کو قرار دیتے ہیں، کیوں کہ وہی ان کا تقرر کرتا ہے۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل اور قابل اعتماد عہدیداروں کے چناؤ کا پورا پورا اہتمام ہونا چاہیے۔ اگر یہ نہ ہو تو وہ خرابیاں پیدا ہو جائیں گی جن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ پھر ان خرابیوں کو صرف یہی بات نہیں روک سکتی کہ خلیفہ بذات خود نیک ہے۔

فقہا نے عہدیداروں کے تقرر میں خلیفہ کی ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فقیہ ماوردیؒ امام کے فرائض بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نویں بات یہ ہے کہ با اعتماد لوگوں کو ذمہ داری کا اہل سمجھے اور لوگوں کے مال خیر خواہ لوگوں کے سپرد کرے، تاکہ اعمال، اہل لوگوں کے ہاتھوں درست انجام پائیں اور اموال با اعتماد لوگوں کے ہاتھ محفوظ رہیں۔[1]

۳۷۸- پھر یہ کافی نہیں ہے کہ خلیفہ اہل اور با اعتماد لوگوں کا تقرر کرے، بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان کے کام میں ان کی نگرانی کرے۔ اس لیے کہ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک با اعتماد آدمی خیانت کرے اور ایک نیک آدمی بھی دھوکہ دہی میں مبتلا ہو جائے، جیسا کہ فقہا کہتے ہیں۔ اگر ہم یہی فرض کریں کہ

۱- الماوردی، ص ۱۴

ان سے خیانت اور دھوکہ صادر نہیں ہو سکتا، تب بھی یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ غلطی سے ایسا کر جائیں۔ مظلوم کے حق میں تو غلطی سے ہونے والا ظلم اور جان بوجھ کر ظلم ایک برابر ہیں۔ اس کی بنا پر مظلوم یکساں طور پر ظالم کے ساتھ نفرت کرتا ہے۔

اس لیے عہدیداروں کی مسلسل نگرانی اور دائمی محاسبے کی ضرورت ہے، تاکہ کوئی خیانت اور بددیانتی نہ ہو سکے۔ اس طرح غلطی کا امکان بھی کم ہوتا ہے اور لوگ بھی جان لیتے ہیں کہ خلیفہ عدل چاہتا ہے اور ظلم کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ خلافت اور حکومت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جاتا ہے۔

فقہائے کرامؒ نے اس مفہوم کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ فقیہ ابویعلیٰ کہتے ہیں:

چاہیے کہ خلیفہ سارے امور کی خود نگرانی کرے اور حالات کا جائزہ لیتا رہے، تاکہ وہ امت کی قیادت اور ملت کی حفاظت کا فریضہ ادا کر سکے۔ وہ مزے لینے یا عبادات میں مشغول ہونے کے لیے نگرانی کا کام دوسروں کے سپرد نہ کرے۔ اس لیے کہ بعض اوقات ایک امانت دار شخص خیانت کر لیتا ہے اور ایک نیکوکار آدمی بددیانتی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (صٓ ۳۸:۲۶) اے داوٗد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر۔[۱]

یہاں اللہ تعالیٰ نے براہ راست نگرانی کو چھوڑ کر صرف تفویض پر اکتفا نہیں کیا۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ. تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک اپنی نگرانی کے بارے میں جواب دِہ ہے۔

۲- امن واطمینان کو عام کرنا

۳۷۹- خلیفہ اور تمام مسلمان حکام کے اہم ترین فرائض میں ایک یہ بھی ہے کہ دارالاسلام میں امن وامان اور سکون واطمینان کو عام کریں تاکہ لوگوں کو اپنی جان، مال اور عزت کے بارے میں اطمینان حاصل ہو

۱- ابویعلیٰ الحنبلي، ص۱۲

اور وہ دارالاسلام میں امن و اطمینان کے ساتھ گھوم پھر سکیں۔

یہ مقصود تب حاصل ہوسکتا ہے کہ اسلام کے قانونِ جرم وسزا کو مکمل طور پر نافذ کیا جائے۔ یعنی جو عناصر لوگوں کے امن کے ساتھ کھیلتے ہیں اور ان پر ظلم وزیادتی کرتے ہیں ان پر شرعی سزائیں نافذ کی جائیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ سزاؤں کا نفاذ عدل کے ساتھ ہو اور اس میں جانبداری یا تردد نہ کیا جائے۔ جب ظلم وزیادتی کرنے والوں کے خلاف سزائیں نافذ کی جائیں گے تو لوگ پر امن ہوں گے اور مجرم خوف زدہ۔ اس طرح اطمینان کا دور دورہ ہوگا۔

ہم شرعی سزاؤں کی اہمیت، اور جرائم کی روک تھام اور امن وامان کو عام کرنے میں ان کے اثرات کی تفصیل اس مقام پر بیان کریں گے جہاں اسلام کے نظام جرم وسزا کا بیان ہوگا۔

فقہائے کرام نے اس مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خلیفہ کا فرض ہے کہ "حدود کا قیام عمل میں لائے، تاکہ حرمات اللہ کی پامالی سے بچا جائے اور اس کے بندوں کے حقوق کو ہلاکت اور ضیاع سے محفوظ رکھا جائے۔"[1]

۳- لوگوں کی ضروریات کا انتظام

۳۸۰- دین کے ذریعے دنیا کی سیاست کے مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ اسلامی حکومت ان اشیاء، صنعت وحرفت اور مختلف قسم کے علوم کا انتظام کرے جن کی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ان فرائض کفایہ میں شامل ہیں جن کی ضرورت کی حد تک موجودگی لازم ہوتی ہے۔ اس کی طرف فقہا نے اشارہ کیا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ الدر المختار پر اپنے حاشیہ **رد المحتار** میں کہتے ہیں: فرائض کفایہ میں سے ایک وہ پیشے ہیں جن کی لوگوں کو ضرورت ہو۔[2]

یہ بات ظاہر ہے کہ وہ پیشے جو لوگوں کے لیے ضروری ہوتے ہیں ان میں زمان ومکان کے اختلاف کے ساتھ تبدیلی آتی ہے۔ لوگ جن چیزوں کے کل محتاج تھے ممکن ہے کہ آج ان کے علاوہ اور چیزوں کے محتاج ہوں۔ چنانچہ اسلامی حکومت کو اس کا مشاہدہ کرنا چاہیے اور اس کے لیے وسائل فراہم کرنے چاہییں۔

۱- الماوردیؒ، ص ۱۴

۲- ابن عابدین، ج ۳، ص ۳۰۲

جب ہم لوگوں کے لیے ضروری پیشوں کے حصول کو فرض کفایہ قرار دیتے ہیں تو اس پر یہ بات مرتب ہوتی ہے کہ اگر اُمت اور اس کے حکمران اِن پیشوں کے حصول میں کوتاہی کریں گے تو وہ گناہ گار ٹھیریں گے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی پیشے کے لوگ اپنا پیشہ ادا کرنے سے انکار کریں گے تو حکومت ان کو اس پر مجبور کرسکتی ہے۔ اس کی فقہا نے صراحت کی ہے۔ مشہور فقیہ ابن القیم الجوزیہؒ اپنی کتاب الطرق الحکمیۃ میں کہتے ہیں:

> اگر کسی صنعت وحرفت کے لوگ متفقہ طور پر اپنا پیشہ چھوڑ دیں، حالانکہ لوگ اس کے محتاج ہوں تو حکمران کو حق ہے کہ وہ انھیں مناسب اجرت کے عوض اس کام پر مجبور کرے۔[1]

۴- ملکی وسائل کی ترقی

۳۸۱- دین کے ذریعے دنیا کی سیاست کے مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ ملکی وسائل کو ترقی دی جائے تا کہ عوام کو اقتصادی خوشحالی اور آرام دہ زندگی میسر آئے۔ اس ذمہ داری کی طرف بھی فقہا نے اشارہ کیا ہے۔ مشہور حنفی فقیہ امام ابو یوسفؒ اپنی قابل قدر کتاب الخراج میں، جو انھوں نے ہارون الرشید کو لکھ بھیجی تھی، فرماتے ہیں کہ خلیفہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہریں کھودنے اور ان میں پانی بہانے کے احکامات جاری کرے۔ اس کام پر جو اخراجات اٹھتے ہیں ان کا سارا بوجھ صرف بیت المال پر پڑے گا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> جب ماہرین اس بات پر متفق ہوں کہ نہریں کھودنے سے خراج میں بہتری آئے گی اور اس میں اضافہ ہوجائے گا تو آپ نہریں کھودنے کے احکامات جاری کریں اور اس کے اخراجات بیت المال سے دے دیں۔ اس کا بوجھ شہریوں پر نہ ڈالیں۔ اسی طرح ہر وہ کام جس میں اہل خراج کی زمینوں اور نہروں کو فائدہ پہنچتا ہے اور وہ اس کا مطالبہ کردیں تو ان کا مطالبہ منظور کیا جائے۔ بشرطیکہ اس میں دوسروں کا نقصان نہ ہو۔[2]

امام ابو یوسفؒ نے خراجی زمین[3] میں نہریں کھودنے کی ضرورت جو بیان کی ہے یہ بطور مثال ہے نہ کہ

۱- الطرق الحکمیۃ لابن القیم ،ص۲۲۲

۲- الخراج لابی یوسف ،ص۱۱۰

۳- خراجی زمین وہ ہے جسے مسلمانوں نے فتح کرلیا ہو اور اسے اس شرط پر اپنے مالکوں کے پاس رہنے دیا گیا ہو کہ وہ ایک خاص ٹیکس اسلامی حکومت کو ادا کریں گے، جیسے عراق کی زمین۔ (مولف)

بطور تحدید۔اس کی دلیل ان کی آخری عبارت ہے،یعنی ''ہر وہ کام جس میں اہل خراج کی زمینوں اور نہروں کو فائدہ پہنچتا ہے اور وہ اس کا مطالبہ کردیں تو ان کا مطالبہ منظور کیا جائے۔''

اس طرح امام ابو یوسفؒ نے جو چیزیں ذکر کی ہیں ان پر ایسے تمام امور قیاس کیے جاسکتے ہیں جنھیں ملکی معیشت کی ترقی کے لیے اپنانا ضروری ہو،اور اس سے سب کو عمومی فائدہ ہو رہا ہو۔اس طرح کے امور کو انجام دینا ضروری ہوگا۔ جیسے آب پاشی کا نظام قائم کرنا، ڈیم تعمیر کرنا، زراعت کو ترقی دینا، معدنیات نکالنا، کارخانے قائم کرنا، سڑکیں تعمیر کرنا،لوگوں کے لیے کام کاج کے باعزت راستے نکالنا اور اس طرح کے دوسرے امور جن کی گنتی کرنا اور ان کی تعداد متعین کرنا ممکن نہیں ہے۔ نیز ان میں زمان ومکان اور احوال وظروف کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

۶

اسلام کا اقتصادی نظام

تمہید

۳۸۲- یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان اپنی زیادہ کارکردگی اور کوشش کھانے، پینے، لباس، مکان اور اس طرح کے دیگر ذرائع معاش کے حصول میں صرف کرتا ہے، جن میں سے بعض ضروری امور ہوتے ہیں اور بعض غیر ضروری۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایک انسان کی طرف سے صرف ہونے والی یہ کوشش ضروری بھی ہے، تاکہ دوسروں کو بھی وسائل زندگی میسر آسکیں۔ اس لیے کہ کوئی انسان بھی اپنے لیے تمام ضروریات اکیلے فراہم نہیں کرسکتا۔ انسان کی اس میدان میں سرگرمی اور اس کی بنیاد پر جو جو امور انجام پاتے ہیں اسی کا دوسرا نام اقتصادی سرگرمی ہے۔ چوں کہ انسان ایک متمدن مخلوق ہے اس بنا پر اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اپنی انفرادی سرگرمیوں کے ذریعے (جن میں سے ایک اقتصادی سرگرمی ہے) حاصل کردہ چیزوں سے پوری آزادی کے ساتھ متمتع ہوسکے۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی سرگرمیوں کو اس نہج پر منظم کرے کہ وہ معاشرے کے لیے بھی قابل قبول بن جائیں اور معاشرے اور فرد دونوں کے لیے خیر پیدا کرسکیں۔

کسی معاشرے میں افراد کی اقتصادی سرگرمیوں کو منظم کرنے والے قواعد واحکام ہی ہیں جن سے اس معاشرے کا اقتصادی نظام وجود میں آتا ہے اور یہ نظام خواہ جیسا بھی ہو، اس کے لیے ایک بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے جس پر یہ نظام قائم ہو اور کچھ تعلیمات کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے اندر اس کے معالم وخصائص کی صورت گری کریں۔ اس طرح نظام کے احکام وقواعد اِن معالم وخصائص کی صورت میں مجسم ہوں گے اور اسی بنیاد پر قائم ہوں گے جو اِن کے لیے ضروری ہے۔

۳۸۳- پھر چوں کہ جامعیت بھی اسلام کے خصائص میں سے ہے اس لیے یہ ایک بدیہی امر ہے کہ اسلام میں انسان کی اقتصادی سرگرمیوں کی تنظیم بھی ہو، اور یہ انھی قواعد واحکام پر مبنی ہو جو اسلام کی تعلیمات

سے سامنے آتے ہیں۔ یہ قواعد واحکام اوران کی وہ بنیاد جن پر یہ قائم ہوتے ہیں اسلام کے اقتصادی نظام کو تشکیل دیتے ہیں۔

۳۸۴- اسلام کا اقتصادی نظام اسلامی عقیدے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی عقیدہ اس کی فکری بنیاد ہے۔ اسلام انسانی فطرت اور محاسن اخلاق کا لحاظ کرتا ہے اور لازمی طور پر اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ افراد کی زندگی کے لیے لازمی انسانی ضروریات پوری کی جائیں۔ یہی اس نظام کی خصائص ہیں۔ اس نظام کی بنیادوں اور خصائص کی روشنی میں اس کے تمام عمومی اصول ومبادی اور ذیلی تنظیمیں وجود میں آتی ہیں۔ اسی طرح یہ نظام بیت المال کی مدات آمد وخرچ کا بھی تعین کرتے ہیں۔ تاکہ حکومت افراد کی ضروریات فراہم کر سکے اور معاشرے کے مفادات کی حفاظت کر سکے۔ اس لیے ہم پہلے عنوان کے تحت اس نظام کی فکری بنیاد اوراس کے خصائص کے بارے میں بات کریں گے، دوسرے عنوان کے تحت اس کے عمومی اصول ومبادی بیان کریں گے اور تیسرے عنوان کے تحت بیت المال کے بارے میں وضاحت کریں گے۔

۱- فکری بنیاد اور خصوصیات

اسلامی نظام معیشت کی فکری بنیاد

۳۸۵- اسلامی نظام معیشت کی فکری بنیاد اسلامی عقیدہ ہے، اور یہ عقیدہ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، کائنات اور خالق کائنات کے ساتھ اور اس مقصد کے ساتھ انسان کے تعلق کی وضاحت کرتا ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ نیز یہ عقیدہ اس مقصد کے حصول کے لیے درکار وسائل کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

اس حق اور سچ عقیدے کی رو سے انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مخلوقات میں سے افضل ترین ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی وسیع معنوں میں عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ اس مقصد تک اس کے بغیر نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اختیاری طور پر اللہ رب العالمین کے آگے جھک جائے۔ اس خضوع کا عملی مظاہرہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو، اپنے کردار کو، اپنی سرگرمیوں کو، جن میں سے ایک معاشی سرگرمی ہے، اس طریقے کے مطابق ڈھالے جو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے اور اسے قانون کا درجہ دیا ہے۔

اس بنا پر اسلام کا اقتصادی نظام اسلام کے دوسرے نظاموں کے ساتھ روبعمل آتا ہے۔ اس سے

انسان کے لیے راستے آسانی اور سہولت پیدا ہوتی ہے، تاکہ وہ اس مقصد تک پہنچ سکے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے۔ اور وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ جب انسان کے لیے یہ عبادت آسان ہو جاتی ہے تو اس کا مطلوبہ مقدار میں تزکیہ ہو جاتا ہے اور وہ آخرت میں حیات طیبہ کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے، جبکہ دنیا میں سعادت و کامیابی کا حصول تو ہے ہی۔

ایک مسلمان کے لیے اسلامی نظام معیشت کے اس فکری بنیاد کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کو سمجھنے اور اسے اپنے ذہن میں مستحضر رکھنے سے وہ دنیا میں اپنا حقیقی مقام، دنیا کے ساتھ اپنا تعلق اور اپنی زندگی کا مقصد پہچان لے گا۔ نتیجتاً وہ پوری رضامندی کے ساتھ ان تمام ضوابط اور تنظیمات کو قبول کرے گا جو اسلامی شریعت نے اسلامی نظام معیشت کے بارے میں پیش کی ہیں۔ وہ ان تنظیمات کو نافذ کرنے اور اپنے آپ کو ان تک محدود رکھنے کی طرف لپکے گا۔ اس طرح اسلامی نظام معیشت کا پھل واقعات کی دنیا میں سامنے آئے گا اور یہ نظام اس مقصد کے حصول میں اپنا کردار ادا کرے گا جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

۳۸۶- نظام معیشت کے بارے میں اسلامی عقیدے کی تعلیمات اور اس کے لوازم میں سے چند درج ذیل ہیں۔

۱- بادشاہی اللہ کی ہے

۳۸۷- یہ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے وہ سب بلا استثنا حقیقی طور پر اور خالص اللہ تعالیٰ وحدہٗ کی ملکیت ہے۔ اس کائنات کے ایک ذرے میں بھی کسی کو اس کے ساتھ کوئی شرکت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے: وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (المائدہ ۵:۱۷) اللہ زمین اور آسمان کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ (المائدہ ۵:۱۲۰) زمین اور آسمان اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔

وَلَم يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِ الْمُلْكِ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۱۱) اور نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک

ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ (سبا۳۴:۲۲)(اے نبیؐ! ان مشرکین سے) کہو کہ پکار دیکھو اپنے ان معبودوں کو جنھیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں۔ وہ آسمان اور زمین کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں۔

جس چیز پر کسی کو کامل ملکیت حاصل ہو تو اس کے ساتھ لازم ہے کہ وہ اس میں پوری طرح تصرف کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام مخلوقات میں اللہ تعالیٰ پوری آزادی کے ساتھ تصرف کا حق رکھتا ہے۔

۲- مال اللہ کا ہے

۳۸۸- مال، جسے لوگ کماتے ہیں، اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اسے محفوظ کیا جا سکتا ہے، یہ بھی کائنات ہی کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ یہ بھی اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس کا حقیقی مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتَاكُمْ (النور۲۴:۳۳) اور ان کو اس مال میں سے دو، جو اللہ نے تمھیں دیا ہے۔

۳- مخلوقات انسان کے لیے مسخر ہیں

۳۸۹- اللہ تعالیٰ نے خالص اپنے فضل و کرم سے اپنی ساری مخلوقات کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے تاکہ وہ ان سے نفع حاصل کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس انتفاع کے راستے بھی آسان بنائے ہیں۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور ہاتھ پاؤں دیے ہیں جن کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے نفع حاصل کرنے کے راستے تلاش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ۴۵:۱۳) اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزوں کو تمھارے لیے مسخر کر دیا، سب کچھ اپنے پاس سے۔

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان۳۱:۲۰) کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری

چیزیں تمھارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کردی ہیں؟

انسان پر اپنی ان نعمتوں کا احسان جتاتے ہوئے، جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہیں اور جن کے ذریعے وہ اللہ کی مخلوق سے نفع حاصل کرنے کے راستے تلاش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ هُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (الملک ۶۷:۲۳) ان سے کہو: اللہ ہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیے، مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔

۴- انسان کی ملکیت مجازی

۳۹۰- اگرچہ حقیقی ملکیت تو اللہ رب العالمین کے لیے ہے مگر اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے فضل سے صرف انسان کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ مال سے نفع اٹھائے اور اس میں تصرف کرے، اسے اپنا مال کہے اور اپنے آپ کو اس کا مالک کہلائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ ۲:۱۸۸) اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمھیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔

وَاعْلَمُوٓا أَنَّمَآ أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (الانفال ۸:۲۸) اور جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں۔

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ (البقرۃ ۲:۲۷۴) جو لوگ اپنے مال شب و روز خرچ کرتے ہیں۔

ان آیات کریمہ میں مال کی نسبت بطور ملکیت اور اختصاص انسان کی طرف کی گئی ہے۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ لَايَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبٍ مِّنْ نَفْسِهٖ. کسی مسلمان کا مال اس کی دلی خوشی کے بغیر لینا جائز نہیں ہے۔

یہ حدیث شریف بھی مال کو انسان کی طرف منسوب کرتی ہے، اس طور پر کہ وہ اس کا مالک ہے، مگر اس کے باوجود ملکیت حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کی رہتی ہے۔ اس لیے کہ یہ بات محال ہے کہ کائنات کی کسی بھی چیز کی ملکیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک ہو جائے۔ چنانچہ یہ بات تو بالکل ممکن نہیں ہے کہ کوئی اور اکیلے کسی چیز کا مالک بن جائے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی چیز کی ملکیت کو انسان کی طرف منسوب کرنا مجازی طور پر ہے نہ کہ حقیقی طور پر، اور انسان جس چیز کا مالک ہوتا ہے وہ اس میں مالک حقیقی کے وکیل کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان اپنی ملکیت میں ان تمام قواعد وضوابط کے آگے جھکے گا جو مالک حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ نے مقرر کیے ہیں۔ انسان کے لیے کبھی جائز نہیں ہے کہ ان حدود سے باہر قدم رکھے۔ اگر وہ ان حدود سے نکلے گا تو گناہ گار ہوگا اور اس پر وہ شریعت میں مقررہ سزا کا مستحق ہوگا۔

اس سلسلے میں کبھی اللہ تعالیٰ اس سے ملکیت کو عارضی یا مستقل اور کلی یا جزوی طور پر چھین لیتا ہے۔ ہمارے فقہائے کرام ان معانی کو پاچکے تھے اور انھوں نے اس کی طرف اشارے کیے ہیں۔ امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں ارشاد خداوندی: وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ[1] کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اصل ملکیت تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ہے اور بندے کو اس میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق تصرف کے علاوہ کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مال درحقیقت تمھارا نہیں ہے اور تمھاری حیثیت اس میں نائب اور وکیل سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا تمھیں جو فرصت ملی ہے اسے غنیمت جانو، قبل اس کے کہ یہ ملکیت تم سے کسی اور کو منتقل ہو جائے۔[2]

اس حقیقت کو جاننا ایک مسلمان کو اس مال میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کرنے کے لیے آمادہ کر دیتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے اس کو تصرف کا اختیار دیا ہے۔ چنانچہ جہاں اس کا خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں وہ اس میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ کیوں کہ وہ اس مال کا وکیل ہے، نہ کہ مالک حقیقی۔ وکیل کا کام یہ ہوتا ہے کہ موکل نے اسے جس کام کے لیے وکیل بنایا ہے اسی کو کر ڈالے۔

۱۔ ترجمہ: اور خرچ کرو اس مال میں سے، جس میں اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ (سورۃ الحدید ۵۷: ۷)

۲۔ تفسیر القرطبی، ج ۷، ص ۲۳۸

۵- مال کو رضائے الٰہی میں خرچ کرنا

۳۹۱- ایک مسلمان کو جو مال دیا جاتا ہے، ضروری ہے کہ وہ اسے اللہ کی رضا میں خرچ کرے اور اسی مقصد کے لیے خرچ کرے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، تاکہ وہ آخرت میں حیاتِ طیبہ سے ہم کنار ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتَاکَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَکَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص ۲۸:۷۷) جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو دنیا کی لذتوں سے محروم کیا جائے یا اپنے جسم کو ضروریات سے محروم رکھ کر مشقت میں ڈالا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف ۷:۳۲) ان سے کہو: کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟

۶- دنیا ذریعہ ہے مقصد نہیں

۳۹۲- دنیا اپنے سارے ساز و سامان اور مال و دولت سمیت، انسان کے لیے مقصد کا درجہ نہیں رکھتی، بلکہ یہ اس مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے آخرت کی تیاری کی جائے۔ چنانچہ اگر آدمی دنیا کے وسائل اور اس کا ساز و سامان حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس مقصد کو بھولنا نہیں چاہیے اور دنیا یا اس کی کسی بھی چیز کو اپنا مقصد نہیں بنانا چاہیے۔

جوتے کا کام یہ ہے کہ انسان اس میں پاؤں رکھے، سواری کا کام یہ ہے کہ آدمی اس پر سوار ہو اور اس مقام تک پہنچ سکے جہاں وہ پہنچنا چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ بات نہ اسلامی فقہ میں جائز ہوگی اور نہ عقلِ سلیم اس بات کی اجازت دے گی کہ جوتا بنانا خود مقصد بن جائے یا سواری کا حصول مقصد کا درجہ حاصل کر لے۔ یہی معاملہ دنیا کے ہر ساز و سامان کا ہے جس کی طرف اگر ایک مسلمان توجہ دیتا ہے تو صرف اس لیے کہ وہ مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اس سے اس مقصد تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اسے ان وسائل سے الگ ہونا ہے۔ ان میں سے وہی کچھ اس کے پاس رہے گا جس سے اپنے رب کی عبادت اور اس کی رضا کے لیے استفادہ کیا۔

ان تعلیمات کا ادراک اور انھیں ذہن میں تازہ رکھنا بہت ضروری امر ہے، تاکہ اقتصادی سرگرمی کو اسی نہج پر منضبط کیا جاسکے جو اسلام کو مطلوب ہے۔ اس لیے کہ انسان کی سرگرمیوں کے ضوابط ہی اسے اندر سے منضبط کرتے ہیں۔ یہی اس کے ارادے کو منضبط کرتے ہیں، اس کے قصد اور اس کے نظریے اور اس کے میلانات کو منضبط کرتے ہیں۔ جب اندرون منضبط ہو جاتا ہے تو بیرون کا منضبط کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم نے بہت سی آیات میں ان تعلیمات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

وَمَآ أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (القصص ۲۸:۶۰) تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (الکہف ۱۸:۷) واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں، ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا (الکہف ۱۸:۴۶) یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرایش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انھی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی نظام معیشت کی خصوصیات

۳۹۳- گذشتہ بحث میں ہم نے کہا ہے کہ اسلامی نظام معیشت کی خصوصیات انسانی فطرت کا لحاظ، اخلاقیات کی پابندی اور انسانی زندگی کی حقیقی ضروریات کی تکمیل پر زور دینا ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے ہر خصوصیت کو اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

۱- انسانی فطرت کا لحاظ

۳۹۴- اللہ تعالیٰ نے انسان میں کچھ جذبات و میلانات اور خواہشات ودیعت کیے ہیں۔ ان کو جڑ سے

اُکھاڑ پھینکنا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ اگر یہ کبھی سیدھے راستے سے ہٹ جائیں یا ان میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے ان کو درست کرنا اور ان کی تہذیب کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس بنا پر جو نظام انسانی فطرت کے موافق نہیں ہوتا بلکہ اس کے خلاف ہوتا ہے، ممکن نہیں کہ وہ خیر لے کر آئے یا اس کے باقی رہنے کے امکان رہے۔

اسلامی نظام معیشت میں انسانی فطرت کے پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے مظاہر میں سے ایک بات یہ ہے کہ یہ نظام انسان کے حق ملکیت کی تائید کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ قرآن کریم نے اس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے: وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (الفجر ۸۹: ۲۰) اور تم مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔

اس نے نظام وراثت بھی مقرر کیا ہے اس لیے کہ اولاد کے ساتھ محبت، اور اگر کوئی مال چھوڑ کر نہ جا رہا ہو تو ان کے لیے فکر مندی بھی اس کی فطرت میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نظام وراثت کو قانون کا درجہ دیا ہے۔ کیوں کہ یہ انسان کی اس فطرت کے ساتھ بالکل موافق ہے۔

قرآن کریم نے بچوں کے ساتھ محبت اور ان پر شفقت، ان کے لیے فکر مندی اور اپنی موت کے بعد ان کے لیے خوف کھانے کی جذبات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (النساء۴: ۹) لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انھیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُوْنَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّأَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَأَصَابَهَآ إِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (البقرة ۲: ۲۶۶) کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو، نہروں سے سیراب، کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا، اور وہ عین اس وقت ایک تیز بگولے کی زد میں آ کر جھلس جائے جبکہ وہ خود بوڑھا ہو

اور اس کے کمسن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں؟ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور و فکر کرو۔

اسی طرح اسلام نے اپنے اقتصادی نظام میں انسان کے لیے اپنی محنت اور کارکردگی کے پھل سے نفع اٹھانے کی تائید کی ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی انسانی فطرت کے ساتھ موافق ہے۔ بلکہ انسانی فطرت کی بنیاد میں تو یہ بھی ہے کہ وہ اپنی محنت میں کسی اور کی شرکت کو مسترد کرتا ہے۔ البتہ بعض دوسری وجوہات کی بنا پر وہ اس مشارکت پر راضی ہو جاتا ہے، جیسے ثواب کا حصول وغیرہ۔ انسان کی اس فطرت کی طرف بھی قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (النحل ۱۶:۷۱) اور دیکھو، اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے۔ پھر جن لوگوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے وہ ایسے نہیں ہیں کہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں تا کہ دونوں اس رزق میں برابر کے حصہ دار بن جائیں۔ تو کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے ان لوگوں کو انکار ہے؟

اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: یعنی تم میں سے کسی کو مال دار اور کسی غریب بنایا۔ چنانچہ جن لوگوں پر رزق کے ساتھ فضل کیا گیا وہ اپنے دیے ہوئے رزق میں سے کچھ بھی اپنے غلاموں پر خرچ نہیں کریں گے کہ مالک اور مملوک مال میں برابر ہو جائیں۔[1] ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ أَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنَاكُمْ فَأَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (الروم ۳۰:۲۸) وہ تمھیں خود تمھاری اپنی ہی ذات سے ایک مثال دیتا ہے۔ کیا تمھارے ان غلاموں میں سے جو تمھاری ملکیت میں ہیں کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیے ہوئے مال و دولت میں تمھارے ساتھ برابر کے شریک ہوں؟

اس کی تفسیر میں امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: ''یہاں مِنْ أَنْفُسِكُمْ میں مِنْ ابتدا کے لیے ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا ہو کہ اللہ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے جو تمھاری قریب ترین چیز سے لی گئی ہے اور وہ تمھاری اپنی جان

۱۔ تفسیر القرطبی، ج ۱۰، ص ۱۴۱

ہے۔'' آگے امام قرطبیؒ مزید فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ کیا تم میں سے کوئی اس بات پر راضی ہے کہ اس کا غلام اس کے مال اور جان میں برابر کا شریک ہو؟ اگر تم اپنے لیے اس پر راضی نہیں ہو تو تم نے اللہ کے ساتھ کیوں شریک بنا رکھے ہیں؟[1]

اسلام کے اقتصادی نظام کے تمام اصول، جنھیں ہم بعد میں بیان کریں گے، اسی فطرت انسانی کی رعایت پر مبنی ہیں۔ لیکن انسانی فطرت کا لحاظ کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ نظام ہر حالت میں انسانی فطرت کے پیچھے چلتا ہے، خواہ انسانی فطرت جہاں بھی جائے اور جس طرف بھی رُخ کرے۔ اس لیے کہ فطرت کی رعایت کے ساتھ یہ بات لازم نہیں ہے کہ اس کی اندھی پیروی کی جائے، بلکہ ان سے مراد اصل فطرت کی رعایت ہے، کہ جب اس میں کوئی خرابی پیدا ہو یا جب انحراف کی شکار ہو تو اس کی تہذیب بھی کی جاتی رہے اور اس کی نگرانی بھی کی جائے۔

۲- اخلاقیات کا لحاظ

۳۹۵- اسلام کا معاشی نظام اخلاقیات کا لحاظ رکھتا ہے۔ چنانچہ کسی انسان کے لیے جائز نہیں ہے کہ ان تعلیمات کو حقیر جانے یا اپنی معاشی سرگرمی کے کسی پہلو میں اس کی حدود کو پامال کرے۔ اس لیے کہ اسلامی معاشرہ محبت اور پاکیزہ تعاون جیسی اخلاقی تعلیمات کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَاتَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ ۵:۲) جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔

چنانچہ اسلامی معاشرے میں نہ حسد ہوتا ہے نہ بغض، نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ جھوٹ اور نہ دھوکہ۔ اس میں جب کسی انسان کے ہاتھ میں مال آ جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے فحش کام میں صرف کرے یا کسی برائی میں، یا جسم کی حرام خواہشات میں۔ بلکہ اس کا فرض ہوتا ہے کہ اسے حلال راستوں میں صرف کرے اور اس کے ذریعے مصیبت زدہ اور محتاج لوگوں کی ضرورتیں پوری کرے۔

اگر کوئی اپنے مال میں اضافہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ کسی ایسے ذریعے سے اس میں

۱- تفسیر القرطبی، ج ۱۴، ص ۲۲-۲۳

اضافہ کرے جس سے اخلاق میں خرابی پیدا ہو یا افرادِ معاشرہ کے درمیان مودت کے رشتے کٹ جائیں۔ جیسے شراب خانے اور فحاشی کے اڈے کھولنا اور سود کا کاروبار کرنا۔

اخلاقی تعلیمات کا لحاظ کرنے میں کچھ امور ایسے ہیں جو انسان کے ایمان اور اس کے وجدان پر چھوڑ دیے گئے ہیں، جیسے سچائی اور ایفائے عہد کی پابندی کرنا۔ جب کہ بعض ایسے ہیں جن کی افراد سے پابندی کرانے میں ریاست بھی دخل دے سکتی ہے۔ جیسے سود کے کاروبار اور فحاشی کے اڈوں اور شراب خانوں کے کھولنے کی ممانعت۔

۳- عوامی ضروریات پوری کرنے پر زور

۳۹۶- انسان کی کچھ مادی ضروریات ہیں جن کے بغیر زندگی گزارنا ممکن نہیں ہوتا۔ جیسے کھانے، پینے، رہائش، لباس اور ان سے متعلقہ یا ان کے قائم مقام دیگر ضروریات۔ ایک باعزت زندگی کے لیے یہ ضروریات ہر انسان کو کم از کم حد تک مہیا ہونا ضروری ہیں۔

اسلامی نظام معیشت نے اس پہلو پر بہت زور دیا ہے۔ یعنی اسلامی معاشرے میں یہ اہم ترین ضروریات ہر انسان کو ملنی چاہییں۔ اسلام نے اس مقصد کے حصول کے لیے درجہ بدرجہ کئی وسائل مقرر کیے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک وسیلہ کافی نہیں ہوتا تو دوسرے وسیلے کو اپنانا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مقصود حاصل ہو جائے اور اسلامی معاشرے میں ہر شخص اپنی ضرورت پوری کر سکے۔ یہ وسائل درج ذیل ہیں:

الف- شخصی ذمہ داری

۳۹۷- ہر شخص اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کا خود ذمہ دار ہے۔ یعنی وہ اپنی پوری محنت اور کوشش صرف کرے گا۔ اسی لیے اسلام نے کام کاج کی ترغیب دی ہے اور جو لوگ کوئی نہ کوئی عمل کرتے ہیں اور خود کماتے ہیں ان کی تعریف کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ۶۲:۱۰) پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے: إِنَّ أَفْضَلَ الْكَسْبِ كَسْبُ الرَّجُلِ مِنْ يَدِهٖ. بہترین کمائی یہ ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ سے کمائے۔

ب- ریاستی ذمہ داری

۳۹۸-حکومت پر لازم ہے کہ جو لوگ کام کر سکتے ہیں ان کے لیے کام کے راستے مہیا کرے۔ یہاں تک کہ اگر ان کو بیت المال سے قرض دینے کی ضرورت ہو اور اس قرض کے ذریعے وہ کام کاج کے قابل ہو سکتے ہوں تو انھیں قرض دینا چاہیے۔ عظیم فقیہ امام ابو یوسفؒ نے محتاج لوگوں کو بیت المال سے قرض دینے کے جواز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فقیہ ابن عابدینؒ کہتے ہیں: امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ عاجز کو (یعنی وہ شخص جو غربت کی وجہ سے اپنی خراجی زمین کو کاشت کرنے سے عاجز ہو) بیت المال سے اتنا قرض دینا چاہیے کہ وہ اس سے کام کاج کرے اور اپنی زمین سے پیداوار حاصل کرے۔[1]

امام ابو یوسفؒ نے جو بات بیان کی ہے اس پر خراجی زمینوں کے مالکوں کے علاوہ دوسرے ضرورت مندوں کو بیت المال سے قرض دینا بھی قیاس کیا جا سکتا ہے، تاکہ وہ اس کے ذریعے حلال روزی کما سکیں۔

ج- خاندان کی ذمہ داری

۳۹۹- جب ایک فرد کسی معذوری، بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے یا پھر کام نہ ملنے کی وجہ سے اس بات سے عاجز ہو کہ اپنی ضروریات خود پوری کر سکے تو اس کے خاندان کے لوگوں پر لازم ہوگا کہ فقہ اسلامی میں افراد اسرہ کے لیے شرعی نفقات کے باب میں مقررہ قواعد کے مطابق اس پر خرچ کریں۔

د- زکوٰۃ کی مد

۴۰۰- اگر عاجز شخص کے خاندان میں کوئی ایسا نہ ہو جو اس پر خرچ کرے، جس کی وجہ خواہ یہ ہو کہ اس کے خاندان میں سرے سے کوئی ہے نہیں، یا یہ کہ وہ خود فقیر ہوں تو اس کو ضرورت کی حد تک زکوٰۃ دینا ضروری ہوگی، جو اغنیا کے مال میں فقیروں کا حق ہے۔ زکوٰۃ کا نظام فقرا اور ضرورت مندوں کی اجتماعی کفالت کا ایک وسیع ترین باب ہے۔

ہ- بیت المال

۴۰۱- اگر زکوٰۃ ناکافی ہو جائے تو ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو بیت المال کی دوسری مدات سے پورا

۱- ردالمختار، ج ۳، ص ۳۶۴

کیا جائے گا، جن کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

و- اهل ثروت کی ذمه داری

۴۰۲- اگر بیت المال میں اتنا کچھ نہیں ہے جس سے ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری ہوں تو پھر یہ مال دار لوگوں کی ذمہ داری بن جائے گی۔ اسی کے بارے میں معروف فقیہ علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں:

ہر علاقے کے مال داروں پر لازم ہے کہ اپنے میں سے فقیروں کی ضرورت پوری کریں۔ اگر ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی تو حکومت ان کو اس کام پر مجبور بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ ان کے مال میں سے کھانے، پینے، موسم کے مطابق لباس اور گرمی، سردی، دھوپ، بارش اور لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہنے کے لیے رہایش کے حوالے سے فقیروں کی ضرورتیں پوری کی جائیں گی۔[1]

علامہ ابن حزمؒ کے قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مال داروں کے مال میں فقیروں کا حق صرف زکوٰۃ ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عمرؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: إِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ. مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔[2] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلآئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ... (البقرۃ ۲:۱۷۷) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں... پر خرچ کرے۔

اس آیت کے بارے میں علامہ قرطبیؒ اور امام رازیؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہاں ایتاء (دینا) زکوٰۃ کے علاوہ ہے اور یہ بھی واجبات میں سے ہے، نہ کہ نوافل میں سے۔ امام رازیؒ نے ان واجبات کی چند مثالیں بھی

۱- المحلیٰ، ج ۶، ص ۱۵۶

۲- المحلیٰ، ج ۶، ص ۱۵۸

بیان کی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک مجبور شخص کو کھانا کھلایا جائے۔اس کے بعد علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں:

علما کا اس بات اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو اگر زکوۃ کی ادائیگی کے بعد کوئی ضرورت لاحق ہو جائے تو اس پر مال خرچ کرنا چاہیے۔امام مالکؒ فرماتے ہیں: لوگوں پر لازم ہے کہ اپنے قیدیوں کو فدیہ ادا کریں، اگر چہ یہ فدیہ ان کے سارے مال پر حاوی ہو جائے۔اور اسی پر اجماع بھی ہے۔[1]

۴۰۳- اس بنا پر ہماری رائے میں یہ جائز ہے کہ مسلمان حکمران مال دار لوگوں سے مال اکٹھا کرنے کا نظام تشکیل دیں۔اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ان کے اموال پر جائز ٹیکس لازم کردے۔یہ اتنی مقدار میں ہو جس سے ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کی جاسکیں اور اسلامی ریاست اس قابل ہو سکے کہ وہ مسلمانوں پر بحیثیت امت لازم ہونے والی ذمہ داریوں کو جو امت کی نمائندہ ہونے کی بنیاد پر حکومت کو انجام دینے ہوتے ہیں، انجام دے۔جیسے خطرات سے بچاؤ، دارالاسلام کے دفاع کے لیے اسلحے کی تیاری وغیرہ۔یہ سارے کام تبھی انجام دیے جاسکتے ہیں جب کہ بیت المال میں اتنا کچھ موجود ہو جو اِن کاموں کے لیے کافی ہو سکے۔ہماری بات کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔فرمایا: كُلُّكُمْ رَاعٍ فَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ، فَالْأَمِيْرُ الَّذِيْ عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَّهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُمْ... تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک اپنی ذمہ داری کے بارے میں جواب دہ ہے۔چنانچہ لوگوں کا امیر بھی ذمہ دار ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔

امام نوویؒ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

علما کہتے ہیں کہ راعی (ذمہ دار) وہ ہوتا ہے جو حفاظت بھی کرتا ہے، امانت کا خیال بھی رکھتا ہے اور ہر وقت اپنے زیر کفالت و ماتحت اشخاص و اشیا کی بھلائی چاہتا ہے۔چنانچہ اس حدیث میں یہ حکم ہے کہ جس کے زیر کفالت کوئی چیز ہو تو اس سے عدل کا اور دینی و دنیوی مفادات اور اس کے متعلقات مطلوب ہوتی ہیں۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اہل ثروت سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ فقیروں اور محتاجوں پر خرچ کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے اور اپنے مال سے حکومت کی مدد کریں گے، تاکہ حکومت اپنے بیت المال میں کافی

۱- تفسیر القرطبی، ج ۲ ص ۲۴۱-۲۴۲ تفسیر الرازی، ج ۵ ص ۲۴

۲- اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان، ج ۲ ص ۲۸۴

مال نہ ہونے کے باوجود وہ کام انجام دے سکے جو اس کے قیام اور بقا کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم اپنی بہت سی آیات میں ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ وہ بخل اور بخیلوں کو مذمت کرتا ہے اور حرص سے روکتا ہے۔ یہ ساری باتیں ایک مسلمان کو انفاق اور سخاوت پر آمادہ کرتی ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں یہی کردار سنت نبویؐ نے بھی ادا کیا ہے۔

اس حوالے سے احادیث میں بہت سے اوامر اور تاکیدی احکام وارد ہوئے ہیں۔ یہاں ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ حدیث نقل کریں جو حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ کَانَ لَهُ فَضْلُ ظَهْرٍ فَلْیَعُدْ بِهٖ عَلٰی مَنْ لَاظَهْرَ لَهُ، وَمَنْ کَانَ لَهُ فَضْلُ زَادٍ فَلْیَعُدْ بِهٖ عَلٰی مَنْ لَّا زَادَ لَهُ[۱] جس کے پاس کوئی سواری ہو وہ اسے اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں ہے۔ اور جس کے پاس اضافی زادِراہ ہو وہ اسے اس شخص کو دے دے جس کے پاس زادِراہ نہیں ہے۔

حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کی مختلف قسموں کے بارے میں بیان کیا۔ یہاں تک کہ ہمارا خیال ہوا کہ کسی کو اضافی مال رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔[۲]

اگر مال دار لوگ اپنے طور پر مطلوبہ انفاق کی طرف آگے نہیں بڑھتے تو حکمران کے لیے جائز ہوتا ہے کہ وہ انھیں اس پر مجبور کرے۔ ان پر ان کے مال میں معقول ٹیکس لگا دے، اس طرح کہ وہ ریاست اور محتاجوں کی ضروریات کے لیے کافی ہو، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

۱- المحلّٰی، ج۶، ص۱۵۶-۱۵۷

۲- ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، حدیث ۱۴۱۶

۲- عام اُصول ومبادی

۴۰۴- اسلامی نظام معیشت میں کچھ عام اصول ومبادی ہیں جو اسلامی عقیدے، فطرت انسانی اور مصلحت عامہ کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ ان اصول ومبادی سے بہت سے جزئیات نکلتے ہیں اور مختلف نظام وجود میں آتے ہیں۔ ان اصول ومبادی میں سے ایک آزادیِ عمل، دوسرا حق ملکیت اور تیسرا حق وراثت ہے۔

۱- آزادیِ عمل

۴۰۵- اسلام عمل پر زور دیتا ہے اور سستی وکاہلی کو ناپسند کرتا ہے۔ اعمال میں سے زیادہ شرافت والا اور عالی شان عمل تو وہ ہوتا ہے جو اللہ کے قریب کردے۔ جیسے خالص عبادات، مثلاً نماز۔ یا مباح اور جائز اعمال جو اچھی نیت کے ساتھ کیے جائیں، مثلاً کاشتکاری اور کاریگری وغیرہ۔ کام کاج اور معاشی سرگرمی کے حوالے سے بھی اسلام لوگوں کو کام کی ترغیب دیتا ہے۔ کام کاج کرنے والے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور کسب حلال پر انسان کی تعریف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ۶۲: ۱۰) پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ (الملک۶۷: ۱۵) وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو تابع کررکھا ہے، چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق، اسی کے حضور تمھیں دوبارہ زندہ ہوکر جانا ہے۔

اور حدیث میں ہے: مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهٖ. کسی مسلمان نے کوئی کھانا نہیں کھایا ہوگا جو اس سے بہتر ہو کہ آدمی اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے۔[۱]

دوسری حدیث میں ہے: مَنْ بَاتَ كَالًّا فِيْ طَلَبِ الْحَلَالِ بَاتَ مَغْفُوْرًا لَهٗ. جس نے رزق حلال کی تلاش میں پریشان رہ کر رات گزاری اس رات اس کی بخشش ہوگئی۔

۱- صحیح بخاری، مسند احمد

پھر کام کی ترغیب اور اقتصادی سرگرمی دکھانا عام اور آزاد ہے۔ یہ نہ کسی متعین قسم تک محدود ہے اور نہ نوع یا قسم کے علاوہ کسی قسم کے ساتھ مقید ہے۔ اس بنا پر یہ اقتصادی سرگرمیوں اور معاملات و مکاسب کی تمام قسموں پر حاوی ہے۔ جیسے تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، شرکت، مضاربت، اجارہ اور وہ تمام امور جنھیں انسان کام کاج اور اقتصادی سرگرمی کے طور پر رزق حلال کی طلب میں اختیار کرتا ہے۔

انسان جو بھی حلال کام کرتا ہے، اسلام کی نگاہ میں اس کی قدر کم نہیں ہوتی، خواہ لوگ اسے کتنا ہی معمولی یا حقیر کام شمار کرتے ہوں۔ اس لیے کہ اسلام کی نگاہ میں انسان کی قیمت اس کی دین داری اور تقویٰ میں ہے نہ کہ اس کے مال وغنا یا اس کے کام اور پیشے میں۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے بہت بڑے بڑے علما وفقہا مختلف قسم کے جائز اور آزادانہ پیشے اختیار کرتے تھے۔ اسی طرح ہم بعض صحابہ کرامؓ کو دیکھتے ہیں کہ وہ بعض مباح قسم کے کام کرکے دوسروں کے ہاں مزدوری کرتے تھے اور مناسب اُجرت حاصل کرتے تھے۔

۴۰۶- کام کاج پر اُبھارنے کا ایک بالواسطہ ذریعہ یہ ہے کہ اسلام نے فقیر کے ساتھ تعاون کرنے کی ترغیب دی ہے اور اجر وثواب کے معاملے میں مدد کرنے والے کو مدد کیے جانے والے سے بہتر قرار دیا ہے۔ حدیث میں ہے: اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی. دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ، حج اور بھلائی کی مختلف قسموں، جیسے انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ میں عظیم ثواب ہے۔ یہ اجر وثواب اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا کہ اس کے اسباب کو انجام دیا جائے، یعنی یہ کہ حج کیا جائے، زکوٰۃ دی جائے اور بھلائی کے دیگر کام کیے جائیں۔ اور یہ سارے کام تب انجام دیے جاسکتے ہیں جبکہ آدمی کے پاس مال ہو۔ یہیں سے عمل اور کام کاج اجر وثواب کے حصول کا ذریعہ بھی ہوا۔ کیوں کہ یہی مال کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور مال خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثواب کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں آیا ہے: نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلْمَرْءِ الصَّالِحِ. ایک صالح آدمی کے لیے صالح مال بہت اچھا ہے۔[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ نیک آدمی اپنا حلال مال ایسے راستوں میں خرچ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں قابل قبول ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرتا ہے۔

۴۰۷- ایک فرد کے لیے مناسب کام کاج کا چناؤ فرد کی ترجیحات پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے، اس معنی میں

۱- مسند احمد، صحیح ابن حبان بروایت عمرو بن العاصؓ

کہ اسلام ہر فرد کو کام کی آزادی دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اسے اقتصادی آزادی فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اس کو حق ہوتا ہے کہ اقتصادی سرگرمی کا جو پہلو چاہے اپنا لے، اس میں فرد پر کوئی جبر و اِکراہ یا روک ٹوک نہیں ہے۔

شریعت کی نصوص میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو افراد کی معاشی آزادی یا کام کاج میں آزادی کے خلاف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس چیز کی بنیاد انسان کی فطرت، اس کی کرامت وانسانیت اور اس کی انفرادی جواب دہی پر قائم ہے اور اس میں جماعت کی مصلحت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہر انسان کی فطرت میں آزادی کا داعیہ موجود ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کے چلنے پھرنے میں اور اس کے اخذ وترک میں بھی۔ چنانچہ اس صحیح اور فطری میلان کو ضایع کرنا درست نہیں ہے، جسے بے زبان حیوانات بھی محسوس کر سکتے ہیں۔

ہاں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فطرت بگڑ جاتی ہے تو ایک فرد اُسی چیز کو اپنا لیتا ہے جو اس کے فائدے کے بجائے نقصان کا ذریعہ ہوتی ہے یا جو جائز ہونے کے بجائے ناجائز ہوتی ہے۔ اس صورت میں فطرت کی درستی کے لیے قیود لگانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے، تا کہ یہ آزادی حلال کے دائرے میں آ جائے۔ اور یہ دائرہ بھی تنگ نہیں بلکہ بہت کھلا ہے۔

اسی طرح انسان کے لیے حریت عمل کی آزادی میں اس کی کرامت اور آدمیت کی حفاظت کا تاکید انتظام کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ انسان اپنے اختیار میں آزاد ہے اور اختیار کے حوالے سے اس میں اور حیوان میں فرق ہے۔ چنانچہ اسے حیوان کے ساتھ برابر کرنا جائز نہیں ہے، جسے کھینچنے والا جدھر چاہتا ہے کھینچتا ہے۔

جب اختیار میں انسان کی حالت یہ ہے تو عمل اور معاشی سرگرمی کے میدان میں بھی اس پر کوئی قید لگانا اور کسی حقیقی ضرورت کے بغیر اس کے ہاتھوں کو اپنی چاہت اور ارادے سے باندھ لینا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ پابندی لگانا اس کی انسانیت سے انکار کرنا ہے۔ اس مفہوم کو ہمارے فقہائے کرام نے بھی ملحوظ رکھا ہے۔ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ نے توحِجر علی السفیه [نادان پر پابندی] کو بھی جائز قرار نہیں دیا۔ ان کی دلیل یہی ہے کہ حجر میں اس کی آدمیت کا انکار ہے۔ اور یہ نادان کے لیے اس کے مال کے ضیاع سے زیادہ نقصان ہے۔

یہاں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ فرد اور جماعت سب کے لیے حکمت اسی میں ہے کہ فرد کی آزادی پر قیود لگائی جائیں اور ریاست کو یہ حق دیا جائے کہ وہ تمام افراد کے اعمال کا تعین کرے۔ یہ بات اس لیے درست نہیں ہے کہ انسان کی ضرورت صرف کھانا اور پیٹ بھرنا نہیں ہے بلکہ وہ آزادی کی تازہ ہوا کا بھی محتاج ہے جس سے اس کی روح سرشار ہو اور اس کے احساسات اور انسانی ہیئت کو اطمینان نصیب ہو۔ یہیں سے یہ بات ضروری ہوگئی کہ انسان کو عمل کی آزادی سے نوازا جائے۔ چنانچہ اسی کو اصل اور بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ رہی پابندی تو وہ ایک استثنائی صورت ہے جو صرف ضرورت کے وقت جائز ہو جاتی ہے۔

انسان کو عمل کی آزادی دینے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسانی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور اس کی قوت وقدرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر انسان وہی عمل اختیار کرنا چاہتا ہے جس کی طرف وہ رغبت رکھتا ہو اور جو اس کے رجحانات اور صلاحیتوں کے ساتھ مناسب ہو۔ چنانچہ وہ رغبت اور شوق سے اس کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح اس کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور اس کے کام میں برکت ہوتی ہے۔ اس سے وہ پورا معاشرہ بھلائی سے ہمکنار ہوتا ہے جس میں انسان رہتا ہے۔

اس کے برعکس جب فرد کو عمل میں آزادی سے محروم کیا جاتا ہے اور ریاست اس کے لیے عمل کا انتخاب کر کے اسے اس پر مجبور کرتی ہے تو اس سے افراد کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ اپنے مناسب عمل اپنا لے۔ اس سے افراد کی فطری صلاحیتیں مر جاتی ہیں اور ان کی کارکردگی کم ہو جاتی ہے۔ وہ اس کام کو قبول تو کر لیتے ہیں مگر مجبوراً اور ناپسندیدگی کے ساتھ۔ اس طرح ان کے عمل کا ثمرہ کم ہو جاتا ہے اور اس میں جدت کی بھی کمی ہو جاتی ہے۔ اس کا نقصان فرد کو بھی ہوتا ہے اور معاشرے کو بھی۔ مختصراً یہ کہ اسلام میں انسان اپنے اعمال اور اپنی پسند وناپسند کے بارے میں پوری طرح ذمہ دار ہے۔ چنانچہ انصاف کی بات یہی ہے کہ اسے اپنے پسندیدہ عمل کو اپنانے کی پوری آزادی دی جائے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جب لوگوں کی اقتصادی آزادی کا استعمال معاشرے کے لیے مضر ہو یا اس آزادی کے پیچھے جماعت کے لیے کوئی برا مقصد یا غلط ارادہ کارفرما ہو تو اس طرح کے حالات میں حکمران کو حق ہوتا ہے کہ وہ افراد کی آزادی میں دخل دے اور ان پر وہ چیز لازم کر دے جس کے ذریعے عام لوگوں سے ضرر کو دفع کیا جا سکے۔

اسی بنیاد پر بعض فقہا نے اجناسِ ضروریہ کی نرخ بندی کی اس صورت میں اجازت دی ہے جب تاجر

اس چیز کو اپنی معمول کی زیادہ سے زیادہ قیمت پر بھی فروخت کرنے سے انکار کر دیں۔ اسی طرح اگر کسی پیشے کے لوگ اپنے کام سے انکار کریں، حالانکہ لوگ ان کے کام کے ضرورت مند ہوں تو انھیں معقول اُجرت پر کام پر مجبور کرنا بھی جائز ہے۔[1]

۴۰۷- افراد کی آزادیِ عمل کا ایک حتمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشی میدان میں افراد کے درمیان اسلامی اخلاقیات کی فضا میں آزادانہ منافست اور مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر فرد کو حق ہوتا ہے کہ اپنی کارکردگی اور مشقت میں اضافہ کرے تاکہ عمل کے میدان میں دوسرے سے بازی لے جائے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اخلاقیات کا پورا پورا لحاظ کیا جائے۔ چنانچہ ملاوٹ، دھوکہ، لڑائی جھگڑا اور آزادانہ مقابلے کے نام پر نرخوں کو اس حد تک گرانا کہ اس سے دوسروں کا نقصان ہو، جائز نہیں ہوگا۔ اسی طرح کسی فرد یا گروہ کی طرف سے ذخیرہ اندوزی جس کا مقصد نرخوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا اور دوسروں کو نقصان پہنچانا ہو، نا قابل قبول ہوگا۔

۴۰۸- آزادیِ عمل کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اہلیت اور صلاحیت اور کام کے لیے کی گئی کوشش کے اختلاف کی بنا پر کمائی اور عمل کے ثمرات میں تفاوت پیدا ہوتا ہے۔ اسلام اس فطری تفاوت کی تائید کرتا ہے، بشرطیکہ یہ ایسے اسباب کی بنا پر سامنے آیا ہو جو جائز اور مباح ہوں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تفاوت لوگوں کی ذہانت، علم اور صلاحیتوں میں اختلاف کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَّرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ** (الزخرف ۴۳:۳۲) دنیا کی زندگی میں گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔ اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (اِن کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان رزق اور مال داری وغریبی کی تقسیم کرتا ہے، تاکہ وہ اسباب معیشت میں ایک دوسرے کے کام آئیں اور سب کی ضرورتیں پوری ہوں۔[2]

یہ فرق جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے یہ کچھ اسباب کی بنا پر ہے اور یہ اسباب بہت سارے ہیں جن کا

۱- الطرق الحکمیۃ لابن القیم الجوزیہ، ص ۲۲۶-۲۴۰

۲- تفسیر القرطبی، ج ۱۶، ص ۸۳

احاطہ ایک انسان نہیں کرسکتا۔ ان میں اہم ترین یہ ہے کہ لوگوں کی اہلیتوں اور صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس فرق کو اس وقت تک ختم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ لوگوں کی صلاحیتوں میں فرق موجود ہے۔ جو چیز ممکن اور مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ جو مال دار ہے وہ کمزور کی مدد کرے۔ اسی چیز کی اسلام تائید کرتا ہے اور اسی کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام نے ایسے ذرائع مقرر کیے ہیں جو عملی طور پر اسی چیز کو وجود میں لاتے ہیں۔

۲- انفرادی ملکیت کا حق

۴۱۰- یہ بات ان بدیہی امور میں سے ہے جسے اسلامی شریعت سے آگاہی رکھنے والا ایک چھوٹا سا طالب علم بھی بخوبی جانتا ہے کہ اسلام افراد کی انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی بنا پر فرد کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ مالک بنے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَآ أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ (یٰسٓ ۳۶:۷۱) کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے ہیں اور اب یہ ان کے مالک ہیں۔

یہاں اللہ نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں پر انسان کی ملکیت کو ثابت کیا ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (البقرۃ ۲:۲۷۹) اب بھی توبہ کرلو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اس آیت نے لوگوں کے لیے ملکیت کو ثابت کیا ہے اور مال کی نسبت ان کی طرف ملکیت و اختصاص کے طور پر کی ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (الانعام ۶:۱۵۲) اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔

نیز فرمایا: وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ (اللیل ۹۲:۱۷-۱۸) اور اس سے دور

رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیز گار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔

اور فرمایا: مَآ أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (اللھب ۱۱۱:۲) اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔

یہ اور اس طرح کی دوسری آیات ملکیت کی نسبت انسان کی طرف کرتی ہیں۔ یہ اس بات کی قطعی اور واضح دلیل ہے کہ اسلام انفرادی ملکیت کی تائید کرتا ہے۔

اس کے علاوہ سنت نبوی میں بے شمار احادیث ہیں جو اس چیز کی مزید تاکید کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث یہ ہے کہ لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبٍ مِّنْ نَّفْسِهٖ. کسی مسلمان کا مال اس کی دلی خوشی کے بغیر لینا جائز نہیں ہے۔

اسلام میں ایک ایسا نظام مقرر کیا گیا ہے جو انفرادی ملکیت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ان میں سے چند بنیادیں یہ ہیں: میراث، زکوٰۃ، حق مہر، نفقات وغیرہ۔ اگر انفرادی ملکیت کے حق کا اعتراف نہ کیا جائے تو میراث کے کوئی معنیٰ نہیں رہتے اور فریضہ زکوٰۃ کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی ہے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس

۴۱۱- انفرادی ملکیت کے ثبوت کے بارے میں جو شرعی دلائل ہیں وہ مال اور مال کے درمیان فرق نہیں کرتیں۔ مال خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، خواہ خوردنی چیز ہو یا ناخوردنی، خواہ حیوان ہو یا نبات اور خواہ ذریعۂ پیداوار ہو یا ذریعۂ نقصان۔ ملکیت کے حوالے سے مال کے بارے میں یہ سارا اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ مال کی نسبت فرد کی طرف بطور ملکیت واختصاص کی گئی ہے۔ اس کے بارے میں جو شرعی نصوص وارد ہوئی ہیں، جن میں سے بعض ہم نے یہاں ذکر کی ہیں، وہ مال کو کسی خاص صفت کے ساتھ متصف نہیں کرتیں، بلکہ وہ ہر قید سے آزاد ہیں۔ البتہ وہ قیود ضرور موجود ہیں جو دوسری نصوص سے معلوم ہوتی ہیں اور جن کی رو سے بعض چیزوں کی ملکیت حرام قرار پاتی ہے، جیسے شراب، سور، جبکہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی حرمت کسی اور سبب سے ہوتی ہے، اگرچہ وہ بذاتِ خود قابل ملکیت ہوتی ہیں، جیسے غصب کی ہوئی یا چوری کی ہوئی چیز وغیرہ۔

۴۱۲- انفرادی ملکیت کے حق کی بنیاد پر سارے لوگوں پر ایک عمومی ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ اس کا احترام کیا جائے اور ناحق طور پر اس پر دست درازی نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَأْكُلُوٓا

أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرة ۲:۱۸۸)اور تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے نہ کھاؤ۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰٓ أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا (النساء ۴:۲)اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے: لَايَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ مِّنْ نَّفْسِهِ. کسی مسلمان کا مال اُس کی دلی خوشی کے بغیر لینا جائز نہیں ہے۔

اسی طرح جو لوگ اس ذمہ داری کو ادا نہیں کرتے اور دوسرے کی ملکیت کے حق پر دست درازی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک سزا بھی مقرر کی ہے۔ چوری کے لیے ایک سزا مقرر ہے، ڈاکہ زنی کی بھی ایک سزا ہے۔ امانت میں خیانت، کسی کا مال لوٹنا اور اس قسم کی دوسری چیزیں قابل سزا جرائم میں شمار ہوتی ہیں، خواہ حد کی سزا ہو یا تعزیر کی۔

۴۱۳- اسلام میں انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ ہر قسم کی قید سے آزاد حق ہے اور اسلام کا اس کے بارے میں کردار ایک پہرہ دار کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اگرچہ انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے اور اس کی حمایت کرتا ہے مگر وہ اس ملکیت کی تنظیم کرتا ہے اور ابتدا سے انتہا تک اس کو چند قیود کے ساتھ مقید کرتا ہے۔ اس طرح اسلام انفرادی ملکیت کے حق میں دو موقف رکھتا ہے۔ ایک اس کا اعتراف اور حمایت اور دوسرا، کچھ قیود لگا کر اس کی تنظیم کرنا۔ اس تقیید کا اظہار درج ذیل پہلوؤں میں ہوتا ہے۔

۱- انفرادی ملکیت کی ابتدا

۴۱۴- اس کے لیے اسلام یہ شرط لگاتا ہے کہ انفرادی ملکیت کی ابتدا کسی جائز سبب سے ہونی چاہیے۔ اگر اس کا آغاز ناجائز ذریعے سے ہو تو اسلام اس کا نہ اعتراف کرتا ہے اور نہ حمایت، بلکہ وہ حکم دیتا ہے کہ یہ مال حامل کے ہاتھ سے لے کر اسے اصل مالک کو لوٹایا جائے۔ اگر مالک نہیں ملتا تو اسے بیت المال میں رکھا جائے۔

ملکیت کے جائز اسباب میں سے چند اسباب یہ ہیں:

(ا- **مباح (غیر مملوکہ) پر قابض ہونا**:- اس نوع میں شکار، غیر آباد زمین کی آبادکاری، صحرائی گھاس پھونس کا حصول اور معدنیات اور خزانوں کی دریافت وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ساری چیزیں کچھ متعین شرطوں کے ساتھ مشروط ہیں۔[1]

ب- **معاہدات اور تصرفات**:- جیسے خرید و فروخت، ہبہ، وصیت، اجارہ، شرکت، مضاربت، مزارعت و کاشتکاری وغیرہ۔ ان میں بھی شرط یہ ہے کہ یہ سارے عقود و تصرفات اسی کیفیت کے مطابق ہوں جسے اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔

ج- **میراث**:- اس میں وارث اپنے مورث کی ملکیت میں اس کا خلیفہ بن جاتا ہے۔ میراث بھی چند اسباب پر مبنی اور شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ اسباب و شروط اسلامی فقہ کی کتابوں میں معروف و متعین ہیں۔

یہ ہیں حق ملکیت کے آغاز کے شرعی اسباب۔ اگر حق ملکیت کا آغاز ان اسباب میں سے کسی سبب کے ساتھ ہوا تو اسلام اس کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ ملکیت کی کمیت اور نوعیت کو اہمیت نہیں دیتا۔ اس لیے کہ شریعت کی رو سے انفرادی ملکیت میں کمیت اور نوعیت کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ شرعی ہے یا نہیں۔ یعنی دیکھنے کے قابل چیز وہ سبب ہے جس سے ملکیت کا آغاز ہوا ہے۔ اگر سبب جائز ہے تو ملکیت جائز ہوگی اور اسلام اس کی حمایت کرے گا اور اگر سبب جائز نہیں ہے تو ملکیت بھی جائز نہیں ہوگی اور اسلام اس کی حمایت نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ملکیت کا سبب جائز ہو تو وہ زیادہ ملکیت کی بھی حمایت کرتا ہے اور سبب ناجائز ہو تو وہ تھوڑی ملکیت کے اعتراف اور حمایت سے بھی ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ اگر ملکیت کسی جائز سبب کی پیداوار ہو تو اسلام ایک وسیع و عریض رقبے کی ملکیت کو بھی تسلیم کرتا ہے مگر غصب کی ایک انچ زمین کی ملکیت کو بھی مسترد کرتا ہے۔ اس لیے کہ غصب ملکیت کا شرعی سبب نہیں ہے۔

۲- ملکیت کی بقاو نشو و نما کی قیود

۴۱۵- ملکیت کی بقاو نشو و نما کے لیے کچھ قیود مقرر ہیں جن کا اظہار ان حقوق میں ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ

۱- اس کی تفصیل ہماری کتاب المدخل لدراسۃ الشریعۃ الإسلامیۃ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (مؤلف)

نے انسان کے مال میں مقرر کی ہیں اور ان کی ادائیگی کو لازمی قرار دیا ہے۔ جیسے زکوٰۃ کا حق، شرعی نفقات کا حق وغیرہ۔ اسی طرح یہ قیود ملکیت کی بڑھوتری میں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ اسلام نے مال کو بارآور کرنے اور اسے نشوونما دینے کے لیے کچھ طریقے متعین کیے ہیں۔ ان میں مختلف قسم کی تجارتیں، مزارعت، شراکتیں اور اس طرح کے دوسرے امور شامل ہیں۔ اسلام اس نشوونما کو تسلیم نہیں کرتا جو باطل اور حرام سبب کی پیداوار ہو۔ جیسے سود کا کاروبار، شراب کی خرید و فروخت، قمار بازی کے اڈے کھولنا۔

ان حرام ذرائع سے جو نشوونما ہوئی ہے، اسلام کی نگاہ میں اس سوجھن کی طرح ہے جو مریض کے جسم میں پیدا ہوتی ہے۔ ناسمجھ لوگ اس کو صحت و عافیت خیال کرتے ہیں مگر ایک حکیم کی نظر میں وہ ایک مصیبت اور بیماری ہوتی ہے جس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

۳۔ ملکیتی مال کی تلفی کی قیود

۴۱۶۔ ملکیتی مال کو ہلاک کرنے کے بارے میں ان قیود کا اظہار اس چیز سے ہوتا ہے کہ اسلام نے خرچ میں اعتدال کو ضروری قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا** (الاعراف ۷:۳۱) کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: **وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا** (الفرقان ۲۵:۶۷) اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔

یہ اعتدال جس کا یہاں مطالبہ کیا جاتا ہے یہ مباحات یا انسان کی بنیادی ضرورتوں میں ہے، جیسے کھانا پینا وغیرہ۔ حرام اُمور میں خرچ کرنا تھوڑا ہو یا زیادہ، ممنوع ہے۔ چنانچہ حرام کردہ لذائذ جیسے فحاشی، شراب، رقص و سرود، مردوں کے لیے سونے کے لباس اور زیورات وغیرہ میں خرچ کرنا ممنوع ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن میں وہ سرمایہ دار لوگ عموماً مبتلا ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں نہیں رکھتے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں فحاشی پھیلتی ہے اور بہت سے ایسے گروہ پیدا ہوتے ہیں جو گمراہ سرمایہ داروں کے لیے یہ ناجائز امور انجام دیتے ہیں۔

۲-ضرورت و مصلحت کے وقت ملکیت سے محرومی

۴۱۷- جب کوئی عمومی مصلحت یا ضرورت درپیش ہو تو صاحب الملک کو اس کی ملکیت سے محروم کیا جاسکتا ہے مگر اسے اس کا عادلانہ عوض ملنا ضروری ہوگا۔ اس کے بارے میں فقہا نے بعض مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک مثال یہ ہے کہ عوامی سڑک کی توسیع کے لیے کسی کی زمین قبضے میں لے لی جائے۔ اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ صاحب ملک پر کسی کا قرض واجب الادا ہے تو اس کی ادائیگی کے لیے صاحب ملک کو اپنی ملکیت بیچنے پر مجبور کیا جائے۔

۳-حق وراثت

۴۱۸- اسلامی شریعت میں جو چیزیں متعین ہیں ان میں سے ایک حق وراثت ہے۔ جب ایک شخص فوت ہوتا ہے اور اس کا مال باقی رہ جاتا ہے تو اس کے رشتے دار درجہ بدرجہ اس کے وارث بن جاتے ہیں۔ اگر شریعت اسلامی میں مقررہ قواعد کے مطابق میراث کی شرائط واسباب موجود ہوں اور اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو رشتے داروں میں سے جو میراث کے مستحق ہوتے ہیں ان کو میت کے ترکہ میں سے کچھ مقررہ حصے مل جاتے ہیں۔

حق وراثت کی بنیاد فطرت، عدل اور مالک کے ارادے کے احترام پر قائم ہے۔ یہ حق آدمی کو مزید محنت، مشقت اور سرگرمی پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ ایک خاندان کے افراد کے لیے اجتماعی کفالت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس سے سرمایہ تقسیم ہوتا رہتا ہے اور کساد بازاری پیدا نہیں ہوتی۔ ان سارے امور کی بنا پر یہ اسلام کے اقتصادی نظام کا ایک عظیم اصول ہے۔

۴۱۹- اب رہی یہ بات کہ اس کی بنیاد فطرت پر قائم ہے تو ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ جو شخص اپنی اولاد کو غربت کی حالت میں چھوڑ کر جارہا ہو تو ان کے بارے میں پریشان اور فکرمند ہونا انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے اتنا کچھ مہیا کر کے جائے جو اس کی موت کے بعد ان کے کام آئے۔

رہی یہ بات کہ اس کی بنیاد عدل پر قائم ہے تو انسان جب تک زندہ ہوتا ہے، اپنی اولاد اور ان لوگوں کی

کفالت کرتا ہے جن کی کفالت کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے جیسے ماں، باپ، بیوی وغیرہ۔ بعض اوقات اگر وہ اس نفقہ سے انکار کرتا ہے تو عدالت کی جانب سے اس پر یہ نفقہ لازم بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر اکثر اوقات کوئی اس سے انکار نہیں کرتا۔ چنانچہ عدل کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی موت کے بعد بھی اس کا مال انھی لوگوں کو مل جائے جن کے وجود کا یہ سبب تھا جیسے اولاد، یا جو اس کے وجود کا سبب تھے جیسے ماں باپ۔ یہ مال ان کو اس لیے ملنا چاہیے تاکہ وہ مورث کی موت کے بعد اس کے مال سے اسی طرح مستفید ہوں جس طرح اس کی زندگی میں وہ ان پر خرچ کرتا تھا۔

۴۲۰- رہی یہ بات کہ میراث کی بنیاد مالک کے ارادے کا احترام ہے تو انسان کے دل کی یہ ایک بہت بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کا مال اس کے رشتے داروں کا ہو نہ کہ کسی اور کا۔ چنانچہ اس کے ارادے کا احترام اور اس کی موت کے بعد اس کا مال اس کے ورثا کو دینا ضروری ہے۔ اسلامی شریعت نے اس کو پوری طرح واضح کیا ہے۔ چنانچہ اس نے ان رشتے داروں کے حصے پوری دقت اور عدل کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان اس بات سے خوش اور راضی ہوتا ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کا مال شریعت کی اس عادلانہ تقسیم کے مطابق اس کے ورثا کو مل جائے۔

۴۲۱- پھر یہ بات کہ میراث کا اصول مزید سرگرمی اور محنت پر آمادہ کرتا ہے تو یہ ایک کھلی بات ہے۔ اس لیے کہ انسان صرف اپنے لیے کام نہیں کرتا بلکہ اپنے خاندان کے ان افراد کے لیے بھی کرتا ہے جو اس کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتا ہے تو اپنے ساتھ ان کی ضروریات بھی پوری کرتا ہے۔ پھر جس طرح کہ وہ ان کی موجودہ ضروریات کے لیے کام کرتا ہے اسی طرح وہ کچھ محنت ان امور میں بھی خرچ کرتا ہے جو مستقبل میں ان کی ضروریات پوری کرنے کے کام آ سکیں۔ اگر زندہ رہتا ہے تو بذات خود ان کے اخراجات برداشت کرتا ہے اور اگر مر جائے تو جو مال ترکہ میں رہ جاتا ہے رشتہ دار اس میں سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری اُٹھا لیتے ہیں۔ اس بنا پر اگر وراثت کو ممنوع کیا جائے تو کام میں انسان کی ہمت کمزور پڑ جائے گی اور اس کی معاشی سرگرمی کم ہو جائے گی۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کی محنت کا پھل اس کے خاندان کے افراد کی طرف نہیں لوٹتا، جن کے بارے میں یہ فکر مند ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب افراد اپنے اپنے کام میں سستی کریں گے اور اپنی وسعت کے مطابق محنت اور اقتصادی

سرگرمی نہیں دکھائیں گے تو اس سے معاشرے کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔

میراث کا اصول خاندان کے اندر اجتماعی کفالت کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔ اس لیے کہ جب ان میں سے ایک شخص فوت ہوتا ہے اور وہ کوئی مال چھوڑ جاتا ہے تو اس سے خاندان کے زندہ افراد کو کچھ مال مہیا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نہ کوئی بچہ بے یار و مددگار رہ جاتا ہے، نہ یتیم اور نہ بیوہ۔ یہ لوگ معاشرے پر بوجھ نہیں بن جاتے۔ اس طرح میراث کی وجہ سے ریاست کے سر سے محتاجوں کی ضروریات پوری کرنے کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

۴۲۲- میراث سے مال تقسیم ہوتا ہے اور مال چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہیں رہ جاتا۔ اس لیے کہ ایک شخص کی موت کے بعد اس کا ترکہ اس کے رشتے داروں میں سے ایک سے زائد لوگوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان اس دنیا میں ہمیشہ نہیں رہتا اور اس کی عمر بھی عموماً کم ہی ہوتی ہے جو چند عشروں سے زیادہ نہیں ہوتی، اس لیے وہ سرمایہ جسے انسان اپنی زندگی میں جمع کرتا ہے، ضروری ہے کہ کچھ عرصے بعد یہ تقسیم ہو جائے۔ بڑے بڑے سرمایوں کی تقسیم اسلام میں پسندیدہ ہے اور اس کے لیے کئی پر امن اور قابل عمل راستے تجویز کیے گئے ہیں۔ ان میں نہ کسی تشدد کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ پریشانی کی۔ انھی راستوں میں سے ایک راستہ میراث ہے۔

۴۲۳- آخری بات یہ ہے کہ اسلام میں میراث کی تنظیم انتہائی باریک بینی اور عدل کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس کی مثال دنیا کے کسی اور قانون میں نہیں ملتی۔ اس میں میت کے ساتھ وارث کے قرب، اس کی ضرورت، اس کی ذمہ داریوں اور مورث کے ساتھ اس کی مدد کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ ان اور ان کی طرح دوسرے امور کو مدنظر رکھ کر مختلف وارثوں کے لیے میراث کے حصے مقرر کیے گئے ہیں۔ اس اختلاف کی ایک مثال یہ ہے کہ بیٹے کے لیے بیٹی کے مقابلے میں دگنا حصہ مقرر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (النساء۴:۱۱)
تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تعالیٰ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بیٹے کو بیٹی کی نسبت مال کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے اوپر مالی ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ نکاح میں مہر کی ادائیگی مرد کرتا ہے نہ کہ عورت۔ اسی طرح مرد ہی اپنی بیوی پر خرچ

کرنے کا پابند ہے، نہ کہ عورت مرد پر خرچ کرنے کی۔ چنانچہ عدل کی بات یہی ہے کہ میراث میں مرد کا حصہ اپنی بیوی کے مقابلے میں دگنا ہو۔

۳- بیت المال اوراس کی مداتِ آمد وخرچ

۱- بیت المال کے ذرائعِ آمدنی

۴۲۴- یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حکومت کو اپنے مختلف اخراجات پورے کرنے کے لیے بہت سے سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے۔ان اخراجات کو وہ متعدد ذرائع سے پورا کرتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اسلامی معاشرے کی ضروریات کم تھیں۔اس لیے کہ اُس وقت ایسے ملازمین نہیں تھے جن کے دائمی اور منظّم وظیفے مقرر ہوں۔اس وقت اگر کوئی شخص ریاست کا کوئی کام سرانجام دیتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اپنے کام کی مزدوری عنایت فرما دیتے۔مثال کے طور پر زکوٰۃ جمع کرنے والوں کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب زکوٰۃ جمع ہونے کا کام مکمل ہوجاتا تو اس کے ساتھ مزدوری کا سلسلہ بھی منقطع ہوجاتا۔ جہاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو نکل کھڑے ہونے کی اپیل کرتے تھے اور لوگ اپنا اپنا اسلحہ اور سواریاں لے کر نکل جاتے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے۔اگر کوئی غنیمت ہاتھ آتا تو آپؐ اسے ان کے درمیان تقسیم فرما دیتے۔اسی طرح زکوٰۃ کا مال جب آجاتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بھی مستحقین میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ریاست کی آمد وخرچ کے لیے اس طرح کی کوئی جدول تیار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی جیسا کہ بعد کے ادوار میں ہوا۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ آئے اور وہ بھی پرانے ڈگر پر چل پڑے۔ چنانچہ انھوں نے بھی آمد وخرچ کو منضبط نہیں کیا۔ کیوں کہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ ان کا دور خلافت بھی مختصر تھا۔ پھر جب حضرت عمرؓ کا دور آیا اور اسلامی ممالک کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے روم وفارس کے ممالک کے دروازے کھول دیے۔ غنیمت، فے اور جزیہ کی صورت میں ریاست کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا۔ اس طرح حضرت عمرؓ نے کوئی ایسا طریقہ سوچنا شروع کیا جس سے ان لاتعداد اموال کا حساب رکھا جاسکے اور ان کے خرچ کا بھی ریکارڈ رکھا جاسکے۔ چنانچہ انھوں نے بیت المال کا صیغہ قائم کیا۔ اس سے مسلمانوں کے اموال کی حفاظت کی جاتی تھی مختلف ذرائع سے موصول ہونے والی اسلامی

ریاست کی آمدنی کا حساب لگایا جاتا تھا۔ اس کے خرچ کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا اور اخراجات کی مقدار معلوم کی جاتی تھی۔ جیسے فوجیوں، عمال اور گورنروں کے وظائف اور مفاد عامہ اور ریاستی ضروریات پر خرچ کے دوسرے ذرائع۔ خرچ کے ان ذرائع سے جو اموال باقی بچتے تھے انھیں بیت المال میں محفوظ کیا جاتا اور اپنے موقع پر خرچ کیا جاتا۔

چنانچہ اس وقت کا بیت المال عصر حاضر کے سرکاری خزانے کی طرح ایک ادارہ تھا۔ اس لیے کہ ریاست کو جو بھی مالی حقوق موصول ہوتے ہیں تو وہ خزانے میں جمع کیے جاتے ہیں اور انھیں خزانے کا حق سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ریاست کو جن اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی خزانہ ہی برداشت کرتا ہے اور انھیں برداشت کرنا خزانے کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔

۴۲۵- اسلامی ریاست یعنی بیت المال کی آمدنی زکوٰۃ، خراج، جزیہ، عشر، فے، خمس اور اس طرح کی دیگر چیزیں ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اولاً: زکوٰۃ[1]

۴۲۶- زکوٰۃ نمو اور بڑھوتری سے ماخوذ ہے۔ شریعت میں یہ وہ حق ہے جو مال میں واجب ہوتا ہے۔ یہ اسلام کے فرائض اور ارکان میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰتُوا الزَّكَاةَ (البقرۃ ۲:۴۳) اور زکوٰۃ دیا کرو۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تو ان سے فرمایا: أَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ فِي فُقَرَائِهِمْ. ان لوگوں کو بتادو کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے۔ یہ ان کے مال داروں سے لیا جائے گا اور ان کے غریبوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

مسلمانوں کا اس کے وجوب پر اجماع ہے اور صحابہ کا ان لوگوں کے خلاف جنگ پر اتفاق ہوا جنھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا۔ اس بنا پر جو اس کے وجوب سے انکار کرتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ جس نے اس کے وجوب کا اقرار کرتے ہوئے اس کی ادائیگی سے انکار کیا اور حکمران اس بات پر قادر ہو کہ اُس سے

۱- اس عنوان کے تحت جو مباحث ہیں وہ المغنی لابن قدامہ، ج ۲، ص ۵۷۲ اور مابعد سے ماخوذ ہیں۔ (مولف)

زبردستی زکوٰۃ لے تو ایسا ہی کرے گا اور زکوٰۃ سے انکار کی بنا پر اسے تعزیر دی جائے گی۔ اگر ایسا شخص حکمران کی قدرت سے باہر ہو تو اس کے خلاف جنگ کرے گا جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنا یہ مشہور قول ارشاد فرمایا کہ **لَوْمَنَعُوْنِيْ عَقَالًا كَانُوْا يُؤَدُّوْنَهٗ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلَيْهِ**. اگر یہ لوگ مجھ سے مہار کی وہ رسی بھی روک لیتے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس پر ان کے خلاف ضرور جنگ کرتا۔

۴۲۷- زکوٰۃ ہر مسلمان مرد اور عورت پر واجب ہے۔ جب ایک شخص نصاب کا مالک بن جائے اور اس پر قرض نہ ہو تو ایک سال مکمل ہونے پر اس کی زکوٰۃ لازم ہو جاتی ہے، خواہ کوئی بڑا ہو یا چھوٹا اور عقل مند ہو یا دیوانہ۔ جس مال پر سال نہ گزرا ہو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

یہ بات حیوانات، سونے، چاندی اور سامان تجارت کی قیمت کے بارے میں ہے۔ رہا زرعی پیداوار، پھلوں اور معدنیات کا معاملہ، تو ان میں سال گزرنے کی شرط نہیں ہے۔ سال گزرنے پر زکوٰۃ لازم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر صاحب نصاب کی کوتاہی یا کسی اور وجہ سے اس کا مال تلف ہو گیا تب بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر نصاب تلف ہو گیا تو خواہ وہ کسی صورت میں بھی ہو، زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی، سوائے اس کے کہ امام نے اس سے زکوٰۃ مانگی ہو اور اس نے دینے سے انکار کیا ہو۔

زکوٰۃ موت کی بنا پر بھی ساقط نہیں ہوتی۔ احناف نے موت کی صورت میں بھی اس کے ساقط ہونے کی بات کی ہے، سوائے اس کے کہ اس نے وصیت کی ہو، تب ایک تہائی مال میں سے اسے ادا کیا جائے گا۔

اسلامی حکومت اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کر کے اسے مستحقین میں تقسیم کرے گی۔ اموال ظاہرہ سے مراد مویشی اور زرعی پیداوار ہے۔ اموالِ باطنہ جیسے سونا، چاندی اور اموال تجارت کی زکوٰۃ نکالیں گے، سوائے اس کے کہ وہ اپنے مال حکمران کو دے دیں، تب حکمران اسے مستحقین میں تقسیم کرے گا۔ میرے خیال میں حکمران کے لیے اموال باطنہ کی زکوٰۃ ابتداءً وصول کرنا اور اسے مستحقین میں تقسیم کرنا بھی جائز ہے۔

۴۲۸- زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی مقدار مختلف اموال کے لیے مختلف ہوتی ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱-مویشیوں کا نصاب[۱]

۴۲۹-اس میں اونٹ، گائیں اور بکریاں شامل ہیں۔

(ا)اونٹوں کا نصاب

اونٹوں کی تعداد	مقدارِ زکوٰۃ
۵-۹	بھیڑوں میں سے جذعہ اور بکریوں میں ثنیہ۔ بھیڑ بکریوں میں سے جذعہ اس کو کہتے ہیں جو چھ مہینے کی عمر کو پہنچ چکا ہو اور ثنیہ وہ ہوتا ہے جس کا ایک سال مکمل ہو چکا ہو۔
۱۰-۱۴	۲ بھیڑ بکریاں
۱۵-۱۹	۳ بھیڑ بکریاں
۲۰-۲۴	۴ بھیڑ بکریاں
۲۵-۳۵	اونٹوں میں سے بنت مخاض، جس کا ایک سال مکمل ہو چکا ہو۔ اگر بنت مخاض موجود نہ ہو تو ابن لبون دے دیں۔
۳۶-۴۵	بنت لبون، جس کے دو سال مکمل ہو چکے ہوں۔
۴۶-۶۰	حِقہ، جس کے تین سال مکمل ہو چکے ہوں اور وہ سواری اور جفتی کے قابل ہو۔
۶۱-۷۵	جذعہ، جس کے چار سال مکمل ہو چکے ہوں۔
۷۶-۹۰	۲ بنت لبون
۹۱-۱۲۰	۲ حقہ
۱۲۱-۱۳۹	۳ بنت لبون
۱۴۰-۱۳۹	۲ حقے اور ایک بنت لبون
۱۵۰-۱۵۹	۳ حقے
۱۶۰-۱۶۹	۴ بنت لبون

۱- اس بحث کے ضمن میں جو معلومات دی گئی ہیں وہ ان مصادر سے ماخوذ ہیں: المغنی، ج ۲، ص ۵۸۰ و مابعد، ابویعلیٰ الحنبلی، ص ۹۹ و مابعد، الماوردی، ص ۱۰۹، و مابعد۔

۱۷۰-۱۷۹ ایک حقہ اور ۳ بنت لبون

۱۸۰-۱۸۹ ۲ حقے اور ۲ بنت لبون

۱۹۰-۱۹۹ ۳ حقے اور ایک بنت لبون

۲۰۰ ۴ حقے یا ۵ بنت لبون

اگر تعداد اس سے بڑھ جائے تو اسی پر قیاس کریں گے۔ اس طرح ہر چالیس میں سے ایک بنت لبون اور پچاس میں سے ایک حقہ دینا پڑے گا۔ حنفیہ، امام ثوریؒ اور امام نخعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اونٹوں کی تعداد جب ۱۲۰ سے بڑھ جائے تو فریضے کا نئے سرے سے آغاز ہوگا۔ چنانچہ ہر پانچ اونٹوں میں ایک بھیڑ بکری ہوگی۔ یہ سلسلہ ۱۴۵ تک جائے گا۔ اس کے بعد ۱۵۰ تک ۲ حقے اور ایک بنت مخاض ہوگا۔ اس کے بعد ۳ حقے ہوں گے۔ اور ایک بار پھر فریضہ نئے سرے سے شروع ہوگا۔ چنانچہ ہر پانچ میں سے ایک بھیڑ بکری دینی ہوگی۔

اس کے علاوہ اونٹوں کی زکوٰۃ میں نصاب اور سال گزرنے کے بعد ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ اونٹ سائمہ ہوں، یعنی صحرا میں چرتے ہوں۔ اس صورت میں ان کی مشقت کم ہوتی ہے۔ امام مالکؒ سے روایت ہے کہ اونٹوں کی زکوٰۃ کے لیے چرنا شرط نہیں ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک چارہ کھانے والے اور کام والے اونٹوں پر بھی یہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ پانچ اونٹوں سے کم میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔

۴۳۰-ب: گائے بھینسوں کا نصاب

تعداد زکوٰۃ

۳۰-۳۹ تبیع (نر) جس کا ایک سال مکمل ہو چکا ہو اور دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ اگر مادہ تبیعہ دی گئی تب بھی قبول ہوگی۔

۴۰-۵۹ مادہ مُسِنّہ، جس کے دو سال مکمل ہو چکے ہوں۔ اگر مادہ مسنہ نہ ملے تو نر مُسِن بھی قبول ہوگا۔

۶۰-۶۹ ۲ تبیع

۷۰-۷۹ ایک مسنہ اور ایک تبیع

۸۰-۸۹ ۲ مسنہ

۹۹-۹۰	۳تبیع
۱۰۹-۱۰۰	ایک مسنہ اور ۲تبیع
۱۱۹-۱۱۰	۲مسنہ اور ایک تبیع
۱۲۰	۳مسنہ یا ۴تبیع

اس کے اوپر جو اضافہ ہوتا ہے وہ اسی پر قیاس ہوگا۔ ہر تیس میں سے ایک تبیع اور ہر چالیس میں سے ایک مُسِنہ۔ گائے بھینسوں میں نصاب اور سال گزرنے کے ساتھ ساتھ چرنا بھی شرط ہے۔ اور امام مالک سے مروی ہے کہ یہ شرط نہیں ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک چارہ کھانے والے اور کام کرنے والی گائے بھینسوں میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، جیسا کہ انھوں نے اونٹوں کے بارے میں فرمایا ہے۔ نصاب کی گنتی میں بھینسوں کو گائیوں کے ساتھ ملایا جائے گا۔ تیس سے کم گائے بھینسوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

۴۳۱-ج: بھیڑ بکریوں کا نصاب

تعداد	زکوٰۃ
۱۲۰-۴۰	۶ ماہ سے ایک سال تک کی بھیڑ بکری۔ اگر سارے جانور ۶ ماہ سے کم ہوں تو پھر انھی میں سے ایک لیا جائے گا۔
۲۰۰-۱۲۱	۲ بھیڑ بکریاں
۳۹۹-۲۰۱	۳ بھیڑ بکریاں
۴۰۰	۴ بھیڑ بکریاں

جب چار سو سے زائد ہو جائیں تو پھر ہر ۱۰۰ میں سے ایک بکری دینی ہوگی۔ نصاب کی گنتی میں بھیڑوں کو بکریوں کے ساتھ ملایا جائے گا۔ بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ میں چرنے کی شرط موجود ہے۔

۲- زرعی پیداوار اور پھلوں کی زکوٰۃ

۴۳۲- زمین سے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے، جو خشک ہو کر باقی رہ جاتا ہے اور جسے کیل کے ذریعے ناپا جاتا ہے، یہ جب پانچ وسق یا اس سے زیادہ ہو جائے تو اس میں عشر ہے۔[1] شرط یہ ہے کہ اس کی سیرابی بارش یا دریا سے ہوتی ہو۔ اگر سیرابی کا ذریعہ کوئی مصنوعی آلہ، ڈول، رہٹ یا کوئی ایسی چیز ہو جس

میں مشقت ہوتی ہے تو اس میں نصف عشر ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر اس چیز میں زکوٰۃ واجب ہے جس کی کاشت سے مقصود زمین کی نشوونما ہو، سوائے لکڑی، بانس اور گھاس کے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ الْعُشْرُ. ہر اس چیز میں عشر واجب ہے جو بارش سے سیراب ہو۔

یہ ارشاد عام ہے اور اس سے مقصود زمین کی نشوونما ہے، اس لیے یہ بھی غلہ کے مشابہ ہوگیا۔ پھر عشر قلیل اور کثیر سب میں واجب ہو جاتی ہے۔ اس میں پانچ وسق کی قید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ زرعی پیداوار میں سال گزرنے کی قید نہیں اس لیے اس میں نصاب بھی معتبر نہیں ہے۔

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ صَدَقَةٌ. پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں ہے۔

یہ ایک صحیح حدیث ہے اور اس میں خاص حکم بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اسے اس حدیث پر ترجیح دی جائے گی جس سے احناف نے استدلال کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ عام ہے اور جب خاص حکم وارد ہو جائے تو وہ عام حکم میں تخصیص کر دیتا ہے۔

رہی یہ بات کہ اس میں سال گزرنا شرط نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے زرعی پیداوار میں ترقی اس کے کاٹنے سے ہوتی ہے نہ کہ بقا سے۔ زرعی پیداوار کے علاوہ اشیا میں سال گزرنا اس لیے معتبر ہے کہ اُس میں سال گزرنے سے نشوونما کے کمال کا امکان ہوتا ہے۔ اسی طرح غیر زرعی اشیا میں نصاب اس لیے معتبر ہے کہ مال ایک ایسی حد کو پہنچے جہاں اس میں سے زکوٰۃ لی جا سکے۔ یہ مفہوم زرعی اور غیر زرعی تمام اشیا میں معتبر ہے۔[2]

۳- سونے چاندی کی زکوٰۃ

۴۲۳- ان دونوں کی زکوٰۃ میں نصاب اور سال گزرنا شرط ہے۔ چاندی کا نصاب ۲۰۰ درہم ہے اور

ا- وسق کا اندازہ ۶۰ صاع کے ساتھ لگایا گیا ہے اور صاع موجودہ دور کے تقریباً ڈیڑھ کلو کے برابر ہے۔ کیوں کہ صاع کا اندازہ انسانی ہاتھ کے چار چلوؤں سے کیا گیا ہے۔ [مؤلف] گویا موجودہ دور میں ایک وسق تقریباً ۹۰ کلو کے برابر ہوگیا۔ اس طرح مذکورہ بالا رائے کے مطابق زرعی پیداوار کا نصاب تقریباً ۴۵۰ کلو یعنی سوا گیارہ من بنتا ہے۔ (مترجم)

۲- المغنی، ج ۲، ص ۶۹۶

اس میں پانچ درہم واجب ہیں۔ سونے کا نصاب ۲۰ مثقال ہے اور اس میں نصف مثقال واجب ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص دراہم اور دنانیر کے ساتھ تجارت کرتا ہے تو سال گزرنے پر اگر وہ نصاب کے برابر ہے تو ان دراہم اور دنانیر کی زکوٰۃ بھی دے گا اور ان کی کمائی کی بھی۔

خاتون کے زیورات اگر عمومی استعمال میں ہوں یا اسے دوسروں کو عاریتاً دیے جاتے ہوں تو ان میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ بعض اہل علم کا مذہب یہ ہے کہ اس میں بھی زکوٰۃ ہے۔

۴- معدنیات کی زکوٰۃ

۴۳۴- یہ اموال ظاہرہ میں سے ہیں۔ ان میں سے جو بھی نکل آئے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ خواہ ٹھوس معدنیات ہوں جیسے سونا، چاندی اور لوہا وغیرہ، یا مائع معدنیات ہوں جیسے تارکول اور تیل وغیرہ، یا پھر ایسے معدنیات جو پتھر کی مانند ہوں اور کوٹنے سے ٹوٹ جاتے ہوں، جیسے جواہر وغیرہ۔ ان میں سے زکوٰۃ کے وجوب کے لیے شرط یہ ہے کہ چھاننے اور صاف کرنے کے بعد نصاب کے برابر ہوں۔

نصاب کی مقدار سونے میں سے ۲۰ مثقال اور چاندی میں ۲۰۰ درہم ہے۔ اگر سونے چاندی کے علاوہ کوئی مال ہو تو اس میں نصاب کی قیمت معتبر ہوگی۔ معدنیات میں زکوٰۃ کے لیے بھی سال گزرنے کی شرط نہیں ہے۔ اس میں زکوٰۃ کی مقدار ڈھائی فی صد ہی ہے۔ جب کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معدنیات خواہ کم ہوں یا زیادہ، اس میں ۲۰ فی صد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس میں نصاب کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس بنا پر کہ یہ رکاز ہے اور رکاز میں خمس واجب ہوتا ہے۔ اور چونکہ اس میں سال گزرنے کی شرط نہیں ہے اس لیے اس میں نصاب کا اعتبار بھی نہیں کیا گیا۔

سمندر سے نکلی ہوئی چیزوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، جیسے یاقوت و مرجان۔ امام احمد بن حنبلؒ سے مروی ہے کہ اس میں بھی زکوٰۃ ہے اس لیے کہ یہ بھی معدنیات سے نکلتی ہیں۔

۵- رکاز کی زکوٰۃ

۴۳۵- رکاز اس مال کو کہتے ہیں جو ماقبل اسلام جاہلی نوعیت کی چیز ہو اور کسی غیر آباد زمین یا ایک ایسے راستے میں مدفون پائی جائے جو پانے والے کی ملکیت ہو۔ اس پر بھی خمس واجب ہوگا۔ اس کی دلیل رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ یعنی رکاز میں خمس ہے۔

یہ خمس اس شخص پر واجب ہوتا ہے جسے یہ رکاز ملا ہو، خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی، چھوٹا ہو یا بڑا، اور اسی طرح خواہ عقل مند ہو یا دیوانہ۔ اس لیے کہ یہ حدیث عام ہے۔ اس کے جاہلی ہونے کا علم اس بات سے ہوگا کہ اس میں جاہلیت کی کوئی نشانی موجود ہو۔ جیسے بت کی تصویر، کسی کافر بادشاہ کا نام یا ماقبل اسلام کی قدیم تاریخ درج ہو۔ لیکن اگر اس میں اسلامی ہونے کی کوئی نشانی موجود ہو، مثلاً اس میں کوئی قرآنی آیت درج ہو یا اس پر ہجری تاریخ درج ہو تو وہ لقطہ ہے اور اس پر لقطہ ہی کے احکام جاری ہوں گے۔

رکاز اگر کسی مملوکہ زمین میں نکل آئے تو وہ زمین کے مالک کے لیے ہوگا۔ اس میں پانے والے کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس میں بھی مالک پر خمس واجب ہوگا۔

۶۔ سامان تجارت کی زکوٰۃ

۴۳۶۔ سامان تجارت کی مختلف قسمیں ہیں۔ ان میں بعض کا تعلق نباتات سے ہوتا ہے اور بعض جانور ہوتے ہیں۔ اسی طرح جایداد سے بھی تجارت کی جاتی ہے اور دیگر تمام اشیا جن کے ذریعے نفع کی امید کے ساتھ تجارت کی جاتی ہے۔ تجارت کا مال بھی جب نصاب کی مقدار تک پہنچ جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس کے نصاب کا اندازہ سونے یا چاندی کے ساتھ قیمت لگانے سے لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جب اس پر سال گزر جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ سال کے درمیان میں اس مال کا نصاب سے کم یا زیادہ ہونا قابل التفات نہیں ہے۔ بس یہی کافی ہے کہ سال کے شروع میں اور اس کے اختتام پر نصاب برابر ہو۔ نشو و نما یعنی کمائی کو سال کے آخر میں قیمت لگاتے وقت اصل سامان تجارت کے ساتھ ملایا جائے گا۔

ثانیاً: جزیہ

۴۳۷۔ جزیہ اس مال کو کہتے ہیں جو متعین مقدار میں ذمیوں سے لیا جاتا ہے۔ یہ فی کس ٹیکس ہوتا ہے جو غیر مسلموں پر اسلامی حکومت کے ذمے میں داخل ہونے یعنی ذمی بننے سے اسلامی حکومت کو دینا لازم ہوتا ہے۔

جزیہ کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ (التوبۃ ۹:۲۹) جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (اُن سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اور سنت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ غیر مسلم سے جزیہ لیا جائے گا۔[1]

۴۳۸- جزیہ واجب ہونے کے لیے عقل، بلوغ اور مرد ہونا شرط ہے۔ چنانچہ بچوں، عورتوں اور دیوانوں پر جزیہ لازم نہیں ہوگا۔ اسی طرح اس کے وجوب کے لیے معذوری، اندھے پن اور بڑھاپے سے محفوظ ہونا بھی شرط ہے۔ چنانچہ معذور، نابینا اور بوڑھے پر جزیہ واجب نہیں ہوگا۔ اسی طرح راہب پر بھی جزیہ واجب نہیں ہوگا۔ بعض فقہا کے نزدیک راہب پر ہر حال میں جزیہ واجب ہوتا ہے۔ جب کہ بعض کہتے ہیں کہ اگر وہ عام لوگوں کے ساتھ خلط ملط ہو جائے یا وہ کام کاج پر قادر ہو تو پھر اس پر بھی جزیہ واجب ہوگا ورنہ نہیں۔

۴۳۹- جزیہ سال کے آخر میں واجب ہوگا اور اس کے آخر میں لیا جائے گا۔ حنفیہ کے نزدیک یہ سال کے آغاز میں واجب ہوتا ہے اور اس کے آخر میں لیا جائے گا۔ جزیہ کی مقدار غریب محنت کش کے لیے ۱۲ درہم ہے۔ درمیانے درجے کے لوگوں کے لیے ۲۴ درہم اور مال داروں کے لیے ۴۸ درہم ہے۔ بعض فقہا کے نزدیک اس کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے۔ مقدار کا مسئلہ حاکم وقت اپنے اجتہاد اور صوابدید کے مطابق طے کرے گا۔

۴۴۰- اگر ذمی اسلام قبول کریں یا اسلامی حکومت ذمیوں کی حفاظت کرنے سے عاجز آ جائے تو ان پر سے جزیہ کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے شام کے ایک شہر میں ذمیوں کو ان کا جزیہ لوٹا دیا تھا۔ کیوں کہ اسلامی فوج ان کی حفاظت سے معذور تھی۔[2]

اسی طرح حضرت خالد بن ولیدؓ نے حیرہ کے علاقے میں قس ناطف کے نمائندہ صلوبا بن نسطونا کے ساتھ جو صلح کی تھی اس میں ہے کہ اگر ہم نے تمھاری حفاظت کی تو ہم جزیہ کا مطالبہ کریں گے اور اگر ہم تمھاری

۱- المغنی، ج ۸، ص ۴۹۶، الجصاص، ج ۳، ص ۹۲-۹۳، اختلاف الفقہاء للطبری، ص ۱۹۹

۲-۱- الخراج لابی یوسف، ص ۱۳۹

حفاظت نہ کر سکے تو پھر نہیں، یہاں تک کہ ہم تمھاری حفاظت کر پائیں۔[1]

ثالثاً: خراج

۴۴۱-خراج کافروں کی اس مال کو کہتے ہیں جو اُن زمینوں پر لگایا جاتا ہے جنھیں جنگ کے ذریعے بطور غنیمت حاصل کیا گیا ہو اور پھر انھی کے ہاتھ میں چھوڑ دی گئی ہوں۔[2] چنانچہ یہ ایک مالی ٹیکس ہے جو ایسے مفتوحہ اراضی پر لگایا جاتا ہے جنھیں مسلمانوں نے کافروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا ہو، وہ اس میں کاشت کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

یہ کام سب سے پہلے جس نے کیا وہ امام راشد حضرت عمر بن الخطابؓ تھے۔ انھوں نے عراق کی زمین پر خراج مقرر کیا اور انھیں اپنے مالکوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا۔ یہ فیصلہ انھوں نے صحابہ کرامؓ کی مشاورت سے کیا تھا۔ صحابہ نے [طویل بحث کے بعد] ان کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ جس زمین پر خراج مقرر ہو جاتا ہے اسے خراجی زمین کہتے ہیں۔

۴۴۲-خراج کی دو قسمیں ہیں: ایک خراج وظیفہ، اور یہ وہ خراج ہے جو کسی زمین پر اس کے رقبے اور زراعت کی نوعیت کے لحاظ سے لگایا جاتا ہے۔ دوسرا خراج مقاسمہ، اور یہ وہ خراج ہے جس میں پیداوار کا ایک حصہ مقرر کیا جاتا ہے، جیسے پانچواں، چھٹا یا اس طرح کا کوئی حصہ۔

دونوں قسموں میں فرق یہ ہے کہ خراج وظیفہ میں زمین کے مالک پر ایک خاص مقدار میں مال واجب ہوتا ہے جس کا تعلق اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ زمین سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہے۔ یہ خراج سال میں ایک مرتبہ لیا جاتا ہے۔ رہا خراج مقاسمہ تو اس میں لازم ہونے والے مال کا تعلق زمین کی پیداوار سے ہوتا ہے، نہ کہ زراعت پر قادر ہونے کے ساتھ۔ یہاں تک کہ اگر ایک مالک فائدہ اٹھانے کی قدرت کے باوجود اپنی زمین کو بے کار چھوڑ دے تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح خراج مقاسمہ بار بار پیداوار کے حساب سے سال میں کئی بار لیا جا سکتا ہے۔

۴۴۳-خراج مقرر کرتے وقت یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ زمین کی قوت کیا ہے، تاکہ خراج زمین کے مالک پر بوجھ نہ بنے۔ فقہا نے بعض ایسی چیزوں کی وضاحت کی ہے جو خراج کے لیے زمین کی طاقت جاننے

۱- تاریخ طبری، ج ۴، ص ۱۶

۲-شرح الازہار، ج ۱، ص ۵۷۱

کے بارے میں رہنمائی کرتی ہیں۔[1]

ان میں سے ایک یہ ہے کہ زمین کتنی زرخیز ہے۔اسی طرح یہ دیکھا جائے کہ زمین میں کس قسم کی چیزیں کاشت کی جاتی ہیں، ان کی قیمت کا کیا اندازہ ہے، ان کو سیراب کرنے کا ذریعہ کیا ہے اور شہروں اور مارکیٹوں سے اس زمین کا فاصلہ کتنا ہے۔

۴۴۴- اگر زمین کا مالک اپنی زمین سے فائدہ اٹھانے سے عاجز ہو تو حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اس حالت میں امام کو حق ہوتا ہے کہ اس زمین کو کاشت کے لیے کسی اور کے سپرد کر دے، یا اجارے پر دے، یا اسے بیت المال کی رقم سے کاشت کرے۔ یہ تمام اخراجات اور خراج منہا کر کے جو کچھ بچ جائے اس کو مالک زمین کے حوالے کیا جائے۔امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص عاجز ہو چکا ہے اس کو بیت المال سے اس کی ضرورت کے مطابق رقم بطور قرض دی جائے جس کے ذریعے وہ اپنی زمین کو قابل کاشت بنا کر اس سے فائدہ اٹھائے۔شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک زمین کے مالک کو حکم دیا جائے گا کہ اپنی زمین کو یا تو اجارے پر دے یا اسے چھوڑ دے۔ یہ زمین اس کے ہاتھ میں فضول نہیں رہنے دی جائے گی، اگر چہ اس نے خراج ادا کیا ہو۔ تا کہ بے کار پڑا رہنے کی وجہ سے وہ بنجر زمین میں تبدیل نہ ہو جائے۔اگر ایسا ہو جائے تو یہ بیت المال کے لیے نقصان دہ ہوگا۔اس سے اسلامی ریاست کی پیداوار میں کمی واقع ہوگی اور یہ ایک عمومی نقصان ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہائے کرام نے اس مسئلے کے لیے جتنے حل بتائے ہیں، سب قابل عمل ہیں۔ حکمران کو اختیار ہے کہ ان میں سے جس کو بھی دوسروں کے مقابلے میں بہتر سمجھے اس کو اپنائے۔[2]

رابعاً: عشور

۴۴۵- یہ ایک تجارتی ٹیکس ہے جو اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں اور ویزہ لے کر آنے والے لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ ذمی پر یہ ٹیکس اس کے تجارتی مال کے بارے میں اس وقت لگایا جاتا ہے، جب وہ اپنا مال اسلامی ریاست کی حدود میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرتا ہے۔اس کی مقدار پانچ فی صد کے برابر ہے۔ ویزے سے آنے والے غیر مسلم پر یہ ٹیکس دارالاسلام میں لائے ہوئے مال کے بارے میں عائد ہوگا۔اس کی مقدار ایک عمومی قاعدے کے طور پر لائے گئے مال کا ۱۰ فی صد حصہ ہے۔اگر چہ یہ بھی جائز ہے

۱- الماوردی، ص ۱۴۳-۱۴۴، ابو یعلیٰ الحنبلی، ص ۱۵۱

۲- أحکام الذمیین و المستأمنین، عبد الکریم زیدان، ص ۱۶۷

کہ معاملہ بالمثل کے قاعدے کے تحت اس مقدار میں کمی بیشی کی جائے۔ یعنی جو شخص ویزہ لے کر ہمارے ملک میں آیا ہے اس کے ملک کی حکومت اگر ہمارے تاجروں سے ۱۰ فی صد سے زیادہ یا کم ٹیکس لیتی ہے تو دارالاسلام کی حکومت بھی اس ملک کی رعایا کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ ان کے تجارتی مال پر اسی قدر ٹیکس وصول کرے گی جتنی ان کی حکومت دارالاسلام کے تاجروں سے وصول کرتی ہے۔

۴۴۶۔ ذمی کے مال میں اس ٹیکس کے لازم ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کے نصاب تک پہنچ جائے۔ یہ قول حنفیہ، زیدیہ اور بعض حنابلہ کا ہے۔[1]

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس ٹیکس کے وجوب کے لیے نصاب شرط نہیں ہے۔[2]

یہ ٹیکس ذمی اور مستامن دونوں سے سال میں ایک ہی مرتبہ لیا جائے گا۔ الّا یہ کہ ذمی اپنا مال واپس اپنے ملک میں لے جائے اور پھر اسی مال کو دوبارہ دارالاسلام میں لے آئے۔ اس صورت میں اسی مال پر دوبارہ بھی ٹیکس لیا جائے گا۔

خامساً: مالِ غنیمت

۴۴۷۔ غنیمت امام ابن تیمیہؒ کے بقول وہ مال ہے جو کافروں سے بذریعہ جنگ لیا جائے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے انفال کا نام دیا ہے۔ اس لیے کہ یہ مسلمانوں کے مال میں ایک اضافہ ہے۔[3]

غنیمت کی چار قسمیں ہیں: جنگی قیدی، دشمن کی عورتیں اور بچے، اراضی، اموال منقولہ۔ جنگی قیدیوں سے مراد دشمن کے برسرِ جنگ مرد ہیں، جب کہ مسلمان ان پر غالب آئیں اور ان کو پکڑ لیں۔ یہ لوگ اگر اپنے کفر پر قائم رہیں تو ان کے بارے میں امام کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنے اجتہاد کی روشنی میں ان کے بارے میں کوئی بہتر سے بہتر فیصلہ کرے۔ خواہ انھیں قتل کرے، غلام بنائے، مال لے کر انھیں آزاد کردے یا مسلمان قیدیوں کے بدلے ان کو آزادی دی جائے۔ اور وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ بغیر فدیے کے احسان کرتے ہوئے ان کو رہا کردے۔[4]

---

۱ – شرح السیر الکبیر للسرخسی، ج۴، ص۲۸۴، شرح الازھار، ج۱، ص۵۷۷، المغنی، ص۵۱۹

۲ – الأموال لأبی عبید، ص۵۳۵-۵۳۶

۳ – السیاسة الشرعیة لابن تیمیةؒ، ص۳۰

۴ – ابو یعلیٰ، ص۱۲۵

اگر قیدی مسلمان ہو جائے تو اس کو قتل کرنے کا حکم ساقط ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں امام کو تین امور یعنی غلام بنانے، احسان کر کے چھوڑنے اور فدیہ لے کر چھوڑنے کا اختیار ہوگا۔[1]

۴۴۸- قیدی عورتوں اور بچوں کا قتل جائز نہیں ہوتا۔ ان کو لونڈی اور غلام بنایا جاتا ہے اور انھیں غنیمت کے منقولہ اموال کے ساتھ تقسیم کیا جاتا ہے۔ اگر امام قیدی عورتوں اور بچوں کو مال لے کر چھوڑ دے تو یہ جائز ہے۔ اس صورت میں ان کی جگہ ان کے فدیے کا مال غنیمت میں شامل ہو جائے گا۔ اگر امام چاہتا ہے کہ ان کو کافروں کے قبضے میں جانے والے مسلمان قیدیوں کے تبادلے کے طور پر آزاد کر دے تو یہ بھی جائز ہے۔ مگر مسلمانوں میں سے جو لوگ مال غنیمت کے حق دار ہیں ان کو اس مال غنیمت کے عوض میں سرکاری مفادات کے لیے رکھے جانے والے حصے میں سے دیا جائے۔

اگر حکمران یہ چاہتا ہے کہ ان قیدیوں کو احسان کر کے چھوڑ دیا جائے تو اس میں مستحقین غنیمت کی رضامندی حاصل کی جائے خواہ وہ اس طرح ہو کہ وہ ان کے بارے میں اپنے حقوق سے دست بردار ہوں یا اس طرح کہ انھیں اس کے بدلے میں کوئی مال دے دیا جائے۔[2]

۴۴۹- اراضی کے بارے میں جو کچھ امام ابوعبید نے کتاب الاموال اور الماوردی نے اپنی کتاب 'الاحکام السلطانیة' میں ذکر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے قبضے میں آئی ہوئی زمین کی تین قسمیں ہیں:

۱- پہلی قسم کی زمین وہ ہے جس کے مالک مسلمان ہو چکے ہوں۔ یہ زمین انھی کی ہوگی اور وہ عشری اراضی شمار ہوگی۔ یعنی اس کی پیداوار سے مقررہ زکوٰۃ لی جائے گی۔

۲- دوسری قسم کی زمین وہ ہے جو ایک متعین خراج کے بدلے میں صلح کے ذریعے فتح ہوئی ہو۔ اس پر وہ لوگ اسی طرح رہیں گے جیسا کہ صلح کے معاہدے میں طے پا چکا ہو۔ اس سے زیادہ مال کا بوجھ ان پر نہیں ڈالا جائے گا۔ اس طرح کی زمین کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ ان کے ساتھ حکمران یہ صلح کر لے کہ اس زمین کی ملکیت مسلمانوں کے پاس رہے گی۔ اس صلح کے ساتھ یہ زمین دارالاسلام کا حصہ بن جائے گی اور 'خراج' اس زمین کی ایسی اُجرت ہوگی جو ان کے اسلام لانے کے بعد بھی ساقط

۱- الماوردی، ص ۱۲۶

۲- الماوردی، ص ۱۲۶-۱۲۷

نہیں ہوگی۔ دوسری یہ کہ امام ان کے ساتھ اس بات پر صلح کرلے کہ زمین ان کی ہے بشرطیکہ وہ ہمیں ایک متعین خراج ادا کریں۔ اس صورت میں ان کو اپنی زمین میں تصرف کا اختیار ہوگا کہ وہ چاہیں اس کو بیچیں یا کچھ بھی کریں۔ مگر پہلی قسم میں یہ بات نہیں تھی۔

۳۔ تیسری قسم کی زمین وہ ہے جسے مسلمانوں نے جنگ کے ذریعے زبردستی فتح کیا ہو۔ اس کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ اموالِ منقولہ کی طرح مالِ غنیمت کا حصہ ہوگا۔ اسے خمس نکالے جانے کے بعد غنیمت کے مستحق مسلمانوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔ ہاں اگر مال غنیمت کے مستحق لوگ اسے بیت المال کے لیے چھوڑ دینا چاہیں تو پھر اسے مسلمانوں کے مصالح عامہ کی خاطر باقی رکھا جائے گا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ زمین مسلمانوں کے لیے وقف رہے گی اور اسے غنیمت کے مستحقین میں تقسیم کرنا جائز نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس کے معاملے میں حکمران کو اختیار ہے کہ وہ اسے غنیمت پانے والوں کے درمیان تقسیم کرتا ہے یا کسی متعین خراج کے بدلے اسے اپنے اصل مالکوں یعنی مشرکین کو لوٹا دیتا ہے۔ پہلی صورت میں یہ عشری زمین قرار پائے گی اور دوسری صورت میں خراجی، اور مشرکین اس کے بارے میں اہل ذمہ شمار ہوں گے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ حکمران اس کو تمام مسلمانوں کے لیے باقی رکھے اور یہ زمین دارالاسلام کا ایک حصہ بن جائے۔ خواہ اس میں مسلمان سکونت پذیر ہو جائیں یا مسلمانوں کی ملکیت میں ہوتے ہوئے مشرکین کو اس میں لا بسایا جائے۔ مگر اس زمین سے مشرکین کے حق میں دست بردار ہونا جائز نہیں ہے۔ امام ابوعبید قاسم بن سلامؒ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ جو زمین زبردستی قبضے میں لے لی گئی ہو اس کے بارے میں امام کو اختیار دیا جائے۔ اس کی مرضی ہے کہ خمس نکالنے کے بعد اسے غنیمت پانے والوں میں تقسیم کرے یا اسے عام مسلمانوں کی بہبود کے لیے محفوظ رکھے۔ اس سلسلے میں حنفیہ کی جو رائے ہے اس کے ضمن میں یہ رائے بھی شامل ہے جس کو امام ابوعبید نے راجح قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا میلان بھی احناف کی رائے کی طرف ہے۔[1]

۱۔ ابوعبید، ص ۵۵، الماوردی، ص ۱۳۲-۱۳۳

۴۵۰- اموال منقولہ سے مراد معروف مال غنیمت ہے۔ یہ مال جنگ کے اختتام اور مسلمانوں کی فتح سے پہلے تقسیم نہیں کیا جاتا۔ البتہ یہ جائز ہے کہ دارالحرب ہی میں مال غنیمت جمع کر کے اسے تقسیم کیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ اسے دارالاسلام میں لوٹنے کے بعد تقسیم کیا جائے۔ اس میں امیر کی صوابدید کا لحاظ کیا جائے گا۔ پھر جب اسے تقسیم کرنے کا ارادہ کریں تو سب سے پہلے دشمن کے مارے گئے سپاہیوں کے ساز و سامان کو تقسیم کیا جائے گا۔ چنانچہ ہر کافر مقتول کا سامان اس کے قاتل مسلمان کو دیا جائے گا۔ اس میں مقتول کا جنگی لباس، اسلحہ اور گھوڑا وغیرہ شامل ہوں گے۔

جب مقتولوں کا سامان اپنے اپنے مستحقین کو مل جائے تو پھر سارے مال غنیمت سے خمس نکالنے کا حکم دیا جائے گا اور یہ بھی ان مستحقین میں تقسیم کیا جائے گا جنھیں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اور جن کی تفصیل ہم بیت المال کی مدات خرچ کے ضمن میں بیان کریں گے۔

خمس نکالنے کے بعد ان لوگوں کو عطیات دیے جائیں گے جن کا جنگ میں عدم شرکت کی وجہ سے مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا مگر انھیں معمولی عطیات دینا قرین مصلحت ہوتا ہے، جیسے عورتیں، بچے اور ذمی وغیرہ۔ ان کو اس انداز سے عطیات دیے جائیں کہ کس نے لڑنے والوں کی کتنی مدد کی ہے۔ مگر ان میں سے کسی کا حصہ لڑنے والے سوار یا پیدل سپاہی کے حصے تک نہیں پہنچنا چاہیے۔

خمس اور عطیات کی تقسیم کے بعد باقی مال غنیمت کو لڑنے والے سپاہیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ پیدل سپاہی کو ایک اور سوار کو تین حصے ملیں گے۔ امیر کے لیے جائز ہے کہ اگر بعض سپاہیوں نے دشمن کے خلاف زیادہ جرأت و بہادری کا مظاہرہ کیا ہو یا کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہو جس کی بنا پر مسلمانوں کی فتح آسان ہوگئی ہو تو اس کے حصے میں اضافہ کرے۔ یہ اضافی حصہ خمس میں سے دینا بھی جائز ہے اور باقی مال غنیمت میں سے بھی۔

سادساً: مالِ فے

۴۵۱- فے وہ مال ہے جسے مسلمانوں نے جنگ کے بغیر کافروں سے لے لیا ہو۔ فقہا نے اس کے مفہوم میں جزیہ، خراج، عشور اور وہ مال بھی شامل کیا ہے جس سے دشمن کے ساتھ صلح کی جاتی ہے یا جو مشرکین سے ان کے بھاگ جانے یا ان کے جلاوطن کیے جانے کے بعد پیچھے رہ جاتا ہے۔ ان اموال کو 'فے' کا نام

اس لیے دیا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو عطا کیا ہے، یعنی کفار کی طرف سے ان کو لوٹا دیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور مال اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس سے عبادت کے لیے مدد لی جائے۔ چنانچہ کافر کے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے مال و جان کو اپنے مومن بندوں کے لیے، جو اس کی عبادت کرتے ہیں، مباح کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی جان و مال کو اللہ کی عبادت کے لیے استعمال نہیں کرتا۔[1]

'فے' کی اصل بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَمَآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰـكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (الحشر ۵۹:۶) اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیے، وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں، بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا فرما دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

معلوم ہوا کہ فے وہ مال ہے جو بغیر جنگ کے کافروں سے مسلمانوں کے ہاتھ میں آ جائے۔

سابعاً: دوسری مدات

۴۵۲- بیت المال کی مدات میں سے ایک مد اُن اموال کی ہے جن کا کوئی متعین مالک موجود نہ ہو۔ جیسے ایک مسلمان وفات پا جائے اور اس کا کوئی متعین وارث نہ ہو، یا جیسے غصب کی ہوئی، قرض لی ہوئی اور کسی سے بطور امانت لی ہوئی وہ چیزیں جن کے مالک معلوم کرنا ممکن نہ رہا ہو، اور جیسے بعض حالات میں وہ لقطہ جس کا مالک معلوم نہ ہوا ہو۔[2]

بیت المال کی مدات میں سے ایک مد یہ ہے کہ ریاست کے کچھ اراضی ہوں جس سے وہ پیداوار حاصل کرتی ہو یا اسے اجارے پر دیا گیا ہو، تو اس کی پیداوار یا اجرت بیت المال کی ملکیت ہوگی۔ عراق کی وہ زمینیں اسی مد میں شامل تھیں جو کسریٰ اور اس کے اہل بیت کی ملکیت تھیں یا جن کے مالک بھاگ گئے تھے یا

۱- السیاسۃ الشرعیۃ، لابن تیمیہؒ، ص ۳۶

۲- اس کی تفصیل کے لیے لقطہ کے احکام کے بارے میں ہماری تحقیق ملاحظہ ہو۔ [مولف]

ہلاک ہو گئے تھے اور جنھیں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے غنیمت کے مستحق لوگوں کی رضا مندی سے ریاست کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ حکمران کو ایسی زمین سے بیت المال کے مفاد میں بحیثیت حکمران پیداوار حاصل کرنے یا بیت المال ہی کے مفاد میں اسے اجرت پر دینے کا اختیار حاصل ہے۔ پہلی صورت پر حضرت عمر بن الخطابؓ نے اور دوسری صورت پر حضرت عثمان بن عفانؓ نے عمل کیا۔[1]

بیت المال کی مدات میں سے ایک وہ ہے جسے حکمران ضرورت پڑنے کی صورت میں مال داروں پر لازم کرتا ہے تا کہ اگر کبھی بیت المال میں مال موجود نہ ہو تو اسے ریاست اور عوام کے ضروری معاملات جیسے فوج کے اخراجات اور ضرورت مندوں کی ضروریات پر صرف کیا جائے۔

۲- بیت المال کی مداتِ خرچ

اولاً: زکوٰۃ

۴۵۳- زکوٰۃ ان لوگوں پر خرچ ہوتی ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں نام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (التوبۃ ۹:۶۰) یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں، اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

آیت میں فقرا اور مساکین سے مراد ضرورت مند ہیں اور عاملین علیہا وہ لوگ ہوتے ہیں جو زکوٰۃ اکٹھی کرتے ہیں۔ مؤلفۃ القلوب دو قسم کے ہیں: ایک وہ کافر جن کو عطیہ دینے میں کوئی منفعت ہو، مثلاً یہ کہ وہ اسلام قبول کر لے یا مسلمان اس کے ضرر سے بچ جائیں۔ دوسرا وہ مسلمان جس کی اسلام پر پختگی مطلوب ہو۔[1]

۱- الماوردی، ص ۱۸۵-۱۸۶

۲-۱- السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہؒ، ص ۳۴، ۳۸

الرقاب میں وہ غلام بھی شامل ہیں جو اپنے آقاؤں سے ایک خاص مقدار میں مال کی ادائیگی کا معاہدہ کر لیتے ہیں تاکہ انھیں آزادی حاصل ہو جائے۔ قیدیوں کا فدیہ دے کر انھیں آزاد کرانا اور غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا بھی اسی کے ضمن میں آتا ہے۔

غارمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو مباح امور میں مال خرچ کرتے ہوئے مقروض ہو چکے ہوں اور ان کے پاس اب اتنا کچھ نہ ہو جو اُن کے قرض کی ادائیگی کے لیے کافی ہو جائے تو ان کو قرض کے برابر رقم دینا بھی اسی مد میں شامل ہے۔ لیکن اگر انھوں نے یہ قرض اللہ کی نافرمانی کے کاموں کے لیے حاصل کیا ہو تو پھر انھیں زکوٰۃ کا مال نہیں دیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ توبہ کر لیں۔[1]

فی سبیل اللہ سے مراد غازی اور مجاہد ہیں۔ چنانچہ انھیں اتنا مال دیا جائے گا جسے وہ جہاد میں خرچ کرنے یا اس کی تیاری کرنے، جیسے سواری، ہتھیار، عمومی اخراجات اور اپنے وظیفے کے طور پر خرچ کر سکیں۔ ابن السبیل سے مراد شہر کے وہ اجنبی لوگ ہیں جن کے پاس سفر خرچ نہ ہو، جو انھیں گھر تک پہنچا سکے۔

اگر کسی شہر میں زکوٰۃ کے آٹھوں مصارف کے لوگ موجود ہوں تب بھی اسے کسی ایک مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے۔ البتہ اسے کسی کافر، یا آپ علیہ السلام کے رشتہ داروں، جیسے بنو ہاشم اور بنو المطلب کو نہیں دے سکتے۔

ثانیاً: معدنیات کی زکوٰۃ اور رکاز کا خمس

۴۵۴- معدنیات کی زکوٰۃ اور رکاز کے خمس کے مصارف بھی وہی ہیں جو عام زکوٰۃ کے ہیں، یعنی جہاں جانوروں، زرعی پیداوار، پھلوں، سونے چاندی اور سامانِ تجارت کی زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے وہاں اس کو بھی خرچ کر سکتے ہیں۔

ثالثاً: غنیمت

۴۵۵- غنیمت میں بیت المال کو پانچواں حصہ یعنی ۲۰ فی صد ملے گا اور یہ ان مصارف میں تقسیم ہوگا جنھیں اللہ تعالیٰ نے سورہ انفال میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱- السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہؒ، ص ۳۴

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوۡلِ وَلِذِي الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ (الانفال ۸:۴۱) اور تمھیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کے حصے کو اسلام کے مفاد میں خرچ فرماتے تھے اور باقی چار حصے مستحقین غنیمت میں الأهم فالأهم کے اصول پر اور ضرورت کی بنیاد پر تقسیم کیے جاتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ باقی چار حصے سارے لوگوں میں برابر برابر تقسیم ہوں۔[1]

رابعاً: مالِ فے

۴۵۶- یہ مال بھی ان لوگوں میں تقسیم ہوتا ہے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ مِنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ وَلِذِي الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ کَيۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَةًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهٰکُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ. لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَاَمۡوَالِهِمۡ یَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا وَّیَنۡصُرُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ. وَالَّذِیۡنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالۡاِیۡمَانَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ یُحِبُّوۡنَ مَنۡ هَاجَرَ اِلَیۡهِمۡ وَلَا یَجِدُوۡنَ فِيۡ صُدُوۡرِهِمۡ حَاجَةً مِّمَّآ اُوۡتُوۡا وَیُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ کَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ وَّمَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ. وَالَّذِیۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَلِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ وَلَا تَجۡعَلۡ فِيۡ قُلُوۡبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ (الحشر ۵۹:۷-۱۰) جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسولؐ کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمھارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ جو کچھ رسول تمھیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔ اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا

۱- زاد المعاد لابن القیمؒ، ج ۳، ص ۲۲۲

دینے والا ہے۔(نیز وہ مال) ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جایدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہی راست باز لوگ ہیں۔(اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو اِن مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دارالہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں، اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔(اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو اِن اگلوں کے بعد آئے ہیں، جو کہتے ہیں کہ ''اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب! تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔''

علامہ ماوردیؒ کہتے ہیں کہ مالِ فے کا پانچواں حصہ لے کر اسے پھر پانچ برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ان میں سے ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپؐ اور آپؐ کے ازواج مطہرات اور عام مسلمانوں کے مصالح پر خرچ کیا جاتا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد یہ حصہ مسلمانوں کے عمومی مصالح پر خرچ ہوتا ہے، جیسے فوج کے کھانے پینے کے انتظامات، اسلحہ کی تیاری، قلعہ جات اور پلوں کی تعمیر، ججوں اور ملازمین کا اعزازیہ اور اس طرح کے دوسرے مصالح۔ دوسرا حصہ ذوی القربیٰ کا ہے۔ اس سے مراد بنو ہاشم، بنو عبدالمطلب اور عبد مناف کے دو بیٹوں کی اولاد ہے۔ تیسرا حصہ حاجت مند یتیموں کا ہے۔ یتیم اس 'بچے' کو کہتے ہیں جس کا باپ وفات پا گیا ہو۔ چوتھا حصہ مساکین کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی کفایت کے برابر وسائل نہیں رکھتے۔ پانچواں حصہ ابناء السبیل کا ہے۔ یہ وہ مسافر ہیں جن کے پاس سفر خرچ نہیں ہوتا۔ اس خمس کے علاوہ باقی پانچ حصے جو رہتے ہیں ان کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حصے صرف فوج کے لیے ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ انھیں مصالح عامہ میں خرچ کیا جائے گا جس میں فوج کا کھانا پینا اور دوسرے لوازمات بھی شامل ہیں۔[1]

حقیقت یہ ہے، جیسا کہ مشہور فقیہ علامہ ابن القیم کہتے ہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی طرف

۱- الماوردی، ص ۱۲۲-۱۲۳

لوٹایا ہے وہ سارا اُن لوگوں کا ہے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے مذکورۂ بالا آیات میں کیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان مذکورہ لوگوں کو خمس تک مخصوص نہیں کیا بلکہ عمومی اور مطلق بات کہی ہے اور سب کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا مال فے کو مذکورہ تمام لوگوں پر صرف کیا جائے گا۔ رہا یتیموں اور مسکینوں وغیرہ کا ذکر، تو اس کا مقصود یہ ہے کہ ان کی طرف توجہ ہو جائے اور یہ ان لوگوں میں شامل ہوں جو مال فے کے مستحق ہیں۔ اگر چہ یہ لوگ غنیمت کے پانچویں حصے میں بھی استحقاق رکھتے ہیں، چنانچہ آیت سے یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ مال فے کا استحقاق انھی تک مخصوص ہے۔

معلوم ہوا کہ مال فے کے مستحق مذکورہ تمام لوگ ہیں۔ خصوصاً وہ مہاجرین وانصار جو اِن کے بعد آئے ہیں، جو مسلمان ہیں، اور جو کہتے ہیں کہ ''اے ہمارے رب! ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی بخشش فرما جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں۔'' اس میں ان کے ساتھ وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو اُن پر لعن طعن کرتے ہیں اور ان سے براءت اختیار کرتے ہیں۔ اس بنا پر مالِ فے کو مسلمانوں کے تمام مصالح میں خرچ کیا جائے گا جن میں یہ بھی شامل ہے کہ محتاج لوگوں پر خرچ کیا جائے، افواج کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا انتظام کیا جائے، علما اور ججوں اور دوسرے ملازمین پر خرچ کیا جائے۔ نیز اس میں سے عام مسلمانوں کو بھی دیا جائے گا۔

یہی بات خلفائے راشدین کی سیرت اور سنت سے ثابت ہے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ کہتے ہیں:

لَيْسَ أَحَدٌ أَحَقَّ بِهٰذَا الْمَالِ مِنْ أَحَدٍ: إِنَّمَا هُوَ الرَّجُلُ وَسَابِقَتُهُ، وَالرَّجُلُ وَغِنَاؤُهُ، وَالرَّجُلُ وَبَلَاؤُهُ، وَالرَّجُلُ وَحَاجَتُهُ. اس مال کا کوئی کسی سے زیادہ حق دار نہیں ہے۔ اس کی بنیاد کسی کی اسلام میں سبقت، اس کی بے نیازی، اس کی آزمائش اور اس کی حاجت ہے۔

گویا اس مال کے مستحقین کو حضرت عمرؓ نے چار قسموں میں تقسیم کیا ہے:

پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو اسلام میں سبقت کی بنا پر مال کے مالک بن گئے ہیں۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو اپنی منفعتوں کے حصول میں مسلمانوں سے بے نیاز ہوتے ہیں، جیسے اولوالامر اور علما جو مسلمانوں کو دنیا و آخرت کی منفعتوں سے سرشار کرتے ہیں۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو مسلمانوں سے ضرر کو دور کرنے کے لیے دادِ شجاعت دیتے ہیں، جیسے مجاہدین فی سبیل اللہ اور ہر دم جنگ کے لیے تیار رہنے والے فوجی، اور اس طرح کے دوسرے لوگ۔

چوتھی قسم حاجت مند لوگوں کی ہے۔

اسی طرح حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا:

وَاللّٰهِ لَئِنْ بَقِيتُ لَهُمْ لَيَأْتِيَنَّ الرَّاعِيْ بِجَبَلِ صَنْعَاءَ حَظَّهُ مِنْ هٰذَا الْمَالِ وَهُوَ يَرْعٰى مَكَانَهُ. اللہ کی قسم! اگر میں زندہ رہا تو صنعاء کی پہاڑی پر بکریاں چرانے والے کو اس کا حصہ وہاں جا کر ملے گا، حالانکہ وہ وہاں اپنی بکریاں چرا رہا ہوگا۔[1]

ان ساری باتوں سے معلوم ہوا کہ عام مسلمانوں کا بھی مالِ فے میں حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ریاست کے ضروری اخراجات، جیسے فوج کے کھانے پینے، اور اولوالامر وغیرہ کی تنخواہوں کے پورے ہونے کے بعد اس مال میں سے عام لوگوں کو بھی دیا جائے گا۔ یہ وہ بات ہے جس پر آیت کریمہ دلالت کرتی ہے۔

سرکاری ضروریات کے بعد جو مال رہ جاتا ہے اس میں حاجت مند لوگوں کو مقدم کیا جائے گا۔

وہ اموال بھی مالِ فے کے ساتھ ملحق کیے جاتے ہیں جس کا کوئی متعین مالک معلوم نہیں ہوتا، جیسے مسلمانوں میں کوئی شخص وفات پا جائے اور اس کا کوئی متعین وارث نہ ہو۔ اسی طرح غصب کردہ مال، ادھار لیا ہوا مال، امانت کے طور پر پڑا ہوا مال اور اس طرح کے دیگر اموال جن کے مالکوں تک رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ ان اموال کا مصرف بھی وہی ہے جو مالِ فے کا ہوتا ہے۔[2]

---

۱ – السياسة الشرعية لابن تيميةؒ، ص۴۴-۴۶، زاد المعاد لابن القيمؒ، ج۳، ص۲۲۱-۲۲۲

۲ – مجموع فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ج۸، ص۲۷۶-۲۷۷

۷

اسلام کا نظامِ جہاد

جہاد کے معنی

۴۵۷- جہاد کے لغوی معنی ہیں انسان کا اپنی پوری کوشش اور طاقت صرف کرنا۔ شرعی اصطلاح میں ایک مسلمان کا اپنی کوشش اور طاقت کو اللہ کی رضا کی خاطر اسلام کی نصرت کے لیے خرچ کرنا جہاد کہلاتا ہے۔ اس بنا پر اسلام میں جہاد اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ فی سبیل اللہ ہو، تاکہ وہ جہاد کے مذکورہ بالا ضروری معنی پر دلالت کرے اور شرعی جہاد وجود میں آسکے۔

قرآن کریم کی آیات اسی معنی کا اعلان کر رہی ہیں کہ مسلمانوں کا جہاد، جس کا ایک شعبہ قتال ہے، اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔ اس کے برعکس کافروں کا جہاد اور قتال اللہ کی راہ میں نہیں بلکہ شیطان کی راہ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (النساء ۴:۷۶) جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔

ہم نے جہاد کا جو مفہوم بیان کیا ہے اس کی تعبیر یوں بھی کی جاتی ہے کہ یہ جنگ اس لیے ہے لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا. تاکہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ایک شخص بہادری کی وجہ سے لڑتا ہے، ایک حمیت کی خاطر لڑتا ہے اور ایک ریا کے لیے لڑتا ہے تو ان میں سے کون اللہ کی راہ میں ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. جو

شخص اس مقصد کے لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ سر بلند ہو وہی اللہ کی راہ میں ہے۔

کلمۃ اللہ سے مراد اسلام کا کلمہ ہے۔ جو شخص اسے بلند کرتا ہے، یعنی اسے دنیا میں نافذ اور غالب کرتا ہے تو وہی اللہ کی راہ میں ہوتا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے دین کو غالب کرنا اللہ کو راضی کرنے والا کام ہے۔

جہاد کی قسمیں

۴۵۸- جہاد کی مختلف قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک جہاد باللسان ہے یعنی اسلامی قوانین کی وضاحت کرنا اور اسلام پر لگائے گئے جھوٹے الزامات کا جواب دینا۔ ایک جہاد بالمال ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے مال کو نیکی کے کاموں میں خرچ کیا جائے، خصوصاً غازیوں اور اللہ کی راہ میں لڑنے والوں پر۔ مثلاً یہ کہ ان کے لیے جنگی ساز و سامان اور اسلحہ خریدا جائے اور ان کے لیے کھانے پینے کی اشیا کا انتظام کیا جائے۔ جہاد کی ایک قسم جہاد بالنفس ہے یعنی اللہ کے دشمنوں کے خلاف جنگ۔ جہاد کا لفظ جب مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے مراد اکثر جہاد بالنفس یعنی قتال ہی ہوتی ہے۔

اسی طرح جہاد بالنفس اکثر جہاد بالمال کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی آیات میں ہم دیکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ. تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنَّاتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. وَأُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَّبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (الصّف ۶۱: ۱۰-۱۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمھیں عذاب الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمھارے گناہ معاف کر دے گا، اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمھیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو، وہ

بھی تمھیں دے گا، اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبیؐ! اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو۔

۴۵۹- عام حالات میں دشمنان اسلام کے خلاف جہاد بالنفس اس صورت میں فرض کفایہ ہوتا ہے جبکہ بعض افراد کی شرکت مقابلے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ مگر جب کفار کسی اسلامی ملک پر قبضہ کر لیں یا مسلمان حکمران نفیر عام کا اعلان کریں تو اس صورت میں یہ فرض عین بن جاتا ہے۔ امام ابن عربی مالکیؒ فرماتے ہیں:

اگر کسی اسلامی ملک پر کافروں کے غالب آنے یا مسلمان قیدیوں پر ان کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے نفیر عام ہو جائے تو یہ جہاد فرض عین ہوگا اور واجب ہوگا کہ ہلکے اور بوجھل، سوار اور پیادے، غلام اور آزاد سب جہاد کے لیے نکلیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کا باپ اسے اجازت نہ دے تب بھی وہ نکلے گا تاکہ اللہ کا دین غالب آئے، اسلامی مملکت اور اس کی حدود کو محفوظ کیا جا سکے، اللہ تعالیٰ اپنے دشمن کو ذلیل و رسوا کرے اور مسلمان قیدیوں کو آزادی نصیب ہو۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔[1]

جہاد، فریضہ اسلامی

۴۶۰- جب جہاد اسلام کے فرائض میں سے ہے تو اس وجہ سے اس کے بارے میں حکم بھی پوری تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کے لیے لازمی تیاری سے لیس ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَّمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ

(الانفال ۸: ۶۰) اور تم لوگ، جہاں تک تمھارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کر دو۔

چنانچہ ہر وہ چیز جس سے قوت حاصل ہو اور جس کی جہاد میں ضرورت ہو اس کا حصول اور اس کی تیاری لازم ہوگی۔ اس میں زمان و مکان کے اختلاف کے ساتھ اختلاف پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ

۱- أحكام القرآن لابن العربي المالكي، ج ۲، ص ۹۴۳

ہمارے موجودہ دور میں قوت کے اہم ترین وسائل میں سے ایک یہ ہے کہ مختلف علوم وفنون اور پیشے جو جنگی تیاری کے لیے ضروری ہوتے ہیں انھیں سیکھا جائے اور ان میں مہارت حاصل کی جائے۔ ان امور کو سیکھنا امت کے لیے فرض کفایہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ مَالَا یُتِمُّ الْوَاجِبُ إِلَّا بِهٖ فَهُوَ وَاجِبٌ. جس چیز کے بغیر ایک واجب کی تکمیل نہ ہو سکے وہ واجب قرار پاتی ہے۔

ہر مسلمان کے لیے یہ بات پسندیدہ ہے کہ جنگی امور جتنے ہو سکے، سیکھ لے۔ جیسے تیراندازی، نیزہ بازی اور مختلف قسم کے اسلحہ کا استعمال۔ ان امور کو اللہ کی رضا کے لیے سیکھے اور اسے دوسروں کو بھی سکھائے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے ان امور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: اس کام یعنی جنگی امور اور قتال کے آلات کا طریقہ سیکھنا اس شخص کے لیے عمل صالح ہے جس کی نظر میں اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہو۔ اگر کسی نے دوسرے کو اس کی تعلیم دی تو وہ اس کے سکھائے ہوئے فن کے ساتھ جو بھی جہاد کرے گا اس میں معلم متعلم کے ساتھ شریک ہوگا اور ان میں سے کسی کے ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔

حضرت عمر فاروقؓ مسلمانوں اور ان کے گورنروں پر یہ تاکید کیا کرتے تھے کہ اپنی اولاد کو تیراندازی اور گھڑسواری سکھاؤ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث میں مروی ہے، آپؐ نے فرمایا: مَنْ تَعَلَّمَ الرَّمْيَ ثُمَّ نَسِيَهٗ، فَلَيْسَ مِنَّا. جس نے تیراندازی سیکھی اور پھر اسے بھول گیا وہ ہم میں سے نہیں۔

جہاد کی اہمیت

۴۶۱- حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے بحیثیت ایک مضبوط امت کے باقی رہنے کے لیے جہاد ضروری ہے۔ تاکہ دشمنان اسلام ان سے مرعوب ہوں اور یہ امت کفار ومنافقین کی لالچ اور بغض سے دور رہے۔ اسی طرح جہاد بذات خود بھی ایک مسلمان کے ایمان کی اور اس بات کی ایک قطعی دلیل ہے کہ وہ اللہ کی پسندیدہ چیز کی طرف آگے بڑھتا ہے اور وہ اللہ کی رضا اور اس کے وعدوں کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی سخت مذمت کی ہے جو جہاد میں سستی دکھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ

(التوبۃ ۹: ۳۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لیے

کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔

۴۶۲- جہاد کے ان عظیم اثرات اور اس کے دلیلِ ایمان ہونے کی وجہ سے فقہا کہتے ہیں کہ مسلمان ملک کی سرحدوں پر پہرہ دینا مساجد ثلاثہ یعنی مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کی مجاورت سے افضل ہے۔

اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ پہرہ دینا جہاد ہے، جبکہ مجاورت زیادہ سے زیادہ اگر کسی چیز کے برابر ہو سکتی ہے تو وہ حج ہے اور حج کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ لَا يَسْتَوُوْنَ عِنْدَ اللهِ. (التوبۃ ۹:۱۹) کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخر پر، اور جس نے جاں فشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔

اور صحیحین میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: إِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ. (اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا)۔ سوال کیا گیا: پھر کون سا عمل؟ تو آپؐ نے فرمایا: جِهَادٌ فِيْ سَبِيْلِهٖ. اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ پھر سوال کیا گیا کہ اس کے بعد کون سا عمل؟ آپؐ نے فرمایا: ثُمَّ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ. پھر حج مبرور۔

۴۶۳- ترکِ جہاد ذلت اور رسوائی کا سبب ہے۔ اس سے اسلامی سرزمین مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے اور کفار کو اسلامی ممالک پر قبضہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ وہ عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے تارکین جہاد کے لیے مقدر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

إِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَّاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (التوبۃ ۹:۳۹) تم نہ اُٹھو گے تو خدا تمھیں دردناک سزا دے گا اور تمھاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا، اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

امام ابن عربی مالکیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: اس آیت میں جہاد ترک کرنے اور اس بات پر شدید

دھمکی اور سخت وعید ہے کہ مسلمان اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر کفار کے خلاف جنگ کے لیے نکلنے سے جی چرائیں۔ عذاب کی نوعیت کے بارے میں امام ابن العربیؒ فرماتے ہیں: دنیا میں اس کی صورت دشمن کا غلبہ ہے اور آخرت میں جہنم۔

تاریخ کے قدیم وجدید واقعات امام ابن العربیؒ کی بات کی تائید کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو جو ذلت نصیب ہوئی ہے یا ان کے اوپر کفار کا غلبہ ہو گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے وہ شرعی جہاد ترک کر دیا ہے جو اُن سے مطلوب ہے۔

جہاد اقدامی یا دفاعی

۴۶۴- جب جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کا ذکر آتا ہے تو بعض جدید اہل قلم کہتے ہیں کہ اسلام میں جہاد یا قتال اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسلامی حکومت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی غیر اسلامی حکومت پر حملہ کرے، سوائے اس کے کہ غیر اسلامی حکومت، اسلامی حکومت پر حملہ آور ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قول درست نہیں ہے۔ یہ قول تحقیق وتدقیق کے لحاظ سے انتہائی ناقص ہے۔ اس کی پشت پر شریعت کے دلائل نہیں ہیں۔

اسلام میں جہاد کے کچھ اسباب ہوتے ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ ظلم وزیادتی کو مٹایا جائے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْآ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (البقرۃ ۲:۱۹۰) اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

دوسرا یہ کہ کمزور مسلمانوں کی مدد کے لیے جہاد کیا جائے، جو کفار کے ظلم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (النساء ۴:۷۵) آخر کیا وجہ ہے

کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں۔

تیسرا یہ کہ جب کفار اسلام کو مسترد کریں اور مسلمانوں کو اللہ کی شریعت کو قائم کرنے اور اسے زمین میں نافذ کرنے کے لیے حکومت واقتدار کے حصول سے منع کریں تو مسلمان ہی جہاد میں پہل کریں۔ یہی قسم ہے جس کے بارے میں بعض لوگ حجت بازی کرتے ہیں اور اسے وہ جنگ شمار کرتے ہیں جسے مسلمان کافروں کے خلاف بلا وجہ شروع کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اور سنت نبویہ اس قسم کے قتال پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (البقرۃ ۲:۱۹۳) تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

فتنہ کے معنی کفر وشرک ہیں۔ امام ابوبکر جصاص، احکام القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

یہ آیت کفار کے خلاف جنگ کو ضروری قرار دیتی ہے، یہاں تک کہ وہ کفر کو چھوڑ دیں۔ یہی بات ابن عباسؓ، قتادہؒ، مجاہدؒ اور ربیعؒ نے کی ہے۔ دین سے مراد اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے اس کے آگے جھکنا ہے۔ شرعی طور پر 'دین' اللہ کے آگے جھکنا اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ اللہ کے نزدیک اصل دین اسلام ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ (آلِ عمران ۳:۱۹) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

چنانچہ امام جصاصؒ کے قول ''یہاں تک کہ وہ کفر کو چھوڑ دیں'' میں کفر سے مراد وہ کفر ہے جو تشریع یعنی قانون سازی سے متعلق ہے۔ اس لیے کہ تشریع صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ جو شخص اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھگڑا کرتا ہے وہ کافر اور مشرک بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَأْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (الشوریٰ ۴۲:۲۱) کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا؟

ہماری بات کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبۃ ۹:۲۹) جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔(ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ چھوٹا بن کر رہنا یہ ہے کہ ان سے جزیہ لیا جائے اور ان پر اسلامی احکام جاری کیے جائیں۔[۱]

یہ اس بات کی صراحت ہے کہ مسلمانوں کی جنگ اس لیے ہوتی ہے کہ جب وہ حکومت و اقتدار کو سنبھال لیتے ہیں تو اللہ کے دین کے غلبے اور اس کے قوانین کے نفاذ کے لیے کام کرتے ہیں۔اس سے مقصود غیر مسلموں کا قتل یا انھیں اسلام پر مجبور کرنا نہیں ہوتا۔کیوں کہ اگر یہی مقصود ہوتا تو نہ جزیہ مشروع ہوتا اور نہ دارالاسلام میں کافروں کو کفر پر باقی رہنے دیا جاتا۔

سنت نبویؐ میں بھی ہماری رائے کی تائید موجود ہے۔اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث وارد ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کے اُمرا کو مشرکین کی طرف روانہ کرتے ہوئے جو ہدایات دیا کرتے تھے اُن میں ایک بات یہ ہوتی تھی کہ مشرکین کو پہلے اسلام کی دعوت دی جائے،اگر وہ اس سے انکار کریں تو جزیہ دینے کی پیش کش کی جائے۔یعنی یہ کہ وہ اسلامی ریاست کے اقتدار کے آگے جھک جائیں۔اگر وہ اس سے بھی انکار کریں تو پھر ان کے خلاف جنگ کی جائے یہاں تک کہ وہ زبردستی مسلمانوں کے اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کریں۔[۲]

۴۶۵-حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلم [حکمران] جب اسلام لانے یا جزیہ دینے سے انکار کریں تو مسلمانوں کا ان کے خلاف جنگ کا آغاز کرنا ان مشرکین کی عمومی مصلحت کے لیے ہوتا ہے جو کفر کے اقتدار

۱-مختصر المزنی،ج۸،ص۲۷۷

۲- صحیح مسلم،ج۷،ص۳۱۰،الخراج لابی یوسف،ص۱۹۰،زادالمعاد،ج۲،ص۶۵

کے آگے جھکتے ہیں۔ اس لیے کہ مسلمان اس جنگ کے ذریعے ان کے اوپر سے اس کافر حکومت اور اس کے قوانین کو ختم کر کے عام لوگوں کے لیے اسلام اور اس کے قوانین کو قریب سے دیکھنے میں حائل رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں۔ چنانچہ جو چاہے مسلمان ہو جائے اور جو چاہے کافر رہ جائے، مگر شرط یہ ہوگی کہ وہ اپنا تعلق اسلامی ریاست کے ساتھ قائم کریں گے۔

یہ سب کچھ مشرکین کے دنیوی اور اُخروی مفادات کی خاطر کیا جاتا ہے۔ دنیوی مفاد یہ ہیں کہ وہ اسلام کے عدل سے مستفید ہوں گے اور ان کے مال و جان جیسے بنیادی حقوق محفوظ ہوں گے اور اُخروی مفاد یہ کہ ان کے لیے اسلام کو قریب سے دیکھنے کی راہ ہموار ہو جائے گی اور ان کے لیے اپنی مرضی اور آزادانتخاب سے — نہ کہ جبر و اکراہ کے ساتھ — اسلام میں داخل ہونا ممکن ہو جائے گا۔ یہ چیز ان کے لیے اُخروی فوز وسعادت کا ذریعہ ہے۔

اسلام اور جہاد ساتھ ساتھ

۴۶۶- خلاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان جہاد سے الگ نہیں ہوسکتا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح حالت جہاد میں ہوتا ہے۔ وہ کبھی اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتا ہے کہ اسے اللہ کی اطاعت، اور اپنی جان و مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر آمادہ کرے۔ کبھی وہ اپنی زبان اور قلم سے جہاد کرتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کی وضاحت کرے اور باطل پرستوں کے اعتراضات کا جواب دے۔ وہ ہر حالت میں جہاد کرتا ہے، مشکلات اور آسانیوں کے وقت جہاد، کمزوری اور طاقت کی حالت میں جہاد اور مالداری اور غریبی میں بھی جہاد۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی روشنی میں مفسرین نے یہی بات لکھی ہے کہ **اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (التوبۃ ۹:۴۱) نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

جہاد کا حکم اور اس کے فضائل کا ذکر قرآن و سنت میں اتنا زیادہ ہے کہ اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ بلکہ جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں، کسی عمل کے ثواب اور اس کی فضیلت میں اتنا کچھ وارد نہیں ہوا جتنا کہ جہاد کے

بارے میں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد کا نفع مجاہد اور غیر مجاہد کے لیے دین و دنیا میں عام ہوتا ہے۔ نیز یہ ہر قسم کے ظاہری اور باطنی عبادتوں کو مجموعہ ہوتا ہے۔ جیسے اللہ کے لیے محبت، اخلاص نیت، صبر اور زہد وغیرہ۔ مجاہد دو بھلائیوں میں سے ایک کا مستحق ضرور بنتا ہے۔ یا تو اسے فتح وکامرانی نصیب ہوتی ہے یا شہادت اور جنت سے سرفراز ہو جاتا ہے۔[1]

......☆......☆......

۱- مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، ج ۸،ص ۳۵۳

۸

اسلام کا نظامِ عدالت

تمہید

۴۶۷- کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت سے احکام ہیں جن میں وہ افعال بیان کیے گئے ہیں جن کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سزائیں مقرر ہیں۔ یہ احکام یا اس پر مبنی اور اس سے مستنبط ہونے والے جو امور ہوتے ہیں ان کو نظام عدالت یا اسلام کا فوجداری قانون بھی کہتے ہیں۔

اسلام کا فوجداری قانون دراصل ایک بین الاقوامی قانون ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی شریعت کا ایک جزو ہے اور وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک بین الاقوامی قانون ہے نہ کہ مقامی۔ اس کے مقنن یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کو روئے زمین کے تمام حصوں میں سارے لوگوں پر نافذ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور وہ سب اس کے مخاطب ہیں۔ سب سے اس کے نفاذ کا مطالبہ ہے۔ مگر چونکہ دارالاسلام کو اپنے علاقوں کے سوا کسی پر اقتدار حاصل نہیں ہوتا اس لیے ان قوانین کا نفاذ متعذر رہوتا ہے۔ مگر اسلامی حدود کے اندر اس کا نفاذ ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں اقتدار مسلمانوں کا ہوتا ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے یہی مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے: اسلامی قوانین کا نفاذ سارے لوگوں کے لیے عام ہوتا ہے مگر دارالحرب میں ان کا نفاذ متعذر رہوتا ہے کیوں کہ وہاں اسلام کا اقتدار نہیں ہوتا۔ دارالاسلام میں ان کا نفاذ ممکن ہوتا ہے اس لیے یہاں ان کا نفاذ ضروری ہوتا ہے۔[1]

اس بنا پر اسلام کے فوجداری قانون کے احکام ان تمام جرائم کے بارے میں نافذ کیے جائیں گے جو دارالاسلام میں پیش آتے ہیں۔ اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ جس نے ان جرائم کا ارتکاب کیا ہے اس کا تعلق کس قوم یا مذہب کے ساتھ ہے۔ یہ ایک عمومی قاعدہ ہے۔ البتہ ذمیوں کے بارے میں اس کے بعض

۱-۱- بدائع الصنائع للکاسانی، ج ۲، ص ۳۱۱

جزئیات میں فقہا کے درمیان معمولی اختلاف پایا جاتا ہے، جبکہ مستأمن (یعنی ویزے سے آئے ہوئے لوگوں) کے بارے میں کافی اختلاف موجود ہے۔[1]

ان اختلافات میں سے ایک ہے کہ جمہور فقہا نے ذمیوں اور مستامنین کو شراب پینے کی سزا سے مستثنیٰ کیا ہے اس لیے کہ ان کے عقیدے میں یہ حلال ہوتا ہے۔ اہل ظاہر کے نزدیک ذمیوں اور مستامنین پر بھی سزا واجب ہوتی ہے۔ ان کا معاملہ وہی ہے جو مسلمانوں کا ہے۔[2]

اس تمہید کے بعد ہم دو الگ عنوانات کے تحت پہلے جرم کے بارے میں اور پھر سزا کے بارے میں بتائیں گے۔

۱- جرم

جرم کی تعریف

۴۶۸- اسلامی شریعت کے ماہرین یعنی فقہا نے جرائم کی تعریف یہ کی ہے کہ یہ وہ شرعی ممنوعات ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے کسی حد یا تعزیر کی سزا سنا کرنا پسندیدگی کا اظہار کیا ہو۔[3]

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہی اصطلاح کے مطابق جرم میں درج ذیل امور کا موجود ہونا ضروری ہے۔

أ- ایک یہ کہ وہ شرعی طور پر ممنوع ہو۔ یعنی ایسی اشیا جن سے اسلامی شریعت نے منع فرمایا ہو، اور یہ ممانعت بھی صرف کراہت کی نہ ہو بلکہ حرمت کی ہو۔ اس دلیل کے ساتھ کہ ان ممنوعات کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سزا مقرر کی گئی ہو۔ جبکہ سزا کا وجوب ایسے ہی جرائم پر ہوتا ہے جن میں کسی واجب کو ترک یا کسی حرام کا ارتکاب کیا گیا ہو۔

۱- ذمی اسلامی ریاست کی وہ غیر مسلم رعایا ہے جو عقد ذمہ کے ذریعے اسلامی ملک ہی کی شہریت رکھتی ہو، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔ مستأمن وہ غیر مسلم ہیں جو دار الاسلام میں ویزہ لے کر داخل ہوں اور پھر چلے جائیں۔ (مولف)

۲- الکاسانی، ج ۷، ص ۳۹، شرح الخرشی، ج ۸، ص ۱۰۸، کشاف القناع، ج ۴، ص ۵۵، مغنی المحتاج، ج ۴، ص ۱۸۷

۳- الماوردی، ص ۳۱۱، ابو یعلیٰ، ص ۲۴۱

ب- دوسرا یہ کہ اس فعل کی حرمت یا اس کا ترک اسلامی شریعت کی طرف سے ہو۔ اگر یہ کسی اور کی طرف سے ہو تو یہ ممنوع کام جرم تصور نہیں ہوگا۔

ج- تیسرا یہ کہ اس کے لیے اسلامی شریعت کی طرف سے کوئی سزا مقرر ہو، خواہ یہ سزا متعین ہو، جسے فقہا 'حد' کہتے ہیں، یا پھر اس کا تعین جج کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہو، جسے فقہا 'تعزیر' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی فعل کا ارتکاب یا کسی واجب کا ترک سزا سے خالی ہو تو وہ بھی جرم نہیں ہوگا۔

کسی فعل کے جرم ہونے کی بنیاد

۴۶۹- کسی کام کو کرنے یا اسے ترک کرنے کو جرم قرار دینے کی بنیاد یہ ہے کہ جس چیز میں فرد یا جماعت کے حق میں کوئی خرابی ہو تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت یہ ہے کہ اس نے ان امور کو صاف صاف بیان کیا ہے جنھیں انسان اپنی مصلحت کے لیے اور اپنی دنیوی اور اُخروی سعادت کی خاطر کبھی کرتے اور کبھی چھوڑتے ہیں۔

شرعی نصوص کی تحقیق و تلاش سے اس بات کی قطعی دلیل سامنے آتی ہے کہ جن امور کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں سزا کا حکم دیا ہے تو وہ فرد اور معاشرے کے لیے بہت سی خرابیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ خرابیاں دینی، عقلی اور نفسیاتی نقصان کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں، یا اس سے کسی کی عزت یا اس کے مال کے ضایع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور پھر ان کے نتیجے میں معاشرے میں بہت زیادہ فساد اور اونچ نیچ پیدا ہوتی ہے۔

جرائم کی قسمیں

۴۷۰- جرائم تو بہت سے ہیں مگر ان کی جامع تعریف یہ ہے کہ یہ وہ شرعی ممنوعات ہیں جن پر سزا دی جاتی ہے۔ فقہا نے جرائم کی سزاؤں کے پیشِ نظر ان کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے، اور وہ یہ ہیں: حدود کے جرائم، قصاص و دیت کے جرائم اور تعزیر کے جرائم۔

۱- حدود کے جرائم

۴۷۱- حدود کے جرائم میں زنا، قذف، شراب نوشی، چوری، 'حرابہ' یعنی ڈاکہ زنی اور ارتداد شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بغاوت کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ حدود کے جرائم میں شامل ہے یا نہیں۔[۱]

۱- البدائع والصنائع، کاسانی، ج ۷، ص ۳۳، حاشیہ علامہ ابن عابدین شامی، ج ۳، ص ۱۹۳۔ ان دونوں نے بغاوت کو حدود کے جرائم میں شامل نہیں کیا ہے۔ (مؤلف)

حد کے لغوی معنی روکنے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں یہ وہ سزا ہے جس کا اندازہ مقرر ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر واجب ہوتی ہے۔[1]

بعض فقہا حد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ یہ شرعی طور پر ایک مقرر سزا ہے۔ وہ اس میں یہ قید نہیں لگاتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر مقرر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے وہ قصاص کو بھی حد کا نام دیتے ہیں۔[2]

۲- قصاص و دیت کے جرائم

۴۷۲- اس میں قتل، زخموں اور اعضا کاٹنے یا ضایع کرنے کے جرائم شامل ہیں۔ اسے فقہا جنایات **علی النفس و مادون النفس** (یعنی جانی یا اس سے کم جرائم) کا نام دیتے ہیں۔ ان جرائم کی سزا قصاص ہوتی ہے، جب کہ اس کی شرائط پوری ہو جائیں۔ یا پھر اگر جرم بالارادہ نہ ہو یا بالارادہ ہو مگر قصاص کی دوسری شرائط موجود نہ ہوں تو اس کی سزا دیت ہے۔ قتل کے جرائم میں بعض اوقات کفارہ بھی لازم ہوتا ہے۔

قصاص کے معنی یہ ہیں کہ مجرم کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو اس نے متاثرہ شخص کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ کبھی اسے قتل کیا جائے گا اور کبھی اس کا کوئی عضو کاٹا جائے گا۔

دیت سے مراد وہ مال ہے جو جانی یا جان سے کم جرائم میں مجرم پر واجب ہوتا ہے۔ شریعت اسلامی میں اس کی متعین شرائط ہیں۔ مقتول کے وارث کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مجرم کو معاف کرے۔ اسی طرح وہ دیت کو بھی معاف کر سکتا ہے، کیوں کہ یہ اسی کا حق ہوتا ہے۔ زخموں کے جرائم میں متاثرہ شخص مجرم کو معاف کر سکتا ہے۔ مگر کفارہ ایک ایسی سزا ہے جس میں عبادت کی معنویت پائی جاتی ہے، اس لیے اس کی ادائیگی ضروری ہوگی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مومن غلام آزاد کیا جائے یا روزے رکھے جائیں۔

۳- تعزیری جرائم

۴۷۳- تعزیر لغت میں تادیب کو کہتے ہیں اور شرعی اصطلاح میں یہ ان جرائم پر تادیب کو کہتے ہیں جن میں کوئی سزا مقرر نہیں ہوتی۔[3]

۱- الھدایۃ، ج ۴، ص ۱۱۲، الکاسانی، ج ۲، ص ۵۶

۲- فتح القدیر، ج ۴، ص ۱۱۳، الماوردی، ص ۲۱۳-۲۱۵

۳- الماوردی، ص ۲۲۷، تبصرۃ الحکام لابن فرحون المالکی، ج ۲، ص ۳۵۸

تعزیری جرائم وہ شرعی ممنوعات ہیں جن کے لیے شریعت اسلامی میں کوئی سزا مقرر نہیں ہوتی۔ جیسے اجنبی عورت کے ساتھ خلوت میں رہنا، سود کھانا، امانت میں خیانت کرنا وغیرہ۔[1]

تعزیری سزا کا تعین حکمران یا مجاز افسر ہی کر سکتا ہے۔ وہ بھی اس سزا کا تعین اپنی خواہش سے نہیں کرے گا بلکہ دیکھے گا کہ جرم کتنا بڑا ہے، یہ کن حالات میں سرزد ہوا ہے، اس سے نقصان کتنا ہوا ہے، مجرم کی حالت کیا ہے، کیا وہ ایک صاحب مروت شخص ہے یا پہلے بھی اس سے مختلف قسم کے جرائم سرزد ہوتے رہے ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی دیکھے گا کہ کیا سزا دی جائے جس سے مجرم کی تادیب ہو جائے گی اور وہ آئندہ اس طرح کے گناہ کے پاس نہیں جائے گا۔[2]

تعزیر ہر عاقل بالغ پر اس وقت واجب ہوتی ہے جب وہ تعزیری جرائم میں سے کسی جرم کا مرتکب ہو جائے، خواہ مرد ہو یا عورت اور مسلمان ہو یا کافر۔ رہا سمجھدار بچہ تو اس کی تعزیر تادیباً کی جا سکتی ہے، بطور سزا نہیں ہے۔[3]

۲- سزا

تمہید

۴۷۴- ہم پیچھے کہہ آئے ہیں کہ اسلامی شریعت میں بدلہ دنیوی بھی ہوتا ہے اور اخروی بھی۔ پھر شریعت اسلامی میں اصل بدلہ آخرت کا ہے، مگر زندگی کے مقتضیات، معاشرے کے استحکام کی ضرورت، افراد کے تعلقات کو واضح انداز سے منظم کرنا اور ان کے حقوق کا ذمہ لینا، یہ سب امور اس بات کے داعی ہیں کہ اخروی سزا کے ساتھ دنیوی سزا بھی ہونی چاہیے۔ یہ بدلہ وہ سزا ہے جسے اسلامی حکومت ان لوگوں کے اوپر نافذ کرتی ہے جو کسی حرام کا ارتکاب کریں یا کسی واجب کو ترک کریں۔ یعنی کوئی جرم کر بیٹھیں۔ اس سزا سے ان لوگوں کی تادیب ہوتی ہے جن کے کے بارے میں وعظ و نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلامی فرد کی اصلاح کا بیڑا اُٹھاتی ہے مگر ایسی اصلاح جسے بنیادی اصلاح کہہ سکتے ہیں، اور یہ اصلاح، فرد کی عقیدے

۱- السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہ، ص ۱۱۹-۱۲۰، ردالمحتار لابن عابدین، ج ۳ ص ۲۵۱

۲- تبصرۃ الحکام، ج ۲ ص ۲۶۴، السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہ ص ۱۲۰

۳- الدر المختار، ردالمحتار، ج ۳ ص ۲۶۰

کی بنیاد پر تربیت کے ذریعے کی جاتی ہے۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانے اور اس سے خوف کھائے،اوران مختلف عبادات کوادا کرے جواللہ تعالیٰ نے اس پرفرض کی ہیں۔

یہ ساری چیزیں اس کے نفس کو بھلائی کے کاموں کے لیے آمادہ بنادیں گی۔ان کو برائی ناپسند ہوگی اور وہ جرائم سے دور ہوں گے۔ان سب میں نفس کی تادیب کا بہت بڑا سامان موجود ہے۔اس کے علاوہ شریعت معاشرے کی طہارت اوراس سے مفاسدکوزائل کرنے کا بھی اہتمام کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے افراد پر لازم کردیاہے کہ وہ منکر کاازالہ کریں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک پاکیزہ اور باعفت معاشرہ جرائم کی روک تھام اور مجرموں کی بیخ کنی میں بہت مدد دے گا۔اس سے دلوں میں بھلائی کا جذبہ بیدار ہوگا اور برائی کے چوردروازے بند ہوں گے،جن سے کمزوردل لوگ گناہوں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔اس طرح کا معاشرہ نفس کی تقویت اوراسے جرائم کے خلاف قوت فراہم کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔

مگراس سب کے ساتھ ساتھ بعض لوگوں کے لیے ان کے نفس نے جرائم کومزین کیاہوتا ہے۔چنانچہ ایک فوری سزا کی ضرورت تھی جسے اسلامی حکومت تادیب کے طور پران کے اوپر نافذ کرے۔تاکہ وہ دوبارہ اس کی طرف نہ لوٹیں اوردوسرے ایسے لوگوں کے لیے بھی عبرت ہوجن کے نفس نے جرم کوان کے لیے مزین کیاہوتاہے۔یہ چیز معاشرے کے استحکام اوراس میں سکون واطمینان کا ذریعہ ہوتی ہے۔اسی طرح ہم آگے بیان کریں گے کہ مجرموں کوسزادینا خودان کے بھی مفاد میں ہوتا ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ اگر توبۃ النصوح ساتھ شامل نہ ہوتو دنیوی سزا کسی مجرم سے اُخروی سزا کوروک نہیں سکتی۔اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے:

إِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوٓا أَوْ يُصَلَّبُوٓا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (المائدۃ۵:۳۳) جولوگ اللہ اوراس کے رسول سے لڑتے ہیں اورزمین میں اس لیے تگ ودَو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں،ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں،یا سولی پر چڑھائے جائیں،یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں،یاوہ جلاوطن کردیے جائیں۔یہ ذلت ورسوائی توان کے لیے دنیامیں ہےاورآخرت میں ان

کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔

توبۃ النصوح کی تکمیل کا ایک حصہ یہ ہے کہ اگر جرم کا تعلق دوسروں کے حقوق سے ہو تو آدمی ان سے بری الذمہ ہو جائے۔ ہماری اس بات کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ إِنَّ السَّارِقَ إِذَا تَابَ سَبَقَتْهُ يَدُهُ إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِنْ لَّمْ يَتُبْ سَبَقَتْهُ يَدُهُ إِلَى النَّارِ[1] اگر چور توبہ کرے تو اس کا [کٹا ہوا] ہاتھ اسے جنت میں لے جائے گا اور اگر توبہ نہ کرے تو اس کا ہاتھ اسے جہنم میں لے جائے گا۔

شرعی سزائیں: بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت

۴۷۵- اسلامی شریعت میں جو دنیوی سزائیں مقرر ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر رحمت کا مظہر ہیں۔ اس لیے کہ یہ سزائیں انسان کو جرم کے ارتکاب سے روکتی ہیں۔ چنانچہ وہ گناہ سے پاک ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جرم میں پڑ جائے تو اس کے حق میں سزا کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مریض کو داغنے کی ضرورت ہو تو اسے داغ دینا، یا جیسے کوئی عضو پورے جسم کے لیے خطرہ بن جائے تو اسے کاٹ دینا۔ یہ داغ دینا اور کسی عضو کو کاٹنا مریض کے فائدے اور اس کی زندگی کو باقی رکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس سے بیماری کو جسم کے دوسرے اعضا میں سرایت کرنے اور پورے جسم کو ہلاکت میں ڈالنے سے روکا جاتا ہے۔

اسی طرح مجرم کو دیے جانے والی اس سزا میں معاشرے کے لیے بھی یقینی فائدہ ہوتا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ اس لیے کہ سزاؤں کے نفاذ سے لوگ اپنی زندگی اور مال کے بارے میں سکون واطمینان حاصل کرتے ہیں اور مجرم لوگ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عمومی فائدہ ہے جس کے مقابلے میں وہ نقصان بہت معمولی محسوس ہوتا ہے جو مجرم کو اپنے جرم کی بنا پر ملتا ہے۔

شرعی سزاؤں کے نفاذ میں احتیاط

۴۷۶- شرعی سزاؤں کا نفاذ اور انھیں عملی جامہ پہنانا ضروری ہوتا ہے۔ اس میں حکمران کے لیے نرمی پیدا کرنے یا انھیں معطل کرنے کی گنجایش نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یہ اللہ کا قانون ہے۔ اس کو معطل کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اسی طرح یہ معاشرے میں فساد برپا ہونے اور اس کے احوال وظروف میں

۱- مجموع فتاوی ابن تیمیہؒ، ج ۲۸، ص ۲۹۹

اضطراب پیدا ہونے کا بھی ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ حدود اللہ کو معطل کرنا کبیرہ اور بدترین گناہوں میں سے ہے۔

گناہوں کا عام ہونا رزق کی کمی، دشمن سے خوف اور زندگی میں سختی و تنگی کا سبب بنتا ہے۔ جب شرعی حدود قائم ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت عام ہوتی ہے، گناہ کم ہوتے ہیں اور بھلائی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حکمرانوں کو چاہیے کہ حدود کے نفاذ میں سختی اختیار کریں اور اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملے میں کوئی شفقت اور نرمی ان کے آڑے نہ آئے۔

ان سزاؤں کے نفاذ سے ان کا مقصود لوگوں کو منکرات سے باز رکھتے ہوئے مخلوق خدا پر شفقت ہو نہ کہ اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنا، یا دنیا میں اپنی بڑائی قائم کر کے زمین میں فساد برپا کرنا۔ چنانچہ حکمران کا رویہ ایسا ہو جیسا ایک باپ کا اپنے بیٹے کی تادیب کے وقت ہوتا ہے۔ وہ اگر اپنے بچے کی تادیب کرتا ہے تو اس پر رحم کھاتے ہوئے اور اس کی اصلاح حال کی غرض سے کرتا ہے، اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے اور ہمیشہ اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ سزا کے ساتھ تادیب کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ یا حکمران کا رویہ ایسا ہونا چاہیے جیسا ایک ڈاکٹر کا ہوتا ہے جو اپنے مریض کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے۔

شرعی سزاؤں کے نفاذ میں مساوات

۴۷۷- شرعی سزائیں ان تمام لوگوں پر نافذ کی جاتی ہیں جن کے اندر سزا کے اسباب اور اس کی شرطیں موجود ہو جائیں۔ اس میں شریف اور کمینے یا طاقت ور اور کمزور کا کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ شرعی سزاؤں کے نفاذ میں جانب داری کا مظاہرہ امت کی ہلاکت کا ذریعہ بنتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ بنو مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ اس کی قوم کو اس معاملے نے پریشان کر دیا۔ انھوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ سے بات کی تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں بات کریں۔ جب انھوں نے اس طرح کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلال میں آ گئے اور فرمایا:

إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ، وَأَيْمُ اللّٰهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا.[1] یقیناً تم سے پہلے جو قومیں ہلاک ہو چکی ہیں تو اس کی وجہ یہی تھی کہ جب ان میں کوئی شریف

۱- تیسیر الوصول إلی جامع الأصول من حدیث الرسول ج ۲ ص ۱۴

آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کر دیتے۔ اللہ کی قسم، اگر فاطمہ بنت محمد چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب سزاؤں کے نفاذ میں رعایا کے درمیان مساوات کا خیال رکھا جائے تو یہ ان طاقت ور لوگوں کے لیے ایک بہترین دھمکی ہوتی ہے جن کی طاقت نے ان کے لیے جرم کو مزین کیا ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ان کی طاقت کی وجہ سے ان کی جانب داری کی جائے گی اور انھیں سزا نہیں دی جائے گی۔ وہ جب سزا دینے میں یہ قطعی مساوات دیکھیں گے تو وہ پیچھے ہٹ جائیں گے اور ان کا نفس ان کو یہ غلط وسوسہ نہیں ڈالے گا۔ وہ جب حکومت کی طرف سے اپنی سزا کے بارے میں مساوات اور سنجیدگی کا مشاہدہ کریں گے تو ان کی قوت انھیں سزا سے نہیں بچا سکے گی۔ اس لیے کہ حکومت کی قوت ان کی قوت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح کمزور کو اطمینان ملے گا کیوں کہ حکومت اس کی پشت پر ہوگی اور وہ ہر طاقت ور فرد سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ چنانچہ کمزور کو یہ خوف لاحق نہیں ہوگا کہ کوئی اس پر ظلم کرے گا۔

چونکہ حکمران سے مطلوب یہ ہوتا ہے کہ وہ رعایا پر سزا کے نفاذ میں عزم اور مساوات کا مظاہرہ کرے اس وجہ سے کسی کے لیے جائز نہیں ہوتا کہ وہ مجرم سے سزا کو ساقط کرنے کے لیے اس کی سفارش کرے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مَنْ حَالَتْ شَفَاعَتُهُ دُونَ حَدٍّ مِّنْ حُدُودِ اللهِ فَقَدْ ضَادَ اللهَ فِي أَمْرِهٖ. جس کی سفارش اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے کسی حد کے راستے میں حائل ہوگئی تو اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے کام میں ضد کیا۔

یہی دراصل وہ شفاعت سیئہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَّنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (النساء۴:۸۵) جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص ایک مجرم سے کسی شرعی حد کو ساقط کرنے کے لیے سفارش کرتا ہے وہ ایک بری سفارش کرتا ہے۔ پھر جیسا کہ کسی شرعی حد کو ساقط کرنے کے لیے بری سفارش جائز نہیں ہے اسی طرح حکمران کے لیے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ شرعی حد کو ساقط کرنے کے لیے مجرم سے کوئی مال وصول کرے۔ خواہ یہ مال بیت المال کے لیے وصول کرے یا کسی اور کے لیے۔ اس لیے کہ یہ ایک خبیث اور حرام مال ہے۔

شرعی سزاؤں کی بنا، عدل اور تہدید

۴۷۸- تمام شرعی سزائیں دو بڑی بنیادوں پر قائم ہوتی ہیں۔ ایک عدل اور دوسری تہدید۔ پہلی بنیاد (یعنی عدل) کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ سزا بقدر جرم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ ۴۲:۴۰) برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔

چنانچہ اس میں مجرم کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوتی، اگرچہ بعض جاہلوں نے اس قسم کی زیادتی کا گمان کیا ہے جیسا کہ ہم عن قریب بیان کریں گے۔

دوسری بنیاد (یعنی تہدید) کا اظہار اس دکھ کی مقدار سے ہوتا ہے جو سزا کی صورت میں مجرم کو پہنچتا ہے، یا اس نقصان سے جو سزا کی بنا پر آزادی کے فقدان یا بعض اعضا کے تلف ہونے کی صورت میں اس کو پہنچتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اشیا کے فقدان سے بھی اسے دکھ اور خوف لاحق ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جرم کرنے سے باز آتا ہے، جس کا محرک اپنی ذات کی محبت اور ایذا پہنچانے اور دردمند کرنے والی چیز سے خوف ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کے نفس نے جرم کو اور شیطان نے حدود اللہ کی مخالفت کو اس کے لیے مزین بنایا ہوتا ہے۔

سزا کی قسمیں

۴۷۹- اسلامی شریعت میں سزاؤں کی بھی تین قسمیں ہیں: حدود، قصاص و دیت اور تعزیر۔ ان کی طرف ہم اس سے پہلے جرائم کی تقسیم کے سلسلے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ انتہائی اختصار کے ساتھ ان سزاؤں میں سے ہر سزا کی مشروعیت کے دلائل اور سزا کی مقدار کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔

۱- حدود

۴۸۰- یہ حدود کے جرائم کی متعین سزا ہے اور یہ، جیسا کہ فقہا فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر واجب ہے۔ اس لیے کہ ان کا نفع عام ہوتا ہے اور ان میں کسی کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں ہوتی۔ جس چیز کا نفع عام ہوتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کا حق معتبر کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ سزا اپنی اہمیت اور جامعیت نفع کے لحاظ سے سارے انسانوں کے رب کی طرف منسوب کی گئی۔[1] اور اس لیے بھی کہ یہ نسبت اس کی طرف توجہ کے

۱- التلويح على التوضيح، ج۲ص۱۵۱

لازم ہونے، اس کے انتہائی اہم ہونے اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کرنے کا احساس دل میں اُجاگر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی کے سامنے ان سزاؤں کے ثبوت پیش ہونے کے بعد ان کے نفاذ کو ساقط کرنا جائز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جس شخص کا نقصان ہوا ہے وہ بھی اگر اس سزا کو ساقط کرنے کی تائید کرے تا کہ ان سزاؤں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حق معلق رہ جائے تب بھی یہی حکم ہوگا۔

حدود کے وہ جرائم جن میں اس قسم کی سزائیں ثابت ہوتی ہیں، ان میں زنا، قذف، شراب نوشی، چوری، حرابہ، ارتداد اور بغاوت کی سزائیں شامل ہیں۔

أ- زنا کی سزا

۴۸۱- زنا وہ جماع ہے جو نکاح یا شبہۂ نکاح یا ملکیت کے بغیر واقع ہو۔[۱]

اس کی سزا کوڑے یا سنگسار اور جلا وطن کرنا ہے۔

کوڑوں کی سزا کی دلیل تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِىْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (النور۲۴:۲) زانیہ عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔

سنت نبوی بھی کوڑوں کی سزا کی تائید میں وارد ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث وہ ہے جس میں آیا ہے کہ آپؐ نے ایک ایسے شخص کو ۱۰۰ کوڑے مارنے کا حکم دیا جس نے زنا کا اقرار کیا تھا۔ یہ شخص غیر شادی شدہ تھا۔[۲]

اگر زانی غیر شادی شدہ ہو تو اس کی سزا ۱۰۰ کوڑے ہونے میں فقہا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ رہا سنگسار کرنے کا معاملہ تو یہ سنت رسول سے ثابت ہے اور صحابہ کرامؓ نیز مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے۔ اس

۱- بدایة المجتهد، ج ۲، ص ۲۶۲

۲- تیسیر الوصول، ج ۲، ص ۷

اجماع سے خوارج کے علاوہ کسی نے تفرد اختیار نہیں کیا۔[1]

رجم کے معنی زانی کو پتھروں سے یا اس طرح کی کسی اور چیز سے مارنا ہے یہاں تک کہ وہ مرجائے۔ رجم صرف مُحْصَن یعنی شادی شدہ شخص پر واجب ہوتا ہے۔ اس پر علما کا اجماع ہے۔ احصان کی شرط یہ ہے کہ اس نے نکاحِ تام میں جماع کامل کیا ہو۔

جلاوطنی کے معنی یہ ہیں کہ زنا کار کو اس ملک سے، جس میں اس نے زنا کیا ہے، کسی اور ملک میں بھیج دیا کیا جائے۔ کوڑوں کی سزا کے ساتھ اس کے واجب ہونے میں علما کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک کوڑوں کی سزا کے ساتھ جلاوطنی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ حکمران کو اس میں مصلحت نظر آئے۔ اس صورت میں یہ تعزیر ہوگی نہ کہ حد۔ یہی مذہب زیدیہ کا بھی ہے۔ حنابلہ اور شافعیہ کے نزدیک غیر شادی شدہ زنا کار کو ۱۰۰ کوڑے مارنے کے ساتھ ایک سال تک جلاوطن کرنا ضروری ہے، خواہ مرد ہو یا عورت۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ مرد کو جلاوطن کیا جائے گا عورت کو نہیں۔ یہی بات امام اوزاعی نے کہی ہے۔[2]

۴۸۲- عملِ قومِ لوطؑ جمہور فقہا جیسے مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور امام ابوحنیفہؒ کے دونوں شاگردوں ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک زنا کے مفہوم میں شامل ہے۔ چنانچہ اس کی سزا وہی ہوگی جو زنا کی ہوگی۔[3]

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: درست بات وہ ہے جس پر صحابہ کرامؓ نے اتفاق کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اوپر اور نیچے (یعنی فاعل اور مفعول) دونوں کو قتل کردیا جائے، خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ اصحاب السنن نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: مَنْ وَجَدْتُّمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهِ.[4] تم جس کو دیکھو کہ عملِ قومِ لوطؑ کررہا ہے تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو۔

ب- قذف کی سزا

۴۸۳- قذف شریعت کی اصطلاح میں زنا کے الزام کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی شخص کی زنا کی طرف نسبت

۱- بدایة المجتهد ج ۲، ص ۳۶۳، المغنی ج ۸، ص ۱۵۷، المبسوط ج ۹، ص ۳۶

۲- شرح الكنز للزيلعي ج ۳، ص ۱۷۳-۱۷۴، المبسوط ج ۹، ص ۴۴-۴۵، المغنی ج ۸، ص ۱۶۷-۱۶۸، بدایة المجتهد ج ۲، ص ۳۶۴-۳۶۵

۳- الكاساني، ج ۷، ص ۳۴، الشرح الصغير للدردير، ج ۲، ص ۳۹۰-۳۹۳، كشاف القناع ج ۴، ص ۵۶-۵۷

۴- مجموع فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۲۸، ص ۳۳۴-۳۳۵

کرنا، مگر کچھ متعین شرطوں کے ساتھ۔ جیسے کہا جائے کہ ''اے زنا کار''۔

اس کی سزا ۸۰ کوڑے مارنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ یَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَّأُولٰٓئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ (النور ۲۴:۴) اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو ۸۰ کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو، اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔

یہاں نص اگر چہ پاک دامن عورتوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے مگر یہ حکم پاک دامن مردوں کے بارے میں بھی ثابت ہے۔ اس پر فقہا کا اجماع ہے۔[1]

قذف کی سزا کے واجب ہونے کے لیے کچھ شرائط رکھی گئی ہیں وہ یہ ہیں کہ الزام لگانے والا عاقل اور بالغ ہو اور جس پر الزام لگایا گیا ہے وہ **محصن** ہو، خواہ مرد ہو یا عورت۔ **محصن** ہونے کی شرائط عقل، بلوغ، آزادی، زنا سے پاک دامنی اور اسلام ہیں۔ یہ شرائط جمہور فقہا کے نزدیک ہیں۔ ظاہریہ کے نزدیک **محصن** ہونے کے لیے اسلام کی شرط نہیں ہے۔ چنانچہ جس نے کسی غیر مسلم عورت پر زنا کا الزام لگایا اس پر بھی اسی طرح حد واجب ہوتی ہے جیسا کہ اس شخص پر لازم ہوتی ہے جو ایک مسلمان عورت پر الزام لگائے۔ ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا مذکورہ بالا ارشاد ہے جس میں عموم ہے اور اس کے حکم میں کافر اور مسلم دونوں داخل ہیں۔[2]

۴۸۴- اگر شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور اپنے الزام کو ثابت کرنے سے عاجز ہو تو اس پر لعان واجب ہوتا ہے۔ اگر اس نے گواہوں کے ساتھ اپنے الزام کو ثابت کر دیا تو اس کی بیوی پر حد زنا لازم ہوگی۔

لعان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ إِلَّآ أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِیْنَ. وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَیْهِ إِنْ کَانَ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ. وَیَدْرَأُ عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْکَاذِبِیْنَ.

۱- تفسیر القرطبی ج ۱۲، ص ۱۷۲

۲- بدایة المجتهد ج ۲، ص ۳۶۸، المغنی ج ۸، ص ۲۱۶، الماوردی ص ۲۲۱، المحلّٰی ج ۱۱، ص ۲۶۸

وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ إِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ. (النور۲۴:۶-۹) اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام میں) سچا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ (اپنے الزام میں) جھوٹا ہو۔ اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص (اپنے الزام میں) جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس بندی پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر وہ (اپنے الزام میں) سچا ہو۔

اگر الزام لگانے کے بعد شوہر لعان کرنے سے انکار کرے تو جمہور کے قول کے مطابق اسے قذف کی سزا دی جائے گی۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اسے حد تو نہیں دی جائے گی مگر حکمران اسے جیل میں ڈالے گا۔ یہاں تک کہ یا تو لعان کرے اور یا اپنے آپ کو جھوٹا کہے۔ دوسری صورت میں اس پر حد جاری کی جائے گی۔

اگر بیوی نے لعان سے انکار کیا تو امام مالک اور شافعیؒ کے قول کے مطابق اس پر زنا کی حد قائم کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اسے قید کیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ لعان کے لیے تیار ہو جائے۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر بیوی نے انکار کیا تو اس پر حد قائم نہیں کی جائے گی۔ ان کے نزدیک لعان یا اقرار پر آمادہ کرنے کے لیے قید کرنے کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔[1]

ج-شراب نوشی کی سزا

۴۸۵-شراب کی حد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے شرابی پر کھجور کے پتوں اور جوتوں کے چالیس وار کیے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی ۴۰ کوڑے لگائے اور حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ۸۰ کوڑے مارے۔ جبکہ حضرت علیؓ ایک بار ۴۰ اور ایک بار ۸۰ کوڑے مارا کرتے تھے۔

چنانچہ علما میں سے کوئی کہتا ہے کہ ۸۰ کوڑے ضروری ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ ۴۰ کوڑے ضروری ہیں۔ ۴۰ کے اوپر جو اضافہ ہوگا وہ حکمران اپنی صوابدید پر ضرورت کے مطابق کرے گا۔ مثلاً یہ کہ لوگ شراب کے عادی ہو جائیں یا شراب پینے والا اس کے علاوہ راہِ راست پر نہ آئے یا اس طرح کی کوئی اور صورت ہو۔ لیکن

۱- بدایة المجتهد ج۲،ص۹۹،الهدایة وفتح القدیر ج۳،ص۲۵۰-۲۵۱،ابو یعلیٰ الحنبلی،ص۲۵۶

اگر شراب پینا عام نہ ہو اور شراب پینے والا اس کا مستقل عادی نہ ہو تو اس صورت میں ۴۰ کوڑے بھی کافی ہوں گے۔[1]

جس شراب کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور جس کے پینے والے کو کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا ہے وہ شراب ہے جو نشہ آور ہو، خواہ اس کا تعلق کسی بھی قسم سے ہو۔ خواہ وہ پھلوں کا ہو یا غلے کا، یا کسی اور چیز کا۔

اسی طرح کا معاملہ بھنگ کا بھی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھنگ پیتا ہے اس کو بھی اسی طرح کوڑے لگائے جائیں گے جیسا کہ شراب پینے والے کو لگائے جاتے ہیں۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَّكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ. ہر نشہ آور چیز شراب ہے، اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَّكُلُّ خَمْرٍ حَرَامٌ. ہر نشہ آور چیز شراب ہے، اور ہر شراب حرام ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ مَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهُ فَقَلِيْلُهُ حَرَامٌ. جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو تو اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہوتی ہے۔[2]

شراب کی حرمت سنت کے علاوہ قرآن کریم سے بھی ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (المائدۃ ۵:۹۰) یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔

۶- سَرقہ (چوری) کی سزا

۴۸۶- سرقہ اس کو کہتے ہیں کہ کسی اور کا مال خفیہ طور پر ظلماً لے کر اس پر زیادتی کی جائے۔ اس کی کچھ

۱- مجموع فتاوی ابن تیمیۃ، ج ۲۸، ص ۳۳۶-۳۳۷

۲- مجموع فتاوی ابن تیمیۃ، ج ۲۸، ص ۳۴۰-۳۴۲

مقررہ شرائط ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ مال محفوظ جگہ میں ہو اور اس کی قیمت ایک چوتھائی دینار سے کم نہ ہو۔[1]

اس کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا أَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (المائدۃ ۵:۳۸) اور چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔

کسی کے مال میں اس کے ساتھ زیادتی کی صورتوں میں سے ایک، امانت میں خیانت کرنا ہے، جسے فقہ کی اصطلاح میں چوری نہیں کہتے اور نتیجتاً اس پر چوری کی سزا بھی واجب نہیں ہوتی، بلکہ اس پر تعزیر لازم ہوتی ہے۔ جیسے کسی کی بطور امانت رکھی ہوئی چیز کو ضایع کرنا، ادھار لی ہوئی چیز سے انکار کرنا، یا اس طرح کی دوسری امانتوں میں خیانت کرنا۔ کسی کا مال زبردستی اس سے لینا، لوٹنا یا مالک کے ہاتھ سے اُچک لینا۔

۶- راہ زنی کی سزا

۴۸۷- ڈاکہ زنی یا حرابہ فقہا کے نزدیک اس کو کہتے ہیں کہ راستے میں بیٹھ کر کھلم کھلا ان کا مال زبردستی لے لیا جائے۔ یہ چیز اس بات کا ذریعہ بنتی ہے کہ لوگ راستوں سے گزرنا بند کردیں اور سڑک ویراں ہو جائیں۔ خواہ اس جرم کا ارتکاب کوئی فرد کرے یا ایک پوری جماعت اس کام کے لیے نکل آئے۔ خواہ ان کے ساتھ اسلحہ ہو یا وہ بغیر اسلحے کے ہوں۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کو 'محارب' کہتے ہیں۔[2]

ان لوگوں کی سزا کے بارے میں دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

إِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُّقَتَّلُوٓا أَوْ يُصَلَّبُوٓا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ. إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ

۱- الکاسانی، ج ۷، ص ۹۱-۹۲، شرح الخرشی، ج ۸، ص ۱۰۴

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (المائدۃ ۵:۳۳-۳۴) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلاوطن کردیے جائیں۔[1] یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے، مگر جو لوگ توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

ڈاکہ ڈالنے والے نے اگر کسی کو قتل بھی کیا ہے اور اس کا مال بھی لیا ہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اسے قتل کرکے، سولی پر لٹکایا جائے۔ اگر اس نے قتل کیا ہے مگر مال نہیں لیا تو پھر اسے قتل کیا جائے مگر سولی پر نہ چڑھایا جائے۔ اگر اس نے مال لیا ہے مگر قتل نہیں کیا تو پھر اس کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹے جائیں مگر قتل نہ کیا جائے۔ اگر قتل اور مال لینے میں سے کچھ بھی اس نے نہیں کیا مگر راستے کو پرخطر بنایا ہے تو پھر صرف جلاوطن کیا جائے۔

مالکیہ کے نزدیک راہزن نے اگر کسی کو قتل کیا ہے تو اسے قتل کرنا واجب ہے۔ اگر اس نے کسی کو قتل نہیں کیا بلکہ صرف مال لیا ہے تو پھر امام کو اختیار ہے کہ اسے قتل کرکے سولی پر چڑھائے یا مخالف سمتوں سے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے۔ اگر اس نے صرف راستے کو پرخطر بنایا ہے تو پھر امام کو اختیار ہے کہ قتل کرکے سولی پر چڑھائے، یا مخالف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹے یا اسے جلاوطن کردے۔[2]

ز۔مرتد کی سزا

۴۸۸۔ مرتد کے لغوی معنی مطلقاً پلٹنے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد دین اسلام سے پلٹنا کرنا ہے۔ ارتداد یا تو الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے، یا افعال کے ساتھ اور یا پھر اعتقادات کے ساتھ۔

۱۔ سولی پر چڑھانا یہ ہے کہ ان کو ایک لکڑی سے باندھا جائے تاکہ ان کا معاملہ خوب مشہور ہوجائے، اور لوگ ان کو پہچان لیں۔ مخالف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹا جائے۔ جلاوطنی سے مراد یہ ہے کہ مجرم کو اپنے ملک کے علاوہ کسی اور ملک میں قید کرلیا جائے۔

۲۔ السیاسة الشرعیة لابن تیمیۃ، ص۸۲-۸۳، المغنی لابن قدامہ، ج۸، ص۲۸۸، فتح القدیر ج۷، ص۲۶۸ ومابعد، بدایة المجتہد ج۸، ص۳۸۰، الکاسانی ج۷، ص۹۳

لفظی ارتداد یہ ہے کہ آدمی کفر کا کلمہ زبان سے ادا کرے، جیسے اللہ اور رسول کو گالی دینا۔ فعلی ارتداد یہ ہے کہ انسان کوئی ایسا عمل کر جائے جو اس بات کی دلیل ہو کہ یہ شخص دین کی توہین کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً دین کی توہین کے طور پر جان بوجھ کر بلا وضو نماز پڑھنا، یا جیسے قرآن کریم کو جان بوجھ کر گندگی میں پھینکنا۔

اعتقادی ارتداد یہ ہے کہ ایک مسلمان ایسی باطل چیزوں کا عقیدہ رکھے جو اسلام کی معروف ومشہور ضروریات کے خلاف پڑتی ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے وجود، یا قیامت، یا ملائکہ، یا جنات کا انکار، یا دنیا کے دائمی ہونے کا عقیدہ، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب، یا زنا کو حلال سمجھنا، یا یہ عقیدہ رکھنا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے، یا یہ کہ محمد رسول اللہ خاتم الانبیاء والرسل نہیں ہیں، اور اس طرح کے دوسرے عقائد۔

ارتداد کے واقع ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ مرتد عاقل بھی ہو اور اپنے فیصلے میں آزاد بھی۔ چنانچہ مجنون یا ایک ایسے بچے کا ارتداد وقوع پذیر نہیں ہوتا جو عقل نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح اس نشئی کا ارتداد جس کی عقل نشے کی وجہ سے بے حال ہو، یا اس مجبور آدمی کا ارتداد جس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ ارتداد کے واقع ہونے کے لیے مرد ہونا شرط نہیں ہے۔ اسی طرح حنفیہ کے نزدیک اس کے لیے بلوغ بھی شرط نہیں ہے۔ مگر اس میں وہ لوگ ان سے اختلاف کرتے ہیں جو بلوغ کو ارتداد کی شرط قرار دیتے ہیں۔[1]

مرتد ہونے والے شخص کی سزا قتل ہے، کیوں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ. جس نے اپنا دین بدل ڈالا اسے قتل کر دو۔

جمہور فقہا کے نزدیک یہ حکم مرتد ہونے والے مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ احناف کے نزدیک عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے قید میں ڈال دیا جائے گا، یہاں تک کہ توبہ کرے۔ قتل سے پہلے مرتد کو مہلت دینے کے معاملے میں جمہور فقہا کہتے ہیں کہ یہ واجب ہے، نیز اس کے سامنے اسلام کی پیش کش ہوگی۔ امید ہے کہ یہ اپنے ارتداد سے رجوع کرے۔ لیکن اگر پھر بھی اس نے انکار کیا تو پھر اسے قتل کیا جائے گا۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ مہلت دینا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔[2]

۱-بدائع الصنائع للکاسانی ج ۷، ص ۱۳۴، ردالمحتار ج ۳، ص ۳۹۲-۳۹۴، الفتاوی الهندیة ج ۲، ص ۳۵۳، المغنی ج ۸، ص ۱۲۳، شرح الخرشی فی فقه المالکیة ج ۸، ص ۶۲، شرح الازهار فی فقه الزیدیة، ج ۴، ص ۵۷۶

۲-الفتاویٰ الہندیۃ ج ۲، ص ۲۵۷، المغنی ج ۸، ۱۲۳-۱۲۵

ز۔ بغاوت کی سزا

۴۸۹- بغاوت کا جرم یہ ہے کہ ایک قوت وشوکت والی جماعت، امام سے ایک قابلِ قبول تاویل کے ساتھ خروج کرے، مگر وہ اسے قوت اور زبردستی کے ساتھ معزول کرنا چاہتے ہوں۔ ایسے گروہ کو فقہائے کرام 'بغاۃ' کا نام دیتے ہیں۔

اس جرم کی سزا کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيْٓءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ (الحجرات ۹:۴۹) اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔

باغی جب امام کی نافرمانی کا اعلان کریں، اس کا حکم ماننے سے کھلم کھلا انکار کریں اور جنگ کے لیے تیاری کرلیں، خواہ انھوں نے اپنا کوئی امیر مقرر کیا ہو یا نہ کیا ہو بہر حال اُن کی سزا یہ ہے کہ ان کے خلاف جنگ کی جائے، مگر ان سے جنگ اس وقت تک جائز نہیں ہوگی جب تک کہ امام ان کی طرف کوئی ایسا شخص نہ بھیج دے جو ان سے پوچھ گچھ کرے، ان پر حقیقت حال واضح کرے اور ان شبہات کو دلائل کے ساتھ رد کردے جن کی وجہ سے وہ لڑائی پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ وہ شخص ان کو اپنی بغاوت کے [اُخروی] انجام سے ڈرائے اور اس کے [دُنیوی] نتیجے سے بھی آگاہ کردے۔

یہ طریقہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ نے خوارج کے ساتھ اختیار کیا۔ انھوں نے خوارج کے پاس حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بھیجا۔ انھوں نے خوارج کو اطاعت اختیار کرنے اور اسلامی جماعت میں لوٹ آنے کی دعوت دی۔ جب انھوں نے انکار کیا تو ان کے خلاف لڑائی ہوئی۔

یہ بھی ہے جائز ہے کہ ان کے خلاف جنگ میں پہل کیا جائے، خواہ انھوں نے عملاً جنگ کا آغاز نہ ہی کیا ہو۔ یہ اس صورت میں ہوگا جبکہ امام کو معلوم ہو کہ یہ لوگ ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں اور آج کل آج کل کرتے ہوئے اپنی عددی قوت بڑھانے اور جنگ کی تیاری کے لیے وقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس صورت میں تو احتیاط اسی میں ہوگی کہ ان کی شرارتوں کے نتیجہ خیز ہونے اور ان کی قوت میں اضافہ ہونے

سے پہلے ہی ان کا کام تمام کر دیا جائے۔ تا کہ یہ معاملہ مزید مشکل صورت حال اختیار نہ کر جائے۔

اگر باغی اطاعت پر آمادہ ہوں اور اسلامی جماعت کے ساتھ آملیں تو پھر ان کے خلاف لڑنا جائز نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ مقصود تو حاصل ہو گیا، اور وہ یہ تھا کہ وہ امام کی اطاعت کی طرف لوٹ آئیں۔

جو لوگ باغیوں کے خلاف لڑتے ہیں ان پر کوئی گناہ، یا تاوان، یا کفارہ کوئی چیز بھی لازم نہیں ہے، کیوں کہ ان سے لڑنا اللہ تعالیٰ نے حلال کر دیا ہے۔ اسی طرح جس نے ان کا مال ضائع کیا اس پر بھی کوئی تاوان لازم نہیں ہوتا۔ نیز اگر باغیوں نے لڑائی کے دوران کسی کا جانی یا مالی نقصان کیا تو اس کا بھی ان سے کوئی تاوان نہیں لیا جائے گا۔ یہ حنابلہ اور حنفیہ کا قول ہے اور امام شافعیؒ کا ایک قول بھی ان کے ساتھ ہے۔ اس قول کی دلیل تاریخ کے وہ واقعات ہیں جو صحابہ کرامؓ اور خصوصاً حضرت علیؓ سے منقول ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ باغیوں کی تاویل قابل قبول ہے۔ اگر ان کو تاوان کا ذمہ دار ٹھیرایا جاتا ہے تو یہ ان کو اطاعتِ امام کی طرف رجوع کرنے اور جماعت کے ساتھ آملنے سے متنفر کرنے والی بات ہوگی۔ چنانچہ یہ ناجائز ہے۔[۱]

۲- قصاص و دیت

۴۹۰- اسلامی شریعت میں سزاؤں کی دوسری قسم قصاص و دیت ہے۔ یہ سزا اُس صورت میں واجب ہوتی ہے جب کسی کی جان لے لی جائے یا اس کم کوئی نقصان پہنچایا جائے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ سزا قتل اور زخموں یا کسی عضو کے کاٹنے سے واجب ہوتی ہے۔ قتل کے جرم میں بعض اوقات کفارہ بھی لازم ہوتا ہے۔ ہم ذیل میں ان سزاؤں کے بارے میں مختصراً بتائیں گے۔

أ- قصاص

قتل کے جرم میں قصاص یہ ہے کہ قاتل کو قتل کیا جائے۔ یہ مقتول کے اولیا کا حق ہے۔

اولیا اکثر فقہا کے نزدیک تمام ورثا اور نسبی و سببی رشتہ دار ہیں۔

۲- ابویعلیٰ الحنبلی، ص ۳۸-۳۹، الماوردی، ص ۵۵-۵۶، الکاسانی، ج ۷، ص ۱۱۳، ۱۴۰، الهداية وفتح القدير ج ۴، ص ۴۱۱، المغنی، ج ۸، ص ۱۰۸-۱۱۴، کشاف القناع ج ۴، ص ۹۹، مغنی المحتاج ج ۴، ص ۱۲۸، المهذب للشیرازی ج ۲، ص ۲۳۷، شرح الازهار ج ۴، ص ۵۷۰

جانی نقصان کے لیے قصاص کے واجب ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی. (البقرۃ ۲:۱۷۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے، اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے۔

قصاص کے واجب ہونے کے لیے کچھ شرائط ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ قتل عمداً اور ظلماً ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ **العمد قود** یعنی قتل عمد قابل قصاص ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مقتول معصوم الدم ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو جس کا قتل جائز ہو چکا ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ حیثیت میں قاتل کے برابر ہو۔ یعنی قاتل حریت یا اسلام میں اس پر فوقیت نہ رکھتا ہو۔ یہ شرط جمہور فقہا کے نزدیک ہے مگر حنفیہ اس کے قائل نہیں ہیں۔[1]

رہا وہ قصاص جو جانی نقصان سے کم جرائم میں واجب ہوتا ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَکَتَبْنَا عَلَیْھِمْ فِیْھَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ. (المائدۃ ۵:۴۵) توراۃ میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔

جان سے کم نقصان میں قصاص کے وجوب کے بارے میں سنت نبوی بھی وارد ہے۔ جیسا کہ رُبَیِّع بنت نضر کے واقعے میں آیا ہے، جس نے ایک لونڈی کا دانت توڑ دیا تھا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قصاص لینے کا حکم دیا تھا۔

جان سے کم نقصان میں جو قصاص واجب ہوتا ہے اس کی شرائط بھی وہی ہیں جو جان جانے کی صورت میں ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں دو مزید شرطوں کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ

۱- المغنی ج ۷، ص ۶۴۳ و مابعد، الکاسانی ج ۷، ص ۲۳۲ و مابعد، الماوردی ص ۲۲۲ و مابعد، بدایۃ المجتہد ج ۲، ص ۳۳۲، شرح الخرشی ج ۸، ص ۴، مغنی المحتاج ج ۴، ص ۱۶، شرح فتح القدیر ج ۸، ص ۲۵۴

مجرم اور متاثرہ شخص کے محل جرم میں مماثلت ہو۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ متاثرہ جگہ ایسی ہو کہ اس میں پورا پورا بدلہ لینا ممکن ہو۔[۲]

ب-دیت

۴۹۱-شریعت کی اصطلاح میں دیت اگر قتل کے معاملے میں ہو تو اس سے مراد وہ مال ہے جو مقتول کے وارثوں کو اس شخص کی طرف سے دیا جاتا ہے جس پر یہ مال واجب ہوتا ہے۔ اس کی مقدار میں اس جان کے اختلاف کے ساتھ اختلاف پیدا ہوتا ہے جس کے بدلے میں یہ مال واجب ہوتا ہے۔

چنانچہ حنفیہ کے نزدیک جب مقتول آزاد مسلمان مرد ہو تو اس کے بدلے میں اونٹوں میں سو اونٹ، سونے میں سو دینار، چاندی میں دس ہزار درہم، لباس میں دوسو جوڑے (جن میں ہر جوڑا دو کپڑوں یعنی ازار اور چادر پر مشتمل ہوگا)، گائیوں میں دوسو گائیں اور بکریوں میں ایک ہزار بکریاں واجب ہوں گی۔ عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہوگی۔ اور پیٹ میں موجود بچے کی دیت اس کی ماں کی دیت کا دسواں حصہ ہوگی۔

قتل خطا اور شبہ عمد میں دیت قاتل کے عاقلہ پر واجب ہوگی۔ عاقلہ سے مراد نسبی رشتہ دار ہیں۔ یعنی قاتل کے وہ مرد رشتہ دار جن کا اس کے ساتھ رشتہ باپ کی طرف سے ہو۔ حنابلہ نے اس کے ساتھ سببی رشتہ دار بھی شامل کیے ہیں جو ولایت اعتاق کی بنا پر اس کے رشتہ دار بن گئے ہوں۔

حنفیہ کے نزدیک عاقلہ سے مراد قاتل کے قابل جنگ ہم پیشہ لوگ ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو پھر اس کا قبیلہ اس کے لیے عاقلہ ہوگا۔

دیت کی رقم تین سال میں قسطوں کی صورت میں ادا کی جائے گی۔ عاقلہ میں سے ہر شخص دیت کا اتنا حصہ ادا کرے گا جتنی اس کی استطاعت ہو۔ قتل عمد میں بھی اگر مقتول کے وارث دیت لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔ یہ بات ان ائمہ کے نزدیک ہے جو مقتول کے وارثوں کو اختیار دیتے ہیں کہ قصاص لیں یا دیت لیں۔ اس صورت میں دیت صرف قاتل کے مال میں سے ادا کی جائے گی۔[۱]

۲-المغنی، ج ۷، ص ۷۰۲-۷۰۷، تفسیر القرطبی ج ٦ ص ۱٦۱ و مابعد، الدر المختار، ج ۵ ص ۴۸۵، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۹۷۔

۱-الدر المختار و رد المختار ج ۵، ص ۵۰۴-۵۰۷، الکاسانی ج ۷، ص ۲۵۱-۲۵۷، المغنی ج ۷، ص ۷۵۹ و مابعد، بدایۃ المجتہد ج ۲، ص ۳۴۵، المحلی لابن حزم، ج ۱۱، ص ۵۸، مختصر المزنی ج ۵، ص ۱۴۱، مغنی المحتاج ج ۴، ص ۵۵، شرح الازہار ج ۴، ص ۴٦۸

۲- کفارہ

۳۹۲- کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دو ماہ مسلسل روزے رکھنا ہے۔ قتل خطا میں کفارہ بھی واجب ہوتا ہے۔ اس میں علما کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح بہت سے فقہا جیسے حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک قتل شِبہ عمد میں بھی کفارہ واجب ہوتا ہے۔ قتل عمد کی صورت میں کفارے کے واجب ہونے کا قول شافعیہ اور زیدیہ کا ہے۔ حنفیہ وظاہریہ اور حنابلہ کا بھی مشہور مذہب یہ ہے کہ قتل عمد میں کفارہ واجب نہیں ہوتا۔[۱]

۳- تعزیر

۳۹۳- سزاؤں کی تیسری قسم تعزیر ہے۔ اس کی تعریف ہم پہلے کر چکے ہیں اور وہاں ہم یہ بھی کہہ آئے ہیں کہ یہ ہر گناہ کے کام (واجب کے ترک یا کسی ممنوع کے ارتکاب) میں واجب ہوتی ہے۔ شریعت میں اس کی سزا کا کوئی تعین نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر ایک نوجوان لڑکے کا بوسہ لینا، کسی حرام چیز، جیسے خون یا مردار کو کھانا، لوگوں کو زنا کے سوا گالیاں دینا، غیر محفوظ مقام سے چوری کرنا، نصاب سے کم مقدار کی چیز چوری کرنا، امانت میں خیانت کرنا (جیسے وکیل اور شریک کا خیانت کر جانا)، معاملے میں دھوکہ دہی، ناپ تول میں کمی کرنا، جھوٹی گواہی دینا، رشوت لینا، جاہلی طریقے سے تعزیت کرنا اور اس طرح کی دوسری محرمات۔

ان امور کا ارتکاب کرنے والے کو تعزیر کے طور پر سزا دی جائے گی، جس کی مقدار کا تعین وہ لوگ کریں گے جو سزا دینے کا اختیار رکھتے ہوں، جیسے حکمران اور قاضی وغیرہ۔ اس کا اندازہ وہ اس بات سے لگائیں گے کہ لوگوں میں ان محرمات کی صورت حال کیا ہے۔ اگر ایک گناہ لوگوں میں کثیر الوقوع ہے تو اس کی سزا زیادہ ہوگی۔ لیکن اگر اس کا لوگوں میں عام رواج نہیں ہے تو اس کی سزا بھی کم ہوگی۔ اسی طرح اس میں مجرم کی حالت کا بھی لحاظ کیا جائے گا۔ اگر جرم ایسے شخص سے سرزد ہوا ہے جو پہلے بھی جرائم اور فسق وفجور میں مبتلا رہا ہے تو اس کی سزا زیادہ ہوگی۔ لیکن اگر جرم پہلی بار سرزد ہوا ہے تو اس کی سزا کم ہوگی۔ نیز اس میں جرم کا چھوٹا بڑا ہونا بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔ جو شخص سارے لوگوں کی عورتوں اور بچوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے اور یہ

۱- المغنی، ج ۷، ص ۶۵۱، ج ۸، ص ۹۶-۹۷، الدر المختار، ج ۵، ص ۴۶۷-۴۶۸، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۵۱، المحلّٰی، ج ۱۰، ص ۵۱۴، البحر الزخار، ج ۵، ص ۲۲۲، متن المنهاج ومغنی المحتاج، ج ۴، ص ۱۰۷

کام اس سے بار بار سرزد ہوتا ہے اس کی سزا ایسے شخص کے مقابلے میں کم ہوگی جو کسی ایک عورت یا ایک بچے سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔

تعزیر کی قسمیں

۴۹۴۔ تعزیر ہر اس قول و فعل یا ترک کلام اور قطع تعلق کے ساتھ ممکن ہے جس سے آدمی دردمند ہو۔ بعض اوقات ایک شخص کی تعزیر نصیحت کرنے، ڈانٹ پلانے یا سختی برتنے کے ساتھ کی جاتی ہے۔ کبھی تعزیر کا طریقہ بائیکاٹ کرنا اور سلام کلام ترک کرنا ہوتا ہے، یہاں تک کہ آدمی توبہ کرے یا اپنے گناہ سے ہاتھ کھینچ لے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ نے ان 'تین افراد' سے بائیکاٹ کیا تھا ''جن کا معاملہ مؤخر کیا گیا تھا''۔[1] کبھی تعزیر کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو ذمہ داری سے برطرف کیا جائے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات تعزیر جلاوطنی، قید کرنے یا مار پیٹ سے ہوتی ہے۔ کبھی تعزیر کے لیے آدمی کا چہرہ کالا کیا جاتا ہے اور کبھی اس پر مالی جرمانہ لگایا جاتا ہے، جیسا کہ سنت نبوی سے ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی صراحیاں توڑنے اور اس کے مشکیزے پھاڑ دینے کا حکم دیا۔ غزوہ خیبر کے دن اُن ہانڈیوں کو، جن میں گدھوں کا گوشت پکایا جاتا تھا، اوندھا کر دینے اور یہ گوشت ضائع کرنے کا حکم دیا۔

تعزیر کی ایک مثال آپ کا مسجد ضرار کو ڈھا دینا ہے۔ یہی طریقہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے بھی اختیار کیا۔ انھوں نے اس مکان کو جلا دینے کا حکم دیا جس میں شراب کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس کی ایک مثال مانعین زکوٰۃ کے مال کا ایک حصہ زبردستی لینا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس دودھ کو انڈیل دیا جس میں بیچنے کے لیے پانی ڈال دیا گیا تھا۔

آخری بات یہ ہے کہ کبھی کبھی تعزیر قتل کی صورت میں بھی ہوتی ہے، جیسا کہ اس مسلمان جاسوس کو قتل کیا جاتا ہے جو دشمن کے لیے مسلمانوں کی جاسوسی کرتا ہے۔ یہ مذہب امام مالک اور بعض حنابلہ کا ہے۔[2]

زیادہ سے زیادہ تعزیر

۴۹۵۔ علما کے درمیان اس بات میں اختلاف ہوا ہے کہ تعزیر کی زیادہ سے زیادہ مقدار کیا ہے۔ اس

۱۔ اشارہ ہے حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے ساتھیوں کے واقعے کی طرف۔ دیکھیے سورۃ التوبۃ ۹: ۱۱۸ کی تفسیر۔ (مترجم)

۲۔ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ج ۲۸ ص ۱۰۷-۱۰۸، ۳۴۴-۳۴۵

سلسلے میں ان سے جو اقوال منقول ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- دس کوڑے

۲- کسی جرم کی کم از کم حد سے ایک درجہ کم، یعنی ۳۹ کوڑے یا ۷۹ کوڑے۔

۳- تعزیر کا اندازہ حد سے نہیں لگایا جائے گا بلکہ اگر تعزیر کسی ایسے جرم کے بارے میں ہو جس کی کوئی ایک مقدار پہلے سے متعین ہو تو اس متعین مقدار میں کچھ کمی کی جائے گی، اگر چہ یہ سزا کسی دوسرے جرم کی سزا سے بڑھ ہی جائے۔ مثلاً ایسی چوری جس کی مقدار، نصابِ سرقہ سے کم ہو تو اس کی تعزیر اتنی نہیں ہوگی کہ قطع ید تک پہنچ جائے، مگر یہ ہوسکتا ہے کہ چور کو اتنا مارا جائے کہ اس کی مقدار حد قذف سے زیادہ ہو جائے۔ اسی طرح زنا سے کم کوئی فعل ہوا ہو تو اس میں تعزیر حد زنا کی مقدار تک نہیں پہنچنی چاہیے اگر چہ ضرب کی مقدار حد قذف سے بڑھ جائے۔ یہ قول جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں، زیادہ مبنی بر انصاف ہے۔ اسی پر سنت رسولؐ بھی دلالت کرتی ہے۔[1]

ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا قتل کے ساتھ تعزیر جائز ہے؟ امام مالک کی رائے جواز پر مبنی ہے اور جزوی طور پر اس میں ان کے ساتھ امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے اصحاب میں سے بھی بعض نے اتفاق کیا ہے۔

ان کے نزدیک ایسے بدعتی کا قتل جائز ہوتا ہے جو مخالف کتاب وسنت بدعتوں کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہو۔ رہا مسلمان جاسوس کے قتل کا معاملہ، جس کی امام مالک اور بعض حنابلہ نے اجازت دی ہے، اسے امام شافعی نے ممنوع قرار دیا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بعض مقامات پر تعزیر بالقتل کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک جرم بار بار کیا جائے، اور اس کی جنس ایسی ہو کہ جس سے قتل واجب ہوتا ہے۔ جیسے اس شخص کو قتل کرنا جائز ہے جس سے قوم لوطؑ کا عمل بار بار صادر ہوتا ہے، یا لوگوں سے مال لینے کے لیے ان کو اغوا کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص ایسا ہو کہ اس کے فساد کو اس کے قتل کے علاوہ کسی طریقے سے نہ روکا جاسکتا ہو تو اس کا قتل جائز ہوگا۔ جیسے امت مسلمہ میں افتراق پیدا کرنے والا۔

اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جس میں آیا ہے کہ مَنْ أَتَاكُمْ وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ عَلَى رَجُلٍ

۱- مجموع فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ج ۲۸، ص ۱۰۸

وَّاحِدٍ ، یُرِیْدُ أَنْ یَّشُقَّ عَصَاکُمْ أَوْ یُفَرِّقَ جَمَاعَتَکُمْ فَاقْتُلُوْہُ. جو شخص تمھارے پاس اس حالت میں آئے کہ تمھارا معاملہ ایک آدمی پر مجتمع ہو اور یہ [نیا آنے والا شخص] تمھاری لاٹھی کو توڑنا چاہے یا تمھاری جمعیت کو منتشر کرنا چاہے تو اسے قتل کردو۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو شراب سے باز نہ آئے تو آپؐ نے فرمایا: مَنْ لَّمْ یَنْتَهِ عَنْهَا فَاقْتُلُوْہُ. جو اس سے باز نہ آئے اسے قتل کردو۔

یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ تعزیر بالقتل جائز ہے۔[1]

چند شبہات اور ان کا ازالہ

۴۹۷۔ بعض لوگ اسلام کے نظامِ جرم وسزا پر ایسے اعتراضات کرتے ہیں جو اُن کے خیال میں بڑے وزنی ہیں۔ ان اعتراضات میں سے ایک یہ ہے کہ موجودہ دور میں شرعی سزاؤں کا نفاذ ممکن نہیں ہے، یا کم از کم یہ کہا جاتا ہے کہ ساری تو نہیں مگر بعض شرعی سزائیں ضرور ایسی ہیں۔

اس اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ زنا، قذف یا شراب نوشی میں کسی کو کوڑے مارنے سے انسان کی انسانیت مجروح ہوتی ہے۔ بعض سزاؤں میں انسان کی شخصی آزادی میں مداخلت ہوتی ہے، جیسے زنا اور شراب نوشی، یا چوری اور ڈاکے کی سزا میں مختلف اعضا کاٹنا، زنا کے جرم میں شادی شدہ شخص کو قتل کرنا۔ اسی طرح بعض سزائیں عقیدے کی آزادی میں مداخلت کے مترادف ہیں، جیسے مرتد کی سزا۔ نیز بعض سزاؤں میں اپنے مخالف کو قتل کرنا لازم آتا ہے جیسے قصاص کی سزا میں معاشرے کے بجائے ایک فرد کو سزا دینے کا حق دینا۔ اسی طرح قتل کی سزا میں قاتل کے اقارب کو بھی دیت کی ادائیگی میں شریک کیا جاتا ہے اور ان پر بھی سزا کا بوجھ ڈالا جاتا ہے، حالانکہ یہ بات ہر فرد کی الگ الگ سزا اور کسی شخص کے کسی دوسرے کے جرم کا ذمہ دار نہ ہونے کی قدر کے بھی خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اعتراضات لغو ہیں اور ان کی بنیاد پر جو استدلال کیا جاتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ فضول ہے۔ اگرچہ یہ اعتراضات کرنے والے ان سے بڑے غرور میں ہیں اور وہ اسے بڑے قوی اور مضبوط دلائل سمجھتے ہیں اور ان کی وجہ سے اپنے اعتراضات کو حق بجانب خیال کرتے ہیں۔ ان کی خوش فہمی

۱۔ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۲۸، ص ۳۴۵ - ۳۴۷

ہے کہ وہ ان کو اپنے لیے شرعی سزاؤں سے آزاد ہونے کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان اعتراضات کو کسی حد تک تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

۱- انسان کی توہین

۴۹۸- ان کا یہ کہنا قابل قبول نہیں ہے کہ کوڑے مارنے سے انسان کی توہین ہوتی ہے۔ اس لیے کہ [اگر یہ توہین ہے تو] مجرم نے اپنی یہ توہین خود ہی کی ہے۔ اس نے اپنا احترام نہیں کیا کہ اپنے آپ کو ذلت کے لیے پیش کیا اور اس سے بچنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ زنا کار جس نے دوسرے کے برتن میں منہ مارا ہے تو اس کے لیے وعظ و نصیحت یا ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ایسا شخص صرف معنوی تکلیف کا نہیں، بلکہ کوڑے کے ساتھ مارے جانے اور جسمانی تکلیف پہنچائے جانے کا محتاج ہے۔

رہی یہ بات کہ شادی شدہ ہونے کی صورت میں اسے سنگسار کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص اسلامی معاشرے میں رہنے کے قابل ہی نہیں رہا، جو ایک پاکیزہ معاشرہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے تو ایسی حالت میں دوسرے کے برتن میں منہ مارا ہے جب کہ اس کے پاس اپنا کافی برتن موجود تھا۔

اور قذف کی سزا میں کوڑے اس لیے مارے جاتے ہیں کہ جس عورت پر زنا کا الزام لگایا گیا ہے یہ سزا اُسے اس الزام سے بری الذمہ کرنے اور اس سے شکوک وشبہات کے ازالے کا راستہ ہے۔ اس کے لیے یہی ایک راستہ ہے کہ الزام لگانے والے کو سزا دے کر اس کی کذب بیانی کا اظہار ہو جائے۔

مسئلے کا اصل راز یہ ہے کہ اسلام معاشرے کی طہارت و پاکیزگی کا بہت اہتمام کرتا ہے اور اس کی عزت اور اخلاق کو سالم رکھنا چاہتا ہے۔ جب یہ امور مطلوب ہیں تو اس کے لیے جو وسائل درکار ہوں گے وہ بھی مطلوب ہوں گے۔ اسلام اسی بات کی تاکید کرتا ہے۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ امور یعنی، عفت، عزت اور اخلاق کی حفاظت اور معاشرے کی طہارت نامرغوب ہے، تب تو اس کے وسائل بھی نامرغوب ہوں گے۔

جو لوگ شرعی سزاؤں پر اعتراض کرتے ہیں تو ان کی بات کا ضمنی نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ چنانچہ اصل اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ ان عزتوں اور حرمتوں کی حفاظت ضروری ہے یا نہیں۔ اسلام تو یہ کہتا ہے کہ ان کی

حفاظت کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے ان لوگوں کے ساتھ سختی اختیار کی ہے جو معاشرے کو آلودہ اور ان ضروری اور عالی شان اغراض کو ضائع کرنا چاہتے ہیں۔

۲- شخصی آزادی کی نفی

۴۹۹- رہا ان کا یہ دعویٰ کہ یہ سزائیں شخصی آزادی میں دخل اندازی ہیں، جیسا کہ زنا اور شراب نوشی کا معاملہ ہے تو یہ بھی مردود ہے۔ اس لیے کہ شخصی آزادی اجتماعیت کے نقصان کا ذریعہ بن جائے، یہ بھی جائز نہیں ہے۔

شخصی آزادی جہاں سے اجتماعیت کے لیے نقصان اور فساد کا آلہ بن جاتی ہے وہاں سے اس کے حدود ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی منصف مزاج آدمی کے لیے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ زانی کا عمل زنا اجتماعیت کے لیے مفید ہے۔ اس کے نقصانات اتنے زیادہ اور واضح ہیں کہ اس مقام پر انھیں بیان کرنا نہ ضروری ہے اور نہ ممکن ہے۔

شراب کے معاملے میں بات یہ ہے کہ انسان کی عقل ایک ایسا قیمتی جوہر ہے کہ اسے جان بوجھ کر معطل کر دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ نیند کی حالت میں وہ مجبوراً معطل ہو جاتی ہے۔ یہ شراب کا صرف ایک پہلو ہے۔

شراب پینے سے جس طرح مختلف جرائم کے راستے آسان ہو جاتے ہیں، وہ اس کے علاوہ ہے۔ حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی حدود میں جرائم کی روک تھام کرے اور اس کے جتنے راستے ہیں ان پر قدغن لگائے۔

۳- تشدد کا پہلو

۵۰۰- رہا ان کا یہ دعویٰ کہ ان سزاؤں میں سے بعض کے اندر بڑی شدت پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ ان میں اعضا کاٹ دیے جاتے ہیں اور لوگوں کو ٹنڈا بنایا جاتا ہے تو یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ چور اور ڈاکو پُر امن لوگوں کے لیے کتنی دہشت کی علامت ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کو چور کے عمل کا تصور کرنا چاہیے تھا کہ وہ کس طرح رات کے اندھیرے میں دبے پاؤں چلتے ہوئے لوگوں کی دیواروں میں نقب لگاتا ہے یا تالے توڑتا ہے اور گھر کے پُرسکون افراد پر جا دھمکتا ہے۔ ان میں مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی، بچے بھی اور بوڑھے بھی۔ اس کے ہاتھ میں اسلحہ ہوتا ہے، اگر کوئی مزاحمت کرتا ہے تو یہ اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ گھر کا ساز و سامان اٹھا کر نکل جاتا

ہے۔ بعض اوقات گھر والے جاگ جاتے ہیں تو وہ یا تو موت کا پیالہ پی لیتے ہیں، ورنہ اضطراب اور پریشانی سے ضرور دوچار ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ یہ لوگ اگر چور کے جرم کے پریشان کن ہونے کا تصور کر لیتے تو انھیں اس بات کا افسوس نہ ہوتا کہ چور کے فسادی اور گناہ گار ہاتھ کو کاٹ دیا گیا۔ یہی بات ڈاکوؤں کے بارے میں بھی کہی جائے گی جو راستے میں بیٹھ کر لوگوں کا انتظار کرتے ہیں، جب کوئی آتا ہے تو یہ اچانک ان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کو مال و جان سے محروم کر دیتے ہیں۔

پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سزا کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں لوگوں کی عبرت اور ان کو خوف زدہ کرنے کا پورا پورا سامان ہو۔ چنانچہ یہ بات کسی شک وشبہے سے بالاتر ہے کہ چور اور ڈاکو کی سزا میں یہ چیز موجود ہے۔ مگر اس کے علاوہ جو خود ساختہ سزائیں ہیں، جیسے قید کرنا اور جرمانہ لگانا، تو ان میں عبرت کا کافی سامان موجود نہیں ہوتا۔ زمینی حقائق اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ چوری کے جرائم روز افزوں ہیں اور قید کی سزاؤں نے اس میں کچھ بھی کمی نہیں کی ہے۔ بلکہ جو لوگ جیل کے پرانے عادی ہیں ان کے لیے تو جیل ایک مہمان خانے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ وہ بار بار اس کی طرف آتے ہیں اور انھوں نے اس کو اپنے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ سمجھ لیا ہے۔ بلکہ یہ تو مجرموں کے مل بیٹھنے اور جرائم کی دنیا کے بارے میں معلومات کے تبادلے کی محفوظ جگہ ہے۔

۴- عقیدے کی آزادی پر قدغن

۵۰۱- ان کا یہ قول کہ ارتداد کی سزا جس میں مرتد کو قتل کیا جاتا ہے، آزادیٔ عقیدہ میں مداخلت اور اس کو سلب کرنا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ایک انسان کو اُس عقیدے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، جسے وہ قبول نہ کرنا چاہتا ہو۔ یہ اعتراض اس سزا کی نوعیت، ارتداد کے مفہوم، اور تبدیلی مذہب پر مجبور کرنے کے مفہوم سے جہالت کا نتیجہ ہے۔

ارتداد، اسلام سے رجوع کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ایک مسلمان اسلام سے منہ موڑ لے۔ چنانچہ ہم ایک مسلمان کے عمل کو، جس نے ایک متعین جرم کیا ہے، ارتداد کا نام دیتے ہیں۔ اس میں ہمارا معاملہ کسی یہودی یا عیسائی کے ساتھ نہیں ہوتا کہ ہم اس کو اپنا عقیدہ بدلنے پر مجبور کر رہے ہوں۔ لا اِکراہَ فی الدین تو خود شریعت اسلامیہ کی ایک اہم قدر اور قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ اس کو بدلنے کا کسی کو مجال نہیں ہے۔

اس کی ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ اسلام نے جزیہ کا حکم دیا ہے، حالانکہ جزیہ اس بات کا اعلان ہے کہ ایک غیر مسلم اپنے دین پر باقی رہ سکتا ہے۔ اگر اسلام غیر مسلموں کو اپنا عقیدہ بدلنے پر مجبور کرتا اور اسے جبراً مسلمان بناتا، تو پھر جزیہ کا حکم نہ ہوتا۔

رہا یہ مسئلہ کہ مرتد کی سزا کی وجہ کیا ہے اور یہ سزا موت کی صورت میں کیوں ہے، تو اس کا مرجع دو اہم امور کی طرف ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان مرتد ہو کر اپنے اوپر لازم کردہ ایک چیز میں خرابی پیدا کرتا ہے۔ اس لیے کہ مسلمان اسلام کو قبول کر کے اسلام کے احکام اور اس کے عقیدے کو اپنے اوپر لازم کرتا ہے۔ چنانچہ جب وہ مرتد ہوتا ہے تو وہ اپنے اوپر لازم کردہ امر میں خرابی پیدا کر کے ایک اور جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔

جو شخص عمداً اپنے معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ سزا کا مستحق بنتا ہے۔ جس کی سزا بعض اوقات موت تک ہوتی ہے۔ کیا دیکھا نہیں، کہ ایک شخص جب کسی ریاست کے ساتھ یہ معاہدہ کر لیتا ہے کہ وہ فوج کے لیے کھانے کی اشیا پہنچائے گا اور پھر وہ ایسی حالت میں اپنے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے جب کہ فوج کو کھانے کی اشیا کی اشد ضرورت ہو تو ایسے شخص کی سزا بھی بعض اوقات موت تک جا پہنچتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مرتد جب اپنے معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ ایک اور جرم کا ارتکاب کر لیتا ہے۔ وہ جرم یہ ہے کہ وہ ریاست کے مذہب اور اس کے مسلمان باشندوں کے عقیدے کا مذاق اڑاتا ہے اور دوسرے منافقین کو جرأت دلاتا ہے کہ وہ بھی اپنے نفاق کا کھلم کھلا اظہار کریں۔ اسی طرح وہ ضعیف العقیدہ لوگوں کے دلوں میں ان کے عقیدے کے بارے میں شک پیدا کرتا ہے۔ یہ سارے وہ خطرناک جرائم ہیں جن کی بنا پر مرتد اس بات کا مستحق بنتا ہے کہ اس کی جان لے لی جائے اور لوگوں کو اس کے شر سے محفوظ کیا جائے۔

ہم نے کہا ہے کہ مرتد [درحقیقت ایک جرم نہیں کرتا بلکہ] بہت سارے جرم کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ارتداد کا علم ہی اس طرح ہوتا ہے کہ وہ اس کی صراحت کرتا ہے۔ اگر وہ اپنے ارتداد کو مخفی رکھتا تو کسی کو اس کا علم کیسے ہوسکتا تھا۔ اس کے باوجود ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی تا کہ اسے اپنے ارتداد سے توبہ کرنے کا موقع مل سکے۔ یہ مہلت اکثر فقہا کے نزدیک واجب ہے۔ پھر کیا اس کے باوجود یہ کہنا درست ہے کہ مرتد کی سزا سخت ہے، یا اس میں کسی کو عقیدے کی تبدیلی پر مجبور کیا جاتا ہے، یا پھر

اس میں عقیدے کی آزادی میں مداخلت لازم آتی ہے؟!

۵-قصاص میں اولیائے مقتول کا حق

۵۰۲-رہا ان کا یہ کہنا کہ قتل کے جرم میں جو سزا مقرر ہے، یعنی قصاص، تو وہ مقتول کے اولیا کا حق قرار دیا گیا ہے، نہ کہ اجتماعیت کا، حالانکہ قتل کا جرم پورے معاشرے کے لیے اہمیت رکھتا ہے، اور یہ معاشرے کے خلاف بغاوت تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سزا بھی اجتماعیت کا حق ہونا چاہیے، نہ کہ مقتول کے وارثوں کا۔

یہ بات بھی بالکل فضول اور سطحی ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سزا میں اجتماعیت کا حق بھی محفوظ ہے اور وہ اس طرح کہ اگر مقتول کے وارثوں نے اس کو معاف کر دیا تو قاضی اس کو قید کر کے یا کوڑے مار کر، یا دونوں طریقوں سے تعزیری سزا دے سکتا ہے۔ یہی بات ابن فرحون مالکیؒ نے بیان کی ہے: 'اگر قتل عمد کے مجرم کو دیت لے کر معاف کیا گیا، تو دیت دینا اس پر لازم ہے اور کفارہ دینا اس کے لیے مستحب ہے۔ اسے سو کوڑے مارا جائے گا اور ایک سال تک قید میں رکھا جائے گا۔'[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ قصاص میں مقتول کے وارثوں کا حق معاشرے کے حق سے غالب ہے، اسی لیے تو ان کو معافی کا حق دیا جاتا ہے، اور وہی قصاص کے مطالبے کا حق رکھتے تھے۔ اگر وہ اس کا مطالبہ کرتے ہیں تو قاضی کو معاف کرنے کا حق نہیں ہوتا، بلکہ اگر مقتول کے وارث مطالبہ کر رہے ہوں تو سربراہ مملکت کو بھی اسے معاف کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کیوں کہ قصاص انھی کا حق ہے، یا کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ان کا حق غالب ہے۔ چنانچہ ان کی رضامندی کے بغیر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس میں تصرف کرے۔

مگر خود ساختہ قوانین میں قصاص کا تصور مختلف ہے۔ یہ قوانین قاتل کی سزا کو اجتماعیت کا حق قرار دیتے ہیں، نہ مقتول کے ورثا کا۔ نتیجتاً ان کے معاف کرنے سے سزا کے ساقط ہونے کا حکم مرتب نہیں ہوتا۔ اسی طرح اجتماعیت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے سربراہ مملکت یا اس طرح کے دوسرے افراد کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قاتل کو معاف کر دیں یا اس کی سزائے موت کو کسی اور سزا میں بدل دیں۔

مگر قتل عمد کے جرم پر گہری نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا پہلا اور فوری نقصان مقتول اور اس کے ورثا کو پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ اس جرم کی آگ پر وہی بھنے جاتے ہیں اور ان کو براہِ راست یہ

۱-تبصرة الحكام لابن فرحون المالكي، ج۲ص۲۵۹

تکلیف اور نقصان پہنچتا ہے کہ وہ اپنے ایک عزیز سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ان کا یہ نقصان، درد اور تکلیف اس نقصان سے کئی گناہ بڑھ کر ہے جو اجتماعیت کو اس جرم سے پہنچا ہے۔ چنانچہ یہ بات فطری اور عادلانہ ہے کہ قاتل سے قصاص لینے میں ان کا حق اجتماعیت کے حق سے زیادہ ہو۔

پھر یہ بھی ہے کہ ان کو قصاص کا حق دینے سے جرم کی اصل جڑ کٹ جاتی ہے، اور دلوں میں غصے اور انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اگر ریاست ان کے سامنے قصاص لینے میں رکاوٹ بن جائے تو اس سے جرم کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جب قاتل جیل سے رہائی پاتا ہے تو مقتول کے رشتہ دار اُسے قتل کر دیتے ہیں، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قاتل سے قصاص لینے اور مقتول کے ورثا کو اس کا حق دینے میں ایک ایسے شخص کے لیے مؤثر درسِ عبرت اور کافی ڈانٹ موجود ہے جس کے نفس نے اس کے لیے بے گناہ لوگوں کا خون بہانا مزین کیا ہو۔ اس لیے کہ انسان کو اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے۔ وہ اس کے بارے میں فکرمند ہوتا ہے اور اس کے فوت ہونے سے خوف کھاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس چیز سے پرے رہتا ہے جو اس کے قتل کا ذریعہ بنتی ہے۔ بشرطیکہ اس کو یہ معلوم ہو کہ قصاص مقتول کے اولیا کا حق ہے اور جب یہ اولیا قصاص کا مطالبہ ہی کر رہے ہیں تو کسی جج یا سربراہِ ریاست تک کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے معاف کر سکے۔

اس ساری بحث کے نتیجے میں ہماری رائے یہ ہے کہ جب تک اسلامی ممالک میں شرعی سزاؤں کے نظام پر عمل ہوتا رہا تو قتل کے جرائم انتہائی کم رہے، مگر جب سے قصاص کی شرعی سزا ختم کی گئی ہے تو قتل کے جرائم میں اضافہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایک منصف مزاج شخص کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ قصاص کی شرعی سزا پر اعتراض کر سکے، حالانکہ درست غور و فکر اس سزا کی تائید کرتی ہے اور حقائق بھی اس کی صحت کی گواہی دیتے ہیں۔

مجرموں کو خوف زدہ کرنے، ان کو جھڑکنے اور لوگوں کی زندگیوں کو محفوظ کرنے میں اس سزا کا جو عظیم اثر ہے اسی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حق فرمایا ہے کہ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَآ أُولِي الْأَلْبَابِ (البقرۃ ۲:۱۷۹) عقل و خرد رکھنے والو! تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔

یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ ہم نے جو مناقشہ اور مناظرہ کیا ہے تو یہ ہم نے اپنے مقام سے ایک درجہ نیچے اُتر صرف اس لیے کیا ہے کہ معترض کو اپنے ہی اعتراض کے ساتھ خاموش کیا جائے،

ورنہ جو شخص اللہ پر، روزِ آخرت پر اور دین اسلام پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت پر اعتراض کرے۔ اس لیے کہ یہ اعتراض ایک طرح سے دین اسلام سے پھرنے کے مترادف ہے۔ یہ بات ایمان کی شرائط میں سے ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے قانون کو اپنے لیے فیصلہ کن مانے اور اس پر راضی ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء۴: ۶۵) نہیں، اے محمدؐ! تمھارے رب کی قسم، یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔

۶- غیر مجرم پر جرم کا بوجھ

۵۰۳- رہا ان کا دیت کے مسئلے پر اعتراض، جس میں مجرم کے علاوہ دوسرے لوگوں کو ملوث کیا جاتا ہے اور جو اِس اُصول کے خلاف ہے کہ جو شخص کسی چیز کا سبب بنے وہی نتائج کا بھی ذمہ دار ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اصول، کہ ذمہ داری اس شخص تک محدود رہے گی جس میں اس کا سبب پایا جائے، اس آیت سے مستفاد ہے کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى (الانعام۶: ۱۶۴) کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

یہ اصول شریعت میں قائم و دائم ہے۔ یہ نہ منسوخ ہو چکا ہے اور نہ معطل ہوا ہے۔ مگر دیت کا مسئلہ اس کے ساتھ بالکل نہیں ٹکراتا۔ اس لیے کہ قتل خطا میں عاقلہ پر دیت لازم کرنا تعاون اور غم خواری کے طور پر ہے۔ ایک خطا کار شخص کا حق ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ تعاون کیا جائے اور اس کے ساتھ تعاون کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو اس کے اہل و عیال اور وہ قریبی رشتہ دار ہوں جو اس کی موت کے بعد اس کی میراث میں حصہ پاتے ہیں۔ چنانچہ الغنم بالغرم [یعنی نفع بمقابلہ نقصان ہے] کے قاعدے کے تحت ان پر لازم ہے کہ اس کی غم خواری کریں اور دیت میں اس کے ساتھ شریک ہوں۔ اس اشتراک کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مقتول کے ورثا کے لیے دیت کے حصول میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ دیت کی مقدار بہت زیادہ ہے اور قاتل کی طرف سے اس کی ادائیگی آہستہ آہستہ ہی ہو سکتی ہے۔ جب عاقلہ پر اس کا بوجھ ڈالا جاتا ہے تو اس سے ایک آدمی پر آنے والی مقدار کم ہو گی اور ہر ایک کے لیے اس کی ادائیگی آسان ہو گی۔

بعض فقہا نے عاقلہ پر دیت کے لازم ہونے کی ایک اور علت بیان کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قتل خطا کے مجرم کے رشتہ داروں پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اس کی نگرانی کریں اور اسے اس بات کی طرف متوجہ کیا کریں کہ وہ ایسی رعونت اور طیش میں نہ آئے کہ کسی کو غلطی سے قتل کر ڈالے۔ جب انھوں نے یہ کام نہیں کیا تو یہ اُن کی طرف سے اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں غلطی اور کوتاہی ہوئی، کہ انھوں نے ایک دوسرے کی نگرانی نہیں کی۔ اس لیے وہ اپنی کوتاہی کی بنا پر قاتل کے ساتھ دیت کی ادائیگی میں شریک ہوئے۔

خلاصہ

۵۰۴- خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا نظام جرم وسزا ایک عادلانہ نظام ہے۔ یہ بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اور اس میں لوگوں کے سارے معاملات میں ان کے مفادات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس میں لوگوں کی فطرت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے جرائم ختم ہوتے ہیں، یا ان میں خاطر خواہ کمی آتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سزا کے تعین میں بھی پورا پورا انصاف ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ سزا اُتنی ہی دی جاتی ہے جتنا جرم سرزد ہوا ہو۔ اس نظام میں سزا کا نفاذ سب پر ہوتا ہے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ حدود اور قصاص ودیت پر جو لوگ اعتراضات کرتے ہیں ان کے اعتراضات کس قدر بھونڈے ہیں۔ البتہ تعزیر کے بارے میں ان کا کوئی اعتراض کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ بلکہ تعزیر کا نظام شریعت اسلامیہ کا وہ انفرادی وصف ہے جس کا نعرہ عصرِ حاضر کے علمائے قانونِ فوجداری بھی لگاتے رہتے ہیں۔

اور جب ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ تعزیری سزاؤں کا میدان حدود وقصاص سے بہت وسیع ہے تو اس سے ہمیں اسلام کے فوجداری قانون کی پختگی اور دوسرے خودساختہ قوانین سے اس کا امتیاز بھی معلوم ہوجاتا ہے۔ اس سے لوگوں کی ضروریات بھی پوری ہوجاتی ہیں اور امن واطمینان بھی قائم ہوتا ہے۔ اسلامی شریعت کی یہ وہ صفات ہیں جن میں نہ کوئی انسانی قانون اس کا مقابلہ کرسکتا ہے اور نہ اس کے گردِ پا تک ہی پہنچ سکتا ہے۔

یہ اس بات کے چند دلائل ہیں کہ اسلامی قانون اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

......☆......☆......

پانچویں فصل

مقاصدِ اسلام

انسانوں کے دنیوی اور اُخروی مصالح

۵۰۵- اسلام کے مقاصد جو نصوصِ شریعت کی تلاش واستقراء کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں، یہ ہیں کہ انسانوں کے دنیوی واُخروی مصالح کو حاصل کیا جائے اور ان سے دنیوی واُخروی خرابیوں اور نقصانات کو دور کیا جائے۔ اس طرح ان کو یہاں اور وہاں کی زندگی میں حقیقی سعادت حاصل ہوگی۔ اس بات کی صراحت محققین علمائے شریعت نے کی ہے۔ امام عز بن عبدالسلامؒ کہتے ہیں: شریعت ساری کی ساری مصالح پر مشتمل ہے، چنانچہ اس میں خرابیوں کو دور کیا جاتا ہے یا مفادات کو حاصل کیا جاتا ہے۔[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: اسلامی شریعت آئی ہی اسی لیے ہے کہ مصالح کو حاصل کیا جائے اور ان کی تکمیل کی جائے جبکہ مفاسد کو معطل کیا جائے اور ان میں کمی کی جائے۔[2]

ان کے شاگرد امام ابن القیم الجوزیؒ فرماتے ہیں: شریعت کی بنا اور اساس حکمتوں اور دنیا وآخرت میں انسانوں کی مصلحتوں پر ہے۔ شریعت عدل ہی عدل، رحمت ہی رحمت، مصلحت ہی مصلحت اور حکمت ہی حکمت ہے۔[3]

علامہ شاطبیؒ اپنی کتاب الموافقات میں کہتے ہیں: شریعت وضع ہی بندوں کی مصلحتوں کے لیے کی گئی

۱- قواعد الاحکام فی مصالح الأنام، ج۱ص۹

۲- منہاج السنة النبویة لابن تیمیہؒ، ج۱ص۱۴۷- ج۲ص۲۴۰- ج۳ص۱۱۸

۳- اعلام الموقعین، ج۳ص۱

ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ اِن ائمۂ اعلام نے جو کہا ہے وہ بالکل حق ہے اور یہ چیز اسلام کی ایک ثابت شدہ وصف ہے جس پر اس کی نصوص دلالت کرتی ہیں۔ یہاں اتنا ہی کافی ہے کہ ہم وہ آیت ذکر کریں جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء۲۱:۱۰۷) اے نبیؐ! ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کی رسالت لوگوں کے لیے رحمت ہی تھی۔ کیوں کہ اس کے ضمن میں یہی بات موجود تھی کہ دنیا اور آخرت دونوں میں انسانوں کے مصالح کو حاصل کیا جائے اور ان سے دونوں طرح کے نقصانات اور خرابیوں کو دور کیا جائے۔

مصلحتوں کی قسمیں

۵۰۶- بندوں کی مصلحتیں، جنھیں اسلام حاصل کرتا ہے اور ان کی حفاظت کرتا ہے، تین قسم کی ہیں:

۱- مصالح ضروریہ (انتہائی ضروری مصلحتیں)، ۲- مصالح حاجیہ (ضروری مصلحتیں)، ۳- مصالح تحسینیہ (زیبائشی مصلحتیں)

اسلام نے ایسے احکام مقرر کیے ہیں جن کا مقصد ان تینوں قسم کی مصلحتوں کو حاصل کرنا اور ان کی حفاظت کرنا ہے۔ اس طرح انسانوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں سعادت نصیب ہوتی ہے۔ ان مصلحتوں کا تفصیلی ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اس لیے اسے دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں۔[2]

مصلحت اور مفسدہ کا معیار

۵۰۷- مصلحت اور مفسدہ کا معیار اسلام ہی ہے۔ جس چیز کے بارے میں اسلام صالحیت کی گواہی

۱- الموافقات للشاطبی، ج ۲، ص ۶

۲- دیکھیے: اس کتاب کا پیرا نمبر ۲۷-۱۰۰ (مترجم)

دے وہ مصلحت ہے اور جس کے بارے میں وہ فساد کی گواہی دے وہ مفسدہ ہے۔ اس معیار سے نکلنے کا مطلب ہے، خواہش کی پیروی کرنا، جبکہ خواہش ایک باطل چیز ہے، اس سے کسی چیز کی صلاح یا فساد کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (ص ۳۸:۲۶) اے داوٗد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق سے حکومت کر، اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر، کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔

یہاں پر دو ہی چیزیں ہیں: ایک حق اور دوسری خواہش۔ حق تو وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اور اس میں مصلحت اور مفسدہ کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ خواہش ہے، جو باطل ہے اور اس میں لوگوں کے لیے فساد ہی فساد ہے۔ معلوم ہوا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ حق کی پیروی کی جائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے، اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔

مفاد و فساد کے علم سے انسان کی عاجزی

۵۰۸- انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ دنیا اور آخرت کی حقیقی مصلحتوں کے ادراک اور ان تک رسائی حاصل کرنے طریقوں سے عاجز ہے۔ اگر بعض دنیوی مصلحتوں کا ادراک وہ کر لیتا ہے تو اخروی مصالح کی معرفت اور ان تک رسائی کے طریقوں سے وہ عاجز ہی رہتا ہے۔ وہ ان پر اس طرح سے قادر ہو سکتا ہے کہ وہ شریعت کے پیچھے چلے اور اس کے نور سے منور ہو، اس کی حدود کے پاس پہنچ کر رک جائے اور ساری چیزوں کو اسی کے ترازو سے تولے۔

انسان کی حقیقی مصلحت

۵۰۹- انسان کی حقیقی مصلحت اسی میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تعلیمات کی پیروی کرے اور اپنے دنیوی امور کو اسلامی نظام کے مطابق چلائے۔ اس لیے کہ ان تعلیمات میں انسان کی حقیقی مصلحتوں اور دنیا کی سعادت کا یقینی حصول ہے۔ نیز اس دنیوی سعادت کے ساتھ ان میں انسان کے لیے آخرت کی عظیم

سعادت ہے جس کی رو سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کے حصول سے سرفراز ہوتا ہے۔ یہ اسلام کا ایک عظیم امتیاز ہے۔ اس لیے کہ اس کے احکام پر عمل اور اس کی تعلیمات کی پیروی کرنے سے آدمی دنیا میں اچھی زندگی سے محروم نہیں ہوتا، جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے، بلکہ وہ زیادہ درست اور ٹھوکروں اور مشکلات سے پاک طریقے سے ان سے مستفید ہوتا ہے۔

یہ زندگی جو اسلام کی تعلیمات پر قائم ہوتی ہے، اس کے لیے آخرت کے راستے پر سہولت اور سلامتی کے ساتھ چلنا آسان کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی۔ لیکن اگر زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق نہ ہو تو انسان کی زندگی مکدر ہو کر سعادت سے محروم ہو جاتی ہے، اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے کٹ جاتا ہے اور آخرت میں وہ آگ میں پہنچ کر رہتا ہے۔

دنیوی مصلحتوں کا اعتبار اُخروی مصلحتوں سے

۵۱۰- فقیہ اسلام علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں: شرعی طور پر مطلوب مصالح اور قابل استرداد مفاسد کا اعتبار اس حیثیت سے ہوتا ہے کہ دنیوی زندگی اُخروی زندگی کی تکمیل کے لیے ہے، نہ کہ اس حیثیت سے کہ اپنے عمومی مصلحتوں کے حصول اور عمومی مفاسد کو روکنے میں انسان کی خواہش کیا ہے۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام انسانوں کے مصالح کا جو اندازہ لگاتا ہے اور ان کے حصول کے لیے جو احکام اور طریقے مقرر کرتا ہے ان سب کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اُخروی سعادت کے حصول کے لیے تیار کیا جائے۔ چنانچہ دنیا کی مصالح فی نفسہٖ مقصود نہیں ہیں، بلکہ وہ آخرت کے مصالح کے لیے وسیلہ ہیں۔ اس لیے جو بھی چیز اُخروی سعادت کے حصول میں رکاوٹ ہو اس کا ترک کرنا اور مؤخر کرنا ضروری ہے، اور جو چیز اُخروی سعادت کا ذریعہ بنتی ہے اسے لینا اور مقدم کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ دنیا اور اس کے زوال پذیر فوائد کی خاطر آخرت کے معاملے میں کوتاہی جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَأَمَّا مَنْ طَغٰى. وَاٰثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا. فَإِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَأْوٰى. وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى. فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى (النازعات ۷۹: ۳۷-۴۱) جس نے

۱- الموافقات للشاطبی، ج ۲، ص ۳۸۴

سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہوگی۔

اسی حوالے سے امام شاطبیؒ الموافقات میں فرماتے ہیں: اُخروی مصلحتوں کا اعتبار دنیوی مصلحتوں پر بالاتفاق مقدم ہے۔اس لیے کہ دنیوی مصلحت اگر اُخروی مصلحت کے راستے میں رکاوٹ بن رہی ہے تو اس کو مصلحت معتبر کرنا ہی درست نہیں ہے۔ چنانچہ یہ بات معلوم ومفہوم ہے کہ جو چیز آخرت کے مصالح میں حائل ہو وہ شارع کے مقصود سے موافقت نہیں رکھتی، اس لیے وہ باطل ہوگی۔[1]

چنانچہ جو چیز ممنوع ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کو آخرت پر مقدم کیا جائے۔ یہ ممنوع نہیں ہے کہ دنیا کو حاصل کر کے اسے آخرت کے لیے استعمال کیا جائے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وابْتَغِ فِيمَآ اٰتاکَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَکَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص ۲۸:۷۷)
جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔

چنانچہ دنیا آخرت کی کھیتی، اس کے لیے زادِراہ اور اس تک رسائی کا وسیلہ ہے۔اس لیے کھیتی کو خراب کرنا بھی ناجائز ہے اور اس سے فرار اختیار کرنا بھی درست نہیں ہے۔کیوں کہ انسان دنیا میں اس لیے آیا ہے کہ وہ نیک عمل کرے، تقویٰ کے زادِراہ سے لیس ہو اور اسی میں اپنی عمر صرف کرے۔مگر اس پر لازم ہے کہ اپنے اصل مقصد کو نہ بھولے، کہ دنیا ہی کو اپنی منزل مقصود بنالے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو آخرت کا وسیلہ اور اس کا خادم بنایا ہے، نہ کہ اس کے ساتھ مزاحم۔ چنانچہ جب انسان کی دنیوی مصلحت اس کی اُخروی مصلحت کے ساتھ متعارض ہو تو وہ دوسری کو پہلی پر مقدم کرتا ہے اور اس پر کوئی افسوس نہیں کرتا۔کیوں کہ اس سے انسان کو کوئی نقصان یا خسارہ نہیں ہوتا۔

اسلام کی نظر میں، بلکہ اہل عقل وخرد کی نگاہ میں بھی بڑی مصلحت کو چھوٹی مصلحت پر مقدم کیا جاتا ہے، اور یہ بات قطعی ہے کہ آخرت کی مصلحت دنیا کی مصلحت سے بہت بڑی ہے۔

۱۔الموافقات، ج۲،ص۳۸۷

کسی مصلحت کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں لذت، راحت اور منفعت کتنی اور کیسی ہے، نیز یہ کہ وہ انسان کو کتنے عرصے تک کے لیے دستیاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پہلوؤں کے لحاظ سے دوسری مصلحت پہلی کے مقابلے میں کئی گنا بڑی ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں جو لذتیں، منفعتیں اور راحتیں ہیں ان کو آخرت کی لذتوں، منفعتوں اور راحتوں پر نہ مقدار کے لحاظ سے قیاس کیا جا سکتا ہے اور نہ کیفیت کے لحاظ سے۔ کیوں کہ دنیا کی منفعتوں کے پہلو بہ پہلو وہ چیزیں بھی موجود ہیں جو ان کے مزے کو کرکرا کر دیتی ہیں اور وہ مقدار اور کیفیت کے لحاظ بہت معمولی نوعیت کی ہیں۔ مگر آخرت کی منفعتیں ہر قسم کی کڑواہٹوں اور مکدرات سے پاک ہیں اور اپنی نوعیت و کیفیت لحاظ سے بے مثال ہیں۔ ان میں وہ وہ چیزیں ہوں گی کہ نہ آنکھوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہوگا، نہ کانوں نے ان کے بارے میں سنا ہوگا، اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال آیا ہوگا۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی، اس کے وجہِ کریم کی دیدار اور جنتوں میں اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوگا۔ ان بڑی بڑی نعمتوں کا اگر تھوڑا تھوڑا حصہ بھی لیا جائے، تو دنیا کی نعمتیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی۔

اگر دوام کے لحاظ سے غور کریں تو آخرت کی سعادت اور اس کی لذتیں دائمی اور غیر منقطع ہیں۔ جبکہ دنیا کی نعمتیں انتہائی محدود ہوتی ہیں۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ نعمتیں ساری زندگی اس کے پاس رہیں گی تب بھی یہ انسان کی زندگی سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ اب کیا نسبت اس سعادت کے درمیان جو انسان کی مختصر زندگی پر جا کر ختم ہو جاتی ہے اور اس سعادت کے درمیان لامتناہی زمانے تک اس کے ساتھ رہے گی۔

چنانچہ ایک عقل مند مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا کو آخرت پر مقدم کرے۔ اس لیے کہ شریعت یہ حکم دیتی ہے کہ آخرت کو مقدم کیا جائے، حساب بھی اس تقدیم کا تقاضا کرتی ہے اور خود انسانی مصلحت بھی اس کی طرف دعوت دیتی ہے۔

یہی حق ہے، اور حق کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ گمراہی، جہالت اور کھلا نقصان ہے۔

......☆......☆......

باب دوم

داعی

تمہید

۵۱۱- داعی وہ ہے جو شرعی طور پر دعوت الی اللہ کے کام پر مامور ہے۔ چنانچہ اس کی تعریف اور اس کے مکلّف ہونے کے دلائل بیان کرنا ضروری ہے۔ داعی جب اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرتا ہے تو اسے کچھ تیاری کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے کام میں اس کے لیے معاون ثابت ہو اور اس کے لیے یہ عظیم کام آسان ہو سکے۔ اسی طرح اسے اسلامی اخلاقیات کی ایک متعین قسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس کا سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہم اس باب کو تین فصلوں میں تقسیم کریں گے:

پہلی فصل: داعی کی تعریف

دوسری فصل: داعی کے لیے زادِ راہ

تیسری فصل: داعی کے اخلاقیات

پہلی فصل

داعی کی تعریف

داعیِ اوّل

۵۱۲-اسلام کے داعیِ اوّل، رسول کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا. وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (الاحزاب ۳۳: ۴۵-۴۶) اے نبیؐ! ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔

قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار خطاب کر کے آپؐ کو دعوت الی اللہ کا حکم دیا گیا ہے اور اس پر قائم و دائم رہنے اور اس سے پہلو تہی نہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس طرح کی آیات میں سے اللہ تعالیٰ کے چند ارشادات یہ ہیں:

وَادْعُ إِلٰى رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيمٍ (الحج ۲۲: ۶۷) تم اپنے رب کی طرف دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔

وَادْعُ إِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (القصص ۲۸: ۸۷) اپنے رب کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو۔

قُلْ إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ أُشْرِكَ بِهٖ إِلَيْهِ أَدْعُوْ وَإِلَيْهِ مَاٰبِ (الرعد ۱۳: ۳۶) تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے

ساتھ شریک ٹھیراؤں، لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔

آپؐ ہمیشہ اپنے رب کی طرف دعوت دیتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آیا اور آپؐ اس حالت میں اپنے رب کے پاس پہنچ گئے کہ آپؐ اپنے رب سے راضی تھے اور آپ کا رب آپؐ سے راضی تھا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی طرف سے ان کو بہترین جزا عطا فرمائے۔

رسولوں کا کام: دعوت الی اللہ

۵۱۳- حقیقت یہ ہے کہ دعوت الی اللہ تمام رسولوں کا کام تھا۔ اسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں کے پاس بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ سب بلا استثنا اپنی اپنی قوموں کو، اور جن کی طرف انھیں بھیجا گیا تھا، اس بات کی دعوت دیتے رہے کہ اللہ پر ایمان لائیں، اسے اکیلا معبود سمجھیں اور اس کی اُسی طرح عبادت کریں جس طرح اللہ تعالیٰ انھیں اس کا حکم دے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: **لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ.** (الاعراف ۷:۵۹) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: ''اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔''

حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ** (الاعراف ۷:۶۵) اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: ''اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔''

حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: **وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ** (الاعراف ۷:۷۳) اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا: ''اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔''

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: **وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ** (الاعراف ۷:۸۵) اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: ''اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔''

یہی معاملہ تمام رسولوں کا تھا۔انھوں نے لوگوں کو اللہ کی طرف، اسی کی عبادت کی طرف اور دوسروں کی عبادت سے اعلان بیزاری کرنے کی طرف بلایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ ''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔''

چنانچہ اللہ کے رسول ہی داعی الی اللہ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی دعوت کے لیے اور اسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے چن لیا ہے۔

دعوت الی اللہ میں امت کی شرکت

۵۲۴- پیچھے ہم نے بتایا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے پہلے داعی تھے۔ہم نے وہ آیات بھی ذکر کی ہیں جن میں آپؐ کو دعوت الی اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔ان آیات کے حکم میں سارے مسلمان بھی شامل ہیں۔اس لیے کہ اصولی طور پر اللہ تعالیٰ جب اپنے نبی کو خطاب کرتا ہے تو اس میں امت بھی داخل ہوتی ہے، الّا یہ کہ کوئی چیز اس سے مستثنیٰ ہو جائے، مگر دعوت الی اللہ کا حکم اس مستثنیٰ میں شامل نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ عز و شرف بخشا ہے کہ اسے اپنے رسول کے ساتھ دعوت کے کام میں شریک کیا ہے۔مگر یہ عز و شرف صرف ان آیات سے مستفاد نہیں ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دعوت کا حکم دیا ہے، بلکہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں یہ حکم صراحت کے ساتھ اور مستقل طور پر بھی آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آلِ عمران ۳:۱۱۰) اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔

اس آیت کریمہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ یہ امت بہترین ہے۔دوسری یہ کہ اس امت کو یہ اعزاز اس وجہ سے ملا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتی ہے، اور یہ فریضہ رسول اللہ

اور باقی تمام رسولوں کا بھی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں پہلی چیز یہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف اور ہر قسم کے شرک سے بیزاری کی طرف دعوت دی جائے۔ بلکہ قرآن کریم نے دعوت کو مومنوں کی صفات میں سے ایک صفت بتایا ہے، برعکس منافقین کے، جو لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور دوسرے راستوں کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَّأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (التوبۃ ۹: ۶۷) منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَّأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ ۹: ۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مومنین اور منافقین کے درمیان فرق کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مومنوں کے مخصوص اوصاف میں سے ہے، اور اس میں سرفہرست دعوت الی اللہ ہے۔[1]

ہم اس پر یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کی تعریف اسی چیز سے کی ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے بارے میں فرماتا ہے: يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ (الاعراف ۷: ۱۵۷) وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔

دعوت الی اللہ کا مکلّف کون؟

۵۱۵- سابقہ بحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ دعوت الی اللہ کا مکلّف ہر

۱- تفسیر القرطبی، ج ۴، ص ۴۷

مسلمان مرد اور عورت ہے۔ اس لیے کہ امت مسلمہ انھی سے وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ جو بحیثیت مجموعی دعوت الی اللہ کی مکلّف ہے، اس کا ہر عاقل بالغ اس دعوت کا مکلّف قرار پاتا ہے، خواہ کوئی مرد ہو یا عورت۔

معلوم ہوا کہ اس فریضے کے مکلّف صرف علما، یا بقول بعض: 'مولوی' اور 'مذہبی لوگ' نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب کا فریضہ ہے۔ ہاں البتہ اس دعوت کی تفصیلات اور اس کے احکام و معانی کے لیے یہی لوگ مخصوص رہیں گے، اس لیے کہ ان چیزوں کے بارے میں ان کا علم زیادہ وسیع ہوتا ہے اور دعوت کی جزئیات کو وہی جانتے ہیں۔

اس بات کی کہ دعوت الی اللہ کا مکلّف ہر مسلمان مرد و عورت ہے، مزید وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف ۱۲:۱۰۸) تم ان سے صاف کہہ دو کہ "میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"

رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے ساتھی وہی تھے جنھوں نے آپؐ پر ایمان لایا تھا۔ وہ بھی بصیرت اور علم و یقین کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے، جیسا کہ ان کے رسولؐ علم و یقین کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے ایمان کے ضروری لوازم میں سے ہے کہ وہ اللہ کی طرف دعوت دے۔ اگر کوئی شخص دعوت سے پیچھے رہے گا تو یہ اس کے ایمان میں نقص یا خلل کی دلیل ہوگا۔ اس کی تلافی اسی طرح کی جاسکتی ہے کہ آدمی دعوت الی اللہ کے اس فریضے کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے فرما رہا ہے کہ لوگوں کو بتائیں کہ "یہ میرا راستہ، یعنی میرا طریقہ، میرا مسلک اور میری سنت ہے۔ یعنی اس کلمے کی طرف دعوت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ آپؐ بصیرت اور ایمان و یقین کے ساتھ یہ دعوت دیتے تھے۔ اور آپؐ کے ساتھی بھی اسی چیز کی طرف دعوت دیتے تھے جس کی طرف ان کے رسولؐ نے بصیرت، یقین اور عقلی و شرعی دلیل کے ساتھ

دعوت دی۔[1]

بخاری کی ایک حدیث میں آیا ہے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ.[2] جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں تک دعوت پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔

یہاں 'شاہد' کے حکم میں ہر وہ مسلمان داخل ہے جو اسلام کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔

۵۱۶- دعوت الی اللہ کا فریضہ کبھی انفرادی طور پر ادا ہو جاتا ہے اور کبھی اجتماعی طور پر۔ اگر ہم اس کی تعبیر کے لیے تھوڑی باریکی میں جائیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فریضہ دو طرح سے ادا ہو سکتا ہے: پہلا یہ ہے کہ ہر مسلمان بحیثیت ایک فردِ مسلم کے اس فریضے کے لیے اٹھ کھڑا ہو، اور دوسرا یہ کہ اس فریضے یا اس کے کسی پہلو کو ایک ایسی جماعت کے فرد کی حیثیت سے ادا کرے جو دعوت الی اللہ کے لیے قائم ہوئی ہو۔

اس سب پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (آل عمران ۳:۱۰۴) تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اس آیت کا مقصود یہ ہے کہ اس امت میں ایک فرقہ ایسا ہونا چاہیے جو اس کام کے لیے مخصوص ہو، اگرچہ یہ امت کے ہر فرد پر اپنی جگہ ایک فریضہ ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ثابت ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ رَّأَى مِنْكُمْ مُّنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ.[3] تم میں سے جو شخص کوئی برائی ہوتی تو اسے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ ہو تو دل سے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین

۱- تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۱۹۵-۱۹۶

۲- صحیح البخاری، ج ۱، ص ۶۲-۶۳

۳- مسلم ۱:۶۹، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، بیہقی

درجہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت دعوت کا کام زیادہ ہوتو داعیانِ دین کا اجتماعی طور پر دعوت کے کام کے لیے اٹھ جانا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً اگر بت پرستانہ معاشروں میں دین کی دعوت دینی ہو، جو شیطان کی آماجگاہ ہوتے ہیں اور جہاں اس نے انڈے چوزے دیے ہوتے ہیں، جہاں اس نے لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا ہوتا ہے اور انھیں شرک کی بھٹی میں سرنگوں کیا ہوتا ہے، جیسے افریقہ کے مشرکانہ معاشرے وغیرہ۔

اس طرح کے علاقے دعوت کی نشر و اشاعت اور لوگوں کو دین کی تعلیم دینے کے لیے زیادہ اور منظم جدوجہد کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک فرد کی کوشش یا مختلف افراد کی انفرادی کوششیں کامیاب نہیں ہوتیں۔ اس اجتماعی مشنری کوششوں کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جو شخص اسلام قبول کرتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے حکم دیتے کہ وہ دارالہجرت میں چلا آئے، تاکہ اس کی جدوجہد دوسرے مسلمانوں کی جدوجہد کے ساتھ مل جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جدوجہد کو صحیح رخ پر ڈال دیں۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے کہ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ ۵:۲) [جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو] ہمیں اس بات کی ایک اور دلیل ملتی ہے کہ دعوت کے کام کے لیے جمع ہونا اور اجتماعی طور پر دعوت دینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ بلکہ ایسے حالات میں تو یہ واجب ہوگا، جب کہ بھلائی کا حصول اس کے بغیر ممکن نہ ہو۔ علامہ جصاصؒ کی روایت کی رو سے امام ابوحنیفہؒ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے تنظیم سازی اور اپنی کوششوں کو اس مقصد کے حصول کے لیے صرف کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

شبہات و اعتراضات

۵۱۷- بعض لوگوں کو یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام ان پر لازم نہیں ہے، اس لیے کہ وہ 'مذہبی لوگ' نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں یہ ایک فرض کفایہ ہے جو صرف علما کا کام ہے، اور یہ عام لوگوں پر

لازم نہیں ہے۔

اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (آل عمران ۳:۱۰۴) تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر، جیسا کہ ہم نے علامہ ابن کثیرؒ سے نقل کی ہے، یہ ہے کہ اس امت میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو اسی کام کے لیے فارغ ہو، اگرچہ یہ امت کے ہر فرد کا فریضہ ہے۔ اور امام رازیؒ اس آیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ اللہ کے ارشاد مِنْكُم کے بارے میں دو قول ہیں:

۱- ایک قول یہ ہے کہ حرف مِنْ یہاں تبعیض کے لیے نہیں ہے اور اس کی دو دلیلیں ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آلِ عمران ۳:۱۱۰) میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری امت پر فرض کیا ہے۔

دوسری یہ کہ کوئی بھی شخص جو مکلّف ہو تو اس پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے، ہاتھ سے، یا زبان سے یا پھر دل سے۔ ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے نفس سے ضرر کو دور کرے۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ہم کہتے ہیں کہ اس آیت کے معنی یہ ہوئے: ''تم ایک ایسی امت بن جاؤ جو بھلائی کی دعوت دینے والی، معروف کا حکم دینے والی اور منکر سے روکنے والی ہو''۔ رہا حرف مِنْ کا معاملہ تو وہ یہاں تبعیض کے لیے نہیں بلکہ تبیین کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (الحج ۲۲:۳۰) تو تم لوگ گندگی سے کنارہ کش رہو یعنی بتوں سے۔

۲- امام رازی نے دوسرا قول یہ ذکر کیا ہے کہ ''مِنْ تبعیض کے لیے ہے، اس لیے کہ امت میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قادر نہیں ہوتے۔'' پھر اس دوسرے قول کے قائلین کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ تکلیف علما کے ساتھ مختص ہے، اس لیے کہ دعوت الی الخیر اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ آدمی کے پاس 'خیر'، 'معروف' اور 'منکر' کا علم ہو۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ یہ

تکلیف علما کے طرف متوجہ ہے نہ کہ عوام کی طرف، اور امت میں علما بعض ہی ہوتے ہیں۔[1]

اس آیت کا یہی مفہوم اور اس کے بارے میں یہی دو قول تفسیر قرطبی اور تفسیر جصاص میں بھی مذکور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قول امام رازیؒ نے ذکر کیا ہے وہ صحیح تر قول ہے، اس لیے کہ اس کے شاگردوں نے بھی اسی سے استدلال کیا ہے۔ یہ وہی قول ہے جسے ابن کثیر نے اپنے دقیق الفاظ میں بیان کیا ہے، جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ انھوں نے وجوب کو ہر فرد کی طرف سے قرار دیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ایک گروہ ایسا بھی ہونا چاہیے جس کا کام ہی دعوت الی الخیر ہو۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لفظ 'علما' کی وجہ سے اس مسئلے میں کسی حد تک التباس بھی پایا جاتا ہے، جو قول ثانی کے قائلین نے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ کی تشریح کرتے ہوئے اس اعتبار سے ذکر کیا ہے ک دعوت الیٰ الخیر علم کے ساتھ مشروط ہے۔ اس التباس کا دوسرا سبب فرض کفایہ کے الفاظ ہیں۔ اس لیے ان دونوں باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں: اس میں شک نہیں کہ دعوت الی الخیر، جس کا اعلیٰ درجہ دعوت الی اللہ ہے، کے لیے علم ہونا شرط ہے، مگر علم کوئی نا قابل تقسیم اور نا قابل تجزیہ چیز نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے قابل تقسیم بھی ہے اور قابل تجزیہ بھی۔ چنانچہ اگر ایک آدمی کو ایک مسئلہ معلوم ہے اور دوسرا معلوم نہیں ہے تو وہ پہلے مسئلے کا عالم اور دوسرے سے جاہل قرار پائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے مسئلے کے بارے میں وہ عالم ہی تصور کیا جائے گا، اور نتیجتاً اس میں ایک مسئلے کے حوالے سے دعوت کی شرط موجود ہے، اگرچہ دوسرے مسئلے کے بارے میں وہ مطلوبہ شرط پر پورا نہیں اترتا۔

اس مسئلے میں فقہا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جو شخص کسی چیز یا اس کے حکم سے بے خبر ہو وہ اس کی طرف دعوت نہیں دے گا۔ اس لیے کہ جس چیز کی طرف داعی دعوت دے رہا ہے اس کے بارے میں علم، دعوت کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اس بنا پر ہر مسلمان اسی قدر دعوت کا مکلّف ہے جتنا اس کے پاس علم ہے۔ اور علم کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

چنانچہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دعوت کا کام علما پر واجب ہے نہ کہ دوسرے لوگوں پر، تو اس سے مراد یہی

۱۔ تفسیر کبیر، رازی، ج ۷، ص ۱۷۷-۱۷۸

ہوگی۔یعنی یہ کام ان لوگوں پر واجب ہے جو کسی مسئلے اور اس کے حکم کو جانتے ہوں، خواہ وہ عام لوگوں میں سے ہوں یا ان لوگوں میں سے جن کو علم کا وافر حصہ ملا ہو۔اس سے ان لوگوں کا قول فاسد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ علما سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو علم کا وافر حصہ ملا ہو، نہ کہ کوئی اور۔ان 'علما' کے لیے بعض اوقات 'مذہبی لوگ' کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔مگر یہ الفاظ بھی ہر مسلمان پر صادق آتے ہیں، اس لیے کہ وہ بھی مذہب اسلام کے لوگ ہوتے ہیں۔چنانچہ یہ کام ان کے کسی گروہ تک محدود نہیں ہے۔

التباس کا دوسرا سبب فرض کفایہ کا مفہوم ہے۔اس سے مقصود یہ ہے کہ جب بعض لوگ اس کو ادا کریں تو دیگر لوگوں سے تکلیف ساقط ہو جاتی ہے، اگر چہ یہ کام واجب سب کے اوپر ہوتا ہے۔امام رازیؒ فرماتے ہیں:

پھر وہ (یعنی دعوت کے عمومی وجوب کے قائل لوگ) کہتے ہیں کہ لفظ مِن تبیین کے لیے ہے نہ کہ تبعیض کے لیے۔اور یہ کام اگر چہ واجب تو سب پر ہے مگر جب کچھ لوگ اس کو ادا کریں تو باقی لوگوں سے اس کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔اس کی نظیر اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا (التوبۃ ۹:۴۱) اور اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا (التوبۃ ۹:۳۹) ہے۔چنانچہ حکم عام ہے۔پھر جب ایک گروہ اس کام کو انجام دے تو کفایت رفع ہو جاتی ہے اور باقی لوگوں سے تکلیف زائل ہو جاتی ہے۔[1]

علامہ جصاصؒ آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ (آل عمران ۳:۱۰۴) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ آیت دو معانی پر محیط ہے: ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب، اور دوسرے یہ کہ یہ فرض کفایہ ہے، نہ کہ فی نفسہٖ ہر ہر فرد پر، جب کہ دوسرے لوگوں نے اس فریضے کو ادا کیا ہو۔[2]

علامہ جصاصؒ کا یہ کہنا کہ "یہ فی نفسہٖ ہر ہر فرد پر واجب نہیں ہے، جب کہ دوسرے لوگوں نے اس فریضے کو ادا کیا ہو"، فرض کفایہ کا مقصود بیان کر رہا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ جب کچھ لوگ اس فریضے کو ادا کر رہے ہوں تو دوسرے لوگوں سے اس کا واجب ساقط ہو جاتا ہے۔جب کہ فرض عین کا معاملہ اس کے برعکس ہے، کیوں کہ وہ اس کے بغیر ساقط نہیں ہوتا کہ ہر ہر فرد اس کی خاطر اٹھ کھڑا ہو۔

۱- الرازی، ج ۷، ص ۱۷۷

۲- الجصاص، ج ۲، ص ۲۹

معلوم ہوا کہ دعوت الی الخیر، جس کا اعلیٰ درجہ دعوت الی اللہ ہے، بقدرِ استطاعت ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ کیوں کہ یہ دعوت جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، مومنوں کی صفات میں سے ہے۔ اور اس لیے بھی کہ حدیث شریف نے ہر مسلمان مرد اور عورت کو حکم دیا ہے کہ اپنی استطاعت کی حد تک منکر کا ازالہ کرے۔ جب ایک یا چند افراد سے مقصود حاصل ہو جائے تو باقی لوگوں کو حکم نہیں دیا جائے گا کہ وہ دوبارہ منکر کا ازالہ کریں۔ ان کا اس بات پر مواخذہ نہیں کیا جائے گا کہ انھوں نے منکر کا ازالہ کیوں نہ کیا۔

ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ کسی اور کا انتظار کیے بغیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ آگے نہیں بڑھے گا تو بعض اوقات دوسرا بھی اس کے لیے نہیں آئے گا، لہٰذا دونوں گناہ گار ہوں گے۔ مسلمان اس وجہ سے اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا ذکر کیا ہے کہ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف ۱۲:۱۰۸) تم ان سے صاف کہہ دو کہ ''میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔''

چنانچہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی طرف دعوت دے۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ ایک متعین شخص اللہ کی طرف دعوت نہیں دیتا، یا کسی وقت وہ اس فریضے سے غافل ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا مسلمان اس کے لیے اٹھ جاتا ہے تو دعوت دینے والے کو ثواب ملے گا اور دوسرا اس سے محروم ہوگا۔ لیکن اگر ایک مسلمان دعوت الی اللہ کو جان بوجھ کر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مفہوم میں شامل نہیں ہوگا کہ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ..... (یوسف ۱۲:۱۰۸) اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار تو وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ فرض کفایہ کے معانی میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا حکم تمام مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے، کہ وہ اس فریضے کو ادا کریں۔ جو شخص عملاً اس کام پر قادر ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ براہ راست اس کام کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

اس طرح آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنْكَرِ (آل عمران۳:۱۰۴) [تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں] کے معنی یہ ہوں گے کہ مسلمان اس طرح کا ایک گروہ تیار کریں۔ یعنی ایک ایسی جماعت جس کا کام ہی دعوت الی اللہ ہو۔ اور اس کے بعد اس جماعت کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کریں، تاکہ یہ جماعت جس مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے وہ مقصد حاصل ہو جائے۔ وہ مقصد یہ ہے اللہ کا دین زمین پر قائم ہو اور اس کی دعوت دنیا کے کونے کونے میں پھیل جائے۔ اگر مسلمانوں نے یہ کام نہ کیا تو سارے گناہ گار ہوں گے، خواہ کوئی دعوت کا اہل ہو یا نہ ہو۔[1]

اگر ہم فرض کر لیں کہ دعوت الی اللہ کا کام بعض لوگوں پر واجب ہے اور بعض پر واجب نہیں ہے، کیوں کہ یہ فرض کفایہ ہے تو پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرض کفایہ سے بری الذمہ ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ جو لوگ اس ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں، ان سے اس کام میں کفایت ہو سکے۔ لیکن جب ان سے کفایت نہ ہو رہی ہو تو پھر ہر مسلمان پر لازم ہوگا کہ اپنی حیثیت کے مطابق اس فرض کو ادا کرے۔ خصوصاً ہمارے دور میں یہ بات بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ شرک و بت پرستی اور جاہلیت نے افریقہ، امریکہ اور دوسرے ممالک میں انسانی معاشروں کو اپنے لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ان ممالک میں دعوت الی اللہ کی نشر و اشاعت کے لیے ایک عظیم الشان جدوجہد کی ضرورت ہے، جس میں تمام مسلمان اپنی وسعت کے مطابق شریک ہوں، خواہ مال و دولت کے ساتھ ہو یا علم و فکر اور اختیارات کے ساتھ۔

۵۱۸- بعض لوگ خوش فہمی میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے غلط استدلال کرتے ہیں کہ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (المائدۃ ۵:۱۰۵) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمھارا کچھ نہیں بگڑتا، اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔

اس طرح وہ دعوت کے فریضے سے جان چھڑانے اور اس کے بارے میں اپنی سستی و کوتاہی کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو اس سے یہ غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے کہ اگر ایک شخص اپنی جگہ

۱- اس آیت کی تفسیر میں شیخ عبداللہ دراز کہتے ہیں: سارے مسلمانوں سے اس کام پر توجہ دینے کا مطالبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک گروہ کو برپا کر دیں، انھیں اس کام کے لیے تیار کریں اور ہر قسم کے وسائل سے ان کے ساتھ تعاون کریں، تاکہ اصلاح کا یہ فریضہ انجام پائے۔ اگر یہ کام نہیں ہوا تو جو لوگ احکام شریعت کے مکلف ہیں وہ سب گناہ گار ہوں گے، خواہ کوئی دعوت کا اہل ہو یا نہ ہو۔ (الموافقات للشاطبی، ج۱، ص۱۷۶)

پر نیکو کار اور صالح ہو تو یہ آیت کریمہ اسے دعوت الی اللہ کی ذمہ داری سے بری الذمہ کر دیتی ہے۔

یہ غلط فہمی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں بھی بعض لوگوں کو لاحق ہوگئی تھی، اس لیے انھوں نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! تم اس آیت کریمہ کو پڑھتے ہو کہ عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ، مگر تم اس کو غلط مقام پر رکھتے ہو۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپؐ فرما رہے تھے: إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلٰى يَدَيْهِ يُوشِكُ أَنْ يَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ. لوگ جب ظالم کو [ظلم کرتے ہوئے] دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں گرفتار کر دے۔[1]

اس کے علاوہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اسی آیت میں ہر مسلمان پر دعوت الی اللہ کے لازم ہونے کی تاکید اور اس غلط فہمی کی نفی پائی جاتی ہے جس کو دعوت الی اللہ سے جی چرانے والوں نے پلے باندھ لیا ہے۔ وہ تاکید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (یعنی اگر تم خود راہِ راست پر ہو)، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے بقول: ہدایت، فرض کی ادائیگی سے تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان جیسا کہ دیگر فرائض کو ادا کرتا ہے اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے تو گمراہوں کی گمراہی ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔[2]

۵۱۹- بعض لوگوں کو ایک اور شبہہ لاحق ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں باطل عام ہو گیا ہے اور اب دعوت الی اللہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، چنانچہ مسلمان کو چاہیے کہ اپنی فکر کرے اور مخلوق کا معاملہ چھوڑ دے۔ اس شبہے کا، جس کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے، جواب یہ ہے کہ مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دے، خواہ مقصود حاصل ہوتا ہے یا نہیں، اور خواہ لوگ اس کو مانتے ہیں یا نہیں۔ یہی شبہہ سابقہ اقوام کو بھی لاحق ہوا تھا جن کے قصے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اپنی کتاب میں ذکر کیے ہیں۔ ان واقعات میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ دعوت کے علم برداروں نے اس شبہے کا کیا جواب دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمَانِاللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا

۱- نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام، از محمد صدیق حسن خان، ص ۲۵۱، الجصاص، ج ۲، ص ۳۱

۲- الحسبة لابن تیمیة، فی مجموعة رسائلہ ص ۲۷۵

شَدِيدًا قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ. فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنْجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (الاعراف ۷: ۱۶۴-۱۶۵)

اور انھیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ ’’تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے؟‘‘ تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ ’’ہم یہ سب کچھ تمھارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اُس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔‘‘ آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انھیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو برائی سے روکتے تھے، اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔

یہ آیت کریمہ ایک بستی کے لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو تین گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ گناہوں میں مبتلا ہو گیا تھا، دوسرا گروہ ان کے اس فعل کو ناپسند کرتا تھا اور انھیں وعظ و نصیحت بھی کرتا تھا، جب کہ تیسرا گروہ خاموش تھا، وہ نہ گناہ کرتا تھا اور نہ کسی کو برائیوں سے روکتا تھا۔ اس آخری گروہ نے روکنے والوں سے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو جنھیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا یا سخت عذاب دینے والا ہے؟

یعنی تم ان لوگوں کو کیوں روکتے ہو، حالانکہ تمھیں معلوم ہے کہ یہ تو تباہ و برباد ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے مستحق ہیں۔ چنانچہ ان کو اس کام سے روکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس پر روکنے والوں نے ان کو وہی جواب دیا جو بالکل درست تھا، اور وہ یہ کہ مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ (یعنی تمھارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لیے)۔

مطلب یہ ہے کہ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں ہم سے مواخذہ کیا جائے گا تو ہم اپنے رب کے سامنے معذرت کریں گے کہ ہم تو یہی کر سکتے تھے کہ ان گناہ گاروں کو ان کے گناہوں سے باز آنے اور اپنے رب کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے۔

ان کا دوسرا جواب یہ تھا کہ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (یعنی اس امید پر کہ شاید یہ لوگ اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں)۔ مطلب یہ کہ ہماری ناپسندیدگی اور اللہ کی طرف رغبت و انابت کی دعوت سے یہ امید کی جا سکتی

ہے کہ وہ ہماری بات مان لیں اور راہِ راست پر آ جائیں۔[1]

اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جب تک دعوت کی قبولیت کا احتمال موجود ہو تو وعظ وارشاد اور دعوت الی اللہ کو جاری رکھنا چاہیے تاکہ جسے رہنا ہے وہ دلیل کے ساتھ زندہ رہے اور جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل کے ساتھ ہلاکت سے دوچار ہو۔

۵۲۰-بعض لوگ ایک اور شبہے میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ اس آیت سے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ ۲:۲۸۶) اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔

یہ لوگ اس آیت سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ دعوت الی اللہ ایک محنت اور مشقت کا کام ہے، اور وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے۔

یہ دلیل بھی دراصل ضعیف الایمان اور کمزور دین داری والے لوگوں کی ہے۔ اس طرح کی مشقت تو ان کو اس وقت بھی برداشت کرنی پڑتی ہے جب یہ دنیا کے معمولی بکھیڑوں میں مصروف ہوتے ہیں، جیسے دنیا کا کوئی معمولی فائدہ وغیرہ۔ چنانچہ اس کے مقابلے میں دعوت دین کی خاطر کچھ مشقت کرنا کوئی مہنگا نہیں، خصوصاً جب کہ اس مشقت کا اَجر بہت زیادہ ہے۔

یہ لوگ جس مشقت کی بات کرتے ہیں وہ بہت کم بھی ہے اور بڑی سہل بھی۔ کیا کسی ناواقف کو اسلام کے مسائل سکھانے یا ایک ایسے کافر کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے میں بہت زیادہ مشقت ہے، جس نے اسلام کے بارے میں کچھ نہیں سنا؟! کیا اس سے بھی کوئی تھک جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اچھی باتیں نکالے؟ یا اگر کوئی اسلام کے بارے میں غور وفکر کرے تو اس کا دماغ بہت زیادہ تھک جائے گا؟! اسی طرح کیا ایک شخص اس صورت میں کسی ناقابل برداشت مشقت سے دوچار ہو جائے گا کہ اللہ نے وسائل دیے ہوں اور وہ بت پرستانہ معاشروں میں جا کر ان کو اللہ کی طرف بلائے؟!

کیا یہ لوگ اہل کلیسا کو نہیں دیکھتے کہ وہ کئی کئی سال اپنے مشن کی راہ میں لگا دیتے ہیں؟! ایک مسلمان پر عیسائی مشنریوں سے بڑھ کر اس بات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلام کے مشن پر نکلیں اور ان بت

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۲۵۷

پرستوں کے درمیان دعوت الی اللہ کو عام کریں۔

ایک مسلمان کے دل میں جب شیطان یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ وہ تھک جائے گا اور مشقت میں مبتلا ہوگا تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو یاد کرے کہ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُونَ (النساء۴:۱۰۴) اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمھاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں۔

ایسے شخص کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ نے دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ میں بہت زیادہ تکلیفیں اٹھائیں، جن میں بعض کا ذکر ہم بطور مثال پیش کریں گے۔ سیرت کی کتابوں میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ جب غزوۂ اُحد سے واپس مدینے میں آئے تو اطلاع ملی کہ ابوسفیان اور اس کے مشرک ساتھی مدینے پر حملہ کرکے باقی لوگوں کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر پڑھی تو بلالؓ کو حکم دیا، اور انھوں نے اونچی آواز سے لوگوں کو پکارا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں حکم دیتے ہیں کہ اپنے دشمن کا تعاقب کرو، اور آج ہمارے ساتھ وہی شخص نکلے گا جو کل لڑائی میں شریک رہا ہو۔

حضرت سعد بن معاذؓ گئے اور اپنی قوم کو چلنے کا حکم دیا حالانکہ وہ سب زخموں سے چور تھے۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں حکم دیتے ہیں کہ اپنے دشمن کا پیچھا کرو۔ یہ سن کر حضرت اسید بن حضیرؓ جن کے جسم میں سات زخم تھے اور وہ ان کا علاج کروانا چاہتے تھے، کہنے لگے: اللہ اور اس کے رسول کا حکم سرآنکھوں پر۔ پھر اٹھے، ہتھیار اٹھایا اور دوائی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے۔

حضرت سعد بن عبادہؓ بھی اپنے قبیلے میں گئے اور حضرت ابوقتادہؓ بھی ایک گروہ کے پاس گئے۔ سارے لوگ فوراً اکٹھے ہو گئے۔ بنوسلمہ میں سے چالیس افراد تھے جو زخموں سے چور تھے۔ طفیل بن نعمانؓ کے جسم پر ۱۳ زخم تھے، نجراش بن الصمہؓ کے جسم پر ۱۰ زخم تھے۔ اس حالت میں جب سارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے انھیں دیکھ کر فرمایا: اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ بَنِي سَلَمَةَ. اے اللہ! بنوسلمہ پر رحم فرما۔[1]

۱۔ اُمتاع الأسماع للمقریزی، ص ۱۶۷

ایسے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اور یہ ہے اعلائے کلمۃ اللہ کے راستے میں ان کے جہاد کا ایک نمونہ۔ پھر کیا جب ایک مسلمان دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن کی نشر و اشاعت اور لوگوں کو اچھے اخلاق کی تعلیم دینے میں اپنے آپ کو تھوڑا سا تھکا دیتا ہے تو وہ اسے زیادہ خیال کرتا ہے؟! کیا اسے شرم نہیں آتی کہ وہ دعوت الی اللہ میں اپنی معمولی سی محنت کو بھی زیادہ خیال کرتا ہے، حالانکہ صحابہ کرامؓ زخم زخم جسموں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جنگ کے لیے نکلتے تھے اور کہتے تھے: اللہ اور اس کے رسول کا حکم سر آنکھوں پر؟!

وجوبِ دعوت الی اللہ کی وجوہات

۵۲۱- پچھلے صفحات میں ہم نے اس بات کے دلائل بیان کیے ہیں کہ دعوت الی اللہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام ایک مسلمان کے لیے صرف یہ کافی نہیں سمجھتا کہ وہ بذاتِ خود نیک اور ہدایت یافتہ ہو، بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی نیک بنانے والا اور سیدھے راستے پر لانے والا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔

۱- فریضۂ شہادتِ حق

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا: قُلْ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف ۷:۱۵۸) اے محمد! کہو کہ ''اے نسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔''

اور آپؐ کی رسالت قیامت کے دن تک ہے۔ اس رسالت کا مقصد یہ ہے کہ ساری مخلوق خدا ہدایت سے سرفراز ہو کر دنیا و آخرت کی سعادت سے بہرہ مند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی رسالت تمام جہانوں کے لیے رحمت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَٰلَمِينَ (الانبیاء ۲۱:۱۰۷) اے نبیؐ! ہم نے تم کو دنیا جہاں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا پیغام پہنچایا اور اس حالت میں اپنے رب کے پاس چلے

گئے کہ آپؐ اپنے رب سے راضی اور آپ کا رب آپؐ سے راضی۔ چنانچہ آپؐ کے بعد مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ پوری دنیا تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے، ان کو ہدایت کے نور سے منور کرتے اور انھیں اندھیروں سے نکال کر اُجالوں کی طرف لے جاتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الر کِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (ابراہیم ۱:۱۴) الف، لام، را، اے محمدؐ! یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمھاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ، ان کے رب کی توفیق سے، اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔

اسلام کو ماننے والے باقی مخلوق پر اللہ کے گواہ اور نبیؐ کے بعد لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرۃ ۲:۱۴۳) اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک 'امت وَسَط' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

مسلمان جب دعوت الی اللہ کا کام انجام دیتا ہے تو یہ چیز اللہ کے بندوں کے لیے عظیم نفع اور تعاون کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس لیے کہ مسلمان ان کی طرف مہربانی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ وہ انھیں شرک اور بت پرستی کی نجاستوں سے نجات دلاتا ہے جس میں وہ پڑے ہوتے ہیں اور انھیں صراط مستقیم پر ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اوپر اپنے رب کا لازم کردہ حق ادا کر دیتے ہیں اور وہ مقصد حاصل کر لیتے ہیں جس کے لیے انھیں پیدا کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات ۵۱:۵۶) میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

۲۔ کفر کا غلبہ اور اس کے اثرات

زمین پر کفر و شرک کا باقی رہنا جلد یا بدیر اُن اسلامی تعلیمات پر اثر انداز ہوتا ہے جو دنیا کے کسی حصے میں

قائم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام مسلمانوں کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ کفر کے علاقے میں رہیں۔ وہ انھیں حکم دیتا ہے کہ اسلامی ملک میں آ جائیں، تا کہ فتنے میں مبتلا ہو کر دل کے مریض اور ایمان سے محروم نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلآئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمْ قَالُوْا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيهَا فَأُولَٓئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَ تْ مَصِيْرًا (النساء۴:۹۷) جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ ''یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟'' انھوں نے جواب دیا کہ ''ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے''۔ فرشتوں نے کہا: ''کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟'' یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

مفسرین اس آیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کفار کے درمیان رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، وہ دین پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے، جب کہ ان کے لیے ہجرت کا راستہ کھلا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور ایک ایسے کام کا ارتکاب کرتے ہیں جو بالاتفاق حرام ہے۔[1]

امام مالکؒ فرماتے ہیں: اس زمین کو چھوڑ دو جس میں ناجائز کام کھلم کھلا ہوتے ہیں اور ان میں کوئی پردہ نہیں کیا جاتا۔[2]

اس بنا پر ایک مسلمان کا کفار و مشرکین کو اللہ کی طرف اور اس کے دین کی طرف بلانا ان کے لیے مفید ہے اور یہ انھیں کفر کے شر سے بچاتا ہے۔

۳- ہلاکت اور عذاب سے بچاؤ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوْا مِنكُمْ خَآصَّةً وَّاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الانفال۸:۲۵) اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انھی لوگوں تک

۱- تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص۵۴۲

۲- تفسیر القرطبی، ج۲، ص۳۹۱

محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے درمیان منکر کو برداشت نہ کریں، ورنہ ان پر عام عذاب آ جائے گا۔ یعنی وہ ایسا عذاب ہوگا کہ نیک و بد سب اس کے لپیٹ میں آ جائیں گے۔

صحیح مسلم میں زینب بنت جحشؓ سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم اس صورت میں بھی ہلاکت سے دوچار ہوں گے جب کہ ہمارے درمیان نیکوکار لوگ موجود ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: جی ہاں، جب کہ برائی عام ہو جائے۔[1]

داعی کی حالت وقدرت اور دعوت الی اللہ

۵۲۲- جب یہ بات واضح ہوگئی کہ دعوت الی اللہ ہر مسلمان پر واجب ہے تو اب یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ فریضہ داعی کی حالت اور اس کی قدرت منحصر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کے وجوب کا دارومدار قدرت ہی پر ہے۔ جو شخص قدرت نہیں رکھتا اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی اور جو شخص قدرت رکھتا ہے اس پر وجوب اتنا ہی ہوتا ہے جتنی اس کی قدرت ہوتی ہے۔

قدرت کے مفہوم میں علم اور اختیار واقتدار آتے ہیں۔ چنانچہ ایک عالم پر ایک چیز واجب ہوگی اور وہی چیز جاہل پر واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح اختیار واقتدار رکھنے والے پر ایک چیز واجب ہوگی اور وہی چیز اختیار واقتدار سے محروم ایک عام مسلمان پر واجب نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل علم کو خصوصی وعید سنائی اور انھیں حق کے کتمان سے منع کیا جس کا انھیں علم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ. إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (البقرۃ۲:۱۵۹-۱۶۰) جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآنحالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب

۱- القرطبی، ج۱، ص۳۹۰

میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ جو اس روش سے باز آ جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ چھپاتے تھے، اسے بیان کرنے لگیں، ان کو میں معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہل علم پر لازم کر دیا کہ اسلام کی جو تعلیمات ان کو معلوم ہو چکی ہیں انھیں بیان کر دیں اور انھیں لوگوں کے درمیان عام کریں تاکہ وہ شرک کی گندگیوں سے پاک ہو سکیں۔ جس کو اسلامی تعلیمات میں سے کسی بھی چیز کا علم ہو جائے تو اس چیز کی حد تک وہ عالم ہے اور اس پر لازم ہے کہ اسے ان لوگوں تک پہنچائے جو اس تعلیم سے بے خبر ہیں۔ اس لیے کہ علم کوئی ایسی اکائی نہیں ہے جس کی تقسیم اور تجزیہ نہ ہو سکے۔ علم ایک قابل تقسیم چیز ہے۔

جو مسلمان یہ بات جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ، اللہ کے رسول ہیں، اور قیامت کے دن حساب حق ہے، اور قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اسلام کے فرائض ہیں، تو اس پر لازم ہے کہ اپنے اس علم کی تبلیغ کرے۔ مگر جو شخص ان چیزوں سے بھی بے خبر ہے تو وہ نہ ان کی تبلیغ کا مکلف ہے اور نہ تعلیم کا، اس لیے کہ وہ خود لاعلم ہے، اور جس کے پاس ایک چیز موجود نہ ہو وہ چیز وہ کسی کو نہیں دے سکتا۔

قدرت کی دوسری قسم، اختیار و اقتدار اور زمین میں حکومت ہے۔ قرآن کریم نے اس قسم کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس کے حامل لوگوں پر لازم کر دیا ہے کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے اس اختیار و اقتدار کو دعوت الی اللہ کی نشر و اشاعت، اچھے کاموں کے ذریعے زمین کو آباد کرنے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے استعمال کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِينَ إِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (الحج ۲۲:۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

زمین میں صاحب اقتدار لوگ کون ہیں؟ اس کے بارے میں مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ حکمران ہیں۔ بعض نے اس میں علما کو بھی شامل کیا ہے۔[1] مگر پہلی بات زیادہ واضح ہے۔

اس بنا پر جس کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اور اقتدار عطا کیا ہو تو اس پر لازم ہے کہ زمین کو اللہ کی عبادت

سے آباد کرے، جس میں سرفہرست نماز ہے۔ اسی طرح وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ امر بالمعروف میں سرفہرست دعوت الی اللہ ہے اور نہی عن المنکر میں سرفہرست یہ ہے کہ لوگوں کو ہر قسم کے شرک سے روکے۔ یہی اس کی حکمرانی کا مقصود ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: امام کا تقرر اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ حکمرانی کا مقصد اصلی یہی ہے۔[2]

ماضی میں جو لوگ حکمران بنے تھے انھوں نے یہ مفہوم پالیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اقتدار کو اللہ کے دین کو قائم کرنے اور اس کی طرف دعوت دینے کے لیے استعمال کیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مختلف صوبہ جات کے اپنے گورنروں کو ایک خط لکھا تھا جس کا مفہوم یہ تھا:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنی اطاعت کا جو حکم نازل کیا ہے اس میں یہ بھی شامل ہے کہ آدمی لوگوں کو پورے کے پورے اسلام کی طرف بلائے ...لہٰذا تمھارا کام یہ ہے اسلام کی طرف دعوت دو اور اس کا حکم دو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ **وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صٰلِحًا وَّقَالَ إِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ** (حم السجدۃ ۴۱:۳۳) اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔[3]

حقیقت یہ ہے کہ حکمران کا فریضۂ دعوت کو ادا کرنا بڑے اچھے اور مؤثر نتائج کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس لیے کہ وہ قوت اور اقتدار کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں امر اور نہی کا اختیار ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ رعایا کے عام افراد کی بہ نسبت نفاذ احکام کی زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ اسی لیے تو ایک مشہور قول ہے کہ **إِنَّ اللّٰهَ يَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا يَزَعُ بِالْقُرْآنِ**. اللہ تعالیٰ حکمران کے ذریعے ان چیزوں کا قلع قمع کرتا ہے، جن کا قرآن سے نہیں کرتا۔

جس قدر ایک مسلمان دعوت و نفاذ پر قادر ہوتا ہے اسی قدر دعوت الی اللہ میں اس کا فرض اور ذمہ داری ہوتی ہے۔

ہر وقت اور ہر حال میں دعوت

۱- القرطبی، ج ۱۲، ص ۷۳

۲- السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہؒ، ص ۷۷

۳- عمر بن عبدالعزیز، از عبداللہ بن عبدالحکم، ص ۹۴

۵۲۳- ہم نے کہا ہے کہ دعوت الی اللہ مسلمان کا فریضہ ہے اور اسی اعتبار سے وہ اس کو ادا کرے گا۔ دعوت الی اللہ کے فریضے کے لیے نماز اور روزے کی طرح کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ اس وجہ سے مسلمان اس فریضے کو ہر قسم کے حالات میں اور ہر وقت، جب بھی اس کا موقع ملے، ادا کرے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا... ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا. ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا (نوح ۷۱: ۵، ۸-۹) اس نے عرض کیا: اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا...... پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی، پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔

اسی طرح ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی دن رات اور چپکے چپکے اور علانیہ اپنی قوم کو دعوت دیا کرتے تھے۔ کوئی چیز بھی ان کو دعوت الی اللہ سے مشغول نہ کر سکی۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ داعی جب اپنی دعوت میں سچا ہو تو وہ اس کا یہی مشغلہ ہوتا ہے۔ اس کی ہر سوچ دعوت کے بارے میں ہوتی ہے اور اس کی ہر حرکت اسی کی خاطر ہوتی ہے۔ وہ اس کے راستے میں اپنے وقت اور صلاحیتوں پر بخل سے کام نہیں لیتا۔ کوئی کام اُسے اس کام سے بے فکر نہیں کر سکتا، یہاں تک کہ وہ سخت ترین لمحات اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی اسی کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

ہمارے رسول پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح تھے۔ آپؐ جس وقت مدینہ کی ہجرت فرما رہے تھے، جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے، تو راستے میں مکہ اور مدینہ کے درمیان آپؐ سے بریدہ بن الحصیب الاسلمیؓ کی ملاقات ہوئی جو اپنی قوم کے قافلے کے ساتھ جا رہا تھا۔ آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور انھوں نے اسلام قبول کیا۔[۲]

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مشکل ترین وقت میں بھی دعوت الی اللہ سے غافل نہ تھے، حالانکہ آپؐ مکہ کو چھوڑ کر مدینے کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور آپؐ کی قوم آپؐ کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

۱- امتاع الاسماع للمقریزی، ص ۱۸

۲- اُمتاع الاسماع للمقریزی، ص ۴۲

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام مظلومانہ طور پر جیل میں ڈال دیے گئے مگر جیل اور اس کی تنگ وتاریک زندگی ان کو دعوت الی اللہ کے فریضے سے غافل نہ کرسکی۔ یہی وجہ تھی کہ جب دو قیدیوں نے ان سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو اس موقع کو انھوں نے غنیمت جانا اور انھوں نے جواب دینے سے پہلے ان کو اللہ کی طرف بلایا۔ اس واقعے کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ہمارے سامنے بیان فرمایا ہے:

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ أَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ. مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلَّآ أَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ أَنْتُمْ وَآبَآؤُكُمْ مَّآ أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّآ إِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (یوسف ۱۲: ۳۹-۴۰) اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباواَجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

داعی کی اصل ذمہ داری

۵۲۴- داعی سے جو کام مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف دعوت دے، اور یہی اس کی ذمہ داری ہے۔ اس سے یہ مطلوب نہیں ہے کہ لوگ مان کر بھی دیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (النور ۲۴: ۵۴) رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔

جب رسول کی حالت یہ ہے کہ تبلیغ کے علاوہ کسی چیز کا مکلّف نہیں ہے تو اُمت کے افراد بطریق اولیٰ تبلیغ کے سوا کسی چیز کے مکلّف نہ ہوں۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

ایک یہ ہے کہ ایک اصولی قاعدہ ہے کہ انسان کسی اور کے فعل کا مکلّف نہیں ہوتا۔ یعنی کوئی اس بات کا مکلّف نہیں ہے کہ فلاں آدمی یہ کام کرے اور یہ کام نہ کرے۔ اس لیے کہ یہ طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا ہے۔ البتہ انسان اس بات کا مکلّف ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق سے متعلق اپنا فلاں کام کرے۔ بلکہ بعض

اوقات تو اسے ایسے فعل پر مجبور کیا جاتا ہے، جیسے دعوت الی اللہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ۔ چنانچہ انسان اس بات کا مکلّف ہے اور اس سے یہ مطلوب ہے کہ وہ معروف کا حکم دے۔

اب اگر مامور اس حکم کو مان لیتا ہے تو حکم دینے والے کا فعل مامور کے فعل کا سبب بن جاتا ہے، مگر کبھی مامور اس حکم کو مان کر نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی [حضرت اسماعیلؑ] کی اس بات پر تعریف کی ہے کہ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ (مریم ۱۹:۵۵) وہ اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیتے تھے۔

چنانچہ ایک مسلمان جس چیز کا مالک اور اس کا مکلّف ہے وہ یہ ہے کہ دوسروں کو معروف کا حکم دے اور انھیں اللہ کی عبادت کی طرف بلائے۔ مگر وہ اس بات کا مکلّف نہیں ہے کہ دوسروں سے کوئی کام کروا کے رہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مدعو سے داعی کی بات منوانا اور اسے ہدایت دینا ایک اللہ کے ہاتھ میں ہے، کہ وہی ہادی ہے: يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ (الفاطر ۳۵:۸) جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔

اللہ کو اپنے بندوں پر حجت بھی حاصل ہے۔ اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت دے دیتا۔ اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا تھا، البتہ باقی سب جواب دہ ہیں۔ تبلیغ، بیان اور دعوت کی ہدایت تو رسولوں کی ذمہ داری بھی تھی اور ہر داعی کی ذمہ داری ہے، اس لیے کہ وہ اس کے مکلّف ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے: وَإِنَّكَ لَتَهْدِيٓ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (الشوریٰ ۴۲:۵۲) یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔

مگر اس کے ساتھ ایک اور آیت میں یہ ارشاد ہے: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ (القصص ۲۸:۵۶) اے نبیؐ! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

اللہ کی طرف مسلسل دعوت

۵۲۵- جب ایک مسلمان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف دعوت دے اور اس سے یہ مطلوب نہیں ہے کہ لوگ ہدایت پا جائیں، تو اس کو چاہیے کہ بغیر کسی اُکتاہٹ کے، دعوت کا کام جاری رکھے، کیوں

کہ اس کا کام بات پہنچانا اوراس کی وضاحت کرنا ہے۔ یہ کام اس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اس لیے اسے چاہیے کہ اس کام کو بھی ویسے ہی انجام دے جیسا کہ وہ دوسرے فرائض انجام دیتا ہے، اگرچہ کوئی بھی اس کی دعوت پر لبیک نہ کہے۔

کیا حضرت نوح علیہ السلام کو نہیں دیکھتے کہ وہ اپنی قوم کو ۹۵۰ سال تک اللہ کی طرف بلاتے رہے؟ اسی طرح تھے اللہ کے رسول۔ وہ ساری زندگی لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ان میں سے ایسے بھی تھے جن کی دعوت کو کسی ایک شخص نے قبول نہیں کیا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ایک مکلّف شخص سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس بات پر ساقط نہیں ہوتا کہ اس کے خیال میں امر بالمعروف کا کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ اس پر لازم ہوگا کہ اس فریضے کو ادا کرتا رہے۔اس لیے کہ ایمان لانے والوں کو نصیحت فائدہ ضرور پہنچاتی ہے۔اوراس کے ذمے جو کام ہے وہ امرونہی ہے نہ قبولیت۔[1]

اس قول سے استدلال کی توجیہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سرفہرست ہے۔ چنانچہ اس معنی کے لحاظ سے یہ قول بھی ہماری رائے کی تائید کرتا ہے۔اسی مفہوم کو علامہ سیوطیؒ نے بھی بیان کیا ہے۔[2]

دعوت الی اللہ کو مسلسل جاری رکھنے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مایوسی کو حرام کیا گیا ہے اور اس بات کی امید رکھنے کی تاکید کی گئی ہے کہ کبھی نہ کبھی کوئی مان لے گا۔اس لیے کہ معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں،اور بندوں کے دل،رحمٰن کی انگلیوں میں ہوتے ہیں،وہ انھیں جس طرح چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ داعی اس بات کا قطعی فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کوئی مان کر نہیں دیتا۔ چنانچہ اس پر لازم ہے کہ دعوت اور وعظ وارشاد مسلسل جاری رکھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ وہ کام انجام دے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

داعی کا اجر اللہ پر ہے نہ کہ بندوں پر

۵۲۶-اللہ کی طرف دعوت دینے والا ایک فریضہ ادا کرتا ہے اور اللہ کے حکم کے تحت ایک عبادت انجام

۱-شرح صحیح مسلم، ج ۲،ص ۲۲

۲-دیکھیے :الاشباہ والنظائر للسیوطی ،ص ۳۰۷

دیتا ہے۔عبادت کرنے والا عبادت کا اَجر اپنے رب جلیل سے پاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر فضل واحسان ہوتا ہے۔ چنانچہ داعی کسی بھی مخلوق سے اپنی دعوت کا اَجر نہیں مانگتا، نہ مال کی صورت میں، نہ تعریف وتوصیف کی صورت میں، نہ جاہ ومنصب کی صورت میں اور نہ کسی دوسرے مادی یا معنوی عوض کی صورت میں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (یونس۱۰:۷۲)تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہ تھا، میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے۔اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں۔

اور ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ لَّآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (الشوریٰ۴۲:۲۳) کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔

یعنی صرف یہی کہتا ہوں کہ میرے ساتھ اپنی رشتہ داری کا ہی خیال کرو۔ مجھے دعوت الی اللہ کا کام کرنے دو اور مجھے اس سے منع کرنے کی کوشش نہ کرو اور نہ دوسرے لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش کرو۔

یہ طریق کار اللہ کے سارے رسولوں کا تھا۔ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے اور ان سے کسی اجر یا قدر دانی کے طالب نہ ہوتے تھے۔ کیوں کہ ان کا اجر، اللہ کریم کے ذمے تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَآءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ. اتَّبِعُوا مَنْ لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُونَ (یٰس ۳۶:۲۰-۲۱) شہر کے دور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا: اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی پیروی اختیار کرلو۔ پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں۔

اسلام میں داعی کا مقام

۵۲۷- اسلام میں داعی الی اللہ کا مقام بہت بلند ہے۔ دعوت الی اللہ کے راستے میں اس کی گفتگو اللہ کی

ترازو میں، جو سب سے اچھی ترازو ہے، بہترین گفتگو ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صٰلِحًا وَّقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (حم السجدة ۴۱: ۳۳) اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔

یہ آیت جیسا کہ مفسرین فرماتے ہیں، ان سارے لوگوں کے بارے میں ہے جو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر ہوتے ہیں، نیک عمل کرتے ہیں، فرائض کو ادا کرتے ہیں اور حرام چیزوں سے بچتے ہیں۔[1]

دعوت الی اللہ کے راستے میں اس کے کلمات، خصوصاً اس وقت جب کہ اللہ سے انکار اور سرکشی عام ہو، روئے زمین پر بولے جانے والے سب سے بہترین کلمات ہوتے ہیں۔ اور اگر ان کا کہنے والا ذاتی نیکی اور اللہ کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کی صفات سے متصف ہو تو وہ روئے زمین کا بہترین شخص ہوگا۔

رہا داعی الی اللہ کے اجر کا معاملہ تو اس کا اجر بہت بڑا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ دَعَا إِلٰى هُدًى كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ أُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهُ لَايَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا. جس نے کسی اچھی بات کی طرف دعوت دی اسے ان لوگوں کے برابر ثواب ملے گا جو اس کی پیروی کریں گے، اور اُن کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

فَوَاللّٰهِ لَأَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلاً وَّاحِدًا ، خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ. اللہ تعالیٰ تیرے ذریعے ایک شخص کو ہدایت سے نواز دے تو یہ تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے بہت ہی بہتر ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ مَنْ دَلَّ عَلٰى خَيْرٍ فَلَهُ أَجْرُ فَاعِلِهِ. جس نے کسی بھلائی کے کام کی طرف رہنمائی کی اس کے لیے بھلائی کرنے والے کے برابر اجر ہے۔

☆ ☆

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۱۰۰

دوسری فصل

داعی کے لیے زادِ راہ

تمہید

۵۲۸- داعی کو اپنی مہم اور اپنے کام، جو دراصل انبیا کا کام ہے، کی ادائیگی بڑی مضبوط تیاری اور زادِ راہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تیاری کے حوالے سے چند امور یہ ہیں: گہرا فہم، مضبوط ایمان اور اللہ کے ساتھ گہرا تعلق۔ یہ دعوت کی تیاری کے اہم ارکان ہیں۔ اگر داعی میں یہ چیزیں نہ ہوں تو ان کی تلافی کوئی اور چیز نہیں کر سکتی۔ اگر داعی کے دل میں یہ امور کمزور ہیں تو اسے چاہیے کہ انھیں قوت پہنچائے۔ ذیل میں مقصود کی وضاحت کے لیے چند مباحث پیش کی جاتی ہیں۔

۱

گہرا فہم

عمل سے پہلے علم

۵۲۹-علم عمل سے پہلے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ (محمد ۴۷:۱۹) پس اے نبیؐ! خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے علم کو عمل سے پہلے ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی عمل سے پہلے علم ضروری ہے، تا کہ آدمی کو معلوم ہو سکے کہ وہ کیا چاہتا ہے، اور پھر اس کے حصول کے لیے عمل کر سکے۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ ہر عمل کے لیے علم ضروری ہے تو داعی الی اللہ کے لیے اس کی ضرورت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ جو کام کر رہا ہے وہ دین کا حصہ ہے اور اللہ کی طرف منسوب ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ داعی جس چیز کی طرف دعوت دے رہا ہے اس کے بارے میں اسے علم و بصیرت حاصل ہو اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے یا کر رہا ہے اس کے شرعی ہونے کا یقین ہو۔ اگر وہ دعوت کے لیے مطلوب علم سے محروم ہوگا تو وہ اس چیز سے جاہل ہوگا جسے وہ چاہتا ہے۔

اس طرح وہ خبط اور خلط میں مبتلا ہوگا اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں بغیر علم کے بات کرے گا۔ اس کا نقصان اس کے فائدے سے اور اس کا فساد اس کی اصلاح سے زیادہ ہوگا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوگا کہ وہ منکر کا حکم دے گا اور معروف سے منع کرے گا اس لیے کہ وہ اس بات سے بے خبر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز کو حلال یا واجب کیا ہے اور کس کو منع یا حرام کیا ہے۔ چنانچہ ہر داعی الی اللہ کو چاہیے کہ اس کے پاس شریعت کا علم ہو، حلال و حرام کا علم ہو اور جائز و ناجائز کا علم ہو۔ اسے معلوم ہو کہ کس چیز میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے اور کس میں نہیں، اسی طرح کون سی چیز ہے جس میں کئی پہلوؤں کی گنجایش موجود ہے اور کون سی چیز میں یہ گنجایش نہیں ہے۔

پھر علم وہ ہے جس پر کتاب اللہ، سنت رسول یا دوسرے شرعی دلائل سے کوئی دلیل قائم ہو چکی ہو۔ مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے شرعی اور نافع علم میں اضافہ کرتا رہے تاکہ وہ اپنی دعوت کا موضوع پہچان سکے اور اس کے بارے میں پوری بصیرت کے ساتھ اور دلیل و برہان کے ساتھ قدم آگے بڑھا سکے۔ چنانچہ وہ حکم دے تو حق کا، اور اگر منع کرے تو باطل سے۔

علم کی فضیلت

۵۳۰-علم اور علما کی فضیلت کوئی اجنبی چیز نہیں بلکہ ایک معروف امر ہے۔ قرآن نے اس کے بارے میں کلام کیا ہے اور اس کی شان کو بلند کیا ہے۔ سنت نبوی نے بھی اس کی تاکید کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا زادِراہ ساتھ لینے اور اس میں مسلسل اضافہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ ۲۰:۱۱۴) اور دعا کرو کہ اے رب! مجھے مزید علم عطا کر۔

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (المجادلہ ۵۸:۱۱) تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا۔

اور سنت نبویؐ میں ہے: مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْهُ فِي الدِّیْنِ. جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کرنا چاہتا ہے اس دین میں فقاہت سے نواز دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل علم کو ایک ایسی خبر میں گواہ بنایا ہے جس پر پہلے سے گواہی موجود ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں اہل علم کی گواہی کو اپنی اور فرشتوں کی گواہی کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے۔ یہ گویا کہ اہل علم کا تزکیہ کرنا، ان کو عادل قرار دینا اور ان کی توثیق کرنا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو گواہ نہیں بناتا جو قابل اعتماد نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (آل عمران ۳:۱۸) اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔

اہل علم صرف اپنے لیے مفید نہیں ہوتے بلکہ وہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں، انھیں اپنے رب کی طرف لے چلتے ہیں اور اس تک پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ کے بقول لوگ کھانے پینے سے زیادہ علم کے محتاج ہیں۔ اس لیے کہ کھانے پینے کی دن میں ایک یا دو مرتبہ ضرورت محسوس ہوتی ہے اور علم کی ضرورت سانسوں کی مقدار میں ہوتی ہے۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر علم کی طلب نفل نماز سے افضل ہے۔ یہی بات امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور دوسرے ائمۂ اسلام نے کہی ہے۔

سنت نبوی میں اہل علم کے لیے بشارت آئی ہے۔ حدیث میں ہے:

إِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ، وَإِنَّ اللهَ تَعَالٰى وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِي النَّاسِ الْخَيْرَ. صاحب علم کے لیے آسمانوں اور زمین والے مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے، لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والے کے لیے بھلائی کی دعائیں کرتے ہیں۔[1]

چنانچہ ایک مسلمان داعی کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ وہ دین میں فقاہت حاصل کرلے، اس کے احکام سے آگاہی بہم پہنچائے اور لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دے، یہاں تک کہ اس کو وہ مقام حاصل ہوجائے جس کی طرف ان آیات اور احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

گہرے فہم کا مطلب

۵۳۱- علم کی ایک قسم وہ ہے جو بہت اہم اور نادر ہے اور جس سے اکثر لوگ غفلت کرتے ہیں، حالانکہ اس پر قرآنِ کریم بھی نہ صرف دلالت کرتا ہے بلکہ اس کی صراحت بھی کرتا ہے اور اس کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یعنی آخرت کے راستے کا علم، جو دل کو بیدار کرکے اسے بے قرار کردیتا ہے اور اسے کردار و عمل پر مجبور کرتا ہے۔ اس علم کا حامل دنیا میں اجنبیت محسوس کرتا ہے اور اسے ہر وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ دور کے سفر پر، جس سے دوبارہ دنیا میں آمد نہیں اور جس میں تقویٰ کے علاوہ کوئی زادِراہ کام نہیں آئے گا، روانہ ہونے کا وقت قریب آیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس زادِراہ کو جمع کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

۱- مدارج السالکین لابن القیم الجوزیہ، ص ا، ص ۴۶۹-۴۷۰

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (البقرۃ ۲:۱۹۷) زادِ راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے۔

• وہ اپنے چشم بصیرت سے دوسرے جہاں میں جھانکتا ہے، جس کی طرف اس کو موت کے لمبے سفر کے بعد جانا ہے۔ کیا اس کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہوگی، اگر یہی بات ہے تو یہ تو بڑی بدبختی ہے، یا پھر اس کا ٹھکانا جنت ہے جہاں وہ اپنے رب کریم کے ہاں رہے گا۔ مومن اپنے اس غیر یقینی انجام کی وجہ سے ہمیشہ خوف ورجا کے درمیان میں ہوتا ہے۔ مگر یہ خوف ایک جاننے والے کا خوف ہوتا ہے، نہ کہ جاہل کا، اور یہ رجا ایک عامل شخص کی ہوتی ہے نہ کہ سست وکاہل کی۔

یہ وہ علم ہے جس کا وجود عام لوگوں میں اور خود طالب علموں میں بھی کم ہے۔ مگر اس کے بغیر کسی عالم کو عالم نہیں کہا جا سکتا، اگرچہ اس نے کتنی شروح ومتون حفظ کر لی ہوں اور کتنے ہی احکام وفتاویٰ سے اپنے دماغ کو بھر دیا ہو اور انھیں ہر وقت زبانی دہراتا ہو۔

یہی علم دراصل علم کا خلاصہ اور اس کا مقصد ہے، ہر مسلمان اس علم کا محتاج ہے، عالم اس کا محتاج تر اور داعی محتاج ترین ہے۔ یہی علم ہے جسے ہم گہرے فہم کا نام دیتے ہیں۔ یہ وہی علم ہے جسے صحابہ کرام نے سمجھا تھا اور جو اُن کے دل ودماغ میں رچ بس گیا تھا۔ انھوں نے اپنے وقت کے معاملے میں سخت بخل سے کام لیا کہ کہیں وہ اطاعت الٰہی اور دعوت الی اللہ کے علاوہ کسی اور کام میں ضائع نہ ہو جائے۔ ان کے جسم کے اعضا عبادت، جہاد فی سبیل اللہ اور دعوت الی اللہ میں سرگرم رہے، یہاں تک کہ ان کے رب کی طرف سے ان کو بلاوا آ گیا۔

گہرے فہم کی بنیاد

۵۳۲- گہرے فہم کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آدمی قرآن کریم کے معانی پر غور وفکر کرے، ان پر گہری نظر رکھے، انھیں بار بار دہرائے، ان کے پاس ٹھہرے اور ان کے مقصد ومرام کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اسی لیے نازل کی ہے کہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کریں، نہ کہ اس لیے کہ لوگ اسے فہم وتدبر کے بغیر پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَیْكَ مُبَارَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (صٓ ۳۸:۲۹) یہ

ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تا کہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد ۴۷:۲۴) کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا، یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں۔

توجہ اور تدبر کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت مسلمان کو اپنے اُس رب کے ساتھ متعارف کرا دیتی ہے، جس کی طرف وہ دعوت دیتا ہے، اس راستے کے ساتھ متعارف کرا دیتی ہے، جو رب تک پہنچانے والا ہے، اور اس عزت و اکرام سے متعارف کرا دیتی ہے جو دعوت قبول کرنے کی صورت میں قبول کرنے والے کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ غور و تدبر مسلمان کو تین مزید چیزوں سے بھی متعارف کرا دیتی ہے: ایک وہ دعوت جس کی طرف شیطان اور اس کی پارٹی بلاتی ہے، دوسرا وہ راستہ جو شیطان تک پہنچانے والا ہے اور تیسری وہ ذلت و رسوائی اور عذاب جو شیطان کی دعوت پر لبیک کہنے والے کو ملتا ہے۔

یہ ساری معرفتیں داعی کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس لیے کہ ان معرفتوں کی بنا پر وہ ایسا بن جاتا ہے جیسے وہ آخرت میں جی رہا ہو، اگر چہ وہ اسی دنیا میں زندہ ہوتا ہے۔ یہ معرفت اس کے لیے حق اور باطل میں اور ہر اس چیز میں تمیز پیدا کر دیتی ہے جس میں لوگوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ معرفت اسے حق کو حق اور باطل کو باطل بنا کر پیش کر دیتی ہے۔ یہ معرفت اسے وہ کسوٹی اور نور عطا کر دیتی ہے جس کے ذریعے وہ ہدایت اور گمراہی کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔ یہ معرفت اس کے دل میں قوت ڈال دیتی ہے، اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے، اسے وسعت اور فراخی عطا کرتی ہے، اسے خوشی اور تر و تازگی سے نوازتی ہے اور اس کا تعلق آخرت سے قائم کر کے اس کے دل میں دنیا سے بے نیازی کا جذبہ ابھارتی ہے۔ چنانچہ اس کی حالت کچھ ہوتی ہے اور دوسرے لوگوں کی حالت کچھ اور۔[1]

گہرے فہم کے ارکان

۵۳۳- گہرے فہم کے ارکان اور بنیادیں تو بہت زیادہ ہیں مگر ہماری نظر میں ان میں سے اہم ترین ارکان دو ہیں:

۱- مدارج السالکین لابن القیم، ج ۱، ص ۴۵۲

۱- داعی کا زندگی میں اپنے مقصد اور انسانوں کے درمیان اپنے مقام کو پہچان لینا۔

۲- دنیاداری سے اجتناب اور آخرت کے ساتھ اپنے تعلق کو استوار کرنا۔

ذیل میں ہم ان دونوں ارکان کا مقصد بیان کریں گے۔

اپنے مقصد اور مقام کی پہچان

۵۳۴- اس دنیا میں انسان کا مقصد کیا ہے اور کیا اس مقصد کے پیچھے کوئی اور مقصد بھی ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن کریم ہمیں دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

۱- پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جنھوں نے کھانے، پینے اور جسم کی لذتوں سے مستفید ہونے کو اپنا مقصد بنالیا ہے۔ ان کے نزدیک اس مقصد کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ایام کو غنیمت جان کر اس سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی کوتاہ بین نگاہوں اور مردہ دلوں میں اس زندگی کے بعد فنا اور عدم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ لوگ بدترین اور بدبخت ترین مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد ۴۷:۱۲) اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چندروزہ زندگی مزے لوٹ رہے ہیں، جانوروں کی طرح کھاپی رہے ہیں، اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔

گویا کہ وہ چوپایوں اور حیوانوں کی طرح بن گئے۔ ان کے اور حیوانوں کے درمیان فرق بس شکل وصورت کا رہ گیا ہے، یا پھر اس بات کا کہ حیوان جہنم میں نہیں جائیں گے، جبکہ یہ لوگ جہنم میں جائیں گے۔

اس نوع کے لوگوں کا یہی مقصد ہوتا ہے، رہا دنیا میں ان کا مقام تو وہ گمراہی اور فساد کا مقام ہے اور ان سب چیزوں کا انجام کار آگ میں داخل ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أُولٰئِكَ يَدْعُوْنَ إِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (البقرۃ ۲:۲۲۱) یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ

وہ سبق لیں گے۔

۲۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جنھوں نے اپنی حقیقت اور مقصد کو پہچان لیا۔ ان کو معلوم ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۱:۵۶) میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

اور انھیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے: يَـٰٓأَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيْهِ (الانشقاق ۸۴:۶) اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔

ان کا مقصد ایک اللہ کی عبادت کرنا ہے، جس میں جہاد فی سبیل اللہ، دعوت الی اللہ، بھلائیوں کے ساتھ زمین کی آبادی، بھٹکنے والے لوگوں کی حق کی طرف رہنمائی اور زندگی کے مسائل میں ان کی قیادت جیسے اعمال شامل ہیں۔

یہ مقصد تو ان کا اس زندگی میں ہے، اور پھر اس کے پیچھے ایک بڑا اور بلند تر مقصد ہے، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کی رضامندی کا حصول۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (الحج ۲۲:۷۷-۷۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو، اور نیک کام کرو، اسی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمھیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمھارا نام 'مسلم' رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے)، تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور

اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمھارا مولیٰ، بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔

یہ ہے زندگی میں مسلمان کا کام اور اس کا مقصد۔ یعنی اللہ وحدہٗ کی عبادت اور اس کی راہ میں جہاد۔ اپنے نفس کے خلاف جہاد، تاکہ اسے اطاعت پر مجبور کرے اور گناہ سے دور رکھے۔ قلم، زبان، مال اور ہاتھ کے ساتھ جہاد، یہاں تک کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور انسانیت اسلام کے نور سے منور ہو۔ اس عظیم ذمہ داری کے لیے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو چن لیا ہے۔

یہ ذمہ داری ہے لوگوں کو ہدایت دینا، حق کی طرف ان کی قیادت کرنا اور انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنیوں کی طرف لے جانا۔ چنانچہ اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسلمان اس عظیم ذمہ داری سے دست بردار ہو۔ یہ وہ عزت و شرف والا کام ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عزت بخشی ہے۔ چنانچہ ان کا فرض ہے کہ رضامندی سے اس کا استقبال کریں، اس کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔

دنیا سے پہلوتہی اور آخرت سے تعلق

۵۳۵- دنیا سے تعلق، اس کی طرف جھک جانا اور اسے آخرت پر ترجیح دینا دل کے لیے جتنا نقصان دہ ہے اتنی اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان آخرت کی طرف جھانکنے، اس کے لیے عمل کرنے، اپنے جسم کو اللہ کی راہ میں تھکا دینے اور اس کی طرف دعوت دینے سے غافل ہو جاتا ہے۔ ایک فاسد اور بیمار دل سے یہ بات کوسوں دور ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کی مشکلات کو انگیز کرے۔ دنیا میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ لوگوں کو دھوکے میں ڈال دے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ إِنَّ الدُّنيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَإِنَّ اللهَ مُسْتَخلِفُكُمْ فِيهَا فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ، فَاتَّقُوا الدُّنيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ. یقیناً دنیا میٹھی اور سرسبز ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھیں اس کی خلافت دیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔ اس لیے تم دنیا اور عورتوں [کے فتنے] سے بچو۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ہمیں اس کے ساتھ تعلق رکھنے اور اس کی جال میں پھنسنے سے ڈرایا ہے۔ ارشاد ہے:

يَـٰأَيُّهَا النَّاسُ... إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (لقمان ۳۱:۳۳) لوگو!...... فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں ڈالے، اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکہ دینے پائے۔

دنیا کے معاملے میں دھوکے میں پڑنے اور اس سے دھوکہ کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بہت سی خوش نمائیاں اور لذتیں پائی جاتی ہیں، جنھیں انسان اپنے سارے حواس کے ساتھ محسوس کرتا ہے، اس کا نفس طبعی طور پر ان کی خواہش کرتا ہے اور اسے دوسری چیزوں پر ترجیح دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ. وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (القیامۃ ۷۵: ۲۰-۲۱) اصل بات یہ ہے کہ تم جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

جب نفس کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ تعلق اور مناسبت میں اضافہ ہوتا ہے یہاں تک کہ دنیا ہی انسان کا اصل مقصد، بلکہ منتہائے مقصود اور مبلغِ علم بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَأَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا. ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (النجم ۵۳:۲۹-۳۰) پس اے نبیؐ! جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے، اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو— ان لوگوں کو مبلغِ علم بس یہی کچھ ہے۔

جب نفس کی حالت اس حد تک پہنچتی ہے تو وہ قبولیت حق اور عبرت پذیری کی حس کھو دیتا ہے۔ اس صورت میں کوئی وعظ و نصیحت اس کو فائدہ نہیں دیتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا نفس رکھنے والا انسان داعی الی اللہ نہیں بن سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ دنیا کی قید اور اس کے ساتھ تعلق سے دل کی نجات کا طریقہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کے زائل ہونے اور اس سے جدائی کا یقین دل میں جاگزیں کیا جائے۔ اور اس کے مقابلے میں آخرت کے یقینی ہونے اور اس کے دائمی ہونے کا یقین پیدا کیا جائے۔ پھر دونوں چیزوں کا آپس میں مقابلہ کرکے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ أُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (القصص ۲۸:۶۰) تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے

وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان ہے۔

اسی طرح ارشاد ہے:

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَّالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (النساء۴:۷۷) ان سے کہو: دنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خداترس انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے، اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہیں کیا جائے گا۔

اور فرمایا: مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (النحل۱۶:۹۶) جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔

اس کے علاوہ آخرت سے تعلق بڑھانے اور دنیا کی محبت ختم کرنے کے لیے ان باتوں کو ذہن میں مستحضر رکھنا چاہیے جن کا یقین حاصل کر لیا ہے۔

پس یہ یقین اور اسے ذہن میں مستحضر رکھنا بھی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آج کل آج کل کرنے اور لمبی لمبی امیدوں کو قطع کیا جائے، یہاں تک کہ آدمی اس دنیا میں اجنبیت محسوس کرے اور دل میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے کہ کسی بھی لمحے دنیا سے چلے جانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

إِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ، وَإِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ... صبح ہو جائے تو شام ہونے کا خیال دل میں نہ لاؤ اور شام ہو جائے تو صبح ہونے کا خیال دل میں نہ لاؤ۔

آپؐ نے یہ بھی فرمایا: مَا لِي وَلِلدُّنْيَا، مَا أَنَا وَالدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا. مجھے دنیا سے کیا غرض!! میری اور دنیا کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک سوار [تھوڑی دیر] کسی درخت کے سایے میں بیٹھ جائے اور پھر اسے چھوڑ کر چل پڑے۔

جب شیطان آدمی کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے اور اس کے خیال میں یہ بات لاتا ہے کہ وہ تو ابھی جوان ہے، طاقت ور ہے، صحت و عافیت کی فراوانی ہے تو اس وسوسے کو ان نوجوانوں کا تصور کر کے دل سے

جھٹک دے جو دنیا سے چلے گئے اور اب منوں مٹی کے نیچے دفن ہیں۔

اگر شیطان اپنے وسوسے پر ضد کرے تو آدمی قبرستان کا رخ کر کے وہاں کے باسیوں کے ساتھ خیالی گفتگو کرے جن میں بہت سے وہ نوجوان ہوتے ہیں جنھوں نے جوانی میں موت کا پیالہ پی لیا ہے۔ اس کے بعد اپنے محلے میں آ کر وہاں کے بوڑھے اور عمر رسیدہ افراد کی گنتی کرے، یقیناً وہ انھیں عام لوگوں کے مقابلے میں دس فی صد سے بھی کم پائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت تو جوانی میں زیادہ آتی ہے، اور موت سے بہت تھوڑے لوگ ہی بچ کر بوڑھے ہو پاتے ہیں۔

جب دنیا کے بارے میں اس کی امیدیں محدود ہو جائیں گی تو دل میں آخرت کی تیاری کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا داعیہ پیدا ہوگا اور وہ نیک اعمال شروع کرے گا۔ اس لیے کہ نہ معلوم، کب بلاوا آتا ہے۔

جس وقت ایک مسلمان داعی دنیا طلبی سے نجات پاتا ہے، اس کا زہر اپنے دل سے نکال پھینکتا ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو وہ دنیا میں سخت اجنبیت محسوس کرتا ہے، مگر اس کا دل ہلکا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب کی رضامندی کے کاموں کی طرف متوجہ ہوتا ہے جن میں سرفہرست اللہ کی طرف دعوت اور اس کے پریشان بندوں کی رہنمائی ہے۔

اس کام میں کوئی تھکاوٹ یا اُکتاہٹ، کوئی درد یا تکلیف، کوئی سفر یا حضر، کوئی نیند یا بے خوابی، کوئی خرچ اور کوئی قربانی اس کے سامنے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ یہ ساری چیزیں وہ زادِراہ ہیں جن کا نفع یقینی اور جن کا فائدہ آخرت کے لمبے اور دور کے سفر میں ملنے والا ہے۔ بلکہ وہ اپنی تھکاوٹ میں راحت اور درد میں لذت محسوس کرے گا، اور اپنے خرچ میں کمائی اور قربانی کے بدلے میں عظیم اجر پائے گا۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ محض خیال اور مبالغہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے۔

ایک شخص جب لمبے عرصے تک اپنے گھر سے دور رہتا ہے اور اس کے دل میں گھر کا شوق پیدا ہوتا ہے تو جب وہ سفر کا سامان تیار کرتا ہے اس میں اسے ایک عجیب قسم کی لذت ہوتی ہے، خواہ اس تیاری سے اُسے کتنی ہی جسمانی تھکاوٹ ہو اور اس کی کتنی ہی نیند حرام ہو جائے۔

۲

گہرا ایمان

گہرے ایمان کی حقیقت

۵۳۶- گہرے ایمان سے ہماری مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان داعی اس بات کا یقین پیدا کرے کہ اسلام، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت دی ہے اور جس کی طرف دعوت کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے، وہی خالص حق ہے، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ قطعی باطل اور گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (البقرۃ ۲: ۱۲۰) صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ (یونس ۱۰: ۳۲) حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟

اسلام کی حقانیت کا یہ یقین ایک مسلمان داعی کے ہاں دو اور دو چار کی طرح یقینی اور بدیہی حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بدیہی حقیقت کے بارے میں کسی مناقشہ و مناظرہ یا کسی شک و شبہہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا، نہ اس پر کسی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

اس کے ساتھ یہ تیقن بھی ضروری ہے کہ مذکورہ یقین سے سرِ مو انحراف اور کسی دوسری چیز کی طرف میلان کا مطلب کسی ناجائز خواہش کی پیروی ہوگی جس کا نتیجہ گمراہی اور ایمان کے ضایع ہونے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ إِنِّي نُهِيْتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُلْ لَّآ أَتَّبِعُ أَهْوَآءَ كُمْ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ (الانعام ۶: ۵۶) اے نبیؐ! ان سے کہو کہ ”تم لوگ اللہ کے سوا جن

دوسروں کو پکارتے ہو اُن کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔'' کہو: ''میں تمھاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہوگیا، راہِ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔''

اسلام کی حقانیت پر یہ گہرا ایمان علمِ یقینی اور دلیل راسخ پر قائم ہے، جس میں کوئی شک نہیں ہے اگر چہ اہل باطل اور گمراہ لوگوں نے اس کو جھٹلایا ہے، مگر یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہونے والے حق کو دیکھ نہیں پاتے۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ حق کے اندر کوئی پوشیدگی ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی ہیں اور ان کے دل مردہ ہیں۔ چنانچہ ایک مسلمان داعی ان کے باطل کی طرف جھکنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسی لیے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اسے اپنی دعوت کے بارے میں کوئی شک لاحق ہو جائے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک بینا شخص اپنے آپ کو اندھوں کے درمیان پاتا ہے تو اس کو اپنی بینائی میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ إِنِّي عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖٓ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ (الانعام ۶:۵۷) کہو: ''میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو، فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امرِ حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

یہ دلیل جس پر مسلمان داعی نے اپنے ایمان کو قائم کیا ہے، خود اسلام ہی سے مستفاد ہے، نہ کہ کسی خارجی چیز سے۔ چنانچہ اس کا گہرا ایمان اس کے دل کی دھڑکن بن جاتا ہے اور اس کے جسم میں خون کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ ممکن نہیں ہوتا کہ یہ ایمان کسی خارجی سبب سے متاثر ہو جائے، یا اس کی وجہ سے زائل ہو جائے۔ خواہ یہ سبب کسی بھی نوعیت و حیثیت کا ہو۔ چنانچہ مسلمان ان لوگوں میں سے نہیں ہوتا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهٗ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهٖ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (الحج ۲۲:۱۱) اور لوگوں میں

کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے، اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو اُلٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔

یہ حالت تو ایک منافق یا ضعیف الایمان شخص ہی کی ہوسکتی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں: یہ حالت ایک منافق کی ہوتی ہے، جس کو اگر دنیا کا فائدہ حاصل ہو جائے تو وہ عبادت کو جاری رکھتا ہے اور اگر دنیوی نقصان ہو تو یہ اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ چنانچہ یہ وہی عبادت کرتا ہے جس میں اس کا دنیوی فائدہ ہو۔ اگر اس پر کوئی مصیبت، سختی تنگی یا آزمائش آئے تو وہ دین کو چھوڑ کر کافر ہو جاتا ہے۔[1]

چنانچہ داعی کا ایمان مضبوط ہوتا ہے، اس میں کوئی لغزش نہیں آتی، خواہ اس کے راستے میں کتنی مشقت اور سختی آئے، اور خواہ داعی مادی اور جسمانی طور پر کتنے ہی کمزور اور تعداد میں کتنے ہی کم ہوں۔ اور خواہ ان کے مقابلے میں کافروں کی حالت کتنی ہی اچھی ہو۔ یہاں تک کہ داعی زمین میں اکیلا رہ جاتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان ایسا ہی تھا۔ وہ ہر حال میں اسی موقف پر قائم رہے، خواہ مکی دور ہو، جہاں کفار نے ان کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور انھیں ہر قسم کی ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں، یا ہجرت حبشہ کا موقع ہو، جب وہ اپنے ایمان کو بچا لے گئے، یا پھر ہجرت مدینہ کا موقع ہو جب انھوں نے مدینے کا رُخ کیا۔ غزوہ بدر کی فتح ہو، غزوہ احد کی شکست یا غزوہ خندق میں ان کا محاصرہ ہو۔ ان سارے حالات میں ان کے ایمان کو ذرہ برابر لغزش نہیں آئی۔ ان کے دل میں اس بات پر کوئی شک پیدا نہیں ہوا کہ وہ حق پر ہیں، حق تک پہنچنے میں کامیابی پا چکے ہیں اور حق کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ جب کہ ان کے دشمن کافر صاف گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (الرعد۱۳:۱۴) اسی کو پکارنا برحق ہے، رہیں وہ دوسری ہستیاں جنھیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انھیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا، حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۲۰۹

کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف۔

داعی کے ایمان کو یہ بات کمزور نہیں کر سکتی کہ لوگ اس کی طرف سے منہ موڑ رہے ہیں اور اس کی بات کو نہیں مانتے۔ نوح علیہ السلام نے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے، اپنی قوم میں ۹۵۰ سال کا عرصہ گزارا، مگر آپؑ پر ایمان لانے والے چند ہی افراد تھے۔ اسی طرح اگر داعی نے پوری کوشش دعوت کی راہ میں صرف کی ہے، تو لوگوں کا داعی کی طرف سے منہ موڑنا اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ وہ اپنی دعوت میں کوتاہی کر رہا ہے۔ اس لیے کہ کوتاہی کا اندازہ اس بات سے نہیں ہوتا کہ اس کے مخاطبین نے اس کی بات نہیں مانی، بلکہ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اس نے دعوت کو جو کچھ پیش کیا ہے وہ تھوڑا ہے یا زیادہ۔

مسلمان داعی کو گہرے ایمان کی ضرورت

۵۳۷- اس طرح کا گہرا ایمان ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے مگر موجودہ دور میں مسلمان داعی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ وہ دور ہے جس میں اسلام کی آواز کمزور اور کفر کی آواز بلند ہے۔ اور لوگوں کے دلوں میں ایمان کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کی مشکلات زیادہ ہیں اور ان پر کفار کی یلغار ہے۔ کفار کی بڑی بڑی مملکتیں ہیں جو اُن کی حمایت کرتی ہیں اور باطل کی پشت پناہی کرتی ہیں۔ وہ اسلام کی حقانیت کے بارے میں شکوک وشبہات کو ابھارتی ہیں۔

مسلمانوں کی ان مشکلات میں اس بات نے اور بھی اضافہ کیا ہے کہ کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں جو اسلام کے دعوے دار اور علمائے سوء ہیں، وہ اپنے دین کو دنیا کے بدلے بیچ دیتے ہیں۔ وہ اپنی زبان سے بظاہر اسلام کا کلمہ پڑھتے ہیں مگر اس کے پیچھے کفر اور گمراہی چھپی ہوتی ہے۔

اس کے باوجود ایک سچے مسلمان اور خاص طور پر ایک داعی کو چاہیے کہ یہ مشکلات اور یہ حالات اس کو خوف زدہ نہ کریں۔ بلکہ یہ اس کے لیے اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلام کو درپیش مسائل کے حل کے لیے مزید محنت کا ذریعہ بن جائیں۔ داعی ایسا نہ ہو کہ کفر کی حالت دیکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ اس لیے کہ کافر جو کچھ بھی ہیں بہر حال گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کو اس بات کی ضرورت ہے کہ انھیں سیدھے راستے پر لایا جائے، ان کو مہذب بنایا جائے اور ان کی تعلیم وتربیت کی جائے، نہ کہ ان کو

اپنے سے بڑا اور اچھی حالت میں سمجھا جائے۔

ایک داعی کو اپنے ذہن میں وہ بات مستحضر رکھنی چاہیے جو بخاری ومسلم نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہم سے حدیث دجال بیان فرمائی۔ اس حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

يَأْتِي الدَّجَّالُ وَهُوَ مُحرَّمٌ عَلَيهِ أَنْ يَّدْخلَ نِقَابَ الْمَدِيْنَةِ فَينْزِلُ بَعْضَ السَّبَاخِ الَّتِي تَلِي الْمدِيْنَة، فيخرُجُ إِلَيهِ يَوْمَئِذٍ رَجلٌ وَّهُوَ خيرُالنَّاسِ، فَيَقُوْلُ: أَشْهَدُ أَنَّكَ الدَّجَّالُ الَّذِي حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ حَدِيثَهُ. فَيَقُوْلُ الدَّجَّالُ: أَرَأَيْتُمْ إِنْ قَتَلْتُ هٰذَا ثُمَّ أَحْيَيْتُهُ، هَلْ تَشُكُّوْنَ فِي الْأَمْرِ؟ فَيَقُوْلُوْنَ لَا. فَيَقْتُلُهُ ثُمَّ يُحْيِيهِ، فَيَقُوْلُ: وَاللهِ مَا كُنْتُ فِيكَ أَشَدَّ بَصِيرَةً مِنِّي الآنَ. قَالَ: فَيُرِيْدُ الدَّجَّالُ أَنْ يَّقْتُلَهُ، فَلَا يُسَلِّطُ عَلَيْهِ. (بخاري، ج۹،ص۱۰۹،مسلم، ج۱۶،ص۷۱-۷۲) دجال آئے گا مگر اس کے لیے مدینے کے نقاب[1] میں داخل ہونا حرام ہوگا۔ چنانچہ وہ مدینہ کے قریب کسی سبخ[2] میں پڑاؤ ڈالے گا۔ اس وقت ایک آدمی اس کے پاس جائے گا، جو بہترین شخص ہوگا۔ وہ دجال سے کہے گا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جس کی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیان فرمائی ہے''۔ دجال لوگوں سے کہے گا: ''کیوں بھائی، اگر میں اس کو قتل کرکے دوبارہ زندہ کروں تو پھر بھی میرے معاملے میں شک کروگے؟'' لوگ کہیں گے: ''نہیں تو!!''۔ وہ اس آدمی کو قتل کرکے دوبارہ زندہ کرے گا۔ وہ آدمی کہے گا: ''تیرے حوالے سے پہلے میری بصیرت اتنی نہیں تھی جتنی اب ہے''۔ آپؐ نے فرمایا کہ دجال چاہے گا کہ اسے دوبارہ قتل کردے مگر [اللہ پہلے کی طرح] اسے اس آدمی پر مسلط نہ کرے گا۔

اس حدیث میں بہت بڑے بڑے فوائد ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ دجال الوہیت اور ربوبیت کا دعویٰ کرے گا اور اپنی دعوت کے ذریعے لوگوں کو فتنے میں ڈالے گا۔ اس لیے کہ اسے بعض امور ایسے عطا کیے جائیں گے جو عموماً عادت کے خلاف ہوتے ہیں۔ ان امور میں سے ایک بات یہ ہوگی کہ وہ ایک شخص کو قتل کرکے دوبارہ زندہ کرے گا۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے، وہ زمین کو حکم دے گا کہ پودے اُگائے تو وہ

۱- نقاب جمع ہے، نقب کی، جس کے معنی ہیں دو پہاڑوں کے درمیان راستہ۔ یہاں اس سے مراد مدینے کے گلی کوچے ہیں۔ (مؤلف)
۲- سبخ سے مراد کھاری زمین ہے جس میں کوئی چیز نہیں اُگتی۔ (مؤلف)

اُگا دے گی، وہ بارش کو حکم دے گا کہ برسے تو وہ برسے گی۔ لوگوں کی کثیر تعداد اس کی پیروی کرے گی، خصوصاً جاہل لوگ جن کے دل ایمان اور اس کے نور سے خالی ہوتے ہیں۔ مگر وہ مسلمان جو دجال کے پاس جائے گا اسے اس بات میں قطعاً کوئی شک نہیں ہوگا کہ یہی وہ جھوٹا دجال ہے۔ اس مسلمان پر اس کے خلاف عادت افعال کوئی اثر نہیں کریں گے۔ نہ اس کے پیروکاروں کی کثرت اسے متأثر کر سکے گی۔

اسی طرح اس مسلمان کا اپنے اسلام پر فخر کرنا بھی اس سے متأثر نہیں ہوگا، اس لیے کہ اُس جھوٹے دجال کی دعوت بالکل باطل اور اسلامی تعلیمات کے برعکس ہوگی۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ باطل کسی بیرونی سبب کی بنا پر حق میں بدل جائے، خواہ وہ مختلف خلاف عادت امور ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح یہ بھی کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اسلام جو یقینی طور پر حق ہے، اس بنا پر باطل ہو جائے کہ اس کا ماننے والا ایک ہی شخص ہے۔ یہی وجہ کہ دجال جب اس مسلمان کو قتل کرے گا تو مسلمان کا اس بات پر یقین اور بڑھ جائے گا کہ وہی حق پر ہے اور دجال کذاب باطل پر ہے۔ رہے اس کے خلاف عادت افعال، تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تصدیق ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ مسلمان اپنے ایمان پر برقرار رہے گا، اگر چہ وہ اکیلا ہوگا، نہ اس کے پاس کوئی قوت ہوگی اور نہ وہ اپنے لیے کوئی مددگار ہی پائے گا۔

اس ایمان کے لوازم وثمرات

۵۳۸- اس گہرے ایمان کے کچھ لوازم اور ثمرات ہیں جو لازمی طور پر ظاہر ہونے والے ہیں اور ان کا موجود ہوئے بغیر رہنا محال ہے۔ اگر یہ ثمرات ظاہر نہ ہوں، یا کمزور ہوں تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہوگی کہ اس قسم کا ایمان موجود ہی نہیں ہے، یا یہ کہ اس ایمان میں ابھی کمزوری پائی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوازم اور ثمرات کیا ہیں؟

اصل بات تو یہ ہے کہ یہ لوازم بہت زیادہ ہیں اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مومنین کی صفات کے حوالے سے مذکور ہیں۔ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ ان آیات واحادیث کو پڑھے اور ان میں مذکور ہر صفت پر غور کرے، اس کے معانی کے بارے میں سوچ بچار کرے، ان صفات کے مدلولات کو معلوم کرے اور پھر اپنی طرف متوجہ ہو کر ان صفات کو اپنے اندر ٹٹولے۔ پھر اندازہ لگائے کہ اس کے اپنے

اندر ان صفات کے معانی میں سے کتنی مقدار پائی جاتی ہے۔ اگر وہ ان صفات کو اپنے اندر پائے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اگر ان کو نہ پائے یا کمزور حالت میں پائے تو اپنے ایمان کی کمی کو دور کرے، اس پر نظر ثانی کرے، اسے مضبوط کرے، اس میں گہرائی پیدا کرے، اس کی نگرانی کرے اور اس کو خصوصی روحانی غذا فراہم کرے۔ یہ چیز اس کے اندر اچھے پھل پیدا کرے گی اور اس کا نفس گہرے ایمان والے لوگوں کے رنگ میں رنگ جائے گا۔

یہاں ہم اس گہرے ایمان کے چند ضروری ثمرات اور بعض اہم لوازم کی طرف اشارہ کریں گے اور باقی لوازم وثمرات کو کسی ایسے موقع پر چھوڑیں گے جس میں ہمارے لیے اللہ تعالیٰ انھیں پیش کرنا آسان فرمائے۔

۱- محبت

۵۳۹- بندے کی اپنے رب سے اور رب کی اپنے بندے سے محبت ایمان کے ان ثمرات میں سے ہے جن کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے: يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ (المائدۃ ۵:۵۴) اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

یہ قطعی طور پر گہرے ایمان کے ثمرات میں سے ہے، بلکہ یہ ایمان کی روح اور اس کا خلاصہ ہے۔ اس کی بنیاد جیسا کہ ہم نے پہلے کہا، رب تعالیٰ کی یقینی معرفت پر قائم ہے۔ حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے: ''جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اس کے ساتھ محبت کرے گا۔ جب معرفت میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایمان کی گہرائی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور بندے کی اپنے رب سے محبت بھی بڑھتی ہے''۔

معرفت میں اضافہ اس طرح ہوگا کہ آدمی اپنے رب کی صفات، اس کی عظمت اور اس کی نعمتوں کے بارے میں غور وفکر کرے، جن میں سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے داعی کو اپنے اوپر ایمان لانے کی توفیق دی ہے: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ (الاعراف ۷:۴۳) اور وہ کہیں گے کہ تعریف خدا ہی کے لیے ہے، جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا، ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے، اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا۔

ایک مسلمان کی اپنے رب سے جو محبت ہوتی ہے اس کی حدود وہاں تک ہوتی ہیں جہاں تک محبوب کی محبت ہو۔ اسی لیے ایک مسلمان اللہ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی محبت کرتا ہے۔ اس لیے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے محبوب، لوگوں کے لیے اس کے رسول اور ان تک اس کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ اسی طرح مسلمان قرآن کریم اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ بھی محبت رکھتا ہے، اس لیے کہ وہ اللہ کا پیغام ہے۔ وہ مومنوں سے بھی محبت کرتا ہے، اس لیے کہ وہ اللہ کے مطیع فرماں بندے ہیں، جو اپنے آقا و مولا کی عبادت کرتے ہیں۔

ایک مسلمان کی اللہ سے اور اس سے تعلق رکھنے والی اشیا سے محبت انسان کے نفس پر بڑا خوشگوار اثر چھوڑتی ہے۔ وہ اس کی حلاوت اور مٹھاس کو محسوس کر سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثَلَاثَةٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ، أَنْ يَّكُونَ اللهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يَّكْرَهَ أَنْ يَّرْجِعَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَهُ اللهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُّقْذَفَ فِي النَّارِ، وَأَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءَ لَايُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ. تین باتیں ہیں، وہ جس میں پیدا ہوئیں، اس نے ایمان کا مزا چکھ لیا۔ ایک یہ کہ ہر چیز کے مقابلے میں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ زیادہ محبت کرے۔ دوسری یہ کہ جب ایک مرتبہ اللہ نے اسے کفر سے نجات عطا فرمائی ہے تو اب اس کی طرف لوٹنا اس قدر ناپسند کرے، جیسے اسے آگ میں ڈالا جائے۔ تیسری یہ کہ اگر کسی سے محبت کرے تو خالص اللہ کی رضا کی خاطر کرے۔

چنانچہ بندے کی اپنے ربّ کے ساتھ محبت اور یہ امور قطعی طور پر لازم و ملزوم ہیں۔ ممکن نہیں کہ اللہ سے محبت کرنے والا کوئی شخص ان سے پیچھے رہے۔

مفید معلوم ہوتا ہے کہ اس گفتگو کو تھوڑا سا لمبا کیا جائے اور ایک مسلمان کی اپنے رب کے ساتھ محبت کے جو لوازم ہیں ان کی مزید وضاحت کے لیے انھیں چند فقروں کی صورت میں بیان کیا جائے۔ کیوں کہ ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ میں کہتا ہوں:

رب سے محبت کے لوازم

۵۴۰۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللهُ

بِقَوۡمٍ یُّحِبُّهُمۡ وَیُحِبُّوۡنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ یُجَاهِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَآئِمٍ (المائدۃ۵:۵۴) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰهُ (آل عمران۳:۳۱) اے نبیؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

چنانچہ ان دو آیتوں کی روشنی میں ایک مسلمان کے اپنے رب سے محبت کے لوازم درج ذیل ہیں:

۱-مسلمانوں کے لیے نرم:- مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لیے نرم دل اور شفیق و رحیم ہوتا ہے، اور داعی اپنے مسلمان بھائی کو اس چیز کی طرف بلاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل میں اس رحمت و شفقت کو محسوس کرتا ہے، جو ذلت کی حد تک پہنچی ہوئی ہے مگر یہ ذلت شریعت میں حرام نہیں ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو ہم بعد میں کریں گے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ **رحماء بینهم** ہوتے ہیں۔

۲-کافروں پر سخت:- اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ (الفتح ۴۸:۲۹) محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت ہیں۔

چنانچہ مسلمان کافروں کے سامنے جھکتا ہے، نہ ان سے دبتا ہے، نہ ان کے سامنے اپنے آپ کو چھوٹا محسوس کرتا ہے نہ ان کی غیر موجودگی میں۔ اس کی ظاہری حالت بھی یہی ہوتی ہے اور دل میں بھی یہی جذبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان جس قدر کہ مومنوں پر نرم ہوتا ہے اسی قدر کافروں پر سخت ہوتا ہے۔

۳-جہاد فی سبیل اللہ:- اللہ کی راہ میں جہاد کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے خلاف دائمی جہاد میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کا نفس درست ہو جائے۔ وہ مسلسل اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اور دشمن کے

خلاف برسر جنگ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا دشمن پیچھے ہٹ جائے اور اس کی شرارتیں ختم ہو جائیں۔ اسی طرح وہ دعوت الی اللہ کے جہاد میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ تبلیغ و تبیین کا فریضہ ادا ہو جائے اور لوگوں کے لیے ہدایت کے راستے آسان ہو جائیں۔

یہ جہاد جو مسلمان داعی اللہ کی طرف دعوت دیتے ہوئے کرتا ہے، یہ تب ظاہر اور ممیز ہوتا ہے جب داعی امورِ دعوت میں مسلسل مشغول رہتا ہے، اسی کے لیے سوچتا ہے، اس کے وسیلے کے طور پر رائے عامہ کو ہموار کرتا ہے اور اس کی کامیابی کے لیے فکر مند رہتا ہے۔ وہ دعوت کے کام کو آل واولاد، مال وجان، آرام وراحت اور دنیا کے سارے فوائد پر ترجیح دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُلْ إِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالُنِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ** (التوبۃ ۹:۲۴) اے نبیؐ! کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، اور تمھارے بیٹے، اور تمھارے بھائی، اور تمھاری بیویاں، اور تمھارے عزیز واقارب، اور تمھارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمھارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے، اور تمھارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمھارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

۴- خوف نہ کھانا:- یعنی وہ دعوت الی اللہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو کام کر رہے ہیں اس سے انھیں نہ کوئی روکنے والا روک سکتا ہے اور نہ کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے والا کوئی رکاوٹ کھڑی کر سکتا ہے۔ نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت انھیں اس کام سے برگشتہ کر سکتی ہے اور نہ جفا کرنے والوں کی جفا کشی۔[1]

۵- رسولؐ کی پیروی:- داعی اپنے تمام معاملات میں اور ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کا حکم دیا ہے اس کی پیروی کرتا ہے اور جن سے روکا ہے ان سے دور رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ**

۱- تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۷۰

فَانْتَهُوْا (الحشر ۵۹:۷) جو کچھ رسول تمھیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔

اللہ کے رسول داعی الی اللہ کا اصل اُسوہ ہوتے ہیں۔ وہ دعوت الی اللہ کے معاملے میں قدم قدم پر اس کی سیرت کی پیروی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱) درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا۔

داعی کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش چیز یہ ہے کہ وہ دعوت کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور بعثت سے لے کر جوارِ رحمت میں جانے تک آپؐ کی سیرت کو اچھی طرح سمجھے۔ داعی کے لیے اس نفع کی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دعوت الی اللہ کے اس ربانی منہج کی عملی ترجمانی ہے جو قرآن کریم کی آیات میں بیان ہوا ہے۔ داعی الی اللہ پر جو بھی حالت آتی ہے اس کے لیے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کوئی مثال، کوئی مشابہت یا کوئی قریبی مناسبت رکھنے والا واقعہ ضرور پائے گا اور اس سے داعی کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کے سردارؐ نے اس کے حوالے سے کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔

سیرت نبویؐ کی اس گہری سمجھ کے ساتھ اگر قرآن میں دعوت سے متعلق احکام پر تدبر بھی کیا جائے تو اس سے داعی اپنے رب کی طرف سے ایک نور پائے گا اور اس کو ایک ایسی کسوٹی ہاتھ آئے گی جس سے وہ مشتبہ اور دقیق اُمور میں حق کو معلوم کر سکے گا۔

رسول کی پیروی کرنے میں جو چیز مددگار ثابت ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ داعی کے ذہن میں رسولؐ کی شخصیت ہر وقت مستحضر رہے اور تصوراتی و روحانی طور پر اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ سمجھے۔ وہ آپؐ کی زندگی کے مختلف مراحل کا تخیل کرے اور آپؐ کی صفات کریمہ کا ذہن میں استحضار کرے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ اپنے ساتھیوں پر بڑے شفیق تھے۔ یہ اور اس طرح کے امور ایک مسلمان کے دل میں اپنے رسول سے محبت میں اضافے کا سبب بنیں گے۔

پھر جوں جوں مسلمان کے دل میں رسولؐ کے لیے محبت میں اضافہ ہوگا یوں یوں آپؐ کے ساتھ اس

کے تعلق میں اضافہ ہوتا جائے گا اور آپؐ کی پیروی کا جذبہ پروان چڑھے گا۔

چند دیگر لوازم

۵۴۱-قرآن وسنت اور محبت کے فطری جذبے سے ایک مسلمان کے اپنے رب سے محبت کے جو لوازم سامنے آتے ہیں اس میں چند امور اور بھی ہیں:

۱- ذکر الٰہی:- پہلی بات یہ ہے کہ داعی ہر حال میں اللہ کے ذکر کو حرزِ جان بنائے۔ داعی کی زبان ہر وقت ذکر سے تر رہے اور اس کا دل کبھی ذکر الٰہی سے خالی نہ ہو۔ اس لیے کہ جو جس چیز سے محبت کرتا ہے لازمی طور پر اس کا ذکر بھی کثرت کے ساتھ کرے گا اور اس سے متعلقہ امور کا ذکر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے سچے عاشقوں کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کی کتاب کی کثرت سے تلاوت کرتے ہیں۔ یہ ان کے دلوں کی بہار، ان کا تنہائی کا ساتھی اور ان کے راستے کی روشنی ہے۔

یہی معاملہ اللہ کے ذکر کا بھی ہے کہ اللہ کا عاشق ہر وقت اور ہر مناسبت سے اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے داعی کے لیے یہ بات پسندیدہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذکر کے ان وظائف کا عادی بنائے جو احادیث میں وارد ہیں۔ وہ نمازِ فجر کے بعد، سونے سے پہلے، گھر سے نکلنے اور گھر میں جانے کے وقت، کھانے پینے کے وقت، کپڑے پہننے کے وقت، سفر وحضر میں اور سحری کے اوقات میں ان وظائف کو پڑھے۔

۲-مناجات:- خلوت میں مناجات الٰہی سے انس حاصل کرے اور تنہائی سے وحشت میں مبتلا نہ ہو۔ خلوت سے دل گرفتہ نہ ہو بلکہ اسے مناجات الٰہی کے لیے غنیمت سمجھے۔

۳-اطاعت میں لذت:- داعی کو چاہیے کہ اللہ کی مرضی کے کاموں میں لذت محسوس کرے اور ان کو اپنے لیے بوجھ نہ سمجھے۔ ایک عاشق اپنے محبوب کی خدمت میں لذت محسوس کرتا ہے اور اس کے لیے پھرتی دکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک اور آپؐ کے نفس کریمہ کے لیے دنیا کے بکھیڑوں سے راحت کا سامان تھی۔ جنید بغدادیؒ کہتے ہیں: عاشق کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت میں ہمیشہ پھرتی دکھائے گا۔

۴-خوشی اور غم کا معیار:- اللہ کے سوا داعی کی کوئی بھی چیز کھو جائے تو وہ اس پر افسوس نہیں کرتا اور ہر اس

لمحے کا اسے افسوس ہوگا جو اللہ کے ذکر اور اللہ کی اطاعت سے خالی گزر چکا ہے۔

۵- اپنی پسند کی قربانی:- جس چیز کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے، داعیِ حق اُسے اُن چیزوں پر ترجیح دے گا جو اِسے پسند ہیں، خواہ ظاہری طور پر ہوں یا باطنی طور پر۔ اس لیے کہ جو سچا عاشق ہوتا ہے وہ ہمیشہ اسی چیز کو ترجیح دیتا ہے جو اس کے محبوب کو پسند ہوتی ہے اور وہ اس ایثار میں کسی مشقت اور تکلیف کو خاطر میں نہیں لاتا۔

۶- ملاقاتِ محبوب کا شوق:- اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کا شوق ہو۔ اس لیے کہ عاشق کو محبوب کی ملاقات بھی محبوب ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک داعی کو جب موت آ جائے تو وہ اس سے نہیں ڈرتا۔

۷- اللہ کے لیے غیرت:- اللہ کے لیے غیرت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کہیں اللہ تعالیٰ کے محارم کو توڑا جا رہا ہے تو داعی کو غصہ آ جائے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حالت تھی۔ آپؐ اپنے لیے کسی پر غصے نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے رب کی خاطر غصہ کرتے تھے۔

اس غیرت میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ داعی جب دیکھتا ہے کہ خود مسلمان بھی اللہ کی شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو وہ غم زدہ ہو جائے۔ روایت ہے کہ ایک صحابی، میرے خیال میں حضرت ابودرداء اپنے گھر میں گئے اور رونا شروع کیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ یہاں اس طریقے سے نماز کی اقامت نہیں ہو رہی جس طرح میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں دیکھی تھی۔

۲- خوف

۵۴۲- ایمانِ عمیق کے ثمرات اور اس کے لوازم میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ اس لیے کہ اللہ کا خوف حکمتوں کی اصل جڑ ہے۔ جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ اس سے خوف کرے گا اور جس نے اللہ سے خوف کیا وہ لوگوں میں سے کسی سے خوف زدہ نہ ہوگا، البتہ لوگ اس سے خوف زدہ ہوں گے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ خوف دراصل اس بات سے عبارت ہے کہ انسان کا دل مستقبل میں پیش آنے والے کسی درد سے دردمند ہو۔ اس خوف کا سبب یہ ہوتا ہے کہ انسان کو آنے والے زمانے میں کسی

دردمند کرنے والی چیز کے موجود ہونے کا علم ہوجاتا ہے۔ اللہ کا خوف دراصل ایک مسلمان کے ایسی چیز کے بارے میں علم کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سبب بنتا ہے اور وہ چیز اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے حقوق کا بجانہ لانا ہے۔

پھر جس قدر ایک مسلمان کو اللہ کے مقابلے میں اپنے جرم کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے اسی قدر اس کا خوف بڑھتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اگر سارے جہانوں کو ہلاک کرنا چاہے تو اسے اس کام سے روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ بندے کے دل میں خوف کے پہلو کو تقویت دینے والی سب سے بڑی چیز قرآن کریم کی ان آیات پر غور کرنا ہے جن میں مجرمین کے بارے میں وعید آئی ہے۔ یہ آیات بالکل سچی اور صحیح ہیں۔ ان میں کوئی مبالغہ اور تخیل نہیں ہے۔ بندوں کو اپنے نیک و بد اعمال کے ذرے ذرے کا بدلہ ملے گا۔ جب ایک شخص کو گناہوں کے اثرات اور حساب و کتاب میں دقت نظر کے بارے میں یہ ایمانِ عمیق حاصل ہوتا ہے اور اسے علم ہوجاتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی حساب و کتاب کرے گا، اور ابھی سے یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا، تو دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت کا جذبہ انگڑائیاں لیتا ہے اور بندۂ مسلم ان چیزوں سے دور ہوجاتا ہے جو ناپسندیدہ اور دردناک انجام سے دوچار کرنے والی ہوتی ہیں۔ پھر زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ یہ خشیت اور خوف کی یہ جھلس دل سے اعضا کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ مومن جب بھی نظر آتا ہے وہ خوف زدہ ہی ہوتا ہے جیسے اس کو کوئی سخت مصیبت نے گھیر رکھا ہو۔ وہ نہ کسی سے مزاح کرتا ہے، نہ ہنسی مذاق کرتا ہے اور نہ مسکراتا ہے۔ اس لیے کہ جو شخص غم زدہ، پریشان اور مصیبتوں میں گھرا ہوا ہو اس کے پاس ہنسی مذاق کا موقع نہیں ہوتا۔ اگر موقع مل جائے تب بھی وہ ہنسی مذاق کر ہی نہیں سکتا۔

خوف کے اثرات بالکل قطعی ہوتے ہیں۔ آدمی جس چیز سے ڈرتا ہے اس سے دور بھاگتا ہے۔ وہ اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ دھاڑنے والے شیر اور بھڑکتی ہوئی آگ سے دور بھاگتے ہیں۔ گناہ اور برائیاں بھی ایسے سانپ اور بچھو ہیں جو موذی اور مہلک ہیں۔ جو شخص اللہ سے خوف رکھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سے بھاگے اور اللہ کی فرمان برداری کرتے ہوئے ان پر غالب آئے۔

ایک مسلمان داعی جب اللہ تعالیٰ کا خوف محسوس کرتا ہے تو وہ مضطرب ہوکر اس کے احکام کی خلاف ورزی سے ہاتھ روک لیتا ہے۔ وہ ان امور کا رخ کرلیتا ہے جو قیامت کے دن اسے دردناک اور تکلیف دہ عذاب سے بچانے والے ہوتے ہیں۔ ان چیزوں میں سرفہرست اللہ سے تقویٰ اور اس کی خشیت ہے۔ تقویٰ کی

بنیادی اینٹ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور دعوت الی اللہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ پھر جب اللہ سے خشیت اختیار کرتا ہے تو اس کو مزید ہدایت نصیب ہوتی ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ (الاعراف ۷:۱۵۴) [حضرت موسیٰ کی تختیوں میں] ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

چنانچہ ہدایت اور رحمت اس کو ملتی ہے جو اللہ کا خوف رکھتا ہو، نہ کہ وہ جو اپنے آپ کو اللہ سے محفوظ سمجھتا ہو۔

۳- رَجا (اُمید)

۵۴۳- گہرے ایمان کے ثمرات میں سے ایک چیز 'رَجا' اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے مومن بندوں سے ان چیزوں کا وعدہ ہے جن کا ذکر اس نے اپنی کتاب حمید میں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مایوس ہونے سے منع فرمایا ہے۔ اس ایمانِ عمیق کے حامل کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مہربان اور ہر چیز پر قادر پروردگار کے ان وعدوں پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ امید ورَجا، مومن کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ اس کے اسباب پیدا کیے جائیں اور اس کے اسباب اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری ہی ہے، جن میں سے ایک دعوت الی اللہ ہے۔ رجا کی حقیقت یہ ہے کہ دل ان چیزوں کے انتظار میں خوش ہوتا رہے جو نفس کو محبوب ہیں، کیوں کہ ان کے حصول کے بہت سے اسباب وقوع پذیر ہو چکے ہوتے ہیں۔ اگر اس کا انتظار اس حالت میں ہو کہ ابھی بعض اسباب میسر نہیں آئے تو [ان اسباب کو فراہم کیے بغیر] ان کا انتظار ایک حماقت اور دھوکہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کی تائید اور اس کی رضامندی کی امید اسی طرح ہوتی ہے کہ اس کے اسباب فراہم کیے جائیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے اور انھی کی بنیاد پر رحمت، تائید اور مدد ورضامندی کی نوید سنائی ہے۔ چنانچہ گہرے ایمان کا حامل مسلمان ان اسباب کے حصول کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے لیے جتنا کرسکتا ہے، کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ نہ تو معاملے کو ٹالتا رہتا ہے اور نہ یہ کہہ کر اس میں تاخیر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ان اسباب کی درستی، ان کے حصول کے لیے تسلسل اور ان کی قبولیت کی توفیق دے گا۔

رحمت خداوندی کی امید کے حوالے سے ایک مسلمان کی مثال اس شخص کی سی ہوتی ہے جو ایک اچھی زرخیز زمین میں بیج بوتا ہے، اسے پانی اور کھاد ڈالتا ہے، اور کاٹنے تک اس کی نگرانی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھتا ہے کہ وہ اس فصل کی حفاظت کرے گا اور اسے آفتوں سے بچائے گا۔

ایک مسلمان داعی ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے پُرامید ہوتا ہے۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داعیوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ان کی مدد اور تائید کی جائے گی اور انھیں اَجر جزیل بھی عنایت کیا جائے گا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور تائید کے ساتھ ساتھ اَجر بھی ملتا ہے۔

۳

مضبوط رابطہ

رابطے کا مفہوم اور اثرات

۵۴۴- مضبوط رابطے سے ہماری مراد یہ ہے کہ مسلمان داعی کا اپنے رب سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ وہ سارے معاملات میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تخلیق و تدبیر، نفع و نقصان اور منع و عطا میں اکیلا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے اور وہ جو نہیں چاہتا، نہیں ہوتا۔ جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے اور اپنے امور اس کے سپرد کرتا ہے اس کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ (الطلاق ۶۵:۳) جو اللہ پر بھروسا کرے اس کے لیے وہی کافی ہے۔

خصوصاً اس شخص کے لیے جو دعوت الی اللہ کے معاملے میں، اعلائے کلمۃ اللہ اور اس کے دشمنوں کے

مقابلے میں فتح ونصرت کے لیے اس پر توکل کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے نقل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قَالَا رَبَّنَآ إِنَّنَا نَخَافُ أَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ أَوْ أَنْ يَّطْغٰى. قَالَ لَا تَخَافَآ إِنَّنِي مَعَكُمَآ أَسْمَعُ وَأَرٰى (طٰہٰ ۲۰: ۴۵-۴۶) دونوں نے عرض کیا: پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا۔ فرمایا: ڈرو مت، میں تمھارے ساتھ ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

یہ 'ساتھ' تائید ونصرت کا 'ساتھ' ہے اور یہ انبیا اور رسولوں تک محدود نہیں ہے، جنھوں نے اللہ کے پیغامات کی تبلیغ میں اللہ پر توکل کیا ہوا تھا، بلکہ یہ تائید ونصرت اس کے تمام متقی بندوں کے لیے عام ہے، اور خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو اس کے دین کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (النحل ۱۶: ۱۲۸) اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔

۵۴۵- ایک مسلمان داعی کا اللہ پر توکل اور اس کے ساتھ تعلق ایسا ہونا چاہیے جیسا کہ ایک بچے کا اپنی ماں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی اور کو جانتا ہے اور نہ کسی دوسرے سے تعلق رکھتا ہے، نہ اس کے علاوہ کسی کے ہاں پناہ لیتا ہے اور نہ اس کے علاوہ کسی پر بھروسا کرتا ہے اور جب کوئی بات اسے پریشان کرتی ہے تو وہ اسی کو پکارتا ہے۔ مگر اس حالت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اسباب کو اختیار نہیں کرے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسباب پر بھروسا نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ بھروسا مسبب الاسباب پر ہوتا ہے جو قوی اور عزیز ہے۔

۵۴۶- اگر مسلمان داعی ان اشیا کو مستحضر رکھے گا جن پر اس نے ایمان لایا ہے تو اس کا اپنے رب تعالیٰ پر بھروسا بڑھتا جائے گا۔ جن چیزوں پر وہ ایمان رکھتا ہے وہ یہ ہیں کہ مخلوق اپنے لیے یا کسی اور کے لیے نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتی، اور بلا استثنا سارے امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں جو قوی وعزیز ہے۔ اگر داعی اپنے دل میں ان امور کو مستحضر رکھے گا تو یقینی ہے کہ وہ کسی بھی مخلوق پر بھروسا کرنے سے مستغنی ہوگا اور وہ مکمل طور پر اپنے خالق، مالک اور ناصر کی طرف متوجہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

بَلِ اللّٰهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ (آل عمران ۳: ۱۵۰) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمھارا حامی اور مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البقرۃ ۲:۲۵۷) جو لوگ ایمان لاتے ہیں اللہ ان کا حامی و مددگار ہے۔

تمام امور میں اللہ پر بھروسا کرنے کے ساتھ ساتھ داعی، اللہ تعالیٰ سے یہ بھی پختہ اُمید رکھتا ہے کہ وہی اس کی حفاظت اور مدد کرے گا اور اسے ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (الحج ۲۲:۳۸) یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ. إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ. وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ. (الصافات ۳۷:۱۷۱-۱۷۳) اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔

۵۴۷- مگر ایک مسلمان داعی کے لیے جائز نہیں ہے کہ اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کی نصرت واعانت کے نزول کے لیے ایک وقت، ایک نوع، یا ایک کیفیت اپنی طرف سے مقرر کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْأَشْهَادُ (المؤمن ۴۰:۵۱) یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں، اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

مدد سے مراد ان لوگوں کے مقابلے میں فتح ہے جنھوں نے ان کو اذیت پہنچائی ہے۔ پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ مدد ان کی موجودگی میں آئے گی، یا ان کی موت کے بعد، جیسا کہ حضرت یحییٰ، حضرت زکریا اور شعیب علیہم السلام کے بارے میں ہوا کہ ان کی وفات کے بعد ان کے دشمنوں پر اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو مسلط کر دیا جنھوں نے ان قوموں کو ذلیل و رسوا کر کے ان کو تہ تیغ کیا۔ چنانچہ یہودیوں پر، جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی کوشش کی تھی، اللہ تعالیٰ نے رومیوں کو مسلط کیا۔ انھوں نے یہودیوں کو ذلیل و رسوا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے رومیوں کو غلبہ عطا کیا۔ سدی کہتے ہیں کہ جب بھی اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کے پاس رسول بھیجا ہے اور انھوں نے اس کو قتل کیا ہے، اور جب بھی اس نے کچھ مسلمانوں کو بھیجا ہے جو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور قوم نے ان کو قتل کیا ہے، تو وہ نسل گزرنے

کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی کو اُن [انبیا اور داعیوں] کی مدد کے لیے بھیجا ہے اور انھوں نے قاتلوں سے دنیا ہی میں مقتولوں کے قتل کا بدلہ لیا ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں: چنانچہ دنیا میں انبیا اور مومنین قتل بھی ہوتے رہے اور وہی کامیاب بھی ٹھہرے۔ یہی معاملہ اس کے [آخری] رسول کا بھی تھا۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے ہجرت کا حکم دیا، مگر پھر اسی مقام پر کامیاب و کامران اور فاتح بن کر واپس لوٹ آئے۔[1]

۵۴۸- جب تک ایک مسلمان داعی، اللہ کی یعنی اس کے دین کی مدد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (الحج ۲۲: ۴۰) اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔

داعی کو چاہیے کہ اس کا یقین رکھے اور اس کے بارے میں شک نہ کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو طائف گئے تو اہل طائف نے آپؐ برے طریقے سے لوٹایا تھا۔ اس موقع پر حضرت زیدؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ لِّمَا تَرٰى فَرَجًا وَّمَخْرَجًا، وَّإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى نَاصِرٌ دِيْنَهٗ وَمُظْهِرًا نَبِيَّهٗ.[2] تم جو کچھ دیکھ رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے نکلنے کا راستہ پیدا فرمائے گا اور کشادگی لائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد کرے گا اور نبی کو غلبہ عطا فرمائے گا۔

داعی کبھی بھی مایوس نہیں ہوتا، اس لیے کہ مایوسی اس دل میں سرایت کر جائے جس کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو یہ حرام اور ناجائز ہے۔ مایوسی تو کافروں کے دلوں میں داخل ہوتی ہے جن کا اللہ سے کوئی رابطہ منقطع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَيْأَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِنَّهٗ لَا يَيْأَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ (یوسف ۱۲: ۸۷)

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔

۵۴۹- رب تعالیٰ سے یہ رابطہ ایک مسلمان داعی کے لیے بہت زیادہ ضروری ہے۔ اس کے ذریعے اس کے لیے راستے کی مشکلات آسان ہوتی ہیں، تکلیفوں میں کمی آتی ہے اور اس کی وجہ سے داعی کے دل

۱- تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۷۳، اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبی نے قریب قریب انھی خیالات کا اظہار کیا ہے جو ابن کثیر کے ہیں، دیکھیے تفسیر قرطبی، ج ۱۵، ص ۳۲۲

۲- اِمتاع الأسماع، ص ۲۸

سے دوسرے لوگوں کا رعب نکل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران۳:۱۷۳) [مومن وہ ہیں] جن سے لوگوں نے کہا کہ تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

وہ ایمان کی حرارت اور قوت محسوس کرتا ہے کیوں کہ اس کا تعلق ایک ایسی ذات کے ساتھ ہے جو قوی اور عزیز ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (المنافقون۶۳:۸) عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں۔

چنانچہ اس کی نگاہ میں نہ کسی باطل کی کوئی وقعت ہوتی ہے اور نہ کسی باطل کے علم بردار کی۔ اس لیے کہ خواہ باطل ہو یا اس کے علم بردار، سب حقیر اور بے حقیقت ہیں۔ ایک مومن کے دل میں ان کی کوئی وقعت ہو ہی نہیں سکتی۔

......☆......☆......

تیسری فصل

داعی کے اخلاق

داعی کے اخلاق: اسلامی اخلاق

۵۵۰-مسلمان داعی کے اخلاق وہی ہیں جو اسلام کے اخلاق ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن میں بیان کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت میں بتایا ہے اور صحابہ کرامؓ نے اپنے کردار کو جن کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ یہ اخلاق ہر مسلمان کے لیے لازم ہیں۔ مسلمان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان اخلاق کے سامنے پیش کرے اور ان کے ترازو سے اپنے آپ کو تولے۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ ان اخلاق میں سے کون سے اس کے اندر موجود ہیں اور کون سے اخلاق کو پیدا کرنے کی ابھی ضرورت ہے۔

ان اخلاقیات کو ہم باب اول کی چوتھی فصل میں بیان کر چکے ہیں۔ چنانچہ تفصیل وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں ہم بعض ایسے اخلاق کو مختصراً بیان کریں گے جن کا داعی کے کام سے گہرا تعلق ہے اور داعی ان کا اس حد تک محتاج ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے اس بابرکت کام میں کامیابی چاہتا ہے تو یہ اخلاق اس کی بنیادی ضرورت بن جاتے ہیں۔

۱-سچائی

۵۵۱-اللہ تعالیٰ کی کتاب میں بہت سی آیات ہیں جو سچائی کی فضیلت سے بحث کرتی ہیں اور ان میں مومنوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ صادقین بن کر رہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبۃ ۹:۱۱۹) اے لوگو جو ایمان لائے

ہو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔

سچائی قیامت کے دن بندے کو نفع پہنچائے گی اور اسے اللہ کی ناراضی سے نجات دلا کر اسے جنت میں داخل کرے گی:

هٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (المائدۃ ۵:۱۱۹) یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو اُن کی سچائی نفع دیتی ہے، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

سچائی کی حقیقت چیز کا حاصل ہونا، اس کی تکمیل ہونا، اس کی قوت کا کمال کو پہنچنا اور اس کے اجزا کا جمع ہونا ہے۔ یہ بات ابن القیمؒ نے مدارج السالکین میں بیان فرمائی ہے۔ سچائی ارادے میں بھی ہوتی ہے، قول میں بھی اور عمل میں بھی۔

ارادے میں سچائی کا مطلب پکا عزم اور اللہ کی طرف جانے اور رکاوٹوں کو دور کرنے کا پختہ ارادہ ہے۔ اس ارادے کی عملی شکل یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں کی طرف آگے بڑھے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر لازم کی ہیں۔ ان میں سرفہرست اللہ کی راہ میں جہاد اور اس کا ایک حصہ دعوت الی اللہ ہے۔

ہر رکاوٹ ڈالنے والی چیز سے اور سستی میں مبتلا کرنے والے افراد سے بچنا، ان سے منہ موڑنا اور ان سے نفرت کرنا۔ اس لیے کہ یہ ایسے افراد ہوتے ہیں جو غفلت میں رہتے ہیں اور دنیا کی ظاہری زندگی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ ان کا مبلغ علم یہی ہوتا ہے، مگر یہ دراصل جہالت اور خواہش ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک سچے مومن کا دل بہت حساس ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو برداشت نہیں کرسکتا جو سستی میں ڈالنے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے دل گرفتہ ہوتا ہے اور ان کا پڑوس، ان کا ساتھ، اور ان کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں کرسکتا۔

اس کا سینہ انھی لوگوں کے لیے کھلا اور انھی لوگوں سے ٹھنڈا ہوتا ہے جو اسے اللہ کی طرف جانے اور اس کی طرف دعوت دینے کا شوق دلاتے ہیں۔

قول میں سچائی کا مطلب یہ ہے کہ انسان حق اور درست بات کہے، باطل اور ناحق بات نہ کہے خواہ کیسی بھی ہو۔

عمل میں سچائی یہ ہے کہ وہ شرعی طریق کار کے مطابق ہو اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی گئی ہو۔

جب ایک مسلمان کے ہاں ارادے، قول اور عمل تینوں میں سچائی پائی جائے تو یہ اسے ایک اور درجے میں داخل کردے گی، جسے 'صدیقیت' کا درجہ کہتے ہیں۔ یہ وہی درجہ ہے جس کے حصول کا اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو حکم دیا ہے۔

اپنے نبی کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّي مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۸۰) اور دعا کرو کہ پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال، اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

مُدْخَلَ صِدْقٍ اور مُخْرَجَ صِدْقٍ کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کا کسی چیز میں داخل ہونا، کسی کام کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لینا، یا کسی کام کو ترک کرنا، اللہ پر توکل کے ساتھ اور اللہ ہی کے لیے ہو۔ یعنی اس کے سارے اعمال وافعال اللہ کے ساتھ متعلق بھی ہوں اور اسی تک پہنچنے والے بھی۔ ان کی ادائیگی میں اللہ ہی کی مدد مانگی گئی ہو اور ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہو۔ چنانچہ ایک مسلمان کا اصل مقصود اللہ تعالیٰ ہی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام ۶:۱۶۲) کہو: میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

جب ایک مسلمان صدیقیت کے اس درجے تک پہنچتا ہے تو دنیا میں اس کے لیے کوئی قابل قبول مقصد نہیں رہتا، سوائے اس کام کے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا وسیلہ بن سکتا ہو۔ اگر اس کا یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے یا اس کو حاصل نہیں کر سکتا تو زندگی سے اس کی رغبت ختم ہو جاتی ہے اور وہ موت کو پسند کرنے لگتا ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: اگر تین چیزیں نہ ہوتیں تو میں دنیا میں زندہ رہنا

پسند نہ کرتا۔ اللہ کی راہ میں اچھی نسل کے گھوڑوں پر سوار ہونا، رات کو [عبادت میں] مشقت اٹھانا اور ایسے لوگوں سے اُٹھنا بیٹھنا جو اچھی باتوں کو اس طرح چنتے ہیں جیسے اچھی کھجوریں چنی جاتی ہیں۔

امام عمرؓ نے جن چیزوں کا ذکر کیا ہے اس سے ان کی مراد جہاد، نماز اور علم نافع ہیں۔ اور یہ سب وہ چیزیں ہیں جو رب تعالیٰ کو راضی کرنے والے ہیں۔[1]

۵۵۲- ایک سچے مسلمان داعی کی سچائی کا اثر اس کے چہرے اور اس کی آواز سے نمایاں ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص سے گفتگو کرتے جو آپؐ کو نہ پہچانتا تب بھی وہ کہتا: واللہ یہ کسی جھوٹے شخص کا چہرہ اور جھوٹے شخص کی آواز نہیں ہے۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ داعی کے چہرے اور اس کی آواز میں سچائی اس کے مخاطب پر اثر انداز ہوتی ہے اور مخاطب کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ داعی کی بات کو قبول کرے اور اس کا احترام کرے، سوائے اس کے کہ کسی کا دل حد سے زیادہ اندھا ہو چکا ہو۔

بہر حال سچائی اس معنی میں جو ہم نے بیان کیے ہیں، ہر مسلمان کے لیے اور خصوصاً داعی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایمان کی بنیاد سچائی اور نفاق کی بنیاد جھوٹ پر ہے۔ چنانچہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص داعی بھی ہو اور وہ جھوٹا بھی ہو۔ اس کے علاوہ جھوٹ، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، برائی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک آدمی برا ہو اور وہ داعی الی اللہ بھی کہلائے۔

۲- صبر

۵۵۳- صبر ان امور میں سے ہے جو اسلام میں فرض ہیں۔ صبر نصف ایمان ہے۔ قرآن کریم نے ۸۰ مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے۔ کہیں اس کا حکم دیا گیا ہے، جیسے: وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (البقرۃ ۲:۴۵) صبر اور نماز سے مدد لو۔

اور کہیں اس کے خلاف ورزی سے منع کیا گیا ہے، جیسے: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ

۱- مدارج السالکین، ج ۲، ص ۲۸۱-۲۸۲

۲- تذکرۃ الدعاۃ، البہی الخولی

الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (الاحقاف۴۶:۳۵)پس اے نبیؐ! صبر کرو جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو۔

کہیں صابرین کے ساتھ محبت کا اظہار کیا گیا ہے، جیسے: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ (آل عمران۳:۱۴۶)اللہ تعالیٰ صابروں کو پسند کرتا ہے۔

کہیں یہ بات کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ صابر لوگوں کا ساتھی ہے، جیسے: إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ (البقرۃ۲:۱۵۳)اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز سے مدد لو۔

کہیں یہ بات بتائی گئی ہے کہ صابرین کا انجام بھلا ہوگا، جیسے: وَأَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (النساء۴:۲۵)اگر تم صبر کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔

کہیں یہ ذکر ہے کہ ان لوگوں کو اجرِ عظیم سے نوازا جائے گا، جیسے: إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر۳۹:۱۰)صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

کہیں یہ ذکر ہے کہ صابرین اللہ تعالیٰ کی نشانیوں اور نصیحتوں سے نفع حاصل کرتے ہیں، جیسے: إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (ابراہیم۱۴:۵)ان واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس فرد کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔

کہیں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے، جیسے: سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (الرعد۱۳:۲۴)تم پر سلامتی ہو، تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو۔

اس کے علاوہ صبر و یقین کے ساتھ امامت فی الدین میسر آتا ہے: وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (السجدۃ۳۲:۲۴)اور جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔

یہ ان آیتوں میں سے چند آیات ہیں جو قرآن کریم میں صبر کے حوالے سے وارد ہیں۔

سنت نبوی میں بھی صبر کے بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

مَا أُعْطِي أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا لَهُ وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ. کسی نے کسی کو صبر سے زیادہ بہتر اور اس سے کشادہ عطیہ نہیں دیا۔

عَجَباً لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ. مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کے لیے تو خیر ہی خیر ہے۔ یہ چیز مومن کے سوا کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ اگر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے، یہ اس کے لیے خیر ہے۔ اور اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔

۵۵۴-صبر کے لغوی معنی روکنا اور باز رکھنا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں صبر کی تین قسمیں ہیں۔ ایک: اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر، دوسری: اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے صبر، اور تیسری مصائب ومشکلات پر صبر۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اس کی پابندی کرے، اس کے بارے میں اخلاص سے کام لے اور اس کو شریعت کے تقاضوں کے مطابق انجام دے۔ اس میں جو چیز مددگار ثابت ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور بندوں پر اس کے حقوق کو پہچان لے، نیز یہ بھی معلوم ہو کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ بہتر بدلہ عطا فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کاموں سے صبر یہ ہے کہ برائیوں کو چھوڑ دیا جائے اور گناہوں سے دور بھاگا جائے۔ نیز صابر مسلسل ان سے دور رہے اور راہ فرار ہی اختیار کیے رہے۔

اس صبر کے حصول میں جو چیز معاون ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آدمی کے دل میں ہر وقت مستحضر رہے۔ اس استحضار کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے حیا کرے اور اس کے ساتھ محبت رکھے۔ اس کے علاوہ صبر کے ثمرات کو مستحضر رکھنا بھی اس میں ممد ثابت ہوسکتا ہے۔ صبر کے ثمرات میں ایک یہ ہے کہ آدمی کا ایمان برقرار رہے گا، اسے تقویت حاصل ہوگی اور اس میں بڑھوتری آئے گی۔ کیوں کہ گناہ یا تو ایمان کو ناقص کردیتے ہیں یا اسے کمزور بنادیتے ہیں، یا اسے گدلا کرکے اس کے نور اور خوشنمائی کو ختم کردیتے ہیں۔

مصائب ومشکلات پر صبر اس طرح ہوتا ہے کہ مشکلات کو برداشت کیا جائے، اس پر ناراضی کو ترک

کیا جائے اور لوگوں سے کوئی شکوہ شکایت نہ کی جائے۔ اس لیے کہ مخلوق سے شکوہ شکایت صبر جمیل کے منافی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شکوہ صبر کے منافی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: قَالَ إِنَّمَآ أَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ إِلَى اللّٰهِ (یوسف ۱۲:۸۶) اس نے کہا: میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا۔

اور حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: إِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ أَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ (الانبیاء ۲۱:۸۳) یاد کرو، جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔

ان کے بارے میں ایک اور جگہ فرمایا: إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهٗٓ أَوَّابٌ (ص ۳۸:۴۴) ہم نے اسے صابر پایا، بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا۔

اس صبر کے لیے داعی اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا استحضار کرے جن کا حساب اور گنتی مشکل ہے۔ اس طرح مصیبت زدہ کے لیے اس مصیبت کو برداشت کرنا آسان ہوتا ہے اور اس کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک آدمی کو دو ہزار روپے دیے جائیں اور ان میں سے ایک پیسہ اس سے گم ہو جائے۔ مصیبت پر صبر کے لیے یہ بات بھی مددگار ثابت ہوتی ہے کہ آدمی صابرین کے عظیم اجر کو ذہن میں لائے۔

صبر: اللہ کی خاطر، اللہ کے بھروسے پر

۵۵۵- صبر کی تمام قسمیں اس معنی میں اللہ کے بھروسے پر ہوتی ہیں کہ مومن اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اس کا صبر اللہ ہی کی مدد سے ممکن ہے۔ گویا اللہ ہی اس کو صبر دلانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ (النحل ۱۶:۱۲۷) اے نبیؐ! صبر سے کام کیے جاؤ، اور تمھارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔

ایک مسلمان کا صبر اللہ ہی کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی مسلمان جب صبر کرتا ہے تو اللہ کی اطاعت اور اسی کی رضا کے لیے کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے صبر کا باعث اللہ کی محبت اور اس کی رضا کی تلاش ہوتا ہے۔ اس قسم کا

صبر، جس میں صبر علی الطاعات اور صبر عن المعصیت بھی شامل ہے، اس صبر سے زیادہ کمال والا ہوتا ہے جو مصائب اور مشکلات پر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ پہلی قسم میں اختیار بھی ہوتا ہے اور اللہ کی محبت کو بھی ترجیح حاصل ہوتی ہے، جب کہ دوسرا صبر مجبوراً ہوتا ہے۔ اس میں صابر کا اختیار کام نہیں کرتا۔

صبر انسان کی ضرورت

۵۵۶- صبر ہر انسان کے لیے ایک لازمی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ صبر کے بغیر انسان اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیوں کہ مقصد کا حصول عموماً اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اس کے لیے مشقت اٹھائے اور اپنے نفس کو اس کا پابند کرے۔

یہ معاملہ زندگی کے تمام امور میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم اپنے آپ کو درس اور مطالعے کا پابند بناتا ہے اور اپنے آپ کو ان لذتوں اور راحتوں سے محروم کرتا ہے جو اس کو پسند ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ سبق یاد کر لیتا ہے اور امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ تاجر کا ہوتا ہے اور یہی معاملہ ہر اس شخص کا ہوتا ہے جس کے پیش نظر کوئی مقصد ہو اور وہ اسے حاصل کرنا چاہتا ہو۔

پھر جو بات افراد کے بارے میں کہی جاتی ہے وہی بات اقوام کے بارے میں بھی ہے۔ چنانچہ وہ قوم جو کسی منزل تک پہنچنا چاہتی ہے اس کو عظیم صبر اور بڑی مشکلات کو برداشت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنگوں میں فتح انھی لوگوں کو ملتی ہے جو اس کے اسباب رکھتے ہیں۔ اور اسباب میں سب سے اہم چیز صبر ہے۔

معلوم ہوا کہ صبر ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ وہ زندگی کے ہر موڑ پر حادثات میں تر انوالہ ثابت ہوگا اور فوراً ہار مان لیتا ہوگا۔ اس لیے کہ زندگی تو رکاوٹوں، مشکلات، مصائب اور پریشانیوں سے بھری پڑی ہے۔ اگر ان کے مقابلے میں صبر نام کی کوئی چیز موجود نہ ہو تو انسان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا اور زندگی میں اس کی شخصیت ٹوٹ کر چور چور ہو جائے گی۔ وہ پاؤں کے نیچے روندا جائے گا اور زندگی کے دھارے سے دور گر جائے گا۔

۵۵۷- جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ صبر ہر انسان کے لیے بقا و دوام اور زندگی کے دھارے میں چلتے ہوئے اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے لازم ہے تو ایک مسلمان کے لیے صبر دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ

ضروری ہے۔ اس لیے کہ مسلمان سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو گناہ سے باز رکھے۔ گناہوں میں نفسانی لذت تو ہوتی ہے جس سے محروم ہونا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسے ضبط نفس اور قوت ارادی کے کافی سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے، جو نفس کو گناہ چھوڑنے پر آمادہ کرے اور اسے برائی سے باز رکھے۔

اسی طرح مسلمان سے یہ بھی مطلوب ہے کہ اچھے کام کرے۔ یہ بھی اس سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنے نفس کو ان کا پابند بنادے۔ اسی کا نام صبر علی الطاعات ہے۔ مومن سے یہ بھی مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ تقدیر پر صبر کرے اور جو مصیبت پہنچے اس پر پریشانی کا اظہار نہ کرے۔ تاکہ گناہ گار نہ ہو اور اجر و ثواب کا مستحق بننے کے بجائے اس کے اوپر مزید بوجھ نہ پڑے۔

مسلمان کو صبر کی ضرورت

۵۵۸- جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ صبر ہر انسان کے لیے ضروری ہے اور خاص طور پر مسلمان کے لیے، تو مسلمان داعی کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے کہ وہ دو میدانوں میں کام کرتا ہے۔ ایک میدان اپنے نفس کا ہے، جس کے ساتھ وہ جہاد کرتا ہے، اسے اطاعت پر مجبور کرتا ہے اور گناہ سے روکتا ہے۔ دوسرا میدان نفس سے باہر کا ہے۔ اور وہ میدان دعوت الی اللہ کا اور اس کے لیے لوگوں کو مخاطب کرنے کا۔ چنانچہ وہ دونوں میدانوں میں بہت زیادہ مقدار میں صبر کا محتاج ہوتا ہے، تاکہ وہ گھاٹیوں کو سر اور اذیتوں کو برداشت کرسکے۔

اگر داعی میں صبر نہیں ہوگا تو وہ مایوس ہوکر بیٹھ جائے گا یا میدان سے کھسک جائے گا۔ اس پر حساب لازم ہوجائے گا اور وہ ثواب سے محروم ہوجائے گا۔

آزمائش ضروری ہے

۵۵۹- داعی کے لیے آزمائش تو ضروری ہے، اس لیے صبر بھی ضروری ہے تاکہ وہ امتحان کو پاس کرے اور اس میں کامیابی حاصل کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوا حَتّٰى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ أَلَآ إِنَّ نَصْرَ

اللّٰهِ قَرِيبٌ (البقرۃ ۲:۲۱۴) پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمھیں مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انھیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

معلوم ہوا کہ زندگی میں ابتلا وآزمایش اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ وہ اپنے بندوں کو جب چاہتا ہے اور جس طریقے سے چاہتا ہے آزماتا ہے، تاکہ ان کے دلوں میں جو ایمان یا نفاق چھپا ہوا ہے وہ لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائے۔ یہ آزمایش کئی طرح سے ہوتی ہے۔ ان میں سرفہرست شرعی احکام کی پابندی ہے۔ یہ بھی ایک ابتلا اور آزمایش ہی ہے۔

کبھی یہ آزمایش اس صورت میں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں اور نفس کی پسندیدہ چیزوں میں مقابلے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں جب ایک مسلمان اللہ کی پسندیدہ چیزوں کو نفس کی پسندیدہ چیزوں پر ترجیح دیتا ہے تو وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے ورنہ وہ ناکام ٹھہرتا ہے۔

کبھی یہ آزمایش مصائب وآلام کی صورت میں ہوتی ہے، جو مسلمان کو پہنچتی ہیں، جیسے بیماری، دوست احباب سے محرومی، مال کا ضائع ہونا وغیرہ۔ جب وہ صبر کرتا ہے، سلامتی کی دعا کرتا ہے، اور انا للہ وانا الیہ راجعون کہتا ہے اور پریشانی کا اظہار نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اسے وہ ثواب دیتا ہے جو صابرین کے لیے مقرر ہے۔ اس صورت میں وہ امتحان میں کامیاب ٹھہرتا ہے ورنہ ناکام۔

داعی کی آزمایش

۵۶۰- جب زندگی میں آزمایش اللہ تعالیٰ کی سنت ہے تو داعیوں کی آزمایش اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے۔ اس لیے وہ ان کافروں کی آزمایش میں مبتلا ہوتے ہیں جو قول سے بھی انھیں ایذائیں پہنچاتے ہیں، ہاتھ سے بھی اور ان کے خلاف سازشیں بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِ الْمُرْسَلِيْنَ (الانعام ۶:۳۴) تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں، مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انھیں پہنچائی گئیں، انھوں

نے صبر کیا، یہاں تک کہ انھیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے، اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّکَ یَضِیقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ. فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِّنَ السَّاجِدِیْنَ. وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَأْتِیَکَ الْیَقِیْنُ (الحجر ۱۵: ۹۷-۹۹) ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمھارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ (اس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجالاؤ، اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّکَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ (الروم ۳۰: ۶۰) پس (اے نبیؐ!) صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔

لَا یَسْتَخِفَّنَّکَ کے معنی یہ ہیں کہ دشمن تجھے بے صبری میں مبتلا کر کے خفت اور طیش میں آنے پر مجبور نہ کریں۔[1]

کیوں کہ داعی الی اللہ کے خلاف اہل باطل مختلف قسم کے حیلے بناتے ہیں، ان پر جھوٹ باندھتے ہیں ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے ہیں، اس لیے کہ وہ جاہل اور گمراہ لوگ ہوتے ہیں۔ مکہ میں آپؐ کے صحابہ کو سخت ترین ایذائیں دی گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو صبر ہی کی تلقین کرتے رہے۔ ایک موقع پر فرمایا: صَبْرًا آلَ یَاسِرٍ، إِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّةُ. یاسر کے گھر والو! صبر کرو، تم سے جنت کا وعدہ ہے۔

چنانچہ ایک مسلمان داعی پر لازم ہے کہ اسے جو اذیتیں پیش آئیں ان کا مقابلہ صبر جمیل کے ساتھ کرے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ اور ان سے بھی پہلے اللہ کے دوسرے رسولوں نے کیا۔ یہ صبر وہ چیز ہے جس سے مسلمان کے عزم کو استحکام نصیب ہوتا ہے اور اس کے ارادے میں قوت آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۱۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۷۰

وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان ۳۱:۱۷) اور جو بھی مصیبت پڑے اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا وَّاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آل عمران ۳:۱۸۶) مسلمانو! تمھیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دِہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔

آزمائش مانگنا یا اسے ہٹانا

۵۶۱- جب یہ بات سامنے آئی کہ داعیوں کو آزمائش سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان داعی کو آزمائش کی دعا مانگنا اور اسے اپنے اوپر واقع کرنا چاہیے اور اگر آزمائش آجائے تو اسے دفع کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے؟ اس مسئلے میں کچھ تفصیل اور توضیح ہے۔ اس لیے کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں لوگ خلطِ مبحث اور شبہے میں پڑ جاتے ہیں، جس کا سبب غلط فہمی ہوتا ہے، نہ کہ بدنیتی اور ارادے کا نقص۔ اس مسئلے کی توضیح کے لیے درج ذیل امور پر غور کرنا چاہیے۔

۱- داعی سے مطلوب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے، بصیرت کے ساتھ اور ان وسائل اور طریقوں کے ساتھ جو جائز ہیں اور جنھیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کیا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں عملی کر دکھایا ہے۔ اگر یہ وسائل داعی کے لیے کسی اذیت کا سبب بن جائیں اور داعی کو ان کا سامنا کرنا پڑے تو داعی کو چاہیے کہ ان کو صبر کے ساتھ برداشت کرے نہ کہ پریشانی اور اضطراب کے ساتھ، اور ان کے راستے میں ثابت قدمی اختیار کرے، نہ کہ ان سے فرار۔

۲- جب داعی کے لیے اذیت میں کشادگی موجود ہو، یعنی وہ یہ کر سکتا ہو کہ اس سے کترا کر نکلے اور اس کا سامنا کرنا ضروری نہ ہو تو اس کو اختیار ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس سے کترا کر چلا جائے۔ بہرحال اس کا

دارومدار حالات پر ہے کہ کبھی اس کے لیے مباح ہوگا کہ آزمائش سے دور رہے اور اس کا سامنا نہ کرے اور کبھی واجب ہوگا۔ اس لیے کہ آزمائش بہرحال نفس کے لیے مشکل ہوتی ہے چنانچہ اس کی حرص یا اس کا شوق نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اس میں ایک ایسا فتنہ پوشیدہ ہے جس کا انجام غیر یقینی ہے۔

بعض اوقات ایک مسلمان اپنے دل میں محسوس کرتا ہے کہ وہ آزمائش میں ثابت قدم رہنے کی طاقت رکھتا ہے اس وجہ سے وہ آزمائش کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، بلکہ بعض اوقات اس کی طرف رغبت رکھتا ہے، کبھی اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ اسے ثواب سے نواز دے اور کبھی اس وسوسے کی بنا پر کہ لوگ کہیں: فلاں تو آزمائش کے مقابلے میں بہت ثابت قدم اور صابر ہے۔ مگر جب آزمائش آتی ہے تو آدمی اسے برداشت کرنے سے عاجز آتا ہے، فتنے میں پڑ جاتا ہے اور امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ کسی کے بارے میں بیان ہے کہ اس نے کہا تھا: ''اے میرے رب! جس امتحان میں چاہے، مجھے ڈال دے، میں تیری تقدیر پر راضی اور تیری آزمائش پر صابر ہوں''۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بول کی بندش میں مبتلا کر دیا۔ اس نے چیخنا اور واویلا کرنا شروع کر دیا۔ وہ بچوں کے پاس جاتا اور کہتا تھا: ''اپنے چاچو کو پتھر مارو، وہ جھوٹا ہے''۔

۳- کسی مسلمان کے ساتھ یہ مناسب نہیں کہ وہ کسی ایسی آزمائش سے تعرض کرے جس کی طاقت نہ رکھتا ہو، اور اس طرح وہ شرمندگی سے دوچار ہو جائے۔ حدیث میں آیا ہے: لَا يَنبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يُذِلَّ نَفْسَهُ. ''کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے''۔ لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اپنے آپ کو کیسے ذلیل کرے گا؟'' آپؐ نے فرمایا: يَتَحَمَّلُ مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَا يُطَاقُ. ایسی آزمائش کو اپنے سر لے جس کی طاقت کسی میں نہ ہو۔[1]

۴- ادعیہ ماثورہ میں سے ایک دعا یہ ہے کہ مسلمان اپنے رب سے عفو اور عافیت مانگے۔

عافیت میں آزمائش سے محفوظ رہنا بھی داخل ہے اور ایذا پہنچانے والی چیزوں سے حفاظت بھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل باطل کی اذیتوں سے اپنے آپ کو بچانا اور ان سے نجات حاصل کرنا قابل تعریف ہے نہ کہ قابل مذمت۔

۱- إمتاع الأسماع، ص ۳۸

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے چند دن پہلے حضرت اسامہ ابن زیدؓ کو روم کے خلاف جہاد کے لیے ایک فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے بھیجنا چاہا تو اس موقع پر ان کو جو نصیحت کی اس میں ایک بات یہ تھی:

لَا تَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ فَإِنَّكُمْ لَا تَدْرُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُبْتَلُوْنَ بِهِمْ. وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اللّٰهُمَّ اكْفِنَاهُمْ وَاكْفُفْ بَأْسَهُمْ. دشمن سے آمنا سامنا ہونے کی تمنا نہ کرو، معلوم نہیں کہ شاید اس طرح تم آزمائش میں پڑ جاؤ۔ البتہ تم یہ کہو کہ اے ہمارے رب! ان کے مقابلے میں ہمارے لیے کافی ہو جا اور ان کی شدت کو روک لے۔[1]

۵- قرآن کریم میں ہے: وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا (الاحزاب ۳۳:۲۵) اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا، اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔

اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مومنوں کو قتال کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف سے جنگ کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ چیز مومنوں پر اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کہلائی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف جنگ میں اذیت اور تکلیف ہوتی ہے۔ اگر ایک مسلمان کا اپنے آپ کو اذیت اور تکلیف کے لیے پیش کرنا بذات خود مطلوب ہوتا تو ان کے لیے جنگ کی ضرورت نہ ہونے کو اللہ تعالیٰ کی نعمت کے طور پر پیش نہ کیا جاتا۔

۶- مومنوں کے لیے اہل باطل کی ایذائیں قطعاً مطلوب نہیں ہیں، بلکہ یہ تو اہل باطل کی برائیوں میں سے ہیں۔ اس لیے کہ یہ اہل حق کے لیے ایذا ہوتی ہے، چنانچہ یہ کیسے جائز قرار پا سکتا ہے کہ ایک مسلمان اپنے آپ کو ایک مبطل کے سامنے پیش کرے کہ وہ اسے ایذا پہنچائے، اس کی توہین کرے اور اسے ذلیل کرے۔ اگر ایک مسلمان یہ کام کرتا ہے تو کیا وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی میں نہیں ڈال رہا اور دوسری طرف وہ اپنے آپ کو ہلاکت، اہانت اور ذلت میں نہیں ڈال رہا؟ حالانکہ یہ ساری چیزیں ناجائز ہیں۔

۷- ایک مجبور شخص کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اذیت اور ہلاکت سے بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے آپ سے اذیت کو دفع کرنا مباح ہے اور ایک مسلمان کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنی اذیت میں خود ہی مددگار نہ بنے۔

۸- جس وقت حضرت خالد بن ولید جنگ موتہ سے اپنے لشکر کو ہلاکت سے بچا کر اور دشمن کا محاصرہ توڑ

۱- سیرت ابن ہشام، ص ۳۳۰

کر آئے اور مدینے میں داخل ہوئے تو لوگوں نے ان پر مٹی پھینکنا شروع کی اور کہنے لگے: ارے بھگوڑو! اللہ کے راستے سے بھاگ آئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کیا اور فرمایا: لَيْسُوْا بِالْفَرَّارِ وَلٰكِنَّهُمْ كَرَّارٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى یہ فرّار نہیں، کرّار ہیں، ان شاء اللہ۔ یعنی یہ بھاگنے کے لیے نہیں بلکہ دوبارہ جانے کے لیے آئے ہیں۔

اس واقعے سے ہمارا استدلال یہ ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو دشمن کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے بچالیا اور اس طرح وہ نقصان اور اذیت سے محفوظ رہے۔ مدینے میں مسلمانوں نے ان کی اس حرکت کو ناپسند کیا اور اسے فرار کا نام دیا۔ مگر سید العارفین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کے اس اقدام کو جس نظر سے دیکھا اس سے دوسرے لوگوں نے نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ آپؐ کو حضرت خالدؓ کے محاصرہ توڑ کر آنے میں بھی ایک طرح کی فتح نظر آئی۔ کیوں کہ وہ قتل سے، مشرکین کی اذیت سے اور ان کی قید میں جانے سے محفوظ ہو گئے۔

ان کا یہ اقدام اس طرح قرار پایا گویا کہ انھوں نے لڑائی کے میدان میں ایک طرف سے دوسری طرف کا رخ کیا ہو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر آزمایش کو دفع کیا جا سکے تو اس کو دفع کرنا ایک مطلوب امر ہے اور ایک مسلمان کا اپنے آپ کو اس وقت بھی اذیت کے لیے پیش کرنا، جب کہ اس سے نجات ممکن ہو، کوئی مطلوب امر تو کیا، جائز بھی نہیں ہے۔

۹- مسلمانوں نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی، اس طرح وہ اپنے دین کو بھی بچالے گئے اور اپنے آپ کو بھی قریش کی اذیتوں سے محفوظ کیا۔ یہ بھی اذیت اور آزمایش کو دفع کرنے اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کے جواز کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ مسلمان کی جان اس کی اپنی ملکیت نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ چنانچہ اس کو اسلام کے کسی فائدے کے بغیر ویسے ہی ضائع کرنا جائز نہیں ہے۔ اور اس کا کوئی فائدہ نہیں کہ لوگ کہیں کہ فلاں داعی کس قدر ثابت قدم اور اللہ کی راہ میں اذیت اٹھانے پر کتنا صابر ہے۔ بلکہ اس محرک کی بنا پر اذیت کو برداشت کرنا بعض اوقات ریا اور خودنمائی اور لوگوں کے ہاں جاہ وجلال کے حصول کا ذریعہ ہوگا اور یہ جائز نہیں ہے۔

۱۰- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب کے تعاون میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا حالانکہ

وہ اپنی قوم کی دین پر تھا۔ چنانچہ آپؐ نے ان کے ذریعے قریش کی طرف سے پہنچنے والی اذیتوں کو دفع کیا اور جس سال حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب وفات پائے تو اس سال کو آپؐ نے عام الحزن قرار دیا اور فرمایا: مَانَالَ قُرَيْشٌ مِنِّي شَيْئًا أَكْرَهُهُ حَتّٰى مَاتَ أَبُوْ طَالِبٍ. جب تک ابوطالب زندہ رہے، قریش کا ہاتھ مجھ تک کسی ایسی بات کے ساتھ نہ پہنچ سکا جو مجھے ناپسند ہو۔[1]

اس کی وجہ یہ تھی کہ ابوطالب کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں اور آپ کے چچاؤں میں کوئی بھی نہ تھا جو آپ کا ساتھ دیتا، یا آپؐ سے قریش کا ہاتھ روکتا۔

جس وقت آپؐ طائف سے واپس آئے اور حراء کے مقام تک پہنچے تو آپؐ نے مطعم بن عدی کے پاس ایک آدمی کو بھیجا تاکہ آپؐ کو پناہ دیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ اپنے رب کے پیغام کو لوگوں تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ مطعم نے آپؐ کو پناہ دی۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے، وہاں مقیم رہے اور اللہ کی طرف دعوت دیتے رہے۔[2]

ان آثار سے ہمارا استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر راضی ہوئے کہ آپؐ کے چچا ابوطالب آپؐ کی حمایت کریں اور آپؐ سے اذیت کو دفع کریں۔ اسی طرح آپؐ کا مطعم بن عدی کی پناہ میں داخل ہونا بھی ہے۔ چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ داعی سے اذیت اور آزمائش کو دور کرنا، خواہ مشرک کے ذریعے ہو، جائز ہے اور مسلمان کا اپنے آپ کو اہلِ باطل کے سپرد کرنا مستحب نہیں ہے۔

یہی طریقہ ان صحابہ کرام نے اختیار کیا تھا جنھوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ پھر جب یہ لوگ مکہ آئے تو ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کی پناہ میں تھا یا چھپ چھپا کر آیا تھا۔[3]

یہاں یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ مسلمان داعی جو اپنے آپ سے اذیت کو دفع کرنا چاہتا ہے یا اس کے لیے کوشش کرتا ہے تو اس کا مقصد ایک ٹھکانا پیدا کرنا اور دعوت الی اللہ کے لیے مناسب فضا تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت اس بات سے ہوتی ہے جو سیرت میں آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے ایام

۱- اِمتاع الأسماع، ص ۱۸

۲- اِمتاع الأسماع، ص ۲۸

۳- سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۸۸

میں قبائل میں جاتے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ ان ملاقاتوں میں آپؐ فرماتے تھے:

مَنْ رَجُلٌ يَحْمِلُنِي إِلٰى قَوْمِهِ فَيَمْنَعُنِي حَتّٰى أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي، فَإِنَّ قُرَيْشاً قَدْ مَنَعُوْنِي أَنْ أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي. کون شخص ہوگا جو مجھے اپنی قوم میں لے جائے، تاکہ وہ میری حفاظت کرے اور میں اپنے رب کا پیغام [اُن تک] پہنچا سکوں۔ قریش تو مجھے اس بات سے روک رہے ہیں کہ میں اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤں۔[1]

خلاصہ

۵۶۲- قرآن وسنت کی ان نصوص سے جو میں نے ذکر کی ہیں، اور سیرت رسول وسیرت صحابہؓ کے واقعات سے جو امت کے سب سے بڑے فقہا تھے، ہمارے سامنے پوری وضاحت کے ساتھ درج ذیل باتیں معلوم ہوئی ہیں۔

اولاً: داعی کو پہنچنے والی اذیت اور نقصان ان امراض اور مصائب کی طرح ہے جو انسان پر نازل ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ جس طرح کہ ان امراض اور مصائب کو نہیں چاہتا اور نہ ان کو اپنے اوپر ڈالنے کا شوق رکھتا ہے، اور اس سے اس کے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اسی طرح یہ بات بھی اس کے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں کرتی کہ وہ اہل باطل کی ایذاؤں کو نہیں چاہتا اور اپنے اوپر اس طرح کے نقصان کی استدعا نہیں کرتا۔

ثانیاً: اگر اس بات کا احتمال ہو کہ اذیت اور نقصان واقع ہو جائے گا تو یہ بات اسے اللہ کی طرف دعوت دینے سے بے دل نہیں کر دیتی۔ مگر داعی اپنے لیے اذیت کی استدعا بھی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آزمائش نہ آئے۔ لیکن اگر آزمائش آ جائے تو وہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہر جائز ذریعے سے اس کو دفع کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے۔

ثالثاً: اگر مسلمان داعی پر کوئی اذیت واقع ہوتی ہے، باوجودیکہ وہ اپنی دعوت میں جائز ذرائع ہی استعمال کرتا رہے، تب اس پر لازم ہوگا کہ اللہ کی مدد حاصل کرے اور صبر جمیل سے کام لے۔ اس کو جاننا چاہیے کہ سارے امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، وہ جو کچھ چاہتا ہے، ہو کر رہے گا اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں

۱- اِمتاع الاسماع ص ۳۱

ہو گا۔ یقیناً پھیرنا اور قوت دینا اللہ کے سوا کسی کا کام نہیں ہے۔

۳- رحم

۵۶۳- داعی کے ضروری اخلاقیات میں سے ایک رحمت ہے۔ اس سے پہلے کہ داعی کے لیے اس کی اہمیت بیان کی جائے، وہ احادیث ذکر کی جاتی ہیں جو اس کے بارے میں وارد ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱- لَایَرْحَمُ اللهُ مَنْ لَّایَرْحَمُ النَّاسَ. جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا۔

۲- لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ إِلَّا مِنْ شَقِيٍّ. ایک بدبخت آدمی کا دل ہی رحم سے خالی ہوتا ہے۔

۳- اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ اللهُ تَعَالٰى، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَّنْ فِي السَّمَاءِ. رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ بھی رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

۴- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت حسن بن علیؓ کا بوسہ لیا، اس وقت حضرت اقرع بن حابسؓ آپؐ کے پاس موجود تھے۔ انھوں نے کہا: میرے تو دس بچے ہیں، اور میں نے کبھی ایک کا بھی بوسہ نہیں لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: مَنْ لَّایَرْحَمْ، لَایُرْحَمُ. جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

۵- دَخَلَتِ امْرَأَةٌ النَّارَ فِيْ هِرَّةٍ رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَأْكُلُ مِنْ حَشَاشِ الْأَرْضِ. ایک عورت اس وجہ سے آگ میں گئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا۔ نہ خود اسے کچھ کھلاتی تھی اور نہ اسے چھوڑتی تھی کہ زمین کی گھاس پھونس کھا لیتی۔[1]

۵۶۴- حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور اخلاق میں سے ایک بات یہ تھی کہ آپؐ اپنی امت پر بڑے شفیق اور رحیم تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُ

۱- تیسیر الوصول، ج ۲، ص ۱۱۲-۱۱٦

وُفٌ رَّحِيمٌ (التوبۃ ۹:۱۲۸) دیکھو، تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔

آپؐ کی شفقت میں سے یہ بھی ہے کہ آپؐ اپنی امت کو اس چیز کی طرف دعوت دیتے تھے جو انھیں آگ سے بچاتی تھی۔ اس بات کو آپؐ نے بڑی بلیغ مثال کے ساتھ یوں بیان فرمایا:

إِنَّمَا مَثَلِيْ وَمَثَلُ أُمَّتِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَاراً، فَجَعَلَتِ الدَّوَابُّ وَالْفَرَاشُ يَقَعْنَ فِيْهِ، فَأَنَا اٰخِذٌ بِحُجُزِكُمْ وَأَنْتُمْ تَقْتَحِمُوْنَ فِيْهِ. میری اور میری امت کی مثال ایسی ہے، کہ ایک شخص نے آگ جلائی، تو حشرات اور پتنگے اس میں گرنا شروع ہو گئے، میں تمھیں کمر سے پکڑتا ہوں اور تم اس میں گرے پڑتے ہو۔[1]

داعی کے لیے رحم کی ضرورت

۵۶۵- داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے دل کا مالک ہو جس سے لوگوں کے اوپر رحمت اور شفقت ٹھپکی پڑتی ہو، اور وہ دوسروں کے لیے خیر اور بھلائی ہی کا طالب ہو۔ یہ بھی داعی کی شفقت ہے کہ انھیں اللہ کی طرف دعوت دے۔ اس لیے کہ اس دعوت میں ان کے لیے آگ سے نجات اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی سے سرفراز ہونے کا راز پوشیدہ ہے۔

داعی لوگوں کے لیے وہی چاہتا ہے جو اپنے لیے چاہتا ہے اور اپنے لیے وہ جس چیز کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے وہ ایمان اور ہدایت ہے، اس لیے وہ یہ چیزیں ان کے لیے بھی پسند کرتا ہے۔ باپ کی اپنی اولاد پر شفقت یہ ہوتی ہے کہ وہ انھیں جائے ہلاکت میں گرنے سے بچاتا ہے اور اس کے لیے اپنے آپ کو تھکاوٹ میں ڈالتا ہے۔ اب گمراہی اور اللہ کی نافرمانی سے زیادہ ہلاکت خیز بات کیا ہوگی۔ داعی اپنی دعوت کے ذریعے گناہ گاروں اور اللہ کے نافرمانوں کو یقینی ہلاکت اور کھلے نقصان سے بچاتا ہے۔

ایک مہربان داعی اپنے کارِ دعوت سے ہاتھ روک نہیں لیتا اور نہ وہ لوگوں کی تردید اور بے رخی سے

۱- مسلم، ج ۵، ص ۹۱۱۔ حُجُز جمع ہے حُجزۃ کی۔ یہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ازار یا شلوار باندھی جاتی ہے۔ تَقَحُّم کے معنی ہیں: کسی مشکل کام میں غیر ارادی طور پر پڑ جانا۔ (مولف)

اُکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اعراض کرنے والے اور گناہ گار لوگوں کے برے انجام سے آگاہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس سے بے رُخی کرتے ہیں تو یہ ان کی جہالت ہے۔ چنانچہ وہ ان کو مطمئن کرنے اور انھیں سیدھے راستے پر لانے سے لاپروائی نہیں کرتا۔

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کے بارے میں وہ مثال ذکر کی ہے جو آپؐ نے خود اپنے بارے میں بیان فرمائی ہے۔ یہی معاملہ تمام انبیائے کرام کا تھا۔ وہ اپنی قوموں پر رحم اور شفقت کرنے والے تھے۔ تاکہ وہ عذاب سے دوچار نہ ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰـهٍ غَيْرُهٗ إِنِّيْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (الاعراف ۷:۵۹) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمھارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

آپؑ کے ارشاد کا آخری فقرہ ایک ایسے ہی دل سے نکل سکتا ہے جو اپنی قوم کے لیے رحمت اور شفقت سے لبریز ہو۔ اسی طرح قوم نے آپؑ پر گمراہی کا الزام لگایا تھا مگر آپؑ نے فرمایا:

يٰـقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلَالَةٌ وَّلٰـكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّيْ وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الاعراف ۷:۶۱-۶۳) اے برادرانِ قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمھارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھارے رب کی یاددہانی آئی تاکہ تمھیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے۔

حضرت نوحؑ کا یہ جواب اپنی قوم پر رحمت اور شفقت اور ان کو خطاب کرنے میں لطف و کرم کے جذبات سے بھرا پڑا ہے۔ قوم کی باتوں سے آپؑ غصے میں نہ آئے اس لیے کہ وہ ایک جاہل قوم تھی، اور اس لیے بھی کہ داعی ہمیشہ رحیم ہوتا ہے، وہ اپنی خاطر کبھی غصے میں نہیں آتا۔ اسی طرح ہمارے رسول حضرت محمد

صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے کہ آپؐ اپنی ذات کے لیے غصے میں نہیں آتے تھے۔ البتہ یہ بات اسے ضرور غصہ دلاتی تھی کہ کوئی اللہ کی حرمتوں کو پامال کرے۔

پھر حضرت نوحؑ کے جواب میں یہ بھی آیا ہے کہ آپؑ اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں۔ یعنی جو بات ان کے لیے مفید اور نفع بخش ہو اس میں ان کے لیے اخلاص سے کام لیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی بات باطل ہوتی ہے۔ آپؑ ان کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ آپؑ رب العالمین کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، تاکہ ان کو معلوم ہو کہ آپؑ جس بات کی خبر دے رہے ہیں وہ بالکل حق ہے اور اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ اگر وہ اس کو قبول کریں گے تو ان پر رحم کیا جائے گا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپؑ کے دل میں ان کے لیے عظیم رحمت پوشیدہ تھی۔

جذبۂ رحم: اذیتِ قوم کی مرہم

۵۶۶- رحمت کا جذبہ داعی کے لیے وہ اذیتیں آسان بنا دیتا ہے جو غفلت اور جہالت میں پڑے ہوئے لوگوں کی طرف سے ان کو پہنچتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ ایک اونچے مقام سے ان کو دیکھتا ہے۔ وہ مقام جہاں وہ اپنے ایمان کے ذریعے پہنچتا ہے اور اسے اپنے رب تک پہنچاتا ہے۔ اس لیے وہ ان کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ کھیلنے والے بچے ہوں۔ کیوں کہ بچے ہوتے ہی ایسے ہیں کہ وہ کھیل کود کرتے ہیں، جہالت میں پڑے ہوتے ہیں اور اپنے نفع و نقصان میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے داعی کو اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی خیر خواہی کا جواب بے رخی، رکاوٹوں اور اذیتوں سے دیتے ہیں۔ جیسا کہ ایک بچے کو نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ضد میں آجاتا ہے۔ مثلاً آپ اس کو آگ کو ہاتھ لگانے یا کسی دوسری موذی چیز سے روکتے ہیں تو وہ چیختا چلاتا ہے، غصے میں آتا ہے اور کبھی نقصان پہنچا دیتا ہے۔ چنانچہ داعی ان کی رکاوٹیں ڈالنے سے اپنے کام سے رکتا نہیں بلکہ دوبارہ ان کے پاس جاتا ہے، ان کی اذیتوں پر صبر کرتا ہے اور ان کے لیے ہدایت کی دعا کرتا ہے۔ یہی معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ آپؐ بار بار قریش کو دعوت دیتے تھے، ان کی اذیتیں برداشت کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: **اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ**... اے اللہ میری قوم کو ہدایت عطا فرما، یہ نہیں جانتے۔

ایک ایسا انسان جو رحم کے جذبات سے لبریز دل کا مالک ہوتا ہے وہ ایک بچے کے بارے میں یہ

بات ناپسند نہیں کرتا کہ وہ نصیحت کرنے والے کی بات سے انکار کرتا ہے یا اسے تکلیف پہنچاتا ہے، اس لیے کہ وہ جاہل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے رحم والے دل کا آدمی اس پر شفقت کرتا ہے اور اس کی برائی کی بنا پر اس کا مواخذہ نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (الاعراف ۷:۱۹۹) نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ اُلجھو۔

رحم: عفو ودرگزر کا ذریعہ

۵۶۷- جب تک ایک داعی اپنے مخاطب کو رحمت اور شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو وہ اپنے معاملے میں اس کے ساتھ عفو ودرگزر سے پیش آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (الاعراف ۷:۱۹۹) نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کا تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ اُلجھو۔

جب اپنے مخاطب کے معاملے میں داعی کی یہ شان ہے، جن سے بے رخی اور اذیتوں کا امکان ہوتا ہے تو اپنے ساتھیوں کے معاملے میں اس کا عفو ودرگزر اور زیادہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران ۳:۱۵۹) ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو۔

ترش روئی: ذریعۂ نفرت

۵۶۸- وہ داعی جو رحمت سے خالی ہو اور دل کا سخت ہو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا اور لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اگر چہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ حق اور سچ ہی ہو۔ یہ لوگوں کی فطرت ہے کہ وہ سخت مزاج، ترش رو اور غصیلے آدمی سے دور بھاگتے ہیں اور اس کی بات کو قبول نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ناصح کی بات کو ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ مخاطب کا دل اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حالانکہ جب آدمی کی طبیعت سخت ہو اور مزاج ترش ہو تو اس کی طرف لوگوں کی توجہ حاصل نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران ۳:۱۵۹) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع

ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ تمھارے گرد وپیش سے چھٹ جاتے۔

اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ ہوسکتا ہے کہ خشونت کی وجہ سے لوگ ان سے متنفر ہو سکتے تھے، حالانکہ رسول کی زبان پر حق کے سوا کچھ آتا ہی نہیں، تو ایک عام داعی کے بارے میں یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ سخت مزاج اور ترش رو ہو اور پھر بھی لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔

چنانچہ داعی الی اللہ کو اپنے رب سے ڈرنا چاہیے، اور اگر وہ فطرتاً رحیم وشفیق نہیں ہے تو اس کو تکلف سے اپنے اندر رحم وشفقت پیدا کرنا چاہیے۔ ان کو چاہیے کہ اپنے برے اخلاق، ترش روئی، سخت مزاجی اور یاوہ گوئی سے لوگوں کو اسلام سے متنفر نہ کریں۔ اگر کوئی شخص اپنے اندر رحمت اور شفقت پیدا نہیں کرسکتا اور اپنے آپ کو اسلامی اخلاقیات کا پابند نہیں بنا سکتا تو اس کے لیے اور خود دعوت کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ وہ دعوت کا کام چھوڑ دیں اور اپنے نفسیاتی علاج پر توجہ دیں۔

۴۔تواضع

تکبر: حماقت اور جہالت

۵۶۹۔تکبر ایک حماقت اور جہالت ہے۔ تکبر ایک متکبر شخص کے لیے اس بات کی ایک دلیل قطعی ہے کہ وہ اپنے رب سے بھی جاہل ہے اور اپنے آپ سے بھی۔ اگر یہ اپنے رب کو پہچانتا تو یقیناً اسے معلوم ہوتا کہ تکبر صرف اس اللہ کے لیے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلْعِزُّ إِزَارِيْ وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ، فَمَنْ يُنَازِعُنِيْ فِيْ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا فَقَدْ عَذَّبْتُهُ. عزت میرا لباس اور تکبر میری چادر ہے، جو شخص ان میں کسی کو بھی مجھ سے چھینتا ہے میں اسے عذاب دوں گا۔[1]

اگر متکبر نے اپنے آپ کو پہچانا ہوتا، کہ اس کا آغاز نطفے سے ہوا، جو گندے پانی کی ایک بوند تھی اور اس کا انجام ایک ناقابل برداشت لاش ہے، تو اسے شرمندگی محسوس ہوتی اور وہ اپنی حدود میں رہتا۔ محمد بن حسین بن علیؒ فرماتے ہیں: جس کے دل میں کچھ بھی تکبر داخل ہوتا ہے تو جس قدر اس میں تکبر پیدا ہوگا اسی قدر اس سے عقل کم ہوگی۔

۱۔ ریاض الصالحین، ص۲۱۶

متکبرین کی سزا

۵۷۰۔متکبر کی سزا یہ ہے کہ وہ نصیحت پکڑنے سے محروم ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے کوئی عبرت نہیں لے سکتا۔ اس لیے کہ تکبر اسے اس بات سے روکتا ہے کہ وہ حق بات کو غور سے سنے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے، اسے اپنی آیات سے دور کر دیتا ہے، اور اس کا نتیجہ ناکامی و نامرادی اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی شکل میں نکلتا ہے۔ اس سے وہ جہنم میں داخل ہوتا ہے اور جنت کی ان نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے جو متواضع لوگوں کو اپنے رب کی طرف سے ملنے والی ہیں۔ ان معانی کو قرآن کریم اور سنت رسول نے اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَأَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (الاعراف ۷:۱۴۶) میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (المومن ۴۰:۳۵) اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ. (المومن ۴۰: ۶۰) جو لوگ گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَّالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (القصص ۲۸:۸۳) وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں۔ اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لَايَزَالُ الرَّجُلُ يَذْهَبُ بِنَفْسِهِ حَتّٰى يُكْتَبَ فِي الْجَبَّارِيْنَ فَيُصِيْبُهُ مَا أَصَابَهُمْ. ایک آدمی تکبر کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اس کا نام متکبرین میں لکھ دیا جاتا ہے، چنانچہ اس کا وہی انجام ہو جاتا ہے جو متکبرین کا ہوتا ہے۔

آپؐ نے یہ بھی فرمایا: لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ. وہ شخص جنت میں نہیں جا سکتا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو۔

اسی طرح ارشاد ہے: أَلا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُّسْتَكْبِرٍ. میں تمھیں بتاؤں کہ جہنم والے کون ہیں؟ ہر وہ شخص جو روکھا، اکڑ کر چلنے والا اور متکبر ہو۔

تکبر کی ممانعت

۵۷۱- ہم نے جو آیات و احادیث ذکر کی ہیں ان سب کے ضمن میں یہ بات موجود ہے کہ تکبر ممنوع ہے، مگر ان کے علاوہ کچھ نصوص ایسی بھی ہیں جن میں تکبر کی صریح ممانعت آئی ہے۔ ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَلا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (لقمان ۳۱:۱۸) اور لوگوں سے گال نہ پھلانا اور نہ زمین میں اکڑ کر چلنا۔ اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔

تکبر کی حقیقت

۵۷۲- ایک حدیث شریف میں آیا ہے، جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ. تکبر حق کی تردید اور لوگوں کی تحقیر کا نام ہے۔

چنانچہ تکبر کی حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ متکبر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور دوسروں کی قدر کو گھٹاتا ہے۔ یہ چیز اسے کمینگی اور تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔

چنانچہ متکبر آدمی حق کی تردید کرتا ہے، نہ اسے قبول کرتا ہے اور نہ اس پر کوئی دھیان دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل ۲۷:۱۴) انھوں سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کو انکار کیا، حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔

وہ اپنی غلطی اور کوتاہی اور بدعملی کا اعتراف نہیں کرتا۔ کیوں کہ وہ اپنے آپ سے متاثر ہوتا ہے۔ حدیث

میں آیا ہے:

ثَلاثٌ مُّهْلِكَاتٌ: شُحٌّ مُّطَاعٌ، وَّهَوًى مُّتَّبَعٌ، وَّإِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهِ. تین چیزیں تباہ کن ہیں: حرص وہوا، جن کی پیروی کی جائے، اور آدمی کا اپنے آپ سے متاثر ہونا۔

متکبر شخص لوگوں کی تحقیر کرتا ہے، اور اس کے دل میں ان کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ وہ اس بات سے انکاری ہوتا ہے کہ لوگوں سے ان چیزوں کے بارے میں پوچھے جن کا اسے علم نہیں ہوتا، نہ وہ کسی نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو قبول کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ اسے کوئی چیز سمجھتا ہی نہیں۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس کی تعریف میں رطب اللسان ہونا چاہیے۔ وہ لوگوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ گفتگو کرنے سے ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہی کامیاب اور باقی سارے لوگ معرض ہلاکت میں ہیں۔ تکبر کے اس طرح کے اور بہت سے آثار ونتائج ہیں۔

تکبر کا سبب

۵۷۳- تکبر کا سبب یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ سے متاثر ہوتا ہے، یا تو اپنے علم کی بنا پر، یا مال وجاہ، حسب نسب اور اقتدار وغیرہ چیزوں کی وجہ سے، جو خود پسندی پر آمادہ کرتے ہیں۔ مگر خود پسند آدمی یہ بات بھول جاتا ہے کہ یہ چیزیں اس کو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں اور اگر وہ چاہے تو یہ نعمتیں واپس بھی لے سکتا ہے۔ بہر حال یہ خود پسندی اسے اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا خیال کرے، اس کی قدر ومنزلت کو لوگوں سے اوپر سمجھے اور ان کی تحقیر کر کے اپنی آنکھوں سے گرائے۔

تکبر کا علاج

۵۷۴- اس مہلک اور پریشان کن بیماری کا علاج اور حقیقی تواضع کا حصول یقینی معرفت کے ساتھ ممکن ہے: اپنے رب کی معرفت اور اپنی ذات کی معرفت کے ساتھ۔ وہ یہ معرفت حاصل کرے کہ کبریا صرف اور صرف اللہ کے لیے ہے۔ کسی انسان کے لیے یہ بالکل جائز نہیں ہے کہ اس کے دل میں تکبر کا ایک ذرہ بھی سرایت کرنے پائے۔ اس لیے کہ یہ ایک خطرناک اور ہلاکت خیز وائرس ہے۔ یہ بہت کثرت سے انڈے بچے دیتا ہے اور ایمان کے نور کو ماند کر دیتا ہے۔ یہ اعمال کو مکدر کر کے انھیں ضائع کر دیتا ہے۔

تکبر کا ایک علاج یہ ہے کہ متکبر شخص اپنی ذات کی معرفت حاصل کرے۔ اس کا آغاز نطفے سے ہوا اور

آنے والے وقت میں یہ مٹی کا ایک ڈھیر بننے والا ہے۔اس کے پاس جتنا بھی مال وجاہ اور اقتدار ہے وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔اگر وہ چاہے تو یہ سب کچھ اس سے چھن سکتا ہے۔اپنے نفس کے بارے میں اس کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

اس طرح متکبر اپنی خود پسندی اور تکبر کے اسباب کو ایک ایک کر کے توڑ دے۔ چنانچہ اگر علم ہے تو وہ اس کے پاس اس کی جہالت کے مقابلے میں انتہائی کم ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۸۵) تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔

دنیا میں اس سے بڑے بڑے علما موجود ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (یوسف ۱۲:۷٦) اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔

جب یہ بات ہے تو خود پسندی اور تکبر کس لیے؟ علم حقیقی تو وہ ہوتا ہے جو رب تعالیٰ کی معرفت کا پھل دیتا ہے، نفس کو تکبر جیسی حماقتوں سے بچاتا ہے اور اسے تواضع جیسی اچھی عادتوں کا عادی بناتا ہے۔رہی وہ عبادت، اور تقویٰ و پرہیز گاری جسے متکبر آدمی انجام دیتا ہے تو وہ بھی خود پسندی کا، اللہ کے ہاں ناز نخرے کا اور مخلوق پر تکبر کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔اس لیے کہ اس بے چارے کو کیا معلوم کہ اس کی عبادت قبول بھی ہوئی ہے اور اس کا نام صالحین میں لکھا گیا ہے یا نہیں۔خاتمہ ابھی مجہول ہے اور اپنے نفس کو پاکیزہ قرار دینا ممنوع ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم ۵۳:۳۲) اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو، وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے۔

عبادت تو بندے پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔بندے کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اللہ پر اس کا احسان جتائے، یا اس کی بنا پر کسی دوسرے پر اپنی بڑائی کا دعویٰ کرے۔اس لیے کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کا حق تھا۔پھر اللہ ہی نے اس کو توفیق دی اور اس کی طرف رہنمائی کی۔اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ (الاعراف ۷:۴۳) تعریف خدا ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا، ہم خود راہ نہ پاسکتے تھے اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا۔

یہ کیا تقویٰ ہوگی جو اپنے صاحب کو کبریا جیسے اللہ تعالیٰ کے ایک خالص حق میں بھی اس کے ساتھ جھگڑنے سے نہ روکے اور اپنے صاحب کو ایک ایسے عمل میں لت پت ہونے سے بھی نہ بچا سکے جس نے ابلیس کو فرشتوں کی صف سے نکال کر، تا قیامت ملعون اور دھتکارا ہوا بنایا۔ ابلیس نے جس وقت حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا تو اس کی وجہ بھی تکبر اور خود پسندی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا قول اس طرح نقل کیا ہے: أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (الاعراف ۷:۱۲) میں اس سے بہتر ہوں۔

یہی بات مال اور اقتدار، افرادی قوت اور اعوان وانصار کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے اور یہی معاملہ حسب ونسب کے فخر کا ہے۔ یہ سب کچھ باطل ہے اور شیطان کے وسوسے کا نتیجہ ہے۔ مال تو آنی جانی چیز ہے اور اقتدار دائمی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ زمانے کی الٹ پھیر جاری ہے۔ اور جاہ وجلال کا بھی یہی معاملہ ہوتا ہے۔ اسی طرح افرادی قوت اور اعوان وانصار کی کثرت اللہ کے مقابلے میں کسی کام نہیں آ سکتی۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا (التوبۃ ۹:۲۵) ابھی غزوۂ حنین کے روز (اس کی دست گیری کی شان تم دیکھ چکے ہو)۔ اس روز تمھیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا مگر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی۔

حسب ونسب پر فخر کا مطلب تو یہ ہے کہ آدمی بوسیدہ ہڈیوں پر فخر کر رہا ہے، بشرطیکہ کوئی ہڈی موجود تو ہو۔ اگر آباؤ اجداد نیک لوگ بھی ہوں تو وہ اپنی نااہل اولاد کے کس کام آ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ. قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ. قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُن مِّنَ الْخَاسِرِينَ (ہود ۱۱:۴۵)

نوحؑ نے اپنے رب کو پکار کر کہا: ''اے رب! میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔'' جواب میں ارشاد ہوا: ''اے نوحؑ! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔ لہٰذا تو اس بات کی مجھ درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے۔'' نوحؑ نے فوراً عرض کیا: ''اے میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔''

تواضع کی اہمیت

۵۷۵- جب ہم نے تکبر اس کے اسباب اور اس کے بعض نتائج وآ ثار بیان کر دیے ہیں تو اس سے ہمارے سامنے تواضع کی حقیقت واضح ہوگئی ہے۔ اس لیے کہ یہ تکبر کی ضد ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور نفس کی معرفت کا ثمرہ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک انسان نے اپنے رب کی معرفت حاصل کی ہو اور اپنے آپ کو پہچان لیا ہو اور وہ تکبر کرے اور تواضع نہ کرے۔ اس بنا پر اگر ایک طرف متکبر شخص اپنے رب سے جاہل ہوتا ہے تو متواضع شخص اپنے رب کا عارف ہوتا ہے۔ اگر متکبر دوسروں کی تحقیر کرتا ہے اور انھیں ایک مکھی کے برابر، بلکہ اپنے غلاموں جیسا سمجھتا ہے۔ تو متواضع شخص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ ''مسلمانوں میں کوئی کسی کو حقیر نہ سمجھے، اس لیے کہ مسلمانوں میں سے ایک حقیر بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا ہوتا ہے۔

اگر متکبر شخص نیک لوگوں کے ساتھ اور فقیروں اور کمزوروں کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کرتا ہے، خواہ ان میں سے ہر شخص اس متکبر جیسے بے شمار لوگوں سے بھی بہتر ہے، بہر حال ایک متواضع شخص اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا ہے کہ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ (الکہف ۱۸:۲۸) اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح وشام اسے پکارتے ہیں، اور ان سے نگاہ ہرگز نہ پھیرو۔

مفسرین اس آیت کی شان نزول کے بارے میں کہتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: ہم اس بات پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں کہ صہیبؓ، عمارؓ، بلالؓ اور خبابؓ جیسے کمزور لوگوں کی پیروی کریں۔ تم ایسا کرو کہ ان کو اپنے ہاں سے بھگا دو اور انھیں اپنی مجلس میں نہ رہنے دو، تب ہم تیری مجلس میں آئیں گے۔ جب ہم فارغ ہو کر نکلیں گے اس کے بعد اگر تم چاہو تو ان کو اپنے پاس بلا سکتے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی اور اس کے بعد ان متکبرین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف ۱۸:۲۸) کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو، جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریقہ افراط وتفریط پر مبنی ہے۔

ایک متواضع شخص اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مفہوم بھی اچھی طرح جانتا ہے: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ

لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (الشعراء۲۶:۲۱۵)اور ایمان لانے والوں میں سے جو تمھاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔

اگر متکبر شخص حق سے انکار کرتے ہوئے اس کی تردید کرتا ہے اور اسے کوئی حیثیت نہیں دیتا تو دوسری طرف ایک متواضع مسلمان اسی طرح کے ایک عارف اور متواضع مسلمان کے اس قول کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جب ان سے تواضع کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا: تواضع یہ ہے کہ تم حق کے آگے جھک جاؤ اور اس کے آگے سرِتسلیم خم کردو۔ اگر تم اس حق کو دنیا کے جاہل ترین آدمی سے سنو، تب بھی اس کو قبول کرو۔

داعی کو تواضع کی ضرورت

۵۷۶- داعی الی اللہ تواضع کی صفت کا دوسرے لوگوں سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگوں سے میل جول رکھتا ہے، انھیں حق کی طرف اور اسلامی اخلاق کی طرف بلاتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ کام کیسے کرسکے گا اگر وہ خود ہی تواضع سے عاری ہو، جو اسلامی اخلاقیات میں سے ایک بنیادی صفت ہے۔

پھر لوگوں کی طبیعت، جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہوتا ہے، یہ بھی ہے کہ وہ اس شخص کی بات کو قبول نہیں کرتے جو اُن کے سامنے بڑا بنتا ہے، ان کی تحقیر کرتا ہے اور انھیں چھوٹا سمجھتے ہوئے ان کے اوپر اپنی بڑائی جتاتا ہے، اگرچہ اس کی بات حق اور سچ ہی کیوں نہ ہو۔

یہ لوگوں کی فطرت ہے کہ وہ متکبر سے نفرت کرتے ہیں اور اس کی باتوں، اس کی وعظ ونصیحت اور دعوت و ارشاد کے لیے اپنے دلوں کے دروازے بند کرلیتے ہیں۔ چنانچہ اس متکبر داعی کی باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ان کے دلوں تک نہیں پہنچتی۔ بلکہ کبھی تو وہ ان کے دلوں میں حق ہی کی ناپسندیدگی کا ذریعہ بن جاتی ہیں، خواہ حق اس داعی کی طرف سے آئے یا کسی اور کی طرف سے۔ اس لیے داعی کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اسے اللہ کا خوف کرنا چاہیے اور لوگوں کے لیے دعوت الی اللہ سے متنفر ہونے کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے۔

یہاں ہم ایک اور بات کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں جس کا اس مقام کے ساتھ تعلق بھی ہے اور اس کی بڑی اہمیت بھی ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کی یہ بھی ایک طبیعت ہوتی ہے کہ وہ اس شخص کو پسند نہیں کرتے جو ہر وقت اپنے

بارے میں گفتگو کرتا ہے، اپنی تعریفیں کرتا ہے اور یہ لفظ بہت استعمال کرتا ہے کہ میں، میں، میں۔ اس لیے داعی کو اس سے بھی اجتناب کرنا چاہیے اور اسے کسی ایسی بات کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے جو اس کی تعلّی پر دلالت کرے، جیسے اپنے بارے میں زیادہ علم، فصاحت یا سمجھ داری کا دعویٰ۔

داعی کے لیے ضروری ہے کہ سمجھے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف اور صرف اللہ کے فضل سے ہے۔ چنانچہ وہ جب لوگوں سے گفتگو کرے تو اسی یقین اور اسی شعور کے ساتھ کرے۔ وہ ان سے اپنے نفس کے فضل وکمال کے بجائے اللہ کے فضل کی بات کرے۔ جب لوگ اس کی طرف سے یہ طرزِ عمل دیکھیں گے تو وہ اپنے دلوں کے دروازے اس کے لیے کھولیں گے، یا کم از کم اس کی گفتگو کے وقت وہ ان کو بند نہیں کریں گے۔ اگر اللہ کو منظور ہو تو اس طرح وہ ان کے دلوں میں پاکیزہ تعلیمات کی روح پھونکے گا۔ اور داعی اس میں بھی اللہ ہی سے مدد کا خواستگار ہوگا۔

۴۱۰- تواضع کی ایک بڑی قسم، جس سے عام طور پر داعیانِ حق غفلت برتتے ہیں، حالانکہ وہ بہت اہم اور ضروری ہے، یہ ہے کہ ان لوگوں کی اطاعت کرے جن کی اطاعت کا شریعت نے حکم دیا ہے، جیسے حکمران اور وہ لوگ جو اس کے معاملات، یا تعلیم وتربیت کے نگران ہوں۔ داعی کو چاہیے کہ اس اطاعت سے انکار نہ کرے، اس کے بارے میں اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کرے اور دل میں چھپی ہوئی کسی قسم کی بڑائی اس کے لیے اس اطاعت میں رکاوٹ نہ بنے، کہ وہ اس اطاعت کو مسترد کرے، اسے اپنے لیے بوجھ سمجھے یا غلط قسم کی تاویلوں سے اس سے راہِ فرار اختیار کرے۔ اس لیے کہ یہ دراصل شیطان کے وسوسے ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہے کہ یہ امیر یا یہ معلم اچھا نہیں ہے، یا اس کام کے لیے مناسب نہیں ہے، یا چھوٹا ہے، یا میں اس سے زیادہ جانتا ہوں، یا اس کام کے لیے زیادہ مناسب ہوں، یا یہ معلم تعلیم دینے کا اہل نہیں ہے اور اس طرح کی کئی باتیں۔ وہ اچھی طرح ذہن نشین کرے کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کو جو ایک نوخیز جوان تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر کا امیر مقرر کیا، جس میں مہاجرین اور انصار کے بڑے بڑے سردار اور بزرگ شامل تھے۔

اس واقعے کے بارے میں اِمتاع الأسماع کے مصنف فرماتے ہیں:

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منگل ۲۷ صفر کو حضرت اسامہ بن زیدؓ کو بلا کر فرمایا: اے اسامہ! اللہ کا نام لے کر چلو اور اس سے برکت کی دعا کرو۔ جب تم اپنے والد کی جائے شہادت پر پہنچو تو ان لوگوں کو

اپنے گھوڑوں سے کچل دو۔ میں نے تمھیں اس لشکر کا امیر مقرر کر دیا..... بدھ کے دن آپ کی بیماری میں شدت آئی۔ سر درد کے ساتھ بخار بھی تھا۔ جمعرات کو پرچم اسلام اسامہ بن زیدؓ کے حوالے کیا اور فرمایا: اے اسامہ! اللہ کے نام سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں ان سے لڑو، مگر کسی کو دھوکہ نہ دو۔ کسی بچے اور عورت کو قتل نہ کرو۔ دشمن کا سامنا کرنے کی دعا نہ کرو۔ اس لیے کہ تمھیں معلوم نہیں، ممکن ہے کہ آزمائش میں پڑ جاؤ۔ البتہ تم یہ کہو: ''اے اللہ! ہماری طرف سے تو ان کے لیے کافی ہو جا اور ان کے شر سے ہمیں بچا۔'' اگر ان کے ساتھ سامنا ہو ہی جائے اور وہ تم پر حملہ کر کے تمھیں پریشان کریں تو اطمینان وسکون اور خاموشی سے ان کا مقابلہ کرو۔ آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ تم بزدل بن جاؤ گے اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ اور کہو: ''اے اللہ! ہم تیرے بندے ہیں۔ ہماری اور ان کی جانیں تیرے ہاتھ میں ہیں اور یقیناً تو اُن پر غالب ہے۔'' اور جان لو کہ جنت چمکتی ہوئی تلواروں کے نیچے ہے۔[1]

اس کے بعد اِمتاع الأسماع کے مصنف بیان کرتے ہیں کہ بعض لوگوں نے حضرت اسامہؓ کے امیر لشکر ہونے کے بارے میں بات کی، کہ وہ نوجوان ہے، اسے کوئی تجربہ نہیں ہے اور اس لشکر میں مہاجرین وانصار سب شامل ہیں۔ جس نے یہ بات کی تھی، حضرت عمرؓ نے اس کی تردید کی اور بعض لوگوں کی یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے سخت غصہ آیا۔ چنانچہ آپؐ باہر نکلے، آپؐ کے سر پر ایک پٹی باندھی ہوئی تھی۔ منبر پر چڑھ کر آپؐ نے حمد وثنا کے بعد فرمایا:

اے لوگو! یہ کیا بات ہے جو میرے اسامہ کو امیر لشکر مقرر کرنے کے بارے میں تمھاری طرف سے مجھ تک پہنچی ہے؟ اگر تم نے اس کی امارت میں کوئی بات کرنا تھی تو اس سے پہلے اس کے والد کی امارت میں بھی کرتے، یہ تو یقیناً امارت کا اہل ہے، اگرچہ اس کا والد بھی اس کے لیے نا اہل نہیں تھا۔[2]

میں نے حضرت اسامہؓ کا قصہ پوری تفصیل سے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس میں کئی دلالتیں، کئی عبرتیں، کئی نصیحتیں اور کئی احکام ہیں۔ آخر میں مَیں یہ کہتا ہوں کہ اگر داعی سمجھ دار ہو تو اس کو جوں جوں دعوت کے کام کی توفیق ملتی ہے، جوں جوں اس کی مساعی میں اسے کامیابی ملتی ہے اور جوں جوں اللہ تعالیٰ اپنے

۱- اِمتاع الأسماع، ص ۵۳۶-۵۳۷

۲- سیرت ابن ہشام، ص ۲۵۷-۲۵۸، اِمتاع الأسماع، ص ۵۳۷

دشمنوں کے مقابلے میں اس کی مدد کرتا ہے، توں توں اس کے تواضع میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب فاتح بن کر مکہ میں داخل ہوئے تو آپؐ کا سر مبارک اپنے رب کے حضور تواضع کی وجہ سے اور اس کے فضل کے اعتراف کے طور پر جھکا ہوا تھا۔

۵- میل جول اور گوشہ گیری

۵۷۸- مسلمان کے لیے کون سی چیز افضل ہے، لوگوں کے ساتھ میل جول، یا ان سے گوشہ گیری اختیار کرنا؟ اس کے بارے میں بعض کہتے ہیں کہ گوشہ گیری افضل ہے، اور اکثر کہتے ہیں کہ میل ملاپ افضل ہے۔ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان میں سے جو چیز اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسندیدہ ہو وہی زیادہ افضل ہے۔ اگر ایک مسلمان کے بارے میں اس کے حالات وظروف اور اس کے زمان ومکان کے لحاظ سے اس کا میل ملاپ اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہو وہی اس کے حق میں افضل ہوگا اور اگر اس کے احوال وظروف اور زمان ومکان کے لحاظ سے گوشہ گیری اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسندیدہ ہو تو اس کے حق میں گوشہ گیری افضل ہوگی۔

میل جول ضروری ہے

۵۷۹- میل جول تو ایک ایسی چیز ہے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان طبعی طور پر اجتماعیت پسند ہے۔ وہ اکیلے زندگی نہیں گزار سکتا۔ اگر کوئی انفرادی زندگی گزار سکتا ہے تو ایسا شاذ ہی ہوگا، جس کی پیروی سارے لوگ نہیں کر سکتے۔

یہ معاملہ تو دنیا کے معاملات اور اس کی ضروریات کے حوالے سے ہے۔ رہا دینی امور کا معاملہ تو وہ بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اسلام کے فرائض اور مستحبات میں ایسی چیزیں شامل ہیں جنھیں دوسروں کے ساتھ میل ملاپ اور ان کے تعاون کے بغیر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً نماز جمعہ، عیدین، نماز جنازہ، مریض کی عیادت، دینی معاملات کو سیکھنا اور اسے دوسروں کو سکھانا اور اس طرح کے دوسرے بے شمار شرعی مطالبات ہیں جنھیں دوسروں سے میل ملاپ کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

داعی کے لیے میل جول کی ضرورت

۵۸۰- دعوت الی اللہ اسلام کے واجبات میں سے ہے اور لوگوں کے ساتھ میل جول اس کا اہم ترین

ذریعہ ہے۔ چنانچہ لوگوں کے ساتھ اختلاط واجب قرار پاتا ہے۔ کیوں کہ جس چیز کے بغیر کسی واجب کی ادائیگی ممکن نہ ہو وہ چیز بھی واجب بن جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی طبیعت بھی میل جول کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لیے کہ اسلام کی تعلیم فرد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ مسلمان کا کام اس کے نفس سے باہر بھی ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب سے اللہ تعالیٰ نے نبوت سے مشرف فرمایا اور آپ کو اپنی تبلیغ کا حکم دیا، تب سے آپؐ لوگوں کے درمیان رہے، ان سے میل ملاپ رکھا اور ان کی مجلسوں کو زینت بخشی۔ آپؐ ان کو اللہ کی طرف بلاتے رہے اور ان کو ان برائیوں سے منع فرماتے رہے جن میں وہ پڑے ہوئے تھے۔ یہی طریقہ آپؐ کے صحابہ کرام کا تھا۔ وہ بھی لوگوں سے میل ملاپ رکھتے تھے اور ان کے اندر اسی ہدایت، اسی دین اور اسی علم کی اشاعت کرتے تھے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھتے تھے۔

بعض تابعین کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ وہ گوشہ گیری کو پسندیدہ قرار دیتے تھے اور اختلاط کو ناپسند کرتے تھے۔ اس معاملے کا تعلق بعض مخصوص احوال اور استثنائی صورتوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ انھوں نے جس بات کا ذکر کیا ہے وہ کوئی عمومی قاعدہ نہیں ہے، کہ ان کے بعد بھی مسلمانوں سے ان پر چلنے کا مطالبہ کیا جائے۔ اس لیے کہ دعوت الی اللہ کا کام شریعت میں ثابت ہے، میل جول دعوت الی اللہ کا پہلا قدم ہے۔ اس لیے اس سے لاتعلق ہو جانا ممکن نہیں ہے۔

ہمارے دور میں تو یہ فریضہ گذشتہ کسی بھی دور سے زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ اس لیے کہ انسان کو مادیت کی اندھی تہذیب کی سخت خطرناک مصیبت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، جس نے حق کے انوار کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے اور اللہ کے ساتھ ان کے تعلق کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ اس سے ہر مسلمان پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ اپنی وسعت کے مطابق دعوت الی اللہ کے کام میں اپنا حصہ ڈالے۔ اس کے لیے لوگوں سے میل جول ضروری ہے تا کہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا جا سکے۔

ضروری میل جول کی حدود

۵۸۱- ضروری میل جول وہ ہے جو دعوت الی اللہ کے کاموں اور دوسروں کو اسلامی احکام کی تبلیغ کے

لیے ضروری ہو۔ اگر اختلاط اس مقصود سے خالی ہو تو اس سے 'ضروری' ہونے کی صفت زائل ہو جائے گی اور یہ اختلاط مباح، یا مکروہ، یا پھر حرام بن جائے گا۔ مباح اختلاط کی مثال یہ ہے کہ آدمی کسی مباح دنیوی مقصد کے لیے لوگوں سے میل جول رکھے۔ مکروہ اختلاط وہ ہے جو داعی کے کسی اخروی فائدے کو ضائع کر دے اور حرام اختلاط وہ ہے جو داعی کو کسی گناہ پر مجبور کر دے۔ اس وجہ سے داعی سے توقع کی جاتی ہے کہ اس کا میل جول ہمیشہ دعوت الی اللہ کے محرک کی وجہ سے ہو۔ چنانچہ وہ جب بھی کسی آدمی سے ملے، تعارف کرے، دوستی کرے، سفر میں ساتھ دے، بھائی چارہ اختیار کرے، نشست و برخاست کرے یا کسی مجمع میں گفتگو کرے تو اس کے یہ سارے کام دعوت الی اللہ کے محرک اور اس کے لیے تیاری کی نیت سے ہوں۔

نفرت ہو کہ الفت' رب کے لیے

۵۸۲- داعی جب لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان سے تعلقات قائم کرتا ہے تو اس کی بنیاد الحب فی اللہ اور البغض فی اللہ پر ہو۔ یعنی انسان اگر کسی کے ساتھ محبت کرتا ہے تو اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کا مطیع ہے اور اس کی رضامندی کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ اور اگر کسی سے بغض رکھتا ہے تو اس لیے کہ وہ نافرمان شخص ہے اور وہ اپنے رب کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان کی محبت جس قدر اپنے رب سے بڑھتی ہے اسی قدر ان لوگوں سے بھی بڑھتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے محبّ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ محبت باہمی دوستی، مدد و نصرت اور جان و مال سے اس کی حمایت و حفاظت میں بدل جاتی ہے۔

ہم یہ جو بات کہہ رہے ہیں یہ محض خیال اور افسانہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک انسان اگر کسی سے محبت کرتا ہے تو اُسے اپنے محبوب کے پسندیدہ لوگوں سے بھی محبت ہوتی ہے۔ یہ اُن کی خدمت کرتا ہے اور ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے۔

جب یہ بات لوگوں کے ہاں معروف ہے، تو ایک مسلمان کی اپنے رب سے اور اس کے اولیا سے محبت کا معاملہ تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ اس کی نیکیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی، تو ایک مسلمان اس کے نیک عمل کی وجہ سے اس کے ساتھ محبت کرتا ہے اور برائیوں کی وجہ سے اس سے نفرت کرے۔

داعی کے بہترین ہم نشین

۵۶۳- جب داعی کی الفت ونفرت اللہ کے لیے ہوتی ہے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ اپنی ہم نشینی، رفاقت اور بھائی چارے کے لیے ایسے ہی لوگوں کو منتخب کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار اور اس کی بندگی کا حق ادا کرنے والے ہوں۔ یہ اس کے لیے بہترین رفیق اور 'پیارے بھائی' ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ داعی کا تعلق بڑا مضبوط ہوتا ہے، انھی کے ساتھ وہ عزت محسوس کرتا ہے اور ان کے ساتھ دوستی کو نبھاتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی دوستی کو مسترد کردیتا ہے جو اللہ کے نافرماں، فاسق وفاجر اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑنے والے ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَأَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (النجم۵۳:۲۹) پس اے نبیؐ! جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے، اور دنیا کی زندگی کے سوا جس کا کچھ مطلوب نہیں ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔

مگر فاسق اور نافرمان لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور میل جول کو مسترد کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ ان کو اللہ کی طرف بھی نہیں بلائے گا، یا ان کے لیے ہدایت، رحمتِ خداوندی اور سیدھے راستے پر آنے کی دعا بھی نہیں کرے گا۔

دوست اور دشمن سے داعی کا رویہ

۵۸۴- داعی کو ہم نشینوں کے حقوق کا علم ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو انھیں پورا کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ مثلاً اپنے دوستوں کے دکھ درد میں شرکت، ان کی ضروریات کا خیال، ان کے عیوب پر خاموشی اختیار کرنا، الا یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے طور پر اس کے بیان کے بغیر چارہ نہ ہو۔ وہ اپنے بارے میں ان کی برائیوں کو برداشت کرتا ہے اور ان کے اعذار کو قبول کرتا ہے۔ اس لیے کہ ایک شریف مومن کا کام یہ ہے کہ وہ دوسروں کے احسانات کو یاد رکھتا ہے، جب کہ کمینہ منافق دوسروں کے عیوب پر نظر رکھتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن المبارکؒ فرماتے ہیں: مومن اپنے بھائی کے اعذار ڈھونڈتا ہے اور منافق اس کی کوتاہیوں کی تلاش میں ہوتا ہے۔

۵۸۵- داعی جس آدمی سے اس کے فسق اور نافرمانی کی وجہ سے دوستی اور رفاقت نہیں رکھتا تو اس کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایک مومن کا رویہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ لڑتا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
وَإِذا خاطبهُمُ الجاهِلُونَ قالُوا سَلامًا (الفرقان۲۵:۶۳) اور جب جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔

داعی اس کے ساتھ خیر خواہی کرتا ہے اور اس کو نصیحت کرتا ہے۔ بعض اوقات اگر اس کی معصیت کا تقاضا ہو تو وہ اس بات پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ قطع تعلق کرے۔ مثال کے طور پر وہ ایسا شخص ہو جو دین میں کسی بدعت کی طرف دعوت دے رہا ہو، یا مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرتا ہو، ان کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہو یا ان پر کوئی مصیبت لانے کے لیے کام کر رہا ہو یا ان پر ظلم و زیادتی کے لیے کوشاں ہو۔

اس حالت میں جب داعی اس کے اعذار معلوم کر لیتا ہے، اس کی نصیحت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا، مگر پھر بھی وہ اپنے طرز عمل سے باز نہ آئے، تو داعی اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس سے قطع تعلق کرے اور اس سے بات تک نہ کرے۔

یہ قطع تعلق ان کی سرکشی، ان کی سازشوں اور ان کی ظلم و زیادتی پر انھیں جھڑکنے کے لیے ہوتا ہے تاکہ لوگ ایسے شخص سے پہلو تہی کریں، اسے پہچان لیں اور اس سے محتاط رہیں۔ بلکہ داعی کو چاہیے کہ اگر وہ اسے سلام کرے تو اس کا جواب بھی نہ دے۔ اس کا مقصد بھی ان کو جھڑکنا اور ان کے اس کام پر نکیر کرنا ہوتا ہے۔

سلام کا جواب دینا اگرچہ ایک حدیث کی رو سے واجب ہے، مگر امام غزالیؒ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگرچہ سلام کا جواب دینا واجب ہے مگر کسی مصلحت کی خاطر ایک ادنیٰ مقصد کے لیے بھی اس کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ جب انسان حمام میں ہو یا قضائے حاجت کر رہا ہو تب بھی سلام کا جواب دینے کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ اور کسی کو ایک برائی پر جھڑکنا ان چیزوں سے زیادہ اہم مقصد ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصد لوگوں کو برائی سے متنفر کرنا ہوتا ہے۔[1]

۱- اِحیاء العلوم للغزالی، ج ۲، ص ۱۴۹

یہی بات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے بھی بیان کی ہے۔[1]

داعی کی گوشہ گیری

۵۸۶- اگر ایک طرف اختلاط دعوت الی اللہ کے مقدمات میں سے ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا، داعی کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، تو دوسری طرف داعی کو کسی حد تک گوشہ گیری، خلوت اور اکیلے پن کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جیسا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ایک بندے کے لیے کچھ ایسے اوقات کے بغیر کوئی چارہ نہیں، جن میں وہ دعا، ذکر واذکار، نماز، محاسبۂ نفس اور اصلاحِ قلب کے لیے خلوت اختیار کرے۔[2]

اس گوشہ گیری میں دو چیزوں کا لحاظ ضروری ہے:

۱- یہ گوشہ گیری ایسے اوقات میں ہو جن میں شریعت نے کسی خاص قسم کی عبادت کو مستحب قرار دیا ہو۔ جیسے رمضان میں اعتکاف اور قیام اللیل، اس میں تلاوت کرنا، نماز کے انتظار میں مسجد کے اندر قیام کرنا وغیرہ۔ چنانچہ ان اوقات میں قیام کرنا اور نماز، ذکر اور دعائیں کرنا گوشہ نشینی اور جائز خلوت کی ایک ممتاز قسم ہے۔ یہ گوشہ نشینی خواہ کتنی ہی مختصر ہو مگر بہر حال اس کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔

۲- اگر داعی کو اس سے زیادہ گوشہ نشینی کی ضرورت ہو تو وہ چند دنوں کے لیے اپنے گھر میں خلوت اختیار کرے۔ اس لیے کہ بعض اوقات داعی اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ تھوڑی سی راحت حاصل کرنے، اپنے نفس کا محاسبہ کرنے اور جو مواقع ہاتھ سے نکل گئے ہیں ان کا تدارک کرنے کے لیے غور وفکر کرے۔ اس گوشہ گیری میں کوئی حرج نہیں ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کا مقصد اپنے نفس کا محاسبہ اور دعوت الی اللہ کے لیے مزید تیاری ہو۔ اس صورت میں داعی کی مثال اس مجاہد کی طرح ہوگی جو میدان جنگ سے ایک طرف ہو جاتا ہے، تاکہ اپنی تلوار کی دھار تیز کرے، گھوڑے کو چارہ کھلائے، اپنے نیزے کو درست کرے اور اپنے زخموں کا علاج کرے، حالانکہ اس کا دل میدان جنگ میں ہوتا ہے، نیز اس کا ارادہ عن قریب دوبارہ جہاد کی طرف لوٹنے کا ہو۔ چنانچہ دونوں حالتوں

۱- مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام، ج ۸، ص ۲۱۶-۲۱۸

۲- مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام، ج ۱۰، ص ۶۳۷

میں وہ جہاد ہی میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ اور مدد کی درخواست اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔

۵۸۷- داعی کے لیے گوشہ نشینی کی ایک اور قسم بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا جسم تو حاضرین کے ساتھ موجود ہو مگر اس کی فکر و سوچ کہیں اور ہو۔ اس گوشہ نشینی کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب داعی برے لوگوں کے درمیان موجود ہو، اس میں غیبت ہو رہی ہو، باطل گفتگو جاری ہو اور داعی کی حالت یہ ہو کہ نہ تو اس مجلس سے نکل سکتا ہو اور نہ حالات کا رخ بدل سکتا ہو تو وہ اپنی روح کے ساتھ اس مجلس سے غائب رہے، اگرچہ اس کا جسم وہاں موجود ہو۔

۵۸۸- اس کے علاوہ داعی کے لیے ایک تیسری قسم کی گوشہ گیری بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اسے محسوس ہو کہ ان کافروں پر مزید محنت کرنا فضول اور بے فائدہ ہے، یا یہ کہ موجودہ وقت میں ان کی طرف سے میری بات کو ماننے کا احتمال کم ہے، یا یہ کہ وہ ان کی اذیتوں کو برداشت نہیں کر سکتا تو داعی کو چاہیے کہ ان کو چھوڑ دے اور ان کی جگہ دوسرے لوگوں کا رخ کر لے۔ اپنی جدوجہد کو ان نئے لوگوں کی طرف متوجہ کرے اور ان کو اللہ کی طرف بلائے۔ اس لیے کہ داعی کی جدوجہد بھی محدود ہوتی ہے اور اس کے پاس وقت بھی محدود، چنانچہ جب وہ ایک قوم کی طرف سے مثبت جواب نہیں پاتا تو اسے چاہیے کہ اپنی دعوت کا رخ کسی دوسری قوم کی طرف موڑ دے اور پہلے والے لوگوں سے کنارہ کش ہو جائے۔ بلکہ اس کے لیے یہ راستہ بھی ہے کہ کچھ عرصے کے لیے سارے لوگوں سے کنارہ کش ہو جائے۔

اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے رہنمائی ملتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں نقل فرمایا ہے:

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ (مریم۱۹: ۴۸) میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنھیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔

نیز حضرت موسیٰ سے حکایت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَإِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاعْتَزِلُوْنِ. (الدخان۴۴: ۲۱) اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے کنارہ کش ہو جاؤ۔

اصحاب کہف کے بارے میں فرمایا:

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا (الکہف ۱۸:۱۶) اب جب کہ تم ان سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمھارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمھارے کام کے لیے سر و سامان مہیا کرے گا۔ واللہ اعلم

☆ ☆

باب سوم

مخاطَبینِ دعوت

تمہید

۵۸۹- باب اول میں ہم نے دعوت کے موضوع کے بارے میں بات کی۔ باب دوم میں داعی کو موضوع بحث بنایا جوخود اسلام پر یقین رکھتا ہے اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتا ہے۔

جس شخص کو اسلام کی طرف دعوت دی جاتی ہے وہ 'مدعو' یا دعوت کا مخاطَب کہلاتا ہے۔اس باب میں ہم اسی کے بارے میں بات کریں گے۔مخاطبین دعوت کے بارے میں گفتگو کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تعریف کی جائے اور اس تعریف کی ضروری تفصیلات بیان کی جائیں۔اسی طرح مخاطبین دعوت کی قسمیں بھی اس باب کا موضوع ہے۔اس لیے ہم اس باب کو دو فصلوں میں تقسیم کرتے ہیں:

پہلی فصل: مخاطبین دعوت کی تعریف

دوسری فصل: مخاطبین دعوت کی قسمیں

پہلی فصل

مخاطَبینِ دعوت کی تعریف

مخاطبینِ دعوت کون!

۵۹۰- انسان خواہ کوئی بھی ہو اللہ کی طرف مدعو یعنی دعوت کا مخاطب ہے۔ اس لیے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا دائمی پیغام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پیغام دے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف ۷:۱۵۸)

اے محمد! کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغمبر ہوں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا ۳۴:۲۸)

اور ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

یہ عموم مخاطبین دعوت کے حوالے سے ہے۔ اس سے کوئی بھی انسان مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہر شخص اس کا مخاطب، اس کو قبول کرنے کا مکلّف اور اس پر یقین کرنے کا پابند ہے۔ بس اتنی بات ضروری ہے کہ وہ عاقل اور بالغ ہو تو پھر خواہ وہ کسی بھی قوم، ملک اور پیشے سے تعلق رکھتا ہو اور خواہ اس کا رنگ کالا ہو یا گورا، خواہ کوئی مرد ہو یا عورت، یا اس طرح کی دوسری تمام تفریقیں جو انسانوں کے درمیان قائم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ایمان لائے ان میں سے کوئی ابوبکر قریشیؓ تھا، کوئی بلال حبشیؓ، کوئی صہیب رومیؓ تھا اور کوئی سلمان فارسیؓ۔ اسی طرح کوئی عورت تھی جیسے حضرت خدیجہؓ اور کوئی بچہ تھا جیسے حضرت علیؓ بن ابی طالب۔ کوئی مال دار تھا جیسے عثمانؓ بن عفان اور کوئی غریب تھا جیسے عمار بن یاسرؓ۔

۵۹۱- اس بنا پر دعوت الی اللہ تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔ یہ کسی نسل یا طبقے، یا گروہ کے ساتھ

خاص نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم انسانوں کو ان کی صفت آدمیت کے ساتھ مخاطب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ (البقرۃ ۲:۲۱) اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے رب کی۔

يَا بَنِيٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف ۷:۳۱) اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔

داعی پر لازم ہے کہ وہ اپنی دعوت الی اللہ کے عموم کو سمجھے اور جہاں تک اس سے ہو سکے، اسے ہر انسان تک پہنچا دے۔ مگر یہ بات اس کے منافی نہیں کہ آدمی اپنے دعوت کا آغاز اپنے قریبی رشتہ داروں سے کرے اور دوسرے لوگوں سے پہلے ان تک دعوت پہنچائے۔ اس لیے کہ ہر انسان کا حق ہے کہ اس تک دعوت پہنچا دی جائے، چنانچہ دور کا آدمی قریب والے کے مقابلے میں اولیٰ نہیں ہے، بلکہ قریب والا اس حیثیت سے بھی اولیٰ ہے کہ اس تک دعوت پہنچانا آسان ہوتا ہے اور اس کے علاوہ یہ امکان بھی ہوتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ خود داعی الی اللہ بن جائے گا۔ اس طرح دور کے لوگوں تک دعوت پہنچانا آسان ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ (الشعراء ۲۶:۲۱۴) اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔

یہ خطاب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر اس کے معنی میں داعی الی اللہ بھی شامل ہیں۔ اس لیے ان پر لازم ہے کہ جو لوگ ان کے قریب ترین رشتہ دار ہوں ان کو ڈرائیں۔ دعوت دینے میں آغاز اپنے خاندان کے لوگوں اور رشتہ داروں اور دوست احباب سے کریں۔ بلکہ اہل وعیال اور خاندان والوں کو دعوت دوسروں سے زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ داعی اگر خاندان کا سربراہ ہے تو وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَّسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهِ. تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

اس ذمہ داری میں ان کے مادی معاملات، جیسے کھانے، پینے اور رہائش اور اس طرح کی دیگر مادی اشیا کا انتظام کرنا بھی شامل ہے اور ان کے دینی امور جیسے انھیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنا اور ان کو اللہ کی

طرف دعوت دینا بھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے ایک رسول [حضرت اسماعیل علیہ السلام] کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكَاةِ (مریم۱۹:۵۵) وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔

قُوٓا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم۶۶:۶) اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔

اہل وعیال کو آگ سے بچانے کا طریقہ یہی ہے کہ ان کو اسلام کی، اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ماننے کی اور اس کے نواہی کو چھوڑ دینے کی دعوت دی جائے۔

مخاطبینِ دعوت کے حقوق

۵۹۲- مدعو کا ایک حق یہ ہے کہ اس کے پاس جایا جائے اور اسے دعوت دی جائے۔ یعنی داعی کو چاہیے کہ اس کے پاس جائے اور اسے اللہ کی طرف بلائے۔ داعی اپنے گھر میں بیٹھ کر اس بات کا انتظار نہ کرے کہ لوگ اس کے پاس آئیں۔

داعی اول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ قریش کی مجالس میں جاتے تھے اور انھیں دعوت دیتے تھے۔ اسی طرح موسم حج میں آپؐ مختلف قبائل کی قیام گاہوں پر جاتے تھے اور انھیں دعوت دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جو لوگ مکہ میں آتے تو آپؐ ان سے ملتے تھے اور انھیں دعوت دیتے تھے۔ سیرت ابن ہشام میں آیا ہے کہ جس وقت حج کے دن قریب آتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو قبائل عرب کے سامنے پیش کرتے تھے، ان کو اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے اور انھیں بتاتے تھے کہ میں اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا نبی ہوں اور ان سے مطالبہ کرتے تھے کہ آپؐ کی تصدیق کریں اور آپؐ کی حفاظت کا ذمہ لیں۔ اس دوران آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ پیغام بھی ان کے سامنے بیان فرماتے۔ اس طرح آپؐ قبائل عرب کی قیام گاہوں کے پاس جا کر کھڑے ہوتے اور فرماتے تھے:

يا بَنِي فُلانٍ! إِنِّي رَسُوْلُ اللهِ إِلَيْكُمْ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَعْبُدُو اللهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا وَأَنْ تَخْلَعُوْا مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ هٰذِهِ الْأَنْدَادَ وَأَنْ تُصَدِّقُوْا بِيْ وَتَمْنَعُوْنِيْ حَتّٰى أُبَيِّنَ عَنِ اللهِ مَابَعَثَنِيْ بِهِ... ''اے فلاں قبیلے والو! میں تمھاری طرف اللہ کا وہ رسول ہوں جو تمھیں حکم دیتا ہے کہ

اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ۔ ان معبودوں سے ہاتھ اٹھالو جن کی تم پہلے عبادت کرتے تھے اور انھیں اللہ کے ساتھ شریک کرتے تھے۔ نیز یہ کہ میری تصدیق کرو اور میری حفاظت کرو۔ میں تمھیں اللہ تعالیٰ کا وہ پیغام بتادوں گا جس کے ساتھ اللہ نے مجھے مبعوث کیا ہے''۔

آپؐ جب بھی سنتے کہ عرب کا کوئی نامور اور صاحب شرف آدمی مکہ آ رہا ہے تو آپ ضرور جا کر اس سے ملتے، اسے اللہ کی طرف دعوت دیتے اور جو کچھ آپ کے پاس [نازل ہو چکا] ہوتا، اس کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اہل مکہ پر یا صرف ان لوگوں پر اکتفا نہ کیا جو مکہ آتے تھے بلکہ مکہ سے باہر بھی گئے۔ آپؐ نے طائف کا سفر کیا اور طائف والوں کو اللہ کی طرف دعوت دی۔ آپؐ جب طائف پہنچے تو بنو ثقیف کے کچھ لوگوں کے پاس گئے، جو اس وقت اس قبیلے کے سردار اور اشراف تھے۔ آپؐ ان کے پاس بیٹھ گئے اور انھیں اللہ کی طرف دعوت دی...... [اور آگے جو کچھ ہوا وہ معروف و مشہور ہے]۔

مخاطب کے پاس جانا ضروری کیوں؟

۵۹۳- یہاں ہم یہ سوال اٹھانا چاہتے ہیں کہ مدعو کے پاس جا کر کیوں دعوت دی جائے اور وہ داعی کے پاس کیوں نہ آئے؟ اس کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے۔

۱- پہلی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہی تبلیغ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدۃ۵:۶۷) اے پیغمبر جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (النور۲۴:۵۴) رسول کی ذمہ داری اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔

اس تبلیغ کے لیے لازمی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کی جگہ میں چلے جائیں جس تک پیغام پہنچانا مقصود ہے۔ اس لیے کہ احتمال ہے کہ وہاں تک دعوت کی خبر نہ پہنچ سکے، یا پہنچے مگر غلط صورت میں، یا پھر درست صورت میں ہی پہنچے مگر وہ اس کے لیے نہ اُٹھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ

۱- سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۱-۳۲

خود چلے جاتے تا کہ ہر شخص آپؐ ہی کی زبان سے سنے۔ان احتمالات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے پاس جاتے تھے اوران تک اللہ تعالیٰ کی دعوت پہنچاتے تھے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندوں پر بہت شفیق تھے اوراس بات کا جذبہ رکھتے تھے کہ لوگ ہدایت پائیں اورانھیں کفر سے نجات ملے۔ یہ چیز آپؐ کواس بات پر مجبور کرتی تھی کہ لوگوں کے پاس ان کے گھروں اوران کی قیام گاہوں میں جا کرملیں اوران تک اللہ تعالیٰ کی دعوت پہنچائیں۔

۳- جولوگ اسلام سے دور ہوتے ہیں وہ دل کے مریض ہوتے ہیں اور جولوگ خود دل کے مریض ہوتے ہیں وہ دوسروں کے مرض کونہیں جانتے۔ چنانچہ وہ اس بات کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ اپنا یا دوسروں کا علاج کریں۔ چنانچہ رسولوں کی طرف سے ان کوان کی بیماری کے بارے میں بتانا ضروری ہوتا ہے اور رسول اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ مریض ان کے پاس آئیں گے تو وہ انھیں ان کی بیماری کے بارے میں بتائیں گے، بلکہ وہ خود چل کر بیماروں کے پاس جاتے ہیں اورانھیں نہ صرف بیماری کے بارے میں بتاتے ہیں بلکہ علاج بھی تجویز کرتے ہیں۔اس لیے کہ یہ بھی ان کی بیماری ہی ہے کہ وہ دعوت سے اعراض کرتے ہیں اور داعی کے پاس نہیں آتے۔

۵۹۴- ایک مسلمان داعی کا کام یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے اورلوگوں کے پاس ان کی جگہ میں، ان کی مجلسوں میں اوران کی بستیوں میں جا کر دعوت دے اوران تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔کتنا ہی اچھا ہو کہ داعی حضرات گلی محلوں میں پھیل جائیں اور ہر شخص ایک حصہ اپنے ذمے لے۔اسی چیز کے بارے میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

ہر عالم ایک علاقے ،ایک شہر،ایک محلے،ایک مسجد یا ایک مجلس اپنے ذمے لے۔ وہ ان کوان کے دین کی تعلیم دے اورانھیں مفید ومضر چیزوں اور سعادت وشقاوت کے درمیان تمیز سکھائے۔عالم کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ صبر کرے کہ کوئی اس سے پوچھے گا بلکہ اسے چاہیے کہ وہ خود ہی لوگوں کو دعوت دینے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو۔اس لیے کہ وہ انبیا کا وارث ہےاورانبیا نے کسی کو جہالت میں نہیں چھوڑا بلکہ وہ لوگوں کو پہلے ان کے اجتماعات میں پکارتے تھے اوران کے گھروں کے دروازوں کا چکر

لگاتے تھے اور پھر ان میں سے ایک ایک کو بلا کر ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ سارے علما اور حکمرانوں کے لیے فرضِ عین ہے کہ وہ ہر بستی اور ہر محلے میں ایک دین دار فقیہ کو مقرر کریں، وہ لوگوں کو ان کا دین سکھائے۔ اس لیے کہ لوگ ماں کے پیٹ سے عالم بن کر پیدا نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان کو دین کی تبلیغ ضروری ہے۔[1]

کوئی انسان معمولی نہیں

۵۹۵- داعی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی انسان کی حالت کو کم تر سمجھے، یا اسے معمولی سمجھ کر دعوت میں نظر انداز کر دے۔ اس لیے کہ ہر انسان کا حق ہے کہ اس کو دعوت دی جائے۔ بعض اوقات یہی شخص جس کو داعی کوئی وزن نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی اسلامی خدمات اور دعوت الی اللہ کی بنا پر بہت وزن رکھتا ہے۔ یہی طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ آپؐ ہر اس شخص کو دعوت دیتے تھے جس سے آپؐ کی ملاقات ہوتی تھی۔ بلکہ آپؐ خود اس کے پاس جاتے تھے۔

سیرت رسول میں یہ بات موجود ہے کہ آپؐ نے ہجرت سے تقریباً تین سال قبل جب اپنے آپ کو ان عرب قبائل کے سامنے پیش کیا جو حج کے دنوں میں مکہ آیا کرتے تھے اور ان میں سے کسی نے بھی آپؐ کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا تو آپ منیٰ کے قریب عقبہ کے مقام پر خزرج کے چھ افراد سے ملے، اس وقت وہ اپنے سر منڈوا رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی۔ آپؐ نے ان کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت فرمائی تو انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہا۔

ایمان لانے کے بعد وہ مدینہ میں اپنی قوم کے پاس گئے اور ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا۔ ''انھوں نے اپنی قوم کو بھی اسلام کی دعوت دی اور مدینے میں اسلام پھیلنا شروع ہوا، یہاں تک کہ انصار کے گھروں میں سے ایک گھر بھی ایسا نہ رہا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چھ افراد کی حالت کو کم تر نہ سمجھا، جو اپنے سر منڈوا رہے تھے، حالانکہ

۱- إحیاء علوم الدین للغزالی، ج ۳، ص ۴۵

۲- إمتاع الأسماع للمقریزی، ص ۳۲-۳۳

مکہ کے قرب و جوار میں مقیم بہت سے قبائل میں سے کسی نے بھی آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے دل میں یہ نہ کہا کہ ''ان لوگوں سے کیا اُمید ہے جو اپنے سر منڈ وانے میں مصروف ہیں۔'' اور پھر یہی چھ افراد مدینہ کے اولین داعی بن گئے۔ اس لیے داعی کو چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل کرے اور کسی کو معمولی نہ سمجھے کہ اس کو دعوت دینے سے بے نیازی اختیار کرے۔ بعض اوقات اسی کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے خیر کثیر رکھا ہوتا ہے جس میں فی الحال کوئی خیر نظر نہیں آتا۔

مخاطبینِ دعوت کی ذمہ داری

۵۹۶- اگر ایک طرف مدعو کا حق یہ ہے کہ داعی ان کے پاس جائے، انھیں معمولی نہ سمجھے اور ان کی حالت کو کم تر خیال نہ کرے تو دوسری طرف مدعو پر لازم ہے کہ اسے جب اللہ کی طرف دعوت دی جائے تو وہ اس کو قبول کرے۔ اس لیے کہ اسے خیر اور حق کی طرف بلایا جا رہا ہے، تو وہ اپنے رب جل جلالہٗ کی پکار پر لبیک کہے۔ ایک حقیقت واقعی کے طور پر —— جس سے داعی استفادہ کر سکتا ہے اور جو داعی سے مایوسی کو بھگا کر اس کی اُمید کو برقرار رکھ سکتا ہے—— ، ہم کہتے ہیں کہ دعوت پر لبیک کہنے اور حق کو قبول کرنے کے حوالے سے سارے لوگ برابر نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہوتے ہیں کہ بہت جلد لبیک کہہ دیتے ہیں اور بعض بہت بعد میں ایمان لاتے ہیں۔ جب کہ ان دونوں درجوں کے درمیان بہت سے اور درجات بھی ہیں جن کی گنتی کرنا مشکل ہے۔

بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جو فوری طور پر بغیر کسی تردد یا ہچکچاہٹ کے ایمان لے آتے ہیں، گویا کہ وہ اسی بات کے منتظر تھے کہ دعوت سنیں اور ایمان لے آئیں۔ ان کی مثال صحابہ میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا اور حضرت موسیٰ کے ساحروں کا ایمان ہے۔ حضرت ابوبکر ؓ کے ایمان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَا دَعَوْتُ أَحَداً إِلَى الْإِسْلَامِ إِلَّا كَانَتْ فِيهِ عِنْدَهُ كَبْوَةٌ وَنَظَرٌ وَتَرَدُّدٌ إِلَّا مَاكَانَ مِنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي قُحَافَةَ، مَا عَكَمَ - أَيْ مَا تَلَبَّثَ- حِينَ ذَكَرْتُهُ لَهُ وَمَا تَرَدَّدَ فِيهِ۔[1]

میں نے جس کو بھی اسلام کی دعوت دی ہے تو اس نے ضرور اس میں توقف، غور و فکر اور تردد کیا، سوائے ابوبکر بن ابوقحافہ کے، ان کے سامنے جب میں نے اسلام کا ذکر کیا تو انھوں نے نہ کوئی تامل

۱- سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۶۸

کی اور نہ تردد سے کام لیا۔

ساحروں کے ایمان سے میری مراد وہ ساحر ہیں جنھیں فرعون مصر نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو باطل کرنے کے لیے لایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قصے اور ان کے ایمان سے ہمیں آگاہ کر دیا ہے۔ فرمایا:

فَأَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ. فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِيْنَ. قَالُوْا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. رَبِّ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ. قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ اٰذَنَ لَكُمْ إِنَّهُ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ. لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِيْنَ. قَالُوْا لَا ضَيْرَ إِنَّآ إِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ. إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطَايَانَآ أَنْ كُنَّآ أَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ (الشعراء ۲۶: ۴۵-۵۱) پھر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو یکا یک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اُٹھے کہ مان گئے ہم رب العالمین کو' موسیٰ اور ہارون کے رب کو۔ فرعون نے کہا: تم موسیٰ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دیتا! ضرور یہ تمھارا بڑا ہے، جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے، اچھا! ابھی تمھیں معلوم ہوا جاتا ہے، میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھادوں گا۔ انھوں نے جواب دیا: کچھ پرواہ نہیں، ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا، کیوں کہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔

یہ جادوگر آئے اس مقصد کے لیے کہ فرعون کے باطل اور اس کے کفر کو ثابت کر دیں اور اللہ کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا مقابلہ کریں، مگر جوں ہی انھوں نے معجزہ دیکھا اور وہ سمجھ گئے کہ یہ وہ سحر نہیں ہے جو انھوں نے سیکھ لیا ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور یہ اللہ کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کی دلیل ہے، جوں ہی انھوں نے یہ دیکھ لیا تو انھوں نے فوراً ایمان لایا اور کھل کر اپنے ایمان کا اعلان کیا۔ یہ ان کے ایمان کی عظمت اور اس نور کی قوت کی دلیل ہے جو اُن کے دلوں میں داخل ہو چکا تھا اور جس نے ان کے دل میں موجود باطل کے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ ان کی زبان سے یہ صدا بلند ہوئی کہ اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. رَبِّ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ (مان گئے ہم رب العالمین کو'

موسیٰ اور ہارون کے رب کو)

جب فرعون لعین نے ان کو دھمکی دی تو انھوں نے کہا: لَا ضَيْرَ کچھ پروانہیں۔ یعنی ہمیں جو دنیوی عذاب دیا جائے اس کی ہمیں کوئی پروانہیں۔ تیرا عذاب ایک لمحے کا ہے، اس پر ہم صبر کرلیں گے، مگر اللہ تعالیٰ اپنے رب سے ہم اس حالت میں ملیں گے کہ ہم مومن ہوں گے اور ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری سابقہ خطاؤں کو معاف کردے گا۔ اس لیے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ظاہر ہوا تو سب سے پہلے ہم نے ایمان میں پہل کیا۔

یہ دو مثالیں اللہ کی دعوت کو جلدی قبول کرنے کی ہیں۔ یہ طریقہ بعض ہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ رہا آہستہ آہستہ ایمان کی قبولیت کا معاملہ تو اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ہم ان میں سے صرف حضرت نوح علیہ السلام کی مثال پر اکتفا کرتے ہیں جن کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے بیان کردیا ہے۔ انھوں نے اپنی قوم میں ۹۵۰ سال کا عرصہ گزارا، مگر اس کے باوجود ان پر چند لوگوں کے سوا کسی نے ایمان نہیں لایا، جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔

حضرت ابوسفیانؓ اور دوسرے طلقاء[1] فتح مکہ کے بعد ہی اسلام اور نبی اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ اور وہ بھی بیس سال کے عرصے پر مشتمل سخت عداوت اور جنگ وجدال کے بعد۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سرے دعوت الی اللہ پر ایمان ہی نہیں لاتے اور کفر ہی کی حالت میں دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ نعوذ باللہ کہ ہم اس ذلت میں مبتلا ہوں۔

۵۹۷- مخاطبینِ دعوت کو جب اللہ تعالیٰ اسلام کی طرف ہدایت دیتا ہے تو اس کے بعد ان کی ذمہ داری

۱- طلقاء سے مراد، جیسا کہ مولف نے وضاحت کی ہے، وہ لوگ تھے جو فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کے لیے عام معافی کے اعلان سے متاثر ہوکر ایمان لائے تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے، کہ مستشرقین جو اپنی غیر جانبدارانہ تحقیقات کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے، نے اپنی تحقیق کی آڑ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیچڑ اچھالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہے اسی طرح کی ایک کوشش یہ ہے کہ انھوں نے لغت جیسے غیر جانب دارانہ موضوع پر لکھتے ہوئے بھی اپنے تعصب کا زہر پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ المنجد کا عیسائی مولف لوئس معلوف لفظ طلقاء کی تشریح میں کہتا ہے: الطلقاء الذين أدخلوا في الإسلام كرهاً. طلقاء وہ لوگ تھے جن کو زبردستی مسلمان بنایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عام طالب علم کو تو اس لغت سے استفادہ کرنا ہی نہیں چاہیے، اگر کوئی استفادہ کرتا ہے تو اسے سخت احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ (مترجم)

یہ بنتی ہے کہ وہ اسلام کا حق ادا کرے۔ چنانچہ اس کو چاہیے کہ اپنی زندگی کے معاملات اور اپنے کردار کو اسلامی منہج کے مطابق ڈھالے اور اس طریقے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم اس کا حکم دیا ہے، اور اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بتایا ہے، تاکہ اس کے اسلام میں نفاق کا شائبہ نہ رہے۔ یعنی یہ کہ زبان سے تو کہے کہ میں مسلمان ہوں مگر اسلام کے حقوق کو ادا نہ کرے۔

......☆......☆......

دوسری فصل

مخاطبینِ دعوت کی قسمیں

تمہید

۵۹۸- ہر معاشرے میں کچھ اشرافیہ لوگ ہوتے ہیں، جنھیں سرداری کا مقام حاصل ہوتا ہے اور ان کا اپنی قوم میں نفوذ ہوتا ہے۔ یہ مخاطبینِ دعوت کی پہلی قسم ہے۔ قرآن کریم ان کو الملأ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ ان کے مقابلے میں کچھ لوگ جمہور اور عام لوگ ہوتے ہیں۔ یہ مخاطبین دعوت کی دوسری قسم ہے۔ پھر جب کچھ لوگ اسلام کی دعوت پر لبیک کہہ دیتے ہیں اور اسلام ان کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ جب مسلمان ہی غالب قوت بن جاتے ہیں اور معاشرہ اسلامی ہو جاتا ہے تو پھر ایک اور قسم بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ دکھاوے اور منافقت کی وجہ سے بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ان دل میں کفر ہی ہوتا ہے۔ یہ منافق کہلاتے ہیں اور یہ دعوت کی تیسری قسم ہے۔ اسی طرح جو لوگ اسلام میں نئے نئے داخل ہوتے ہیں تو ان کا اسلام کمزور اور ایمان نازک ہوتا ہے۔ اس سے وہ گناہوں کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہ گناہ گار کہلاتے ہیں اور یہ مخاطبین دعوت کی چوتھی قسم قرار پاتے ہیں۔

چنانچہ ضروری ہے کہ چار قسموں کے بارے میں مختلف عنوانات کے تحت بحث کی جائے۔

۱

طبقہ اشرافیہ

اشرافیہ کی تعریف

۵۹۹-قرآن کریم جب رسولوں اور ان کی قوموں کے واقعات بیان کرتا ہے تو اس میں لفظ الملأ بھی استعمال کرتا ہے۔ یہ لفظ جیسا کہ مفسرین فرماتے ہیں قوم کا اشرافیہ، ان کے لیڈر، ان کے رئیس اور ان کے سردار وغیرہ ہوتے ہیں۔[۱]

چنانچہ وہ معاشرے کے نمایاں لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا معاشرے میں اثر ونفوذ ہوتا ہے۔ لوگ ان کو اپنے لیڈر اور اشراف سمجھتے ہیں۔ وہ معاشرے کے رہنما اور شرفا سمجھے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگوں کے عرف میں معاشرے کی قیادت، سیادت اور رہنمائی کے مستحق سمجھے جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات وہ عملاً ایسے ہی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں جو الملأ کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو وہ اسی معنی میں ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ان کے لیے لفظ الملأ استعمال کرنا صورتِ واقعہ کی وضاحت کے لیے ہوتا ہے نہ کہ وہ ان لوگوں کو اس قیادت وسیادت کا مستحق بھی سمجھتا ہے۔

اس کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات مبارکہ میں مذکور یہ بات ہے کہ آپؐ نے روم، فارس اور مصر کے حکمرانوں کو ان القاب سے نوازا تھا۔ مثلاً روم کے بادشاہ کے نام خط میں اس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: **إلى عظيم الروم**. چنانچہ روم کے بادشاہ کے لیے اس لفظ کا استعمال ایک حقیقت واقعی کا بیان ہے، اور وہ یہ کہ یہ شخص رومیوں کی نگاہ میں عظیم ہی تھا، کیوں کہ وہ ان کا حکمران تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اس صفت کا مستحق تھا اس لیے آپؐ نے اس کے بارے میں یہ لفظ استعمال کیا۔

۱۔تفسیر القرطبی، ج ۳، ص ۲۲۳، ۲۳۴، ج ۱۲، ص ۱۲۱ تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۲۲۳

اشرافیہ اور دعوت الی اللہ

۶۰۰-ہر قوم کے اشرافیہ کی اکثر حالت یہ رہی ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کا دشمن ہوتا ہے۔اسی وجہ سے ہر دور میں اس طبقے نے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے رسولوں کا مقابلہ کیا ہے۔یہی لوگ دعوت الی اللہ کے ظالمانہ مقابلے کے روح رواں رہے اور انھی لوگوں نے انبیائے کرام کے خلاف کذب وافترا اور گمراہ کن پروپیگنڈے کی قیادت کی ہے۔اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ. وَقَالُوْا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَّأَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (سبا۳۴:۳۴-۳۵) کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ ''جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے۔'' انھوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ ''ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خبردار کر رہا ہے اور آپ ؐ کو تسلی دے رہا ہے کہ کوئی بھی رسول جب کسی بستی میں بھیجا گیا ہے تو اس قوم کے مترفین (جو قوم کے صاحب حیثیت، قوت وحشمت، مال وجاہ اور قیادت وسیادت والے لوگ ہوتے ہیں) یہی کہتے آئے ہیں کہ ہم اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس کی پیروی کریں گے۔[1]

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوْحًا إِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ إِنِّيْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖ إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ (الاعراف۷:۵۹-۶۰) ہم نے نوح ؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمھارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا یہی اشرافیہ تھا جنھوں نے دعوت الی اللہ کو للکارا تھا اور یہی وہ لوگ تھے

۱-تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۵۴۰

جنھوں نے اپنے نبی کی طرف صریح گمراہی کو منسوب کیا۔ یہ عظیم ترین ظلم اور بدترین طریقے سے اللہ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا ہے۔ اس لیے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب کی طرف سے جو حق پیش کیا اس کو انھوں نے گمراہی کہہ دیا۔ مگر اشرافیہ طبقے کی یہی منطق ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں قریش کے اشراف کا بھی یہی رویہ تھا۔ انھوں نے بھی اس مبارک دعوت کا مقابلہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں پہنچائیں، آپؐ پر جھوٹا ہونے کا الزام لگایا اور آپؐ کے خلاف سازشیں کیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَعَجِبُوٓا أَنْ جَآءَ هُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُوْنَ هٰذا ساحِرٌ كَذّابٌ. أجعل الْاٰلِهة إِلٰهًا وَّاحِدًا إِنَّ هٰـذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ. وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوْا واصْبِرُوْا علٰى اٰلِهَتِكُمْ إِنَّ هٰـذَا لَشَيْءٌ يَّرَادُ. مَا سَمِعْنَا بِهٰـذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ إِنْ هٰـذَآ إِلَّا اخْتِلَاقٌ (ص ۳۸:۴-۷) ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انھی میں سے آ گیا۔ منکرین کہنے لگے کہ ''یہ ساحر ہے، سخت جھوٹا ہے، کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔'' اور سردارانِ قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ ''چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے۔ یہ بات تو ہم نے زمانۂ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔

اس آیت کریمہ میں الملأ سے مراد قریش کے سردار، ان کے قائدین، رؤسا اور کبراء ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: اپنے دین پر قائم رہو اور توحید کی اس دعوت پر کان نہ دھرو جس کی طرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھیں دعوت دے رہا ہے۔[1]

سیرت رسولؐ میں قریش اور دوسری قوموں کے ان اشراف کے طرزِ عمل کے بارے میں بہت کچھ موجود ہے جو انھوں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہنچائی ہوئی دعوت الی اللہ کے ساتھ روا رکھا تھا۔ ان میں سے ایک وہ واقعہ ہے جو سیرت ابن ہشام نے نقل کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبائل میں نکل کر انھیں اللہ کی طرف دعوت دیا کرتے تھے۔ ابولہب جو قریش کے اشراف میں سے تھا، آپؐ کے پیچھے پیچھے چلتا جاتا تھا اور لوگوں سے کہتا جاتا تھا: اس کی پیروی نہ کرو، اس کی بات بھی نہ سنو۔[2]

۱- تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۲۷

۲- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۲

اسی طرح طرح جس وقت آپؐ طائف کی طرف نکلے اور ان میں سے کچھ لوگوں سے ملے، جو اس وقت بنوثقیف کے سادات اور اس کے اشراف تھے، تو انھوں نے آپؐ کی دعوت کو بری طرح مسترد کیا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے جاہل لوگوں اور غلاموں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا، وہ آپؐ کو گالیاں دیتے اور آپؐ پر آوازے کستے رہے۔ یہاں تک کہ دوسرے لوگ جمع ہو گئے۔[1]

اشراف کی دعوت سے دشمنی کے اسباب

۶۰۱-انبیا علیہم السلام کے واقعات کے سلسلے میں جو آیات وارد ہیں اور ان کو اپنی قوموں کی طرف سے جس سلوک کا سامنا کرنا پڑا، اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرام کے ساتھ ان اشراف کی دشمنی اور جھگڑے کے اسباب کیا تھے، اور وہ کیوں ان کی دعوت کو مسترد کرتے تھے۔ ان میں سب سے اہم سبب تو وہ تکبر ہوتا تھا جو ان کے دلوں پر حاوی تھا۔ اس کے علاوہ انھیں سرداری اور جاہ و جلال اور ان جہالتوں سے عشق کی حد تک محبت تھی، جن کو انھوں نے یقینی دلائل سمجھ رکھا تھا۔ ذیل میں ہم ہر سبب کے بارے میں وارد آیات و آثار کے حوالے سے بات کریں گے۔

۱-تکبر

۶۰۲-تکبر ایک قابل مذمت صفت اور ایک بڑی آفت ہے۔ یہ دل میں اپنے لیے جگہ بناتا ہے اور اس کے آثار خارج میں مختلف صورتوں اور متعدد رویوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ اکثر اوقات متکبر آدمی کو حق نظر نہیں آتا، یا اس کو نظر آ جاتا ہے مگر اس کا تکبر اسے حق کا اعتراف کرنے اور اس کے آگے جھکنے سے روکتا ہے۔ اسی طرح تکبر اس بات سے بھی روکتا ہے کہ کسی فضیلت والے کی فضیلت کا اعتراف کیا جائے۔

تکبر متکبر آدمی کے لیے اس بات میں بھی رکاوٹ بن جاتا ہے کہ وہ ٹھیک طریقے سے اپنی قدر پہنچانے۔ وہ اپنے کو دوسرے لوگوں سے بالاتر سمجھتا ہے، چنانچہ وہ اس بات سے انکاری ہوتا ہے کہ ان کی صف میں کھڑا ہو یا ان میں سے کسی کا پیروکار بن جائے۔ بعض اوقات تکبر کے ساتھ حسد بھی مل جاتا ہے تو اس کے برے اثرات میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ حق سے مزید متنفر ہو کر زیادہ شدت کے ساتھ اس کا

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۷-۲۸

انکار کرتا ہے اور وہ دعوت کے علمبرداروں سے لڑتا اور ان سے دشمنی کرتا ہے۔

۶۰۳- اشراف کی تکبر والی صفت اور اس سے جو انتہائی برے نتائج واثرات سامنے آتے ہیں، اس پر جو آیات دلالت کرتی ہیں ان میں سے چند آیات درج ذیل ہیں:

۱- وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل ۲۷:۱۴) انھوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کو انکار کیا، حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔

فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے انکار کیا، اگرچہ ان کے دل میں اس کا یقین پیدا ہو چکا تھا۔ پھر اس کو قبول کرنے سے کیا چیز حائل تھی، یہی ان کا ظلم اور تکبر، جو وہ موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے اپنے دل میں رکھتے تھے۔

۲- لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوْحًا إِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ إِنِّىْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖٓ إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ (الاعراف ۷:۵۹-۶۰) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمھارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔

یہاں اشراف نے اس حق کو جو نوح علیہ السلام لے کر آئے تھے گمراہی کی نظر سے دیکھنے لگے، اس کی روشنی ان کو اندھیرے کی صورت میں نظر آئی اور انھوں نے دعویٰ کیا کہ یہ تو ایک صریحی گمراہی ہے۔ یہ دراصل اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اندھے ہیں اور ان کو حق نظر نہیں آ رہا۔ اسی اندھے پن نے انھیں اس غلط دعوے پر آمادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے انجام کے بارے میں ہمیں بتا رہا ہے:

وَأَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ (الاعراف ۷:۶۴) اور ہم نے ان لوگوں کو ڈبو دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔

۳- حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کے بارے میں اور جو کچھ انھوں نے اپنے نبی سے کہا تھا اس کے بارے

میں خبردار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ (الاعراف ۷:۶۶) اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کررہے تھے، جواب میں کہا: ہم تو تمھیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔

سفاہت سے مراد حماقت اور کم عقلی ہے۔ اگر ان کی نظر تیز ہوتی تو وہ ضرور دیکھ لیتے کہ وہ جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں وہی تو صریح حق ہے۔

۴- چوتھی آیت وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے قریش کے سرداروں کے بارے میں بتایا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو کس طرح جھوٹ اور گھڑی ہوئی بات سے تعبیر کیا۔ ان کے بارے میں بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ إِنْ هٰذَآ إِلَّا اخْتِلَاقٌ (ص ۳۸:۷) یہ بات تو ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ انھوں نے کس طرح اسے سحر اور جنون سے تعبیر کیا ہے۔[1] اللہ تعالیٰ ان کو غارت کردے۔

۵- حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے اشرافیہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِيْنَ (ہود ۱۱:۲۷) اس کی قوم کے سردار، جنھوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے: ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے، جو ہمارے ہاں اَراذِل تھے، بے سوچے سمجھے تمھاری پیروی اختیار کرلی ہے۔ بلکہ ہم تو تمھیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔

چنانچہ قومِ نوح کا طبقہ اشرافیہ کہتا تھا: ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری قوم کے 'نکمے' (یعنی غریب، کمزور اور ادنیٰ

۱- اس کی دلیل چند صفحات پیچھے 'اشرافیہ اور دعوت' کے زیرِ عنوان گزر چکی ہے۔ (مترجم)

پیشے رکھنے والے) لوگ ہی تیری پیروی کرتے ہیں اور اشراف وسادات اور قائدین ورؤسا میں سے کسی نے بھی تیری پیروی نہیں کی۔ چنانچہ ہم کس طرح ان کے ساتھ اور تیری پیروی میں ان کی طرح ہو سکتے ہیں۔

پھر وہ کہتے تھے: ان 'نکموں' نے بھی تیری پیروی بغیر سوچے سمجھے اختیار کر لی ہے، اس لیے کہ یہ نکمّے ہیں، اشراف وسادات نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ اللہ کے رسول یا اس کے پیروکاروں کی کوئی فضیلت تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اپنی بات یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ یہ رسول جھوٹا ہے۔

یہ ساری باتیں ان کے نفسانی تکبر کے نتائج ہیں، جس نے ان کو ایسا بنایا تھا کہ وہ حقائق کو تلپٹ کرتے تھے اور حق سے اس 'دلیل' کی بنا پر انکاری تھے کہ اس کی پیروی نکمے لوگوں نے کی ہے۔ مگر وہ یہ بات بھول گئے کہ حق تو بہر حال حق ہی رہتا ہے، خواہ اس کی پیروی غریب اور کمزور لوگ کریں یا قائدین اور رؤسا۔ حقیقت میں اشراف تو وہی لوگ ہیں جنھوں نے حق کی پیروی کی، خواہ وہ غریب ہی کیوں نہ ہوں۔ اور حقیقتاً اَرذال وہ لوگ ہیں جنھوں نے حق کے ماننے سے انکار کیا اور اس کے ساتھ عناد رکھا، خواہ لوگوں کی نظر میں وہ اشراف ہی کیوں نہ ہوں۔

۶- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَأَخَاهُ هَارُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ. إِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ. فَقَالُوْٓا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ. فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ (المومنون ۲۳: ۴۵-۴۸) پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور کھلی سند کے ساتھ فرعون اور اس کے اَعیانِ سلطنت کے پاس بھیجا۔ مگر انھوں نے تکبر کیا اور بڑی دوں کی لی۔ کہنے لگے: کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندی ہے۔ پس انھوں نے دونوں کو جھٹلا دیا اور ہلاک ہونے والوں میں جا ملے۔

فرعون اور اس کے اَعیانِ سلطنت نے بھی حق کے اتباع سے اپنے آپ کو بڑا سمجھا اور انکار پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنے کفر کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے یہ جاہلانہ دلیلیں پیش کر دیں۔ یہ فرعون وہی ہے جس کے تکبر نے اس کو الوہیت اور کسی حد تک ربوبیت کا دعویٰ کرنے پر بھی آمادہ کیا۔ اس کے بارے

میں بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ (القصص ۲۸:۳۸) میں اپنے علاوہ تمھارے کسی معبود کو نہیں جانتا۔

اور أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلٰى (النازعات ۷۹:۲۴) تمھارا برتر پروردگار تو میں ہی ہوں۔

۷- سیرت رسول میں آیا ہے کہ قریش کے اشراف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ ہم اِن لوگوں (یعنی صہیبؓ، عمارؓ، بلالؓ اور خبابؓ جیسے کمزور مسلمانوں) کے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہوں گے۔ اس لیے پہلے تم ان لوگوں کو اپنے سے الگ کرلو، اور جس وقت ہم تمھارے پاس آتے ہیں اس وقت انھیں اپنی مجلس میں نہ آنے دو۔ پھر جب ہم تمھارے ساتھ باتیں کرنے اور تمھاری باتیں سننے سے فارغ ہوکر نکلیں، تب اگر تم چاہو تو ان کو اپنے پاس بلایا کرو۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاکَ عَنْهُمْ (الکہف ۱۸:۲۸) اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح وشام اسے پکارتے ہیں، اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔

ان متکبرین اور شیخی بگھارنے والوں کے بارے میں، جو یہ طرح طرح کے مطالبے کررہے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف ۱۸:۲۸) کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو، جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کرلی ہے اور جس کا طریق کار افراط وتفریط پر مبنی ہے۔

(شمائل الرسول صلی اللہ علیہ وسلم لابن کثیر، ص ۱۰۳-۱۰۴)

۸- جو لوگ اسلام کے پیغام سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے اپنے آپ کو بڑا سمجھ رہے تھے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ. أَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّکَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (الزخرف ۴۳:۳۱-۳۲) کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے

ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں۔

اس آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم پر اعتراض کرنے والے اور اپنے آپ کو اس پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے بڑا سمجھنے والے کہتے تھے: قرآن کا نزول ان دو شہروں (-مکہ اور طائف) کے لوگوں میں سے (ان کی نگاہوں میں) کسی بڑے آدمی کے اوپر کیوں نہ ہوا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رجل عظیم سے ان کی مراد قریش کے جابروں میں سے کوئی جابر ہوتا تھا۔[1]

وہ اپنے نفسانی تکبر کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو ہلکا سمجھتے تھے۔ وہ آپ کو نبوت کا اہل نہیں مانتے تھے۔ ان کی نظر میں یا تو خود وہ اس کے مستحق تھے یا ان کُبرا میں سے کوئی اور شخص۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ بات یہ کہہ کر ان پر لوٹا دی ہے کہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کو عطا کرے۔

۲-منصب و جاہ کی محبت

۶۰۴-طبقہ اشرافیہ کے لوگ منصب و جاہ کو اور اللہ کے بندوں کی گردنوں پر تسلط حاصل کرنے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر اس دعوت کو مسترد کرتے ہیں جو اِن سے وہ مقام چھین لیتی ہے جو لوگوں کے درمیان میں ان کو حاصل ہوتا ہے، اور ان کو باقی لوگوں کے برابر کھڑا کر دیتی ہے۔ وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ اگر عام لوگوں نے دعوت الی اللہ کو قبول کر لیا تو وہ اِن سے ان کے مناصب اور ان کا اقتدار چھین لیں گے۔ اسی لیے وہ اس دعوت کا مقابلہ کرتے ہیں، اس کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اور اپنی دشمنی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے انتہائی بھونڈی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ان کے اس حب جاہ و منصب اور اس کی وجہ سے دعوت حق کو مسترد کرنے پر جو آیات دلالت کرتی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱- فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (المومنون۲۳:۲۴) اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ ''یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے کو بھیجتا۔ یہ بات تو

۱-ابن کثیر، ج۴، ص ۱۲۶-۱۲۷

ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے)۔

چنانچہ اشرافیہ اپنے لوگوں پر اپنے اقتدار اور تسلط کو بچانے کے لیے اپنی قوم سے کہتا ہے کہ نوح اپنی اس دعوت کے ذریعے تم پر برتر بننا چاہتا ہے، یعنی تم پر رفعت اور بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے اور تمھارا رئیس بننا چاہتا ہے۔ اس پروپیگنڈے کے ذریعے وہ لوگوں کو حضرت نوح علیہ السلام سے پھیرنا چاہتے تھے تاکہ لوگوں پر ان کا اقتدار اور تسلط برقرار رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے رسول نہ زمین میں ذاتی برتری چاہتے ہیں اور نہ فساد، نہ اقتدار اور نہ بڑا بننا۔ وہ اپنی دعوت کی فطرت سے لوگوں کے ائمہ بن جاتے ہیں اور پھر انھی کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر اللہ کے رسولوں کا اقتدار ان اشراف اور متکبرین کے اقتدار کی طرح نہیں ہوتا۔

۲۔ فرعون اور اس کے اعوان وانصار کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوسٰى وَهٰرُونَ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهِ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ. فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا إِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ. قَالَ مُوْسٰى أَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ أَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ. قَالُوْٓا أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْأَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ (یونس۱۰:۷۵-۷۸) پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، مگر انھوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ پس جب ہمارے پاس سے حق ان کے سامنے آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا: تم حق کو یہ کہتے ہو جب کہ وہ تمھارے سامنے آ گیا' کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے۔ انھوں نے جواب میں کہا: کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے۔ تمھاری بات تو ہم ماننے والے نہیں ہیں۔

چنانچہ فرعون اور اس کے اشرافیہ نے حق کے اتباع سے اور اس کے آگے جھکنے سے استکبار کیا۔ یہ مجرم لوگ تھے۔ پھر انھوں نے حق سے اپنے استکبار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے یہ دعویٰ گھڑ لیا کہ موسیٰ اور ہارون لوگوں کو اس دین سے پھیرنا چاہتے ہیں جس پر ان کے آباؤ اجداد عمل پیرا تھے، یا یہ کہ موسیٰ اور ہارون چاہتے ہیں کہ زمین میں انھی کو کبریا یعنی عظمت اور قیادت حاصل ہو جائے۔ پس فرعون اور اس کے اعوان کی

طرف سے دعوتِ حق کو مسترد کرنے کے جتنے اسباب ہیں ان سب کا سرا تکبر اور زمین میں قیادت وسیادت سے جاملتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر یہی الزام لگایا کہ وہ قیادت چاہتے ہیں۔ فرعون کا یہی خیال تھا کہ ان کی دعوت کا اصل مقصد یہ ہے، یا پھر ان کی دعوت کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ فرعون کی بادشاہت دوسروں لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔

۳- قریش کے سرداروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ. مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (ص ۳۸:۶-۷) اور سردارانِ قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ "چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جارہی ہے۔

یہ تو صرف ایک بات ہے جو قریش کے سرداروں نے کہی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ تحذیر یعنی ڈراوے کے الفاظ ہیں۔ یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتا ہے اس کے ذریعے وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی طرف مائل ہوجائیں۔ اس طرح اس کا درجہ بلند ہوجائے گا اور ہم اس کے تابع بن کر رہ جائیں گے۔ پھر اس کی مرضی ہے کہ جس طرح چاہے ہم پر حکومت کرے۔ چنانچہ اس کی پیروی کرنے سے محتاط رہو۔[1]

اللہ تعالیٰ کے ارشاد إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ کے بارے میں ابن جریر نے کہا: سردارانِ قریش نے کہا تھا: یہ توحید کی بات، جس کی طرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں دعوت دے رہا ہے، ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے وہ تم پر شرف اور بلندی حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کا ارادہ یہ ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ اس کے پیروکار بن جائیں، مگر ہم اس کی بات ماننے والے نہیں۔[2]

اس سب کچھ کے معنی یہ ہیں کہ قریش کے سرداروں نے اپنی جاہ وجلال اور قیادت وسیادت کی حرص میں مبتلا ہوکر اسلامی دعوت کو مسترد کردیا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ یہ دعوت انھیں اس منصب اور لوگوں کے اوپر ان کے اقتدار سے محروم کردے گی۔

۱۔ تفسیر القرطبی، ج ۱۵، ص ۱۵۱-۱۵۲

۲۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۲۷

۳- جہالت

۶۰۵- یہ سردارانِ قوم جہالت میں ڈوبے ہوتے ہیں اور انھیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ اپنے رب کا انکار کرتے ہیں اور اس کی مبارک دعوت کو مسترد کرتے ہیں، جس کے ساتھ اس نے اپنے انبیائے کرام کو لوگوں کے پاس بھیجا ہوتا ہے۔ یہ لوگ دعوت کو گمراہی کا نام دیتے ہیں اور اس کے مبلغین یعنی انبیائے کرام کو بے وقوفی اور کم عقلی کا طعنہ دیتے ہیں، ان کے لیے مصیبتیں کھڑی کرتے ہیں، ان کے خلاف چالیں چلتے ہیں، ان سے دشمنی کرتے ہیں اور ان کی دعوت کو عجیب وغریب ثابت کرتے ہیں۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول کے جھوٹا ہونے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ انسان ہوتے ہوئے نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نبوت ورسالت کے اس سے زیادہ مستحق تو ہم تھے۔ کیوں کہ ہم سردارانِ قوم ہیں اور ہمارے پاس مال دولت بھی ہے اور ہم آل واولاد بھی رکھتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ انبیائے کرام اُن کو اپنے آباؤ اجداد کے دین سے پھیر دیتے ہیں اور ان کے سامنے ایک نیا دین پیش کر رہے ہیں جس کے بارے میں انھوں نے پہلے سے نہیں سنا۔ یہ لوگ مومنوں کا مذاق اڑاتے اور ان کے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ یہ مسلمان نہ علم رکھتے ہیں اور نہ سمجھ بوجھ۔ اسی لیے تو انھوں نے دعوت الی اللہ کی پیروی اختیار کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اللہ کے رسولوں کی بلا سوچے سمجھے پیروی اختیار کی ہے، جب کہ ہم نے یہ کام نہیں کیا اس لیے کہ ہم سردارانِ قوم اور اشراف ہیں، عقل اور سمجھ رکھتے ہیں اور بات کہ تہہ تک پہنچتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ انبیائے کرام زمین میں فساد کرتے ہیں، اس کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو اصلاح کرنے والے اور لوگوں کے دین اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والے ثابت کرتے ہیں۔ اس دفاع کے راستے میں وہ انبیائے کرام اور اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔

یہ ان کی جہالتوں اور حماقتوں کے چند اثرات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن کریم کی کئی آیات میں آگاہ کیا ہے۔ انھی کی وجہ سے وہ گمراہی میں پڑے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے استفادہ نہیں کرتے تھے۔ چند آیات حسب ذیل ہیں۔

۱- حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ

قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ (ہود ۱۱:۲۷) اس کی قوم کے سردار، جنھوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے: ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے، جو ہمارے ہاں اَراذِل تھے، بے سوچے سمجھے تمھاری پیروی اختیار کر لی ہے۔ بلکہ ہم تو تمھیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔

چنانچہ یہ لوگ اپنی جہالت کی بنا پر اپنے نبی حضرت نوح علیہ السلام سے کہتے تھے: تم کوئی فرشتہ نہیں ہو، بلکہ ایک انسان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ہمیں چھوڑ کر تمھارے پاس وحی بھیج دی؟ پھر ہم نے دیکھا کہ جن لوگوں نے تمھاری پیروی کی ہے وہ ہمارے اراذل ہیں۔ ہمارے اشراف اور رئیسوں میں سے کسی نے بھی تمھاری پیروی نہیں کی۔

یہ سب کچھ ان کی جہالت کی وجہ سے تھا، ورنہ اگر ان میں ذرہ برابر بھی عقل ہوتی تو وہ جان لیتے کہ رسول کو تو بشر ہی ہونا چاہیے تا کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ انھی کی زبان میں گفتگو کر سکے، اور قوم کے لیے ممکن ہو کہ اس کی بات کو سمجھ سکے۔ اگر ان کی عقل درست ہوتی تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ محرومی، غریبی اور کمزوری ایسی چیزیں ہیں جن کا دین [illegible]ت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہاں، اگر کمزور اور غریب لوگ حق کی پیروی کرتے ہیں تو وہ اپنے حسن ادراک اور صفائے قلب پر ایک ناقابل تردید دلیل قائم کر دیتے ہیں۔

۲- قوم ثمود کے بارے میں اور انھوں نے اپنے نبی کو جو جواب دیا تھا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ. قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (الاعراف ۷:۷۵-۷۶) اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقہ کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے، کہا: کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟ انھوں نے جواب دیا: بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں۔ ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا: جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔

چنانچہ قوم ثمود کے سردار اپنی جہالت اور حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت سے انکار پر مُصِر تھے اور

انھوں نے ایک جاہل اور متکبر شخص کے انداز میں، نہ کہ ایسے شخص کی طرح جو تواضع کرتا ہو اور سمجھنے کے لیے پوچھ رہا ہو، مومنوں سے اوپر والا سوال پوچھا تھا۔

۳- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَكَذٰلِكَ مَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ إِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓى أُمَّةٍ وَّإِنَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (الزخرف۴۳:۲۳) اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا، اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔

کھاتے پیتے لوگوں سے مراد یہی سردارانِ قوم ہیں۔ اللہ کے رسولوں کی دعوت کے مقابلے میں ان کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک ملت اور ایک دین پر پایا ہے اور انھی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، اس سے ذرہ برابر آگے پیچھے نہیں ہوتے۔

مگر یہ اُن کی جہالت تھی۔ اس لیے کہ جہالت پیروی کے لائق نہیں ہے، بلکہ حق اس لائق ہوتا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ آباؤ اجداد کے فرسودہ اور باطل روایات کی یہ اندھی تقلید، حق کے خلاف دشمنی کے اسباب میں سب سے بڑا سبب ہے۔

اس طرح کی اندھی تقلید کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا أَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (البقرۃ۲:۱۷۰) ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

۴- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَآءَ هُمْ وَنَسْتَحْيِيْ نِسَآءَ هُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ. (الاعراف۷:۱۲۷) فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھیں؟ فرعون نے جواب دیا: میں ان کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے

دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔

قومِ فرعون کے سردار اللہ کے نبی اور اس کی طرف دعوت دینے والے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے مسلمان پیروکاروں کو زمین میں فساد پھیلانے والے کہتے تھے۔ وہ ان کا مقابلہ کرتے اور ان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے جتن کر رہے تھے۔

ان کی جہالت ان کے تکبر اور جاہ پسندی سے مل جاتی ہے تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو زمین میں فساد برپا کرنے والا قرار دیتے ہیں۔

اشراف اشراف ہی ہیں

۶۰۶ - قرآن کریم نے سردارانِ قوم کی جو صفات اور ان کے جو اخلاق بیان کیے ہیں وہ ہر معاشرے، ہر دور اور ہر جگہ کے اشراف میں پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اکثر یہی لوگ دعوت الی اللہ کے راستے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے تکبر کی بنا پر، جو اِن کے دلوں کے اوپر چھایا ہوا ہوتا ہے، اس کے خلاف محاذ کھول لیتے ہیں۔ نیز انھیں جاہ و منصب کی محبت ہوتی ہے اور انھیں خوف ہوتا ہے کہ یہ اصلاحی دعوت ان کو ان کے مقام و مرتبے اور جاہ و جلال سے محروم کر دے گی۔

یہ طبقہ اشرافیہ ہر دور میں موجود ہوتا ہے اور ہر اُس پاکیزہ دعوتِ خیر کا مقابلہ کرتا ہے جس کا مقصد لوگوں کی اصلاح اور ان کو اپنے خالق تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اس طبقے کی ہر دور میں موجودگی کی دلیل یہ ہے کہ وہ محرک جس نے سابقہ اقوام کو اللہ کے رسولوں اور اس کی طرف دعوت کی مخالفت پر آمادہ کیا، ہر دور کے سرداروں اور طبقہ اشرافیہ کے دلوں میں موجود ہوتا ہے۔ اس لیے کہ تکبر مریض دلوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اور جاہ و جلال کی محبت بھی دل میں پائی جاتی ہے اور وہ ایمان کو دل سے اُکھاڑ دیتی ہے۔ اس قسم کے دلوں میں، جو زمین میں بلندی اور جاہ و منصب کے شوقین ہوتے ہیں، جہالت بھی اپنے سائے ڈالتی رہتی ہے۔

اگر ان اشراف اور کُبَرا کے دلوں میں اصلِ ایمان داخل ہو بھی جائے تب بھی اکثر اوقات وہ کمزور ہی رہتا ہے۔ اس میں یہ قوت نہیں ہوتی کہ ان لوگوں کو اللہ کے راستے میں رکاوٹ بننے یا اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کے خلاف محاذ بنانے سے باز رکھ سکے۔ ان کے دلوں میں فضول قسم کے شبہات آتے رہتے ہیں، جیسا کہ زمانہ قدیم کے ان اشراف کے دلوں میں آیا کرتے تھے جنھوں نے اللہ کے رسولوں کے خلاف جنگ کی اور لوگوں کو ان

کی مبارک دعوت سے روکتے رہے۔

مفسرین نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اشراف ہر دور میں دعوت الی اللہ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں ارشاد باری تعالیٰ: قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖٓ إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ (الاعراف ۷:۶۰ - اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو) کے بارے میں وارد ہے کہ ''یہی معاملہ ہر قوم کے فساق و فجار کا ہوتا ہے۔ وہ نیک لوگوں کو گمراہی پر سمجھتے ہیں۔[1]

دوسری جگہ فرماتے ہیں: اکثر اوقات ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ حق کی پیروی کرتے ہیں وہ کمزور لوگ ہوتے ہیں، جبکہ اشراف اور کبرا کی طرف سے اکثر اوقات یہی دیکھا گیا ہے کہ وہ دعوت کے مخالف ہوتے ہیں۔[2]

اسی طرح کا قول تفسیر قرطبی میں بھی وارد ہے۔[3]

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۲ ص ۴۴۰

۲۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۲ ص ۴۴۱

۳۔ تفسیر القرطبی، ج ۱۵ ص ۱۵۰

۲

عوام الناس

عوام الناس کی تعریف

۶۰۷-عوام الناس سے ہماری مراد لوگوں کی اکثریت ہے۔ اس لیے کہ ہر چیز میں عام (جمہور) اس کے بڑے اور اکثر حصے کو کہتے ہیں۔ پھر اس مقام پر عوام الناس سے مقصود اشراف کے علاوہ لوگ ہیں۔ اشراف کے بارے میں ہم گفتگو کر چکے ہیں، اور یہ عموماً چوٹی کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو لوگ ہوتے ہیں تو وہ ہر معاشرے میں اکثریت میں ہوتے ہیں۔ یہ عوام الناس عمومی طور پر اشراف اور چوٹی کے لوگوں کے دست نگر اور تابع ہوتے ہیں۔ اسی طرح عام طور پر یہ کمزور اور غریب بھی ہوتے ہیں۔ یہی لوگ ہوتے ہیں جو مختلف کام اور پیشے رکھتے ہیں۔

عوام الناس اور قبولیت حق

۶۰۸-عوام دعوت کی قبولیت کے معاملے میں دوسروں سے آگے ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے رسولوں کے پیروکار ہوتے ہیں اور دوسروں سے پہلے ان پر ایمان لاتے ہیں۔ جیسا کہ ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا تھا۔ دعوت اسلام کے آغاز میں ایک مرتبہ حضرت ابوسفیانؓ شام گئے تھے۔ جب ہرقل کو معلوم ہوا کہ وہ مکہ کے ہیں تو اس نے اُن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلوم کرنا چاہا۔ اس سلسلے میں ہرقل نے کہا: اس کی پیروی اشراف لوگ کرتے ہیں، یا کمزور؟ ابوسفیانؓ نے کہا: کمزور۔ ہرقل نے کہا: انبیا کے پیروکار یہی لوگ ہوتے ہیں۔[1]

حقیقت یہی ہے کہ اللہ کے رسولوں کے پیروکار عوام ہی رہے ہیں۔ ہم نے اشراف کے بارے میں

۱-یہ ایک لمبی حدیث کا حصہ ہے جسے امام بخاری نے اپنی صحیح ج۱ص ۷-۸ میں نقل کیا ہے۔

گفتگو کرتے ہوئے یہ بات پیش کی ہے کہ اشرافیہ طبقے نہ حضرت نوح علیہ السلام سے کہا تھا: وَمَا نَرٰکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا (ہود۱۱:۲۷) اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے تمھاری پیروی کی ہے جو ہمارے ہاں اَراذِل تھے۔

اسی طرح ہم نے قوم ثمود کے اشراف کا قول بھی نقل کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا واقعہ بیان کیا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّہٖ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِہٖ مُؤْمِنُوْنَ. (الاعراف ۷:۷۵-۷۶) اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقے کے اُن لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے، کہا: کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟ انھوں نے جواب دیا: بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں۔

ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار بھی مکہ کے کمزور لوگ ہی تھے، جنھوں نے مشرکین سے بڑی اذیتیں اٹھائیں۔[1]

عوام ہر دور میں دوسروں کے مقابلے میں جلدی حق کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اکثر اوقات حق کی پیروی وہ لوگ کرتے ہیں جو کمزور ہوتے ہیں۔[2]

عوام کی قبولیت حق کی وجہ

۶۰۹-عوام میں حق کی آواز پر لبیک کہنے اور دعوت الی اللہ کو قبول کرنے کے حوالے سے جو سرعت پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر حق کی قبولیت میں رکاوٹ بننے والی وہ چیزیں نہیں ہوتیں جو اشراف میں پائی جاتی ہیں، جیسے حکومت واقتدار کی محبت اور دوسرے کے آگے جھکنے سے انکار۔ اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ جلدی حق کو قبول کر لیتے ہیں اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اس وجہ کی

۱- سیرت ابن ہشام ج۱،ص ۳۳۹

۲- تفسیر ابن کثیر ج ۲،ص ۴۴۲

طرف امام قرطبیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں اشارہ کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تکبر، اقتدار کی محبت اور عیش وعشرت میں گم ہو جانا اور اس طرح کی دیگر چیزیں وہ ہیں جن سے اشراف عموماً الگ ہونا نہیں چاہتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل ایک غلاف میں بند ہوتے ہیں، وہ حق سے متاثر نہیں ہوتے اور ان کی آنکھوں پر ایک پردہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق کو نمایاں طور پر نہیں دیکھ پاتے۔ چنانچہ اپنی جہالت کی وجہ سے اور اپنے مقام ومرتبے کی حرص کی بنا پر وہ حق کے خلاف دشمنی پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔

عوام پر اشراف کا اثر

٦١٠- اگر چہ عوام دوسروں کی نسبت جلدی قبولیت حق کے لیے تیار ہوتے ہیں، ان کے سامنے ایمان لانے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے فطرت سلیمہ عطا کی ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود اس کا بات کا احتمال موجود ہوتا ہے کہ وہ اشراف کی چالوں سے متاثر ہو جائیں اور ان کے جھوٹے اور گمراہ کن پروپیگنڈے کے پیچھے چل پڑیں، جیسا کہ قوم فرعون کا معاملہ تھا۔ اس قوم نے باطل پر فرعون کی پیروی کی اور اس میں اس کی مدد کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ (الزخرف ٤٣:٥٤) اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں: اس نے اپنی قوم کی عقلوں کو ہلکا سمجھا، انھیں گمراہی کی دعوت دی اور انھوں نے اس دعوت کو قبول کیا۔[1]

ظاہر ہے کہ فرعون کا فتنہ بہت بڑا فتنہ تھا۔ اس کے پاس حکومت، اقتدار، افرادی قوت اور مال ودولت کسی چیز کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس کی قوم کے دل علم نافع سے، درست ہدایت سے، اور عقل سلیم سے بالکل خالی تھے۔ اس لیے وہ فرعون کے فتنے اور اس کے باطل دعووں میں پڑ گئے، جن سے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو مسترد کرنے کے سلسلے میں دلیل لاتا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاتَّبَعُوٓا أَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَآ أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ (ہود ١١:٩٧) انھوں نے فرعون کے حکم کی پیروی

1۔ تفسیر ابن کثیر، ج ٤، ص ١٣٠

کی، حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔

اشراف اور کبرا کمزور لوگوں یعنی عوام کو جس طرح گمراہ کرتے ہیں اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْ تَرٰى إِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ. قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْآ أَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ إِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ. وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُوْنَنَآ أَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ أَنْدَادًا وَّأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا الْأَغْلٰلَ فِيْٓ أَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (سبا۳۴:۳۱-۳۳) کاش تم دیکھو ان کا حال اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔" وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: "کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔" وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے: "نہیں، بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیرائیں۔" آخرکار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال ان کے تھے ویسی ہی جزا وہ پائیں؟

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات سے آگاہ فرما رہا ہے کہ کفار اپنی سرکشی میں آگے بڑھتے جاتے ہیں، ضد پر اڑے رہتے ہیں۔ وہ قرآن پر اور ان تمام امور پر ایمان نہ لانے پر اصرار کرتے ہیں جن کی نبی ان لوگوں کو دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ ان کی وہ حالت بتا رہا ہے کہ قیامت کے دن اس کے ساتھ جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ کیا ہے۔ ان میں ایک بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور اس بات کو ایک دوسرے پر

تھوپتے رہیں گے۔ اس وقت وہ ایک دوسرے پر لعنت ملامت کریں گے، حالانکہ دنیا میں وہ ایک ساتھ رہتے تھے اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار تھے۔ اس باہمی حجت بازی اور لعنت ملامت کے حوالے سے ایک، ان دبائے ہوئے لوگوں کی طرف سے سامنے آنے والی یہ بات ہے کہ لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے)۔

یعنی اگر تم ہمیں اللہ کے راستے سے نہ روکتے تو ہم ضرور انبیا کی پیروی کرتے اور اس حق پر ایمان لاتے جو انبیا لے کر آئے تھے۔ اس پر مستکبرین یعنی قائدین اور لیڈر ان کو جواب دیں گے: اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ (کیا ہم نے تمھیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمھارے پاس آئی تھی؟)

یعنی ہم نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ ہم نے تمھیں دعوت دی، اور تم نے بلا دلیل ہماری پیروی کی۔ تم لوگوں نے رسولوں کی طرف سے پیش کی گئی دلائل، براہین اور حجتوں کے خلاف عمل کیا، اپنی خواہشات کی خاطر، اور اس مقصد کے لیے کہ تم نے خواہش نفس کو اور ہمارے کیے گئے وعدوں کو ترجیح دی۔ تم نے خود ہماری پیروی کر کے ایک جرم کا ارتکاب کیا۔

یہ دبائے گئے لوگ جو عوام الناس ہی ہوتے ہیں، کفار کے بڑوں سے کہیں گے:

بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (سبا ۳۴:۳۲) نہیں، بلکہ شب و روز کی مکاری تھی۔

یعنی تم شب و روز ہمارے ساتھ چالیں چلتے تھے، تم ہمیں گمراہ کرتے تھے، ہمیں سبز باغ دکھاتے تھے اور ہمیں بتاتے تھے کہ تم حق پر ہو اور انبیا کی دعوت باطل ہے۔ اس طرح تم لوگ ہمیں طرح طرح سے باطل اور جھوٹ کے ساتھ دھوکہ دیتے تھے اور ہمیں حکم دیتے تھے کہ اللہ کا انکار کریں اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بنائیں۔ تم لوگ اپنے باطل کو ثابت کرنے کے لیے اور ہمیں گمراہ کرنے کے لیے مختلف شبہات کھڑے کرتے تھے۔ چنانچہ اے مستکبرین اور مجرم انسانو! ہمیں کفر کی طرف بلانے اور باطل کو ہمارے لیے مزین کرنے کی وجہ سے ہی ہم نے تمھاری پیروی کی ہے اور کافر بن گئے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتا ہے کہ ان لوگوں نے ندامت کو اپنے دلوں میں چھپا رکھا تھا اور جب عذاب کو سامنے دیکھ لیا تو کیا پیشوا اور کیا پیروکار، سب نے اس کو ظاہر کر دیا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے کیے پر پشیماں ہوگا مگر اب اس ندامت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس طرح ان کی گردنوں میں

زنجیریں ڈال دی جائیں گی، یعنی ان کے ہاتھوں کو گردنوں کے ساتھ باندھ دیا جائے گا۔ یہی ان کے اعمال کی سزا ہے۔ قائدین کے لیے ان کی حیثیت کے مطابق عذاب ہوگا اور پیروکاروں کے لیے ان کی حیثیت کے مطابق۔[1]

عوام پر اشراف کا اثر کیوں!

۶۱۱- ہم یہ بات کہہ آئے ہیں کہ عوام حق کی قبولیت میں دوسروں سے آگے ہوتے ہیں اور ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ اس بات کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے کہ عوام اپنی قیادت سے متاثر ہو جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ باطل سے عوام یہ اثر کیوں لیتے ہیں، باوجودیکہ حق بالکل واضح ہوتا ہے اور عوام کے لیے اس کی قبولیت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی؟ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ تاثر کئی وجوہات کی بنا پر ہوتا ہے۔

۱-خوف

۶۱۲-عوام کے اپنی قیادت سے متاثر ہونے کی ایک وجہ خوف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کافر قیادت، جس کے ہاتھ میں قوت، نفوذ، مال اور وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ عوام کو مرعوب کریں اور انھیں اس بات سے خوف زدہ کریں کہ وہ کفر کو چھوڑ جائیں، جس کے وہ علم بردار ہوتے ہیں۔ یہ خوف عوام کی اکثریت کی ہمتوں کو کمزور کر دیتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو اذیتوں سے بچانا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ (یونس۱۰:۸۳) موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنھیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکتے نہیں ہیں۔

معلوم ہوا کہ فرعون اور اس کے اعوان و انصار کی پکڑ کے خوف نے اکثر عوام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے روکے رکھا، اور آپؑ پر تھوڑے لوگوں کے سوا کسی نے ایمان نہ لایا۔ یہ لوگ اس بات کا

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج۳، ص۵۳۹ تفسیر القرطبی، ج۱۴، ص۳۰۳-۳۰۴

خوف رکھتے تھے کہ فرعون ان کا مواخذہ کرے گا۔

یہ بات درست ہے کہ عوام میں سے ایک معمولی گروہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انھیں حق پر ایمان لانے سے عذاب اور سزا کی کوئی دھمکی خوف زدہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ بغیر کسی رعب اور خوف کے اپنے ایمان کا اعلان کر دیتے ہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے پر آنے والے ساحروں نے کیا، کہ جب انھوں نے موسیٰ علیہ السلام پر اور ان کی دعوت پر اور اپنے رب تعالیٰ پر ایمان لانے کا اعلان کیا تو انھوں نے فرعون کی طرف سے قتل اور مصلوب ہونے کی دھمکیوں پر کوئی توجہ نہ دی اور اس سے کہنے لگے:

لَا ضَيْرَ إِنَّآ إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ. إِنَّا نَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطَايَانَآ أَن كُنَّآ أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ (الشعراء۲۶: ۵۰-۵۱) کچھ پرواہ نہیں، ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا، کیوں کہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔ اسی طرح کا معاملہ اصحاب الاخدود کا بھی تھا کہ انھوں نے سخت عذاب کے باوجود ایمان لایا۔

مگر جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ عوام کی ایک چھوٹی ٹولی ہوتی ہے، جب کہ عوام کی اکثریت قیادت کی طرف سے پیش آنے والے خوف اور ڈر سے متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ایمان لانے کا اقدام نہیں کر سکتے۔ پھر جب مدت دراز ہوتی جاتی ہے تو وہ کفر سے مانوس ہو جاتے ہیں اور اسے قبول کر لیتے ہیں، حالانکہ پہلے وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سب پر عذاب الٰہی کا کوڑا برستا ہے۔

عوام کو حق کی پیروی کرنے سے روکنے میں خوف کا جو کردار ہے اس کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی اشارہ کر رہا ہے:

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوٓا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (ہود۱۱: ۵۹) یہ ہیں عاد، اپنے رب کی آیات سے انھوں نے انکار کیا، اس کے رسولوں کی بات نہ مانی، اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے۔

۲- مال و جاہ

۶۱۳- دوسری چیز مال و دولت اور دنیوی جاہ و جلال کے دھوکے میں آنا ہے۔ طبقۂ اشرافیہ کے پاس

ان چیزوں کی کمی نہیں ہوتی اور وہ یہ چیزیں عوام کے سامنے لہراتے رہتے ہیں کہ اگر تم لوگ باطل میں ہماری پیروی کرو گے اور ہماری قیادت کو تسلیم کرو گے تو یہ سب کچھ تمھارے لیے ہے۔

اس کی طرف اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد اشارہ کرتا ہے جو قوم نوح کے بارے میں وارد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا (نوح ۷۱:۲۱)
نوح نے کہا: میرے رب! انھوں نے میری بات رد کر دی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں۔

ان لوگوں نے اپنے رئیسوں اور بڑے اور مال دار لوگوں کی پیروی کی، اس امید پر کہ ان کے اموال میں سے کچھ حصہ ان عوام کو بھی مل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي أَفَلَا تُبْصِرُونَ (الزخرف ۴۳:۵۱) ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا: لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے، اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟

جس حد تک میں سمجھا ہوں اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فرعون جس مال واسبابِ دنیوی کا مالک تھا اس کے ذریعے وہ لوگوں کو بہکانا چاہتا تھا کہ اگر کوئی اس کے باطل میں اس کا ساتھ دے گا تو وہ اسے سب کچھ دے گا اور اس سے استفادہ کرنے کے مواقع فراہم کرے گا۔

سیرت النبی میں بھی یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ قریش کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خطیر رقم کی پیش کش کی تھی، مگر شرط یہ تھی کہ آپ اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائیں۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ہر دور کا طبقہ اشرافیہ لوگوں کو مال کے ذریعے بہکانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ذریعے انھیں دعوت الی اللہ کی طرف آنے سے روکتا ہے۔

۳۔شکوک وشبہات

۶۱۴۔ سردارانِ قوم صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کرتے کہ لوگوں کو پکڑ کر قوت کے ساتھ اور خوف زدہ

کر کے اللہ کے راستے سے روکیں، بلکہ اس کے لیے وہ شبہات پیدا کرنے کا راستہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ شبہات کے کئی طریقے ہیں۔ اس سلسلے میں کبھی داعی الی اللہ پر جنون کا الزام لگایا جاتا ہے اور کبھی گمراہی اور کم عقلی کے طعنے دیے جاتے ہیں۔

اس حوالے سے ہم نے حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کی قوموں کے اقوال پہلے نقل کیے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖٓ إِنَّا لَنَرٰىكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (الاعراف ۷:۶۰) اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔

اور حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ إِنَّا لَنَرٰىكَ فِي سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ (الاعراف ۷:۶۶) اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے، جواب میں کہا: ہم تو تمھیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔

اس طرح کے شبہات میں سے ایک شبہہ یہ تھا کہ رسول انسان ہے اور ان کے خیال میں یہ درست نہیں تھا کہ رسول بھی ہو اور انسان بھی ہو۔ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (ہود ۱۱:۲۷) ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔

ان کے شبہات میں سے ایک یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اگر حق کا مقابلہ کرتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد لوگوں کے عقیدے اور ان کے مفادات کا تحفظ اور ان سے فساد کو دفع کرنا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں میں یہ شبہہ جو پایا جاتا تھا اور ہر زمانے میں نئی نئی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيٓ أَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗٓ إِنِّيٓ أَخَافُ أَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ أَوْ أَنْ يُّظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ (المؤمن ۴۰:۲۶) ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا: چھوڑو مجھے، میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں، اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمھارا دین بدل ڈالے گا، یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔

سرادارنِ قریش بھی اسی طرح کی بات کہا کرتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کا عقیدہ خراب کرنا چاہتا ہے اور ہمارے معبودوں کو بے وقوف بنانا چاہتا ہے اسی لیے ہم اس کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

ان شبہات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ان کے پاس لاتعداد اموال ہیں، جاہ وجلال ہے، اقتدار ہے اور یہ ساری چیزیں ان کی حقانیت اور ان کے اچھے ہونے کے دلائل ہیں۔ اس وجہ سے وہ سمجھتے تھے کہ وہ داعی سے اچھے ہیں، خواہ رسول ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ونادیٰ فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْٓ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (الزخرف ۴۳: ۵۱-۵۲) ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا: لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے، اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل وحقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا۔

چنانچہ فرعون اپنی حکومت واقتدار اور اپنی مالداری اور قوت سطوت کے گھمنڈ میں تھا اور عوام کا یہ گمان تھا کہ فرعون، جو اس مقام ومرتبے کا مالک ہے، موسیٰ کے مقابلے میں حق کے زیادہ قابل ہے۔ جب کہ موسیٰ کے پاس ان چیزوں میں سے کچھ نہیں ہے، جو فرعون کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنا مطلب ومدعا بھی فصاحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ. وَقَالُوْا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَّأَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (سبا ۳۴: ۳۴-۳۵) کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ ''جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے۔'' انھوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ ''ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔''

ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال اور اولاد عطا فرمائی ہے اس کو وہ اپنی اچھائی اور عذاب سے نجات کی دلیل بناتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کو یہ معلوم نہیں کہ عطا اور محرومی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت کیا ہے۔ مال تو اللہ تعالیٰ کبھی اپنے پسندیدہ لوگوں کو دیتا ہے اور کبھی ناپسندیدہ لوگوں کو۔ اس لیے مال ہی کسی آدمی کی

اچھائی اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی دلیل نہیں ہے۔

یہ شبہات اگرچہ ساری باطل اور غلط ہیں، مگر اس کے باوجود عوام ان سے متاثر ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ جو سنتا ہے وہ متاثر بھی ہوتا ہے، اور اس لیے بھی کہ طبقہ اشرافیہ ان شبہات کو ایسے نرم اور خوب صورت اسلوب کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے جس کی وجہ سے یہ شبہات عوام کی گمراہی اور بہکاوے کے حوالے سے مال کی ترغیب اور قوت کے ذریعے خوف زدہ کرنے کے مقابلے میں زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔

انسان تو زندگی اور اس کے مال و متاع سے محبت رکھتا ہے اور اس بات سے ڈرتا ہے کہ اسے اذیت پہنچے یا فوائد سے محروم رہ جائے۔ اس طرح کے انسانی جذبات کے ساتھ جب شبہات بھی مل جاتے ہیں تو اس کا اثر زیادہ تر عوام پر پڑتا ہے اور ان میں سے کم ہی ایسے ہوتے ہیں جو اس سے بچے ہوتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود انبیائے کرام کے پیروکار اکثر عوام ہی کے طبقے سے ہوتے ہیں، نہ کہ طبقہ اشرافیہ سے۔

۳

منافقین

منافق کی تعریف

۶۱۵ -شرعی اصطلاح میں منافق اس شخص کو کہتے ہیں جو بظاہر وہ بات کہتا ہے جو اس کے باطن میں نہیں ہوتی ۔ اگر اس کے باطن میں ایمانیات کے اصول کی تکذیب ہے تو یہ خالص منافق ہے۔اس کا حکم آخرت میں وہی ہے جو ایک کافر کا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو ایک گونہ زیادہ عذاب دیا جائے گا کیوں کہ اس نے مومنوں کے سامنے اسلام کا اظہار کر کے ان کو دھوکہ دیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء۴:۱۴۵) یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے۔

البتہ اگر اس کے دل میں چھپی ہوئی بات اللہ، اس کی کتاب اور اس کے رسولوں سے کفر نہیں ہے، بلکہ کوئی ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے زمرے میں شامل ہوتی ہے تو یہ وہی ہے جس میں نفاق کے شعبوں میں سے ایک یا کئی شعبے موجود ہوتے ہیں۔اس بحث میں ہم جس چیز کے بارے میں بحث کرنا چاہتے ہیں وہ خالص منافق ہے ۔یعنی جو اپنے دل میں کفر اور اللہ، اس کی کتاب اور اس کے رسول کی تکذیب لیے پھرتا ہے۔اس کے ساتھ ہم ان منافقین کی بعض صفات کا بیان بھی کریں گے، تاکہ مسلمان اس سے نصیحت حاصل کریں۔اس لیے کہ بعض اوقات کسی شخص میں منافقین کی کوئی صفت پائی جاتی ہے مگر اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نفاق کے بعض شعبے ایمان کے ساتھ جمع ہو جائیں۔

منافق کا مقام ومحل

۶۱۶ -جس وقت ایک کافرانہ معاشرے میں اسلامی دعوت کو کامیابی ملتی ہے، اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے،

لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں، کفر کی قوت ٹوٹ جاتی ہے، کافروں کا اقتدار ختم ہوتا ہے اور قوت وشوکت مسلمانوں کو ملتی ہے تو ایسے موقع پر منافق بھی پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو مومنوں کی طرح ایمان بھی نہیں لائے اور بظاہر اپنے کفر پر بھی قائم نہیں ہوتے۔ وہ بظاہر کافروں کے ساتھ نہیں ہوتے، اس لیے کہ ان کو مسلمانوں کی سطوت کا خوف ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے دل میں کفر اور بظاہر اسلام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس مقام پر کفر کا غلبہ ہو اور انھی کو اقتدار حاصل ہو وہاں یہ نفاق موجود نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں کفر کے اظہار اور اسلام کے خلاف بغاوت میں کوئی خوف نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت مدینہ سے پہلے مکہ میں مسلمانوں میں ایک منافق بھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہاں مسلمان قلت میں تھے اور کمزور بنائے گئے تھے۔ ان کا کسی معاملہ میں کوئی بس نہ چل سکتا تھا۔ ان کے پاس کوئی قوت بھی نہیں تھی۔ جتنی قوت تھی وہ کفار قریش کے ہمراہ تھی۔ مگر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کی اور مسلمانوں کو قوت واقتدار مل گیا اور اسلام مدینے میں پھیلنا شروع ہوا تو نفاق بھی سامنے آیا اور منافقوں کا ظہور بھی ہوا۔

نفاق کی بنیاد

۶۱۷- نفاق کی بنیاد کفر اور بزدلی پر قائم ہے۔ کفر تو منافق کے باطن میں موجود ہوتا ہے اور بزدلی وہ چیز ہے جو منافق کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ بظاہر وہ بات کرے جو اس کے باطن میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منافق جہاں بھی ہوتا ہے وہ بزدل ہی ہوتا ہے۔ وہ کم ہمت اور بُز دلا ہوتا ہے۔ چالیں چلنے، جھانسہ دینے اور چھپکے سے اپنا کام نکالنے میں اس کو مہارت ہوتی ہے۔ وہ جب مسلمانوں سے ملتا ہے تو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُ وْنَ (البقرۃ ۲:۱۴) جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے مذاق کر رہے ہیں۔

چنانچہ وہ اپنی بزدلی سے اپنے آپ کو مومن کہتے تھے، مگر جب اپنے جھوٹے اور منافق لیڈروں سے

ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم مومنوں کے ساتھ مذاق کرتے ہیں کہ ان کے سامنے اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتے ہیں۔

نفاق کفر سے بدتر

۶۱۸ - منافق کافر سے زیادہ بدتر اور خطرناک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ کفر میں اس کے برابر ہوتا ہے اور دھوکہ بازی اور تضلیل میں اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔

اس کو مسلمانوں کی صفوں میں گھسنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کا نقصان زیادہ شدید اور اس سے بچاؤ کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ کافر جس کے کفر میں کوئی شک وشبہہ نہ ہو تو اس کی حقیقت کے ظاہر ہونے کی وجہ سے اس کے لیے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کا موقع نہیں ملتا۔

نفاق کی نشانیاں

۶۱۹ - جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ نفاق کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آدمی کے باطن میں کفر ہو اور دراصل جو چیز دل میں ہوتی ہے وہ چھپی ہوتی ہے۔ اس لیے منافق کی پہچان اسی طرح ہوسکتی ہے کہ کسی میں نفاق کی نشانیاں پائی جائیں۔ چنانچہ کسی شخص میں یہ نشانیاں پائی جاتی ہیں تو مسلمان اس سے احتیاط برتتے ہیں اور اس کے شر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ وہ شخص خالص منافق ہو، یعنی ان لوگوں میں سے ہو جو دل میں اللہ اور اس کے رسول کا انکار کر رہا ہو، یا پھر ان لوگوں میں سے جو دل میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں مگر اس ایمان کے ساتھ نفاق کی بعض نشانیوں کا شائبہ بھی موجود ہوتا ہے اور اس میں منافقین کی بعض صفات پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ جس میں منافقین کی بعض صفات پائی جائیں، اس کے ساتھ منافقین کا سا معاملہ کیا جائے گا، مگر اسی حد تک جتنی اس کے عمل اور کردار میں منافقت پائی جائے۔ پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کے دل میں ایمان باللہ موجود ہے یا نہیں۔ [اس لیے کہ دل کا علم ہماری رسائی سے باہر ہے]۔

۶۲۰ - منافقت کی نشانیاں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت سے معلوم ہوتی ہیں نہ کہ ان طریقوں سے جو لوگوں کے ہاں متعارف ہیں۔ لوگوں کے نزدیک ان نشانیوں میں بعض ایسی ہیں جو حسن

سلوک اور اخلاق و آداب کے لوازمات میں شمار کی جاتی ہیں۔ نفاق اور منافقین کی صفات میں اس طرح کے بھونڈے جواز فراہم کرنے سے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اصل اعتبار چیزوں کے مسمیات کا ہوتا ہے نہ کہ ان کے اسما کا۔ کسی چیز کی حقیقت وہی رہتی ہے، اگرچہ لوگ ہزار مرتبہ اس کا نام تبدیل کر دیں۔

منافق کی علامات وصفات

۶۲۱- اب سوال یہ ہے کہ منافق کی نشانیاں اور صفات کیا ہیں تو ذیل میں ہم کچھ نشانیاں اور صفات بیان کرتے ہیں:

۱- دل کا مرض

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (البقرۃ ۲:۱۰) ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور بڑھا دیا، اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

دل کی یہ بیماری دراصل فساد کی ایک قسم ہے جو دل کو لاحق ہو جاتی ہے اور ادراک و ارادہ کو خراب کر دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو یا تو حق نظر نہیں آتا، یا اگر نظر آتا ہے تو اپنی اصل حالت میں نہیں۔ ارادے کی خرابی کی وجہ سے وہ حق سے نفرت کرتا ہے جو ایک نافع چیز ہے اور باطل کو پسند کرتا ہے جو ایک غلط اور مضر شے ہے۔ جو شخص دل کی اس بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کو ایسی ایسی چیزیں بھی نقصان پہنچاتی ہیں جو دوسروں کے لیے کوئی اپنے اندر کوئی نقصان نہیں رکھتیں۔ ایک معمولی بات بھی اس کی شہوت کو بھڑکا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهِ مَرَضٌ (الاحزاب ۳۳:۳۲) تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی بیماری کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے۔

دبی زبان سے بات کرنا ایک فاسد اور بیمار دل والے انسان کی شہوت کو بھڑکا سکتا ہے۔ جب کہ جس شخص کے دل میں کوئی بیماری نہ ہو تو اگر ایک عورت اس کے ساتھ تعرض کرے تب بھی وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔

یہی حالت مختلف قسم کے شبہات کی بھی ہوتی ہے۔ایک بیمار دل والے آدمی کے لیے معمولی شبہہ بھی بہت سے شکوک کا ذریعہ بن جاتا ہے اور ایک معمولی فتنہ بھی اس کے قدموں کو ڈگمگا دیتا ہے اور اس کو اُلٹے پاؤں پھرنے پر آمادہ کردیتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (الحج ۲۲:۵۳) تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنادے، ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں کو (نفاق کا) روگ لگا ہوا ہے۔

اگر منافق خالص نفاق میں مبتلا ہو تو اس کو دل کی بیماری کا ایک وافر حصہ نصیب ہوتا ہے اور اگر اس کے دل میں ایمان موجود ہو مگر اس میں منافق کی نشانیاں پائی جاتی ہوں، تب بھی اس کو دل کی بیماری کا جو حصہ ملتا ہے، کچھ کم نہیں ہوتا۔

۲-فساد فی الارض

۶۲۲-اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَاتُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ قَالُوْآ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ. أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (البقرۃ ۲:۱۱-۱۲) جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو، تو انھوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انھیں شعور نہیں ہے۔

یہ لوگ فساد کرتے ہیں مگر انھیں شعور نہیں ہوتا کہ فساد کررہے ہیں۔ بلکہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کرنے والے ہیں۔فساد سے مراد قولی اور عملی کفر اور گناہ کا کام خود بھی کرنا اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دینا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے یا دوسروں کو اس کا حکم دیتا ہے تو وہ زمین میں فساد برپا کرتا ہے۔اس لیے کہ زمین کی اصلاح اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری اور اس کا فساد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہے۔

منافقین کا فساد یہ ہے کہ وہ کفر و شرک کرتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلاتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کو دھوکہ دیتے ہیں، دین کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں اور اس کے دوستوں اور اس کی طرف دعوت دینے والوں سے دشمنی کرتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے دیگر امور جو اُن کی صفات سے سامنے آتے

ہیں، ان کے فساد کی مثالیں ہیں۔

۳۔ مومنوں پر کم عقلی کا الزام

۶۲۳۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ (البقرۃ ۲:۱۳) اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انھوں نے یہی جواب دیا کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟ خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے قوف ہیں مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔

سفیہ اس شخص کو کہتے ہیں جو نادان ہو، کوئی رائے نہ رکھتا ہو اور اسے اپنے نفع نقصان کی تمیز نہ ہو۔[1]

مگر حقیقت یہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، یہ لوگ خود کم عقل ہیں۔ بلکہ کم عقلی انھی پر اور ان کی طرح کے کافر پر تمام ہے۔ پھر ان کی جہالت کی انتہا یہ ہے کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ جہالت اور گمراہی میں مبتلا ہیں۔

۴۔ جھگڑالو پن اور گناہ پر فخر

۶۲۴۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ. وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ. وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ (البقرۃ ۲:۲۰۴-۲۰۶) انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمھیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھیراتا ہے، مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے، حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر، تو اپنے

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۵۰

وقار کا خیال اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہے۔

منافق آدمی بہت اچھی گفتگو کرتا ہے۔ منہ چبا کر چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے۔ اپنے اسلام کا اعلان کرتا ہے۔ وہ اللہ کو اور مومنوں کو اس بات پر گواہ کرتا ہے کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔ مگر یہ سخت جھگڑالو، اور اپنے جھگڑے میں کج روی اختیار کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کی کج روی یہ ہوتی ہے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے، حق سے انکار اور افترا پردازی کرتا ہے اور گالیاں بکتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث صحیح میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ. منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ بولتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے اور جھگڑتا ہے تو گالیاں بکتا ہے۔

اس سب کچھ سے اس کا مقصد زمین میں فساد برپا کرنا ہوتا ہے، اس لیے کہ اسے فساد فی الارض اور لوگوں کو نفع پہنچانے والی چیزوں کو تباہ کرنے کے علاوہ کسی چیز کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور تم یہ جو فاجرانہ بات اور فاسدانہ سعی کرتے ہو اس سے ہاتھ اٹھا کر حق کی طرف رجوع کرو تو وہ صاف انکار کرتا ہے، بلکہ اُلٹا گناہ کی حمیت میں آتا ہے اور غصے سے لال پیلا ہو جاتا ہے۔

۵- کفار سے دوستی اور مومنوں سے دشمنی

۶۲۵- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا. الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَيَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا.... الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ وَإِنْ كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (النساء ۴: ۱۳۸-۱۴۱) اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انھیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے...... یہ منافق تمھارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے)

اگر اللہ کی طرف سے فتح تمھاری ہوئی تو آ کر کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو اُن سے کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟ بس اللہ ہی تمھارے اور ان کے معاملے کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور (اس فیصلے میں) اللہ نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔

منافق کافروں سے دوستی رکھتا ہے، ان کی مدد کرتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔ وہ جب ان کے ساتھ الگ ہوتا ہے تو ان سے کہتا ہے کہ حقیقت میں وہ انھی کا ساتھی ہے۔

منافقوں کی ایک صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ اسلامی مملکت کے زوال اور کافروں کے غلبے اور ان کے دین کا نام ونشان مٹنے کے منتظر ہوتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوتی ہے تو یہ منافق آ کر ان سے کہتے ہیں: کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو یہ ان کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ کیا ہم اندر اندر تم سے ملے ہوئے نہ تھے؟ اس طرح منافق مسلمانوں اور کافروں دونوں کے ساتھ مفاہمت رکھتے ہیں، اگرچہ ان کی دلی محبت اور زیادہ میلان کفار کی طرف ہی ہوتا ہے۔ مگر وہ نہیں چاہتے کہ کھلم ان کے ساتھ ہونے کا اعلان کریں یا مسلمانوں کے خلاف جنگ میں وہ مشقت اٹھائیں جو علانیہ کافر اٹھاتے ہیں۔

۶- دھوکہ، ریا اور عبادات میں سستی

۶۲۶- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا. مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (النساء۴: ۱۴۲-۱۴۳) یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے، جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اُٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانوا ڈول ہیں۔ نہ پورے اِس طرف ہیں نہ پورے اُس طرف۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔

منافقین کی صفات میں ایک یہ ہے کہ وہ دھوکہ باز ہوتے ہیں۔ اللہ کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور لوگوں کو بھی۔ اللہ کو دھوکہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح لوگوں کے درمیان ان کا معاملہ 'چل' رہا ہے، ظاہر میں ان پر مسلمانوں کے احکام جاری ہوتے ہیں اور ان کی حقیقت لوگوں سے پوشیدہ ہے، اس طرح آخرت میں اللہ کے ہاں بھی ان کا معاملہ مخفی ہی رہے گا، مگر یہ ان کی محض جہالت ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے زمین و آسمان میں کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔

اسی طرح ان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ عبادات میں سستی کرتے ہیں۔ ان کو جب نماز یاد آتی ہے اور اس کے لیے اٹھتے ہیں تو سستی کے ساتھ اٹھتے ہیں۔ ان کو نہ اس سے کوئی محبت ہوتی ہے اور نہ اسے ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، مگر صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز جیسی حرکات کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تِلْکَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ. تِلْکَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ. تِلْکَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ. يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰى إِذَا كَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ قَامَ فَنَقَرَ أَرْبَعًا لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا.

یہ ہے منافق کی نماز۔ یہ ہے منافق کی نماز۔ یہ ہے منافق کی نماز۔ وہ بیٹھ کر سورج کا انتظار کرتا ہے، جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو یہ اُٹھ کر چار ٹھونگے مارتا ہے، مگر اس میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہے۔

منافق حیران و پریشان ہوتے ہیں۔ وہ ظاہراً اور حقیقتاً نہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور نہ کافروں کے ساتھ۔

۷- طاغوت سے فیصلہ کروانا

۶۲۷- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ اٰمَنُوا بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْکَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ يُرِيدُونَ أَنْ يَّتَحَاكَمُوٓا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوٓا أَنْ يَّكْفُرُوا بِهٖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا. وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْکَ صُدُودًا. فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوکَ يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَانًا وَّتَوْفِيقًا. أُولٰٓئِکَ الَّذِينَ يَعْلَمُ

اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا. (النساء۴: ۶۰-۶۳) اے نبیؐ! تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رُجوع کریں، حالانکہ انھیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انھیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمھاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔ پھر اس وقت کیا ہوتا ہے جب ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آ پڑتی ہے؟ اس وقت یہ تمھارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، ان سے تعرض مت کرو، انھیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اُتر جائے۔

منافقین کی ایک صفت ان کا یہ گمان ہے کہ وہ اس چیز پر ایمان لائے جو اللہ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے یا ان سے پہلے اپنے رسولوں پر نازل کی ہے۔ اس زبانی دعوے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنے فیصلے طاغوت سے کروائیں، جو سراسر باطل ہے، اور طاغوت ہر وہ چیز ہے جو قرآن وسنت کے خلاف ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم دیا ہے کہ اس سے بیزاری کا اعلان کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان یہ لوگ اپنے فیصلے کتاب وسنت کے بجائے کسی اور کے پاس لے جا کر گمراہی میں دور جا گریں۔

پھر جب ان کے اپنے نفاق اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے بغاوت اختیار کرنے کی مصیبت ان پر آ پڑتی ہے تو ان کی کیا حالت ہوتی ہے؟ اس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے یوں کھینچا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طاغوت کے پاس فیصلہ لے جانے سے ہمارا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ فریقین کا بھلا ہو اور دونوں کے درمیان موافقت، اصلاح اور خیر کا راستہ نکل آئے۔ مگر اللہ کے دین اور اس کی شریعت سے انحراف کرنے والے ان منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں بیماری اور نفاق موجود ہے۔ چنانچہ آپؐ کو نصیحت کی گئی ہے ان کو رہنے دیجیے اور ان کے دل

کے نفاق کی وجہ سے ان کے ساتھ سختی نہ کیجیے۔ البتہ ان کو اس نفاق سے روکا جا سکتا ہے جو ان کے دلوں میں موجود ہے۔ آپ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کو ایسی مؤثر نصیحت کیجیے جو اُن کے دلوں پر اثر انداز ہو جائے۔

۸۔ مسلمانوں کے درمیان فساد ڈالنا

۶۲۸- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ (التوبۃ ۹:۴۷) اگر وہ تمھارے ساتھ نکلتے تو تمھارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمھارے درمیان فتنہ پردازی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے، اور تمھارے گروہ کا حال یہ ہے کہ ابھی اُن میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔ اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

منافقین کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو کمزور کرنے، ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور انھیں آپس میں لڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ درج بالا آیت کریمہ ان اور اس طرح کے دیگر معانی کی وضاحت کر رہی ہے۔

بعض اوقات مسلمان اس بات سے غم زدہ ہو جاتے ہیں کہ فلاں فلاں لوگ ہمارے ساتھ نہیں ملے اور انھوں نے ہمارے کام میں ہمارے ساتھ شرکت نہیں کی۔ ان کا تو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی انھی میں سے ہیں اور اگر وہ ان کے ساتھ نکلتے تو اس سے انھیں فائدہ ہوتا۔ مگر اللہ کے علم میں کچھ اور ہے۔ اگر یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ نکلتے تو انھیں نقصان، فساد، چغل خوری، مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے اور ان کے درمیان اضطراب پیدا کرنے کے سوا کچھ فائدہ نہ دیتے۔ یہ لوگ ضرور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرتے، ان کے درمیان چغل خوری کرتے اور ان کے درمیان بغض و فساد پیدا کرتے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ مسلمانوں کے درمیان ایسے لوگ موجود تھے جو ان منافقین کی باتیں کان لگا کر سنتے تھے، یعنی ان کی پیروی کرتے تھے اور ان کی باتوں پر لبیک کہتے تھے۔ وہ انھی لوگوں کو اپنا خیر خواہ سمجھتے تھے اور انھی سے مشورے لیتے تھے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کو ان کا حال معلوم نہ تھا۔ اگر یہ کام ہو جاتا تو اس سے مسلمانوں کے درمیان فتنہ برپا ہو جاتا۔[1]

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۶۱

۹-جھوٹ، خوف اور مسلمانوں سے نفرت

۶۲۹- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُونَ. لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ (التوبۃ ۹:۵۶-۵۷) وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمھی میں سے ہیں، حالاں کہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں۔ اصل میں تو وہ ایسے لوگ ہیں جو (تم سے) خوف زدہ ہیں۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پالیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ، تو بھاگ کر اُس میں جا چھپیں۔

منافقین کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتے اور اس پر قسمیں کھاتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ – وفِي رِوَايَةٍ – وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ. منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ بولتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے، اور — ایک روایت میں ہے — جھگڑتا ہے تو گالیاں بکتا ہے۔

آیت کریمہ میں منافقین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں، مگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے اور خوف رکھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ان کے جھوٹ کا اصل محرک یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ان کا کفر ظاہر ہو گیا تو مسلمان ان کو سزا دیں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کو ناپسند کرنے کی بنا پر وہ نہ مسلمانوں سے میل جول پسند کرتے ہیں اور نہ انھیں دیکھنا گوارا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب اسلام اور اہل اسلام کو دیکھتے ہیں کہ انھیں عزت اور فتوحات ملتی ہیں تو یہ غم زدہ اور پریشان ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ان کے لیے خوشی کی نہیں بلکہ پریشانی کی بات ہے۔ اگر ان کو کوئی ٹھکانا، کوئی کھوہ یا کوئی غار مل جائے تو یہ بھاگ کر اس میں چھپ جائیں، تاکہ وہ مسلمانوں سے چھپے رہیں اور ان پر نظر تک نہ پڑے۔

۱۰-اہل حق کی عیب جوئی اور خود پسندی

۶۳۰- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَّمْ

يُعْطَوْا منهَآ إِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ (التوبۃ ۹:۵۸) اے نبیؐ! ان میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراضات کرتے ہیں، اگر اس مال میں سے انھیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں، اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں۔

منافقین کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اہل حق پر اعتراضات کرتے ہیں اور ان کے سچے اور عادلانہ اعمال پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ منافقین حق اور عدل کو پسند نہیں کرتے۔ ان رضامندی اور ناراضی اپنے لیے ہی ہوتی ہے۔ ان کو جو کچھ مطلوب ہوتا ہے اگر وہ ان کو دے دیا جائے تو راضی ہوتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو یہ ناراض ہوتے ہیں اور غضب ناک ہوتے ہیں۔ پھر یہ اہل حق پر ظلم وزیادتی کا الزام لگادیتے ہیں۔

یہ معاملہ ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں آیت کریمہ میں آگاہ کر دیا ہے۔ منافقین میں بعض لوگ ایسے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صدقات کی تقسیم میں اعتراض کرتے تھے۔ اگر اس میں ان کو کچھ دیا جاتا تو یہ راضی ہوتے اور خاموش رہتے، لیکن اگر ان کو کچھ نہ دیا جاتا تو پھر ناراض ہوتے اور غصے میں آجاتے تھے۔

یہی معاملہ ہر دور میں منافقین کا ہوتا ہے۔ اگر ان کو وہ چیز دے دی جائے جس کے وہ لالچی ہوتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور اگر انھیں کچھ نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی رضامندی اور ناراضی میں اپنے آپ کو دیکھتے ہیں، نہ کہ حق اور عدل کو۔

۱۱- بھلائی سے روکنا اور برائی کا حکم دینا

۶۳۱- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَّأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وينهوْن عَنِ الْمَعْرُوْفِ ويَقْبِضُوْنَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ هُمُ الْفَاسِقُوْن. (التوبۃ ۹:۶۷) منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔ یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں۔

منافقین کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے روکتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے بیمار دل ابھی اس بات کو پسند نہیں کرسکتے کہ لوگوں کو بھلائی کرتے ہوئے دیکھیں۔ وہ دل سے یہی چاہتے ہیں کہ لوگوں میں شر اور منکر پھیلے۔ اس سے ان کے غضب اور حسد کی آگ بجھتی ہے جو مسلمانوں کے خلاف ان کے دل میں بھڑک رہی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ برائیوں میں ان کے اور دوسرے لوگوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

ان تمام بری صفات کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ اپنا مال اللہ کی رضا کے لیے خرچ نہیں کرتے۔ چنانچہ انفاق فی سبیل اللہ اور بھلائی کے کاموں میں، بھلائی کی طرف دعوت دینے میں اور اس کی طرف رہنمائی کرنے میں وہ سخت بخیل ہوتے ہیں۔

١٢- دھوکہ دہی اور وعدہ خلافی

٦٣٢- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنۡهُم مَّنۡ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتَانَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ. فَلَمَّاۤ اٰتَاهُم مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَتَوَلَّوۡا وَّهُم مُّعۡرِضُوۡنَ. فَأَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ إِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ أَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَبِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ. (التوبۃ ٩: ٧٥-٧٧) ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولت مند کر دیا تو وہ بخل پر اُتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انھیں اس کی پروا تک نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو انھوں نے اللہ کے ساتھ کی، اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے، اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔

منافقین کی صفات میں سے ایک دھوکہ دہی، خیانت اور وعدہ خلافی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بھی دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک مسلمان سے اس کے کلمہ توحید کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے بھی دھوکہ دہی، خیانت اور وعدہ خلافی نہ کرے اور اللہ سے تو ظاہر ہے کہ نہیں کرے گا۔

آیت کریمہ یہ بات بتا رہی ہے کہ منافقین میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کے ساتھ عہد باندھتے ہیں

کہ اگر اللہ نے اپنے فضل سے اس کو مال دار کردیا تو وہ ضرور صدقہ کرے گا اور نیک بن کر رہے گا مگر اس نے اپنے عہد کو وفا نہیں کیا اور وہ اپنے دعوے میں سچا ثابت نہیں ہوا۔ چنانچہ ان کے اس دوغلے پن کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں نفاق کی بیماری پیدا ہوگئی اور وہ ان کے دلوں میں ایسے چپک گئی کہ قیامت تک کے دن تک ان کے ساتھ چپکی رہے گی، جب کہ یہ اپنے رب سے ملیں گے۔[1]

۱۳-مومنوں کا مذاق اڑانا اور ان سے ناراضی

۶۳۳-اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ (التوبۃ ۹:۷۹) (اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ان کنجوس دولت مندوں کو) جو برضا ورغبت دینے والے اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہِ خدا میں دینے کے لیے) اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر برداشت کرکے دیتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

منافقین کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کی عیب چینی کرتے ہیں اور ان پر اعتراضات کرتے ہیں۔ وہ کسی چیز سے بھی راضی نہیں ہوتے۔ اگر کوئی مسلمان بہت سارا مال خرچ کرتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ یہ ریاکار ہے اور اگر کوئی تھوڑا مال خرچ کرتا ہے کیوں کہ اس کے پاس زیادہ ہوتا نہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اس کے صدقے کی اللہ تعالیٰ کو کیا حاجت ہے۔ اس عیب کے علاوہ وہ مسلمانوں کا مذاق بھی اڑاتے ہیں، اور ان کا ٹھٹھا کرتے ہیں اور ان پر ہنستے ہیں۔

۱۴-ترکِ جہاد کی تلقین

۶۳۴- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْا أَنْ يُّجَاهِدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَّوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (التوبۃ ۹:۸۱) جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انھیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے

۱-تفسیر ابن کثیر، ج ۲،ص ۳۷۱؛ تفسیر القرطبی، ج ۸،ص ۲۱۰

جہاد کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ ’’اس سخت گرمی میں نہ نکلو‘‘۔ ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش، انھیں اس کا شعور ہوتا۔

منافق کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ علم و معرفت اور سمجھ بوجھ سے عاری ہوتا ہے۔ وہ ایمان باللہ کو چھوڑ دیتا ہے، اس کے راستے میں جہاد سے پیچھے رہ جاتا ہے، دوسرے منافقین کو بھی جہاد نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے، اس لیے کہ جہاد میں تو بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے، جیسے گرمی اور سردی کو برداشت کرنا، مگر منافق یہ بات بھول جاتا ہے کہ جہنم کی آگ اس سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ عقل مند وہ ہے جو ایسا عمل کرے کہ اسے جہنم سے بچائے۔

۱۵- مضرت رسانی اور دورنگی

۶۳۵- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ. لَا تَقُمْ فِيْهِ أَبَدًا لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ أَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (التوبۃ ۹:۱۰۷) کچھ لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوتِ حق کو) نقصان پہنچائیں، اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں، اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں، اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔

آیت میں منافقین کے بعض ان ’کارناموں‘ کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں انجام دیے تھے۔ انھوں نے مسجد قبا کے قریب ایک مسجد بنائی، جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ مسجد قبا کے لوگوں کو نقصان پہنچائیں، جو خالص مسلمان تھے۔ اس کا دوسرا مقصد اللہ کے رسول کا انکار اور اللہ اور اس

کے رسول کے ساتھ برسر پیکار ہونا تھا۔ چنانچہ ان کے تعمیر مسجد کا اصل مقصد یہی تھا اگر چہ وہ جھوٹی قسمیں کھا رہے تھے کہ اس مسجد کی تعمیر سے ان کا مقصد بھلائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یعنی وہ مسلمانوں کی بھلائی چاہتے تھے اور ان کے ساتھ مہربانی کر رہے تھے، تاکہ اگر کسی کو عذر ہو یا کوئی مصروفیت ہو تو اس میں نماز ادا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ وہ جو قسمیں کھا رہے ہیں اس میں وہ جھوٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اس مسجد کو ڈھا دیں اور اس میں نماز نہ پڑھیں۔ مسجد قبا جس کی بنیاد تقویٰ پر اور طلب رضائے الٰہی کے لیے رکھی گئی تھی، وہی اس بات کی مستحق ہے کہ مسلمان اس میں نماز پڑھیں اور اس میں بھلائی کے لیے اکٹھے ہوں۔

''یہ مسجد اب بھی مختلف صورتوں میں بنائی جاتی ہے۔ یہ صورتیں ان ناپاک وسائل کے مطابق ہوتی ہیں جنھیں دین کے دشمن اپناتے ہیں۔ مثلاً کسی ایسی سرگرمی کی صورت میں مسجد ضرار کی تعمیر کی جاتی ہے جن کا مقصد بظاہر اسلام کے لیے کام کرنا ہو، مگر دراصل اس کے پیش نظر اسلام صفحہ ہستی سے مٹانا، اس کی شکل بگاڑنا اور اس پر ملمع کاری کر کے دوسروں کے لیے قابل قبول بنانا ہو۔

یہ 'مسجدیں' ایسے اداروں کی شکل میں بنائی جاتی ہیں جن پر دین کا بورڈ چسپاں کیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کے لیے آڑ بنے، ورنہ وہ دین ہی کو نشانہ بناتے ہیں۔ اسی طرح یہ 'مسجدیں' ایسی تنظیموں، کتابوں اور تحقیقی بحثوں کی صورت میں قائم کی جاتی ہیں جو دین سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان بہت سے 'مساجدِ ضرار' کے پیش نظر یہ بات ضروری ہے کہ ان کو بے نقاب کیا جائے، ان سے وہ بورڈ اُتار دیے جائیں جو دین کے نام پر دھوکہ دینے والے ہیں۔ لوگوں کے سامنے ان کی حقیقت واضح کرنا اور ان کے مقاصد کو بے نقاب کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے لیے بہترین نمونہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مسجد ضرار کی حقیقت واضح کی گئی۔[1]

۱۔ فی ظلال القرآن، ج ۱۱، ص ۳۶

۴

گناہ گار لوگ

۶۳۶-لوگوں کی قسموں میں سے ایک قسم کے طور پر گناہ گاروں سے ہماری مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل میں ایمان کی اصل بنیاد موجود ہو۔ ایمان کی بنیاد اس گواہی پر ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ مگر ایمان کی بنیاد موجود ہونے کے باوجود ان لوگوں میں کمی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس گواہی کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ شریعت کے بعض اوامر کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور شریعت کے بعض نواہی سے آلودہ ہوتے ہیں۔

پھر ان میں بعض وہ ہوتے ہیں جو زیادہ گناہ کرتے ہیں اور بعض کم۔ اس کے علاوہ بھی ان کے بے شمار درجات اور نوع بنوع مراتب ہیں۔ ان کی گنتی اللہ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔

مسلمان معصوم عن الخطا نہیں

۶۳۷-مسلمان گناہ اور خطا سے معصوم نہیں ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ كُلُّ ابْنِ آدَمَ خَطَّاءٌ وَّخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ. ہر انسان سے غلطی ہوسکتی ہے، مگر غلطی کرنے والوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو توبہ کرے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا نفس جس طرح ثواب کا کام کرنے کے قابل ہے، اسی طرح گناہ کا کام کرنے کے بھی قابل ہے۔ مسلمان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کا طالب رہے اور اس کی نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا. فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا. قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا. وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس ۹۱: ۷-۱۰) اس کی بدی اور اس کی پرہیز گاری اس پر الہام کردی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

مسلمان جب کسی معصیت میں پڑتا ہے تو اس کو چاہیے کہ جلد از جلد توبہ کی طرف متوجہ ہو، اپنے گناہ سے باز آجائے اور اپنے رب کی طرف رجوع کرے۔

گناہ کے اسباب

۶۳۸- ذہن میں اکثر یہ سوال آتا ہے کہ ایک مسلمان شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کیوں کرتا ہے، حالانکہ وہ اللہ پر، اس کے رسول پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کا ایمان ہے کہ خالق کی نافرمانی اس کی ناراضی اور عذاب کا ذریعہ بنتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمان کے دل میں ایمان کبھی کبھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس صورت میں اُس کی شہوت اس پر غالب آتی ہے اور وہ شیطان کی اکساہٹ کو قبول کر کے گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ گناہوں پر سزا تو وہ آخرت میں دی جاتی ہے، جب کہ دنیا کی لذتیں ہاتھوں ہاتھ ہوتی ہیں۔ نفس کی فطرت یہ ہے کہ وہ غائب چیز کی نسبت، موجودہ چیز سے زیادہ متاثر ہوتا ہے، اگرچہ موجود کا انجام کڑوا اور غائب کا انجام میٹھا ہوتا ہے۔ اس اثر سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی، سوائے مضبوط اور روشن ایمان کے، جو غائب کو حاضر کی طرح بنا دیتا ہے۔ چنانچہ اس صورت میں آدمی غائب سے متاثر ہوتا ہے، نہ کہ حاضر اور محسوس چیز سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (الاعلیٰ ۸۷:۱۶) مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ فوری لذت کو مؤخر لذت پر ترجیح دیتا ہے خواہ فوری لذت کتنی ہی کم اور مؤخر لذت کتنی ہی بڑی ہو۔ جب ایمان کمزور ہوتا ہے تو انسان کی یہ فطرت اور جبلت قوت پکڑتی ہے اور انسان فوری لذت کے حصول یا فوری تکلیف سے بچنے کے لیے احکام الٰہی کی مخالفت کو آسان سمجھتا ہے، خصوصاً اس صورت میں کہ انسان کو باقی رہنے اور مستقبل میں توبہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کی امید ہوتی ہے

گناہ گار کی نادانی

۶۳۹- گناہ گار آدمی قطعاً نادان ہوتا ہے۔ اگر وہ نادان نہ ہوتا تو وہ کبھی گناہ نہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (النساء۴:۱۷) جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انھی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔

مجاہدؒ اور کئی اہل علم فرماتے ہیں: جو شخص گناہ کرتا ہے، خواہ عمداً ہو یا سہواً تو وہ نادان ہی ہوتا ہے جب تک کہ وہ اپنے گناہ سے ہاتھ نہ اٹھائے۔ قتادہؒ ابوالعالیہؒ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کو یہ بات سناتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کہا کرتے تھے: انسان جو بھی گناہ کرتا ہے یہ اس کی نادانی ہوتی ہے۔ مجاہدؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ انھوں نے کہا: جو شخص بھی گناہ کا کام کرتا ہے وہ اس کام کے وقت نادان ہی ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یہ آدمی کی نادانی ہے کہ وہ برا عمل کرتا ہے۔[1]

گناہ گار کی نادانی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی قدر نہیں جانتا اور وہ اس کی اطاعت سے، جو اس پر لازم ہے، بے خبر ہوتا ہے۔ یہ اطاعت اللہ کی ربوبیت، اس کی الوہیت، اس کی عظمت، اس کے کمال نعمت اور بندے کے کمال فقر کی بنا پر اس پر لازم ہے۔ نیز اس لزوم کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مخلوق جو بھی عمل کرے وہ اللہ تعالیٰ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

گناہ گار کی نادانی یہ بھی ہے کہ وہ گناہوں کے ضرر سے بے خبر ہوتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ سانپ اور بچھو سے بھی زیادہ اپنے گناہوں سے ڈرتا، ان چیزوں کو تو کوئی ہاتھ تک نہیں لگاتا، اور نہ انھیں جسم پر ڈالتا ہے۔ مگر گناہ گار کی نادانی دیکھیے کہ وہ گناہوں کو نہ صرف قبول کرتا ہے، بلکہ انھیں اپنے اوپر لاد دیتا ہے۔

گناہ گار کی نادانی یہ بھی ہے کہ وہ فوری چیز کو مؤخر چیز پر ترجیح دیتا ہے، حالانکہ دنیا اور اس میں موجود لذتوں کی جنت اور اس کی عظیم نعمتوں کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں ہے جو سمندر کے درمیان اور اس میں انگلی ڈبونے سے نکلنے والے پانی کے درمیان ہے۔

۱- تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص ۴۶۳

یہ بھی گناہ گار کی نادانی ہوتی ہے کہ وہ توبہ کو آج کل پر ٹالتا رہتا ہے، اور اس کے بارے میں لمبی لمبی امیدیں باندھتا ہے۔ وہ اس پر غور نہیں کرتا کہ موت انسان کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔ جب موت کا وقت آتا ہے تو وہ کسی سے پوچھتی نہیں ہے۔

یہ بھی اس کی نادانی ہے کہ وہ دنیا کی ہاتھوں ہاتھ کامیابی کے لیے بہت سی لذتوں کو چھوڑ دیتا ہے اور اپنے آپ کو بہت مشقت میں ڈالتا ہے۔ اگر وہ سمجھ دار ہوتا تو آخرت کے لیے بھی وہی کچھ کرتا، جو اس دنیا کی کامیابی کے لیے کرتا ہے۔ ایک طالب علم اپنے آپ کو اپنے گھر میں قید کر لیتا ہے اور کئی دنوں بلکہ کئی ہفتوں تک پڑھتا اور یاد کرتا ہے، تاکہ امتحان میں کامیاب ہو۔ چنانچہ اس دوران میں وہ کئی قسم کی لذتوں کو قربان کر دیتا ہے۔ ایک تاجر بہت سے خطرات کو مول لیتا ہے، اپنے اہل وعیال سے دور ہو جاتا ہے، بہت سے نشیب وفراز طے کرتا ہے، اور اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ کچھ مال حاصل کر سکے۔ چنانچہ ایک شخص آخرت کے لیے اتنا عمل کیوں نہ کرے جیسے وہ ان صورتوں میں کرتا ہے۔

پھر کیا یہ ایک گناہ گار کی نادانی نہیں ہے کہ جب وہ ایک ڈاکٹر کی بات سنتا ہے کہ اگر اس نے فلاں چیز کھائی، یا فلاں چیز پی لی تو وہ مر جائے گا یا پھر سخت خطرے سے دوچار ہوگا، تو وہ ڈاکٹر کی بات پر عمل کرتا ہے اور جس چیز سے ڈاکٹر نے روکا ہوتا ہے اس سے اپنے آپ کو روکتا ہے، حالانکہ ڈاکٹر کی بات غلط بھی ہو سکتی ہے۔ جب کہ وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی حدود کو پامال کرتا ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت وعید اور عذاب ہے، تو یہ ایک سچی اور یقینی بات ہے۔ چنانچہ کیوں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو قبول نہیں کرتا اور ایک ڈاکٹر کی بات کو قبول کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص جاہل اور نادان نہ ہو تو وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔

یہ بھی گناہ گار کی نادانی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی اور اس کی رحمت کی آڑ لیتا ہے اور یہ بات بھول جاتا ہے کہ اللہ کی رحمت قریب ہے مگر نیکوکاروں کے۔ رہے وہ لوگ جو سمجھ دار ہوتے ہیں تو وہ جو کچھ پیش کر سکتے ہیں اسے پیش کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں خوف ہوتا ہے، کہ ان کی پیش کش مسترد نہ کی جائے۔ اصل میں 'امید ورَجا' کا حامل وہ ہے جو اسباب فراہم کرتا ہے اور پھر اللہ علیم وخبیر کی رحمت کا انتظار کرتا ہے۔ بالکل اس کسان کی طرح جو زمین میں ہل چلاتا ہے، اس میں بیج ڈال دیتا ہے، اسے پانی دیتا ہے اور فصل کی نگرانی کرتا ہے، اور پھر امید رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی فصل کی حفاظت کرے گا اور اسے آفات سے

محفوظ رکھے گا۔ مگر جو شخص نادان اور احمق ہوتا ہے وہ زمین کو بنجر حالت میں چھوڑ دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ کانٹوں سے بھر جاتی ہے۔ وہ اس میں بیج بھی نہیں ڈالتا اور اللہ سے امید رکھتا ہے کہ وہ اسی زمین سے اس کو پیداوار عطا فرمائے گا۔

گناہوں سے بچاؤ

۶۴۰- گناہ کا ارتکاب کرنے یا اس کی طرف مائل ہونے سے کیسے بچا جائے، اس کی طرف اگرچہ ہم نے بعض اشارے کیے ہیں۔ مگر اس کا تفصیلی ذکر ہم چوتھے باب میں دعوت کے اسالیب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کریں گے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ علاج سے پرہیز بہتر ہے۔ یہ ضرب المثل جس طرح کہ جسمانی امراض کے بارے میں صادق ہے اسی طرح دل کی بیماریوں پر بھی صادق ہے۔ گناہ دل کی بیماری کا سبب بھی ہے اور اس بیماری کا نتیجہ بھی۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ گناہوں سے کیسے بچا جائے؟

ہر نفس میں گناہ کی استعداد اور قابلیت پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا. فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس ۹۱:۸) اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیز گاری اس پر الہام کر دی۔

معلوم ہوا کہ نفس میں گناہ کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ جب تک کہ دل صحت و عافیت میں ہو اور ایمان سے معمور ہو تو یہ جراثیم مغلوب اور مقہور ہوتے ہیں۔ جب ایمان کسی بھی وجہ سے کمزور ہوتا ہے اور یہ جراثیم اپنے لیے کوئی مناسب ماحول پا لیتے ہیں تو یہ جراثیم پھلتے اور پھولتے ہیں اور ان کی فعالیت بروئے کار آتی ہے۔ چنانچہ اس کا بھی وہی معاملہ ہوتا ہے جو جسم کے جراثیم کا ہوتا ہے۔

گناہوں کے جراثیم کے لیے مناسب ماحول وہ تمام اشیا ہیں جو گناہ پر اُبھارنے والی ہوتی ہیں۔ خواہ وہ نظر آنے والی ہوں یا ہاتھ سے محسوس کی جانے والی، سننے سے تعلق رکھنے والی ہوں یا معلومات کی صورت میں سامنے آنے والی، یا پڑھنے سے علم میں آنے والی۔ ان میں سے کوئی بھی چیز جب شہوت کو اُبھارتی ہے تو وہ گناہ کی طرف لے جاتی ہے اور اللہ کے ذکر سے غافل کر دیتی ہے۔

چنانچہ گناہ کے جراثیم کے لیے مناسب ماحول وہ عورتیں بھی ہیں جو برہنہ یا نیم برہنہ ہوتی ہیں، وہ موسیقی بھی ہے جو فحاشی اور برائی سے بھرپور ہو، وہ مجلسیں بھی ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہو، وہ

مقامات بھی ہیں جن میں اللہ سے غافل لوگوں کی نشست و برخاست ہو اور دنیا داروں کی وہ باتیں بھی، جن میں دنیا کے علاوہ کسی چیز کا ذکر نہ ہو۔

یہ ساری چیزیں گناہ کے جراثیم کو قوت دیتی ہیں یہاں تک کہ وہی غالب اور قاہر بن جاتا ہے، حالانکہ پہلے وہ مغلوب اور مقہور تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی گناہ میں پڑ جاتا ہے اور اس میں لت پت ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس جو ماحول گناہ کے جراثیم کو کمزور کرنے والا ہوتا ہے وہ ہر وہ چیز ہے جس سے آدمی کے اندر ایمان کو غذا ملتی ہے، اللہ اور آخرت کے دن کا حقیقی علم نصیب ہوتا ہے اور آدمی کو آخرت کا راستہ نظر آتا ہے۔ پاکیزہ لوگوں کی صحبت اور اسلام کے لیے کام کرنے والوں اور اس کی طرف دعوت دینے والوں کا ساتھ دینا نفس اور ایمان کے لیے وہ عظیم ترین قلعہ ہے جس میں گناہ کے جراثیم کمزور ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کسی گناہ کو معمولی نہ سمجھے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس لیے کہ تنکا تنکا ملتا ہے تو گٹھڑی بنتی ہے۔ اسی طرح آدمی اپنی قوت اور صحت پر اعتماد کر کے اپنے آپ کو کسی ایسی چیز کے سامنے پیش نہ کرے جو اس کے ایمان کو کمزور کرتی اور اس کے اندر گناہ کے جراثیم کو تقویت دیتی ہے۔ اس لیے کہ یہ کوئی عقل مندی نہیں ہے کہ آدمی اپنے آپ کو قوی اور صحت مند سمجھ کر 'سل' نامی بیماری کے جراثیم اپنے جسم میں منتقل کرے یا اس بیماری میں مبتلا لوگوں کے ہاں زیادہ آمد و رفت رکھے۔[1]

گناہ گار کے ساتھ داعی کا رویہ

۶۴۱- داعی کا کام یہ ہے کہ گناہ گاروں کو شفقت اور رحم کی نگاہ سے دیکھے۔ وہ دیکھتا ہے کہ گویا وہ لوگ اندھیری رات میں ایک گہری کھائی کے کنارے کھڑے ہیں۔ اسے خوف ہوتا ہے کہ وہ اس کھائی میں گرنے والے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو ہلاکت سے بچانے کے لیے پوری کوشش کرتا ہے۔ اپنی اس کوشش میں وہ ان لوگوں کی زیادتی کو نظر انداز کرتا ہے، بشرطیکہ ان کی زیادتی داعی کے حقوق سے متعلق ہو۔ وہ نہ ان لوگوں کو عار دلاتا ہے اور نہ اُن پر ہنستا ہے اور نہ اپنے اوپر یا اپنی عبادت گزاری پر فخر کرتے ہوئے ان لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

۱- سل ایک بیماری کا نام ہے جس سے پھیپھڑوں میں زخم پڑ جاتا ہے اور منہ سے خون آنا شروع ہو جاتا ہے۔ (مترجم)

البتہ ان لوگوں کے گناہوں اور حدود اللہ کے خلاف ان کی زیادتی کی وجہ سے وہ ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے یا ان کی زیادتیوں کی وجہ سے ان پر غضب ناک ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ نہ کبھی ایسا ہوا کہ آپ ؐ کو کسی نے کوئی نقصان پہنچایا ہو اور آپ ؐ نے اپنی خاطر کسی سے انتقام لیا ہو، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو پامال کیا جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو پامال کیا جاتا تو پھر آپ ؐ کے غضب کو کوئی چیز ٹھنڈا نہ کر سکتی تھی، جب تک کہ اللہ کے لیے انتقام نہ لیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ کی وہ حرمتیں جن کے لیے ایک داعی گناہ گاروں پر غضب ناک ہو سکتا ہے، یہ ہیں: گناہ گاروں کا دعوت الی اللہ کی مخالفت کرنا، اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکنا اور داعیانِ حق کو اذیتیں دینا، تاکہ وہ دعوت کے کام سے باز آجائیں۔

ان اور اس طرح کی دیگر صورتوں میں داعی کے لیے جائز ہوگا کہ ان لوگوں کے ساتھ ایسے طریقے سے پیش آئے جس کے ذریعے دعوت اور داعیوں کو ان لوگوں کا ضرر نہ پہنچنے پائے۔ مگر اس میں اسی قدر سختی کی جا سکتی ہے جس کی شریعت میں اجازت ہو۔ چنانچہ شریعت کے مقرر کردہ اندازے سے تجاوز نہ کیا جائے۔ نیز ان کے ضرر کو دفع کرنے میں درجہ بدرجہ آسان سے آسان طریقہ آزمایا جائے گا۔ مگر پوری کوشش اور خواہش یہی ہونی چاہیے کہ یہ لوگ ہدایت پائیں اور ان کی اصلاح ہو سکے۔

......☆......☆......

باب چہارم

اسالیبِ دعوت

تمہید

۶۴۲ - دعوت الی اللہ کے لیے کچھ علوم اور مہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے جو تبلیغ، تاثیر، احوال وظروف سے استفادہ کرنے، اور انسانی نفسیات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ علم کے حوالے سے ہم 'دعوت کے موضوع'، یعنی اسلام کے ضمن میں کچھ گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اس علم کے حوالے سے بات کریں گے جس کا تعلق براہِ راست تبلیغ سے اور اس کے راستے سے رکاوٹوں کو دور کرنے کے ساتھ ہے۔ یہ دعوت کے اسالیب ہیں۔

اس طرح ہم اس باب کو دو فصول میں تقسیم کریں گے۔

پہلی فصل: اسالیب کے مصادر اور ان کی ضرورت

دوسری فصل: دعوت کے اسالیب

پہلی فصل

اسالیب کے مصادر اور ان کی ضرورت

مصادر کی تعداد

٦٤٣- دعوت کے اسالیب اور اس کے وسائل کے مصادر: قرآن کریم، سنت رسول، سیرتِ سلف صالحین، فقہا کے اجتہادات اور انسانی تجربات ہیں۔ ذیل میں ہم ان میں سے ہر مصدر کے بارے میں اختصار سے بتائیں گے۔[1]

۱- قرآن کریم

٦٤٤- قرآن کریم میں بہت سی آیات ہیں جو انبیا کے حالات سے بحث کرتی ہیں اور ان کو اپنی قوم کی طرف سے جو کچھ پیش آیا اس کے بارے میں بیان کرتی ہیں۔

اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دعوت کے مختلف امور کے سلسلے میں مخاطب کیا گیا۔ اس طرح کی آیات سے دعوت کے اسالیب اور اس کے وسائل کے بارے میں رہنمائی ملتی ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ ان امور کو اسی طرح خوب جان لے جس طرح کہ دین کے دوسرے امور کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعات ہمارے سامنے اسی لیے بیان کیے ہیں تاکہ ہم ان سے استفادہ کریں۔ ان میں سے جو کچھ دعوت الی اللہ کے سلسلے میں ہمارے لیے اہم ہوتا ہے اسے پلے باندھیں اور اس طریق کار کو اپنے اوپر لازم کر دیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۱- ان مصادر کا تعلق باب پنجم کے ساتھ بھی ہے۔ اس لیے کہ وہ دراصل اسی باب کی فصل تھی۔ (مترجم)

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِي هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (ہود۱۱:۱۲۰) یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمھیں سناتے ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے ہم تمھارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

ہر خبر جو انبیا کے واقعات کے حوالے سے ہم تمھیں سناتے ہیں، کہ آپ سے پہلے گزرے ہوئے انبیا کو اپنی اقوام کے ساتھ کیا پیش آیا، ان کے درمیان کیا کیا حجت بازی اور جھگڑا ہوا، انبیا نے لوگوں کی اذیتوں اور جھٹلانے والوں کی باتوں کو کیسے برداشت کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو کس طرح نصرت عطا فرمائی اور اپنے کافر دشمنوں کو کیسے ذلیل کیا، ان ساری باتوں کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ ہم اس کے ذریعے آپ کے دل کو مضبوط کرتے ہیں، تاکہ آپ کے سابقہ بھائیوں کی سیرت سے آپ کے سامنے ایک نمونہ سامنے آئے۔[1]

پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان اپنے رسول کی سیرت کی پیروی بھی کرتے ہیں اور آپ دعوت الی اللہ کے معاملے میں دوسرے انبیا کی سیرتوں میں سے جو کچھ اپناتے تھے اس کی پیروی بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (یوسف۱۲:۱۱۱) اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انھی کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

چنانچہ روئے زمین کی سابقہ اقوام پر جو کچھ گزرا اور ان کی طرف ان کے نبیوں کو جو کچھ پیش آیا، ان کے قصوں میں عبرت بھی ہے اور نصیحت بھی، مگر ان لوگوں کے لیے جو عقل سلیم کے مالک ہوں، اور ان واقعات

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۴۶۵

میں ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو گذشتہ قوموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ واقعات سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایمان نے ان کے دلوں کو حق کے لیے کھول دیا ہے اور ان کی حس کو عبرت و نصیحت کے لیے تیز کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام۶:۹۰) وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، انھی کے راستے پر تم چلو۔

یہ آیت کریمہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ دعوت الی اللہ میں اللہ کے رسولوں کے طریق کار کی پیروی لازم ہے۔

۲- سنت نبوی

۶۴۵- سنت نبوی میں بہت سی احادیث ہیں جو دعوت کے مختلف امور اور خاص طور پر اس کے وسائل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ میں مکہ اور مدینہ میں آپؐ کو جو کچھ پیش آیا اور پیش آمدہ حالات وواقعات میں آپؐ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، یہ سب کچھ ہمیں دعوت کے اسالیب اور اس کے وسائل کے حوالے سے بڑا لوازمہ فراہم کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف حالات سے گزرے، جن سے ہر دور اور ہر مقام پر داعی کی گزر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ داعی کو جو بھی صورت حال درپیش ہو، اسے جو بھی حادثہ پیش آئے، وہ دیکھے گا کہ یہی یا اس سے ملتی جلتی صورت حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں موجود ہے۔ اس طرح اگر داعی سیرت نبوی کا گہرا فہم حاصل کرے گا تو وہ اس سے کسی مسئلے کے بارے میں صحیح حل اور درست موقف نکال سکے گا اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اسی موقف کو اپنائے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی منشا یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ایسے حالات وظروف سے گزار دیا تاکہ مسلمان داعی معلوم کر سکے کہ وہ دعوت کے معاملے میں مختلف احوال وظروف میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے ہوئے کیا اور کیسے اقدامات کرے گا۔

معلوم ہوا کہ سیرت نبوی اور آپؐ کی تعلیمات و ہدایات اُن احکام کی عملی شکل ہیں جو تبلیغ دین اور دعوت الی اللہ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو ملتے تھے یا اس معاملے میں آپؐ کے دل پر القا ہوتے تھے۔ اس بنا پر داعی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دعوت کے میدان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو نظر انداز کرے۔

۳- سیرتِ سلف صالحین

۶۴۶- ہمارے سلفِ صالحین، خصوصاً صحابہ کرام اور تابعین، کی سیرت میں دعوتی اُمور کے حوالے سے بہت اچھی مثالیں پائی جاتی ہیں جن سے داعیانِ حق ہر دور میں استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ سلفِ صالحین شارع کی منشا اور دعوت الی اللہ کا مفہوم بعد کے لوگوں سے بہتر جانتے تھے۔ اہل علم ہمیشہ ان کی سیرت سے استدلال کرتے رہیں گے۔

۴- فقہا کے اجتہادات

۶۴۷- فقہا کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ شرعی دلائل سے شریعت کے عملی احکام مستنبط کرتے ہیں۔ انھی احکام کا ایک پہلو دعوت الی اللہ سے متعلق احکام کا ہے۔ جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام اور جہاد و حسبہ کے احکام۔

فقہائے کرام نے اپنی فقہی کتابوں میں ان تمام احکام کے لیے الگ الگ ابواب متعین کیے ہیں۔ دعوت کے میدان میں فقہا نے جن امور کا تعین کیا ہے اس کا حکم وہی ہے جو ان کے دوسرے اجتہادات کا ہے۔ یعنی ان کی پیروی واجب ہوگی، یا پھر کم از کم مستحب۔ اس لیے کہ دعوت کے وسائل و اسالیب، عبادات و معاملات جیسے دینی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵- انسانی تجربات

۶۴۸- تجربہ انسان کے لیے ایک اچھا معلم ہے، خصوصاً اس شخص کے لیے جو دوسروں سے معاملات رکھتا ہے۔ دعوت کے میدان میں داعی کے بے شمار تجربات ہوتے ہیں جو اس کے لوگوں کے ساتھ براہ راست تعامل اور سابقہ مصادر سے اس کی سمجھ میں آنے والے وسائل کے براہ راست استعمال کا نتیجہ ہوتے

ہیں۔ اس لیے کہ بعض اوقات عملی طور پر اس کے سامنے اپنی غلطی واضح ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ مستقبل میں انھیں دہرانے سے اجتناب کرتا ہے۔

بعض اوقات ان تجربات کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، مگر جو تجربات حاصل ہو جاتے ہیں، اگر ان سے کماحقہ استفادہ کیا جائے تو وہ ادا کی جانے والی قیمت سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ مومن سے اسی بات کی امید کی جاتی ہے، اس لیے کہ مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔

داعی جس طرح اپنے تجربات سے استفادہ کرتا ہے اسی طرح وہ اسالیب اور وسائل کے میدان میں دوسروں کے تجربات سے بھی مستفید ہوتا ہے۔ اس لیے کہ حکمت مومن کی متاعِ گم گشتہ ہوتی ہے، وہ خواہ جہاں سے بھی ملے، مومن اسے قبول کر لیتا ہے۔

درست منہج اپنانے کی ضرورت

۶۴۹- وسائل و اسالیب میں درست منہج یہ ہے کہ ان مصادر سے روشنی حاصل کی جائے جو ہم نے بیان کیے ہیں۔ اس منہج کو اپنانا ہر داعی کے لیے لازمی اور ضروری بلکہ واجب ہے۔ اس لیے کہ اسلام انھی کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور داعی کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اسی طریقے کو اپنائے جس کے ساتھ دین میں فیصلہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اس درست منہج کو اپنانے سے آدمی مقصد کے قریب ہوتا ہے بلکہ منزل مراد پر پہنچ جاتا ہے۔

پھر داعی سے جس چیز کا تقاضا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا التزام کرے، درست رائے کی پیروی کرے اور غلطی و گناہ میں نہ پڑے۔ داعی کا یہ تقاضا تب پورا ہوتا ہے جب وہ درست نہج کو اپناتا ہے، جو مذکورہ مصادر سے سامنے آتا ہے۔ چنانچہ جب داعی وہ کام کر ڈالتا ہے جو اس سے مطلوب ہے تو اس سے اپنے عمل کے نتیجے کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا کہ وہ مقصد تک پہنچ گیا یا نہیں اور اس نے منزل مراد پا لی یا اس سے محروم رہا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن ۶۴: ۱۶) ’جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔‘

قیامت کے دن حساب اس بات پر ہوگا کہ انسان نے جو عمل کیا ہے وہ جائز ہے؟ اور اس پر جو کچھ لازم تھا، اس نے کر ڈالا ہے؟

جب یہ بات واضح ہوگئی اور داعی نے اس کو سمجھ لیا اور اس کا گہرا فہم حاصل کر لیا تو اس کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو درست منہج سے بری الذمہ کر لے کہ وہ مشکل ہے، اس کا راستہ لمبا ہے، لوگ اس کو قبول نہیں کرتے، داعی جلد از جلد اپنے مقصد تک پہنچنا چاہتا ہے، یا وہ ایک اچھے اور قابل قدر دینی جذبے کے پیچھے چلتا ہے، یا یہ کہ اللہ کے راستے میں کام کرنے اور اس کے راستے میں جہاد وشہادت کی زیادہ رغبت رکھتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ نیت خواہ کتنی اچھی ہو اور جذبہ خواہ کتنا قابل قدر ہو، وہ خطا کو صواب نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسا ذریعہ نہیں اپنایا جاتا جو اس تک پہنچانے والا نہ ہو، اگرچہ اس راستے پر چلنے والا دل سے یہی چاہتا ہو کہ مقصد تک پہنچ جائے۔

اس کی دلیل میں یہی کہنا کافی ہے کہ شریعت کے احکام بھی سارے یکبارگی نازل نہیں ہوئے اور اسلامی دعوت جرأت و بہادری رکھنے والے اور سچے جذبات رکھنے والے جلد باز داعیوں کے پیچھے نہیں گئی۔ چنانچہ مکہ میں جہاد مشروع نہیں تھا۔ جو لوگ اس سلسلے میں جلد بازی سے کام لیتے تھے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ تھا کہ اصبروا۔ صبر کرو۔

صلح حدیبیہ پر بہت سے مسلمانوں کو شرح صدر حاصل نہیں تھا، باوجودیکہ وہ سچے بھی تھے اور ان کا ایمان بھی مضبوط تھا۔ اس کے علاوہ وہ لڑنے اور شہید ہونے کے لیے بھی تیار تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر شرح صدر حاصل تھا۔ اس لیے کہ یہ موقع ایسا نہ تھا کہ جس میں موت کے لیے تیاری اور اس تیاری میں سچائی مطلوب ہو، بلکہ یہ موقع درست نہج پر چلنے کے التزام کا تھا۔ مطلوبہ نہج پر چلنے کے بعد مقصد اور منزل مراد پر پہنچانے والا تو وہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنی وحی کے ذریعے سے اس صلح کو فتح مبین سے تعبیر کیا۔

چنانچہ داعی کو چاہیے کہ جب وسیلہ اور اسلوب متعین ہو جائے تو جذبات سے، مقصد کے اچھا ہونے سے، اور اسلام کی خدمت کے لیے ذاتی بہادری سے متاثر نہ ہو۔

ہم نے جن مصادر کا ذکر کیا ہے ان کی روشنی میں درست غور وفکر وسائل و اسالیب کے لیے معاون ثابت ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جرأت، جذبے اور کام کے شوق، ساری چیزوں کو درست اسلوب اور صحیح

وسائل کے تعین اور ان کے حصول کی طرف متوجہ کیا جائے، نہ کہ ان چیزوں کو صحیح اسلوب کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے، بے فائدہ بحث اور اس سختی کے لیے استعمال کیا جائے جو درست وسائل سے کوسوں دور ہے۔

درست نہج سے ہٹنے کے نتائج

۶۵۰- وسائل واسالیب میں درست منہج سے ہٹنا ناکامی اور مقصد تک نہ پہنچ سکنے پر منتج ہوتا ہے، اگرچہ جو شخص اس سے ہٹتا ہے وہ یہی سمجھ کر ہٹتا ہے کہ وہ مقصد تک پہنچ جائے گا۔ بلکہ اگر اتفاق سے یہ چیز اسے مقصد تک پہنچا بھی دے، تو جلد ہی مقصد اس کو ٹھکرا دے گا اور اپنے سے دور پھینک دے گا۔

اس کے علاوہ درست منہج سے ہٹنا بعض اوقات ایسا کرنے والوں کے لیے اذیت اور محنت کے ضائع ہونے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک شخص صحیح بنیادوں کے بغیر عمارت کھڑی کر دیتا ہے، یا اس میں غلط مواد شامل کرتا ہے تو اس عمارت کا انجام زوال کی طرف ہوتا ہے، بلکہ یہ احتمال بھی ہوتا ہے کہ یہ عمارت اپنے ساکنین کے اوپر گر جائے۔

غلط بنیادوں پر کھڑی عمارت کے یہ نتائج حتمی ہوتے ہیں۔ اگرچہ بنانے والے کی نیت اور اس کا مقصد درست ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں نتائج اپنے اسباب اور مقدمات پر مترتب ہوتے ہیں۔ اس میں کام کرنے والے کی نیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

بطور مثال یا بطور دلیل، ہم کہہ سکتے ہیں کہ دعوت کے درست منہج میں ایک چیز اچھے اخلاق اور نرمی ہے۔ اگر داعی میں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں، اور وہ سخت مزاج اور قسی القلب ہو تو یہ اس بات کا ذریعہ بنے گا کہ لوگ اس سے منہ موڑیں گے، اگرچہ وہ اپنی دعوت میں حق پر ہو اور اپنے عمل میں مخلص ہو۔ اس لیے کہ اس کی حالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچھی نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے، مگر آپ ﷺ کو اپنے رب نے ان الفاظ میں خطاب فرمایا:

وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران ۳:۱۵۹) اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ درست منہج سے ہٹنا بعض اوقات گناہ ہوتا ہے جس میں داعی پڑ جاتا ہے۔ اس لیے کہ دعوت میں درست منہج اختیار کرنا ایک دینی حکم ہے اور دعوت کے معاملات میں دین کے احکام کی خلاف ورزی گناہ ہے، جس کے بارے میں مسلمان داعی جواب دہ ہوگا۔

درست منہج پر چلنے میں مشکلات

۷۵۱- اس میں کوئی شک نہیں کہ درست منہج کا التزام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا ایک تقاضا تو یہ ہے کہ داعی درست منہج کے معانی مفاہیم کا احاطہ کرے، ان کو ذہن میں مستحضر رکھے تاکہ اس کے افعال اسی نہج کے مطابق سہولت اور آسانی سے انجام پائیں۔

پھر اس پر یہ بھی لازم ہوگا کہ وہ جن معانی کو سمجھ گیا ہے ان کو ان کے جزئیات پر منطبق کردے۔ اور یہ جزئیات اتنے زیادہ ہیں کہ جن کی گنتی اور احاطہ کرنا مشکل ہے۔ کئی مرتبہ یہ جزئیات ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتے ہیں اور ان کے درمیان میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ جزئیات اکثر اوقات داعی سے درست منہج کو بھلا دیتے ہیں، نیز اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان بہت سے جزئیات کی وجہ سے داعی کے لیے مسائل کا حل تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس حالت میں داعی کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک فوج کا کمانڈر ہو۔ ایسے کمانڈر کو جنگ کے مختلف طریقوں، فوجی منصوبوں اور اس کے قواعد سے اچھی طرح آگاہ ہونا چاہیے۔

مگر یہ چیزیں عملی اقدام کے لیے کافی نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس میں یہ ملکہ اور قدرت بھی ہونی چاہیے کہ وہ موجودہ صورت حال میں ان مہارتوں سے بھرپور استفادہ کرے جو اس نے جنگ کا درست نقشہ کھینچنے اور صحیح اسلوب اختیار کرنے کے لیے سیکھی ہوں۔

ان مہارتوں کو عملی جامہ پہنانا ایک داعی کے لیے کسی فوجی کمانڈر کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فوجی کمانڈر کے پاس فرمان بردار سپاہیوں کی بڑی تعداد ہوتی ہے جو کمانڈر کی ہر بات کو عمل کا روپ دیتے ہیں، جبکہ داعی کا سابقہ ایسے لوگوں سے ہوتا ہے جو اپنے رب سے جاہل، اس سے بغاوت پر آمادہ، حق سے متنفر اور دنیا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ داعی کے مخالف، یا کم از کم اس کی دعوت خیر کی طرف کوئی توجہ

نہ دینے والے اور اس کی کوئی حاجت محسوس نہ کرنے والے ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کے حالات اور ان کے مزاج مختلف اور متضاد ہوتے ہیں، ان کے امراض بے شمار اور نوع بہ نوع ہوتے ہیں۔

یہ ساری باتیں داعی کے لیے اپنی سیکھی ہوئی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے میں اس کے کام کو مشکل سے مشکل تر بنا دیتی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب یہ نہیں ہے کہ اس مشکل ذمہ داری کو آسان نہیں بنایا جاسکتا بلکہ اگر کوشش کی جائے تو مشکل کو آسان بھی بنایا جاسکتا ہے۔ اگلے پیرے میں اسی کی وضاحت کی جاتی ہے۔

اس مشکل کو آسان بنانا

۶۵۲- درست منہج پر چلنے کو آسان بنانے میں جو امور معاون و مددگار ثابت ہوسکتی ہیں ان میں سے چند امور حسب ذیل ہیں:

۱- گہرا فہم

اس سلسلے میں پہلی چیز یہ ہے کہ درست منہج کا صحیح اور گہرا فہم حاصل کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان معانی کے بارے میں، جو ہمارے مذکورہ مصادر سے سامنے آئے ہیں، گہری غور و فکر کی جائے، یہاں تک کہ وہ داعی کی فطرت ثانیہ بن جائیں، وہ اس کے خون میں دوڑتے محسوس ہوں اور ہر وقت اس کے ذہن میں مستحضر رہیں۔

داعی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مذکورہ مصادر میں بیان کردہ معانی کو بار بار پڑھنے اور ان پر غور و فکر کرنے سے اُکتا جائے۔

۲- خوفِ خدا

خوفِ خدا سے مسلمان کا دل منور ہوتا ہے، اس میں ادراک اور غور و فکر کی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ حق کو واضح اور نمایاں طور پر دیکھتا ہے اور درست وسائل و اسالیب کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔

یہ وسائل و اسالیب جو اسے نظر آتے ہیں، ان احوال و ظروف اور اشخاص کے حسبِ حال ہوتے

ہیں جن کے ساتھ اسے پالا پڑا ہے۔ اگرچہ یہ احوال وظروف کچھ دوسرے احوال کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں اوراس کی بنا پر داعی کے لیے درست وسائل واسالیب میں اشتباہ پیدا ہوسکتا ہے۔[مگر جس کے دل میں خوف خدا کی وجہ سے نور کی کرن چمک رہی ہو اس کے لیے کوئی اشتباہ نہیں ہوتا۔]

اشتباہ اس لیے پیدا ہوسکتا ہے، جیسا کہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں، کہ یہی بات کافی نہیں ہوتی کہ ایک شخص عمومی نظر سے وسائل اور اسالیب کو پہچان لے، بلکہ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان وسائل واسالیب کو درپیش حالات میں عملی بھی کرکے دکھا سکے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک خاص وسیلۂ دعوت کو عمل میں لانے کے لیے سندِ جواز فراہم کرنے والی وجوہات کسی خاص صورت حال کے معانی ومفاہیم کے ساتھ متعارض ہوتی ہیں۔ اس طرح کی صورت حال میں داعی کو ایسی گہری بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ مناسب وسیلے کو معلوم کرلے اور اسے بہت سے درست وسائل کے مجموعے سے برآمد کرلے۔

یہ کام وہ اپنی مزاج شناسی اور اپنے اجتہاد وقیاس کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (الانفال ۸:۲۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم خدا ترسی اختیار کروگے تو اللہ تمھارے لیے کسوٹی بہم پہنچادے گا اور تمھاری برائیوں کو تم سے دور کرے گا اور تمھارے قصور معاف کرے گا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ ''فرقان کے معنی ہیں: حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا معیار۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے، اس کے اوامر پر عمل کرتا ہے اور اس کے نواہی سے بچتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ یہ توفیق دیتا ہے کہ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کرسکے۔ یہ چیز اس کے لیے دنیا میں کامیابی، نجات اور مشکلات سے نکلنے اور آخرت میں سعادت کا ذریعہ بنتی ہے۔[1]

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (البقرۃ ۲:۲۸۲) اللہ کے غضب سے بچو۔ وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۰۱-۳۰۳

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر نے وہی بات ذکر کی ہے جو اوپر والی آیت کے حوالے سے نقل ہوا ہے۔[1]

۳- رجوع الی اللہ

درست منہج پر چلنے کے لیے آسانی جن امور سے پیدا ہوتی ہے ان میں تیسری چیز یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اللہ سے التجا کرے، اسی کے آگے گر پڑے اور اسی کو وسیلہ بنائے کہ وہ اسے درست فہم اور علم عطا فرمائے۔ امام ابن تیمیہ صحرا میں نکلتے، اپنے رخسار کو مٹی کے اوپر رکھ دیتے اور کہتے: يَا مُعَلِّمَ إِبْرَاهِيمَ عَلِّمْنِي. "اے ابراہیم علیہ السلام کو تعلیم دینے والے! مجھے بھی تعلیم دے"۔ یہ بات وہ بار بار دہراتے۔

اور جیسا کہ ان کے شاگرد ابن القیمؒ فرماتے ہیں، یہ طریقہ بھی انھوں نے کئی بار دہرایا۔

۴- ریا سے پرہیز

چوتھی چیز اپنے دل کو ریاکاری کے جراثیم سے مکمل طور پر پاک رکھنا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی نیت اور اپنے مقصد کو اللہ رب العالمین کے لیے خالص کیا جائے، یہاں تک کہ دعوت کے درست منہج کی قیمت پر لوگوں کی طرف دیکھنے، ان کے ہاں شہرت پانے اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کا خیال تک دل میں نہ رہے۔

داعی بعض اوقات اس بنا پر درست منہج سے ہٹ جاتا ہے کہ وہ لوگوں کا شور سنتا ہے یا اس کے ساتھی درست منہج کی طرف جانے میں تساہل کرتے ہیں۔ اس صورت میں داعی کے لیے جو چیز ثابت قدمی، استقامت اور درست منہج پر عمل پیرا ہونے میں مددگار ثابت ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ مکمل اخلاص کا مظاہرہ کرے۔ یہ چیز اسے کسی طرف مڑنے نہیں دے گی۔

نیت کو خالص کرنا بھی بہت مشکل ہے، اس لیے کہ ریا کے جراثیم مخفی اور بہت باریک ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک داعی ان کا شکار ہو چکا ہوتا ہے مگر اسے احساس نہیں ہوتا۔ جس طرح کہ ایک صحت مند انسان میں مرض کے جراثیم موجود ہوتے ہیں مگر اسے احساس نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ یہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج۱ص ۳۳۷

جراثیم اس پر اثر انداز ہو جائیں اور اس کے دل میں درست منہج کو اپنانے کے جو دواعی پائے جاتے ہیں ان کو کمزور کر دیں۔ اس میں اللہ ہی سے استعانت کی جا سکتی ہے۔

......☆......☆......

دوسری فصل

دعوت کے اسالیب

تمہید

۶۵۳- ایک کامیاب دعوت کی بنیاد اس بات پر ہوتی ہے کہ مخاطبینِ دعوت میں جو بیماری پائی جاتی ہے اس کی درست تشخیص کی جائے اور اس کے لیے درکار علاج معلوم کیا جائے اور پھر اس کو یقینی بنایا جائے۔ اسلوب دعوت کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان شبہات کو دور کیا جائے جو مخاطبینِ دعوت کے لیے اپنی بیماری کو دیکھنے اور اسے محسوس کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ پھر انھیں ترغیب دی جائے کہ وہ دوا کو استعمال کریں اور ان کو اس بات سے ڈرایا جائے کہ وہ علاج کو ترک کریں۔ پھر جو لوگ دعوت کو قبول کریں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے تا کہ ان کے آبائی مرض کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو۔ آگے کی مباحث میں ہم یہی بات واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱

مرض اور علاج

بنیاد کا تعین

٦٥٤- جسمانی ڈاکٹر پہلے بیماری کی تشخیص کرتا ہے اور پھر علاج کا تعین کرتا ہے۔ علاج کا یہی درست طریقہ ہے۔ جو شخص اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے وہ دل اور روح کا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ اس کو چاہیے کہ روح کا علاج کرنے کے لیے اسی اسلوب کو اپنا لے۔ چنانچہ اسے چاہیے کہ پہلے بیماری کی تشخیص کرے اور پھر علاج متعین کرے۔ اگر بیماری مسلسل بڑھ رہی ہے تو اس کا طرزِ عمل یہ نہیں ہونا چاہیے کہ بیماری کو بڑھنے سے روکنے پر توجہ دے اور اس کی اصل جڑ کو اپنی حالت پر رہنے دے۔

انسان کی اصل بیماری اور اس کا علاج

٦٥٥- اب سوال یہ ہے کہ انسان کی روحانی بیماری کی بنیاد کیا ہے اور اس کے لیے بنیادی علاج کیا ہے؟ ذیل میں ہم اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

زمانہ قدیم سے لے کر آج تک انسانوں کی اصل بیماری یہ رہی ہے کہ وہ اپنے رب سے جاہل اور اس سے بد کے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اپنے رب کا انکار کرتے ہیں اور اس کی کامل عبودیت میں داخل ہونے اور اس طریقے پر چلنے کو مسترد کر دیتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف سے لے کر آئے ہیں۔ وہ دنیا کے دھوکے میں پڑے، اس کی طرف جھکے ہوئے اور آخرت سے غافل ہو کر اس کا انکار کرتے ہیں۔ یہ ہے بیماری کی اصل جڑیں، جو کفر باللہ کے ساتھ ملی ہوئی اور اس پر حقیقی ایمان کے منافی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ امور بعض ضعیف العقیدہ مسلمانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جب بیماری کی تمام جڑیں دل میں موجود ہوں تو اس کے ساتھ شر و فساد کی تمام قسموں کا موجود ہونا تو یقینی ہوگا اور جب اس کی بعض جڑیں موجود

ہوں گی تو اس کے مطابق شر و فساد بھی موجود ہوگا۔

اس بیماری کا بنیادی علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اس حیثیت سے ایمان لایا جائے کہ وہی رب ہے اور وہی الٰہ ہے، اس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں ہے، طاغوت کی تمام قسموں اور اس کے سارے مظاہر سے انکار کیا جائے، اللہ کی طرف توجہ کی جائے اور دنیا کی طرف جھکاؤ نہ رہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (الاعراف ۷:۵۹) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمھارے حق میں ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

اسی طرح کی بات سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سردارانِ قریش کے سامنے اس وقت کہی تھی جب وہ آپؐ کے چچا ابو طالب کے پاس آ کر پوچھ رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کیا چاہتا ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا تھا:

تَقُوْلُوْنَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَتَخْلَعُوْنَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ. یہ کہ تم کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور [عملی طور پر] ان معبودوں سے ہاتھ اٹھاؤ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو[1]

یہی قول بلا استثنا تمام انبیائے کرام کا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا، اور س کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ "اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

اسلامی عقیدے کو یقینی بنانا

۶۵۶- جب ہمارے سامنے بیماری کی بنیاد اور اس کے لیے بنیادی علاج واضح ہو گیا تو دعوت الی اللہ

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۷

کے راستے میں ایک مسلمان داعی کو چاہیے کہ وہ اسلامی عقیدے کو یقینی بنائے۔ اس لیے کہ وہی اُس بیماری کا اصل علاج ہے جو ہم نے بتا دی ہے۔ چنانچہ وہ اس بات پر ایمان کو یقینی بنائے کہ اللہ ہی تمام مخلوقات کا رب اور الٰہ ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی اور رسول ہیں، موت کے بعد جسم و روح کا دوبارہ مل جانا اور زندہ ہونا حق ہے اور آخرت میں عذاب سے نجات کے لیے عمل صالح ضروری ہے۔

معلوم ہوا کہ دل میں اسلامی عقیدے کی پختگی، اس کی بنیادوں کی مضبوطی اور اس کے لوازمات اور ضمنی اُمور کو بروئے کار لانا داعی کے کارِ دعوت کی بنیاد ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن پر داعی ہمیشہ زور دیتا ہے اور کبھی بھی ان سے غفلت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہی اس کی دعوت کی بنیاد ہے اور اس کے علاوہ جو اُمور ہیں وہ اس کی شاخیں ہیں۔ اگر یہی بنیاد پختہ قائم ہوگئی اور مخاطبین دعوت اپنے کفر کے بعد اس پر لبیک کہہ چکے تو داعی کے لیے اس کو اسلامی تعلیمات اور اس کی مختلف شاخوں پر مطمئن کرنا آسان ہو جائے گا۔ اگر انھوں نے اسی بنیاد کو ٹھکرا دیا تو گویا اس نے اسلام کی ساری شاخیں اور تمام تعلیمات ٹھکرا دیں۔ یہی درست طریق کار ہے جس پر قرآن کریم کی آیات بھی دلالت کرتی ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طریق کار پر چلے۔

مکہ میں قرآن کریم آیات اور سورتوں کی شکل میں نازل ہو رہا تھا۔ اس میں عقیدے کے اصول اور اس کی تعلیمات بیان ہو رہی تھیں۔ ان اصولوں کی چند مثالیں یہ ہیں۔ اللہ پر ایمان، اس کے واحد رب اور الٰہ ہونے پر ایمان، قیامت کے دن پر ایمان، جنت و دوزخ پر ایمان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان، اچھے اور نیک کام کرنے کی ضرورت۔ اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ إِنِّيٓ أُمِرْتُ أَنْ أَكُوْنَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. مَّنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ. وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (الانعام۶:۱۷) کہو: اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے روزی لیتا نہیں ہے؟ کہو: مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرِ تسلیم خم کروں (اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے) تُو بہر حال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو: اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے

(خوف ناک) دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمھیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمھیں اس نقصان سے بچا سکے، اور اگر وہ تمھیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَآءُ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوٓا أَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ إِلَىٰٓ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَّتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ. ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتٰى وَأَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. وَأَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ (الحج ۲۲:۵-۷) لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اُٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اُگلنی شروع کر دی۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے، اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اور یہ (اس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں ہے، اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اُٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ عَمِلَ صٰلِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (النحل ۱۶:۹۷) جو شخص بھی نیک

عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر، ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

اسلامی عقیدے پر زور دینے کا یہ منہجِ قرآنی ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی جاری رہا۔اس وقت بھی آیات اسی کی وضاحت کے لیے نازل ہوتی رہیں۔ معاملات سے متعلق آیات کا خاتمہ بھی عقیدے کے اصول، جیسے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت سے ہوتا تھا۔عقیدے پر زور دینا داعی کے لیے ان مسلمانوں کے بارے میں بھی ضروری ہے جن کا عقیدہ اور ایمان کمزور ہوتا ہے، جن میں عقیدے کی کمزوری کا احساس اس طرح ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوتے ہیں، شریعت کے احکام کی نافرمانی ہوتی ہے اور وہ احکام شریعت کو بھاری محسوس کرتے ہیں۔اس طرح وہ طرح طرح کی سرکشی اور گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ منہج ان لوگوں کے بارے میں بھی ضروری ہے جو بظاہر گناہ نہ کرتے ہوں۔ اس لیے کہ عقیدے کی یہ تاکید اور اس کی تعلیمات کے ساتھ ان کی تذکیر اُن کو انحراف اور نافرمانی سے محفوظ رکھتی ہیں۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

۶۵۷- یہاں ہم پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ بعض انبیا نے اپنی قوموں کو دعوت دیتے ہوئے ان کے بعض مفاسد پر نکیر فرمائی، جیسا کہ حضرت لوط علیہ السلام کے قصے میں آیا ہے۔ چنانچہ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عقیدے اور اس کی تعلیمات کو پہلے راسخ کرنا ہوگا، اور جب لوگ اس کو مان لیں تو پھر داعیِ حق عقیدے کے فروع کی طرف توجہ کرے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عقیدے کو یقینی بنانے کے معنی یہ ہیں کہ عقیدے کی تعلیمات کو پہلا درجہ دیا جائے اور اس کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے۔اسی طرح معاشرے کے بعض مفاسد کو عقیدے کی تعلیمات کے ساتھ مربوط کرتے ہوئے یہ بتانا کہ اللہ کے خلاف بغاوت کے نتائج میں سے ایک بڑا نتیجہ یہ ہے۔ چنانچہ ہم نے عقیدے کو یقینی بنانے کی جو بات کی ہے اس کا مطلب یہ ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ داعی اپنے معاشرے میں جو

خرابیاں دیکھتا ہے ان سے چشم پوشی کرے۔ اس کی دلیل قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جو حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں وارد ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ. إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ. إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ. فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ. وَمَآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَٰلَمِينَ. أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَٰلَمِينَ. وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ (الشعراء٢٦: ١٦٠-١٦٦) لوطؑ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی لوطؑ نے ان سے کہا تھا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمے ہے۔ کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمھاری بیویوں میں تمھارے رب نے تمھارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟ بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو۔

چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام نے ان کے ساتھ معاملے کا آغاز تقویٰ کی دعوت کے ساتھ کیا اور ان کو بتایا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ رسول کا حق یہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور وہ اللہ وحدہ کی عبادت کے جو طریقے بتاتا ہے اس میں اس کی پیروی کی جائے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَآءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (الاعراف٧: ٨٥) اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی صاف رہنمائی آ گئی ہے، لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو، اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اسی میں تمھاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے ساتھ بات کا آغاز صرف اور صرف اللہ کی عبادت سے کیا۔ پھر ان کے سامنے بیان کیا کہ وہ اللہ کی طرف سے جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور بالکل واضح ہے۔ اس حق کے ساتھ لازم ہے کہ تم پیمانے اور وزن پورے کرو، لوگوں پر ظلم نہ کرو اور زمین میں فساد برپا کرنے سے باز آ جاؤ۔ اگر وہ واقعی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں تو یہی چیز ان کے لیے بہتر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہما السلام نے اپنی قوموں کو بتایا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ پھر اس پر یہ اضافہ کیا کہ ان کے سامنے اللہ سے بغاوت کے نتائج بیان کر دیے، جس میں ان کے برے افعال (لواطت اور ناپ تول میں کمی) بھی شامل تھے۔

اسی طرح مکہ میں بھی جو لوگ ناپ تول میں کمی کرتے تھے ان کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ. الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ. وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَو وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ. أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ. لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ. يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (المطففین ٨٣: ١-٦) تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر، یا تول کر دیتے ہیں تو انھیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اُٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے گھاٹا دینے اور اس کی ممانعت کو عقیدے کے ایک اصول کے ساتھ مربوط کیا، اور وہ ہے قیامت کے دن حساب اور لوگوں کا اللہ کے سامنے کھڑا ہونا۔

داعی کی درست منہج سے دوری

٦٥٨- بعض اوقات داعی اس منہج صحیح سے دور ہو جاتا ہے اور عقیدے کے امور کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ وہ ان چیزوں میں غوطہ زن ہونا چاہتا ہے جسے لوگ پسند کرتے ہیں۔ اس چیز کے علاوہ وہ لوگوں کو کسی چیز کا مکلّف نہیں کرتا۔ جیسے لوگوں کے ہاں معروف معنوں میں سیاست کے اندر غوطہ زن ہو جانا اور اس میں ڈوبتے چلے جانا، امور کو عقیدے اور اس کی جامع تعلیمات سے دور لے جا کر کسی طریقے سے حل کرنا۔ یہ

سارے کام بعض اوقات داعی کرتا ہے، اس لیے کہ لوگوں کی رغبت اس طرف ہوتی ہے یا خود اس کی اپنی رغبت اس جانب ہوتی ہے۔ یہ طریق کار غلط ہے، اس لیے کہ داعی کوئی نئی چیز لے کر نہیں آتا، جسے لوگ نہ جانتے ہوں، بلکہ وہ اس کے ساتھ اس کی باتوں اور اس کے دعووں کے بارے میں مناقشہ اور بحث کرتے ہیں۔ اس طرح داعی ایسے امور میں کھنچتا چلا جاتا ہے جن کا بیماری اور علاج کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی عقیدے اور اس کی تعلیمات کے ذہنوں میں گہرا کرنے سے انحراف۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیماری اپنے حال پر رہتی ہے اور عمارت بغیر بنیاد کے اٹھتی چلی جاتی ہے۔

جزئیات نہیں، کلیات

٦٥٩- جب معاملے کا اصل سرا یہ ہے کہ اصل بیماری اور اس کے علاج کو یقینی بنانا چاہیے تو داعی پر لازم ہے کہ وہ اپنی مساعی کو جزئیات اور ان کے استیصال میں ضایع نہ کرے۔ بشرطیکہ اس کی وجہ سے اس بات میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں عقیدے کی تعلیمات کو راسخ کرسکے اور انھیں اللہ کی طرف دعوت دے سکے۔

اس کے بارے میں ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے تھے کہ اللہ کا گھر خانہ کعبہ بتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کے باوجود آپؐ اس کا طواف کرتے تھے جب کہ یہ بت آپ کا منہ چڑا رہے ہوتے تھے۔ آپؐ نے ان کو توڑنے کے لیے نہ اپنا ہاتھ بلند کیا اور نہ اپنے صحابہ کو یہ حکم دیا کہ ان بتوں کو توڑ دیں۔ اگر آپؐ چاہتے تو اس کا حکم دے سکتے تھے، اور اگر آپؐ حکم دیتے تو صحابہ کرامؓ آپ کے حکم کی تعمیل بھی کردیتے۔ مگر آپؐ نے ایسا نہ کیا۔ اس لیے کہ اس وقت اصل مسئلہ بتوں کے توڑنے کا نہ تھا، بلکہ اصل مسئلہ دلوں پر لگے تالوں کو توڑنے کا تھا، تاکہ وہ حق کو سمجھ جائیں۔ اگر یہ کام ہوجائے تو وہ دن بھی آجائے گا جب یہ بت مومنوں کے گرزوں کے نیچے آئیں گے اور پاش پاش ہوکر رہیں گے۔ یہ کام فتح مکہ کے دن انجام پایا۔ اس موقع پر آپؐ اپنے عصا کے ساتھ ساتھ ایک ایک بت کی طرف اشارہ کرکے فرماتے تھے: لَقَدْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا. حق آگیا اور باطل مٹ گیا، یقیناً باطل کو تو مٹنا ہی تھا۔ اس طرح ایک ایک بت زمین پر گر کر پاش پاش ہوتا گیا۔

۲

مخاطبین کے شبہات کا ازالہ

شبہات کی ماہیت

٦٦٠ - یہاں شبہہ سے مراد وہ چیز ہے جو داعی کی سچائی اور اس کی تعلیمات کے بارے میں شک وارتیاب پیدا کرتی ہے۔ یہ چیز مخاطب کو حق دیکھنے اور اسے قبول کرنے سے روک لیتی ہے، یا کم از کم یہ کہ حق کی قبولیت میں کچھ عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس طرح کے شبہات کا تعلق اکثر اس عادت کے ساتھ ہوتا ہے جو موروثی چلی آ رہی ہو، یا کسی مصلحت کی وجہ سے، دنیوی جاہ وجلال کی خاطر، یا جاہلی حمیت کی بنیاد پر۔ ان امور کے سبب شبہات ایسے کمزور نفوس پر اثر انداز ہوجاتے ہیں جو اِن امور سے تعلق خاطر رکھتے ہوں۔ ایسے نفوس ان امور کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور اسے ایک ایسی دلیل سمجھتے ہیں جس کے ذریعے حق کو ٹھکرایا جا سکتا ہو اور اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کے خلاف لڑا جا سکتا ہو۔

شبہات کا مصدر

٦٦١ - اکثر اوقات شبہات کے پیدا ہونے کا مصدر سردارانِ قوم ہوتے ہیں۔ وہ شبہات اُٹھاتے ہیں، انھیں لوگوں کے لیے مزین کرتے ہیں اور انھیں لوگوں کے درمیان شہرت دیتے ہیں۔ وہ ان شبہات کو اتنا زیادہ دہراتے ہیں کہ عوام میں جو سادہ لوح لوگ ہوتے ہیں وہ ان شبہات کے ساتھ مانوس ہوجاتے ہیں۔ پہلے پہل تو وہ ان شبہات کی تردید کرتے ہیں مگر بعد میں وہ ان کی تصدیق شروع کر دیتے ہیں اور انھیں ناقابل تردید حقائق سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ انھی شبہات کا دفاع کرتے ہیں اور ان کی خاطر حق اور اہل حق سے مخاصمت کا دروازہ کھول لیتے ہیں۔ پھر سردارانِ قوم ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان پر ہنستے ہیں، کیوں کہ انھوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔

شبہات سے چھٹکارا نہیں

۶۶۲- داعی کو جاننا چاہیے کہ دعوت الی اللہ کے راستے میں شبہات کا پیدا ہونا پرانی بات ہے۔ یہ بندوں کے بارے میں اللہ کی سنت ہے۔ یہ باطل کے علم برداروں میں ایک قدیم اور نسل در نسل منتقل ہونے والی ایک روایت ہے۔ چنانچہ داعی کو اس میں کوئی اجنبیت محسوس کرنی چاہیے، نہ اس سے دل گرفتہ ہونا چاہیے۔شبہات کا اصل اور جوہر بھی ایک ہی رہتا ہے، اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آتی۔اس سلسلے میں صرف اسلوب اور کیفیت بدلتی رہتی ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

> مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ (حٰم السجدۃ ۴۱:۴۳) اے نبیؐ! تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو۔

پہلے رسولوں کو جو کچھ کہا گیا تھا وہ باطل ہی تھا جو لوگوں کے حق میں شبہات تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> مَآ أَتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ. أَتَوَاصَوْا بِهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ (الذاریات ۵۱:۵۲-۵۳) ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انھوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون۔کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کرلیا ہے؟ بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔

قریش سے پہلے کی قوموں نے اپنے اپنے دور کے رسولوں پر سحر اور جنون کا الزام لگایا تھا، یہی کام قریش نے لوگوں کو داعی الی اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت سے پھیرنے کے لیے کیا۔

اگر داعی یہ حقیقت سمجھ جائے اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلے تو جب اس پر جھوٹے الزامات لگائے جائیں گے یا اس کی دعوت کے بارے میں شکوک وشبہات اٹھائے جائیں گے تو اس وقت نہ وہ حیرت کا شکار ہوگا، نہ دل گرفتہ ہوگا اور نہ غصے میں آئے گا۔اس لیے کہ دعوت میں اس کی حالت اللہ کے رسولوں سے بہر حال بہتر نہیں ہے، نہ وہ باتوں میں انبیا سے زیادہ فصیح ہے، نہ ان سے زیادہ مخلص ہے اور نہ ان سے زیادہ تائیدالٰہی کا مستحق ہے۔اس کے باوجود باطل کے علم برداروں نے انبیا کے خلاف جو شبہات اڑائے ان کا ذکر اللہ تعالیٰ

نے اپنی کتاب میں ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ پھر داعی جب اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے تو اس کے بعد وہ جانتا ہے کہ ایک انسان گمراہی کے کن حدود تک پہنچ سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے رسولوں کے خلاف بھی لڑ سکتا ہے، حالانکہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اُسے بیماریوں سے شفا دینا چاہتے ہیں اور آگ سے نجات دینے اور جنت میں لے جانے کی کوشش میں لگا رہتے ہیں۔ آخر میں یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ ان امور کی سمجھ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، تاکہ وہ اچھے اور برے میں فرق کر سکے اور ان شبہات سے متأثر نہ ہو، کہ ان کے پیچھے چلے اور انجانے میں اللہ کے دشمنوں کا ساتھی اور اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کا دشمن بن جائے۔

شبہات کی قسمیں

٦٦٣- شبہات کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض داعی کے متعلق ہوتے ہیں، بعض دعوت کے 'موضوع' یعنی اسلام کے متعلق اور بعض مخاطبینِ دعوت کے متعلق۔

جو شبہات داعی کے متعلق ہوتے ہیں وہ اس صورت میں سامنے آتے ہیں کہ اس کی شخصیت اور اس کی سیرت و کردار پر الزامات لگائے جاتے ہیں، اسے کم عقلی، جہالت، گمراہی، جنون اور افترا کی تہمتوں سے نوازا جاتا ہے اور اس طرح کے دوسرے پروپیگنڈے، جن کا مقصد لوگوں کو اس سے متنفر کرنا اور اس پر اعتماد نہ کرنا ہوتا ہے۔

جو شبہات دعوت کے موضوع کے متعلق ہوتے ہیں وہ اس صورت میں سامنے آتے ہیں کہ اسے نئی ایجاد قرار دیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ لوگوں کو اپنے جانے پہچانے طریقوں، آبائی تقلید اور موروثی نظام سے نکال کر کسی نئے نظام کا پابند بنانا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد بھی لوگوں کو دعوت الی اللہ سے متنفر کرنا اور اس کے راستے سے روکنا ہوتا ہے۔

جو شبہات مخاطبین دعوت کے متعلق ہوتے ہیں ان کی عملی صورت یہ ہوتی ہے کہ باطل کے علم بردار ان کے مفادات، ان کی قوم اور ان کے دین کے امین بن بیٹھتے ہیں اور ان کی پُر آسائش زندگی کی حفاظت کا جھانسہ دے دیتے ہیں۔ اس کا مقصد داعیانِ حق کے خلاف لوگوں کی حمیتِ قومی کو اُبھارنا ہوتا ہے۔

شبہات میں داعی کا رویہ

٦٦٤- ان شبہات کے بارے میں داعی مجبور ہے کہ ان کو ختم کرے، ان کا بودا پن اور ان کا غلط ہونا

ثابت کر دے۔ اس لیے کہ یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو بصارت اور بصیرت کی کمی کے شکار لوگوں کے لیے حق کو دیکھنے میں حائل ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہ بیماری کا احساس کرنے اور اس کے علاج کی ضرورت محسوس کرنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

ان شبہات کا ازالہ دلیل و برہان ہی سے ممکن ہوتا ہے، مگر یہ دلیل و برہان ایسی ہونی چاہیے جس میں صراحت بھی ہو اور وضاحت بھی، حسنِ بیان بھی ہو اور حسنِ کلام بھی۔ اس دلیل کے خطاب میں نرمی اور سلاست ہو۔ یہ نہ ہو کہ داعی الی اللہ جھوٹے الزامات لگانے والوں کے رویے کی بنا پر اشتعال میں آ جائے اور اس کی وجہ سے وہ اپنی ذات کے لیے انتقام لینے اور اسی کے لیے غیظ و غضب کے ساتھ نامناسب لب ولہجہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ چیز داعی کے لیے بہت بھاری ہے مگر اس کے بغیر کوئی چارہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ سے امید کی جا سکتی ہے کہ اگر داعی مکمل طور پر اللہ کے لیے مخلص ہوگا اور اللہ کی راہ میں پہنچنے والی اذیتوں کو ثواب کا ذریعہ سمجھے گا تو یہ مشکل اس کے لیے آسان ہو گی۔

شبہات کا ازالہ کرنے کے حوالے سے داعی کا معاملہ ایک ماہر، خیر خواہ اور شفیق ڈاکٹر کی طرح ہے۔ اس کو مریضوں کی چیخ پکار اور ڈاکٹر سے ان کی نفرت اس بات کا اشتعال نہیں دلاتی کہ وہ مریض کا معاینہ کرنا ہی چھوڑ دے۔ بلکہ اگر مسلسل علاج کی وجہ سے مریض اس کو گالیاں دیں یا اسے برا بھلا کہیں تب بھی وہ اشتعال میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ مریضوں کی طرف یہ سلوک ان کی بیماری کے بعض عوارض ہیں۔ مگر ڈاکٹر تو ان کا علاج کرنا چاہتا ہے، نہ کہ ان سے انتقام لینا۔

شبہات کی چند مثالیں اور ان کی تردید

شبہات رفع کرنے کے حوالے سے انبیائے کرام کے واقعات سے بہت اچھا اسلوب سامنے آتا ہے، کہ ان کے خلاف باطل کے علم برداروں نے جو شبہات اٹھائے تھے ان کے مقابلے میں انبیائے کرام نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ ذیل کی سطور میں ہم یہی بات واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱- داعیانِ حق پر الزامات

۶۶۵ - سردارانِ قوم اوران کے پیروکاروں کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ عام لوگوں کو داعیانِ حق سے دور رکھا جائے۔ اس کے لیے وہ ان کی شخصیت، امانت، اور عقل پر جھوٹے الزامات لگاتے ہیں۔ یہی طریقہ ہے جو اِن کے اسلاف نے اللہ کے رسولوں کے ساتھ اپنایا ہے۔ انھوں نے رسولوں کو سحر، جنون اور گمراہی کے الزامات کا نشانہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَذٰلِكَ مَآ أَتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُوْنٌ. أَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (الذاریات ۵۱:۵۲-۵۳) ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انھوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کرلیا ہے؟ بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔

مشرکین عرب نے ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَعَجِبُوْٓا أَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُوْنَ هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ (ص ۳۸:۴) ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انھی میں سے آ گیا۔ منکرین کہنے لگے کہ "یہ ساحر ہے، سخت جھوٹا ہے۔

اللہ کے رسول اس جھوٹے الزام کی تردید کیا کرتے تھے اور اس سے جو شبہات پیدا ہوتے تھے ان کو زائل کرتے تھے۔ وہ بہت اعلیٰ اور واضح اُسلوب کے ساتھ ان اعتراضات کو اپنے سے نفی کرتے تھے، مگر اس میں بھی ان افترا پردازوں کے لیے پوری شفقت کا لحاظ کرتے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم، ان کے اعتراضات اور حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے ان کے جواب میں اپنائے جانے والے اسلوب کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖٓ إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ. قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلَالَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّيْ وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا

تَعْلَمُوْنَ. أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الاعراف ٧:٦٠-٦٣) اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔ نوحؑ نے کہا: اے برادرانِ قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمھارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھارے رب کی یاددہانی آئی، تاکہ تمھیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے جواب میں دیکھا جاسکتا ہے کہ وہ ان کو 'اے برادرانِ قوم' کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ آپؑ کی قوم تھی اور انھوں نے اپنی قوم کی طرف منسوب ہونے سے بیزاری کا اعلان نہیں کیا۔ اس اندازِ تخاطب کی شان یہ ہے کہ یہ ان کے باطل پر اَڑ جانے سے باز رکھنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

پھر حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے دعوے کے بطلان کے لیے بتایا کہ میرے اوپر کوئی دیوانہ پن نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ یا تو جھوٹ بول رہے تھے یہ جہالت میں پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کو چاہیے کہ اپنے جھوٹ یا اپنی جہالت سے باز آ جائیں۔

اس کے بعد انھوں نے ان کے سامنے اصل حقیقت بیان کی۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کے رسولوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام پہنچاتے ہیں وہ سچ اور حق ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ وہ ان کو اللہ کے پیغام سے روشناس کرانا چاہتے ہیں، ان کے خیر خواہ ہیں اور ان کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ علم آچکا ہے جو قوم کے پاس موجود نہیں ہے۔ نصیحت کا حق یہ ہوتا ہے کہ اسے سنا جائے اور اس کی پیروی کی جائے۔

[illegible] میں ان کے سامنے یہ بات بیان کی کہ ان کے تعجب کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ [illegible]ں کے پاس اللہ کا پیغام ایک ایسے شخص کی زبان پر آیا ہے جو انھی میں سے ہے، وہ انھیں جانتا ہے اور قوم کے

لوگ اسے جانتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اپنی موجودہ حالت کے انجام سے خبردار کر رہا ہے اور انھیں دعوت دے رہا ہے کہ اپنے رب اور اپنے خالق سے تقویٰ اختیار کریں۔ اس طرح امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار بن جائیں۔

اس طرح کے بلند اور موثر اسلوب کے ساتھ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کی افترا پردازیوں اور شبہات کا جواب دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِلٰى عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰـهٍ غَيْرُهٗ أَفَلا تَتَّقُوْنَ. قَالَ الْمَلأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ. قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. أُبَلِّغُكُمْ رِسَالاتِ رَبِّيْ وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِيْنٌ. أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَ كُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ

(الاعراف ٧:٦٥-٦٩) اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟ اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے، جواب میں کہا: ہم تو تمھیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، اور تمھارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھارے رب کی یاددہانی آئی تاکہ وہ تمھیں خبردار کرے؟

٢- فساد فی الارض اور طلبِ اقتدار کا شبہہ

٦٢٦- سردارانِ قوم داعی کے خلاف جو شبہات اٹھاتے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ وہ زمین میں بلندی اور اقتدار چاہتا ہے۔ وہ لوگوں کے عقائد اور تقلیدِ آبائی کو روکنا چاہتا ہے۔ وہ جو کچھ لے کر آیا ہے وہ تو ایک نئی بدعت ہے، جو نقصان پہنچانے والی اور لوگوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے والی ہے۔ انھوں نے اس طرح کی بات پہلے کبھی نہیں سنی۔ یہ دعوت فساد فی الارض کا ذریعہ بنے گی۔ اس لیے داعی اور اس کی دعوت کا مقابلہ

ضروری ہے۔ انھیں اپنے کام میں آگے بڑھنے سے روکنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ قومِ نوحؑ، قومِ عاد اور قومِ ثمود کی طرف سے داعیانِ حق کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک اور داعیانِ حق کی طرف سے ان کو دیے جانے والے جواب کے حوالے نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ. قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (ابراہیم ۱۴:۱۱) انھوں نے جواب دیا: تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان، جیسے ہم ہیں۔ تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو جن کی بندگی باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اچھا، تو لاؤ کوئی صریح سند۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا: واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے، اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمھیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے آ سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسا کرنا چاہیے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (سبا ۳۴:۴۳) ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ''یہ شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمھارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔'' اور کہتے ہیں کہ ''یہ قرآن محض ایک جھوٹ ہے گھڑا ہوا۔'' ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ ''یہ تو صریح جادو ہے۔''

اس طرح سردارانِ قوم نے لوگوں کے درمیان تقلید اور آبائی دین پر ڈٹے رہنے کا شبہ ڈال دیا، جب کہ انبیائے کرام لوگوں کو اس چیز سے روکتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا

بِهٰـذَا فِيٓ اٰبَآئِنَا الْأَوَّلِيْنَ (المومنون۲۳:۲۴) اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے کو بھیجتا۔ یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے باپ داد کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے)۔

ان کا یہ زعم باطل تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام ان کے درمیان کوئی بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے اوپر اقتدار کے طلب گار ہیں۔ وہ اپنی دعوت کے ذریعے اپنی فضیلت جتانا چاہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ باطل کے علم بردار اہل حق کو بھی اپنے غلط معیارات پر جانچتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جو لوگ اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں ان کا مقصد وہی ہے جو باطل کے علم برداروں کا ہے۔ یعنی زمین میں بڑا بن جانا اور لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہو جانا۔

فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا:

أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْأَرْضِ (یونس۱۰:۷۸) انھوں نے جواب میں کہا: کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے۔

پھر حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے ایک دلیل یہ پیش کی تھی کہ وہ انھی کی طرح ایک انسان ہیں اور ان کے غلط خیال کے مطابق اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے پیام بر بن جائیں۔ اگر اللہ نے چاہا ہی تھا کہ ہم تک کوئی بات پہنچا دے تو اس مقصد کے لیے فرشتے کیا کچھ کم تھے؟ ان کا یہ شبہہ اس شبہے کی طرح ہے جو قریش نے بھی کھڑا کیا تھا اور وہ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہ تھا:

وَقَالُوْا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَّلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ. وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (الانعام۶:۸-۹) کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اُتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر انھیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔ اور اگر ہم فرشتے کو اُتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اُتارتے اور اس طرح انھیں اسی شبہہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں۔

یعنی اگر اللہ تعالیٰ فرشتہ بھی بھیجتا تو اسے انسانی صورت میں کر دیتا، تاکہ وہ ان تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا سکے۔ اس صورت میں بھی ان کو یہی شبہہ پڑ جاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ. قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (الاعراف ۷: ۱۲۷-۱۲۸)
فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھیں؟ فرعون نے جواب دیا: میں ان کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور آخری کامیابی انھی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔

چنانچہ وہ سردارانِ قوم ہی تھے جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف فرعون کا غصہ اُبھارا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ موسیٰ زمین میں فساد برپا کرنا چاہتا ہے، اس لیے اسے اس طرح چھوڑنا درست نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت کا کام جاری رکھے۔

اس سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے یہ غلط شبہہ اس لیے بھی اٹھایا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپؑ پر ایمان لانے والوں کو سزا دینے کا جواز ہاتھ آ جائے اور اپنے گمراہ پیروکاروں کی تائید بھی حاصل ہو۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ باطل کے علم برداروں کا یہ دعویٰ اور فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے قتل کا جو فیصلہ کیا تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؑ نے ان سے کہا تھا کہ اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ آپؑ نے ان کو یہ بھی بتایا کہ آخرت میں بہتر انجام ہمیشہ متقی لوگوں کا ہوتا ہے۔ رہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے فرعون کے شبہات اور اس کے اعتراضات کا جواب تو وہ اللہ

تعالیٰ نے دوسری آیات میں بیان کردیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقَالَ مُوسٰى يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. حَقِيْقٌ عَلٰٓى أَنْ لَّآ أَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الاعراف ۷:۱۰۴-۱۰۵) موسیٰ نے کہا: اے فرعون! میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمھارے رب کی طرف سے صریح دلیلِ ماموریت لے کر آیا ہوں۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ مَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ إِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى أُمَّةٍ وَّإِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ. قٰلَ أَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِأَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (الزخرف ۴۳:۲۳-۲۴) اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا، اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنھی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے ان سے پوچھا: کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمھیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انھوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے کافر ہیں۔

چنانچہ کھاتے پیتے لوگ اور سردارانِ قوم لوگوں کے دلوں میں تقلید آبائی کا شبہہ بھی اُبھارتے ہیں اور انھیں اس بات سے دھوکے میں ڈال دیتے ہیں کہ آبائی دین کا قائم رہنا ضروری ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کا مقابلہ کرنا بھی ضروری سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اللہ کے رسول بڑا منطقی اور درست جواب دیتے ہیں کہ "کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمھیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتادوں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟"

مطلب یہ ہے کہ اصل قابل تقلید چیز تو 'حق' ہے، خواہ وہ ان چیزوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اور حق وہ ہے جسے میں [نبی اور رسول] تمھارے رب کی طرف سے لے کر آیا ہوں۔ لہٰذا تم دیکھو اور تقابل کرو، تمھیں میری بات کی سچائی معلوم ہو جائے گی۔ اس جواب سے باطل کے علم

برداروں کا ناطقہ بند ہو جاتا ہے تو وہ صاف صاف انکار کر دیتے ہیں کہ تم جو کچھ لے کر آئے ہو، ہم اسے ماننے والے نہیں ہیں۔

۳- خفیہ روابط اور فرسودہ روایات کا شبہہ

٦٦٧- داعی کے خلاف شبہات پیدا کرنے میں باطل کے علم برداروں کا ایک طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جو اس فریب کاری میں اس کے ساتھ تعاون کرتی ہے اور ان کے اشاروں پر یہ دعوت کا کام کرتا ہے۔ اس کی دعوت کا دین کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو زمانہ ماضی کی فرسودہ روایات ہیں۔ ان کے ذریعے وہ اپنے مقصد تک پہنچنا چاہتا ہے۔

قریش کے بارے میں اور ان کی طرف سے اسلامی دعوت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف گھڑے جانے والے جھوٹے شبہات کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا. وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا. قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (الفرقان۲۵:۴-۶) جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ”یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔“ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اُتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں: ”یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنھیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔“ اے نبیؐ! ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔

۴- گم نام ہونے کا شبہہ

٦٦٨- شبہات اٹھانے والوں کے شبہات میں سے ایک یہ ہوتا ہے کہ داعی ایک گم نام آدمی ہے، کسی شمار قطار میں نہیں ہے۔ وہ نہ بڑے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے ہے اور نہ معروف قسم کے مال داروں میں اس کا نام ہے۔ نہ اس کے پاس کوئی عہدہ ہے اور نہ معاشرے میں کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ

نکالتے ہیں کہ وہ خود ہی ہر قسم کی بھلائی اور ہر دعوتِ اصلاح کے لیے مناسب ہیں۔ داعی جس چیز کی طرف دعوت دے رہا ہے اگر وہ واقعی اصلاح اور حق ہوتی تو یہ دعوت وہ لوگ لے کر آتے جو معاشرے کے معزز لوگ ہیں۔ مشرکینِ عرب سے وہ بات نقل کرتے ہوئے جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ. أَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَّرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (الزخرف ۴۳:۳۱-۳۲) کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے، تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔ اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں اُتارے، کیوں کہ وہی حکیم بھی ہے اور جاننے والا بھی۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَّأَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ. قُلْ إِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ. وَمَآ أَمْوَالُكُمْ وَلَآ أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى إِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَأُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ اٰمِنُوْنَ. وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعَاجِزِيْنَ أُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (سبا ۳۴:۳۵-۳۸) انھوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ''ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔ اے نبیؐ! ان سے کہو: میرا رب جسے چاہتا ہے، کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا عطا کرتا ہے، مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے۔'' یہ تمھاری دولت اور تمھاری اولاد نہیں ہے جو تمھیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے اُن کے عمل کی دُہری جزا ہے، اور وہ بلند و بالا

عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں، تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ باطل کے علم بردار کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد اور زیادہ افرادی قوت کو اس بات کی دلیل ٹھیراتے ہیں کہ اصلاح کی دعوت دینے کے لیے وہی سب سے زیادہ مستحق ہیں، اور اسی بنا پر وہ ہر قسم کے عذاب سے نجات پائیں گے۔ قرآن عظیم الشان نے ان کے سامنے بیان کر دیا کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے اپنی حکمت بالغہ کی وجہ سے تنگ کر دیتا ہے۔ نیز مال و اولاد اللہ کے قریب کرنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ اللہ کے قریب کرنے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ عمل صالح ہے۔

۵- گم نام لوگوں کی پیروی کا شبہہ

٦٦٩- دعوت کے بارے میں باطل کے علم برداروں کے شبہات میں سے ایک یہ ہے کہ داعی کی پیروی ایسے لوگ کر رہے ہیں جو غیر معروف ہیں، غریب اور فقیر ہیں، ان کے پیشے کم تر درجے کے ہیں، وہ کوتاہ بین اور ناقص رائے والے ہیں۔ یہ داعی اور اس کے پیروکار اس بات کا حق نہیں رکھتے کہ وہ لوگوں کو بھلائی کی طرف رہنمائی کریں یا ہدایت کے راستے میں ان کی قیادت کریں۔ اس بنا پر سردارانِ قوم ہی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی خیر کی طرف رہنمائی کرنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ وہ داعی الی اللہ کے پیروکار نہیں بن سکتے۔ اس لیے کہ وہ فکر و نظر کے مالک ہیں، برعکس ان فقیر لوگوں کے، جنھوں نے بلا سوچے سمجھے اور بغیر کسی دلیل کے داعی الی اللہ کی پیروی شروع کی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِيْنَ

(ہود ١١:٢٧) اس کی قوم کے سردار، جنھوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے: ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے، جو ہمارے ہاں اَراذِل تھے، بے سوچے سمجھے تمھاری پیروی اختیار کر لی ہے۔

بلکہ ہم تو تمھیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔

اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے بیان فرمایا، کہتے ہیں:

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتَانِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ. وَيَا قَوْمِ لَآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ أَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِنَّهُمْ مُّلَاقُوْ رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ. وَيَا قَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ إِنْ طَرَدْتُّهُمْ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ. وَلَآ أَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ أَقُوْلُ إِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ أَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ أَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ إِنِّيْٓ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِيْنَ (ہود ۱۱: ۲۸-۳۱) اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمھارے سر چپیک دیں؟ اور اے برادرانِ قوم! میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے۔ اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنھوں نے میری بات مانی ہے، وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم! اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی؟ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمھاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انھیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی۔ ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔

حضرت نوح علیہ السلام ان کے سامنے بیان فرما رہے ہیں کہ آپ اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر قائم ہیں۔ یعنی انھیں اپنے کام پر پورا یقین ہے، یہ راستہ ان کے سامنے بالکل واضح اور روشن ہے، اور وہ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ اگر یہ ساری باتیں تم سے مخفی ہیں اور تمھیں اس کی طرف رہنمائی نہیں مل رہی، اور اسی بنا پر تم نے جھٹلانے کی ٹھان لی ہے تو ہم تمھیں کیسے مجبور کر سکتے ہیں کہ اس دعوت کو ضرور قبول کرو گے۔ یہ دعوت

تو ایسی ہے کہ آدمی اس سے مطمئن ہو جائے اور اپنی مرضی سے اس کو قبول کرے۔ کیوں کہ دین میں جبر ممنوع ہے۔

رہی یہ بات کہ حضرت نوح علیہ السلام کے پیروکار غریب اور کمزور لوگ ہیں تو اس کے بارے میں حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور لوگوں کو ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلاتے ہیں۔ آپؐ کی دعوت میں مال دار اور غریب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس بات کا اہل ہے کہ اسے اللہ کی طرف دعوت دی جائے، بلکہ دعوت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر کسی کو دعوت دی جائے۔ ان میں سے جو بھی دعوت حق پر لبیک کہتا ہے، اس کی قدر کی جائے گی اور وہ رسول کے پیروکاروں میں شامل ہو جائے گا۔ داعی کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ ان کو اپنی مجلس سے یہ کہہ کر دھتکار دے کہ تم غریب اور کمزور ہو، شریف لوگ تمھارے پاس آنے سے بدکتے ہیں اور ایسی مجلس میں نہیں آتے جس میں تم لوگ موجود ہو۔ اسی طرح داعی ان کو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کے ہاں تمھارے اعمال کا کوئی ثواب نہیں ہے، حالانکہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام پر ایمان لایا ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل باطل اور خاص طور پر سردارانِ قوم ان غریبوں اور کمزوروں کی وجہ سے دل گرفتہ ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ ان غریبوں کی طرح بن جائیں اور انھی کی طرح داعیانِ حق کی پیروی اختیار کریں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پیغمبر سے مطالبہ کرتے ہیں کہ انھیں اپنی مجلس سے ہٹا دو۔ یہی طریقہ سردارانِ قریش نے بھی اختیار کیا اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ ان کو اپنی مجلس سے دھتکار دے۔ اسی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنَاکَ عَنْهُمْ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیَاةِ الدُّنْیَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَکَانَ أَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف ۱۸:۲۸) اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں، اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو، جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔

چنانچہ خواہشات کی پیروی کرنے والوں اور ایسے لوگوں کی، جن کے دل اللہ کے ذکر سے خالی ہوں، ان تجاویز کے حوالے سے پیروی جائز نہیں ہے جن میں وہ داعی سے ناجائز مطالبات کرتے ہیں۔ انھی میں سے ایک چیز یہ ہے کہ داعی سچے مسلمانوں کو صرف اس بنا پر اپنے سے دور کرے کہ وہ غریب اور کمزور ہیں۔

۶۷۰- یہ باطل کے علم برداروں کے بعض وہ شبہات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انبیائے کرام کے قصوں میں نقل کیا ہے۔ ان سب کا مجموعہ ایک شبہے میں یہ ہے کہ داعی اور دعوت پر اعتراضات کرنا اور عوام کو دعوت کے خلاف جنگ کے لیے اُبھارنا، تاکہ کفر و گمراہی میں مبتلا سردارانِ قوم کے لیے میدان خالی رہے اور وہ اپنے باطل طریقوں پر عمل پیرا اور لوگوں کی گردنوں پر اسی طرح سوار رہیں جس طرح کہ پہلے تھے۔

داعی کا شبہات سے دور رہنا

۶۷۱- جب باطل کے علم بردار شبہات کھڑی کرتے ہیں اور داعی اور دعوت پر جھوٹے الزامات لگاتے ہیں تو داعی پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ شبہات کے مقامات سے دور رہے، تاکہ اہل باطل حاشیہ آرئیاں نہ کر سکیں اور ایسے مواقع ان کے لیے افترا پردازی کا ذریعہ نہ بنیں۔ قرآن کریم بھی اس بات کی ضرورت واضح کرتا ہے کہ داعی کو ان مواقع سے بچنا چاہیے جن سے اہل باطل کو شبہات پیدا کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔ ان قرآنی دلیلوں میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱- تمام انبیائے کرام اپنی قوموں سے کہا کرتے تھے کہ ہم اپنی دعوت کے ذریعے تم سے کوئی مال یا کوئی اجر نہیں مانگتے۔ اس لیے کہ ہمارا اجر اللہ وحدہ کے ذمے ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَيَا قَوْمِ لَآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ (ہود۱۱:۲۹) اے قوم! میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے۔

ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا سَأَلْتُكُمْ مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (سبا۳۴:۴۷) اگر میں نے تم سے

کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تم ہی کو مبارک رہے۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

ان آیتوں سے دلالت کا پہلو یہ ہے کہ اگر انبیائے کرام اپنی دعوت کے بدلے میں کوئی مال یا کوئی مزدوری طلب کرتے تو اہلِ باطل اس پر حاشیہ آرائی کرتے اور اسے ایک شبہہ بنا کر اسے اُبھارتے، تاکہ لوگوں کو دعوت الی اللہ اور داعیوں سے روک سکیں۔ وہ کہتے کہ یہ تو مال کے طالب ہیں۔

۲- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْ مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (العنکبوت۲۹:۴۸) [اے نبیؐ! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔

اس میں دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو لکھنا پڑھنا سیکھنے سے دور رکھا۔ اس کا مقصد اس شبہے کو دفع کرنا تھا کہ اہلِ باطل دعویٰ کریں گے کہ یہ رسول جو کچھ لے کر آیا ہے، یہ اس نے قدیم کتابوں سے سیکھ لیا ہے جو اس نے پڑھ لی تھیں اور ان کے نسخے حاصل کیے تھے۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ داعی بعض ایسی چیزوں کو بھی چھوڑ دیتا ہے جن میں اس کا فائدہ ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ غلط شبہات کے رد کرنا چاہتا ہے۔ لکھنا پڑھنا سیکھنے میں فائدہ ہے مگر غلط شبہے کو دور کرنے میں اس سے زیادہ فائدہ تھا، اس لیے شبہے کو رفع کرنے کے لیے اس فائدے کو چھوڑ دیا۔

۳- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ أَدْرٰكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖٓ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس۱۰:۱۶) اور کہو: اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمھیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمھیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمھارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

اس میں استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ نے چالیس سال کی عمر سے پہلے کسی وحی کی تبلیغ نہیں کی۔ تاکہ شبہے کو اچھی طرح رفع کیا جا سکے اور یہ باطل کے علم برداروں کے قول کے لیے زیادہ دندان شکن ثابت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان یہ طویل عرصہ گزارا۔ انھوں نے آپ کی سیرت، آپؐ کے بلند اخلاق، آپ کی امانت اور آپؐ کی صداقت کو خوب جانا پہچانا۔ چنانچہ یہ بات معقول نہیں ہے کہ آدمی اتنے طویل عرصے کے بعد جھوٹ بولے اور رسالت کا دعویٰ کرے۔ جب معاملہ یہ ہے کہ آپؐ کی صداقت ظاہر

ہو چکی ہے تو کافروں کا یہ دعویٰ کہ آپؐ ساحر، یا مجنون، یا جھوٹے ہیں، ایک باطل اور ناقابل قبول دعویٰ ہے۔

یہاں بھی وہی بات کہی جا سکتی ہے جو ہم نے اوپر کہی ہے کہ بعض اوقات فوائد کے حصول کو شبہات رفع کرنے کی خاطر مؤخر کیا جاتا ہے۔ یہاں دیکھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بیشتر حصہ رسالت کی تبلیغ سے پہلے گزر چکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آپؐ کو چالیس سال کی عمر سے پہلے نبی بنایا جاتا تو ممکن تھا کہ آپ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے۔ مگر اللہ کی حکمت کو یہی منظور ہوا کہ آپؐ کی بعثت چالیس سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد ہی ہو۔ اگرچہ اس سے کچھ نفع اور کچھ بھلائی تو فوت ہوگئی، کہ آپؐ کو نبوت ملنے میں تاخیر ہوگئی مگر اس سے کفار کے بہت سے شبہات اور جھوٹے دعوے باطل ہو گئے، جیسا کہ آیت کے ظاہری الفاظ ہی سے واضح ہے۔

اسی طرح ہر سمجھ دار داعی پر لازم ہے کہ بعض فوائد اس مقصد کے لیے چھوڑے کہ اہل باطل کے شبہات رفع ہوں اور اس سے جو نقصان دعوت کو پہنچتا ہے اس سے بچا جائے۔ اس سب کی وجہ یہ ہے کہ شبہہ جب لوگوں کے درمیان برپا ہو جاتا ہے اور اس کی اشاعت ہو جاتی ہے تو وہ دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور کرتا ہے، خصوصاً ان دلوں پر جن میں ضعف، جہالت اور نفاق پایا جاتا ہو۔ اس صورت میں شبہے کا مقابلہ کرنا اور اسے ختم کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز جو شبہات پیدا ہونے کو روکے یا اس کے مقابلے میں قوت فراہم کرے اس کا لحاظ رکھنا، اس کو معتبر سمجھنا اور اس کا حصول داعی کے لیے مفید ہے، خواہ اس سے بعض فوائد ضایع ہی ہو جائیں۔ اس لیے کہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ دَرْءُ الْمَفَاسِدِ أَوْلَى مِنْ جَلْبِ الْمَنَافِعِ. خرابی کو رفع کرنا فائدے کے حصول سے زیادہ ضروری ہے۔ نیز دو نقصانوں میں سے اس کو برداشت کیا جائے گا جو کم ہو۔

۴- ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُبِينٌ (یٰس ۳۶:۶۹) ہم نے اس نبی کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے۔ یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف صاف پڑھی جانے والی کتاب۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو شعر سیکھنے اور اسے تخلیق کرنے سے روکا ہے، تاکہ یہ باطل کے علم برداروں کے ہاتھوں اس بات کا ذریعہ نہ بن جائے کہ وہ اس پر اپنے شبہات کی بنیاد رکھیں۔

۶۷۲- حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی طرف دعوت دینے والے اس بات کے دوسروں سے زیادہ محتاج ہیں کہ وہ بہت سی ایسی مباح چیزوں سے بھی اپنا دامن بچائیں، جن کو اہل باطل کو یہ موقع ملتا ہے، کہ وہ داعی کے عمل کو اپنے لیے غنیمت جانیں اور اسے اپنے شبہات اڑانے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے کا ذریعہ بنائیں۔ مگر اس بات پر بھی متنبہ رہنا چاہیے کہ کون سی چیز ہے جس سے شبہات کو رفع کرنے کی غرض سے بچنا چاہیے اور کون سی چیز ہے جسے اپنانا چاہیے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ شبہات میں سے محسوس ہوتی ہیں مگر وہ دعوت ہی کا حصہ ہوتی ہیں۔ یہ ایک نازک مقام ہے جس میں اکثر اوقات غلطی ہو جاتی ہے۔ یہ بات کافی تفصیل کا تقاضا کرتی ہے مگر اس مقام پر ہم اتنا ہی کہہ دینے پر اکتفا کرتے ہیں کہ داعی کے لیے اس بات کی گنجایش موجود ہے کہ وہ اپنے نفس سے متعلق اور اپنے مباح فوائد کو شبہات رفع کرنے کی غرض سے چھوڑے، اور یہ ترک بعض اوقات واجب یا مستحب کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے یہ گنجایش نہیں ہے کہ وہ اصل دعوت کو یا اس سے براہ راست تعلق رکھنے والی، یا دعوت کے منہج اور اسلوب سے تعلق رکھنے والی چیز کو شبہات رفع کرنے کی غرض سے چھوڑ دے۔

مثال کے طور پر کسی حکمران کو دعوت دینا اور دعوت کی غرض سے اس کے پاس جانا اس دلیل کے ساتھ ترک نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے لوگوں کے دلوں میں یہ شبہہ پیدا ہوگا کہ داعی حکمران کا آلۂ کار ہے یا اس کے ساتھ ساز باز کرنا چاہتا ہے۔

۳

ترغیب وترہیب

ترغیب وترہیب کے معنی واہمیت

۶۷۳-ترغیب سے مراد ہر وہ طریقہ ہے جو مخاطبین دعوت کو دعوت اور حق کی قبولیت اور اس پر ڈٹ جانے پر راغب کرے۔ترہیب سے ہماری مراد ہر وہ ذریعہ ہے جو مدعو کو دعوت کی عدم قبولیت اور حق سے انکار کرنے، یا قبولیت کے بعد اس پر قائم نہ رہنے سے خوف زدہ اور محتاط کرے۔

دیکھنا چاہیے کہ قرآن کریم میں جگہ جگہ اسلام کو قبول کرنے کی ترغیب اور اس سے انکار سے ڈراوا ہے۔ اس طرح کی آیات سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ یہ دعوت الی اللہ کے اس اسلوب یعنی ترغیب وترہیب کی اہمیت کی قطعی دلیل ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ داعی کو یہ اسلوب کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

ترغیب وترہیب کے ذرائع

۶۷۴-ترغیب کی اصل بنیاد یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کی رحمت اور آخرت میں اس کے ثواب کی یاد دلائی جائے۔ترہیب کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی طرف سے اخروی عذاب کا خوف دلایا جائے۔یہی طریقہ اللہ کے پیارے نبیوں کا تھا، جیسا کہ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے اور جیسا کہ سنت نبویہ سے معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلے کی چند آیات حسب ذیل ہیں:

۱- حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَ كُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الاعراف ۷:۶۰-۶۳) کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے

تمھارے رب کی یاددہانی آئی، تاکہ تمھیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے۔

۲- حضرت نوح علیہ السلام ہی کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد ہے: إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلٰى قَوْمِهٖٓ أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ. قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ. أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَأَطِيْعُوْنِ. يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلٰٓى أَجَلٍ مُّسَمًّى إِنَّ أَجَلَ اللّٰهِ إِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (نوح۷۱:۱-۴) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کردے، قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔ اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! میں تمھارے لیے ایک صاف صاف خبردار کردینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اللہ تمھارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمھیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا، کاش تمھیں اس کا علم ہو۔

۳- اپنے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيٓ أَنْزَلْنَا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ. يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صٰلِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ أَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التغابن۶۴:۸-۹) پس ایمان لاؤ اللہ پر، اور اس کے رسول پر، اور اس روشنی پر جو ہم نے نازل کی ہے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (اس کا پتا تمھیں اس دن چل جائے گا) جب اجتماع کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا۔ وہ دن ہوگا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا۔ جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک عمل کرتا ہے، اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

۴- إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد۴۷:۱۲) ایمان لانے

والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اللہ ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں، جانوروں کی طرح کھاپی رہے ہیں، اور اُن کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔

۵- سنت نبویہ میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے بیعت کرنے والوں سے جنت کا وعدہ فرماتے تھے۔ اس طرح کا ایک واقعہ وہ ہے جب آپؐ نے بیعت عقبہ اولیٰ میں لوگوں سے جنت کا وعدہ فرمایا۔ اس وعدے کے الفاظ یہ تھے: فَإِنْ وَفَّيْتُمْ فَلَكُمُ الْجَنَّةُ. اگر تم نے اپنے اس عہد کو وفا کیا تو تمھارے لیے جنت ہوگی۔[1]

۶۷۵- اصل ترغیب وترہیب تو یہی ہے کہ لوگوں کو آخرت کے بدلے کی یاد دلائی جائے، مگر یہ بھی جائز ہے کہ مخاطبین دعوت کو دعوت پر لبیک کہنے کی صورت میں جو دنیوی بھلائی نصیب ہوتی ہے اس کی ترغیب دی جائے اور دعوت کو ٹھکرانے کی صورت میں جو نقصان پہنچتا ہے اس سے ان کو خوف زدہ کیا جائے۔ اس کے جواز کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

۱- وَعَدَ اللهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (النور۲۴:۵۵) اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے، اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔

۲- حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو کچھ کہا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے یوں نقل کیا ہے: فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا. يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا. وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهَارًا (نوح۷۱:۱۰-۱۲) میں نے کہا: اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری

کر دے گا۔

۳- کفارِ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں آپؐ کے چچا ابوطالب کے پاس آئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ آپؐ سے بات کر کے اُن کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے روکیں، ہم بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی نقصان نہیں پہچائیں گے۔ ابوطالب نے آپؐ کے پاس پیغام بھیجا اور جب آپؐ آئے تو ابوطالب نے کہا: بھتیجے! یہ تیری قوم کے اشراف ہیں، یہ تمھارے پاس جمع ہوئے ہیں تاکہ تمھارے ساتھ کچھ لین دین کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یَاعَمِّ! كَلِمَةٌ وَّاحِدَةٌ يُعْطُوْنِيْهَا، يَمْلِكُوْنَ بِهَا الْعَرَبَ وَتَدِيْنُ لَهُمْ بِهَا الْعَجَمُ. چچا جان! میں تو ان سے صرف ایک کلمہ لینا چاہتا ہوں، جس کے ذریعے یہ عرب کے بادشاہ بن جائیں گے اور عجم بھی ان کے آگے جھک جائیں گے۔

ابوجہل نے کہا: ضرور، ضرور!! ایک نہیں، ہم دس کلمات دے دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تَقُوْلُوْنَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَتَخْلَعُوْنَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ. کہنا یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور کرنا یہ ہے کہ اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو ان سے ہاتھ کھینچو۔[1]

ترغیب وترہیب کے چند اسالیب

۶۷۶- ترغیب وترہیب کے اسالیب میں سے ایک یہ ہے کہ قوم کو ان نعمتوں کے ذریعے یاد دہانی کرائی جائے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر کی ہیں۔ ان نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آدمی کو اللہ کی اطاعت پر آمادہ کریں، جس نے آدمی پر یہ نعمتیں کی ہے۔ نیز انھیں اس بات سے ڈرایا جائے کہ اگر انھوں نے دعوت الی اللہ پر لبیک نہ کہا اور اس سے انکار کیا تو وہ ان نعمتوں سے محروم ہو سکتے ہیں۔ اور صرف نعمتوں سے محرومی ہی نہیں بلکہ ان کے اوپر عذاب بھی آ سکتا ہے۔ اس قسم کے اسلوب کو بیان کرنے والی آیات درج ذیل ہیں:

۱- حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الاعراف ۷:۶۹) بھول نہ جاؤ کہ تمھارے رب نے نوحؑ کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمھیں خوب تنومند کیا،

۱- سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۷

پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

۲- حضرت ہود علیہ السلام ہی کے بارے میں یہ بھی فرمایا: وَاتَّقُوا الَّذِيٓ أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ. أَمَدَّكُم بِأَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ. وَجَنَّاتٍ وَّعُيُوْنٍ. إِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. (الشعراء۲۶:۱۳۲-۱۳۵) ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمھیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمھیں جانور دیے، اولادیں دیں، باغ دیے اور چشمے دیے۔ مجھے تمھارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

۳- حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاذْكُرُوٓا إِذْ جعلكُمْ خُلفآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (الاعراف۷:۷۴) یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمھیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

۴- اور قریش کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِإِيْلَافِ قُرَيْشٍ. إِيْلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ. فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ. الَّذِيٓ أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (قریش۱۰۶:۱-۴) چونکہ قریش مانوس ہوئے، (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس، لہٰذا اُن کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔

ترغیب وترہیب کے لوازم

۶۷۷- چونکہ انسان دنیا میں رہتا ہے اور اس کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے، اسے محسوس کرتا ہے اور اس کی فریب کاریوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا ہے اس وجہ سے بعض اوقات یہ چیزیں اسے دنیا کی طرف مائل کر دیتی ہیں اور وہ اس کے ساتھ تعلق جوڑ کر آخرت کو بھول جاتا ہے۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ مخاطبین دعوت کو اس بات سے نفرت دلائی جائے کہ وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیں۔ اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ لوگوں کو

یک رم دنیا سے لاتعلق ہونے اور اس سے فرار کی دعوت دی جائے۔ اس کے ساتھ دنیا کی حقیقت اور اس کی قدر و قیمت بھی اس کے سامنے بیان کی جائے اور اس کے مقابلے میں آخرت کی نعمتوں اور اس کی حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا جائے۔ یہ ساری چیزیں قرآن کریم نے بہترین انداز میں بیان کر دی ہیں۔ قرآن کریم کے ان بیانات سے کوئی بھی عقل مند مسلمان ہو تو وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دے گا۔ بلکہ اگر دعوت کا مخاطب غیر مسلم ہے تو اس کے لیے بھی دنیا اور آخرت کے درمیان قرآن کریم کے بیان کردہ توازن میں ایک کشش ہوتی ہے۔ یہی چیز بعض اوقات اس کے ایمان لانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس بیان میں صداقت ہے اور اس میں دنیا کی اصل قدر و قیمت بیان کی گئی ہے۔

اس بارے میں جو قرآنی آیات ہیں ان میں سے چند آیات یہ ہیں:

۱ – إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتّٰىٓ إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قَادِرُوْنَ عَلَيْهَآ أَتَاهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (یونس۱۰:۲۴) دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہوگئی، پھر عین اس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں، یکا یک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں۔

۱ – اِعْلَمُوْٓا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَّفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (الحدید۵۷:۲۰) خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمھارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی

نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی۔ پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔

۶۷۸- سیرت نبوی میں بھی دنیا سے اور اسے آخرت پر ترجیح دینے سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آخرت کے مقابلے میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ سیرت نبوی کی ان تعلیمات میں سے چند احادیث حسب ذیل ہیں:

۱- إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَّإِنَّ اللهَ تَعَالٰى مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ، فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ. دنیا میٹھی اور سرسبز ہے اور اللہ تعالیٰ تمھیں اس میں نائب بناتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔ لہٰذا دنیا سے، اور عورتوں سے بچو۔

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشَ الْاٰخِرَةِ. اے اللہ دنیا کی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی ہے ہی نہیں۔

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی قدر و قیمت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَا الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا مِثْلَ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ. آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے تم میں سے ایک شخص سمندر میں اپنی انگلی ڈبوئے، تو وہ دیکھے کہ اس کے ساتھ کتنا پانی نکلتا ہے۔

۴

تعلیم وتربیت

تعلیم کی ضرورت

٦٧٩- جب داعی کو مثبت جواب ملتا ہے، دعوت کا مخاطب دعوت الی اللہ کو قبول کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے دیتا ہے اور اس کے دل کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے تو داعی پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کی دیکھ بھال کرے تاکہ اس کے اندر پرانی بیماری کے مقابلے میں قوت مدافعت پیدا ہو جائے۔ داعی کو چاہیے کہ اپنے مخاطب کو دین کی تعلیمات سے آگاہ کرے اور اس کی ثابت قدمی کا سامان کرے۔

اس کا طریقہ یہی ہے کہ اسے اسلام کی تعلیمات اور افکار سے روشناس کرائے۔ داعی کے لیے کسی طرح یہ جائز نہیں کہ وہ ان لوگوں کو کھلا چھوڑ دے، جنھوں نے دعوت کو نیا نیا قبول کیا ہے۔ ان کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ انھوں نے اسلام قبول کیا ہے اور ان کا شمار مسلمانوں میں ہونے لگا ہے۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں ان کی پرانی بیماری تھوڑی بہت پھر بھی رہتی ہے، اور وہ بیماری ہے شرک مع اپنی جملہ اقسام۔ یہ چیز ان کے لیے الٹے پاؤں پھرنے اور اسلام سے مرتد ہونے، یا غلط راستے پر چلنے کا ذریعہ بن سکتی ہے، حالانکہ ان کا خیال ہوگا کہ وہ ہدایت پر ہیں۔

٦٨٠- سنت نبوی میں بہت سے واقعات ہیں جو دعوت الی اللہ کے اس بہترین منہج پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کی جو اسلام کو قبول کریں، تعلیم وتربیت کرنا۔

سنت مطہرہ سے ثابت ہے کہ جس وقت عمیر بن وہب نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا: **فَقِّهُوا أَخَاكُمْ فِي دِينِهِ، وَأَقْرِئُوهُ الْقُرآنَ.** اپنے بھائی کو دین [کے احکام] سمجھاؤ اور اسے قرآن پڑھاؤ۔[1]

١- سیرت ابن ہشام، ج ٢، ص ٣٠٨

اس حدیث سے ان لوگوں کی تعلیم وتربیت کی ضرورت پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو شخص اسلامی تعلیمات میں سے کسی چیز کا علم حاصل کرے تو اسے چاہیے کہ ان کو اپنے علاوہ دوسرے مسلمانوں خصوصاً نومسلموں کو سکھا دے۔ یہ بھی سنت سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو بھیجا تھا کہ مدینے کے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ مسلسل قرآن کریم کی تعلیم دیتے رہے اور لوگوں کو اسلام کی طرف بلاتے رہے، یہاں تک کہ انصار کے گھروں میں کوئی گھر بھی ایسا نہ رہا جس میں کوئی نہ کوئی مسلمان نہ ہو۔[1]

جس وقت بنوالمصطلق کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس اپنا ایک ایلچی بھیجا جو اُن کو اسلام کے مختلف امور کی تعلیم دے۔[2]

۶۸۱- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اسلام کے امور کی تعلیم دینے کو کتنی اہمیت دیتے تھے اس کی ایک دلیل وہ حدیث ہے جسے ابورِفاعہ تمیم بن اُسیدؓ نے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب پہنچا، آپؐ خطبہ دے رہے تھے۔ میں نے کہا: یارسول اللہ! میں ایک اجنبی ہوں، میں اپنے دین کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے دین کے احکام کیا ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف توجہ کی اور خطبہ چھوڑ دیا۔ آپؐ میرے قریب آ کر بیٹھ گئے تو ایک کرسی لائی گئی۔ آپؐ اس پر تشریف فرما ہوئے اور مجھے ان چیزوں کی تعلیم دینے لگے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تعلیم کی تھیں۔ اس کے بعد جا کر خطبہ مکمل کیا۔[3]

اگر لوگوں کو اسلام کے امور کی تعلیم دینا ضروری کام نہ ہوتا اور اس میں تاخیر کی گنجایش ہوتی تو آپؐ کبھی خطبہ چھوڑ کر کسی کو تعلیم دینے کے لیے نیچے نہ اُترتے۔

اس لیے دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کے احکام کی تعلیم دیں، ان کو حدود اللہ کی پہچان کرائیں۔ انھیں چاہیے کہ صرف پاکیزہ جذبات اور بعض اچھے کلمات کے ورد پر اکتفا نہ کریں۔ اسلام ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے ہے۔ اس لیے یہ عمومی باتیں کافی نہیں ہیں بلکہ ضروری ہے

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۰۸

۲- إمتاع الأسماع، ص ۳۴

۳- ریاض الصالحین، ص ۲۶۸

کہ ممکن حد تک تفصیلی معلومات حاصل ہوں۔

اسلامی تعلیمات کی اشاعت ہر مسلمان پر لازم ہے۔ چنانچہ جس کے پاس علم ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اسے چھپائے، خصوصاً اس وقت جب کہ جہالت عام ہو اور مختلف بدعات کا ظہور ہو جائے۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں: علما پر واجب ہے کہ کلام اللہ کے معانی سے پردہ اٹھائیں اور اس کی تفسیر کریں۔ علم کی طلب میں علم کے مراکز میں جائیں اور اس کی تعلیم و تعلم کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهُ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ (آلِ عمران ۳:۱۸۷) اور جب ان اہل کتاب سے اللہ نے عہد لیا تھا کہ تمھیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا، انھیں پوشیدہ رکھنا نہیں ہوگا۔ مگر انھوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔ کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔

پھر علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں

چنانچہ اے مسلمانو! ہم پر لازم ہے کہ ان چیزوں سے باز آ جائیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی مذمت کی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس حکم کو بجا لائیں جو ہمیں دیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو کتاب نازل ہوئی ہے اس کو سیکھیں اور سکھائیں، اور اسے خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھائیں۔[۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ داعی کے لیے یہ فریضہ زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ داعی الی اللہ کی تو شان ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو بصیرت اور علم کے ساتھ اللہ کی طرف بلائے گا۔ چنانچہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ دوسروں کو بھی بصیرت فراہم کرے اور انھیں سکھائے اور اس کے پاس جو علم ہے اس کے بارے میں بخل سے کام نہ لے۔ اگر کسی نے علم کو چھپایا تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُوْنَ. إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَأَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَأُولٰٓئِكَ أَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. (البقرۃ ۲:۱۵۹-۱۶۰) جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۳

تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآں حالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ جو اِس روش سے باز آ جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں اور جو کچھ چھپاتے تھے، اسے بیان کرنے لگیں، ان کو میں معاف کردوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

تعلیم اور تربیت ساتھ ساتھ

۶۸۲- یہ بھی کافی نہیں ہے کہ مسلمان داعی دعوت قبول کرنے والوں کو صرف اسلامی تعلیمات سکھائے۔ اس پر یہ بھی لازم ہے کہ انھیں ان تعلیمات پر عمل کرنے پر آمادہ کرے اور ان کے کردار کو اس کے تقاضوں کے مطابق ڈھالے۔ 'تعلیم و تربیت ساتھ ساتھ' سے ہماری مراد یہی ہے۔ پہلے دور کے مسلمانوں کا یہی طریق کار تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے ایک شخص جب دس آیات سیکھ لیتا تو پھر وہ آگے نہیں بڑھتا تھا، جب تک کہ ان کے معانی کی معرفت حاصل نہ کرتا اور اس پر عمل پیرا نہ ہوتا۔

حضرت ابوعبدالرحمٰن السلمی کہتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں نے بتایا جو ہمیں قرآن کریم پڑھاتے تھے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم سنتے تھے۔ وہ جب دس آیات سیکھ لیتے تو انھیں ایسے نہیں چھوڑتے تھے، بلکہ ان میں جو احکام ہوتے تھے ان پر عمل کرتے تھے۔ اس طرح انھوں نے قرآن کریم اور اس پر عمل کرنا ایک ساتھ سیکھ لیا۔[1]

اسلامی تعلیمات کے مطابق تربیت کی ضرورت

۶۸۳- ایک مسلمان کی اسلامی تعلیمات کے مطابق تربیت اور اس کے کردار کو اِن کے مطابق ڈھالنا ایک ضروری امر ہے۔ کسی مسلمان کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داعی پر لازم کردیا گیا ہے کہ وہ اس کا اہتمام کرے اور اس کام کو اس کی دلچسپیوں میں سرفہرست بنایا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کو محض یاد کرنا اور ان تعلیمات کا دل کے ساتھ چھو کر بھی نہ گزرنا اور انسان کے کردار کا ان کے رنگ میں رنگا نہ جانا کسی طرح بھی مفید نہیں ہے اور اس سے ایک مسلمان کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ جو شخص جسم کی تقویت کے طریقے

1- تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۳

سیکھتا ہے، اور اگر اس سے ان کے بارے میں سوال پوچھا جائے تو وہ فرفر سنا دیتا ہے یا اپنے دل میں اس کو دہراتا رہتا ہے مگر ان کو اپنے جسم پر عملی کر کے نہیں دکھاتا، وہ اچھی صحت یا مضبوط جسم کا مالک نہیں بن سکتا۔ اسی طرح کی صورت حال اس شخص کی ہے جو اسلام کو جان لیتا ہے اور اس کی تعلیمات کو یاد کر لیتا ہے، مگر ان سے اپنے نفس کی تربیت نہیں کرتا۔

اس کے علاوہ جو شخص سیکھتا اور اپنے سیکھے ہوئے پر عمل نہیں کرتا تو وہ پہلی ہی آزمایش اور امتحان میں پھسل جانے اور الٹے پاؤں پھر جانے سے نہیں بچ سکتا۔ حالانکہ دنیا کے فتنے اور اس کی آزمایشیں کتنی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهٖ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (الحج ۲۲:۱۱) اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے، اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو اُلٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔

یہی وجہ ہے کہ مکی دور اسلامی تعلیمات کے ساتھ تربیت اور اس کے اُن عظیم اصولوں کی سمجھ کے ساتھ ممتاز ہے جو اسلامی عقیدے کی بنیاد بننے والے تھے۔ اس گہری تربیت کے ساتھ ان معزز ہستیوں کے نفوس کی تربیت ہوئی۔ ان کے نفوس اسلام کے حقائق سے بھر گئے۔ اس طرح وہ اسلام کا ہراول دستہ ثابت ہوئے اور اس تربیت نے ان کو اس قابل بنایا کہ وہ اللہ کی راہ میں اور اس کے دین کو آفاق میں پہنچانے کے لیے وہ مصائب برداشت کریں جن کے برداشت کرنے سے دوسرے لوگ عاجز آ جاتے۔

تربیت کے سنگ میل

۶۸۴- تربیت کے سنگ ہائے میل اور اس کے اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمان ایک اعلیٰ مقصد کے لیے کمر ہمت کس لے۔ اگر ساری زندگی گزر جائے تو گزر جائے، مگر وہ اس کی طرف بڑھنے اور تیز رفتاری کے ساتھ اس کے پاس جانے سے باز نہ آئے۔ یہ مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچنا اور اس کی رضا کا حصول، اس کے ذکر سے لذت پانا اور اس کی عبادت سے محظوظ ہونا اور اسی چیز کا امیدوار ہونا ہے جو اللہ کے پاس موجود ہے۔

یہ اتنا اعلیٰ مقصد ہے کہ اس میں اس بنا پر کوئی تنگی پیدا نہیں ہوتی کہ اس کے چاہنے والے اور اس کے

لیے کوشش کرنے والے زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے چاہنے والوں میں کسی قسم کا بغض وحسد پیدا ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔ ان کے درمیان ہمیشہ انس ومحبت اور باہمی مقابلہ ہوتا ہے۔ مگر یہ چیز صرف خواہشات کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی، کہ آدمی فارغ بیٹھ کر سستی کا مظاہرہ کرے اور ان اعلیٰ مقاصد کے لیے کچھ بھی نہ کرے۔ مثلاً جو شخص مکہ پہنچنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہوگا کہ سفر کا پختہ ارادہ کر لے، اس کی طرف چل پڑے اور اپنے ملک اور اہل وعیال سے الگ ہو جائے، پوری رفتار کے ساتھ سفر کرے اور اپنے ساتھ سامان سفر کی خاصی مقدار لے جائے۔

زیر بحث مقاصد میں اصل زادِ راہ تقویٰ ہے، اور ایک مسلمان کا اپنی پوری زندگی کو اللہ رب العالمین کے لیے خالص کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَٰلَمِينَ (الانعام ۶:۱۶۲) کہو: میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تعلیمات اور ان مقاصد کے ساتھ مسلمانوں کو یاددہانی کیا کرتے تھے اور اُن کو اس بات پر اُبھارتے تھے کہ وہ تقویٰ کا زادِراہ ساتھ لے لیں۔ یہاں تک کہ پہلا خطبہ جو آپؐ نے مدینے میں ارشاد فرمایا وہ اسی قسم کا تھا کہ اس میں آپؐ نے لوگوں کو تقویٰ پر اُبھارا اور آخرت کے ساتھ تعلق جوڑنے کی تاکید کی۔[1]

تربیت کے چند وسائل

۶۸۵- انتہائی مؤثر تربیت کے وسائل میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب عظیم کے ساتھ تعلق ہے، تلاوت کا تعلق، غور وفکر کا تعلق اور فہم کا تعلق۔ دل کے دروازوں کو اس عظیم روح یعنی قرآن کے لیے کھول دینا ہے، تاکہ اس کے انوار مسلمان کے سراپے پر چھا جائیں۔ اس طرح انسان کے اندر کی بیماریاں اور اندھیرے چھٹ جائیں گے اور انسان ایک حقیقی زندگی میں قدم رکھے گا۔ اس لیے کہ قرآن، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ایک نور، ہدایت، شفا اور روح ہے اور نور کے سامنے اندھیرا نہیں ٹھیر سکتا، نہ ہدایت کے سامنے شک کو ثبات نصیب ہوتا ہے، نہ شفا کے ساتھ کسی بیماری کے پاؤں جمتے ہیں اور نہ روح ساتھ میں موت ایک ساتھ رہ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۱۸

الٓمّٓ. ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (البقرۃ ۲:۱-۲) الف، لام، میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے پرہیز گار لوگوں کے لیے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (بنی اسرائیل ۱۷:۸۲) ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا..... (التغابن ۶۴:۸) پس ایمان لاؤ اللہ پر، اور اس کے رسول پر، اور اس روشنی پر جو ہم نے نازل کی ہے۔

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ ۴۲:۵۲) اور اسی طرح (اے نبیؐ!) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمھاری طرف بھیجی۔

۶۸۶- ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ سیرت نبوی اور سیرت صحابہؓ کے ساتھ گہرا تعلق رکھے، یہاں تک کہ مسلمان اس حالت میں رہے گویا وہ مدینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کے درمیان رہ رہا ہے۔ وہ زمانے کی دوریوں کو روندتے ہوئے روحانی طور پر اپنے معاشرے سے گردن چھڑا کر رسول اللہ اور آپؐ کے صحابہؓ سے جاملتا ہے اور ان کی سیرت کو اپنا لیتا ہے۔ ایک مسلمان داعی کا یہ فرض ہے کہ وہ دعوت حق پر لبیک کہنے والوں کی اس نہج پر تربیت لینے میں مدد کرے اور ان کے ساتھ اس قسم کے اسلوب کو اپنانے میں مددگار ثابت ہو۔ تاکہ وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں اور وہ بھی اللہ کی طرف دعوت دینے والے بن جائیں۔ اسلام کو اور بھی بہت سے سمجھ دار داعیانِ حق کی اشد ضرورت ہے۔

......☆......☆......

باب پنجم

دعوت کے وسائل

تمہید

۶۸۷-اس باب میں ہم ان اموراور اشیا سے بحث کریں گے جن سے ایک داعی مدد لیتا ہے۔ اور یہ دعوت کے وسائل ہیں۔ اگر داعی یہ سب کچھ اچھی طرح سمجھ جائے تو اس کے اندر وہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی جس کے ذریعے وہ دعوت الی اللہ کو اچھے انداز میں لوگوں تک پہنچا سکے۔ ہر سہولت کی چیز اپنے مقام پر استعمال ہونی چاہیے، مگر سارے امور اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔

وسائل کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ وسائل جن کا تعلق دعوت الی اللہ کے لیے بہتر اور موزوں فضا تیار کرنے کے ساتھ ہو۔ ان کو ہم دعوت کے خارجی وسائل کہتے ہیں۔ دوسرے وہ وسائل جن کا تعلق براہ راست دعوت کے ساتھ ہو۔ ان کو ہم ابلاغِ دعوت کے وسائل کہتے ہیں۔

اس بنا پر یہ باب دو فصول پر مشتمل ہے:

پہلی فصل: دعوت کے خارجی وسائل

دوسری فصل: ابلاغ دعوت کے وسائل

پہلی فصل

دعوت کے خارجی وسائل

تمہید

۶۸۷ - ان وسائل کی بنیاد زندگی کی حقیقت کے بارے میں درست غور وفکر، اور اس کے واقعات کو قانونِ اسباب کے مطابق چلانا ہے۔ یہ وسائل بہت سے ہیں، جن میں سے چند وسائل ہم یہاں بیان کریں گے۔

۱- احتیاط

۲- دوسروں کی مدد حاصل کرنا

۳- نظم وضبط

ہماری نظر میں یہ تین وسائل خارجی پہلو کے لحاظ سے سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے وسائل انھی کے ذیل میں آئیں گے یا ان کے قریب قریب ہوں گے۔ ہم ان تین وسائل کے بارے میں الگ الگ عنوانات کے تحت بحث کریں گے۔

۱

احتیاط

احتیاط کا مفہوم

۶۸۹- [احتیاط کے لیے عربی میں حذر کا لفظ استعمال ہوتا ہے] اس کے لغوی معنی اخفا، بچنا اور بیدار رہنا ہے۔ رجلٌ حذرٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو بیدار مغز ہو۔ متحذرٌ اس کو کہتے ہیں جس نے اپنے آپ کو اس چیز کے مقابلے کے لیے تیار کیا ہو جس سے وہ ڈرتا ہے، کہ اچانک اسے کوئی نقصان نہ پہنچائے۔[۱]

احتیاط، ایک پسندیدہ صفت

۶۹۰- حذر کی لغوی تعریف سے ہمارے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس کی بنیاد معرفت اور علم پر قائم ہے۔ احتیاط ہی ہے جس کے ذریعے انسان کو علم ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کو ناپسند کرتا ہے اس کے امکانات کیا ہیں۔ اس طرح آدمی اس کے واقع ہونے سے ڈرتا ہے اور اس سے محتاط ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے اسباب مہیا کرتا ہے کہ وہ ناپسندیدہ امر واقع ہی نہ ہو۔ اور اگر واقع ہو ہی جائے تو اس کا بروقت علاج کیا جائے، یا کم از کم یہ کہ اس کے مضر اثرات کو کم کیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ’حذر‘ سے مراد وہ خوف زدگی نہیں ہے جس میں آدمی کسی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے، مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور دل ہار جاتا ہے۔ وہ پریشانیوں اور تفکرات کا شکار ہو جاتا ہے اور مصیبت کے آنے سے پہلے ہی اس کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اس لیے ہمارے بیان کردہ معنی کے لحاظ سے احتیاط ایک قابلِ تعریف صفت ہے، نہ کہ قابلِ مذمت۔

یہ اہلِ ایمان کی صفت ہے۔ یہ صفت ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو درست عقل وفہم کے مالک ہوتے

۱- دیکھیے لسان العرب، مادہ ح ذ ر

ہیں اور جو کائنات میں اللہ کے قوانین پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی صفت نہیں ہے جو بات بات پر طیش میں آتے ہیں، قدم قدم پر حماقت، جہالت اور کوتاہ بینی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو نہ تو احتیاط کی سمجھ آتی ہے اور نہ ان کے دماغ میں اس کی گنجایش ہوتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی ناک سے زیادہ دور دیکھ نہیں پاتے اور وہ کسی متوقع مصیبت کا کوئی احساس نہیں رکھتے، سوائے اس کے کہ مصیبت ان کے اوپر عملاً آن پڑے۔ مصیبت کے واقع ہونے سے پہلے وہ غافل اور لاپروا بن کر بیٹھے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مصیبت ان کے اوپر اچانک آ پڑتی ہے تو پھر وہ پریشان ہو کر ہڑبڑا جاتے ہیں۔

عقل مند اور جاہل کے درمیان فرق ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ پہلا شخص خطرے کو نازل ہونے اور کسی ناپسندیدہ امر کو واقع ہونے سے پہلے معلوم کر لیتا ہے، چنانچہ وہ اس کے لیے بھرپور تیاری کر لیتا ہے اور اسے اپنے سے دور ہٹا دیتا ہے۔ مگر دوسرا شخص خطرے کا احساس ہی نہیں رکھتا، سوائے اس کے کہ مصیبت اس کے اوپر عملاً آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس اس کا مقابلہ کرنے اور اس سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کوئی تیاری نہیں ہوتی۔

جب جاہل اور محتاط آدمی کے درمیان یہ فرق واضح ہو گیا تو اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ محتاط آدمی مصیبت کے آنے سے پہلے جو احتیاط کرتا ہے اسے جاہل آدمی اس خوف کا حصہ سمجھتا ہے جس کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، اور اسے وہ بزدلی قرار دیتا ہے جس کا ایمان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اکثر اوقات ایک محتاط آدمی جاہلوں کی باتوں سے متاثر ہوتا ہے، چنانچہ وہ اپنی احتیاط پر عمل کرنا چھوڑ دیتا ہے اور خطرے سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، اگرچہ اس کے بعض آثار ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایک مسلمان داعی کو چاہیے کہ ان جاہلوں کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دے۔

ایک محتاط آدمی کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو سمندر میں کشتی کے ذریعے سفر کر رہا ہو۔ اور وہ اسی اندازے کے مطابق چل رہا ہو جو اندازہ اس کے سامنے فضا کی حالت دیکھ کر ہوتا ہے، جس میں اس کا علم فلکیات اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس طرح وہ ہوا کا رخ بدلنے کے لیے مطلوبہ احتیاط کر لیتا ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ اُس نے جو اندازہ لگایا تھا وہ غلط تھا، تو اس نے جو احتیاط کی تھی، اُس کا اسے کوئی نقصان نہیں ہو گا۔

ایک جاہل اور احمق کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو ایک چھوٹے سے سمندر میں چھوٹی کشتی کے

ذریعے سفر کر رہا ہو اور وہ ان باتوں پر کوئی توجہ نہ دیتا ہو کہ سائنسی معلومات اس کو درپیش موسمی حالت کے بارے میں کیا رہنمائی کرتی ہیں۔ بلکہ اس کی جہالت اسے ان معلومات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کرے۔ مگر جلد ہی اس کی سواری اسے ہلاک کر دیتی ہے، اس کی لکڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور کشتی اپنی سواری سمیت ڈوب جاتی ہے۔

اگر داعی کی نیت اچھی ہو اور اس کا ارادہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو تو ممکن ہے، اس کا اجر آخرت میں اس کو مل جائے، مگر دنیا کے معاملات تو اسباب اور ان کے مسببات کے مطابق انجام پاتے ہیں، نہ کہ مقصد اور نیت کے مطابق۔

احتیاط کا جواز، قرآن میں

۶۹۱- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا

(النساء ۴:۱۰۲) اور اے نبیؐ! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالت جنگ میں) انھیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے اسلحے لیے رہے، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آ کر تمھارے ساتھ نماز پڑھے اور وہ چوکنا رہے اور اپنے اسلحے لیے رہے۔ کیوں کہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضایقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکنے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

یہ آیت صراحت اور قطعیت کے ساتھ اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ احتیاط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

بلکہ اس میں مسلمانوں کو احتیاط کی کیفیت بھی بتائی جا رہی ہے، جو اس کی اہمیت کی کھلی دلیل ہے۔

اسلحے لیے رہنے کا حکم اور کچھ مسلمانوں کا نمازیوں کے پیچھے رہنے اور دشمن سے نمازیوں کی حفاظت کا حکم، اسی طرح مسلمانوں کے دو گروہوں میں تقسیم ہونے کا حکم، جن میں سے ایک گروہ نماز پڑھے اور ایک پہرہ دے اور اس میں بار بار چوکنا رہنے کا حکم، اس کے بعد یہ بتانا کہ کفار چاہتے ہیں کہ مسلمان کسی وقت احتیاط کا دامن چھوڑ بیٹھیں اور اس کے اسباب کو ترک کر دیں تو کافر اچانک حملہ کر کے مسلمانوں کی قوت کو توڑ ڈالیں، یہ ساری باتیں دلیل ہیں اس بات کی کہ احتیاط کرنا اور متوقع نقصان سے چوکنا رہنا ضروری ہے۔

اس مقام پر ہم امام قرطبیؒ کی وہ افکار نقل کرنا چاہتے ہیں جو انھوں نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہیں، تاکہ قاری کو معلوم ہو سکے کہ ہمارے اسلاف نے احتیاط کہ اہمیت کو محسوس کر لیا تھا اور اس کی دعوت دی تھی، جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل اور اس کی کتاب کے معانی کو سمجھنا ہے۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا فرمان وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ اور وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ اس بات کی وصیت [یعنی تاکیدی حکم] ہے کہ احتیاط کا دامن نہ چھوڑا جائے اور اسلحہ ساتھ رکھا جائے تاکہ دشمن کو حملہ کرنے کا موقع نہ ملے اور وہ اپنا مرام حاصل نہ کر سکے۔

پھر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا کا مطلب یہ ہے کہ کفار تمنا کرتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے اسلحے سے غافل ہو جاؤ اور وہ اپنے مقصود کو حاصل کر سکیں۔ چنانچہ ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ اسلحہ لیے رہنے کی حکمت بیان کر رہا ہے۔ پھر احتیاط کا ذکر دوسرے گروہ کے ساتھ کیا گیا ہے، اس لیے کہ احتیاط کی ضرورت اسی کو زیادہ ہے۔

یہ آیت اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اسباب کا انتظام کرنا اور ہر اس چیز کو حاصل کرنا ضروری ہے جو عقل والوں کو نجات دے، سلامتی کا ذریعہ بنے اور عزت کے مقام تک پہنچائے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَخُذُوا حِذْرَكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ بیدار رہو، خواہ تم نے اسلحہ رکھا ہو یا نہ رکھا ہو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر دم تیار اور ہر حالت میں دشمن کے مقابلے کے لیے چوکنا رہنا اور اس کے سامنے جھکنے سے انکار کرنا ضروری ہے۔ کسی بھی لشکر کو اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس وجہ

سے کہ وہ احتیاط میں کوتاہی کر لیتے ہیں۔[1]

۶۹۲- دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ خُذُوا۟ حِذْرَكُمْ فَٱنفِرُوا۟ ثُبَاتٍ أَوِ ٱنفِرُوا۟ جَمِيعًا (النساء۴:۷۱) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہو، پھر (جیسا موقع ہو) الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔

اس آیت میں مسلمانوں کو خطاب کر کے کفار کے خلاف جہاد اور شریعت کی حمایت کی خاطر اللہ کی راہ میں نکلنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ ان لوگوں کے لیے حکم ہے جنھوں نے اطاعت قبول کی ہے، کہ وہ اپنے دین کے احیا اور اپنی دعوت کی سربلندی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا ہے کہ وہ دشمن پر غفلت کی حالت میں حملہ نہ کریں بلکہ اپنے آپ کو ٹٹولیں کہ ان کے پاس کیا کچھ ہے اور وہ یہ بھی احساس کریں کہ دشمن ان کی کارروائی کا کس طرح جواب دے گا۔ یہی طریقہ ان کے لیے زیادہ استقامت والا ہے۔[2]

احتیاط کا جواز، سنت میں

۶۹۳- سنت نبوی میں بہت سے دلائل ہیں جو احتیاط کی مشروعیت اور ایک مسلمان اور خصوصاً داعی کے لیے اس کی ضرورت کو واشگاف کرتے ہیں، کیوں کہ داعی کو کفار اور منافقین کی چالوں کا زیادہ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں چند احادیث کو ہم یہاں بیان کریں گے۔

اوّلاً: ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت ہمارے پاس آئے۔ یہ ایسا وقت تھا کہ اس وقت آپؐ ہمارے پاس نہیں آتے تھے۔ وہ کہتی ہیں کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپؐ کو دیکھا تو کہنے لگے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج ایسے نہیں آئے بلکہ ضرور کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ جب آپؐ اندر داخل ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ ان کے لیے اپنے بستر سے پیچھے ہٹے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے۔ اس وقت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ میرے اور میری بہن اسماء کے

۱- تفسیر القرطبی، ج ۵، ص ۲۷۱-۲۷۳

۲- تفسیر القرطبی، ج ۵، ص ۲۷۳

علاوہ کوئی نہیں تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو باہر بھیج دو۔ انھوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں، میرے والدین آپؐ پر فدا ہوں، معاملہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہجرت کے لیے نکلنے کی اجازت دے دی ہے۔[۱]

اس واقعے کے بارے میں مزید تفصیلات جو سیرت کی کتابوں سے سامنے آئی ہیں ان میں یہ بھی آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیقؓ گھر کی پچھلی طرف ایک چھوٹے دروازے سے باہر نکلے اور ثور کی پہاڑی پر ایک غار میں پناہ گزیں ہوئے۔ وہ ابھی غار کے دھانے تک نہیں پہنچے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک پاؤں سے خون ٹپکنے لگا۔ ان کے داخل ہونے کے بعد غار کے دھانے پر ایک مکڑی نے جالا بنایا اور دو کبوتروں نے وہاں گھونسلا بنا کر اس میں انڈے دیے۔[۲]

اس روایت میں اور اس سے پہلے جو روایت گزری، ان میں اس بات کی قطعی دلیل سامنے آتی ہے کہ احتیاط ضروری ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں:

ا۔ پہلی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے گھر میں دوپہر کے وقت میں آئے۔ اس وقت راستے میں لوگوں کی آمد و رفت نہیں ہوتی، یا کم ہوتی ہے۔

ب۔ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ گھر والوں کو یہاں سے نکال دو۔ اس میں خطرہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو باتیں کریں گے وہ کفار تک نہ پہنچیں۔ لیکن جب حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کو بتایا کہ یہ ان کی بیٹیاں ہیں تو آپؐ نے ان کی موجودگی میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔

ج۔ دونوں حضرت ابوبکرؓ کے گھر میں پیچھے کی طرف سے ایک چھوٹے دروازے سے نکل گئے، اور گھر کے اصلی دروازے سے نہیں نکلے۔

د۔ دونوں نے غار میں جا کر پناہ لی اور وہاں تک پہنچنے کے لیے اتنی مشقت برداشت کی کہ آپؐ کے مبارک پاؤں سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے۔

۱۔ سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۹۷، اُمتاع الأسماع، ص ۳۹

۲۔ سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۹۸، اُمتاع الأسماع، ص ۴۰

و۔ اللہ تعالیٰ نے مکڑی کو حکم دیا کہ وہ غار کے دھانے پر جال بُننے اور کبوتروں کو حکم دیا کہ گھونسلا بنائیں، تاکہ یہ اس بات میں مددگار ثابت ہوں کہ کفار کی نظریں آپؐ کی یہاں موجودگی سے پھر جائیں۔

۶۹۴۔ثانیاً: سنت نبویؐ میں یہ بھی آیا ہے کہ قریش نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا تو ''حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: آج رات اپنے بستر پر مت سوئیے، جہاں آپ پہلے سویا کرتے تھے۔

رات کو جب اندھیرا چھا گیا تو قریش آپؐ کے دروازے کے پاس جمع ہوگئے۔ وہ اس تاک میں تھے کہ آپؐ سو جائیں تو آپؐ پر ٹوٹ پڑیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ صورت حال دیکھی تو حضرت علی بن ابی طالبؓ سے کہا: میرے بستر پر سو جاؤ اور میرا یہ سبز حضرمی کمبل اوڑھ لو۔ اس میں سو جاؤ [اور کوئی فکر نہ کرو] تجھے ان کی طرف سے کوئی ناپسندیدہ صورت حال پیش نہیں آئے گی۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے، اپنے ہاتھ میں ایک مٹھی خاک لے لی اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کی نظر چھین لی۔ چنانچہ ان کو کچھ نظر نہ آیا۔ آپؐ یہ خاک ان کے سروں پر اڑاتے گئے...[1]

۶۹۵۔ثالثاً: مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جب نماز پڑھتے تو گھاٹیوں اور وادیوں میں چلے جاتے تھے اور اپنی نماز کو اپنی قوم سے چھپا لیتے تھے۔[2]

احتیاط کی ضرورت

۶۹۶۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ شریعت میں احتیاط جائز ہے تو اب سوال یہ ہے کہ کیا داعی کو اس کی ضرورت ہے، اور کیا جب اسے اس کی ضرورت پڑ جائے تو اس پر احتیاط کرنا لازم ہو جاتا ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہاں داعی کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص افریقہ اور ایشیا کے بت پرستانہ معاشروں جیسے کسی غیر مسلم معاشرے میں رہتا ہو تو اس کے لیے احتیاط ضروری ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ان معاشروں کا جو طبقہ اشرافیہ ہوتا ہے وہ داعی الی اللہ کے خلاف طرح طرح کی چالیں چلتا ہے۔ وہ لوگ

۱۔ سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۹۵

۲۔ ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۷۵

اشاعت اسلام کی کوششوں پر قدغنیں لگانا چاہتے ہیں، بلکہ اگر ان کا بس چلے تو ان پر مکمل پابندی لگادیں۔

اس طرح کے حالات میں احتیاط کو لازم پکڑنا واجب ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر احتیاط نہیں کریں گے تو یہ بعض اوقات تباہی کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اس سے داعی الی اللہ کا اللہ کے راستے میں جہاد متأثر ہوسکتا ہے۔

اگر اس بات کا امکان موجود ہو کہ داعی احتیاط سے کام لیتے ہوئے بھی اپنی دعوت پھیلاسکتا ہے تو ایسی حالت میں اپنے آپ کو ہلاکت کے سامنے پیش کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ایسے اسباب کو اختیار کرنا واجب ہوگا جن کے ذریعے اس ہلاکت کو روکا جاسکتا ہے۔

اس طرح داعی کا زندہ رہتے ہوئے آزادی کے ساتھ مختلف شہروں میں آنا جانا اور اسلام کی اشاعت کرتے رہنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ عدم احتیاط کی بنا پر اپنے آپ کو ہلاکت کے لیے پیش کرے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے داعی کو احتیاط ضرور کرنا چاہیے۔

احتیاط اور توکل علی اللہ

۶۹۷- اچھی طرح واضح رہے کہ احتیاط، بیداری اور چوکنا رہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی اللہ پر بھروسہ نہ کرے۔ ہم جس احتیاط کی بات کررہے ہیں وہ توکل علی اللہ کی ضد نہیں ہے۔ اس لیے کہ احتیاط اسباب مہیا کرنے کا نام ہے اور اسباب فراہم کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔ البتہ یہ بات کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ آدمی اسباب ہی پر قناعت کرلے، ان کی طرف اس کا سارا میلان ہو اور دل اسباب ہی کے ساتھ اٹکا رہے۔ اس لیے کہ اسباب اور مسببات صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی اسباب فراہم کرتا ہے اور وہی ان کی توفیق دیتا ہے۔ وہی ان کی طرف رہنمائی دیتا ہے اور وہی ان کو نتیجہ خیز بناتا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ چیز کی سببیت ہی کو ختم کردے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ ہوجاتا ہے اور اللہ جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ مسلمان اسباب کو بھی اختیار کرتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کی طرف دعوت دی ہے، مگر اس کے باوجود بھی ایک مسلمان صرف اور صرف اللہ پر اعتماد کرتا ہے۔ وہ اسی کی طرف لپکتا ہے، اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسے جڑا ہوتا ہے گویا کہ اس نے کسی اور سبب کا سہارا لیا ہی نہیں۔

اس کی مثال اس طرح ہے جیسے ایک آدمی زرخیز زمین میں بیج ڈال کر ایک اللہ پر بھروسا کرے، نہ کہ ان اسباب پر جو اس نے فراہم کر دیے۔

یہی حالت تھی متوکلین کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ آپ ؐ نے ہجرت کے موقع پر، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، اسباب فراہم کیے اور اپنے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو لے کر غار میں چلے گئے۔ یہ احتیاط ہی تو تھی۔ مگر آپ ؐ کا بھروسا اللہ ہی پر تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جس وقت حضرت ابوبکر ؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بارے میں پریشانی لاحق ہوئی اور اس پر اپنے غم کا اظہار کیا تو اللہ نے آپ ؐ کی مدد کی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے بیان کیا ہے:

إِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبۃ ۹:۴۰) اگر تم نے نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں، اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

معلوم ہوا کہ آپ ؐ کی نظر اور آپ ؐ کا بھروسا اسی بات پر تھا کہ اللہ ان کے ساتھ ہے، وہی ان کی مدد بھی کرے گا، حفاظت بھی اور تائید بھی۔ ان کا اعتماد اس بات پر نہیں تھا کہ انھوں نے اسباب فراہم کیے ہیں۔

احتیاط کی قسمیں

۶۹۸- احتیاط کی مختلف قسمیں ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے کہ داعی کو کن کن چیزوں سے محتاط رہنا چاہیے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسے گناہوں سے بھی محتاط ہونا چاہیے، اپنے اہل وعیال سے بھی، خواہشات کی پیروی سے بھی اور کفار ومنافقین سے بھی۔ ان قسموں کے بارے میں مختصراً بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱- گناہوں سے احتیاط

۶۹۹- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ (آل عمران ۳:۲۸) اللہ تمھیں اپنے آپ سے

ڈراتا ہے۔

یعنی وہ تمھیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے، اس سے کہ تم گناہ کرو یا کوئی ایسا کام کرو جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے اور تم پر اس کا عذاب نازل ہو جائے، یا تم اس کی مدد اور تائید سے محروم ہو جاؤ۔ داعی اس بات سے ڈرتا ہے کہ اس پر اللہ کا عذاب نازل ہو جائے، یا اس سے اللہ کی مدد، اس کی نصرت اور اس کی تائید وحفاظت کا سلسلہ رک جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق رکھتا ہے اور ایسی چیزوں میں مبتلا ہونے سے احتیاط کرتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے نفس کے مختلف گوشوں کو ٹٹولتا رہتا ہے کہ اس میں ریا کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہو — اس لیے کہ ریا سے بچنا ایک انتہائی مشکل کام ہے — اس میں سُمعت وشہرت پیدا نہ ہو، اس میں خود پسندی کے جراثیم سرایت نہ کر جائیں، آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ تر نہ سمجھے اور وہ دعوت کا جو کام انجام دے رہا ہے اسے کسی پر احسان نہ سمجھے۔ یہ اور اس طرح کے اور بہت سے قلبی امراض ہو سکتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ سے تو کوئی مخفی چیز بھی چھپی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيٓ أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ (البقرۃ ۲:۲۳۵) خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اسی سے ڈرو۔

۲ - اہل وعیال سے احتیاط

۷۰۰ - اہل وعیال بزدلی اور بخل کا ذریعہ ہے جیسا کہ بعض آثار میں بھی آیا ہے۔ اس لیے کہ ایک مسلمان کی اہل وعیال سے محبت بعض اوقات اسے جہاد فی سبیل اللہ سے بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ اس کے لیے یہ بات محبوب بنا دیتے ہیں کہ وہ ان کے نان ونفقہ کا انتظام کرے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نان ونفقہ کا انتظام کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات جان بوجھ کر اسے جہاد سے اور دوسرے نیک اعمال سے روکتے ہیں، تاکہ ان کے لیے ان کے ذہن کے مطابق راحت اور سکون کے اسباب فراہم ہوں۔

اس دباؤ کے نتیجے میں بعض اوقات ایک داعی ان کی بات مان لیتا ہے، چنانچہ داعی کے لیے ان کا یہ فعل دشمنانہ فعل ثابت ہوتا ہے، حالانکہ دشمن تو اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اس سے احتیاط کی جائے اور اس کی

چالوں سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن ۶۴:۱۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو۔[1]

ان کی عداوت کی وجہ، جیسا کہ علامہ ابن العربی المالکیؒ کہتے ہیں، یہ ہے کہ دشمن جو دشمن ہوتا ہے تو ذاتی طور پر نہیں، بلکہ اپنے فعل کی وجہ سے۔ چنانچہ اگر اولاد اور بیوی وہی عمل کرے جو دشمن کرتا ہے تو وہ بھی دشمن بن جاتے ہیں۔ افعال میں اس سے زیادہ برا فعل کوئی نہیں کہ کسی کے عمل صالح میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ اور مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت عوف بن مالک الاشجعی کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ یہ بہت اہل وعیال والا تھا۔ وہ جب کسی جہاد کے لیے جاتا تو اس کے اہل وعیال رونا پیٹنا شروع کر دیتے اور کہتے کہ آپ ہمیں کس کے لیے چھوڑ رہے ہیں؟ اس طرح وہ اس کا دل نرم کر دیتے، چنانچہ وہ بھی نرم ہو جاتا اور ان کے پاس ٹھیر جاتا۔[2]

چنانچہ مسلمان داعی کو چاہیے کہ اپنے اہل وعیال کی جہالت سے ہوشیار رہے اور ان کی وجہ سے جہاد فی سبیل اللہ اور دعوت کے کام سے پہلو تہی نہ کرے۔ اس لیے کہ وہ، جیسا کہ ہم نے کہا، بزدلی اور بخل کا ذریعہ ہیں۔

۳- خواہشات کی پیروی سے احتیاط

۷۰۱- داعی کو اس بات سے بھی محتاط رہنا چاہیے کہ خواہشات کی پیروی میں اس کے پاؤں پھسل جائیں اور وہ یہ کہہ کر حق کو چھوڑ دے کہ دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے، یا یہ کہہ کر کہ لوگ دعوت کو قبول کریں اور اس کی خوب اشاعت ہو جائے۔

دعوت الی اللہ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس کے پیروکاروں کی تعداد مداہنت اور باطل پر راضی ہونے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو مول لینے کے ذریعے زیادہ ہو۔

۱- تفسیر القرطبی، ج ۱۸، ص ۱۴۱

۱- تفسیر القرطبی، ج ۱۸، ص ۱۴۰

اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے: وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ (المائدۃ۵:۴۹) اور تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس کی ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمھاری طرف نازل کی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ یہودی علما کے ایک گروہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاکر اسلام قبول کرنے کی پیش کش کریں گے مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان کی بات مان لیں۔ اس طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: آپ جانتے ہیں کہ اپنی قوم میں ہمارا کیا مقام ہے۔ اگر ہم اسلام قبول کریں گے تو سارے یہودی اسلام قبول کریں گے۔ ہمارا فلاں قبیلے کے ساتھ جھگڑا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کو فیصلہ کرنے کے لیے آپ کے پاس لے آئیں۔ آپ ہمارے حق میں فیصلہ کردیں تو ہم بھی اسلام قبول کریں گے اور ہم کیا، سارے یہودی مسلمان ہو جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے انکار کیا۔ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[1]

۴- کفار و منافقین سے احتیاط

۶۰۲- منافقین کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کے منافق وہ ہوتے ہیں جو خالص منافق ہوتے ہیں اور کچھ وہ ہوتے ہیں جن میں نفاق کا شائبہ ہوتا ہے اور وہ ان کے اسلام کو آلودہ کرتا ہے۔ تیسری قسم کے منافق ان دونوں کے درمیان میں ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کو منافقین کے طرف سے بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ یہ نقصان بعض اوقات اس نقصان سے زیادہ ہوتا ہے جو کافروں کی طرف سے پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ کفار کا معاملہ ظاہر ہوتا ہے اور منافق چھپ کر حملہ آور ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک مسلمان داعی پر لازم ہے کہ ان سے ہوشیار رہے، نہ ان کی کوئی بات سنے اور نہ ان پر اعتماد کرے۔ ان کے لیے جو چور دروازے ہیں ان کو بند کرنے کی کوشش کرے اور ان کی چالوں کو ناکام بنائے۔ اللہ تعالیٰ منافقین کی صفات اور ان سے محتاط رہنے کے بارے میں فرماتا ہے:

۱- القرطبی، ج۶ ص۲۱۲

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُسَنَّدَةٌ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ

(المنافقون ۶۳:۴) انھیں دیکھو تو ان کے جثّے تمھیں بڑے شان دار نظر آئیں۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ۔ مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کُندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیے گئے ہوں۔ ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ پکے دشمن ہیں، ان سے بچ کر رہو۔ اللہ کی مار ہو اِن پر، یہ کدھر اُلٹے پھرائے جا رہے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاحْذَرْهُمْ کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ ان پر اعتماد کرنے سے ہوشیار رہو اور ان کی باتوں کی طرف مائل نہ ہو۔ دوسرا یہ ہے کہ وہ آپؐ کو گمراہ کرنے کے لیے اور آپؐ کے ساتھیوں کو ذلیل کرنے کے لیے جو خیالات آپؐ کے دل میں ڈالتے ہیں ان سے محتاط رہو۔[1]

احتیاط کے ذرائع

۷۰۳- احتیاط کے ذرائع بہت سے ہیں۔ جوں جوں وہ چیزیں مختلف ہوتی ہیں جن سے احتیاط کی جاتی ہے، یا وہ احوال وظروف، جن میں احتیاط کی جاتی ہے، توں توں ان ذرائع میں بھی اختلاف آتا ہے۔ ہم بطور مثال چند ذرائع کا ذکر کریں گے۔ یہ وہ ذرائع ہیں جو مختلف روایات میں منقول ہیں۔ ضرورت کے وقت ان پر دوسری چیزوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ایک داعی ان وسائل کو بت پرستانہ معاشروں میں دعوت کا کام کرتے ہوئے اختیار کرسکتا ہے، مثلاً ایک آدمی جب افریقہ کے بت پرست کمیونٹی پر مشتمل علاقوں میں چلا جاتا ہے اور وہاں لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیتا ہے تو اس کے لیے ان وسائل کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ وہ ذرائع درج ذیل ہیں:

۱- صرف بااعتماد لوگوں کو دعوت

۷۰۴- پہلا کام یہ ہوگا کہ اپنی دعوت کا اظہار ان لوگوں کے سامنے کرے جن پر اُسے اعتماد ہو، یہ بھی

۱- القرطبی، ج ۱۸، ص ۱۲۶

۲- سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۶۸

احتیاط کا ایک طریقہ ہے اور یہ احتیاط ان معاشروں میں خاص طور پر ضروری ہے جن میں کفر اور بت پرستی عام ہو اور جہاں کا طبقہ اشرافیہ اسلام کی اشاعت سے دل گرفتہ ہوتا ہے، جیسے افریقہ کے بت پرست ممالک میں۔ اس احتیاط کی دلیل سیرت کا یہ واقعہ ہے کہ جس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام لائے تو انھوں نے اس کا اعلان تو کیا...مگر وہ اپنی قوم کے اُن لوگوں کو اللہ کی طرف اور اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے جن پر ان کو اعتماد ہوتا تھا، جو آپؐ کے پاس زیادہ آتے جاتے تھے اور آپؐ کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔[۲]

۲-خفیہ دعوت

۷۰۵- آغاز میں دعوت کو خفیہ اور راز داری کے ساتھ دینا، تاکہ کافروں کی چالیں ناکام ہوں اور داعی ان کی اذیتوں سے محفوظ رہے۔ اس پر ہمارے پاس دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [ہجرت کے موقع پر] راز داری کے ساتھ غار میں جا چھپے تھے۔

۳-قوم سے کنارہ کشی

۷۰۶- احتیاط کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ داعی اپنی قوم سے کنارہ کش ہو کر اس سے چھپ جائے۔ اس پر ہماری دلیل اصحاب کہف کا طرزِ عمل ہے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُۥٓا إِلَى الْكَهْفِ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِۦ وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا** (الکہف ۱۸:۱۶) اب جب کہ تم ان سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمھارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمھارے کام کے لیے سر و سامان مہیا کر دے گا۔

جب اس طرح کی کنارہ کشی جائز ہے [جس طرح کہ اصحابِ کہف نے اختیار کی] تو اس سے کم درجے کی کنارہ کشی، جیسے کسی سے قطع تعلق کرنا، اس سے میل ملاپ نہ رکھنا اور ضرورت کے وقت کچھ عرصے کے لیے دعوت کی اشاعت سے باز رہنا بھی جائز ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں داعی کے لیے مناسب یہ ہوتا ہے کہ اپنے نفس کے تزکیہ میں مصروف ہو اور اپنے رب کی عبادت کی طرف متوجہ ہو، دعوت کے معاملات میں غور و فکر اور سوچ بچار کرے۔ یہاں تک کہ وہ حالت ختم ہو جائے جس نے اسے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔

۴-ہجرت

۷۰۷-احتیاط کے ذرائع میں چوتھا ذریعہ کفار کی اذیتوں سے بچنے کے لیے کسی محفوظ مقام کی طرف نکل جانا ہے۔ اس کی دلیل مسلمانوں کی حبشہ کی طرف ہجرت کرنا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل کفر کے علاقے سے نکلنا ضروری ہوتا ہے، جہاں کافروں کی چالیں داعی الی اللہ پر ہاتھ ڈالنے کے لیے تاک میں ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، جو اس کی مشروعیت کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يَا مُوْسٰى إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِيْنَ. فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ (القصص ۲۸:۲۰-۲۱) ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا: موسیٰ! سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں، یہاں سے نکل جا، میں تیرا خیر خواہ ہوں۔ یہ خبر سنتے ہی موسیٰ ڈرتا اور سہمتا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دعا کی کہ اے میرے رب! مجھے ظالموں سے بچا۔

۵-اپنے اسلام کو خفیہ رکھنا

۷۰۸-احتیاط کا پانچواں ذریعہ یہ ہے کہ اگر اسلام کے اظہار میں کافروں کی طرف سے مسلمان پر تشدد کرنے کا امکان ہو تو ایک مسلمان اپنے قبول اسلام کو خفیہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيْمَانَهٗٓ أَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا أَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَّبِّكُمْ (المومن ۴۰:۲۸) آلِ فرعون میں سے ایک مومن شخص، جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، بول اُٹھا: کیا تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ وہ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس بینات لے آیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس مومن کا قصہ ہمارے سامنے بیان کیا ہے جو اپنے ایمان کو چھپاتا تھا، اور اس پر اللہ تعالیٰ نے ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ضرورت کے وقت اپنے ایمان کو خفیہ رکھنا

جائز ہے۔ پھر یہ بات کہ داعی الی اللہ کفار سے اپنی حیثیت چھپائے، زیادہ اولیٰ ہے۔ بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ وہ اپنا اصلی نام بھی نہ بتائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت بدر کے میدان میں جارہے تھے تو آپؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ مسلمانوں سے دور نکل گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بوڑھے عرب کے پاس رُک گئے اور اس سے قریش کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے جواب دینے کے بعد ان سے پوچھا: مِمَّنْ أَنْتُمَا؟ تم کون سے قبیلے سے تعلق رکھتے ہو؟ تو آپؐ نے فرمایا: نَحْنُ مِنْ مَّاءٍ. ہم پانی سے ہیں۔

ایک مسلمان کے لیے اپنے ایمان کو خفیہ رکھنے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مکہ سے باہر منیٰ کی ایک گھاٹی میں آپؐ سے ملاقات کریں گے۔ اس واقعے کے بارے میں جو روایات آئی ہیں ان میں سے ایک روایت وہ ہے، جسے بیعت عقبہ کے موقع پر حاضر اور بیعت میں شریک حضرت کعب بن مالکؓ نے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ہم اپنا معاملہ اپنی قوم کے ان لوگوں سے چھپاتے تھے جو ابھی مشرک تھے۔

پھر کہتے ہیں کہ اس رات ہم اپنی قوم کے ساتھ اپنے خیموں میں سو گئے۔ یہاں تک کہ ایک تہائی رات گزر گئی تو ہم اپنے خیموں سے نکلے۔ اس لیے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم دبے پاؤں چل رہے تھے، یہاں تک کہ ہم عقبہ کے قریب ایک وادی میں اکٹھے ہوئے۔ ہم ۷۳ افراد تھے اور ہمارے ساتھ دو خواتین تھیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ آپؐ تشریف لائے۔ آپؐ کے ساتھ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ بھی تھے۔[1]

۶- الگ الگ رہنا

۷۰۹- احتیاط کے ذرائع میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمان الگ الگ رہیں اور اپنی شان وشوکت کا اظہار نہ کریں کہ کافروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَّمَآ أُغْنِي عَنكُم مِّنَ

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۴۹

اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (یوسف۱۲: ٦۷) انھوں نے کہا: میرے بچو! مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔ مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا، حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا، اور جس کو بھی بھروسا کرنا ہو اسی پر کرے۔

۷- اپنے ارادوں کو مخفی رکھنا

۷۱۰- احتیاط کے ذرائع میں سے ایک یہ ہے کہ داعی اپنے ارادوں اور ان کی تفصیلات کو لوگوں سے چھپائے رکھے۔ سیرت نبوی میں یہ بات مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کم ہی ایسا کرتے تھے کہ کسی غزوہ کا ارادہ ہو اور اس کو مخفی نہ رکھیں۔ آپؐ ارادہ ایک مقام کا رکھتے ہوتے تھے، اور لوگوں کو کسی اور جانب کا اشارہ دیتے تھے۔ ایک غزوہ تبوک کا موقع ایسا تھا کہ اس میں آپؐ نے صاف صاف بتا دیا تھا۔ اس لیے کہ اس میں زیادہ مشقت درپیش تھی۔[1]

ا- سیرت ابن ہشام، ج۴، ص۱۲۹

۲

دوسروں کی مدد حاصل کرنا

اچھے لوگوں کی مدد حاصل کرنا

۱۱۷- داعی ہمیشہ دعوت کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے فکرمند ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ کسی بھی جائز ذریعے کا سہارا لیتا ہے تاکہ وہ اپنی منزل کو پاسکے۔ دعوت کے جائز وسائل میں ایک چیز اچھے لوگوں کی مدد حاصل کرنا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاجْعَلْ لِّي وَزِيْرًا مِّنْ أَهْلِي. هَارُوْنَ أَخِي. اشْدُدْ بِهٖٓ أَزْرِي. وَأَشْرِكْهُ فِيْٓ أَمْرِي. كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا. وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا. إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا (طٰہٰ ۲۰:۲۹-۳۵) میرے لیے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کردے۔ ہارون، جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعے سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کردے، تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگران رہا ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ذریعے ان کا ہاتھ مضبوط کرے۔ اور اس کی وجہ انھوں نے خود ہی دوسرے مقام پر بیان کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَخِي هَارُوْنُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْأً يُّصَدِّقُنِيْٓ إِنِّيْٓ أَخَافُ أَنْ يُّكَذِّبُوْنِ (القصص ۲۸:۳۴) اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج، تاکہ وہ میری تائید کرے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔

ردء کے معنی ہیں: میرا نائب، مددگار، میرے کام کو تقویت پہنچانے والا، جو میری بات کی تصدیق

کرے، میں جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں اس کی وضاحت کرے، اس لیے کہ وہ زبان میں مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔ وہ میری طرف سے ان کو وہ بات سمجھائے گا جو وہ لوگ میری زبان سے نہ سمجھیں گے۔

چنانچہ ایک مسلمان داعی دوسرے مسلمانوں کی صلاحیتوں اور ان کے تجربات سے مستفید ہونے میں کبھی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ جب کسی باصلاحیت اور بااعتماد مسلمان کو دیکھتا ہے تو انتہائی خوش ہوتا ہے۔ خصوصاً جب ملنے والا اس بات کا خواہاں ہو کہ وہ بھی اس کے ساتھ اس میدان میں کام کرے۔ اگر داعی اپنے دل میں کسی باصلاحیت مسلمان کے کام کے حوالے سے تنگی محسوس کرتا ہے تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اس کے دل میں اخلاص کے ساتھ شہرت اور دکھاوے کا شائبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کو چاہیے کہ جلد از جلد اپنے اخلاص کو دکھاوے کی شائبے سے پاک کرے اور باصلاحیت اور قابل اعتماد لوگوں کے لیے دعوت الی اللہ کے جہاد میں حصہ لینے کا میدان کھلا رکھے۔

حفاظت کی غرض سے تعاون کا حصول

۷۱۲- مسلمان داعی کے لیے جائز ہے کہ وہ ان لوگوں سے اپنی حفاظت کے لیے دوسرے مسلمانوں کی حمایت وحفاظت حاصل کرے جو اسے ایذائیں دیتے ہوں یا اسے اسلام کی تبلیغ سے روکتے ہوں۔

اس کے بارے میں ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے دنوں میں اپنے آپ کو قبائل عرب کے سامنے پیش کرتے تھے، ان کو اسلام کی دعوت بھی دیتے تھے اور ان کو یہ بھی کہتے تھے کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ نیز ان سے مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ﷺ کی تصدیق کریں اور آپ ﷺ کی حفاظت کا ذمہ لیں، تاکہ آپ ﷺ وہ تمام تعلیمات لوگوں کو بیان کر سکیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث کیا ہے۔

اس مقصد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب قبائل کی قیام گاہوں میں جا کر کھڑے ہوتے اور فرماتے:

يَابَنِي فُلَانٍ! إِنِّي رَسُوْلُ اللهِ إِلَيْكُمْ، يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَعْبُدُوا اللهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا، وَأَنْ تَخْلَعُوْا مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ مِنْ هٰذِهِ الْأَنْدَادِ، وَأَنْ تُؤْمِنُوْا بِي وَتُصَدِّقُوْا بِي وَتَمْنَعُوْنِي حَتّٰى أُبَيِّنَ عَنِ اللهِ مَابَعَثَنِيْ بِهِ. اے فلاں قبیلے والو! میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھاری طرف

بھیجا گیا ہوں، اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ اکیلے اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ تم اللہ کے سوا جن معبودوں کی عبادت کرتے ہو ان سے دست کش ہو جاؤ۔ نیز مجھ پر ایمان لاؤ، میری تصدیق کرو اور میری حفاظت کرو، تاکہ میں اللہ کے بارے میں وہ سب کچھ بیان کرسکوں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے۔[1]

اور بیعت عقبہ کبریٰ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أُبَايِعُكُمْ عَلٰى أَنْ تَمْنَعُوْنِي مِمَّا تَمْنَعُوْنَ مِنْ نِسَاءِ كُمْ وَأَبْنَاءِ كُمْ. میں تم لوگوں سے بیعت کرتا ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ تم میری اسی طرح حفاظت کروگے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔[2]

غیر مسلم سے مدد لینا

۷۱۳- بعض اوقات داعی کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ کسی مشرک کی حمایت حاصل کرے، ان لوگوں کے مقابلے میں جو اسے ایذائیں دیتے ہیں، یا اسے تبلیغ دین سے روکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کرنا جائز بھی ہے، یا نہیں؟ نیز اگر کافر خود ہی اس طرح کی پیش کش کرے تو کیا اسے قبول کرنا چاہیے یا نہیں؟ اگر اس کا جواب ہاں میں ہے تو کافر سے مدد طلب کرنے، یا اگر وہ خود پیش کش کرے تو اس کے قبول کرنے کی کیا شرائط ہیں؟ پھر یہ بھی ہے کہ کیا داعی کے لیے یہ جائز ہے یا نہیں کہ دعوت کے بعض امور میں غیر مسلموں سے تعاون کا تعاون حاصل کرے؟

۷۱۴- سطور ذیل میں ہم انھی سوالات کا جواب دینا چاہتے ہیں۔

۱- یہ بات ثابت ہے کہ ابوطالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کرتے تھے اور آپ ؐ کو کفار قریش کی ایذاؤں سے بچاتے تھے۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دل سے یہی چاہتے تھے کہ چچا کا آپ ؐ کے ساتھ یہی طرز عمل رہے؛ درو وہ اس رویے سے بیزار نہ ہوں۔ ابوطالب نے عملاً بھی اس بات کو مسترد کیا تھا کہ اپنے بھتیجے کو اکیلا چھوڑ دیں، اگرچہ قریش نے کئی بار اُن کو دھمکیاں دیں اور ان کو

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۲۸۱

۲- سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۲۳۶

۳- اِمتاع الأسماع ص ۲۷

ورغلانے کی کوشش کی۔ بلکہ ابوطالب نے تو یہاں تک کیا کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے پاس گئے اور اُن کو دعوت دی کہ وہ بھی وہی موقف اپنائیں جو ابوطالب کا تھا۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور پشت پناہی کریں گے۔[1]

پھر جب ابوطالب وفات پائے تو قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذائیں پہنچانے کا وہ موقع ہاتھ آیا جس کا وہ ابوطالب کی زندگی میں تصور نہ کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَانَالَتْ مِنِّيْ قُرَيْشٌ شَيْئاً أَكْرَهُهُ حَتّٰى مَاتَ أَبُوْطَالِبٍ. جب تک ابوطالب زندہ رہے، قریش کو مجھے اذیت پہنچانے کا کوئی ایسا موقع میسر نہیں آیا، جو مجھے پریشان کرتا۔[2]
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال کو 'عام الحزن' کا نام دیا جس سال حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات ہوئی تھی۔[3]

۲- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے تھے تو اس کا مقصد یہ تھا کہ بنو ثقیف کی طرف سے نصرت وحفاظت بھی میسر آئے اور یہ امید بھی تھی کہ وہ اللہ کا پیغام قبول کرلیں گے۔ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں یہی بات روایت کی ہے۔[1]

۳- کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف سے لوٹے اور حرا کے مقام پر پہنچے تو بنوخزاعہ کے ایک آدمی کو مطعم بن عدی کے پاس بھیجا، تاکہ وہ آپؐ کو پناہ دے اور آپؐ اپنے رب کا پیغام لوگوں کو پہنچا سکیں۔ اس نے آپؐ کو پناہ دے دی۔[2]

۴- جس وقت حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمان اس گمان سے واپس لوٹے کہ مکہ والے مسلمان ہو چکے ہیں، تو ان میں سے کوئی بھی مکہ نہیں آیا، مگر اس طرح کہ یا تو اس نے کسی کی پناہ لی یا چھپتا پھرتا رہا۔[3]

یعنی وہ کسی نہ کسی کافر کی پناہ میں ہوتے تھے تاکہ وہ انھیں قریش کے ظلم اور ان کی ایذاؤں سے بچائے۔

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۸

۲- اِمتاع الأسماع، ص ۲۸

۳- سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۸۸

۵- ابن دغنہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پناہ دینے کی پیش کش کی تو انھوں نے اسے قبول کرلیا۔ ابن دغنہ نے مکہ میں آ کر لوگوں سے کہا: اے قریش! میں نے ابن ابی قحافہ کو پناہ دے رکھی ہے، اس لیے کوئی بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔[1]

غیر مسلم سے مدد لینے کا جواز کیوں

۷۵۱- ہم نے جو روایات نقل کی ہیں وہ اس بات پر صراحت کے ساتھ دلالت کر رہی ہیں کہ غیر مسلم کی مدد حاصل اور قبول کی جا سکتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے دعوت الی اللہ کو پر سکون فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی فضا جو مشکلات اور رکاوٹوں سے خالی ہو۔ ایسی فضا جس میں داعی پر ظلم و زیادتی نہ ہو اور اسے تبلیغ سے روکا نہ جاتا ہو۔ اس لیے کہ دعوت الی اللہ کی مثال بیج اور عمارت جیسی ہے۔ بیج آندھیوں اور طوفانوں میں نہیں اُگتے اور عمارت افراتفری کی حالت میں کھڑی نہیں ہو سکتی، جب کہ اس کے معماروں کو ایذائیں پہنچائی جا رہی ہوں اور وہ اپنے سے ظلم و زیادتی کو روکنے میں مصروف ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت صلح حدیبیہ کے بعد دعوت اسلام کو پر سکون فضا میسر آئی تو جتنے لوگ اس سے پہلے اسلام میں داخل ہوئے، اس صلح کے بعد اُتنے یا اُس سے بھی زیادہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔[2]

چنانچہ غیر مسلم کی حمایت حاصل کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ داعی کو اسلام کی اشاعت اور دعوت الی اللہ کا موقع میسر آئے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہو اور اس میں راحت اور سکون حاصل کرے، یا کفار کے ساتھ مداہنت سے کام لے۔

چنانچہ دعوت الی اللہ کے لیے کسی حمایت حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ تو اسی طرح ہے کہ ایک مشرک آدمی مسلمان کے راستے سے کوئی تکلیف دہ چیز ہٹائے، اس سے ظلم کو روکے اور اس کی حفاظت کرے۔ جب یہ چیزیں ایک مشرک سے قابل قبول ہیں تو اس کی حمایت بھی اسی طرح ہے۔

غیر مسلم کی حمایت قبول کرنے کی شرائط

۷۱۶- غیر مسلم کی حمایت کو قبول کرنے یا اس سے حمایت طلب کرنے کے لیے شرط یہ ہے کہ یہ حمایت

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۹۶

۲- سیرت ابن ہشام، ج ۳، ص ۲۷۸

اس شرط کے ساتھ مشروط نہ ہو کہ اسلامی تعلیمات میں تبدیلی کی جائے یا ان میں سے کسی سے دست برداری اختیار کی جائے۔

یہی وجہ ہے کہ جس وقت ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ''مجھے اور اپنے آپ کو زندہ رہنے دو اور مجھ پر میری طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔'' تو آپؐ نے فرمایا:

وَاللّٰهِ يَا عَمِّ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِيْ وَالْقَمَرَ فِيْ يَسَارِيْ عَلٰى أَنْ أَتْرُكَ هٰذَا الْأَمْرَ مَا تَرَكْتُهُ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ أَوْ أُهْلَكَ دُوْنَهُ. خدا کی قسم، چچا جان! اگر یہ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں، کہ میں یہ کام چھوڑ دوں تو میں اس کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ اللہ اس کو غالب کر دے یا میں اس کے راستے میں جان دے دوں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آبدیدہ ہو گئے اور روتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب چل پڑے تو ابوطالب نے آپؐ کو بلاتے ہوئے کہا: بھتیجے، میری طرف دیکھو۔ پھر کہا: بھتیجے جاؤ، جو چاہو کہتے رہو، خدا کی قسم میں تجھے کسی مصیبت کے سپرد نہیں کروں گا۔[1]

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی ابن الدغنہ کی پناہ اس کو لوٹا دی تھی، جب اس نے مطالبہ کیا کہ اپنی مسجد میں نماز نہ پڑھے جو انھوں نے بنوجمح میں اپنے گھر کے ساتھ بنائی تھی۔[2]

۷۱۷- غیر مسلم کی حمایت اس وقت بھی جائز ہے جب کہ اس کا پہلا مقصد ہی کفار کی ایذاؤں اور ان کے مواخذے سے بچنا ہو۔ اس لیے کہ مسلمان اگر زندہ رہے تو مستقبل میں اس کو دعوت کا فریضہ ادا کرنے کے مواقع ملیں گے۔

اس کی دلیل سیرت ابن ہشام کی وہ روایت ہے جس میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ آپؐ کے صحابہ کو سخت آزمایشوں کا سامنا ہے اور آپؐ خود عافیت میں ہیں، اس وجہ سے کہ آپؐ کو اللہ کے ہاں بڑا مقام حاصل ہے، یا پھر اس وجہ سے کہ آپؐ کو اپنے چچا ابوطالب کی حمایت حاصل ہے، مگر آپؐ اتنی قدرت نہیں رکھتے کہ اپنے ساتھیوں کو ایذاؤں سے بچا سکیں تو آپؐ نے ان سے کہا: کاش کہ تم لوگ

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۱ ص ۲۷۸

۲- سیرت ابن ہشام، ج ۱ ص ۳۹۶

حبشہ کی طرف نکل جاؤ، وہاں ایک بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ وہ سچائی کی زمین ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمھارے لیے ان آزمایشوں سے نکلنے کا راستہ فراہم کرے گا جن سے تم دوچار ہو۔[1]

بعض امور میں غیر مسلم کی مدد حاصل کرنا

۷۱۸- داعی کے لیے جائز ہے کہ بعض امور میں غیر مسلم سے مدد حاصل کرے، اگرچہ اس کے لیے غیر مسلم کو دعوت کے میدان میں بعض ایسے امور سے آگاہ کرنا پڑے جن کا تعلق داعی کے عمل سے ہوتا ہے۔ اس کے بھی کئی دلائل ہیں۔

۱- ہجرت مدینہ کے واقعے میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ دو سواریاں ہیں، میں نے ان کو اسی موقعے کے لیے تیار کیا ہے۔ پھر انھوں نے عبداللہ بن اُرقط کو اُجرت پر ساتھ لیا۔ یہ بنی الدُئل بن بکر کے قبیلے کا ایک آدمی تھا جو مشرک تھا اور دونوں مہاجروں کو راستہ دکھاتا تھا۔ انھوں نے اس آدمی کو دونوں سواریاں دے دیں، جو اس کے پاس رہیں اور مقررہ وقت تک وہی ان کو چراتا رہا۔[2]

۲- بیعت عقبہ کبریٰ کے واقعے میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل مدینہ کے پاس آئے تو آپؐ کے ساتھ آپؐ کے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب بھی تھے۔ اس وقت وہ اپنی قوم کے مذہب پر تھے۔ مگر انھوں نے چاہا کہ اپنے بھتیجے کے ساتھ موجود ہوں اور ان کے کام میں مؤید بنیں۔[3]

۳- بنو خزاعہ کے مسلمان اور کافر سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دان تھے۔ انھوں نے ہر موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ رکھا۔ ان کے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھے۔ وہ آپؐ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔[4]

۷۱۹- یہ روایات اس بات پر صریحی دلالت کرتی ہیں کہ بعض امور میں غیر مسلم کی مدد حاصل کرنا جائز

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۴۳

۲- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۹۸

۳- سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۴۹

۴- سیرت ابن ہشام، ج ۳، ص ۴۵

ہے۔مگر اس مدد کی شرط یہ ہے کہ جس غیر مسلم سے مدد لی جاتی ہے وہ قابل اعتماد ہو اور اس بات کا اطمینان ہو کہ وہ مسلمانوں سے خیانت نہیں کرے گا، یا جن باتوں سے وہ آگاہ ہو جائے وہ کافروں کے سامنے بیان نہ کرے۔ یہ ایسے امور ہیں کہ ان کو مسلمان داعی کے اندازے اور اس کی ذہانت وفطانت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔نیز یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ اس طریق کار کو اپنانے کی کتنی ضرورت ہے۔

ایک مشرک کا مسلمانوں کے لیے مفید طرزِ عمل اور اس کا مسلمانوں کے رازوں کو راز رکھنا کبھی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کی مسلمان کے ساتھ کوئی رشتہ داری ہوتی ہے، کبھی اس کی بنیاد مسلمان کا اس کے ساتھ حسن سلوک ہوتا ہے اور کبھی مسلمان کی سیرت وکردار اس کا ذریعہ بن جاتی ہے۔جیسا کہ ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پناہ دینے سے پہلے کہا تھا کہ ''واللہ، تم تو وہ آدمی ہو جس سے خاندان کی زینت قائم ہے، تم مصیبتوں میں مددگار بنتے ہو، لوگوں سے بھلائی کا سلوک کرتے ہو اور نادار کو کما کر دیتے ہو۔لوٹ جاؤ، تم میری حفاظت میں ہو۔[1]

چنانچہ اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ داعی ایک مشرک کے اس مفید اور قابل تعریف رویے سے فائدہ اٹھائے جو مشرک آدمی کسی نہ کسی وجہ سے اس کے بارے میں اپنا تا ہے۔

۳- سیرت ابن ہشام، ج ا، ص ۳۹۶

۳

نظم وضبط

نظم وضبط کی اہمیت

۷۲۰۔نظم وضبط دعوت الی اللہ کا ایک اچھا اور بہت اہم ذریعہ ہے۔اپنی کوششوں کو بروئے کار لانے اور ان کو ایک ثمر بار بنانے کے لیے اس کو استعمال کرنا ضروری ہے۔اس کے نتیجے میں داعی کے پاس اپنے ہدف تک پہنچنے میں کامیابی کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں۔نظم وضبط نہ ہوتو سارے کام افراتفری کا شکار ہوتے ہیں اور سفر کا رُخ درست نہیں ہوتا۔

اسلام نظم وضبط کا دین ہے۔نماز ایک نظم وضبط کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔اس میں وقت کی پابندی کی جاتی ہے،مقتدی امام کی پیروی کرتا ہے۔یہی معاملہ باقی عبادات جیسے حج،روزے اور زکوٰۃ کا بھی ہے۔

داعی کے لیے نظم وضبط کی ضرورت

۷۲۱۔مسلمان داعی کو اپنے وقت کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔اس لیے کہ وقت زندگی ہے۔یہ داعی کا اصل سرمایہ ہے۔اسے چاہیے کہ اس حدیث کو اپنا شعار بنائے کہ مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ جس کے دو دن ایک جیسے ہوں وہ خسارے میں ہے۔

اس لیے داعی کے حساب میں ضروری ہے کہ اس کا آنے والا کل اس کے آج سے اور آج کا دن اس کے گذشتہ کل سے بہتر ہو۔بہتر ہونے کا یہ اندازہ مختلف طریقوں سے لگایا جاسکتا ہے۔داعی کی جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کوششیں اور لوگوں کی ہدایت و رہنمائی میں اس کی کامیابی اس کے بعض ذرائع ہیں۔اس لیے کہ ایک آدمی کو سیدھے راستے پر لانا اور اسے آگ سے بچانا داعی کے لیے سرخ اونٹوں سے زیادہ بہتر ہے۔

اوقات کو منظّم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے پورے دن کے معمولات کو مختلف اجزا میں تقسیم کرے اور ہر جزو کو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے مختص کرے۔ ایک حصہ اس کے اپنے نفس کا ہو، ایک اہل وعیال کے لیے، ایک حصہ اپنے رب کی عبادت کے لیے اور ایک حصہ دعوت الی اللہ کے کام کے لیے۔

اس بات سے دور رہنا چاہیے کہ داعی اپنے اوقات کو ایسے مشاغل میں مصروف کرے جن کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ ذمہ داریاں اوقات سے زیادہ ہوتی ہیں۔ نیز ہر لمحے موت کا خوف بھی ہوتا ہے۔ اس لیے احتیاط کی بات یہی ہے کہ داعی اپنے وقت کے ہر سیکنڈ کو غنیمت جانے اور اس میں کوئی واجب یا مستحب یا مندوب حکم بجالائے۔

جماعت اور نظم وضبط

۷۲۲- دعوت الی اللہ کبھی اجتماعی ہوتی ہے، جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران۳:۱۰۴) تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔

یہاں امت سے مراد جماعت ہے۔ چنانچہ اگر دعوت الی اللہ کا کام اجتماعی طور پر انجام دیا جائے، جیسے جاہلانہ اور بت پرستانہ معاشروں میں کچھ لوگ دعوت الی اللہ کے کام کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں تو ان کو چاہیے کہ نظم وضبط کے ان اصولوں کا خیال رکھیں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے، تاکہ ان کی محنت رائیگاں نہ جائے بلکہ اس کے اچھے ثمرات سامنے آئیں۔ اس لیے کہ تھوڑا کام اگر نظم وضبط اور پابندی کے ساتھ ہو تو وہ اس زیادہ کام سے اچھا ہے جو اَفراتفری کے ساتھ کیا جائے اور کبھی کبھی۔

اجتماعیت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ چھوٹی چھوٹی دینی تنظیمیں وجود میں آئیں اور وہ لوگوں کے دینی امور اور عبادت کے طریقے سکھائیں۔

اسلام میں نظمِ اجتماعی کے سنگ میل

۷۲۳- دعوت الی اللہ کے میدان میں عملِ اجتماعی کے لیے اسلامی شریعت میں کئی سنگ میل موجود ہیں، جن کا خیال رکھنا اور اہتمام کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے چند امور درج ذیل ہیں:

۱- ہر جماعت کے لیے ایک امیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی اسلام نے تاکید کی، اور اس کا حکم دیا۔ اس کی تائید زمینی حقائق اور عقل سلیم سے بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے: إِذَا خَرَجَ ثَلَاثَةٌ فِي سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوْا أَحَدَهُمْ. (ابوداؤد) جب تین آدمی سفر پر نکلیں تو آپس میں ایک کو امیر بنائیں۔

اور ایک حدیث میں ہے: لَا يَحِلُّ لِثَلَاثَةِ نفرٍ يَكُوْنُوْنَ بِفَلَاةٍ مِّنَ الْأَرْضِ إِلَّا أَمَّرُوْا عَلَيْهِمْ أَحَدَهُمْ. (مسند احمد) اگر تین آدمی ایک صحرا میں سفر کر رہے ہوں تو جائز نہیں ہے کہ وہ آپس میں کسی ایک کو امیر نہ بنائیں۔

امام ابن تیمیہؒ اس حدیث پر تعلیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹی اور سفر کی عارضی جماعت میں ایک کو امیر بنانا لازمی قرار دیا تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قسم کی جماعت میں اس کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب قرار دیا ہے اور اس کی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ داعی کے پاس قوت بھی ہو اور حکومت بھی۔[۱]

امارت کا مقصود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کو حاصل کرنا اور ان کے اوامر کو نافذ کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: چنانچہ حکومت کو دین داری اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ سمجھ کر حاصل کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے قرب کا بہترین ذریعہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ لیکن اس میں اکثر لوگوں کی حالت بگڑ جاتی ہے اس لیے کہ حکومت سے ان کا مقصود مال وجاہ کا حصول ہوتا ہے۔[۲]

۲- دوسری بیعت عقبہ کے حوالے سے منقول ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَخْرِجُوْا إِلَيَّ مِنْكُمْ

۱- مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۲۸، ص ۹۳۰

۲- مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۲۸، ص ۹۳۱

اِثْنَي عَشَرَ نَقِيباً لِّيَكُونُوا عَلٰى قَوْمِهِمْ بِمَا فِيهِمْ.[1] اپنے میں سے بارہ نقیب مجھے نکال دو، تا کہ وہ اپنی قوم کے معاملات کے ذمہ دار ہوں۔

۳- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب بھی جہاد یا کسی اور مقصد کے لیے مدینہ سے نکلتے تو مدینے میں کسی کو اپنا نائب مقرر کرتے۔

امارت کا مقصد

۷۲۴- کسی چھوٹی یا بڑی جماعت کے لیے امیر مقرر کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ایک جماعت کی صورت میں رہیں ان کے معاملات ایک نظم کے تحت اور ایک رائے کے مطابق طے ہوں۔ یہ مقصد تب حاصل ہوتا ہے جب کہ جماعت کے لوگ اختلاف رائے کی صورت میں کسی ایک شخص کی اطاعت کریں۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر امیر مقرر کرنے کے نہ کوئی معنی ہیں اور نہ کوئی فائدہ۔

ایک حدیث میں آیا ہے جسے حضرت عبادہ بن صامتؓ نے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

بَايَعَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِيْ عُسْرِنَا وَيُسْرِنَا وَمَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَأَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَأَلَّا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ وَأَنْ نَّقُوْلَ الْحَقَّ أَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ.[2] ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیعت کی، اس بات پر کہ ہم سمع وطاعت کریں گے، خواہ ہمارا دل چاہے یا نہ چاہے، ہمارے لیے آسان ہو یا مشکل اور خواہ اس میں ہمارا ذاتی فائدہ ہو یا نہ ہو، ہم اولوالامر کے ساتھ نزاع نہیں کریں گے، ہم جہاں بھی ہوں حق بات کہیں گے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہیں کھائیں گے۔

اطاعت معروف میں ہوتی ہے، نہ معصیت میں۔ حدیث میں آیا ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ. اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت [جائز] نہیں ہے۔

اطاعت کی ضرورت

۷۲۵- سربراہ کی اطاعت ہر کام میں ضروری ہے۔ پھر اس جماعت کے کام میں تو اس کی ضرورت

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۵۱

۲- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۶۳

بڑھ جاتی ہے جو اللہ کی طرف دعوت دیتی ہو اور اسلام کی اشاعت کا کام کر رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں اطاعت کی سمجھ اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ غزوۂ خندق کے موقع پر جب وہ مدینہ کے گرد خندق کھود رہے تھے تو اگر کسی کو قضائے حاجت کی ضرورت ہوتی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیتا تھا۔ اس کے برعکس منافقین جو مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھے، وہ چھپکے سے کھسک جاتے تھے اور اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔

ابن ہشام کے بقول منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم اور آپؐ کی اجازت کے بغیر اپنے گھروں کو کھسک جاتے تھے۔ جب کہ کسی مومن کو اگر کوئی سخت ضرورت درپیش ہوتی تھی، جس سے اس کے لیے کوئی چھٹکارا نہیں ہوتا تھا تو بھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کرتا اور اجازت لیتا تھا کہ وہ اپنے اس کام سے جا رہا ہے۔ آپؐ اس کو اجازت مرحمت فرما دیتے تھے۔ جب ضرورت پوری ہو جاتی تو وہ اپنی جگہ اور اپنے کام پر واپس لوٹ آتا تھا، تاکہ وہ بھلائی کے کام میں شریک ہو کر ثواب کما سکے۔ انھی مومنوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَإِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰى أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَأْذِنُوْهُ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَأْذِنُوْنَكَ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النور۲۴:۶۲) مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔ اے نبیؐ! جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں، پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو، اللہ یقیناً غفور رحیم ہے۔[۱]

اطاعت اور مشاورت

۷۲۶- اطاعت کو لازم قرار دینے سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ مشاورت کو چھوڑ دیا جائے۔ سربراہ

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۳، ۱۷۰

کے لیے افرادِ جماعت سے مشاورت ضروری ہے۔ علما کہتے ہیں کہ کوئی نہیں جو اپنے ساتھیوں سے اتنا مشورہ لیتا ہو، جتنے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔[1]

ہر فرد کو حق ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے اور سربراہ پر اس کا سننا لازم ہے۔ اگر کسی کی رائے درست ہو تو ضروری ہے کہ اس کو قبول کرے۔ اس کی دلیل سیرت نبویؐ کا یہ واقعہ ہے کہ ۶ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرے کے ارادے سے مکہ کی طرف نکلے۔ قریش نے ان کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کی تیاری کر رکھی تھی۔ آپؐ نے چاہا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کو ان کے پاس بھیج دے تاکہ وہ ان کو بتادے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بیت اللہ کی زیارت کرنا ہے، نہ کہ مکہ والوں کے خلاف جنگ کرنا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: یارسول اللہ! مجھے قریش سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ مکہ میں میرے خاندان بنوعدی بن کعبؓ کا کوئی آدمی نہیں ہے جو میری حفاظت کرے۔ اس کے علاوہ قریش کو میری دشمنی کے بارے میں بھی معلوم ہے اور اُن کو اپنے بارے میں میری سختی کا بھی علم ہے۔ میں آپ کو ایک ایسے شخص کے بارے میں بتاتا ہوں جو قریش کے لیے مجھ سے زیادہ معزز ہے، اور وہ ہے عثمان بن عفان۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو بلایا اور ان کو ابوسفیان اور قریش کے سرداروں کے پاس بھیج دیا، تاکہ جا کر ان کو بتائے کہ آپؐ جنگ کے لیے نہیں آئے بلکہ بیت اللہ کی زیارت اور اس کی حرمت وتعظیم کی خاطر آئے ہیں۔[2]

بعض امور جو جماعت کے لیے جائز نہیں

۷۲۷- معلوم ہونا چاہیے کہ جو امور کسی فرد کے لیے جائز ہوتے ہیں، وہ بعض اوقات جماعت کے لیے ناجائز ہوتے ہیں۔ اس کی دلیل ابوبصیر کا واقعہ ہے، جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا اور صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں سے آملے تھے، جب کہ مسلمانوں کا قریش کے ساتھ معاہدہ طے پارہا تھا۔

حضرت ابوبصیرؓ چاہتے تھے کہ مسلمان ان کو پناہ دیں اور قریش سے ان کی حفاظت کریں۔ مگر مسلمانوں

۱- السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہ، ص ۱۶۹

۲- سیرت ابن ہشام، ج ۳، ص ۲۷۱

نے اس سے انکار کیا اس لیے کہ وہ صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تھے، جس کی پابندی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ چنانچہ مشرکین حضرت ابو بصیرؓ کو پکڑ کر لے گئے۔

کچھ عرصے بعد وہ ان سے بھاگ گئے اور قریش کے راستے میں بیٹھ کر ان کے قافلوں کو لوٹنا شروع کیا۔ ان کا یہ فعل قریش پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس سے مشرکین پریشان ہو رہے تھے اور مسلمانوں کو اس کا فائدہ پہنچتا تھا۔

یہ فعل ایسا تھا کہ ابو بصیر کے لیے تو اس کی گنجایش تھی مگر مسلمانوں کی جماعت کے لیے اس کی گنجایش نہیں تھی، اگرچہ عملاً یہ فعل مسلمانوں ہی کے حق میں تھا۔ مسلمانوں کو بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ بعض افعال جن کی ایک فرد کے لیے گنجایش ہوتی ہے، جماعت کے لیے نہیں ہوتی۔ اسی لیے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا کہ ابو بصیرؓ کے کام میں اس کے ساتھ شریک ہوں، جو ان کے لیے مفید تھا۔ اس لیے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور ان پر بھی وہ بات لازم تھی جو مسلمان جماعت پر لازم تھی۔ جبکہ ابو بصیرؓ مسلمان تھے مگر ان کا مسلمان جماعت کے ساتھ تعلق نہیں تھا، بلکہ وہ ایک اکیلے فرد کی حیثیت رکھتے تھے اور اکیلے فرد کے لیے بعض اوقات کسی کام کی گنجایش ہوتی ہے مگر جماعت کے لیے اس کی گنجایش نہیں ہوتی۔

غزوہ خندق کے موقع پر جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ بن یمان کو بھیجا کہ مشرکین کے حالات معلوم کر کے بتائیں، تو حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میرے لیے ابو سفیان کو قتل کرنا کچھ مشکل نہ تھا، مگر میں نے یہ کام نہیں کیا اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں جو بھی نئی صورت حال دیکھوں آ کر بیان کروں۔[1]

ہر شخص اجتماعیت کے ساتھ نہیں چل سکتا

۷۲۸- اسلام کی اشاعت اور دعوت الی اللہ کے لیے دوسروں کے ساتھ کام کرنے کے لیے گہرے فہم اور صبر جمیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے اپنے نفس کو دوسروں کی اطاعت پر راضی کرنا پڑتا ہے، اپنے نفس کو بڑی حد تک قابو میں رکھنا پڑتا ہے، اپنی ذات کی نفی کرنی پڑتی ہے، تواضع اختیار کرنی ہوتی ہے اور اپنے

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۳، ص ۱۸۶-۱۸۷

آپ کو ان لوگوں کی طبیعت کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے جو دعوت الی اللہ کے کام میں آدمی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ نیز اگر جماعت کا فیصلہ یا سربراہ کی صوابدید تقاضا کرے، تو اپنی رائے کے مخالف رائے کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے معاملات ہیں جو اجتماعی عمل کے ساتھ لازم ہیں۔

اللہ بہتر جانتا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ... (آل عمران ۳:۱۰۴- تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں) میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ دعوت الی الخیر، جس میں سرفہرست دعوت الی اللہ ہے، ہر فرد پر بحیثیت فرد مسلم حسبِ توفیق واجب ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے کہ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبۃ ۹:۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ أَدْعُوْٓ إِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ۱۲:۱۰۸) تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ... (آل عمران ۳:۱۰۴- تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں) میں مسلمانوں کی ایک 'امت' یعنی ایک جماعت کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کا کام کرے۔ اور یہ چیز، اللہ بہتر جانتا ہے، ان امور میں داخل ہے جس کے لیے جدوجہد کو یکجا کرنا پڑتا ہے اور افراد کی صلاحیتوں کو اجتماعی عمل میں لگانا پڑتا ہے۔

اس بنا پر ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہر مسلمان اجتماعی عمل کا اہل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ہر مسلمان ایسا نہیں ہوتا جس کے اندر اجتماعی عمل کے لیے درکار صفات موجود ہوں۔ بعض افراد فی نفسہٖ بہت اچھے ہوتے ہیں مگر وہ نظم وضبط اور اطاعت کے مفہوم سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ نظم وضبط کی پابندی کو اپنی آزادی پر قدغن اور ایک طرح کا ظلم و جبر تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اطاعت کو ذلت و رسوائی سمجھتے ہیں، نہ کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے ایک حکم کی بجاآوری اور خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت۔

اس اطاعت کی مثال تو اسی طرح ہے، جیسے ایک مقتدی نماز کے دوران میں اپنے امام کی اطاعت کرتا

ہے۔ وہ امام کی پیروی کرتا ہے مگر شریعت کے حکم کو نافذ کرنے کے لیے اور اپنے لیے اجر وثواب کو محفوظ کرنے کی غرض سے۔

اس طرح کا مسلمان اگر انفرادی طور پر رہے تو بعض اوقات مفید ہوتا ہے، مگر جب بھی کسی اور کے ساتھ مل کر کوئی کام کرتا ہے تو نقصان ہی کرتا ہے۔ ایسا شخص بعض اوقات ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی برا نمونہ بن جاتا ہے جو اس کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ چنانچہ نظم وضبط کے بارے میں اس کا جو رویہ ہوتا ہے، اور وہ اطاعت کو جتنا غیر اہم سمجھتا ہے، دوسرے بھی اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اس طرح جماعت کی صفوں میں انتشار پیدا ہوتا ہے، لوگوں کی آرا آپس میں مختلف ہوتی ہیں اور ایک افراتفری کا سماں پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کے جماعت سے نکلنے کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ لوگ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ بری جماعت ہے، ان کے اختلافات خواہشات پر مبنی ہیں، یہ برائی کے داعی ہیں۔ یہ لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ دعوت الی اللہ کے لیے ایک عظیم فتنہ بن جاتا ہے اور اس کا عملی طور پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ اسلام سے متنفر ہو جاتے ہیں۔

اگر ایک بہت بڑا کارخانہ بھی ہو تو وہ اپنا کام صحیح طریقے سے انجام نہیں دے سکتا اور نہ وہ اپنے مقصد کو پورا کر سکتا ہے، جب تک کہ اس کے سارے پرزے ایک نظم وضبط کے ساتھ کام نہ کریں۔ مثال کے طور پر اس کارخانے میں ایک آلہ ایسا ہے جو تیزی کے ساتھ حرکت کر سکتا ہے، اب کوئی چاہے کہ یہ آلہ کارخانے کی رفتار کے برعکس اپنی تیز رفتاری کے ساتھ چلے، تو یہ آلہ اپنی اس تیز رفتاری کے ساتھ نقصان کرے گا فائدہ کوئی نہیں دے گا۔

یہی معاملہ ایک فرد کا جماعت میں ہوتا ہے۔ وہ بعض اوقات یہ تصور کر لیتا ہے کہ فلاں عمل اچھا اور نفع بخش ہے تو وہ اس کی طرف بڑھتا ہے، مگر جماعت کی رفتار اور اس کے تقاضوں کے برعکس۔ اس سے اضطراب پیدا ہوتا ہے، اور جہاں سے اس فرد نے نفع کا ارادہ کیا تھا وہاں سے نقصان واقع ہو جاتا ہے۔

یہ فرد بعض اوقات ایسا ہوتا ہے جس کی نیت اچھی ہوتی ہے اور وہ اس کام کے ذریعے ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر دنیوی نتائج تو جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مرتبہ کہہ چکے ہیں، ان اسباب اور مقدمات کے مطابق ہوتے ہیں جن کے بعد یہ نتائج رونما ہوتے ہیں۔

سر براہ کا فرض

۷۲۹- جماعت کے سر براہ کا فرض ہوتا ہے کہ جو لوگ اس کے ساتھ کام کر رہے ہیں ان کے ساتھ نرمی سے پیش آئے اور ان کو بھی احساس دلائے کہ وہ ان کے ساتھ نرمی کرتا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے کارکنان کے ساتھ سختی نہ کرے۔ مگر ان پر نرمی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو وہ حقوق بھی دے جو خلاف شریعت ہیں۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ امیر وہی کچھ کرے جو اس کے کارکنان چاہیں، اور جو کام اس کے کارکنوں کو ناپسند ہو اس کو چھوڑ دے۔ شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (المومنون ۲۳:۷۱)
حق اگر کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

صحابہ کرامؓ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاعْلَمُوٓا أَنَّ فِيكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ (الحجرات ۴۹:۷) خوب جان رکھو کہ تمھارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمھاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ۔

ان کے ساتھ احسان، جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں، یہ ہوگا کہ امیر وہی کام کرے جو دین و دنیا میں ان کے لیے مفید ہو، اگر چہ وہ اسے ناپسند کریں۔ البتہ جو چیز ان کو ناپسند ہو اس میں ان کے ساتھ نرمی کرے۔

۷۳۰- اسی طرح سر براہ پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کے راستے پر لوگوں کی عزیمت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور ان کو ایسی چیزوں سے بچائے جو انھیں دعوت کے کام سے بیٹھ جانے پر مجبور کرتی، انھیں متنفر کرنے، اُن کے عزائم کو پست کرنے اور ان کے بازوؤں کو کمزور کرنے کا ذریعہ بنتی ہوں۔

اس کی دلیل سنت نبوی کا وہ واقعہ ہے جس میں آیا ہے کہ بنو قریظہ نے غزوۂ خندق کے موقع پر، جب کہ مسلمان مدینے میں محصور ہو کر رہ گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے گئے اپنے معاہدے کو توڑ دیا۔ جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی تو آپؐ نے سعد بن معاذؓ، سعد بن عبادہؓ، عبداللہ بن رواحہؓ

اور خوات بن جبیرؓ کو بھیجا اور ان سے کہا کہ تم لوگ جا کر دیکھو کہ یہ اطلاع جو اس قوم کی طرف سے ہم تک پہنچی ہے، سچ ہے یا نہیں۔ اگر یہ بات سچی ہو تو چپکے سے آ کر مجھے اشارے میں سمجھا دو اور لوگوں کے بازوؤں میں مونچ نہ لاؤ۔ اور اگر یہ اطلاع غلط ہو اور وہ معاہدے پر قائم ہوں تو سارے لوگوں کے سامنے اعلان کر دو۔[1]

۷۳۱- سربراہ پر یہ بھی لازم ہے کہ جس حد تک ممکن ہو، ہر شخص کو خود کوئی کام سپرد کرے، اس لیے کہ یہ کام اس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ اس باب میں سب سے جامع بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

اِنَّ خَيۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِيُّ الۡاَمِيۡنُ. (القصص ۲۸:۲۶) بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں، وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔

اعمال کے اختلاف کے لحاظ سے 'قوت' کے مفہوم میں اختلاف آ سکتا ہے۔ چنانچہ امیر کو چاہیے کہ ہر کام کے لیے موجود لوگوں میں اہل تر آدمی کو مقرر کرے۔

اس کی دلیل نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف سے حضرت خالد بن ولیدؓ کو مختلف جنگوں میں لشکر کا امیر مقرر کرنا ہے، حالانکہ ان سے بعض اوقات ایسے اجتہادی امور بھی صادر ہوتے تھے، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیزاری کا اعلان کرنا پڑتا۔ مگر اس کے باوجود انھیں امارت پر رہنے دیتے تھے۔ مثلاً بنوجذیمہ کے بارے میں آپؓ سے جو کام صادر ہوا تھا اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَبۡرَاُ اِلَيۡکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدُ بۡنُ الۡوَلِيۡدِ. اے اللہ! خالد بن ولید نے جو کچھ کیا ہے اس سے میں بیزار ہوں۔[2]

اسی طرح اس کی ایک دلیل اذان کا مسئلہ ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا اور حضرت عبداللہ بن زیدؓ جنھوں نے اذان کا خواب دیکھا تھا، اُن سے کہا کہ بلال کی آواز تم سے زیادہ اونچی ہے۔[3]

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۳، ص ۱۷۶

۲- سیرت ابن ہشام، ج ۴، ص ۴۴

۳- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۲۹

یہ بھی جائز ہے کہ امیر کسی کام کو لوگوں کے سامنے پیش کرے اور ان سے پوچھے کہ یہ کام کون اچھے طریقے سے

کرسکتا ہے، وہ اپنے آپ کو پیش کرے۔ پھر جو لوگ اپنے آپ کو پیش کریں ان میں سے جو زیادہ مناسب ہو، امیر اسے اس کام کے لیے چن لے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ يَّأْخُذُ هٰذَا السَّيْفَ بِحَقِّهِ. کون ہے جو اس تلوار کا حق ادا کرے؟ یہ سن کر کئی لوگ تلوار کی طرف لپکے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کسی کو نہ دیا، یہاں تک کہ ابودجانہؓ آئے تو آپؐ نے وہ تلوار اُن کو دے دی۔[1]

......☆......☆......

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۳، ص ۱۰

دوسری فصل

ابلاغِ دعوت کے وسائل

تمہید

۷۳۲- لوگوں تک دعوت پہنچانا قول کے ذریعے بھی ہوتا ہے، عمل کے ذریعے بھی اور داعی کی سیرت کے ذریعے بھی، جس کی بنا پر داعی دوسروں کے لیے بہترین نمونہ بن جاتا ہے اور وہ لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچتا ہے۔ ان وسائل کے بارے میں ہم ذیل کے تین عنوانات کے تحت گفتگو کریں گے۔

۱- قول کے ساتھ ابلاغِ دعوت

۲- عمل کے ساتھ ابلاغِ دعوت

۳- اچھے کردار سے ابلاغِ دعوت

ا

زبان کے ذریعے ابلاغِ دعوت

ابلاغِ دعوت میں قول کی اہمیت

۷۴۳- دعوت الی اللہ میں قول ہی اصل بنیاد ہے۔قرآن کریم جو دعوت الی اللہ کا ایک بہترین ذریعہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہی ہے جسے حضرت جبرائیل علیہ السلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئے تا کہ اس کے ذریعے دعوت پہنچانے کا انتظام ہو سکے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ (التوبۃ ۹:۶) اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمھارے پاس آنا چاہے (تا کہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے رب کا پیغام قول کے ذریعے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو مخاطب کرتے ہوئے اور آپ کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ لوگوں سے کہیں:

قُلْ يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ (یونس ۱۰:۱۰۸) اے محمدؐ! کہہ دو کہ لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے۔

قُلْ يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف ۷:۱۵۸) اے محمدؐ! کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو حکم دیا ہے کہ اپنی قوموں تک اپنے رب کا پیغام قولِ مبین کے ساتھ پہنچا دیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ

(المومنون۲۳:۲۳) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى يَا فِرْعَوْنُ إِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف۷:۱۰۴) موسیٰ نے کہا: اے فرعون! میں کائنات کے رب کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔

چنانچہ ایک داعی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ابلاغِ دعوت میں اس بات سے غفلت کرے کہ اس ضمن میں 'قول' کا کیا مقام ہے اور پاکیزہ کلمے کا دلوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ لوگوں تک حق پہنچانے میں 'قول' اصلی ذریعہ ہے۔

گفتگو کے عمومی آداب

۷۳۴۔ گفتگو کے لیے ضروری ہے کہ وہ واضح اور سلیس ہو، اس میں کوئی ابہام نہ ہو، سامع اس کو سنتے ہی سمجھ جائے۔ اس لیے کہ کلام کا مقصد مطلوبہ معلومات کو اس شخص تک پہنچانا ہوتا ہے جس سے بات کی جاتی ہے۔ اس بنا پر بات پوری طرح واضح ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا کو اپنی اپنی قوم کی زبان کے ساتھ مبعوث فرمایا، تاکہ قوم کو جس چیز کی دعوت دی جا رہی ہے اس کو وہ جان سکے۔ اس طرح نبی کو بھی وہ بات بیان کرنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم۱۴:۴) ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کا کام ہی یہ قرار دیا ہے کہ وہ کھلے اور واضح انداز میں اس کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں، تاکہ مخاطبین پر حجت قائم ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (النور۲۴:۵۴) رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔

کلام کے واضح ہونے کا معیار صرف داعی اور اس کا فہم و دانش نہیں ہے، اس لیے کہ بعض اوقات اس

کے حق میں تو بات واضح ہوتی ہے، مگر مخاطبین کے حق میں وہی بات واضح نہیں کہلائی جاتی۔ اسی طرح یہ بھی معیار نہیں ہے کہ بات فی نفسہٖ واضح ہو، اس لیے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بات اپنی جگہ واضح ہوتی ہے، مگر مخاطبین کے حق میں وہ غیر واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ واضح ہونے کا معیار یہ قرار پاتا ہے کہ بات مخاطبین کے لیے واضح ہو۔

یہ وہی بات ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اشارہ کر رہا ہے کہ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم۱۴:۴) ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تا کہ وہ 'انھیں' اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔

چنانچہ بیان اور وضاحت 'اُن' کے حق میں ہونی چاہیے، نہ کہ داعی کے حق میں، یا فی نفسہٖ کلام کا واضح ہونا۔ حدیث میں آیا ہے، ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو 'فصل' کے ساتھ، یعنی واضح اور ظاہر ہوتی تھی۔ اس کلام کو جو بھی سنتا، اسے سمجھ جاتا تھا۔[1]

۷۳۵- یہ بھی ضروری ہے کہ گفتگو ان نئے الفاظ سے خالی ہو جن میں حق اور باطل اور صحیح و غلط دونوں کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ داعی کو چاہیے کہ انھی الفاظ کا اہتمام کرے جو قرآن و سنت میں استعمال ہوئے ہیں، یا مسلمان علما کے ہاں رائج ہیں۔ اس لیے کہ ان الفاظ کے معنی متعین اور مفہوم واضح ہوتے ہیں۔ ان میں کسی غلط معنی کی گنجایش نہیں ہوتی، جو بعض اوقات مخاطب کے ذہن میں معلق رہتے ہیں۔ اس انداز دعوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے واضح کیا:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (البقرہ۲:۱۰۴) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، راعنا نہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہا کرو۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کی زبان میں لفظ 'راعنا' کے غلط معنی بھی تھے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اس لفظ سے یہی غلط معنی میں مراد لیتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اس لفظ کا استعمال چھوڑ دیں، اور لفظ راعنا کے بجائے انظرنا کہیں، تا کہ یہود اس سے دلیل پکڑ کر راعنا کا لفظ نہ کہتے رہیں اور اس سے آپؐ کو گالی دینے اور تنقیص کرنے کا موقع نہ پاسکیں۔ اگر داعی کسی

[1] - ریاض الصالحین، ص۲۹۶

جدید لفظ کے استعمال پر مجبور ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس سے جو مفہوم لینا چاہتا ہے اس کی وضاحت کر دے، تا کہ لوگوں کے ذہنوں میں وہ مفہوم نہ آئے جو غلط ہے اور جو ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے یا لوگ اس کو سمجھتے ہیں۔[1]

داعی کے لیے گفتگو کے آداب

۷۳۶- داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سکون کے ساتھ بات کرے۔ چنانچہ اسے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ ٹھیر ٹھیر کر بات کرے تا کہ سامع اس کی بات کا احاطہ کرتے ہوئے اس کو سمجھ سکے۔ بخاری کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات کرتے تو اسے تین بار دہراتے تھے، تا کہ لوگ اسے سمجھ سکیں۔[1]

۷۳۷- داعی کو چاہیے کہ وہ گفتگو میں لفاظی، بڑے پن اور تکلف سے اجتناب کرے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

هَلَکَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ. تَنَطُّعْ کرنے والے ہلاک ہوئے۔ یہ بات آپؐ نے تین بار دہرائی۔[2]

تَنَطُّعْ سے مراد یہ ہے کہ آدمی گفتگو میں تکلف اور لفاظی سے کام لے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

إِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَيْهِقُوْنَ.
مجھے تم میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قیامت کے دن سب سے زیادہ مجھ سے دور وہ لوگ ہوں گے جو ثرثار، متشدق اور متفیہق ہوتے ہیں۔[3]

۷۳۸- داعی کو اس بات سے اجتناب کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مخاطب پر اپنی بڑائی جتائے، اس کو حقیر

۱- موجودہ دور میں غالباً لفظ جمہوریت ایک ایسا ہی لفظ ہے۔ آج کے داعیانِ حق اس کو اسلام کے نظام شورائیت کے معنی میں لیتے ہیں اور عام لوگوں کے ذہن میں اس کے وہی معنی ہیں جو مغرب میں سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی تحریکوں کے لیے اس ابہام کو دور کرنا ایک اہم چیلنج ہے جس میں انھیں اب تک کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی۔ (مترجم)]

۲- تیسیر الوصول، ج ۳، ص ۲۱۷

۳- ریاض الصالحین، ص ۲۷۴- ثرثار اس کو کہتے ہیں جو بہت باتیں کرتا ہے اور اس میں تکلف سے کام لیتا ہے۔ متشدق کے معنی یہ=

جانے، اس کو چیلنج کرے اور اس کے اوپر اپنی فضیلت کا اظہار کرے۔

اس کو چاہیے کہ خیر خواہ اور شفیق، مخلص اور متواضع کے سے انداز میں اس سے بات کرے۔ ایسی بات جو دوسرے کو یہ احساس دلائے کہ اس کے لیے کیا چیز مفید ہے اور وہ اسے سمجھ جائے۔ داعی کو چاہیے کہ وہ اس مبلغ کی طرح بات کرے جس کو اللہ کی پیغام رسانی کا منصب حاصل ہے، نہ کہ اس شخص کی طرح جس کو خود کوئی فضل و کمال حاصل ہو۔

داعی کے لیے ان امور کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اگر وہ ان کا خیال نہیں رکھے گا تو اس کی بات اور مخاطب کے دل کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہوگا اور وہ داعی کی کوئی بات سن کر اس سے متاثر نہیں ہوگا۔ بلکہ مخاطب اس سے متنفر ہوگا اور پھر وہ داعی کی کوئی بات نہیں سنے گا خواہ وہ درست ہی کیوں نہ ہو۔

۷۳۹- داعی کو چاہیے کہ اس کی بات میں لطف ہو۔ وہ اپنے کلام اور خطاب میں ایسے خیالات کا چناؤ کرے جس سے مخاطب کا شوق اس کے سننے کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس کے ذریعے مخاطب کے دل سے جہالت اور نفرت کے جذبات کا قلع قمع کر دے۔ قرآن کریم میں بہت سی آیات ہیں جو اس لطف کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْـًٔا (مریم ۱۹:۴۲)

(انھیں ذرا اس موقعے کی یاد دلاؤ) جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا تھا: ابا جان! آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خطاب میں اُبُوَّت کے رشتے کا ذکر کیا جس کی شان یہ ہے کہ یہ بچے کو باپ کی مصلحت کے لیے پریشان کر دیتا ہے اور باپ کو اس لائق بنا دیتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی بات کو غور سے سنے۔

حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

= ہیں کہ آدمی دوسروں کو بات کرنے کا موقع نہ دے اور تکلف کے ساتھ فصاحت پیدا کرنے کی غرض سے منہ بھر کر بات کرتا ہے۔ متفیہق وہ شخص ہوتا ہے جو بھاری لہجے میں بات کرتا ہے، لمبی بات کرتا ہے اور اس میں اجنبیت پیدا کرتا ہے، تکبر کے ساتھ، رفعت حاصل کرنے کی غرض سے اور دوسروں پر اپنی بڑائی جتانے کے لیے۔ (مؤلف)]

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُونَ (الاعراف ۷:۶۵) اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟

چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو یَا قَوْمِ کہہ کر مخاطب کیا، اس لیے کہ یہ خطاب اس قابل ہے کہ مخاطب اس پر لبیک کہے۔ اس سے مخاطب کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جو شخص اسے خطاب کر رہا ہے وہ نسب میں اس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس کی بھلائی چاہتا ہے۔

سنت نبوی میں بھی ایسے واقعات ملتے ہیں جو ہماری بات کی تائید کرتے ہیں۔ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنوکلب کی ایک وادی میں جو بنوعبداللہ کے نام سے جانے جاتے تھے، اُن کے گھروں کے پاس گئے، ان کو اللہ کی طرف دعوت دی اور اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کیا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے ان سے کہا:

يَا بَنِي عَبْدِاللهِ إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ أَحْسَنَ إِسْمَ أَبِيْكُمْ. اے بنوعبداللہ! اللہ تعالیٰ نے تمھارے باپ کا نام بڑا اچھا رکھا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ تمھارے باپ کا نام اچھا ہے تو تمھارا جواب بھی اچھا ہونا چاہیے اور وہ یہ کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

۷۴۰- اس بنا پر داعی کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے خطاب میں مخاطبین کے جذبات کو اپنی اطاعت پر اُبھارے، اس طرح کہ ان کو ان کی نسلی بہتری، خاندانی کرامت اور نسبی شرافت کی طرف متوجہ کیا جائے کہ ان امور کی بنا پر انھیں یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اللہ کے نافرمانوں کے ساتھ چلیں اور خواہشات ورذائل میں لت پت ہوں۔ ان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ وہ بہترین لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے فرماں برداروں کے ساتھ ہوں۔

اس طرح کا انداز اختیار کرنا — ان شاء اللہ — ممنوع نہیں ہوگا، اس میں ہمیں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ البتہ یہ ہے کہ اس میں داعی مبالغہ نہ کرے اور اس طرزِ عمل کا مقصد شوق دلانا اور اطاعت پر آمادہ کرنا ہو، نہ کہ

۱- سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۲

مداہنت اور نفاق اختیار کرنا۔ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔

۷۴۱- بات میں لطف پیدا کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ داعی مداہنت اور نفاق کا شکار ہو جائے، یا یہ کہ وہ حق کو چھپائے یا باطل کی تحسین کرے، یا اس پر رضامندی کا اظہار کرے، بلکہ اس کا مقصد صرف مخاطب کو حق کی قبولیت کے لیے آمادہ کرنا اور اس قبولیت میں اس کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ داعی مخاطب کے مرض کو چھپا دے۔ اس لیے کہ داعی کی مثال طبیب کی طرح ہے اور طبیب اپنے مریض سے اس کی بیماری کی علت اور علاج کی ضرورت چھپاتا نہیں ہے۔ یہی معاملہ داعی کا بھی ہوتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (ہود ۱۱:۵۲) اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمھاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو۔

حضرت صالح کے بارے میں اور انھوں نے اپنی قوم سے جو کچھ کہا تھا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ. وَلَا تُطِيْعُوْٓا أَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ. الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (الشعراء ۲۶:۱۵۰-۱۵۲) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔

گفتگو کی قسمیں

۷۴۲- ابلاغ دعوت کے حوالے سے گفتگو کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً خطاب، درس، لیکچر، مباحثہ، کسی اچھائی پر اُبھارنے اور برائی سے روکنے کے لیے بحث، خط و کتابت جو اِس اعتبار سے گفتگو ہی کے ضمن میں آتی ہے کہ یہ دعوت پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اس کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو گفتگو کا ہوتا ہے۔ یہ ذریعہ اُس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب داعی کے لیے گفتگو ممکن نہیں ہوتی۔

۱- خطاب

۷۴۳- یہ ابلاغ دعوت کا ایک اچھا وسیلہ ہے۔ یہ ذریعہ عام طور پر وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں کچھ لوگ جمع ہوتے ہیں جنھیں داعی نہیں جانتا یا ان میں سے بعض کو جانتا ہے۔ کامیاب خطاب کے لیے شرط یہ ہے کہ داعی کے پاس کچھ متعین معلومات ہوں جنھیں وہ لوگوں کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہے اور اُن کی توجہ ان معلومات کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہے۔

اس سلسلے میں بہتر یہ ہوتا ہے کہ خطاب کا موضوع ایسا ہو جس کا لوگوں کے حالات کے ساتھ بھی تعلق ہو اور اس کا سرا اِسلامی عقیدے کے ساتھ بھی جاملتا ہو۔ مثلاً اگر وہ ایسے لوگوں کو خطاب کر رہا ہے جن میں قومی عصبیت پائی جاتی ہے تو اُن کے سامنے بیان کرے کہ قومی عصبیت کے کیا نقصانات ہیں اور اس کے بارے میں اسلام کا حکم کیا ہے۔ ایک مومن اگر اپنے رشتہ دار کی مدد کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس کا رشتہ دار ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ حق پر ہے۔ ایک مسلمان کو اُسی چیز پر راضی ہونا چاہیے جس کی اسلام اجازت دیتا ہے۔ مسلمانوں کی اسلامی اخوت کی لڑی میں پروجانا چاہیے اور جاہلی عصبیت کا قلادہ اپنے گلے سے اتار پھینکنا چاہیے۔ داعی کو چاہیے کہ اپنے خطاب میں درج ذیل امور کا لحاظ رکھے:

۱- قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے استشہاد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، دوسرے انبیائے کرام اور صحابہ کی طرف سے ان کی عملی تطبیق کا ذکر۔ عملی تطبیق کے ذکر سے آیت اور حدیث کے معنی کھل کر سامنے آتے ہیں اور وہ ایک زندہ حقیقت بن جاتے ہیں۔

۲- کتاب وسنت میں مذکور قصص اور واقعات سے مدد لینا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ افکار و معانی کو قصص اور ضرب الامثال کی شکل میں پیش کیا جائے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَنَّ فِي بَابِ أَحَدِكُمْ نَهْراً يَغْتَسِلُ فِيهِ فِي الْيَوْمِ خَمْسَ مَرَّاتٍ أَيَبْقَى مِنْ دَرَنِهِ شَيْءٌ؟ اگر کسی کے گھر کے سامنے ایک نہر ہو اور وہ اس میں روزانہ پانچ مرتبہ نہائے تو کیا اس کے جسم پر کوئی میل رہ جائے گی؟ لوگوں نے کہا: نہیں، یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: كَذٰلِكَ الصَّلَاةُ. نماز کا بھی یہی معاملہ ہے۔

۳- خطاب مختصر ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ إِنَّ طُولَ صَلَاةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ،

فَأَطِيْلُوا الصَّلَاةَ وَاقْصُرُوا الْخُطْبَةَ[1] آدمی نماز لمبی اور خطبہ مختصر پڑھے تو یہ اس کی فقاہت کی نشانی ہے۔ پس تم لوگ نماز لمبی اور خطبہ مختصر پڑھو۔

یہ حدیث خطبہ جمعہ کے سلسلے میں آئی ہے، مگر اس پر باقی خطابات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ جہاں لمبا خطاب کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

۴- خطابات زیادہ نہ ہوں، تاکہ لوگ اُکتاہٹ کا شکار نہ ہوں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابو وائل شفیق بن سلمہ کہتے ہیں: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کو ہمیں تذکیر کیا کرتے تھے۔ ایک آدمی نے ان سے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! میں چاہتا ہوں کہ کاش آپ ہر روز ہمیں تذکیر کیا کریں۔ انھوں نے کہا: اس سے مجھے یہ بات روک رہی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ میں تم لوگوں کو اُکتاہٹ سے دوچار کردوں۔ میں [کبھی کبھار] نصیحت کے ساتھ تم لوگوں کی تربیت کرتا ہوں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [کبھی کبھار] ہماری تربیت کرتے تھے، اس خوف سے کہ ہم اُکتا نہ جائیں۔[2]

۵- داعی کی بات سادہ اور واضح ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ جو لوگ اسے سنتے ہیں وہ خطاب کو سمجھنے میں علم اور صلاحیتوں کے لحاظ سے ایک سطح پر نہیں ہوتے۔ چنانچہ جب وہ سادہ اور واضح اسلوب اپنائے گا اور مختصر جملے استعمال کرے گا تو سب کو فائدہ ہوگا اور خطاب کو سارے لوگ سمجھیں گے۔

۶- داعی کے لیے مفید ہے کہ اپنے خطبے کا آغاز اس انداز سے کرے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنے رب کی یاد تازہ ہو۔ خطیب انھیں یہی کچھ بیان کرے اور انھیں اللہ سے ڈرائے۔ خطبے کا مقصد مقابلہ بازی نہ ہو، تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں اور کہیں کہ یہ تو بہت بڑا عالم اور بہت اچھا خطیب ہے۔ اصل مقصد دعوت الی اللہ کے معانی کی اشاعت ہے۔ چنانچہ اگر ضرورت ہو کہ ایک بات جو اس نے ایک مقام پر بیان کی ہے وہ دوسری جگہ بھی بیان کردے تو اسے چاہیے کہ اس کا اعادہ کرے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کا بار بار تکرار کرتے تھے۔ آپؐ لوگوں سے کہتے تھے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمھارے جو معبود ہیں ان کو چھوڑ دو۔ اسی طرح مسلمانوں کے سامنے خطبات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تقویٰ اور آخرت کے لیے عمل کرنے کا اعادہ کیا

۱- ریاض الصالحین، ص ۲۹۷

۲- ریاض الصالحین، ص ۲۹۷

کرتے تھے۔خود قرآن کریم میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ کئی بار دہرایا گیا ہے۔اسی طرح عقیدے کے بہت سے اصول اور معانی بھی بار بار دہرائے گئے ہیں۔

۷- خطیب کے لیے مفید ہے کہ اپنے خطبے کا آغاز کسی ایسی بات سے کرے جس سے لوگوں کی توجہ اس کی طرف ہو جائے۔مثلاً خطبے کے موضوع سے تعلق رکھنے والا کوئی حادثہ،کوئی قصہ، یا کوئی خیال جو اس کے دل میں آئے۔جب لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو جائے تو خطیب اپنا خطاب شروع کرے اور اس میں آہستہ آہستہ اور شوق بھرے انداز میں نصیحت ان کے گوش گزار کردے۔

۸- داعی کو چاہیے کہ اپنی فراست سے حاضرین کے دلوں اور ان کے ذہنوں میں جھانکے اور معلوم کرے کہ ان پر کون سی بیماری غالب ہے۔نیز یہ کہ ان کو کسی چیز کی زیادہ ضرورت ہے۔چنانچہ وہ اسی کے مطابق بات کرے اور اس بیماری کا تعلق اسلامی عقیدے کے ساتھ جوڑ دے۔مثلاً اگر ان کو ضرورت ہے کہ انھیں اس بات سے ڈرایا جائے کہ وہ شریعت کی مخالفت پر کمربستہ ہیں اور اس میں جری ہوتے جارہے ہیں تو ان کے سامنے وہ آیات واحادیث بیان کرے جو اس مسئلے سے متعلق ہیں،ان کو لمبی لمبی آرزوئیں باندھنے سے روکے،اور انھیں کہے کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وقت آنے سے پہلے زادِراہ تیار کی جائے،اور زادِراہ تقویٰ ہے۔اللہ کے پاس جانے والے مسافر کے لیے یہ بہترین زادِراہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (البقرۃ۲:۱۹۷)اور زادِراہ ساتھ لے جاؤ،اور سب سے بہتر زادِراہ پرہیز گاری ہے۔

ان کے سامنے بیان کردے کہ گناہ کی لذت، جو بہت مختصر ہوتی ہے، کے بعد ندامت کی تلخی آنے والی ہے اور لمبے عرصے تک اس کی وجہ سے عذاب میں رہنا پڑے گا۔عقل مند وہ ہے جس نے کسی حرام چیز کی لذت سے اپنے آپ کو بچایا،اس مقصد کے لیے کہ حلال کی لذت سے لطف اندوز ہو سکے، جو دائمی ہے اور اس مختصر لذت سے بچ کر اس کی وجہ سے آخرت کے دائمی عذاب سے نجات پا سکے۔

اگر خطیب دیکھے کہ وہ جن لوگوں کو خطاب کررہا ہے،ان پر مایوسی اور نااُمیدی کا غلبہ ہے اور وہ رجوع الی اللہ کو مشکل سمجھ رہے ہیں تو وہ ان کو یہ تعلیم دے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت زیادہ ہے،اور جو سچے دل سے توبہ کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے

فرمایا:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (الزمر ۳۹:۵۳) (اے نبیؐ!) ان سے کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں اس شخص کا قصہ بیان کیا جاسکتا ہے جس نے سو قتل کیے تھے کہ کس طرح ایک عالم نے اسے اللہ کی طرف رجوع اور ایک ایسی بستی میں جانے کا مشورہ دیا جس کے لوگ نیک اور صالح تھے۔

۹- داعی کو چاہیے کہ ان آیات اور احادیث کو بیان کرنے سے احتیاط کرے جنھیں عموماً لوگ سمجھ نہیں پاتے، اور ان کا مفہوم سمجھنے کے لیے لمبی تشریح کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ حدیث کہ مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ خَالِصاً مِّنْ قَلْبِهِ دَخَلَ الْجَنَّةَ. جس نے دل کے خلوص کے ساتھ لا الا اللہ کہا، جنت میں داخل ہوگا۔

اگر یہ حدیث بیان کرنا ہو تو داعی کو چاہیے کہ اس کی پوری تشریح کر دے تاکہ لوگ اس کو صحیح طور پر سمجھ جائیں۔

۱۰- داعی کو چاہیے کہ جلدی جلدی گفتگو نہ کرے اور اس کی آواز بلاضرورت اونچی نہ ہو۔

۱۱- بہتر یہ ہوگا کہ خطاب زبانی ہو، نہ کہ کاغذ سے پڑھ کر سنائے۔ چنانچہ تقریر کا مفہوم اس کے ذہن میں حاضر ہو، یعنی اس نے پہلے سے تیار کر لی ہو۔

۲- درس

۷۴۴- درس عموماً قرآن کریم کی کسی آیت کی تفسیر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کی تشریح پر مشتمل ہوتا ہے، یا وہ فقہ کے کسی مسئلے کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی طرح درس میں عموماً لوگوں کی ایک مختصر تعداد موجود ہوتی ہے۔ وہ اصل میں تو درس سننے کے لیے آتے ہیں مگر یہ داعی کے لیے ایک بہترین موقع ہوتا ہے کہ وہ قریب سے ان لوگوں کے ساتھ جان پہچان پیدا کرے اور ان کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرے۔

درس میں داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ موضوع کو پہلے خود اچھی طرح ذہن نشین رکھے اور اصل

موضوع کو مختصر انداز میں پیش کرے۔ بات کو خواہ مخواہ لمبا نہ کرے، اس لیے کہ بات لمبی کرنے سے اصل موضوع سامع کے ذہن سے غائب ہو جاتا ہے اور وہ اُکتاہٹ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

تفسیر قرآن کے معاملے میں بہتر یہی ہے کہ خود قرآن کے ذریعے اس کی وضاحت کی جائے۔ اس لیے کہ قرآن نے اگر کسی بات کو ایک جگہ مجمل بیان کیا ہے تو دوسری جگہ اس کی وضاحت کر دی ہے۔ اگر کسی بات کی مزید وضاحت قرآن کریم میں نہیں ملتی تو سنت کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ اگر حدیث میں بھی کسی آیت کی وضاحت نہیں ملتی تو پھر مفسرین میں سے صحابہ وتابعین کے اقوال کی طرف رجوع کرے۔

اسی طرح اگر حدیث کی تشریح بیان کرنی ہو یا فقہ کے کسی مسئلے کی وضاحت کرنی ہو تو بہتر یہ ہوتا ہے کہ جو فقہی حکم اس کے نزدیک وزنی ہو وہ بیان کرے۔ مگر یہ اس وقت ممکن ہوگا جب کہ وہ فقہی اقوال میں تمیز کی قدرت رکھتا ہو اور ان میں سے وزنی اور غیر وزنی کو معلوم کر سکتا ہو۔ اگر وہ یہ معلوم نہیں کر سکتا تو اسے چاہیے کہ کسی ایک مذہب کے مطابق جو حکم ہو وہ بیان کر دے اور اس مسئلے میں جو اختلافی آرا ہیں ان ذکر نہ کرے۔ اس لیے کہ ان اختلافات کو ذکر کرنا سامعین کے ذہن کو منتشر کر دے گا۔

۳۔ لیکچر

۷۴۵۔ لیکچر بالعموم کسی ایک موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں موضوع کے لیے جتنے دلائل ہیں ان کو ذکر کیا جاتا ہے۔ اس موضوع کے بارے میں اب تک جتنا کچھ کہا گیا ہے اس کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان اقوال میں جو بات درست ہو اس کا تعین کیا جاتا ہے۔

کامیاب لیکچر وہ ہوتا ہے جس کا ایک خاص اور متعین ہدف ہو، جسے بیان کرنے والا اس طرح واضح طور پر بیان کر دے کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے اور سامع مکمل طور پر قانع ہو جائے۔

لیکچر دینے والے کو چاہیے کہ وہ اپنے کلام میں باریکی سے کام لے اور اٹکل سے کام نہ لے۔ نیز وہ جذباتی الفاظ وکلمات پیش نہ کرے۔ جذبات کا مقام لیکچر نہیں بلکہ خطاب ہوتا ہے۔ لیکچر دینے والے کو چاہیے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے سامعین کو اپنے ساتھ گفتگو میں شریک کرے۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمہیدی گفتگو کر کے نتیجہ موضوع کے وہ مقدمات ان کے سامنے رکھے جن تک اپنی تحقیق کے دوران میں اس

کی رسائی ہوئی ہے۔ اگر وہ ان مقدمات پر سامعین کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اُن کا نتیجے تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔

لیکچر دینے والے کو چاہیے کہ وہ جس نتیجے تک پہنچنا چاہتا ہے، اس کے لیے پہلے کچھ متعین مقدمات رکھے، اور وہ مقدمات ایسے مسائل پر مشتمل ہوں جو بالکل واضح اور مشہور ہوں۔

لیکچرار کو دقیق مسائل سے اور ایسے مشتبہ خیالات سے اجتناب کرنا چاہیے جن میں اخذ وقبول اور تردید دونوں کا امکان موجود ہو۔ اسی طرح وہ ایسے مسائل کو اپنے لیے مقدمات نہ بنائے جو بذاتِ قبول ثبوت کے مستحق ہوں۔ مثلاً ان مسائل کو اپنے موضوع کے مقدمات کے طور پر پیش نہ کرے جسے موجودہ دور میں فلسفیانہ مسائل کہتے ہیں۔

اگر لیکچرار چاہتا ہے کہ بعض دینی حقائق، یا عقیدے کے اصول، جیسے بعث بعد الموت وغیرہ، تو اس کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا کہ وہ لوگوں کی نظر اس بات کی طرف متوجہ کردے کہ ہم موت اور دوبارہ زندہ کیے جانے کا حیوانات اور نباتات میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں تو پھر انسان کے دوبارہ زندہ کیے جانے میں کیا رکاوٹ ہے۔ پھر اس حقیقت کو ان کے ذہنوں میں اور زیادہ راسخ کرنے کے لیے بعض مثالیں پیش کرے۔ یہی انداز قرآن کریم میں مذکور ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (حٰم السجدۃ ۴۱:۳۹) اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سُونی پڑی ہوئی ہے، پھر جوں ہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا، یکا یک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اِس مری ہوئی زمین کو جلا اُٹھاتا ہے وہ مُردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

معلوم ہوا کہ حیات بعد الموت تو ایک دیکھی بھالی حقیقت ہے۔ زمین مردہ ہوتی ہے، اس میں کوئی سبزہ نہیں ہوتا، نہ اس میں زندگی کے کوئی آثار نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر بارش نازل کر دیتا ہے تو وہ زمین پھول جاتی ہے اور اس میں سے زندہ نباتات پیدا ہوتے ہیں، جن کے مختلف رنگ اور مختلف ذائقے ہوتے ہیں۔

یقیناً وہ اللہ جس نے اس زمین کو موت کے بعد زندہ کیا وہی مُردوں کو بھی موت کے بعد زندہ کرے گا، کیوں کہ اسی نے ان کو نطفے کے ایک بوند پانی سے پیدا کیا تھا۔ یہ بوند جسے ہم جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ اور یہ بات معلوم ومحسوس ہے کہ دوسری مرتبہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے کی نسبت زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ. قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيٓ أَنْشَأَهَآ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (یٰس ۳۶: ۷۸-۷۹) [انسان] اب ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے: کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟ اس سے کہو: انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انھیں پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔

یہ تو ہوئی لیکچر کی عمومی حیثیت، مگر ایک مسلمان داعی کا لیکچر بالکل خشک بھی نہیں ہوتا، بلکہ اسے چاہیے کہ اپنے لیکچر میں عقلی اور وجدانی طور کچھ ایسی تحریک پیدا کرے جو اسے اسلام کے حقائق اور اسلامی عقیدے کی تعلیمات کی طرف متوجہ کر سکے۔ یہ وجدانی تحریک مسلمان کے دل میں موجود ایمانی جذبے کو اُبھارنے سے پیدا ہوتی ہے۔

۴- مباحثہ ومناظرہ

۷۴۶- مباحثہ اور مناظرہ دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہے۔ داعی جب کسی کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے تو بعض اوقات مخاطب اس کی بات کو قبول نہیں کرتا اور وہ داعی کے ساتھ مباحثہ اور مناظرہ کرتا ہے۔ قرآن کریم نے مباحثے کی بعض صورتیں ذکر کی ہیں جو انبیائے کرام اور ان کی قوموں کے درمیان پیش آئے تھے۔ انھی میں ایک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوْحًا إِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ إِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖٓ إِنَّا لَنَرَاكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ. قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلَالَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّيْ وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ

لِيُنذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الاعراف ۷: ۵۹-۶۳) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمھارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔ نوحؑ نے کہا: اے برادرانِ قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمھارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھارے رب کی یاددہانی آئی تاکہ تمھیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ، اور تم پر رحم کیا جائے۔

مدعو جب اپنے داعی کے ساتھ مباحثہ اور مناظرہ کرتا ہے تو کبھی کبھی وہ داعی پر الزام تراشی کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ صریح گمراہی میں مبتلا ہے۔ مدعو کی یہ گمراہی اسے حیرت زدہ نہیں کرسکتی اور نہ اسے اپنے وقار اور سکون سے خارج کر دیتی ہے۔ وہ پھر بھی اپنے مدعو کو پورا وزن دیتا ہے، اس کے ساتھ شفقت کرتا ہے، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے جواب سے واضح ہے۔ داعی کو چاہیے کہ ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھے اور اپنے مباحثہ اور مناظرہ کی گفتگو میں بہترین انداز اختیار کرے، پاکیزہ کلام کرے، اور پورے ادب کو ملحوظ رکھے، تواضع اور سکون سے کام لے، اپنی آواز اونچی نہ کرے اور مدمقابل کو نہ غصہ دلائے اور نہ اس کا مذاق اڑائے۔ وہ مخاطب کے ساتھ اپنی گفتگو بلند اور اعلیٰ سطح پر رکھے اور اس کے ساتھ نرمی وشفقت جاری رکھے، اپنی گفتگو کو سختی اور خشونت سے خالی رکھے، مگر اس میں مخاطب کو مطمئن کرنے کی قوت موجود ہو اور اس سے حق کھل کر نمایاں ہو جائے۔

یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے مستفاد ہیں:

اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل ۱۶: ۱۲۵) اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔

پھر اگر مخاطب اپنے باطل موقف پر اصرار کرتا ہے، ضد میں آجاتا ہے اور اس کے ساتھ مزید گفتگو کا

فائدہ نہیں ہوتا تو داعی کو چاہیے کہ اس کے ساتھ مباحثہ چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش نظر رکھے:

قُلْ يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَ كُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ (یونس۱۰:۱۰۸) اے محمدؐ! کہہ دو کہ لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف حق آ چکا ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے، اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے۔ اور میں تمھارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں۔

نیز یہ کہ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف ۱۸:۲۹) صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

ایسے لوگوں کے ساتھ مباحثہ ترک کرنا ایک درست طریق کار ہے۔ اس لیے کہ بعض لوگوں کے ساتھ مباحثے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ مباحثے کے ذریعے حق تک رسائی نہیں چاہتے بلکہ ان کا مقصد اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا، اور ضد و عناد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (الانعام۶:۷) اگر ہم تمھارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔

۵- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

۷۴۷- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عموماً زبان سے ہوتا ہے۔ غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دینا اسی قسم کی چیز ہے۔ اسی طرح ایک گناہ گار مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی دعوت دینا اور اسے شریعت کی خلاف ورزی سے روکنا بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی ہے۔

اس کے علاوہ ان تمام قسم کے اوامر و نواہی کا رخ کبھی ایک فرد کی طرف ہوتا ہے اور کبھی ایک سے زائد

افراد یا لوگوں کی ایک پوری جماعت کی طرف، یا بالعموم سارے انسانوں کی طرف۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان احکام کی پیروی کریں جنھیں اسلام لے کر آیا ہے اور ان اشیا سے باز رہیں جو اس کے برخلاف ہیں۔ اس سلسلے میں چند جامع قواعد جنھیں داعی کو سمجھنا چاہیے، درج ذیل ہیں:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قواعد

i-علم

۷۴۸- جس معروف کی طرف داعی حکم دیتا ہے اور جس منکر سے وہ روکتا ہے اس کا علم ضروری ہے۔ سلف صالحین میں سے کسی کا قول ہے کہ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہی کرے جو فقیہ ہو، اُس معروف کا جس کا وہ حکم دے رہا ہے اور اُس منکر کا جس سے وہ روکتا ہے۔'' یہ بات واضح ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے کہ جو شخص کسی مریض کا علاج کرتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ بیماری کو بھی سمجھے اور علاج بھی معلوم ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اچھا طبیب ہو۔ اسی طرح داعی کا معاملہ ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے مستفاد ہے کہ قُلْ هٰـذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ۱۲:۱۰۸) تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

ہم نے جو بات کہی ہے وہ بصیرت کے ضمن میں آتی ہے۔

ii-نرمی

۷۴۹- اس کی بنیاد بھی کتاب وسنت ہے۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى. فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ ۲۰:۴۳-۴۴)
جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے، یا ڈر جائے۔

نرم بات کہنا، جس کی طرف اس آیت کریمہ نے اشارہ کیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نازعات میں

بھی ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ. فَقُلْ هَلْ لَّكَ إِلَىٰ أَنْ تَزَكَّىٰ. وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ. (النازعات ٧٩: ١٧-١٩) فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہوگیا ہے، اور اس سے کہہ: کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اُس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو؟

یہ خطاب حق کو صراحت کے ساتھ بیان کر رہا ہے مگر اس میں نرمی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے مخاطب اپنے دل میں، جو باطل کے ساتھ گراں بار ہوتا ہے، کوئی اُبھار محسوس نہیں کرتا۔

پھر خطاب میں نرمی اس حد سے آگے بڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے واقعہ بیان کیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَآ أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ (طٰہٰ ٢٠: ٤٨) ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔

یہ فرعون کو ڈرانے کا ایک سچا اور لطیف انداز ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عذاب کی بات براہِ راست فرعون کی طرف منسوب نہیں کی، بلکہ فرمایا: عَلَىٰ مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ. یعنی عذاب اس کے لیے ہے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔

اس میں ڈراوے کا جو لطیف انداز اور جو نرمی پائی جاتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نرمی کا حکم دیا ہے، حالانکہ آپؑ معصوم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی حفاظت کی ہے، تو دوسرے داعیوں کے لیے نرمی اور شفقت کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اب کوئی بھی داعی موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہیں ہوگا اور اس کا مخاطب فرعون سے زیادہ برا نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

مَا كَانَ الرِّفْقُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ وَلَا كَانَ الْعُنْفُ فِي شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ. جس چیز میں بھی نرمی کی جاتی ہے وہ خوب ہوتی ہے اور جس چیز میں بھی شدت سے کام لیا جاتا ہے وہ خراب ہو جاتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهِ وَيُعْطِي عَلَيْهِ مَا لَا يُعْطِي

عَلَى الْعُنُفِ. اللہ تعالیٰ نرم ہے اور ہر چیز میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نرمی کے ساتھ وہ کچھ دیتا ہے جو سختی کے ساتھ نہیں دیتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دعوت الی اللہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں جو نرمی ہو وہ اس رفق میں داخل ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ داعی بعض اوقات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اس نرم طریق کار سے نکل جاتا ہے۔ مگر اس کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو اس بات کے لیے آمادہ رکھے۔ اس لیے کہ یہی وہ درست طریق کار ہے جس کی طرف سنت نبوی نے رہنمائی کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عملی کر دکھایا ہے۔

ان عملی نمونوں میں سے ایک وہ ہے جو حضرت معاویہ بن حکم سلمیؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ اس دوران لوگوں میں سے کسی نے چھینک ماری تو میں نے کہا: يَرْحَمُكَ اللهُ. یہ سن کر لوگوں نے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا: بھئی کیا ہوا؟ میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟ لوگ مزید پریشان ہوئے اور وہ اپنے رانوں پر ہاتھ مار کر مجھے خاموش کرنے لگے۔ میں خاموش ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نماز مکمل کی، میرے والدین آپؐ پر قربان ہوں، میں نے آپؐ کی طرح معلم نہ پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا ہے، واللہ! آپؐ نے مجھے ڈانٹا، نہ مارا اور نہ برا بھلا کہا۔ آپؐ نے صرف اتنا فرمایا:

إِنَّ هٰذِهِ الصَّلَاةُ لَايُصْلِحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِّنْ كَلَامِ النَّاسِ، إِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيْحُ وَالتَّكْبِيْرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ. یہ نماز ہے، اس میں انسانی باتیں درست نہیں ہیں۔ اس میں صرف تسبیح، تکبیر اور قرآن کی تلاوت ہوتی ہے۔[1]

iii-مصلحتوں پر نظر

۷۵۰- اس سے مراد یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا اس بات کی گہری سمجھ اور بصیرت رکھتا ہو کہ کون سی بات مصلحت پر مبنی ہے اور کون سی نہیں، اور وہ کس بات پر قادر ہے اور کس بات پر قادر نہیں۔ وہ جس چیز کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے، اگر اس کے بارے میں

۱- ریاض الصالحین، ص ۲۹۷-۲۹۸

مصلحت اور فساد کا آپس میں مقابلہ ہو تو وہ دیکھے، اگر صورت حال یہ ہو کہ اِس کی بات میں پائے جانے والے فوائد اُس خرابی سے زیادہ ہوں جو دعوت نہ دینے کی صورت میں درپیش ہوتی ہے تو اس پر لازم ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، لیکن اگر معاملہ اُلٹ ہو، یعنی دعوت دینے کا نقصان دعوت نہ دینے کے نقصان سے زیادہ ہو تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ صرف یہ کہ واجب نہیں ہے، بلکہ کبھی تو حرام ہوتا ہے۔[۱]

iv-معروف اور منکر کا ملاپ

۷۵۱- داعی معروف کی مختلف قسموں کے بارے میں مطلقاً دعوت دے، اور اسی طرح منکر کی تمام قسموں کے بارے میں مطلقاً نہی کرے۔ مگر جب کسی خاص فرد یا گروہ کا معاملہ درپیش ہو جس میں معروف بھی پایا جاتا ہے اور منکر بھی، تو اس کی دو صورتیں بنتی ہیں: یا تو وہ معروف اور منکر دونوں کو کرتے ہوں گے یا دونوں کو چھوڑتے ہوں گے۔ داعی کو چاہیے کہ غور کرے، اگر معروف کا فائدہ زیادہ ہے، جس کا وہ حکم دے رہا ہے تو اسے چاہیے کہ اس کا حکم دے، اگرچہ وہ فرد یا گروہ کسی منکر میں بھی مبتلا ہو، جسے بہت سے معروفات نے ڈھانپ رکھا ہو۔ اسی طرح اگر منکر کا نقصان معروف کے فائدے سے زیادہ ہے تو داعی کو چاہیے کہ اپنے مخاطب کو اس سے روکے، اگرچہ اس کی وجہ سے امر بالمعروف نہ کرنے کی بنا پر کسی بھلائی سے محروم ہونا پڑے جو برائیوں سے ڈھکی ہوئی ہو۔ اگر داعی کے سامنے معاملہ اس سے بھی زیادہ مشتبہ ہو جائے تو پھر اس کو چاہیے کہ توقف کرے، یہاں تک کہ اس کے سامنے معاملہ واضح ہو جائے۔ چنانچہ وہ جو بھی قدم اُٹھائے، علم کے ساتھ اٹھائے اور اپنی نیت خالص رکھے۔

۷-اِبلاغ بقدرِ اِمکان

۷۵۲-فریضہ تبلیغ کی ادائیگی کے لیے یہ بات شرط نہیں ہے کہ داعی کی بات دنیا کے ہر مکلّف انسان تک پہنچے۔ اس لیے کہ یہ رسالت کی تبلیغ کی شرائط میں بھی داخل نہیں ہے، تو جو چیز رسالت کے قائم مقام ہے اس میں یہ بات کیسے شرط قرار دی جاسکتی ہے۔ بلکہ شرط یہ ہے کہ مکلّف لوگ اس بات کے امکانات پیدا کریں کہ حق اُن تک پہنچ سکے۔ اگر وہ اس میں کوتاہی کرتے ہیں اور وہ اس بات کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے کہ حق اُن تک پہنچ سکے، باوجودیکہ کچھ لوگ اس کام کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنا فریضہ ادا

کر رہے ہیں۔ اس صورت میں کوتاہی لوگوں کی ہوگی، نہ کہ داعی کی۔[1]

۶- خط و کتابت اور تحریر

۷۵۴- خط و کتابت اور تحریر، جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، دعوت الی اللہ کے معاملے میں قول اور گفتگو کی ایک قسم شمار ہوتی ہے۔ اس میں یا تو ان لوگوں کو خطوط لکھنا ہوتا ہے جن کو داعی اِسلام کی طرف دعوت دینا چاہتا ہے اور اسلام مخالف امور کو اس سے چھڑانا چاہتا ہے، یا پھر لکھنے اور تحریر کا ہدف کتابیں تالیف کرنا اور مختلف مجلّات کے لیے علمی و تحقیقی مقالات و مضامین لکھنا ہوتا ہے۔ یہ دونوں دعوت الی اللہ کے بہت اچھے ذریعے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے تھے کہ غیر مسلم ممالک کے حکمرانوں کے نام خطوط لکھیں۔ ان میں آپؐ لوگوں کو اللہ کی طرف اور اسلام کو قبول کرنے کی طرف دعوت دیتے تھے۔ جیسے آپؐ نے عراق [اور ایران] کے بادشاہ کسریٰ، شام کے ہرقل اور مصر کے مقوقس کے نام خطوط ارسال کیے۔

علمائے اسلام کا بھی یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ مسلمان حکمرانوں کو خطوط لکھتے تھے۔ ان میں وہ حکمرانوں کو ان اُمور کی دعوت دیتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم کیے ہیں۔ اس کی ایک مثال امام اوزاعی کا وہ خط ہے جو انھوں نے شام میں عباسی حکمران کو ذمیوں کے بارے میں لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی کہ ذمیوں کے جائز حقوق کا خیال رکھا جائے۔

اس کے علاوہ اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتابیں لکھنا، تحقیقی مضامین اور مقالات تحریر کرنا دعوت الی اللہ کا ایک مفید ذریعہ ہے۔ خصوصاً جب انھیں ایسی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے جن کو اسلام سے متعارف کرانا اور ان کو اسلام کی طرف دعوت دینا پیش نظر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طریقے سے لاکھوں ایسے لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچانا ممکن ہو جاتا ہے جو عربی زبان نہ جانتے ہوں اور جن تک اسلامی تعلیمات نہ پہنچی ہوں۔

کتابوں اور مقالات کے لکھنے میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ان کا خطاب عمومی ہو اور انھیں زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکیں، اگرچہ علم و فہم کے لحاظ سے ان کی سطحیں مختلف ہوں۔

۱- مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۲۸، ص ۱۲۵-۱۲۶؛

چنانچہ داعی کو چاہیے کہ کتابیں اور مقالات سادہ انداز میں لکھے۔ ان کا مفہوم واضح ہو، یہاں تک کہ اسے وہ لوگ بھی سمجھ سکیں جن میں بات کو سمجھنے کی صلاحیت کمزور ہو۔

داعی اپنی کتاب یا مقالے میں جو خیالات پیش کرتا ہے وہ ایسے ہوں کہ اگر کوئی انسان اسلام کو قبول کرنا چاہتا ہے، تو وہ ان تعلیمات سے منہ نہ موڑ سکے۔ داعی کی کتابیں دقیق اختلافی مسائل سے پاک ہونی چاہییں، ان میں اختصار پیش نظر رہے اور اس میں معانی کے لحاظ سے یا فہم کے تقاضوں کے لحاظ سے کوئی خرابی نہ ہو۔

۲

عمل کے ساتھ ابلاغِ دعوت

عمل سے مراد

۷۵۴- یہاں پر ابلاغِ دعوت کے معاملے میں عمل سے ہماری مراد عملی طور پر منکر کا ازالہ کرنا ہے، اور عموماً ہوتا بھی یہی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ عمل میں منکر کا ازالہ نہ ہو، بلکہ کسی منکر کا قیام اور نفاذ ہی مقصود ہو۔ جیسے مسجد و مدرسہ وغیرہ کی تعمیر جس میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کی اقامت کے لیے کام کیا جاتا ہے یا اس کے لیے تیاری کی جاتی ہے۔ یہ اسلام کی طرف ایک خاموش دعوت ہوگی اور یہ دعوت الی اللہ کی اشاعت کا ایک فعال اور مؤثر ذریعہ ہوگا۔

منکر کو ختم کرنے کی بنیاد

۷۵۵-منکر کا ازالہ کرنے کی اصل بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ. تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے، اور اگر اس کی طاقت بھی نہ ہو تو دل سے بدل ڈالے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

منکر کا عملاً ازالہ ایک ایسی چیز کا ازالہ ہے جو بھلائی یا حق کے راستے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر زمین میں کوئی منکر موجود ہو تو وہ اپنے برابر یا اس سے بھی زیادہ حق کے لیے رکاوٹ بنتا ہے۔ چنانچہ اس کو زائل کرنا یا اس کا زائل ہونا بھلائی اور حق کو لوگوں کے لیے آسان بنانے کی خاطر ہوگا۔ چنانچہ یہ بھی امر بالمعروف کی تکمیل بلکہ اسی کا ایک پہلو ہے۔

منکر کا ازالہ کرنے کے عمومی قواعد

۷۵۶- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں ہم نے عمومی قواعد کا ذکر کیا ہے۔ وہی قواعد یہاں بھی جاری ہوتے ہیں۔ منکر کا ازالہ کرنے کے لیے اس چیز کا علم اور اس کا فہم ضروری ہے جس کا داعی ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح منکر کا ازالہ کرنے میں بھی نرمی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اصل مقصود یہ ہے کہ منکر کا ازالہ ہو جائے، کسی کو سزا دینا یا کسی سے انتقام لینا مقصود نہیں ہے۔

بخاری میں ایک روایت ہے کہ ایک دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کیا۔ لوگ اس کی پٹائی کرنے کے لیے اُٹھے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دَعُوْهُ وَأَرِيْقُوْا عَلٰى بَوْلِهِ سِجْلًا مِّنْ مَّاءٍ أَوْ ذَنُوْباً مِّنْ مَّاءٍ، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ. اسے پیشاب کرنے دو، اور [بعد میں] اس پر ایک ڈول پانی ڈال دو۔ تم آسانی پیدا کرنے والے ہو، نہ کہ سختی اور تنگی لانے والے۔

داعی پر لازم ہوگا کہ منکر کا ازالہ کرنے کے لیے اقدام کرنے سے پہلے وہ فوائد اور نقصانات کا جائزہ لے اور ان کے درمیان مقابلے کی صورت بھی ملاحظہ کرے۔ اس طرح داعی کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا ازالہ کرنے سے کیا اچھے یا برے نتائج برآمد ہوں گے۔ اسی طرح وہ کسی شخص میں معروف اور منکر کے ملاپ کی وہ صورت بھی دیکھے جو چوتھے قاعدے میں بیان ہو چکی ہے۔ وہ شخص یا تو معروف اور منکر دونوں کام کرتا ہوگا یا دونوں کو ترک کرتا ہوگا، [حالانکہ معروف کو کرنا چاہیے اور منکر سے بچنا ضروری ہوتا ہے۔] چنانچہ داعی دیکھے کہ اس متعین شخص کے بارے میں منکر کے ازالے سے کیا فائدہ یا نقصا ہوگا۔ یہاں ہم ان عمومی قواعد کے علاوہ منکر کا ازالہ کرنے کے بارے چند مزید قواعد کا اضافہ کرتے ہیں:

۱- ازالۂ منکر کی قدرت

۷۵۷- پہلی بات یہ ہے کہ منکر کا ازالہ کرنے والے میں اتنی قدرت ہو جو منکر کا ازالہ کر سکے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قدرت کے لحاظ سے داعیوں کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ اس کی سب زیادہ قدرت حکمران کو ہوتی ہے، یعنی وہ شخص جس کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے اور جو امر و نہی کے اختیارات کا مالک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اپنے گھر میں منکر کا ازالہ کرنے کے سلسلے میں وہ دوسروں کی نسبت زیادہ جواب دہ ہے۔ اس لیے کہ وہ شرعی طور پر اس کام پر مامور ہے کہ وہ یہ ازالہ کرے گا، اور اس کو اپنے گھر میں ولایت حاصل ہے۔ اس لیے وہ اس ازالے پر قادر بھی ہے۔ یہی وجہ کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے۔

البتہ اگر منکر کی بعض جزئیات میں کوئی چیز شرعی طور پر اس ازالے کے بالمقابل آ جائے، اس لحاظ سے کہ اگر داعی اس جزوی خرابی کو دور کرتا ہے تو اس سے دوسری طرف ایسا نقصان ہوگا جو حاصل کیے جانے والے فائدے سے بہت زیادہ ہوگا، تو جیسا کہ سابقہ قواعد میں کہا گیا ہے اس منکر کا ازالہ درست نہیں ہوگا۔

۷۵۸- اگر داعی میں منکر کا ازالہ کرنے کی قدرت نہیں ہے، یا ازالہ تو وہ کر سکتا ہے مگر اس سے زیادہ بڑا منکر لازم آتا ہے، یا اس سے کوئی عظیم نقصان واقع ہونے کا خدشہ ہے۔ چنانچہ دعوت الی اللہ میں اس کا عملی اقدام معطل ہوگا اور داعی زبان کے ساتھ ازالے کی طرف منتقل ہوگا۔ لیکن اگر وہ اس کی طاقت بھی نہیں رکھتا تو جیسا کہ مذکورہ حدیث میں آیا ہے، داعی اس سے بھی نیچے آ کر دل سے بدل ڈالنے کی طرف رجوع کرے گا۔

۷۵۹- اس قاعدے کے عملی نمونوں میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کو کچھ نہیں کہا تھا، اس لیے کہ مدینہ میں اُس کے بہت سے حمایتی موجود تھے۔ کیوں کہ اسے سزا دے کر اس کے منکر کا ازالہ کرنے سے ایک بڑے معروف سے بھی ہاتھ دھونا تھا۔ اور وہ یہ کہ اس کی قوم کے لوگ [جن میں سے بعض سچے مسلمان تھے، خصوصاً اس کا بیٹا حضرت عبداللہؓ بن عبداللہ بن اُبی] ناراض ہو جاتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ لوگ سنیں گے تو وہ اصل حقیقت سے بے خبر ہو کر یہی خیال کریں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔[۱]

۲- منکر سے نفرت اور اس کا ازالہ بقدرِ وسعت

۷۶۰- یہ بات بھی اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ منکر سے نفرت کامل اور مکمل ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ مسلمان کے بارے میں اصل تصور یہی ہے کہ اس کی محبت اللہ کی محبت کے موافق ہونی چاہیے اور اس کا بغض اس چیز کے ساتھ ہونا چاہیے کہ جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو۔

۱- فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ج ۲۸، ص ۱۳۱

اس موافقت میں کسی بھی قسم کی کمی، خواہ ایک جانب سے ہو یا دونوں طرف سے، قطعی طور پر ایمان کا ناقص ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ دل میں منکر کو ناپسند کرنا ایک ایسا امر ہے کہ اس میں کسی قسم کا ضرر نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کوئی یہ بھی نہیں کرتا کہ وہ منکر کے ساتھ دل میں نفرت کرے تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس کے ایمان میں ضعف ہے۔ بلکہ اس کا دل مردہ ہے اور اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔ اس لیے کہ جس حدیث میں منکر کو ہاتھ اور زبان سے روکنے جیسے ایمان کے مختلف مراتب کا ذکر ہے، اس کے آخر میں ہے کہ لَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ. اس کے بعد ذرہ برابر ایمان بھی نہیں ہے۔

ہاتھ سے منکر کا ازالہ یعنی عملی طور پر اس کے خلاف اقدام کرنا انسان کی قوت اور قدرت پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت زیادہ مکلّف نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن۶۴: ۱۶) جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔

جب دل میں منکر کے ساتھ نفرت کامل ہو اور اس کو بدل ڈالنے کا ارادہ پختہ ہو اور مسلمان اس کے خلاف اپنی وسعت کے مطابق کوشش کرے، یا عاجز ہونے کی وجہ سے اس کے خلاف کوئی کام نہ کر سکے تو اس کا ثواب ضرور اسے ملے گا۔

۳- ازالۂ منکر کے لیے مباح اُمور کا سہارا لینا

۷۶۱- اس کی اصل بنیاد یہ ہے کہ لوگوں کی تالیف قلب کرنا مشروع قرار دیا گیا ہے، تاکہ لوگ خیر کی طرف آگے بڑھیں اور برائی سے ہاتھ کھینچ لیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے لوگوں کو مالی عطیات بھی دیے جاسکتے ہیں۔ امام وفقیہ [اور پانچویں خلیفہ راشد] حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا: خدا کی قسم، میں لوگوں کے لیے دین کا کوئی حکم نہیں دے سکتا، جب تک کہ اس کے ساتھ کچھ دنیوی پہلو بھی ان کے سامنے پیش نہ کروں۔ اس کے ذریعے میں لوگوں کے دلوں میں نرمی پیدا کرتا ہوں، کیوں کہ مجھے خوف ہے کہ ان کی طرف سے مجھ پر ایسی چیز پھٹ پڑے گی جس کی طاقت مجھ میں نہیں ہوگی۔[1]

اس وجہ سے داعی کے لیے جائز ہے کہ جو شخص کسی برائی میں مبتلا ہے اس کو کوئی جائز دنیوی عوض بھی فراہم کرے۔ یہ اس کے لیے برائی کو چھوڑنے یا اسے بدل ڈالنے کا بدلہ ہوگا۔

مثلاً کسی کا کوئی بیٹا یا کوئی دوست جوا کھیلتا ہے تو وہ جوئے سے روکنے کے لیے اُسے کوئی انعام دے دیتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کسی مباح کام مثلاً گھڑ سواری یا نشانہ بازی کا مقابلہ جیتنے، یا کسی ایسی چیز کے یاد کرنے پر کسی کو انعام دیا جائے، جس کا یاد کرنا مستحب ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص فحش کتب اور رسائل پڑھنے کے منکر میں مبتلا ہے تو اسے پاکیزہ کتابیں دی جائیں، یا کوئی شخص رشوت کا عادی ہے، یا دوسرے کا مال لے کر کھانے میں تساہل سے کام لیتا ہے تو اس کی اُجرت میں اضافہ کیا جائے۔ اور اس طرح کے دوسرے امور۔

۳

اچھے کردار سے ابلاغِ دعوت

اچھے کردار کی اہمیت

۷۶۲- دعوت الی اللہ اور لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے ذرائع میں سے بہترین ذریعہ داعی کا پاکیزہ کردار، اس کے قابل تعریف افعال، اعلیٰ صفات اور بلند اخلاق ہے۔ یہ چیزیں داعی کو دوسروں کے لیے بہترین نمونہ اور خوب صورت اسوہ بنا دیتی ہیں۔ ان کی بنا پر داعی کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند ہوتی ہے جس میں لوگ اسلامی تعلیمات کو پڑھ سکتے ہیں، اس طرح وہ ان تعلیمات کی طرف بڑھتے ہیں اور ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس لیے کہ افعال اور کردار کا اثر صرف باتوں کے اثر سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

۷۶۳- دنیا کے اکثر ممالک میں اسلام کی اشاعت مسلمانوں کی پاکیزہ سیرت و کردار سے ہوئی، وہ کردار جو غیر مسلموں کی نگاہیں اپنی طرف کھینچتا اور انھیں اس بات پر آمادہ کرتا تھا کہ وہ اسلام کو گلے لگا لیں۔ داعی اپنی پاکیزہ سیرت کے ذریعے جو اسوۂ حسنہ پیش کرتا ہے وہ دراصل اسلام کی عملی دعوت ہوتا ہے، جس سے غیر مسلم اسلام کی حقانیت پر استدلال کرتے ہیں اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین ہے۔ یہ تأثر خاص طور پر ان غیر مسلموں کا ہوتا ہے جو سلیم الفطرت اور سلیم العقل ہوتے ہیں۔

۷۶۴- داعی کے اچھے کردار کی اہمیت اور وہ جس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے اس پر لوگوں کے ایمان لانے میں داعی کے کردار کے اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا میں پیش آمدہ واقعے کی اطلاع دی تو انھوں نے کہا: آپ کو مبارک ہو، اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، آپ گراں بار کے سوار ہونے میں تعاون کرتے ہیں اور حوادث زمانہ کے مقابلے میں مدد دیتے ہیں....

انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرح کے کئی اچھے اخلاق کا ذکر کیا، جن کی بنا پر وہ آپ کی تصدیق اور حق میں آپ کی اعانت پر کمر بستہ ہو گئیں۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ ایک دیہاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: تم کون ہو؟ آپؐ نے فرمایا: میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ آدمی نے کہا: کیا تم وہی ہو جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں میں وہی ہوں جس کے بارے میں لوگوں کا یہ گمان ہے۔ دیہاتی نے کہا: یہ چہرہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں۔ پھر اس نے کہا: تم کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے چند اسلامی تعلیمات بیان کیں، جس کی طرف آپؐ دعوت دیتے تھے۔ دیہاتی نے کہا: میں تجھ پر ایمان لایا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کا رسول ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیہاتی نے آپ کے چہرۂ انور کے اُن نشانات سے، جو سچے اور با اخلاق لوگوں میں پائے جاتے ہیں، اس بات پر استدلال کیا کہ آپؐ اپنی دعوت میں سچے ہیں۔

اچھے کردار کے اصول

۷۶۵- اچھا کردار، جس کے ذریعے داعی دوسروں کے لیے اچھا نمونہ ثابت ہوتا ہے، اس کے دو بڑے اصول ہیں: ایک اچھے اخلاق اور دوسرا قول و فعل کی موافقت۔ اگر یہ دونوں اصول موجود ہوں تو داعی کی سیرت و کردار اچھی ہوگی اور اس کا کردار اسلام کی طرف خاموش دعوت ہوگا۔ لیکن اگر داعی میں یہ دونوں امور موجود نہ ہوں تو اس کی سیرت بری ہوگی اور یہ اس بات کی خاموش دعوت ہوگی کہ لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں۔ اس لیے داعی کو اس اہم ترین معاملے میں اللہ کا خوف کرنا چاہیے اور اسے اپنی سیرت کی وجہ سے دوسروں کو دین سے متنفر نہیں کرنا چاہیے، حالانکہ داعی چاہتا یہ ہے کہ لوگوں کو دین کی طرف بلایا جائے۔

۱- اچھے اخلاق

۷۶۶- اچھے کردار کا پہلا اصول اچھے اخلاق ہے۔ پہلے ایک فصل میں ہم نے اسلام کے نظامِ اخلاق کے بارے میں بحث کی ہے۔ نیز ایک جگہ ہم نے داعی کے اخلاق بھی بیان کیے ہیں۔ اس لیے یہاں ہم ان سارے مباحث کا اعادہ نہیں کریں گے۔ یہاں صرف صبر اور عفو و درگزر کی صفات کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱- إمتاع الأسماع، ص ۱۳-۱۴

داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اذیتوں کے مقابلے میں بردبار اور صابر ہو۔ اس لیے کہ داعی کو اذیتوں اور مشکلات کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ اگر داعی حلم اور صبر سے کام نہیں لے گا تو امام ابن تیمیہؒ کے بقول: ''یہ اصلاح سے زیادہ فساد کرے گا۔'' یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (الاعراف ۷:۱۹۹) نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے منہ موڑ لو۔

لقمانِ حکیم نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی تھی اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ أَصَابَكَ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ (لقمان ۳۱:۱۷) نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں کے امام ہیں، صبر کا حکم دیتا ہے۔ فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف ۴۶:۳۵) صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے۔

بلکہ یہاں تو صبر کو رسالت کے ابلاغ کے ساتھ متصلاً ذکر کیا گیا ہے، جو اس کی اہمیت اور داعیِ حق کے لیے اس کے لازمی ہونے کی دلیل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اقرأ کے بعد پہلی وحی یہ نازل ہوئی:

يٰٓأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَأَنْذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ. وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ. وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ. (المدثر ۷۴:۱-۷) اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اُٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔ اور گندگی سے دور رہو۔ اور احسان نہ کرو، زیادہ احسان کرنے کے لیے۔ اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔

ان آیات کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ لوگوں کو ڈراؤ اور ان تک اللہ کا پیغام پہنچاؤ۔ اور اختتام صبر پر ہوتا ہے۔ انذار اور ڈرانا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور

نہی عن المنکر کے بعد صبر واجب ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ داعی اپنے عفو درگزر، جاہلوں سے اعراض اور ان کی اذیتوں پر صبر سے وہ نتائج حاصل کرتا ہے جو ان صفات کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ داعی کی صفات مخاطبین کو لازمی طور پر قبول حق پر آمادہ کرتی ہیں، اگر چہ اس میں کچھ وقت لگ جاتا ہے، سوائے ان لوگوں کے جن پر تقدیر غالب آجاتی ہے۔ اس لیے کہ برائی سے روکنا اور بھلائی کی قوت دینا بھی اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ.

۲۔قول وفعل میں مطابقت

۷۶۷۔ اچھے کردار کا دوسرا اُصول قول وفعل میں مطابقت ہے۔ داعی کو اس بات سے بھی محتاط رہنا چاہیے کہ اس کے قول اور فعل میں تضاد ہو۔ یہ فطری بات ہے کہ جو شخص اپنے علم پر عمل نہیں کرتا اس کی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا: وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ (ہود۱۱: ۸۸) اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات سے روکتا ہے کہ ہمارے افعال ہمارے اقوال کے خلاف ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ. كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْن (الصف۶۱: ۲-۳) اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔

داعی کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ رکھے کہ اس کے افعال اس کے اقوال کے مطابق ہوں۔ یہ چیز لوگوں کے، اس کی طرف متوجہ ہونے اور اس کی بات کو قبول کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

......☆......☆......

۱۔ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ج ۲۸ ص ۱۳۶-۱۳۷

خاتمہ

۷٦۸- ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے دعوت الی اللہ کے بارے میں یہی کچھ میسر تھا۔ اگر اس میں کوئی بات درست ہے تو یہ مجھ پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اگر اس میں کوئی غلطی اور زلّت ہے تو اس کے لیے میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا خواستگار ہوں۔ اللہ اور اس کا رسول اس چیز بری ہیں۔

میں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت شعیب علیہ السلام کی زبان سے فرمایا:

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (ہود۱۱:۸۸) میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک بھی میرا بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

آخر میں مَیں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں — اور وہی بہترین مسئول ہے — کہ ان صفحات سے راقم اور قاری دونوں کو نفع پہنچائے اور ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيْمَانِهِمْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِيْ جَنَّاتِ النَّعِيْمِ. دَعْوَاهُمْ فِيْهَا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلَامٌ وَّاٰخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس۱۰:۹-۱۰) حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، انھیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا، نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی۔ وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ ''پاک ہے تو اے خدا۔'' اُن کی دعا یہ ہوگی کہ ''سلامتی ہو''۔ اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہوگا کہ ''ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے

لیے ہے۔''

وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

......☆......☆......

ہماری مقبول مطبوعات

اصول فقہ	مولانا معین الدین خٹک
فقہ الزکوۃ	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
اسلامی زندگی	ڈاکٹر محمد علی ہاشمی
شعور حیات	مولانا محمد یوسف اصلاحی
شمع حرم	مولانا محمد یوسف اصلاحی
الروح والریحان	محمد وقاص
خلیفۃ الرسولؐ	طالب ہاشمی
تیس پروانےؓ	طالب ہاشمی
چالیس جاں نثارؓ	طالب ہاشمی
ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم	طالب ہاشمی
تذکار صحابیات	طالب ہاشمی
سو شیدائی	طالب ہاشمی
ستر ستارےؓ	طالب ہاشمی
پچاس صحابہؓ	طالب ہاشمی
سیرت فاطمہؓ	طالب ہاشمی

البدر پبلی کیشنز

23۔ راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور

Ph: 042-37225030 Cell: 0300-8455030